سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
بازیگر
پہلا حصہ
PDFBOOKSFREE.PK

پیش نوشت

بازی گر ایک آشفتہ مزاج اور مہم جو نوجوان بابر زماں کی آپ بیتی ہے۔ بڑی دھوم رہی ہے اِس کی۔ بہت شہرت کمائی ہے اِس نے۔ یہ سب رنگ کا ایک مقبول سلسلہ ہے۔ پڑھنے والے نہایت بے قراری سے اِس کا انتظار کرتے ہیں اور بہت ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں مگر اِس کے مصنف کا نام کبھی شائع نہیں ہوا لیکن جو قارئین شکیل عادل زادہ کے اسلوب اور طرزِ نگارش سے آشنا ہیں، اُن کے لیے یہ راز کبھی راز نہیں رہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شکیل عادل زادہ کا طرزِ تحریر اِس قدر منفرد اور یکتا ہے کہ بقول شاعر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے!

بازی گر کا اسلوب بیانیہ ہے مگر بیانیہ طرزِ اظہار جتنا آسان نظر آتا۔ [illegible] بھی ہے۔ اِس میں کبھی کبھی بڑے نازک مقامات آتے ہیں۔ ایسے ہفت خواں سر کرنے پڑتے ہیں کہ [illegible] دے کر نکلنے اور علامتوں کی بیساکھی کے سہارے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں۔ اِس میں رمز وکنایہ سے اِس خوبی اور مہارت سے کام لینا پڑتا ہے کہ تحریر میں جھول پیدا نہ ہو۔ سلاست وروانی اپنی پوری رعنائی کے ساتھ برقرار رہے۔ سچ پوچھیے تو یہ الفاظ کے برمحل استعمال، اُن کی نشست برخاست، اُن کی تزئین اور ترتیب کا فن ہے اور اِس فن میں شکیل عادل زادہ کو مہارت حاصل ہے۔ یہ مہارت اُنھوں نے اپنی خداداد صلاحیت، محنت اور ریاضت سے حاصل کی ہے۔

شکیل عادل زادہ نے بہت لکھا اور خوب لکھا ہے۔ بازی گر کو اُن کے تخلیقی سفر میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ صرف بابر زماں کی آپ بیتی نہیں، جگ بیتی بھی ہے۔ اِس کے کردار معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے اِنسان ہیں جو اندھیرے کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور اندھیرے ہی میں پروان چڑھتے ہیں۔ یہ چور اُچکے، بدمعاش اور غنڈے ہیں۔ قتل وغارت جن کا پیشہ ہے مگر اِس شر میں بھی خیر کا پہلو ہے اور یہ زندگی کی ایک بنیادی حقیقت کا اظہار ہے۔ معاشرے کا کوئی بھی فرد سرتاپا بُرا نہیں ہوتا۔ اِس کے وجود میں ایک اچھا انسان بھی چھپا ہوتا ہے اور اِسی بُرائی اور اچھائی کے امتزاج سے اِس کی تشکیل اور تعمیر ہوتی ہے۔ اور اِسی اچھائی اور بُرائی کے تضاد سے اُس کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ یہی تضاد کہانی میں زندگی کا رنگ بھرتا ہے۔ فن کار کا کمال فن یہ ہے کہ اپنے کرداروں کے اِس تضاد کی بازیافت کرے اور اِس خوبی اور چابک دستی سے کرے کہ اُن کی محبت اور نفرت، اُن کے دُکھ درد اور خوشیاں قاری کی اپنی محبت اور نفرت اور اپنی خوشی اور غم بن جائے۔ بات یہ ہے کہ قاری جب قصے کے حصار میں داخل ہوجاتا ہے تو وہ اِس کے سحر میں صرف کھو نہیں جاتا بلکہ اپنی خوشیاں، اپنی ناآسودہ خواہشات اور وہ سب کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُسے زندگی میں نہیں ملتا۔ لکھنے والا جب اپنے قارئین کے یہ مُطالبات مہیا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تب ہی قبولِ عام کی سند حاصل کرتا ہے۔ بازی گر ایک ایسی ہی اَدبی تخلیق ہے۔ اِس میں صرف تفریحِ طبع کا ساماں نہیں ہے، زندگی کی ہنگامہ آرائی ہے۔ ہل چل ہے اور گہماگہمی ہے جو کبھی خون کی گردش تیز کردیتی ہے، کبھی دل گرفتہ کر دیتی ہے اور کبھی مبہوت اور دم بخود کردیتی ہے۔ کہتے ہیں اندھیروں میں رنگوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ شکیل عادل زادہ کے فن کی خوبی یہ ہے کہ اندھیرے میں جنم لینے والوں اور اندھیرے میں رہنے والوں نے اپنے کرداروں کی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ جس طرح اُن کی عادات واطوار اور اقدار مختلف ہیں۔ اِس طرح اُن کی شناخت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر ایک کا اپنا علیحدہ مزاج ہے اور اپنی نرالی کج کلاہی اور سج دھج ہے۔

بازی گر کی تعمیر وتشکیل میں کلاسیکی داستان نگاری اور جدید افسانہ نگاری کا ایسا دل آویز امتزاج ہے کہ اُسے پڑھتے ہوئے الف لیلہ کا سند باد جہازی۔ آرائشِ محفل کا حاتم طائی، فسانۂ آزاد کا آزاد اور ایسے ہی دوسرے لازوال کردار بار بار آتے ہیں مگر جس طرح یہ تمام کردار اپنی اپنی جگہ منفرد اور یکتا نظر آتے ہیں، اِسی طرح بازی گر کا بابر زماں بھی اپنی انفرادیت اور اپنا علیحدہ تشخص رکھتا ہے۔ وہ دلیر ہے، حوصلہ مند ہے، خوب صورت اور وجیہ ہے، دشت نورد ہے، محبت بھی لوٹ کر کرتا ہے۔ نفرت کی آگ میں بھی جلتا ہے۔ قدم قدم پر مصائب اور ابتلا سے دوچار ہوتا اور مردانہ وار اُن کا مقابلہ کرتا ہے۔ موت سے آنکھ مچولی کرنے میں تلذذ محسوس کرتا ہے۔ حسینوں اور مہ جبینوں کے حسن اور رعنائی سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ بازی گر ایک ایسا نظامِ شمسی ہے جس میں بابر زماں کو سورج کا مقام حاصل ہے۔ دوسرے تمام کردار اور واقعات اِس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ شکیل نے اِس کردار کو جس محنت سے تخلیق کیا ہے، اِسی احتیاط اور مہارت سے اِس میں توازن اور اعتدال بھی برقرار رکھا ہے۔ اپنے شگفتہ اور دل نواز طرزِ تحریر سے اِسے سجایا ہے، نکھارا ہے اور سنوارا ہے۔

بازی گر، شکیل عادل زادہ کی ایک مقبول اور ہر دل عزیز اَدبی تخلیق ہے۔ اِسے کل بھی قبولِ عام کی سند حاصل تھی، آج بھی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آیندہ بھی اِسے یہی مقام حاصل رہے گا۔

شوکت صدیقی

۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء
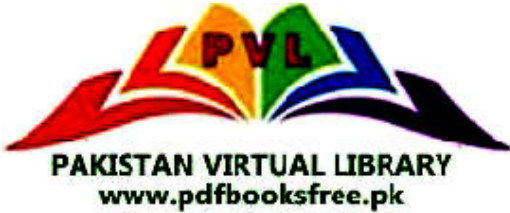
شاید میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آتی اگر میں اُس روز گھر جانے کے بجائے خلافِ معمول ریلوے اسٹیشن نہ چلا جاتا اور کلکتے سے آنے والی ہوڑہ ایکسپریس تین ساڑھے تین گھنٹے لیٹ نہ ہوتی۔ روزانہ صبح سویرے سیر کرنا میرا معمول تھا۔ یہ عادت میں نے اپنے والد سے سیکھی تھی۔ شروع شروع میں میں اُن کے ساتھ ہی آتا تھا مگر وہ گھٹنوں کے درد کے باعث زیادہ دُور چلنے سے معذور ہو گئے تھے اس لیے میں نے تنہا سحر خیزی شروع کر دی تھی۔ کبھی اس طرف کبھی اُس طرف۔ میں شہر کے مختلف حصّوں میں نکل جاتا اور کوئی آٹھ بجے گھر واپس پہنچتا۔ اُس روز اسٹیشن کی رونق شباب پر تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج ہوڑہ ایکسپریس خاصی تاخیر سے آ رہی ہے۔

ریل جب کسی بڑے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر گرجتی ہوئی داخل ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے زندگی کا سوئچ آن کر دیا ہے۔ بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ خصوصاً میری عمر کے لوگوں کے لیے یہ تماشا دیدنی ہوتا ہے۔ بھاگتے ہوئے قلی چیختے ہوئے خوانچہ فروش، گھبرائے ہوئے مسافر، آنے والے جانے والے بچے بوڑھے اور جوان ننھے ننھے چہرے، گورے کالے چھوٹے لمبے، دُبلے پتلے۔

میں جس شہر کا ذکر کر رہا ہوں اُس کا نام گیا ہے۔ گیا، بہار کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اُس کی آبادی ڈھائی لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اُس کے تین اطراف پہاڑیاں ہیں اور چوتھی طرف ندی ہے۔ اس محلِ وقوع کے اعتبار سے اُسے دلکش شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کپل وستو سے شاکیہ منی یہاں آئے تو یہیں کے ہو گئے۔ اس شہر کی فضاؤں میں ایک سکون سا گھلا ہوا ہے۔ گوتم بُدھ نے یہیں نِروان حاصل کیا اس لیے اسے کچھ لوگ گوتم کے شہر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ گوتم بُدھ کے اس شہر میں بُدھ مذہب کے پیرو برائے نام ہیں۔ اس کے برعکس یہاں کی آبادی ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ جن دنوں یاتریوں کی آمد شروع ہوتی ہے، شہر کی گھما گھمی میں ایک دم اضافہ ہو جاتا ہے۔ زندگی تیز ہو جاتی ہے، بازار سجنے لگتے ہیں اور بہت سے بے کار روزگار سے لگ جاتے ہیں۔ مہاتما بدھ کی سالگرہ کا یہ میلا مسلسل ایک مہینے تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصے میں شہر کی آبادی خاصی زیادہ ہو جاتی ہے۔ شہر کی انتظامیہ کو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ رضا کار طلبہ کے دستے بن جاتے ہیں۔ یہ دستے گیا آنے والے بُدھ مسافروں کی مدد کرتے ہیں اور انتظامیہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اسٹیشن سے سات میل دُور بدھوں کا خاص علاقہ ہے اسے بُدھ گیا کہتے ہیں۔ یہ علاقہ کئی مربع میل میں پھیلا ہوا اور ایک جزیرے کی سی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں کی دُنیا قطعی مختلف ہے۔ سارے علاقے میں گوتم بدھ کے چھوٹے بڑے مندر اور پگوڈے بنے ہوئے ہیں۔ گیروے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس بُدھ یاتری ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ تمام مندروں کی صناعی دیکھنے کے لائق ہے بعض مندر تو ایسے ہیں جن میں ہیرے جواہر جڑے ہوتے ہیں۔ مندروں کے اس سلسلے کا سب سے نمایاں مندر وہ ہے جس کے احاطے میں پیپل کا ایک بہت قدیم درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گوتم بُدھ نے اسی درخت

کے سائے میں ریاضت کی تھی اور نروان حاصل کیا تھا۔ یہاں ہر طرف گوتم کی مورتیاں ہیں اور اس ترتیب سے نصب کی گئی ہیں کہ ان سے گوتم بدھ کی پوری زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس مندر کا کلس بدھ گیا پہنچنے سے بہت پہلے دکھائی دینے لگتا ہے۔ جن دنوں یہاں میلا لگتا ہے، اسٹیشن تک سات میل کا راستہ مختلف رنگوں اور نسلوں کے یاتریوں سے آباد ہو جاتا ہے۔ بعض یاتری پیدل چل کے آتے ہیں اور اس طرح گوتم بدھ سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ اُس دن کا ذکر ہے جب شاکیہ مُنی کی ولادت کا جشن منایا جا رہا تھا اور سارا شہر بدل گیا تھا۔ مجھے بھی طلبہ کے رضاکار دستے میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر میری طبیعت ذرا مختلف تھی، اس لیے میں نے اپنی والدہ کی علالت کا بہانہ کر کے چھٹی لے لی تھی۔ ہوڑہ ایکسپریس آنے والی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت سے طلبہ کی ڈیوٹی اسٹیشن پر بھی لگائی گئی ہے کہ وہ یاتریوں کی رہبری کریں۔ آج انھیں خوب مزا آیا ہوگا۔ انتظار میں ساری رات گزر گئی ہوگی۔ اُن کا حال احوال پوچھنے اور ہوڑہ ایکسپریس سے اُترنے والے مسافروں کا تماشا دیکھنے کے لیے میں پلیٹ فارم پر آ گیا جیسے ایک دم کسی نے پلیٹ فارم کی زور سے چٹکی لے لی ہو، قلیوں میں افراتفری مچ گئی۔ ہوڑہ ایکسپریس کا سیاہ انجن تیز سیٹیاں بجاتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہو رہا تھا۔ سب طالب علم منتشر ہو گئے۔ میں ایک جگہ چائے کے اسٹال پر دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ کے سامنے ایک بوڑھا اور اُس کی کم سن لڑکی بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ کسی قلی کی بھی نظر اُن پر نہیں گئی۔ یہ سیزن کا زمانہ تھا۔ قلی کم، مسافر زیادہ تھے۔ ہر شخص اپنی دُھن میں مست تھا۔ کوئی رضاکار طالب علم بھی ان کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ گو اُن کے پاس سامان مختصر تھا لیکن بوڑھا اُسے اپنے کاندھے پر اٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کم سن لڑکی اضطراب میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اُس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ میری نظریں اسی پر جم گئی تھیں۔ وہ بہت نازک اور حسین تھی۔ میں اُس کی طرف کھنچتا چلا گیا اور میں نے آگے بڑھ کے اُن کا سامان اٹھا لیا۔ بوڑھے نے ٹوٹی پھوٹی ہندی اردو میں میرا شکریہ ادا کیا۔ لڑکی کی نگاہیں ممنونیت سے چمک اٹھیں۔ بوڑھا شکل سے ہمالیا کی ترائی والے علاقے کا کوئی باشندہ معلوم ہوتا تھا لیکن لڑکی کے نقش و نگار خالص ہندوستانی تھے۔ صرف اُس کے ماتھے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کا تعلق بوڑھے کی نسل سے بھی ہو سکتا ہے، مجھے یقین تھا کہ سکم، نیپال، تبت اور بھوٹان کے سوا ان کا وطن کہیں اور نہیں ہو سکتا۔

اسٹیشن سے باہر آ کے میں نے کسی نہ کسی طرح جدوجہد کر کے ایک تانگا حاصل کیا۔ میں تانگے والے کے ساتھ بیٹھا اور وہ دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اُس کے رخساروں پر سُرخی چھائی ہوئی تھی ویسے اُس کا رنگ خون میں تھوڑے سے پانی، سفیدا اور پیلا رنگ ملا کے بنا لگتا تھا۔ وہ اپنے روایتی لبادہ نما ریشمی لباس میں ایک نازک سی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے گندھے ہوئے لمبے سیاہ بال کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اُس کے دانت موتیوں کے بنے ہوئے تھے۔ وہ بہت شرمیلی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ اپنی دراز پلکوں کو جنبش دیتی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے تانگا ہچکولے کھانے لگا ہے۔ میری عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی سولہ سترہ سال ہوگی۔ فرسٹ ایر کا طالب علم، گھر میں ضدی، نک چڑھا اور قنوطی مشہور تھا۔ آج تک کسی لڑکی کو اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ افسانوں اور ناولوں کے قصے مجھے جھوٹ معلوم ہوتے تھے۔ خاندان میں کئی حسین لڑکیاں تھیں مگر اُن پر نظر ہی نہیں گئی تھی۔ اسکول میں بھی میں اپنے ساتھیوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ اعزا سمجھتے تھے کہ یہ لڑکا خود پسند، مغرور اور بد تہذیب ہے، چنانچہ والد صاحب کی توجہ بھی میری جانب کم سے کم تھی۔ مجھے یہ زندگی ہی کچھ بے مزہ اور بے رنگ معلوم ہوتی تھی۔ صبح اٹھیے، شام تک محنت کیجیے۔ دوسروں کی برائیاں کیجیے، رات کو سو جایئے۔ سب کا یہی معمول تھا۔ میں جب نویں میں تھا اُسی وقت سے میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں زندگی کے اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔ میں نے میٹرک فرسٹ کلاس پاس کیا۔ کالج نے مجھے فرسٹ ایر میں وظیفہ آفر کیا جو میرے زمیں دار باپ کی شان کے خلاف تھا۔ انھوں نے حقارت سے اسے مسترد کر دیا حالانکہ زمیں داری کوئی ایسی بڑی نہیں تھی۔ بس کھاتے پیتے لوگ تھے، عزت تھی، لوگ احترام کرتے تھے، جھک کے سلام کر لیتے تھے۔ چار بہنیں، دو چھوٹے بھائی، ایک ماں، ایک باپ۔ اگر مجھے شامل کر لیجیے تو کل نو افراد تھے، بہتر ہے مجھے شامل نہ کیجیے کیونکہ والد صاحب مجھے کالی بھیڑ کے نام سے پکارتے تھے۔ پتہ نہیں، یہ وہ کیوں کہتے تھے؟ میرا قد نکلتا ہوا، رنگ نکھرا ہوا اور چہرہ زمیں داروں کے بیٹوں کے چہروں کی طرح دلکش اور با وقار تھا۔ ہاں میں اپنے مزاج، فکر اور اطوار میں ضرور اُن سے مختلف تھا۔ ضبط کی یہ حالت تھی کہ گرمی، سردی، برسات کچھ بھی ہو، میرے معمولات میں فرق نہیں آتا تھا۔ ایک بار طے کر لیا تھا کہ صبح سیر کے لیے جایا کریں گے چنانچہ میں جاتا رہا، والد صاحب ہار گئے۔ میں نہیں ہارا۔

بوڑھے کے ساتھ اُس لڑکی کو دیکھ کے مجھ پر عجیب سے احساسات طاری ہوئے۔ جسم میں کوئی چیز تڑپنے لگی۔ جی چاہا اُسے گھر لے جاؤں اور شیشے کی اُس الماری میں بند کر دوں جس میں چینی کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔ صبح و شام اُسے دیکھا کروں۔ زلفوں اور رخساروں کے متعلق میں نے صرف شعر پڑھے تھے اور وہ شعر مجھے کبھی اچھے نہیں لگے تھے۔ میں شاعروں کو پاگل سمجھتا تھا مگر آج ان کی اور ان کے شعروں کی حقیقت مجھ پر واضح ہو رہی تھی۔ راستے میں بوڑھے شخص نے شفقت سے میرا نام پوچھا اور اپنا نام بتایا۔ اُس کا نام اجّین تھا۔

"اور ان کا نام؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"اُس کا نام کورا ہے۔ میری بچی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا آپ تبت سے آ رہے ہیں؟" میں نے شائستگی سے پوچھا۔

"ہم بہت دُور سے آ رہے ہیں۔" بوڑھا کچھ سوچتے ہوئے بولا "لیکن ہمارا تعلق ہمالیائی بستیوں ہی سے ہے۔"

"وہاں کے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، شریف، نیک، محنتی۔"

"گیا کے لوگ بھی کچھ کم اچھے نہیں ہوتے۔"

باتیں شروع ہوئیں تو ہم تمام راستے باتیں کرتے رہے۔ اُس نے مجھ سے میری تعلیم و خاندان کے بارے میں پوچھا۔ میری شرافت کی بڑی تعریف کی۔ بوڑھے کی ہندوستانی صاف نہیں تھی لیکن اُس کا لہجہ بھاری بھرکم تھا۔ آنکھوں میں گہرائی اور چہرے پر تدبّر تھا۔ وہ کوئی معمولی شخص معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا: "آپ وہاں کیا کام کرتے ہیں؟"

"پہاڑی کیا کر سکتے ہیں؟" اُس نے مختصر جواب دیا۔

"اور یہ؟" میں نے جھجک کر پوچھا۔ "یہ پڑھتی ہیں؟"

"ہاں کورا بہت اچھی طالبہ ہے۔"

"کورا! آپ کو یہ شہر اچھا لگ رہا ہے؟" وہ اب تک خاموش رہی تھی۔ میں نے پہلی بار ڈرتے ڈرتے اُسے مخاطب کیا۔

اُس کے چہرے کی سُرخی گہری ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں پٹ پٹا کر شکستہ لہجے میں کہا۔ "بہت اچھا۔" اُس کی ہندوستانی بھی ٹوٹی پھوٹی تھی مگر آواز بڑی سریلی اور لچک دار تھی۔

"آپ ہمارے گھر آیئے نا، ہماری بہنیں ہیں، ماں ہیں۔ وہ سب آپ سے مل کے بہت خوش ہوں گے۔"

اُس نے شرما کے نظریں جھکا لیں۔ اُس کے بجائے بوڑھے نے جواب دیا۔ "ضرور آئیں گے۔ ہم اپنے بیٹے کے گھر ضرور آئیں گے۔"

سات میل کا یہ سفر باتوں باتوں میں کٹ گیا۔ جب ہم بدھ گیا پہنچے تو دھوپ میں تیزی آ گئی تھی۔ مندروں کے کلس چمک رہے تھے اور ہر طرف بدھ یاتریوں کے غول کے غول رواں دواں تھے۔ میں ان دونوں کو خیموں کی طرف لے گیا جہاں منتظم نے اُن کے ناموں کا اندراج کیا اور جب انھیں قیام کا اجازت نامہ مل گیا تو انھیں اُن کے خیموں میں بسا کے میں نے اجازت چاہی۔ بوڑھا اجّین مجھ سے بہت متاثر تھا۔ وہ مجھے بار بار دعائیں دے رہا تھا۔ کہتا تھا کہ اگر اُس کا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ آج میرے برابر ہوتا۔ وہ اپنے تخت سے ایک گہری وادی میں گر گیا تھا۔ بوڑھے کے لہجے میں سکون، وقار اور دُکھ شامل تھا۔ جب میں واپس ہونے لگا تو اجّین نے مجھے روک کے اپنا صندوق کھولا اور موتیوں کی ایک مالا نکال کے زبردستی میرے گلے میں ڈال دی۔ میں نے مالا لاکھ واپس کرنا چاہی مگر اُس نے میری ایک نہ سنی۔ چلتے چلتے اجّین نے میرے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ پتہ بہت آسان تھا، میرا مکان محلہ کریم گنج میں تھا۔ میں نے اُسے مکان کا نقشہ بخوبی سمجھا دیا تھا تاکہ وہ بھول نہ جائے۔ اسی لمحے کورا نے اپنی شیریں آواز سے مجھے روک لیا۔ "آپ اِدھر آئیں گے؟" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

"ضرور آئیں گے۔" میں نے چہک کر کہا۔ "لیکن آپ بھی آئیں گی۔"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ضرور ضرور آئیں گے۔"

واپسی میں راستے بھر میرے ذہن میں کوئی اور چیز نہیں تھی۔ میں اُن دونوں ہی کے متعلق سوچتا رہا۔ بوڑھے اجّین کی دی ہوئی مالا میں نے جیب میں رکھ لی تھی اور کورا کا چہرہ میری آنکھوں میں محفوظ تھا۔ آج کا دن مجھے ایک نیا دن معلوم ہو رہا تھا اور میں خود کو اجنبی اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ گھر آ کے میں نے والدہ کو تاخیر سے لوٹنے کی وجہ سچ سچ بتا دی۔ اِس روداد کی تصدیق کے لیے میرے پاس اجّین کی مالا موجود تھی، اُسے والد صاحب نے دیکھا تو کسی سوچ میں پڑ گئے، پھر کہنے لگے: "تمھیں یہ مالا کسی صورت میں قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ بیش قیمت موتیوں کی مالا ہے۔ مجھے حیرت ہے اُس شخص نے اتنی معمولی خدمت پر یہ تمھیں کیوں بخش دی؟"

"جی ہاں، اُسی نے مجھے دی ہے۔" میں نے قدرے ناراضی سے کہا "میں نے اُسے بہت منع کیا مگر وہ مانا ہی نہیں۔ وہ ایک بہت نیک، شریف اور مال دار شخص معلوم ہوتا ہے۔"

انھیں مجھ پر شبہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، پہلے ہی میں اُن کا سب سے مشکوک بیٹا تھا۔ انھوں نے مالا کئی بار پرکھی اور کسی جوہری کی طرح اسے نگاہوں میں تولا اور والدہ کے سپرد کر دی جنھوں نے احتیاط سے اپنے زیور بکس میں اسے مقفل کر دیا۔

دن تو جیسے گزرنا تھا، گزر گیا، رات آئی تو مجھے نیند نہیں آئی۔ حالانکہ میں جلد سو جانے کا عادی تھا۔ پوری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ کورا کا چہرہ نظروں میں سمایا رہا۔ ایسی بے چینی تھی کہ کسی کروٹ قرار نہیں تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، تین بج رہے تھے۔ والد صاحب فجر کی نماز سے پہلے جاگتے تھے تو مجھے اُٹھا دیتے تھے، اُن کے بیدار ہونے سے پہلے گھر سے باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ گھڑی آئی، میں پہلی ہی آواز پر اٹھ بیٹھا۔ انھیں سلام کیا اور جلد سے جلد کپڑے بدل کے گھر سے نکل گیا۔ آج اِدھر اُدھر جانے کے بجائے میرا رُخ بدھ گیا کی سمت تھا۔ آدھے راستے تک میں پیدل چلتا رہا، پھر ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ بدھ گیا میرے پہنچنے سے پہلے ہی دن نکل آیا تھا۔ ہر شخص جاگ رہا تھا اور شاکیہ منی کے قدموں میں پھول نچھاور کرنے، اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے مضطرب تھا۔ شاکیہ منی کو سکون بہت پسند تھا اور صبح سکون اور امن کی علامت ہوتی ہے۔ اس سال دُنیا کے مختلف حصوں سے گوتم بدھ کے پیرو بڑی تعداد میں یہاں آئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اجّین اس وقت اپنی بیٹی کورا کے ساتھ کسی مندر میں ہوگا۔ احتیاطاً میں نے خیمے میں جھانک لینا مناسب سمجھا۔ خوش قسمتی سے وہ دونوں وہاں موجود تھے، جب کہ باقی خیموں کے باسی مندروں میں عبادت کے لیے چلے گئے تھے۔ میں نے خیمے کے باہر سے آواز لگائی۔ بوڑھا اجّین برآمد ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کے کھل اُٹھا اور میری کمر پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔ "آؤ آؤ بیٹے اندر آؤ۔"

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل۔ دیکھو کورا! بابر آیا ہے۔ میں رات تم سے اس کا ذکر کر رہا تھا۔" اجّین نے مجھے چٹائی پر بٹھا لیا جس پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ سامنے ہی کورا کا بستر تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی، میرے پہنچتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے

اپنی چمکتی اور مسکراتی آنکھوں سے میرا خیر مقدم کیا۔ سلام کے لیے بے اختیار میرے ہاتھ اٹھ گئے۔ اُسے سلام کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اُٹھے، پھر اُس نے اپنا ایک ہاتھ ماتھے پر ٹکا کے کچھ کہا جسے میں نہیں سُن سکا۔

"آپ کہیں باہر نہیں نکلے؟"

"نہیں، مجھے بھیڑ بھاڑ پسند نہیں ہے۔" اجین نے انکسار سے کہا۔ "جب بھیڑ چھٹ گئی تھی، اُس وقت ہم نے رات کو بُدھ گیا کی سیر کی تھی۔ شاکیہ منی جانتے ہوں گے کہ میرا دل اُن میں ڈوبا ہُوا ہے۔"

"اور کورا آپ؟" میں نے ہمت کرکے پوچھا۔

کورا سے بولا نہیں گیا۔ "یہ۔ یہ تو گھبرا رہی ہو گی۔" اُجین نے جواب دیا۔ "کورا تم بابر سے بات نہیں کرتیں؟" کورا کچھ اور شرما گئی اور اُس نے مٹھائی کا ڈبا میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔ "کچھ کھاؤ نا بیٹے!" اجین نے مجھ سے شفقت سے کہا۔

"آپ لوگ ہندوستانی بہت اچھی جانتے ہیں۔" میں نے مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" بوڑھا اجین ہنس کر بولا۔ "میں بہت عرصے تک ہندوستان میں رہا ہوں۔ کورا کو ہندوستانی میں نے ہی سکھائی تھی۔ پھر یہاں آ کے ہم نے ـــــ گھر کے کام کاج کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی۔ اس سے کورا نے اچھی خاصی ہندوستانی سیکھ لی ہے۔"

میں نے وہاں زیادہ دیر ٹھیرنے کے لیے شاکیہ منی کی تعلیمات کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اُس کے سامنے گوتم بدھ کی زندگی سے متعلق بہت سی روایتوں پر حیرت کا اظہار کیا۔ میرا خیال تھا کہ اجین شدومد سے گوتم بدھ کے نظریات فلسفے اور زندگی کی تبلیغ کرے گا اور اس طرح مجھے یہاں کچھ اور قیام کرنے اور کورا کا چہرہ دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ اجین نے میرا تجسس غور سے دیکھا مگر کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ اُس نے سرسری انداز میں گوتم بدھ کی تعلیمات کا ذکر کیا اور کہا جو بدھ کہتے ہیں وہ سچ ہے کیونکہ گوتم کے قریب آئے بغیر اُسے پہچانا اور سمجھا نہیں جا سکتا۔ اُس سے کم از کم مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک عام بدھ شخص ہے۔ کوئی پروہت یا مبلغ نہیں یا اُس کے تجربہ کار حواس نے سراغ لگا لیا تھا کہ میں محض اخلاقاً اور رسمایہ گفتگو کر رہا ہوں۔ گفتگو میں شوقِ حصول کی وہ شدت نہیں تھی جو ہونی چاہیے۔ کچھ اور نہیں بنا تو میں نے اُس سے کہا۔ "آپ گیا شہر نہیں دیکھیں گے کیا؟"

"شہر سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دکانیں، بازار، چھوٹی بڑی عمارتیں، غریب امیر لوگ۔ مجھے تو تم کوئی خاص چیز دکھاؤ۔"

"خاص جگہ تو آپ خود ہی بیٹھے ہیں۔" میں نے مہذب لہجے میں کہا۔ "یاد ہے، کل آپ نے کیا وعدہ کیا تھا؟"

"مجھے بھی یاد ہے، کورا کو بھی یاد ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ کب چلیں گے، کل میں نے امی کو آپ کی دی ہوئی مالا دکھائی۔ وہ سب حیران تھے کہ آپ نے اتنی قیمتی چیز ایک اجنبی لڑکے کو کیسے دے دی۔ وہ مجھ پر شک کر رہے تھے، میں نے اُنھیں بہت سمجھایا۔ اب آپ کو میری بات کی لاج رکھنے کے لیے چلنا ہو گا۔"

"اچھا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "میں اُن سے ضرور ملوں گا اور کہوں گا کہ تمھارا بیٹا بہت ذہین، خوش اخلاق اور مہمان نواز ہے۔ ایسے اچھے بیٹے پر تو آنکھ بند کرکے اعتبار کرنا چاہیے۔"

اعتبار تو انھوں نے کر لیا ہے اور آپ کا بہت بہت شکریہ بھی ادا کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ کسی دن ہمارے ہاں کھانا کھائیں۔ آپ کے لیے ہم آپ کی پسند کے کھانوں کا انتظام کر دیں گے۔"

"نہیں نہیں۔" بوڑھے اجین نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "میں ہر قسم کا کھانا پسند کرتا ہوں۔"

میری متجسس نگاہیں بار بار کورا کی جانب اُٹھتی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کا بھی کچھ یہی حال ہے، وہ بھی بار بار میری طرف دیکھتی ہے۔ جب ہماری نگاہیں ٹکراتی تھیں تو ہم دونوں گردنیں جھکا لیتے تھے۔ کاش میں اُن میں کہیں بھی بدصورتی کا کوئی گوشہ کوئی نقطہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ تو میرے دل میں اُترتی گئی اور لمحہ بہ لمحہ اور حسین اور حسین نظر آنے لگی۔ بوڑھے اجین کی موجودگی میں اُس سے کوئی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے بہت سے لفظ سوچے، بہت سے طریقے اُسے مخاطب کرنے کے لیے میرے ذہن میں آئے، سب ناکام ہو گئے۔ میں قطعاً واقف نہیں تھا کہ ایک لڑکی سے اور اتنی حسین لڑکی سے کیسے بات کرنی چاہیے۔ یہ سب کچھ مجھے بہت مشکل نظر آیا۔ میری طبیعت ایسی تھی کہ اپنی کوئی خواہش پوری نہ ہونے کی صورت میں میں ہمیشہ کے لیے اُس سے دست بردار ہو جاتا تھا۔ میں نے سوچا انھوں، یہ لوگ یاتری ہیں، آج آئے ہیں، کل چلے جائیں گے، پھر یہی اپنا شہر گیا ہو گا، یہی گھر، یہی کالج، یہی معمولات لیکن میں خود پر جبر کرنے میں ناکام ہو گیا۔ بوڑھا اجین کہتا تھا کہ اُسے گوشہ نشینی بہت پسند ہے۔ حالانکہ وہ بُدھ گیا کے ہجوم میں چلا آیا تھا اور یہاں اپنے خیمے میں خیمے کی طرح جما ہوا تھا۔ "اگر آپ کو شہر سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔" میں نے پوچھا۔

"یہاں ہمارے پاس کم سے کم چیزیں ہونی چاہئیں جن کی ضرورت ہو انھیں بھی ترک کر دینا چاہیے۔ شاکیہ منی کہتے تھے کہ اپنے آپ کو ضرورتوں سے بلند کرو۔"

"شہر کے کالجوں میں بہت سے طلبہ کی ڈیوٹی لگی ہے کہ وہ گیا میں آنے والے مہمانوں کا خیال رکھیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "میری خوش قسمتی ہے کہ میرے حصے میں آپ جیسے مہمان آئے۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں، جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھا رہوں اور آپ کی باتیں سنتا رہوں۔"

وہ اس بات سے بہت خوش ہُوا۔ "ابھی تمھاری عمر کم ہے مگر تم بڑی اچھی باتیں کرنے لگے ہو، تم ضرور ترقی کرو گے۔"

"آپ نے جواب نہیں دیا کہ آپ کب ہمارے ہاں چلیں گے؟"

وہ سوچنے لگا۔ "کسی دن بھی چلے چلیں گے، ابھی تو ہم لوگ یہاں موجود ہیں، ایسی کیا جلدی ہے؟"

"جلدی تو مجھے ہے، میں آپ کو اپنا گھر دکھانا اور اپنے بہن بھائیوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔ وہ کورا کو اور آپ کو دیکھ کے بہت خوش ہوں گے، آپ ہماری عزت بڑھائیں گے۔ دیکھیے اب ٹال لیے مت۔"

وہ مسکرانے لگا اور اُس نے دوسرے دن رات کو ہمارے گھر کھانا کھانے کا وعدہ کر لیا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جلد ہی بہت سی جذباتی باتیں کہہ دیں۔ اُسے میری دعوت قبول فوراً کرنی پڑی۔ میں اُسے ٹالنے کا کچھ اور موقع دیتا تو کچھ دیر مزید یہاں بیٹھنے اور کورا کی سیر سے لطف اٹھانے کا بہانہ مل جاتا۔ مجھے وہاں سے اٹھنا پڑا۔ اجین کے ساتھ کورا بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت اُس نے مجھے اور اُلجھن میں مبتلا کر دیا۔ اُس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ وہ لفظ نہ جانے کیسے میری سمجھ میں آ گئے۔

میں وہاں سے تو رخصت ہو گیا لیکن بدھ گیا کے علاقے سے باہر نہیں گیا بلکہ کچھ دور اِدھر اُدھر گھوم گھام کے ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے میں آسانی سے اجین کے خیمے پر نظر رکھ سکتا تھا۔ کسی کام کے بغیر ایک جگہ ٹھیرے رہنے سے بہت سے لوگوں کی توجہ میری جانب مبذول ہو گئی۔ "تمھیں کس کی تلاش ہے؟" ایک پروہت نے نرم لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔

"سکون کی تلاش۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اُس کے ماتھے کی شکنیں دُور ہو گئیں۔ "شاکیہ منی تمھیں سکون کا درس دیں گے۔" یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ شاید میرے چہرے میں اُسے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تھی۔

بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب بوڑھا اجین باہر نکلا، جاتے جاتے وہ خیمے کا پردہ ڈالنا نہیں بھولا۔ اُس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک برتن تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دوپہر کا کھانا لانے کی غرض سے باہر آیا ہے۔ میلے کے زمانے میں یہاں لنگر کے انداز میں کھانا تقسیم کیا جاتا تھا جس میں خاصی دیر لگتی تھی۔ اگر وہ کھانا خریدنے بھی جاتا تو اُسے واپس آنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور لگ جاتا۔ میں اس آدھے گھنٹے میں اس کے خیمے میں داخل ہو کے کورا سے باتیں کر سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ کچھ دور گیا، میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور تیز رفتاری سے اجین کے خیمے تک کا فاصلہ طے کرنے لگا۔ خیمے کے قریب میرے قدم اٹکنے لگے۔ اندر جا کے میں کورا سے دوبارہ واپس آنے کا کیا جواز پیش کروں گا اور پھر کورا بوڑھے اجین سے یہ راز کیوں چھپائے گی؟ بات خراب ہو جائے گی۔ وہ باتیں بھی ذہن سے اچانک اتر گئی تھیں جو مجھے کورا سے کہنی تھیں۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ میں کوئی بہانہ بنا دوں گا، اتنے قریب آ کے واپس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں خیمے کا پردہ ہٹا کے اندر داخل ہو گیا۔ کورا کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نمودار ہوئے مگر دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگی اور تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ میرا سارا جسم تمتمانے لگا۔ اُس کی نظریں سوال کر رہی تھیں کہ میں دوبارہ کیوں واپس آیا ہوں؟ ایسی گھبراہٹ سے زندگی میں کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ چند لمحوں تک میں یوں ہی گُنگ کھڑا رہا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

"بیٹھیے۔" کورا نے پہل کی۔

"نہیں، میں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا۔ آپ سے باتیں کرنے آیا تھا مگر سب کچھ بھول گیا اس لیے واپس جا رہا ہوں۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"کھانا کھا کے جائیے گا، بابا کھانا لینے گئے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں اُن کے سامنے آنا نہیں چاہتا، نہ ہی آپ انھیں یہ بتائیں کہ میں دوبارہ یہاں آیا تھا۔ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں، مجھے کیا ہو گیا ہے، مجھے معاف کر دیجیے۔ بابا کو مت بتائیے گا۔" میں نے گھبراہٹ میں کہا۔

وہ میرے بے ربط جملوں اور اختلاجی کیفیت پر کچھ حیرت زدہ سی ہوئی۔ "میں نہیں بتاؤں گی۔"

"کل آپ آئیں گی نا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں۔" اُس نے گردن ہلا کر کہا۔

"دیکھیے ضرور آئیے گا ورنہ۔" میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ضرور۔" اُس نے جیسے ایک ایک حرف علیحدہ علیحدہ ادا کیا اور اُس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ چھا گئی جو میں نے کسی اور لڑکی کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا جیسے میں امتحان ہال میں بیٹھا ہوں۔ یا میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں یا مجھے تیز بخار ہو گیا ہے۔ اس کش مکش سے نجات پانے کے لیے میں فوراً چلا آیا۔ کسی لمحے بھی اجین آ سکتا تھا۔ تمام راستے مجھے معلوم تھے۔ اس لیے میں اجین کی نظروں سے بچتا ہُوا بدھ گیا کے علاقے سے دُور نکل گیا اور تانگے میں بیٹھ کے گھر کی راہ لی۔ گھر والے میری وجہ سے پریشان ہو گئے ہوں گے۔ اطلاع دیے بغیر اتنی دیر تک کبھی میں گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ والد صاحب کی گرج دار آوازیں ابھی سے میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ گھر سے کچھ فاصلے پر تانگے سے اتر کے میں نے باقی راستہ پیدل طے کیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میری تلاش میں گھر کا ملازم محلے میں گھوم رہا تھا اور اب میرے ہم جماعت ساتھیوں کے گھر جا رہا تھا۔

گھر میں میری ناپسندیدگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں جھوٹ کم سے کم بولتا تھا، منہ پھٹ تھا اور کسی مصلحت کا خیال کیے بغیر ہر بات صاف صاف کہہ دیتا تھا۔ آج مجھے سو بہانے سوجھ رہے تھے۔ جھوٹ کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میری آہٹ پر سبھی دروازے پہ آ گئے۔ "کہاں تھے صبح؟" امی نے تُلخی سے پوچھا۔

"گیا شہر ہی میں تھا۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "اب میں اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں کہ گھر سے کچھ دیر اپنی مرضی سے باہر نہ رہ سکوں۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ بدھ گیا چلا گیا تھا۔"

"کوئی اطلاع بھی نہیں دی؟" امی خفگی سے بولیں۔
"خیال تھا جلدی واپس آجاؤں گا۔"
"یہ تم بدھوں وغیرہ کے جھنجھٹ میں کیوں پڑ گئے؟ ہم مسلمان ہیں بیٹا!"
"تو کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں اپنا مذہب بدلنے گیا تھا؟"
"توبہ توبہ نعوذ باللہ۔" امی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ "کیسی باتیں کر رہا ہے، ذرا اپنے ابا کے سامنے آکے دیکھنا، وہ تیری کیسی خبر لیتے ہیں۔"

امی نے اس بار مجھے کچھ زیادہ ہی بُرا بھلا کہا۔ پتہ نہیں کیوں؟ یہ امی ناراض ہونے والی بات تو نہیں تھی۔ حیرت ہے کہ اُس دن والد صاحب نے کچھ نہیں پوچھا، وہ دوسرے کمرے میں امی کی ساری باتیں سُن رہے تھے، میں سمجھا، یہ بھی اُن کے خفا ہونے کا ایک انداز ہے یا امی نے اُن کا کوٹا بھی پورا کر دیا تھا۔ میری بہن فرخ اور فہمیدہ نے امی کی ڈور کھینچی تو کہیں وہ چپ ہوئیں۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں اُس دعوت کا ذکر کرتا جو میں نے بوڑھے امین اور اُس کی بیٹی کورا کو دی تھی۔ میں نے بڑی بے بسی محسوس کی، اپنا گھر مجھے پڑوس کے کسی گھر کی طرح لگا۔ ایک جیل خانہ جہاں میں سزا کے دن کاٹ رہا ہوں۔ مجھے بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ میں نے اُسے پینے کی کوشش کی تو اور بڑھ گیا۔ اس جھنجھلاہٹ میں، میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت دعوت کا ذکر کر دینا چاہیے۔ منع کر دیں گے تو میں گھر سے نکل جاؤں گا۔ ابا! میں نے آرام کرسی پر حقہ گڑگڑاتے ہوئے انھیں کسی قدر گستاخی سے مخاطب کیا لیکن میں اپنے لہجے پر قائم نہیں رہ سکا۔ "ایک بات کہوں، آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟"

"کہو۔" وہ ترشی سے بولے۔
"ابا! اگر میں یہاں کسی کی دعوت کروں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"
"اعتراض کیوں ہوگا؟ یہ تمھارا گھر ہے۔"
مجھے اپنے کانوں کی صحت پر شبہ ہوا۔ "ابا!" میں نے ناز اور پیار سے انھیں مخاطب کیا۔ "میں نے کل رات دو معزز آدمیوں کی دعوت کر دی ہے۔"
"کون ہیں وہ؟" ابا نے غیر متوقع نرمی سے پوچھا۔
"وہ وہی بزرگ بدھ شخص ہے جس کا نام امین ہے اور اُس کی لڑکی، وہ لوگ بے حد شریف ہیں، کل مالا انھوں نے ہی مجھے دی تھی۔" میں نے جوش میں کہا۔ جواب دینے کے بجائے والد صاحب حقہ گڑگڑانے لگے۔ "میں اُن سے کہہ چکا ہوں ابا!" بس میرے منہ سے نکل گیا۔ "آپ انکار کر دیں گے تو میری بعد ہو جائے گی۔"
"ٹھیک ہے تم نے جو بات کہہ دی ہے، اُسے پورا کیا جائے گا۔" ابا نے آہستگی سے کہا۔ "مگر آئندہ اتنی جلدی اجنبیوں کو دعوت دینے میں احتیاط برتنا، پتہ نہیں کون لوگ ہیں، کہاں سے آئے ہیں۔"
"بہت اچھے لوگ ہیں، آپ اُن سے ملیے تو سہی۔ میں ایسے ویسوں کو اپنے گھر میں کیوں مدعو کرتا؟" میں نے جذباتی لہجے میں کہا اور بوڑھے امین کی تعریفیں کرنے لگا۔

والد صاحب نے میری لاج رکھ لی تھی، مجھے اُن پر بہت پیار آیا۔ تمام شکوے ایک ہی بات میں دُھل گئے۔ میں جس کام کو بہت مشکل سمجھتا تھا وہ اتنا آسان نکلا۔ اب میری عقل میں آیا کہ وہ تو بس میری محبت میں مجھ سے ناراض رہتے ہیں، دل کے بہت اچھے ہیں۔ اس سے میرے اس کی تائید بھی ہو گئی کہ میں کہیں اور نہیں اسلام میں گیا تھا۔ امی، بہنوں اور بھائیوں نے بدھ یاترا کے متعلق بہت سے سوال کیے۔ میں بتاتا رہا کہ وہ کتنا معقول، ہنس مکھ، تجربہ کار اور خوش اخلاق شخص ہے۔ میں نے اپنے گھر میں اُس کا ایسا تصور قائم کر دیا کہ جب وہ آئے تو سب عزت و تکریم سے پیش آئیں۔ امی کھنچی کھنچی رہیں، شام تک میں نے انھیں بھی منا لیا لیکن میں خود سے روٹھا ہوا تھا۔

دوسری رات نیند تو آئی مگر عجب عجب طرح کے خواب آتے رہے کہ میں کورا کے ساتھ پہاڑوں، وادیوں کا سفر کر رہا ہوں۔ وہ میرے گھر میں بیٹھی ہے، میرے ساتھ پڑھ رہی ہے، وہ چھوٹی موری کا پاجامہ اور کرتا پہنے ہوئے ہے، گلے میں دوپٹا بھی ہے۔

❋

صبح ہوتے ہی میں سیر کو نکل گیا۔ سوچا، بدھ گیا کی طرف ہو آؤں اور ایک بار پھر تصدیق کر آؤں۔ کہیں کورا نے میرے آنے کا ذکر امین سے نہ کر دیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے نہ آئے، انکار کر دے اور گھر میں سب میرا خوب مذاق اُڑائیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ کورا خاموش رہی ہوگی۔ میں جلد ہی گھر واپس آگیا اور چیزیں قرینے سے رکھنے لگا۔ قدِ آدم شیشے کی صفائی کی، دیواریں جھاڑیں، دیوارگیریاں صاف کیں، فرش دھلوایا، بیٹھک میں چاندنی بدلی، چھوٹا سا فانوس چمکایا، گاؤ تکیوں کے غلاف بدلوائے۔ بہنیں بھی میرا ساتھ دیتی اور مجھے چھیڑتی رہیں۔ امی نے مختلف قسم کی لذیذ سبزیاں اور چاول پکائے، چٹنیاں، مربہ جات، گوشت کا کوئی سالن نہیں پکایا گیا۔ کورا کو تحفے میں دینے کے لیے امی نے سلیم شاہی جوتیاں اور گانوں کے بالے علیحدہ نکال کے رکھ لیے۔ کچھ بھی ہو ایک زمیندار کے گھر مہمان آ رہا تھا۔

سرِ شام میں کپڑے پہن کے تانگے میں سوار ہو کے بدھ گیا کی جانب روانہ ہو گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ بدھ گیا کا جانا پہچانا راستہ آج طویل معلوم ہوتا تھا۔ ڈر تھا کہ امین کا ہمدردانہ رویّہ نہ بدل گیا ہو۔ یہ بھی خیال آیا کہ کہیں وہ واپس نہ چلا گیا ہو۔ دل میں ہزار اندیشے لیے میں اُس کے خیمے پر پہنچا تو وہ موجود تھا اور خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ میری جان میں جان آئی۔ رسمی سلام دُعا کے بعد میں نے کہا۔ "آپ کو مکان ڈھونڈنے میں مشکل پیش آتی، اس لیے میں خود ہی چلا آیا، چلیے تیار ہو جائیے۔"
"میں مزدور تا بابر! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا، تم نے بے کار تکلیف کی۔ بہرحال ابھی بیٹھو، ذرا اندھیرا ہو جائے تو چلتے ہیں۔" کورا نے پہلے ہی سادہ سا لباس پہن رکھا تھا۔ اُس نے اپنا تبتی لباس اُتار دیا تھا اور پاجامے، ٹاپ کپڑے پہ ڈھیلا ڈھالا کرتا پہن رکھا تھا۔ ہلکی سی نیلی شال شانوں پر ڈال رکھی تھی۔ اس لباس سے وہ اور دل کش ہو گئی تھی۔

"آپ کی بہنیں کتنی بڑی ہیں؟" پہلی بار اُس نے مجھ سے سوال کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اُس نے میری بہت سی باتوں کا جواب دے دیا ہے۔ میں نے اُسے اپنی تمام بہنوں کے نام بتائے اور عمریں بتائیں۔ بوڑھا بھی انہماک سے سُنتا رہا۔ اندھیرا ہوتے ہی اُس نے مجھ سے معذرت چاہی اور کہا کہ اُسے لباس تبدیل کرنا ہے اس لیے میں اور کورا کچھ دیر کے لیے باہر چلے جائیں۔ ہم نے اُس کی درخواست کی تعمیل کی، جب ہم دونوں باہر آگئے تو میں نے چپکے سے پوچھا۔ "آپ نے کچھ کہا تو نہیں؟"
"نہیں۔" وہ جھجکتی ہوئی بولی۔ "ہم نے نہیں بتلایا۔"
"میں بہت ڈر رہا تھا۔" پتہ نہیں وہ کیا سمجھیں، یہ کہتے کہتے میں جھینپ سا گیا، پھر بولا۔ "آپ تو اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔"
وہ لجا گئی اور کہنے لگی۔ "آپ کو اچھا لگ رہا ہے؟"
"آپ کچھ بھی پہن لیں، مجھے اچھا لگے گا۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ "دیکھیے، گھر میں سب سے خوب گھل مل جائیے گا۔ میں نے اپنی بہنوں سے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔"
"اور میں نے بابا سے آپ کی۔"
"آپ نے بالکل غلط تعریف کی، میں تو بہت بُرا ہوں۔"
"ہوں۔" اُس کے موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے۔
"آپ سے پرسوں ہی ملاقات ہوئی ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، آپ کو ایسا لگتا ہے؟"
اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
"گھر جا کے بھی آپ کا خیال رہا۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔
اس اثنا میں بوڑھے امین نے آواز دی۔ "اندر آجاؤ۔" ہم دونوں اندر گئے تو وہ لباس بدل چکا تھا۔ "میں تیار ہوں۔"
اندھیرا ہو چکا تھا۔ بوڑھے کی بغل میں کسی موٹی کتاب کے سائز میں سفید کپڑے میں لپٹا ہوا بقچہ دبا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔ "یہ مجھے دے دیجیے۔" اُس نے انکسار سے انکار کر دیا۔ میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ ہم تانگے میں بیٹھ گئے۔ سڑکوں پر روشنیاں جھلملانے لگی تھیں۔ میں خوشی اور فخر کے جذبات سے سینہ پھلائے گردن اکڑائے تانگے کی اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ تانگا رُکنے کی آواز سُن کے والد صاحب دروازے پر آگئے۔ دونوں ایک دوسرے سے پُرانے شناساؤں کی طرح بغل گیر ہوئے۔ ڈیوڑھی میں امی اور بہنوں نے کورا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ امی نے تو اُسے گلے لگا لیا۔ کاش میں امی ہوتا۔ وہ سب چہچہاتی ہوئی اندر زنان خانے میں چلی گئیں اور میں، والد صاحب اور امین بیٹھک میں آگئے۔ چاندنی کے اوپر درمیان میں قالین بچھا ہوا تھا۔ امین کو عزت کے ساتھ وہاں بٹھا دیا گیا۔ "آپ نے میری عزت بڑھائی۔" والد صاحب نے خالص زمیندارانہ لہجے میں کہا۔ یہ لہجہ وہ اُسی وقت اختیار کرتے تھے جب گھر میں کوئی معزز مہمان آتا تھا۔
امین میرے کردار اور اخلاق کی تعریف کرنے لگا۔ "اس بچے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔"

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" والد صاحب نے رسمی انداز میں پوچھا۔ "بابر نے تو بس آپ کی تعریفیں کیں، کچھ بتایا نہیں۔"
"جناب یوں تو کہانی بڑی لمبی ہے، کسی وقت فرصت میں سناؤں گا، تبت سے چلے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے۔ چند مہینے رہلی میں، پھر کلکتے چلا گیا، اب وہیں سے آ رہا ہوں، تبت میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔"
"اچھا اچھا۔ آپ بھی زمیندار ہیں۔ خوب؟" والد صاحب نے ہنس کر کہا۔ "اپنا بھی ایک زمانے سے یہی پیشہ ہے۔"
دونوں بزرگوں میں جلد ہی مغائرت ختم ہو گئی اور وہ دنیا جہان کی باتیں کرنے لگے۔ والد صاحب اپنے بچوں کے متعلق باتیں کرنے لگے، پرانی یادیں، تجربے اور غیر معمولی واقعات سنانے لگے۔ امین جیسا سامع انھیں کہاں دستیاب ہوتا؟ میری بڑی بہن فہمیدہ نے آواز دے کے مجھے بلا لیا۔ میں صحن میں گیا تو وہ کہنے لگی۔ "بابر! یہ تو بہت پیاری ہے، میٹھی میٹھی باتیں کر رہی ہے، گڑیا سی لگتی ہے، اگر یہ مسلمان ہوتی تو میں اسے گھر سے نہ جانے دیتی، تمھارے لیے محفوظ رکھ لیتی۔ اب سمجھ میں آیا کہ کل تم کہاں غائب تھے۔ اچھا یہ بات ہے!"
"کیا بات ہے؟" میں نے مصنوعی ناگواری سے پوچھا۔
"ہم سب سمجھتے ہیں جناب؟ تم اِدھر کیوں نہیں آتے۔" وہ شوخی کرنے لگی اور مجھے کھینچتی ہوئی اندر کمرے میں لے گئی جہاں کورا میری دوسری بہنوں اور بھائیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ انھوں نے اتنی جلدی دوستی کر لی تھی کہ اُسے چوڑیاں تک پہنا دی تھیں۔ وہ ابھی تک اُس کے نازک نازک ہاتھوں، اُس کے رنگ، زلفوں، ہونٹوں اور دمکتے ہوئے رخساروں سے مبہوت تھیں۔ گو میری بہنیں بھی خوب صورتی میں کسی سے کم نہیں تھیں لیکن کورا کے آگے اُن کے چہرے گہنا گئے تھے۔
"بھائی جان! ہم انھیں اب جانے نہیں دیں گے۔ ان سے کہیے کچھ دن ہمارے گھر رہیں۔" میری چھوٹی بہن فرخ کہنے لگی۔
"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں بھی جھینپا جھینپا سا تھا۔ "تم انہی سے کہو یا پھر امین صاحب سے۔"
"آپ جائیں گی تو نہیں؟" میرے چھوٹے بھائی جہاں گیر نے معصومیت سے پوچھا۔
کورا کو جواب دینے میں مشکل پیش آئی۔ "نہیں۔" اُس نے جہاں گیر کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔
جہاں گیر اور فرخ امین کے پاس پہنچ گئے اور ضد کرنے لگے کہ وہ کورا باجی کو آج رات جانے نہیں دیں گے۔ والد صاحب نے انھیں سمجھایا کہ یہ پھر آئیں گے۔ امین نے فرخ اور جہاں گیر کو گود میں بٹھا لیا اور اُن سے وعدے کرنے لگا کہ ہم لوگ دوبارہ آئیں گے۔
میں گھر میں اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا، کبھی اس طرف کبھی اُس طرف۔ امی نے ایک پُرتکلف کھانے کا اہتمام کیا تھا، رات کے دس بجے تک

وہ دونوں موجود ہے۔ کورا کو یہاں لاکے احساس ہوا کہ میں اُسے اپنے لیے کہاں لایا تھا، اتنے لوگوں کی موجودگی میں اُس سے کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی پھر بھی دل مطمئن تھا۔ بوڑھے اجین نے چلتے وقت امی کے لیے قدیم طرز کا ایک قیمتی گلوبند دیا۔ والد صاحب کے شدید انکار کے باوجود بھی وہ نہیں مانا اپنا بقچہ جس طرح ویسے کے آیا تھا اُسی طرح واپس لے گیا جب کہ میرا خیال تھا کہ اُس میں کوئی تحفہ ہوگا جو وہ گھر جا کے والد صاحب کے حوالے کر دے گا۔ اُس میں ضرور کوئی ایسی قیمتی چیز تھی جو وہ خیمے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چلا گیا لیکن دوبارہ آنے کا وعدہ بھی کرتا گیا اُس کے جانے کے بعد گھر میں اُس کی اور کورا ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے خوشی تھی کہ والد صاحب نے اُس کی ذہانت اور شرافت کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ وہ بیلو بل بل کے اُس کی اعلا نسبی اور رسایتی حسنِ سلوک کا تذکرہ کرتے تھے، جب وہ ایسا کرتے تھے تو مجھے لگتا تھا جیسے وہ میری صفات بیان کر رہے ہوں۔

★

پھر تو اپنا کچھ یہ عالم ہوا کہ نیند ہی اُچاٹ ہوگئی۔ کتابوں میں جی نہیں لگتا تھا کتابیں کیا، کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ دوسرے دن بھی میں ایک دوست کے گھر کا بہانہ کر کے بدھ گیا پہنچ گیا۔ بوڑھا اجین گھر کی خیریت بہن بھائیوں کا حال پوچھنے لگا۔ کورا نے نام لے لے کے تمام گھر والوں کا حال احوال پوچھا۔ اُس کے کان میں وہی بالیاں لٹک رہی تھیں جو امی نے کل رات اُسے دی تھیں۔ چوڑیاں بھی وہ پہنے ہوئے تھی چُنری بھی اُس نے سر پہ ڈال رکھی تھی۔ اب میرا یہ معمول ہوگیا کہ کسی نہ کسی وقت موقع نکال کے بدھ گیا پہنچ جاتا۔ میلا شباب پر تھا۔ بدھ گیا کی رونق میں پہلے سے کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ پھر ایک رات کورا کے ساتھ والد صاحب سے ملنے آیا اور رات گئے واپس گیا۔ گزشتہ ایک ہفتے میں کئی بار میں نے کوشش کی تھی کہ کورا سے تنہائی میں ملاقات ہو جائے مگر مجھے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ بوڑھا بدھ گیا میں شاید خیمے میں رہنے کے لیے آیا تھا۔ وہ بہت کم باہر نکلتا، دن بھر اپنے خیمے میں پڑا رہتا اور باہر جاتا بھی تو جلد واپس آجاتا۔ پہلے والا تکلف ختم ہوگیا تھا اور اب ہم دونوں ایک دوسرے سے تم کہہ کے مخاطب ہوتے تھے۔

نویں دن مجھے ایسا موقع مل گیا جب اجین اپنی کسی ضرورت کے تحت شہر گیا تھا۔ کوئی بہت ہی اہم ضرورت ہوگی۔ خیمے کے اُوپر پردہ پڑا ہوا تھا، احتیاطاً میں نے اندر جھانک لینا مناسب سمجھا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہاں تنہا کورا موجود تھی۔ اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ "بابا کہاں ہیں؟" میں نے ناقابلِ یقین لہجے میں پوچھا جیسے اجین وہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو۔

"وہ کسی کام سے شہر گئے ہیں، دیر سے آئیں گے۔" کورا نے سادگی سے جواب دیا۔

"تم کھانا کھاؤ گے؟ باہر جانے سے پہلے بابا مجھے دے گئے تھے، میں نے ابھی تک نہیں کھایا ہے۔"

"ہاں، بشرطیکہ تم ساتھ کھاؤ۔" اُس نے چٹائی کا بنا ہوا دسترخوان بچھا دیا۔ چپتل پر سبزیاں اور ہلکی چٹنیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کے کھاتے رہے۔ "میں ایک ہفتے سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ تم سے تنہائی میں ملاقات ہو جائے۔"

"میں بھی۔"

"سچ؟" میں نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"کورا جب تم چلی جاؤ گی تو بہت اُداسی ہو جائے گی۔"

"ہم لوگ جانے ہی والے ہیں۔"

"کب؟" میرے ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔

"بابا کہہ رہے تھے اب تین چار دن میں ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ اُداسی سے بولی۔

"تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔" میں نے شکایتاً کہا۔

"کیا بتاؤں۔" وہ دُکھ سے بولی۔

"تمہارے بابا بھی... " میں کہنا چاہتا تھا کہ عجب پُراسرار شخص ہے۔ دن بھر خیمے میں گُھسا رہتا ہے حالانکہ اتنی دُور سے یہاں آیا ہے۔

"وہ میرے بابا نہیں ہیں۔"

"کیا؟" میرا نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ ....."

"میں نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ میرے بابا ہی ہیں لیکن میرے باپ نہیں ہیں۔" اُس کی آنکھوں میں اچانک آنسو لرزنے لگے۔

"کیا بات ہے، مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"میرا باپ مارا گیا۔" اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "وہ تبت کے ایک قبیلے کا سردار تھا۔ میرے چچا نے اُسے مار دیا۔ بابا اجین میرے باپ کا دوست بھی تھا اور مجھے پڑھاتا بھی تھا، جب ہمارا وہاں رہنا مشکل ہوگیا تو وہ مجھے لے کے ہندوستان چلا آیا۔"

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ بوڑھے اجین کے کسی طرزِ عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کورا کا باپ نہیں ہے۔ "تو کیا تم اب یہیں رہو گی ہندوستان میں؟"

"مجھے نہیں معلوم، وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹکتے۔ شہر شہر گھومتے رہتے ہیں۔" کورا نے معصومیت سے کہا۔

"ایسا کیوں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا صرف آنسو تھے۔ اُس نے خوب آنسو بہائے۔ میں اُسے دلاسا دیتا رہا۔ سمجھاتا رہا حالانکہ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی ایک جگہ قیام کیوں نہیں کرتا؟ میرا ذہن اُلجھ گیا۔ ابھی میں اسی گتھی میں اُلجھا ہوا تھا کہ غیر متوقع طور پر بوڑھا اجین وحشت زدہ انداز سے خیمے میں داخل ہوا۔ اُس کی بغل میں وہی بقچہ دبا ہوا تھا اور اُس کی سانس قابو میں نہیں تھی۔ "کوئی مجھے پوچھتا ہوا تو نہیں آیا تھا؟" اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" کورا نے اور میں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

"تھوڑی دیر ہوئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم سو کیوں رہی ہو؟" اُس نے کورا سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں، یہ کہہ رہی تھیں، ہم تین چار دن میں جا رہے ہیں۔ میں نے فہمیدہ اور فرخ وغیرہ کا ذکر کر دیا تو رونے لگیں۔"

اجین مسکرانے لگا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ "آپ شہر نہیں گئے بابا؟" کورا نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں درمیان سے لوٹ آیا، پیسے تو یہیں بھول گیا تھا۔"

"تو آپ نے گھر جا کے ابا سے لے لیے ہوتے۔"

"اوہ نہیں نہیں بابو! یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔"

"آپ تو غیریت برتتے ہیں، وہ آپ ہی کا گھر ہے۔"

"تم بہت اچھے لڑکے ہو، بہت یاد آؤ گے۔"

"آپ میلے تک تو ٹھہرتے، اتنی بھی کیا جلدی ہے؟"

بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ "بابو! میں ضرور ٹھہرتا مگر مجھے جلد ہی یہاں سے جانا ہوگا۔ شاید ہم آج کل میں چلے جائیں۔"

"کیوں؟ کورا تو بتا رہی تھیں کہ آپ تین چار دن اور رہیں گے۔ میں آپ سے کہنے والا تھا کہ ان دنوں کے لیے آپ انھیں ہمارے ہاں رہنے دیجیے۔ بہنوں نے بہت اصرار کیا ہے۔"

"ہم پھر آئیں گے بابو! پھر آئیں گے۔" وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔ "اب تو گیا میں بھی ہمارا ایک گھر ہے۔"

"نہیں نہیں، ہم آپ کو ابھی نہیں جانے دیں گے۔"

"اچھا دیکھو۔ کل بتائیں گے۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے ٹال رہا ہے لیکن میں اُسے کیسے روک سکتا تھا۔ اُسے ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔ مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا، بوڑھے نے صندوق سے چند کاغذات نکال کے انھیں غور سے دیکھنا شروع کر دیا تھا اور مجھ سے کچھ بے نیازی اختیار کر لی تھی۔ میں نے کورا کو اشارہ کیا اور اجین کو آداب کہتا ہوا چلا آیا۔ سات میل کا یہ سفر میں نے پیدل ہی طے کیا۔ تنہا تنہا، اُداس اُداس، نہ جانے گھر کیسے پہنچا۔ جاتے ہی میں بستر پہ گر گیا۔ امی لاکھ چیختی چلاتی رہیں۔ پھر انھوں نے آکے میرا ہاتھ دیکھا۔ میری آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور جسم گرم تھا۔ "وہیں گیا ہوگا بدھ گیا۔ نہ جانے کہاں کہاں کے لوگ روگ لگا کے وہاں آتے ہوں گے۔ بابو یہ بیماری وہیں سے لایا ہے۔"

امی سچ کہتی تھیں۔ میرا تو جسم ٹوٹ رہا تھا اور بدھ گیا ہی سے مجھے روگ لگا تھا۔ میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا، اُوپر کے کمرے میں پڑا ناجہاں میں پڑھتا تھا۔ بہنیں آئیں، بھائی آئے، ابا آئے۔ میں اُٹھ کے نہیں گیا۔

کوئی ایک بجے رات کو زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں، میں جاگا ہوا تھا، اس بے وقت دستک پر حیران رہ گیا پھر نیچے اُتر کے صحن میں پہنچا۔ ابا اور امی بھی جاگ گئے تھے۔ اتنی رات گئے کون ہمارے گھر آسکتا ہے؟ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کون ہو سکتا ہے؟ میں آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، سُن سے رہ گیا۔ میں سمجھا کہ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، اُس کا خیال تھا۔ وہی سامنے کھڑی تھی کورا کسی ہرنی کی طرح سہمی ہوئی دروازے پہ کھڑی تھی اور اُس کی بغل میں گٹھری دبی ہوئی تھی۔ مجھے دروازے پہ دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف لپکی چونکہ والد صاحب بھی پیچھے آگئے تھے، اس لیے میں ایک طرف ہوگیا۔ "تم؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "خیریت تو ہے؟" وہ ڈیوڑھی میں بار بار مڑ کے گلی میں جھانکنے لگی۔

"اندر آجاؤ۔" والد صاحب نے تذبذب کے لہجے میں کہا۔

"اجین صاحب کہاں ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"بتاتی ہوں۔" اُس نے نڈھال آواز میں کہا اور گھبرائی ہوئی اندر گھر میں آگئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ روشنی میں آئی تو سب اُس کی صورت تکنے لگے، اُس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی، آنکھوں میں وحشت بسی ہوئی تھی اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ لباس گرد میں اور چھوٹے چھوٹے پاؤں مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ گھر میں آتے ہی وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے محسوس کیا کہ امی اور ابا کے چہرے کبیدہ ہوگئے ہیں، امی کا انداز تو بڑا جارحانہ تھا۔ "کیا ہوا بیٹی؟ تم اتنی رات کو یہاں اکیلی کیسے آ گئیں؟ اجین صاحب کہاں ہیں؟" ابا نے بھاری آواز میں پوچھا۔

وہ ہچکیاں لینے لگی۔ "انھیں مار دیا گیا ہوگا۔"

"مار دیا گیا ہوگا؟" ابا نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔" خیمے میں ایک آدمی گھس آیا تھا، اُس کے ہاتھ میں چھُرا تھا، وہ بابا پر چڑھ گیا اور بابا نے مجھ سے کہا کہ بیٹی بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ۔ میں نے جلدی سے یہ سامان سمیٹا اور وہاں سے چلی آئی۔"

"میں بہت دُور تک بھاگتی رہی، پھر مجھے ایک تانگے والا مل گیا۔ میں نے اُسے بہت دُور چھوڑ دیا تاکہ وہ یہ گھر نہ دیکھ سکے پھر میں چھپتی چھپاتی یہاں آگئی۔ میرا کوئی گھر بھی نہیں ہے، دُنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

امی کو چاہیے تھا کہ وہ اُس کے سر پر ہاتھ رکھتیں اور اُسے سینے سے لگا کے کہتیں، یہ تمہارا گھر ہے مگر امی اور ابا بُت بنے کھڑے رہے۔ "تمھیں یہ کیسے یقین ہے کہ اجین صاحب مارے گئے؟" ابا نے کسی پولیس والے کے لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"اس کے ہاتھ میں چھُرا تھا۔ بابا خالی ہاتھ تھے اور کمزور تھے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ زہر بلا چھُرا ہوگا۔ وہ تبت ہی کا کوئی آدمی تھا۔ جب بابا نے مجھ سے یہ کہا کہ میں بھاگ جاؤں اور اپنے دوست کے پاس چلی جاؤں تو وہ

میری طرف جھپٹا لیکن بابا نے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ میں خیمے سے نکل کے اندھیرے میں کھڑی ہو گئی اور راستہ بدل کے سڑک کے کنارے بھاگتی رہی پھر مجھے تانگا مل گیا۔"

"ممکن ہے وہ زندہ ہوں۔"

"شاکیہ منی چاہیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

ابا خاموش گم سم سے ہو گئے پھر چونک کے بولے "تمھیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"مگر امین صاحب تو بہت شریف آدمی ہیں، اُن کے ایسے دشمن کیسے ہو گئے؟ وہ تو بہت...." ابا اُلجھتے ہوئے بولے۔

"ہم شہروں شہروں بھاگتے پھر رہے تھے، آخر اُس نے ہمیں پکڑ لیا۔ وہ بہت بُرے لوگ ہیں۔"

"کون بھاگتے پھر رہے تھے؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟" والد صاحب نے تشویش سے پوچھا۔ "پھر وہ یہاں بھی تو آ سکتے ہیں۔"

"آپ نہیں جانتے، وہ بہت بُرے ہیں، پتہ نہیں وہ کیوں بابا کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ویسے یہاں اُن کا آنا مشکل ہے کیونکہ بابا نے کسی سے آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا کہ ابا ایک معصوم لڑکی سے کیسے سوالات کر رہے ہیں۔ انھیں ایسے وقت تو خاموش رہنا چاہیے تھا مگر ابا بہت عجیب آدمی تھے۔ "اس میں کیا ہے؟"

"اس میں ہیرے جواہر اور کچھ کاغذات ہیں۔" کورا نے کہا۔

"ہیرے جواہر؟" والد صاحب نے اُس سے چھوٹی سی گٹھری لے کے وزن کیا۔ "یہ تو خاصی بھاری ہے۔" پھر وہ اُس کی اجازت کے بغیر گٹھری کھولنے لگے۔ کاغذات میں غالباً تبتی زبان میں آڑی ترچھی لکیریں بنی ہوئی تھیں، وہ کاغذات ایک دوسرے موٹے کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے۔ گٹھری میں وہ بقچہ بھی رکھا ہوا تھا جو امین اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ ابا نے بقچہ کھول کے دیکھا تو سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ روشنی میں جواہر جگ مگ کر رہے تھے۔ میں نے ابا اور امی کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں کے رنگ بار بار بدل رہے تھے، کبھی سُرخی، کبھی زردی، کبھی سفیدی۔ ابا نے انھیں خاموشی سے گٹھری میں باندھ دیا۔ "یہ تو بہت قیمتی ہیرے جواہر معلوم ہوتے ہیں۔ تمھاری اور ان کی حفاظت، دونوں مشکل کام ہیں، بہرحال اب تم آ گئی ہو تو اللہ مالک ہے، دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔" وہ لمبی سانس کھینچ کے بولے اور امی سے مخاطب ہوئے۔ "انھیں حفاظت سے رکھ دو۔"

امی نے گٹھری ہاتھوں میں لینے سے انکار کیا۔ ابا نے انھیں گھور کے دیکھا۔ وہ سہم گئیں اور جھجکتے ہوئے انھوں نے اُسے اُٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئیں۔ فہمیدہ بھی اُٹھ گئی تھی۔ ابا نے اُسے حکم دیا کہ وہ اپنے کپڑے کورا کو پہنا دے اور صبح اُسے اُوپر والے کمرے تک محدود رکھے تاکہ محلّے والوں کی نظریں اُس پر نہ پڑ سکیں۔ ہمارے محلّے کے مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ بعض کا تو چھتوں چھتوں راستہ تھا۔ اُوپر کے کمرے میں عموماً میں رہتا تھا۔ وہاں ایک پلنگ تھا اور میز کرسی موجود تھی۔ ایک الماری میں میری نصاب کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ فہمیدہ بھی سہمی ہوئی تھی۔ سبھی خاموش اور گم سم سے تھے۔ کورا کو فہمیدہ نے اپنا لباس پہنا دیا۔ صرف فہمیدہ ہی ایسی تھی جس نے اُس کے آنسو پونچھے اور میں نے ابا اور امی کے سامنے تسلّی اور تشفّی کے بہت سے جملے ادا کیے۔

فہمیدہ اُسے لے کے اُوپر کے کمرے میں چلی گئی اور میں نیچے آ گیا۔ نیچے ابا کورا کی عدم موجودگی میں آزادی سے تبصرہ کر سکتے تھے۔ "باہر!" انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔ "اس لڑکی کا انتظام جلد سے جلد کہیں اور کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ معاملہ اُلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے یہ یہاں سے چلی جائے ورنہ ہم کسی بڑی مصیبت میں گھر سکتے ہیں۔ اب تک زندگی میں جو عزّت اور مرتبہ حاصل کیا ہے، وہ سب خاک میں مل جائے گا۔ ہم اسے کہاں کہاں تک چھپائیں گے جب کہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ پولیس اسے ضرور ڈھونڈ رہی ہوگی۔ وہ یہاں بھی آ سکتی ہے۔"

"مگر ابا وہ ہماری پناہ میں آئی ہے۔" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر ہمیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اُس کے ساتھ قیمتی زیورات ہیں اور نہ جانے کس قسم کے کاغذات ہیں۔"

"ابا وہ سیدھی اور معصوم لڑکی ہے، ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"اس کی عمر ہی کیا ہے۔" امی نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اُس کی ہمّت تو دیکھو، سات میل کا سفر تنِ تنہا طے کرتی ہوئی آ دھمکی۔"

"زندگی بچانے کے لیے آدمی سات میل تو کیا ستّر ہزار میل بھی جا سکتا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"فمی کی ماں! کیا تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں ہو سکتیں، ہمیں پہلے سے کوئی فیصلہ کرنا چاہیے اور فیصلہ کرنے کے لیے جذبات کی نہیں، سکون کی ضرورت ہے، ممکن ہے یہ بچی کا محض گمان ہو کہ امین کو کچھ ہو گیا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ امین زندہ ہو؟ یا اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تعلقات محدود رکھنے چاہئیں ورنہ آدمی خواہ مخواہ پریشان ہو جاتا ہے۔"

"ابا صبح تک ہم انتظار کیوں نہ کریں؟ اُس وقت تک کورا کی حالت بھی سنبھل جائے گی اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ امین صاحب زندہ ہیں یا۔" میں نے اپنی زبان قابو میں کی۔

"نہیں وہ مر گئے، ٹھیک ہے صبح تک دیکھ لیتے ہیں مگر ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا۔" ابا یہ کہہ کے خاموش ہو گئے۔

میں اُن کے برابر ہی لیٹا ہوا تھا۔ آج وہ کورا میرے گھر میں تھی جسے گھر میں لانے کے لیے میں نے صرف چند روز میں اتنے خواب دیکھ لیے تھے کہ انھیں شمار کرنا بھی مشکل تھا۔ وہ ایک منزل اُوپر تھی، بہت ہی قریب مگر قریب تو وہ اُس دن سے تھی جب میں نے اُسے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ امین مجھے پہلے ہی کوئی غیر معمولی شخص معلوم ہوتا تھا، کورا کے بیان سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ وہ مارا گیا اور کورا اکیلی رہ گئی۔ اب کورا کا کیا ہوگا؟ اگر والد صاحب نے انکار کر دیا تو؟ اگر پولیس نے تفتیش کی تو؟ ابا کبھی یہ بات گوارا نہیں کریں گے۔ یہ گھر میرا ہے مگر یہ گھر تو ابا کا بھی ہے اور امّی کا بھی، میرا کیا ہے۔ کورا کے آنے سے اچانک جو خوشی ہوئی تھی، وہ چند ہی لمحے باقی رہی۔ اب تفکّرات نے ذہن پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُوپر کورا بھی نہیں سوئی۔ ابا بھی ساری رات کھنکارتے رہے اور میری نیندیں تو پہلے ہی اُچاٹ ہو چکی تھیں۔

ابا صبح نماز کے لیے اُٹھے تو انھوں نے مجھے جگا کے تاکید کی کہ میں بدھ گیا کی طرف نہ جاؤں۔ میں نے حامی بھر لی اور حسبِ معمول سیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ سیر کا تو نام ہے۔ جب سے کورا کو دیکھا تھا صبح کی خوب صورتی تر و تازگی اور شگفتگی کم نظر آنے لگی تھی۔ کورا بھی ایک صبح تھی، صبح کی طرح بیج، صبح کی طرح ملائم، شبنم کی طرح جھلملاتی ہوئی، ہرنی کی طرح خوش گوار، پھولوں کی طرح دل کش۔ والد صاحب کی تاکید کے باوجود میرے قدم خود بہ خود بدھ گیا کی طرف اُٹھ گئے۔ میرا ارادہ امین کے خیمے میں جانے کا نہیں تھا۔ صرف حقیقتِ حال جاننے کا ارادہ تھا۔ بدھ گیا کی رونق کا وہی عالم تھا، کہیں بھی کسی قسم کی تشویش کے آثار نہیں تھے۔ میں نے دُور سے دیکھا، امین کے خیمے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ کیا امین اندر موجود ہے؟ میں وہاں جاتے جاتے رہ گیا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو گھر ضرور آتا۔ پھر کیا قاتل اسے چھرا گھونپ کے فرار ہو گیا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ وہ اندر مُردہ پڑا ہے؟ مرنے سے پہلے اس کی چیخیں گونجی ہوں گی اور قریب کے خیموں کے لوگ جاگ گئے ہوں گے۔ موت کے وقت تو آدمی کو ضرور چیخنا چاہیے۔

مجھے اپنے چند طالبِ علم ساتھی مل گئے، اچھا ہوا کہ میں نے کسی سے کورا کا ذکر نہیں کیا تھا ورنہ وہ مجھ سے میرے مہمانوں کے بارے میں مزید پوچھتے۔ انھیں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ امین کے خیمے پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں بدھ گیا سے جلد ہی واپس آ گیا تاکہ والد صاحب کو شبہ نہ ہو جائے۔ گھر میں ابا اور امی کے چہروں پر ابھی تک تکدّر تھا اور اس میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو مجرم سا سمجھا۔ میرے پہنچتے ہی وہ مجھ سے پوچھنے لگے "کچھ پتہ چلا؟"

"کیسے پتہ چلتا؟" میں نے رُکھا سا جواب دیا۔

"تو پھر مر ہی گیا۔" ابا افسردگی سے بولے۔ "اگر وہ زندہ ہوتا تو اب تک کورا کی خبر لینے ضرور آتا۔"

"ممکن ہے کوئی اور مجبوری ہو۔"

"تم اس کا بندوبست کرو بھئی، مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" ابا ایسی اجنبیت سے بولے جیسے میرا اور اُس کا کوئی رشتہ نہ ہو۔

"آپ ہی بتائیے، کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے، ہمیں پولیس میں بتا دینا چاہیے یا مندر کے بڑے پروہت یا بدھ گیا کے منتظم کو صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔" ابا بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔

"ابھی سے کسی کو کیسے مطلع کر دیں؟ ہم کچھ انتظار بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"معاملات بگڑ سکتے ہیں۔" ابا نے متوحش ہو کے کہا۔

"کورا پولیس وغیرہ کا سامنا کس طرح کرے گی؟ ایک ایسی لڑکی جس کا کوئی سہارا نہیں ہے، اُسے ہم پولیس کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ تو ویسے ہی مر جائے گی۔" میں نے تندی سے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کیا جائے۔ ایک طرف اس لڑکی کا سوال ہے، دوسری طرف اپنی عزّت کا۔ اس لڑکی نے تو اچھی خاصی زندگی حرام کر دی اور اس کے فتنے وارث ہو صرف تم۔" وہ غصّے سے بولے۔

میں نے سوچا کہ ابا کی باتوں کا کیا جواب دوں؟ اُن کی نظر میں گھر گھر کی عزّت، خاندان، عقد اور برادری ہی سب کچھ ہے۔ میں کورا کی خیر خبر پوچھنے اُوپر چلا گیا۔ فہمیدہ اور دوسری بہنوں کے چہرے بہت تاباں نظر آ رہے تھے۔ وہ اُسے گڑیا کی طرح درمیان میں لیے بیٹھی تھیں۔ میرے آتے ہی کورا بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی مگر بہنوں کا خیال کر کے پھر سمٹ کے بیٹھ گئی۔ "یہ تمھارا ہی گھر ہے کورا! تمھیں گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ کسی چیز کی تکلیف تو نہیں ہے؟" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

"یہ ہم سے بول نہیں رہیں۔" فرخ نے شکایت کی۔

"ہاں ہم سے ناراض ہیں۔" جہاں گیر نے تلملا کے کہا۔

"نہیں، نہیں، ان کی طبیعت خراب ہوگی۔" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "تم لوگ انھیں پریشان کر رہے ہو گے؟"

کورا نے اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ "بہت شریر ہے۔"

اِدھر اُس کی پذیرائی کا یہ حال تھا، اُدھر ابا پر خفقانی دورے پڑ رہے تھے۔ شام تک وہ متعدد مرتبہ مجھے بُرا بھلا کہتے اور ہزار اندیشے ظاہر کرتے رہے۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ممکن ہے کورا ہی اپنے باپ کو قتل کرائی ہو اور امین اُس کا باپ نہ ہو۔

میں نے تائید نہیں کی کہ واقعی امین اُس کا باپ نہیں تھا مگر کیا وہ قتل کر سکتی ہے؟ ابا کو کیا ہو گیا تھا، انھوں نے میری زندگی تنگی میں مبتلا کر دی۔ شام کو میں ایک بار پھر بدھ گیا گیا۔ وہاں تو میلا لگا ہوا تھا، کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ابا کے تلخ اور ترش جملوں میں ایک رات اور گزر گئی۔ دوسرے دن دوپہر کو میرے ایک کلاس فیلو ہری شنکر نے مجھے بتایا کہ بدھ گیا کے ایک خیمے میں ایک شخص قتل کر دیا گیا ہے، ہری شنکر بدھ گیا ہی سے آ رہا تھا، تفصیل پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ امین ہی تھا۔ ہری شنکر کے بیان کے مطابق خیمے کے اردگرد پولیس لگی ہوئی تھی۔ یاتریوں میں دہشت پھیلنے کے خیال سے یہ واقعہ چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ پھر بھی بہت سے لوگوں کو معلوم ہو ہی گیا۔ "لوگ کہتے ہیں، اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی، لڑکی غائب ہے۔" ہری شنکر نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

میں نے چاہا، یہ اطلاع والد صاحب کو جا کے دے دوں لیکن پھر اُن کا کیا حال ہوگا؟ وہ اور گھبرا جائیں گے۔ گھر جاتے ہی مجھے امی کی انتہائی تلخ باتیں

سنتی پڑیں۔ "میں کہتی ہوں بابر! یہ لڑکی کب تک ہمارے گھر میں رہے گی؟ تمھیں کچھ پتہ نہیں، تمھاری جوان بہنیں بھی ہیں، اس کا اتا پتہ پوچھ کے اسے کہیں چھوڑ آؤ۔"

"چھوڑ آؤں گا، چھوڑ آؤں گا۔" میں نے غصے میں کہا۔

ایک دن، دو دن، تین دن، چوتھے دن ابا نے الٹی میٹم دے دیا۔ انھیں کہیں سے معلوم ہوگیا تھا کہ امین کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اوپر اب صرف فہمیدہ کو بھیجا جاتا تھا۔ کورا کو ویسے بھی کمرے میں بند رکھا گیا تھا۔ پڑوس والوں کی عورتیں آتیں تو فہمیدہ کو آواز دے کے بلا لیا جاتا۔ گھر میں ایک دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی تک مجھے کورا سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج رات ضرور اس سے ملاقات کروں گا لیکن وہاں فہمیدہ موجود ہوگی۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے ابا سے کہا۔ "میں کورا سے یہ کیوں نہ پوچھوں کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کا پتہ بتائے تاکہ انھیں مطلع کیا جا سکے۔"

"یہ بات تو میں خود پوچھ چکا ہوں مگر وہ تو کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتی، بس رونے لگتی ہے۔"

"میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے فہمیدہ کو وہاں سے ہٹا دیجیے۔" میں نے جرأت کر کے کہا۔

"کوشش کر لو مگر اسے یہ سمجھا دو کہ اسے جلد از جلد یہاں سے جانا چاہیے۔ کھانا پینا بھی ختم ہو گیا ہے۔ میں گھر سے باہر بھی نکل نہیں سکتا کہ نہ جانے میری عدم موجودگی میں کیا واقعہ پیش آ جائے۔"

"ٹھیک ہے، میں اس سے بات کر لیتا ہوں۔"

ابا نے فہمیدہ کو آواز دے کے نیچے بلا لیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میری حالت دگرگوں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا کوئی نہیں ہے، کورا سے تنہائی میں ملنے کا خیال بھی مجھے وحشت میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ میں اس سے کیا کہوں گا اور وہ کیا جواب دے گی؟ تسلی و تشفی کے لیے میرے پاس چند جملے تک نہیں تھے۔ میں اوپر پہنچا تو کورا کو پھر رونا آ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی قمیص سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ "روتی کیوں ہو کورا!" مجھے خود بھی رونا آ گیا۔

"میں نے گھر والوں کو بہت پریشان کر دیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کورا! کاش میں بڑا ہوتا۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن اب بھی کیا ہے، میں دنیا بھر کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میں نے سوچا ہے میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ "نہیں نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں، میں جانتا ہوں کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔ وہ کون شخص تھا جس نے بابا کو قتل کر دیا؟ ممکن ہے تم نے کچھ باتیں والد صاحب سے چھپائی ہوں اور صرف مجھے بتانا چاہتی ہو۔"

"وہ انھی لوگوں میں سے کوئی تھا جو میرے چچا کے دوست ہیں، وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں، کچھ کاغذات حاصل کرنا چاہتے ہیں جو میں نے ابا کو لا کے دیے ہیں۔"

"وہ تمھیں کیوں مارنا چاہتے ہیں اور وہ کاغذات کیسے ہیں؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔ "اور یہ زیورات کس کے ہیں؟"

"یہ زیورات ہمارے ہیں، میرے۔ بابا امین نے چلتے وقت انھیں اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ کاغذات میں بھی کوئی خاص بات ہے جو مجھے نہیں معلوم مگر امین بابا بار بار انھیں دیکھتے تھے اور کسی سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ وہ لوگ مجھے اس لیے مارنا چاہتے ہیں کہ اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کی سرداری کی حق دار میں ہوں۔ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ اگر کسی سردار کے ہاں صرف لڑکی پیدا ہوئی ہو تو وہ ولی عہد مقرر ہوتی ہے مگر اسے اس وقت تک سرداری نہیں سونپی جاتی جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے، پھر اس کا شوہر اس کے نام پر سرداری کرتا ہے۔ میرے باپ بہت رحم دل اور نیک تھے۔ قبیلے میں کئی شادیاں کرنے کا رواج ہے مگر انھیں ایک ہندو عورت یعنی میری ماں سے محبت ہو گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے ان کے سوا کسی سے شادی نہیں کی۔ میری ماں میری پیدائش پر مر گئیں پھر میرے باپ نے شادی نہیں کی اور مجھے پرورش کرتے رہے۔ انھوں نے قبیلے کے سب سے دانا شخص امین کو میرا اُستاد مقرر کیا۔ قبیلے کے سبھی لوگ ان کے انصاف اور رحم کے باعث ان سے محبت کرتے تھے مگر میرے چچا نے انھیں مار دیا اور خود سردار بن بیٹھا۔ پھر اس نے مجھے بھی مارنا چاہا کیونکہ میری شادی ہو جانے پر اُسے سرداری چھوڑنی پڑے گی۔ ہمارا قبیلہ بہت بڑا ہے۔ ہماری کئی بستیاں ہیں، پکے مکانات ہیں، سڑکیں ہیں، اسے جانگ قبیلہ کہتے ہیں۔" یہ سب باتیں کورا نے اٹکتے اٹکتے شکستہ لہجے میں بیان کیں۔ "وہ بری طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، مجھے بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کاغذات پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ تمھیں حاصل نہیں کر سکیں گے۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "تم اب قطعی محفوظ ہو، میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ بہت دُور لے جاؤں گا۔ میں تمھاری خاطر سب کو چھوڑ دوں گا۔"

"میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی، مر جاؤں گی۔"

"تو میں بھی مر جاؤں گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟" وہ سادگی سے بولی۔

"تم ایسا کرو کہ آج رات جاگتی رہو۔ صبح پانچ بجے یہاں سے ایک گاڑی جاتی ہے، میں تمھیں فہمیدہ کا برقع دے جاؤں گا، تم برقع پہن کے میرے ساتھ چلنا۔"

"نہیں، کوئی دیکھ لے گا، رات کے وقت نکلنا مشکل ہوتا ہے۔"

"دن کے وقت نکلنا کون سا آسان ہوتا ہے، محلے میں سبھی تمھیں دیکھیں گے مگر تم تو برقع پہنے ہوئے ہو گی۔ کون سمجھے گا کہ تم جا رہی ہو یا میری کوئی بہن جا رہی ہے۔ میں اپنی بہن کے ساتھ اکثر جاتا رہتا ہوں۔ ہم تانگے پر پردہ ڈال دیں گے لیکن دن میں گھر سے کیسے نکلیں گے۔ رات کو گاڑی کے وقت تو سبھی نکلتے ہیں۔ میں ایک سوٹ کیس میں کپڑے تیار رکھوں گا اور کچھ نقدی اکٹھی کرنی ہو گی، زیورات تو ہمیں لے جانے چاہئیں۔"

وہ منع کرتی رہی اور سوچتی رہی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ رات کو وہ میری ہلکی سی دستک پر اٹھ بیٹھے۔ نیچے آ کر میں نے والد صاحب سے کہا۔ "اس کا کوئی عزیز موجود نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ اشتعال میں بولے۔

"وہ یہی کہتی ہے۔"

"اُسے بکنے دو۔" انھوں نے ڈپٹ کر کہا۔

"مجھے تو وہ بڑی حرافہ معلوم ہوتی ہے، میں کہتی ہوں اُس سے صاف کہہ دو کہ وہ اپنا ٹھور ٹھکانا ڈھونڈے ورنہ نکال باہر کرو۔" امی نے کہا۔

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

دن کے وقت چپکے سے میں نے فہمیدہ کے کپڑے چرا لیے، کچھ اپنے کپڑے رکھے اور ایک سوٹ کیس تیار کر لیا۔ میں نے یہ کام کئی گھنٹوں میں کیا۔ پھر میں نے وہ مالا بھی رکھ لی جو امین نے مجھے دی تھی۔ یہ سب کام ہو گیا، اب مجھے رات کا انتظار تھا۔ میری عمر خاصی کم تھی۔ رات کو ایک برقع پوش لڑکی کے ساتھ گھر سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ کوئی بھی جاننے والا دیکھ سکتا تھا مگر ان تمام اندیشوں کے باوجود مجھے رات کا انتظار تھا۔ یہ گھر پہلے بھی میرا کب تھا؟ اسے تو مجھے کبھی نہ کبھی خیرباد کہنا ہی تھا۔ اب امی رویا کریں، ابا تلملایا کریں، بہنیں یاد کیا کریں۔

آدھی رات کے بعد میں گھڑی دیکھ کے اٹھا، سب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ننگے پیر چل کے سوٹ کیس اٹھایا اور دروازے کے پاس رکھ دیا۔ رات کو کنڈی میں نے کھلی رہنے دی تھی۔ پھر میں اوپر گیا اور ہلکی سی دستک دی۔ کورا فوراً اٹھ کے باہر آ گئی اور مجھ سے منتیں کرنے لگی کہ میں اپنے ارادے سے باز آ جاؤں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ فہمیدہ کے سینڈل بھی میں نے سوٹ کیس میں رکھ لیے تھے۔ وہ ننگے پیر ہی نیچے آئی۔ "برقع اوڑھ لو۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ اسے برقع اوڑھنا نہیں آتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اس کی مدد کی۔ پھر ہم دونوں رینگتے ہوئے نیچے آئے اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ڈیوڑھی میں آ گئے۔ سوٹ کیس اٹھا کے میں نے دروازہ آہستگی سے کھولا اور کورا کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر نکل آیا۔ باہر آ کے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سوٹ کیس کھول کے فہمیدہ کے سینڈل اسے پہنا دیے۔ پھر دوبارہ دروازہ بند کر کے ہم احتیاط سے سڑک پر آ گئے۔ میں نے شیروانی پہن لی تھی تاکہ میری عمر سولہ سترہ سال سے کسی قدر زیادہ معلوم ہو، برقعے میں کورا کی عمر چھپ گئی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ ہم اندھیرے میں پھسلتے ہوئے خاصی دُور نکل آئے، کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں بھاگتے رہے۔

گلیاں جانی پہچانی تھیں۔ میں ان گلیوں سے ہزاروں بار گزرا تھا۔ مگر اس وقت بڑی عجیب اور ڈراؤنی محسوس ہو رہی تھیں۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی تو ہم سانس روک کے اندھیرے کی آڑ میں ہو جاتے۔ پتا کھڑکتا تو دل لرز جاتا۔ ہم گھر سے خاصی دُور نکل آئے تھے مگر ابھی تک ہول طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ہر قدم پر کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔ ہمیں خود اپنی آوازوں اور آہٹوں سے خوف آ رہا تھا۔ گلیوں میں اونگھتے ہوئے کتے قدموں کی ہلکی چاپوں سے بیدار ہو جاتے اور غلط انداز نگاہ ڈال کر دوبارہ پیروں میں سر رکھ کے سو رہتے۔ جب وہ غرّانے لگتے تو ہم خاموشی سے کھڑے ہو جاتے اور انھیں ہم پہ ترس آ جاتا۔ کورا مجھ سے زیادہ سہمی ہوئی تھی۔

"گھر واپس چلو۔" اُس نے ایک جگہ میرا ہاتھ روک کر منت کی۔

کئی بار خود میرے ذہن میں گھر واپس جانے کا خیال آیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گھر میں سب سو رہے ہوں گے، ہم بڑی آسانی سے واپس جا سکتے تھے۔ اور اس اذیت سے نجات پا سکتے تھے، کوئی بھی ہمیں دیکھ لیتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا، ہم تو کہیں کے نہ رہتے۔ غم اور غصے میں ابا تو مہینوں تک کھانا بھی نہیں کھاتے، کورا پولیس کے سپرد کر دی جاتی۔ "نہیں۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اب تھوڑا سا راستہ رہ گیا ہے۔" میں نے جھوٹ کہا تھا۔ گلی کے نکڑ سے اسٹیشن کا راستہ دو میل کے قریب تھا اور یہ دو میل ہمارے لیے دو سو دو ہزار میلوں سے کم نہیں تھے۔

آگے بڑھتے، رکتے، چھپتے، راستہ بدلتے ہم وہاں تک پہنچ گئے جہاں تانگا ملنے کا امکان تھا۔ کوچوان، گھوڑا اور تانگا سب غنودہ تھے۔ میں نے ہمت کر کے ایک تانگے والے کے اونگھتے ہوئے جسم پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ "کہاں جانا ہے؟" اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے بے دلی سے پوچھا۔

"اسٹیشن۔" میں نے اپنی آواز بھاری بنانے کی کوشش کی۔

"مجھے اُدھر نہیں جانا، دوسرے تانگے والے سے پوچھ لیجیے۔" یہ کہہ کے اُس نے ایک جماہی لی اور پھر سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"کتنے پیسے لوگے؟" میں نے اُس کی بات نظرانداز کر کے کہا۔

"میں نے آپ سے کہہ دیا بابوجی! مجھے اُدھر نہیں جانا۔"

"دو روپے لوگے؟"

اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور اُس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "تین روپے دیں گے بابوجی؟ رات کا وقت ہے، گھوڑا تھکا ہوا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے اُس سے حجت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ یہاں سے اسٹیشن تک کا یہ بہت زیادہ کرایہ تھا لیکن اُس وقت وہ مجھ سے سو روپے بھی طلب کرتا تو میں اُسے دینے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ہم تانگے میں بیٹھے تو [illegible] کچھ کم ہوئی۔ دل قابو میں آنے لگا۔ رات کے وقت سڑک پر صرف ایک شور تھا۔ تانگے اور کتوں کا شور۔

"کہاں جائیں گے بابوجی؟" تانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگاتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ راستے میں تانگے والا اپنی عادت کے مطابق سوال و جواب ضرور کرے گا، گھوڑے کو برا بھلا کہے گا اور بڑبڑاتا رہے گا۔ اُس کے سوال پر میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟

کسی اور شہر کا نام ذہن میں نہیں آیا۔ میں نے مختصراً کہا: "کلکتے۔"

"گاڑی پونے پانچ بجے آتی ہے مگر آج کل سالی گاڑیوں کا کیا اعتبار، ابھی کل ہی، ایک آدھے دن لیٹ آئی تھی۔" وہ میری ہُوں ہاں سے بے نیاز اپنی زبان ہلاتے جا رہا تھا۔ "زمانہ خراب آگیا ہے بابوجی! کسی چیز کا ٹیم نہیں رہا۔ اب دیکھیے آپ کو کب تک انتظار کرنا پڑے۔"

میں نے اس درمیان کورا سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ برقع میں اُس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اُس کا چہرہ زرد پڑا ہوگا، ہوائیاں اُڑ رہی ہوں گی۔ وہ مُڑ مُڑ کے برقع کی جالی سے مجھے دیکھتی تھی اور کسمسانے لگتی تھی۔ اس سیاہ مضبوط سڑک پر گھوڑے کے نعل کی آواز آج مجھے بہت بُری معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں خود ایک سڑک ہوں اور گھوڑا مجھ پر دوڑ رہا ہے۔ گھوڑے کا ہر بڑھتا ہوا قدم فاصلہ کم کر رہا تھا لیکن راستہ ہی آج طویل ہو گیا تھا۔ "تیز چلاؤ۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

"ہوا سے باتیں کر رہا ہے بابوجی! اور ابھی گاڑی آنے میں بھی بہت دیر ہے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وقت پر پہنچا دوں گا۔" کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ یہی عذاب ناک کیفیت، تانگے والے کو میری خاموشی پسند نہیں آئی چنانچہ اس نے پیچھے ایک نظر ڈال کے پہلے برقع پوش کورا کو دیکھا پھر مجھے اور کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "ساتھ میں آپ کے گھر سے ہیں؟"

کوئی اور موقع ہوتا تو میں کہتا، تیری بہن ساتھ ہے! یہ ایک غیر متعلق اور بے ہودہ سوال تھا لیکن مجھے خوش اخلاقی کا ثبوت دینا تھا۔ میں نے بہ مشکل تمام ہنستے ہوئے کہا۔ "بھابی ہیں، میکے آئی تھیں، اب واپس جا رہی ہیں، بھیا کو چھٹی نہیں مل سکی اس لیے میں لے کے جا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" تانگے والا بولا۔ "بھائی کیا کام کرتے ہیں؟"

"انجینئر ہیں، عمارتیں ہیں نا کلکتے میں بڑی بڑی، وہ سب وہی بناتے ہیں۔ بہت بڑے انجینئر ہیں، کلکتہ کبھی دیکھا ہے؟" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"نہیں جناب بس سنا ہی سنا ہے۔" وہ آہ بھر کے بولا۔ "سنا ہے بڑا ظالم شہر ہے، آدمیوں کا جنگل ہے، وہاں ہر وقت روشنی رہتی ہے اور لوگ جاگتے رہتے ہیں، کلکتے کے بہت سے لوگ گیا آتے ہیں تو اُنھی سے اُس شہر کے بارے میں سُن لیتا ہوں، بہت بار ارادہ کیا جانے کا مگر ....." وہ ایک مصرع گنگنانے لگا۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی...."

کلکتے کا ذکر بہت سود مند ثابت ہوا۔ گو میں نے خود کلکتہ نہیں دیکھا تھا مگر میں اُسے اُس شہر کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں کر کے چونکاتا رہا۔ آخر اسٹیشن تک راستہ کٹ ہی گیا۔ اُسے مجھ سے میرے سفر اور کورا کے متعلق کوئی سوال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یقیناً یہ بات اُس کے لیے حیرت انگیز ہوگی کہ میکے سے واپس جانے والی کسی لڑکی کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر کوئی نہیں آیا مگر ممکن ہے، میکے میں اُس کے تمام رشتے دار ضعیف ہوں، بیمار ہوں، اس کا دیور تو بہر حال اس کے ساتھ ہے۔ اسٹیشن کے باہر عمارت میں تیز روشنی تھی۔ میں نے پہلے ہی جیب سے تین روپے نکال کے ہاتھ میں رکھ لیے تھے تا کہ تانگے والے سے کوئی اور گفتگو نہ ہو سکے۔ اُترتے ہی میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس نے مجھے دُعائیں دیں۔ کئی قلی ہماری طرف دوڑے مگر میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس دیکھ کے ٹھٹک گئے۔

میرے لیے گھر سے باہر قدم نکالنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا، میں والد صاحب کے ساتھ قریب کے شہروں میں کئی بار جا چکا تھا۔ گھر سے اسٹیشن تک آنے کا مشکل مرحلہ گزر چکا تھا، اب مجھے کہیں لوگوں کی نظروں سے بچ کے گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ میری کوئی منزل نہیں تھی، کہاں جاؤں؟ کون سے شہر میں اُتروں؟ میں یہ طے کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ قریب کے کسی شہر میں جانا مناسب نہیں تھا۔ ہر پھر کے ایک ہی شہر ذہن میں آیا اور وہ تھا کلکتہ۔ تانگے والے سے گفتگو کر کے مجھے کورا کے ساتھ سفر کرنے کی دشواریوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ہر آدمی چہرے پر لکھی ہوئی عمر دیکھتا ہے۔ ذہن کی بھی ایک عمر ہوتی ہے مگر وہ نظر نہیں آتی، ہزاروں بوڑھے بچے ہوتے ہیں اور بچے بوڑھے ہوتے ہیں۔ میں زندگی کے بارے میں ہر چیز جانتا تھا۔ میں نے کتابیں پڑھی تھیں اور بہت کچھ سوچتا رہتا تھا، میرا ذہن خیالوں اور خوابوں کا کارخانہ تھا۔ روز مجھے ہزاروں خواب دکھاتا تھا، ہزاروں تصورات اس میں ڈھلتے تھے۔ کورا کا چہرہ برقع میں چھپ گیا تھا، قد اُس کا پہلے ہی نکلا ہوا تھا۔ کوئی قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اندر ایک نوخیز لڑکی ہے۔ میں نے بھی شیروانی اسی لیے پہنی تھی کہ میرا قد بھی نکلتا ہوا تھا مگر میں کورا کی طرح برقع نہیں پہن سکتا تھا۔ میں آواز چاہے کتنی ہی بھاری بنا لیتا، چہرے پر سنجیدگی کی کتنی ہی تہیں جما لیتا اور چال میں کتنا ہی وقار پیدا کر لیتا، میرے چہرے پر عمر صاف لکھی ہوئی تھی۔ میں اسٹیشن کی روشنیوں سے بچتا ہوا بکنگ آفس پہنچا اور کلکتے کے دو ٹکٹ خرید کے تیزی سے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ یہاں قلی اپنی سُرخ چادریں بچھائے اونگھتے یا لیٹے ہوتے تھے۔ ابھی چار بجے تھے اور گاڑی آنے میں پون گھنٹا باقی تھا۔ بکنگ کلرک نے بتایا تھا کہ آج گاڑی وقت پر آ رہی ہے، پلیٹ فارم پر تیز روشنیاں نہیں تھیں، میں دور ایک دھیمی روشنی کے نیچے دھری ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا اور میں نے کورا سے کہا کہ وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹانے کی غلطی نہ کرے۔

بہت ممکن تھا کہ محلے کا کوئی شخص، کوئی رشتے دار یا کوئی شناسا بھی آج کی گاڑی سے کلکتے جا رہا ہو۔ اس لیے میں پلیٹ فارم سے ہٹ کر ایک سنسان بنچ پر چھپا بیٹھا تھا اور میں نے اپنا چہرہ اس طرح جھکا لیا تھا جیسے مجھ پر نیند کا غلبہ ہو، مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ بدھ گیا کے یاتریوں کو لینے کے لیے آنے والے رضا کار طالب علم اس طرف نہ آ جائیں۔ جب تک گاڑی گیا کے اسٹیشن سے حرکت نہ کرتی، میرے لیے سکون محال تھا۔ شیروانی کے اندر سارا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" کورا کی سہمی ہوئی کمزور آواز اُبھری۔

"بہت دُور۔ جہاں کوئی ہمارے پیچھے نہ آ سکے۔" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم کلکتے چل رہے ہیں کورا! ابھی کچھ دیر میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے، پھر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔"

"اب بھی ہم گھر واپس چل سکتے ہیں۔" کورا کے لہجے میں لرزہ تھا۔

"اب تو چلے آئے ہیں۔ اب گھر کا خیال چھوڑ دو کورا! ہم اپنا ایک گھر علیحدہ بنائیں گے۔ ٹھیک ہے، اب جو کچھ بھی ہو۔"

"بابر!" اُس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ہمت رکھو کورا! دنیا بہت بڑی ہے۔" میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی حالانکہ میری حالت خود دگرگوں تھی۔ میں ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔

"گھر والے کیا سوچیں گے، وہ سب بہت روئیں گے۔"

"رونے دو، انھیں کون سی میری فکر تھی۔ رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں گے۔ سمجھ لیں گے کہ میں مر گیا، یا میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔"

"سب مجھے بُرا بھلا کہیں گے۔ میں ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہوں۔"

"کورا ایسی باتیں مت کرو، تم نہ آتیں تب بھی شاید میں کسی دن وہ گھر چھوڑ دیتا۔ اب اُن کا ذکر مت کرو۔"

ایک قلی کے قریب آنے کی آہٹ ہوئی تو میں نے سر جھکا لیا، کورا بھی چپ ہو گئی۔ قلی نے ہماری بنچ پر آ کے کہا۔ "بابوجی! جگہ چاہیے؟"

"نہیں۔" میں نے گردن جھکائے جھکائے جواب دیا۔

"اس گاڑی میں جگہ ملنی مشکل ہوتی ہے۔" قلی نے حجت کی۔

"نہیں بھائی! ہم خود جگہ تلاش کر لیں گے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

قلی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ یہاں کے قلیوں کا یہی حال تھا۔ وہ جگہ فراہم کرنے کے بہانے ایک دو روپے اینٹھ لیتے تھے۔ گاڑی میں اتنی ہی جگہ ہوتی تھی جتنی ہو سکتی تھی۔ قلی جگہ کھینچ کے بڑی نہیں کر سکتا تھا۔ مستورات کے لیے گاڑی میں علیحدہ ڈبے ہوتے تھے، میں نے سوچا کورا کو وہاں بٹھا دوں گا تو وہ بڑی محفوظ رہے گی، خود میں اسٹیشن پر اُتر کے اُس کی خیریت دریافت کرتا رہوں گا مگر مستورات کے ڈبے میں کورا کا نقاب اُٹھانا لازمی تھا اور عورتوں کا پوچھ گچھ کرنا بھی یقینی تھا۔ کورا کی ہندوستانی خاصی صاف تھی مگر اتنی بھی نہیں۔ بہر حال ہندوستان میں ہر جگہ مسلمان عورتیں صاف اُردو یا ہندوستانی نہیں بولتیں لیکن ڈر یہ تھا کہ اگر ڈبے میں کوئی مسلمان عورت ٹکر گئی اور اُس نے اِدھر اُدھر کے سوالات شروع کر دیے تو کورا کیا جواب دے گی۔ اُسے مردانے میں اپنے پاس بٹھانے میں بھی خطرہ تھا۔ ڈبے میں تمام لوگوں کی نظریں اس برقع پوش لڑکی پر جم جائیں گی اور خواہ مخواہ کی اُلجھنیں پیدا ہوں گی۔ ایک برقع پوش مسلمان لڑکی کا مردانے ڈبے میں سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں اس شش و پنج میں گرفتار رہا جیسے جیسے گاڑی آنے کا وقت قریب آ رہا تھا، پلیٹ فارم کی زندگی کھلنے لگی تھی۔ قلیوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ کسی آوارہ انجن کی تیز سیٹیوں کی آواز آتی، یا اُس کی تیز روشنی نظر آتی تو گمان ہوتا جیسے گاڑی آ گئی ہے، مسافروں میں بدھ راہب اپنے مخصوص لباس میں علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ گاڑی آنے کے وقت تک اسٹیشن پر خاصا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ مجھے چند طالب علم بھی نظر آئے۔ میں اپنی بنچ سے اُٹھ کر جنگلے کے قریب اندھیرے میں ہو گیا کیونکہ کئی دکان دار اور شناسا چہرے اسٹیشن پر گشت کر رہے تھے۔ کورا اکیلی بنچ پر بیٹھی رہی۔ یہ بہت کرب ناک وقت تھا، کم بخت گاڑی نہ جانے کہاں اٹک گئی تھی۔ جب پلیٹ فارم پر ٹہلنے والوں کی بھیڑ بڑھ گئی اور بہت سے لوگ ہوس ناک نظروں سے کورا کے ارد گرد منڈلانے لگے تو میں اندھیرے سے نکل کے بنچ پر آ گیا۔ بھیڑ خود بخود چھٹ گئی۔ میں ایک طرف غور سے دیکھنے لگا جیسے کسی کے آنے کا انتظار ہو، جیسے ابا ٹکٹ لینے گئے ہوں اور بیٹے اور بیٹی کو یہاں بٹھا گئے ہوں۔ کورا کے چمکیلے ہاتھ برقع سے جھلک رہے تھے، اُس کے خوب صورت پیر بھی سیاہ لباس میں صاف نظر آ رہے تھے۔

جب بھی ہم طالب علم اسٹیشن آتے اور کسی برقع پوش عورت کو دیکھتے تو سب سے پہلے اُس کے پیروں پر ہماری نظریں جاتیں، پیروں اور ہاتھوں سے اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی گوری ہوگی اور گوری ہوگی تو اُس کا چہرہ کتنا دل کش ہوگا۔ اب یہی صورت میرے ساتھ تھی، ہم پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر بھی لوگ یہاں تک آ جا رہے تھے، انھیں کون روک سکتا تھا کہ اس طرف مت آؤ، اس طرف مت دیکھو، جب وہ اس طرف سے گزرتے تو کورا کی جانب گردن موڑ کے ضرور دیکھتے۔ میں نے تصور تصور میں اُن میں سے بعضوں کی آنکھیں پھوڑ دیں۔

کسی کو کیا خبر تھی کہ برقع میں ایک شہزادی بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر وہ نقاب اُٹھا دے تو اسٹیشن پر بجلی گر جائے، اور سب کچھ تلپٹ ہو جائے۔ یہ احساس کہ میرے پاس ایک خزانہ موجود ہے، حُسن و جمال کا خزانہ، ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی۔ یہی احساس مصائب و ابتلا کے وقت میرا سہارا بنا ہوا تھا۔ احتیاطاً میں نے ابا کا ایک تیز دھار والا رام پوری چاقو بھی سامان میں رکھ لیا تھا، یہ چاقو دستے کے اوپری حصے پر لگا ہوا پیتل کا ایک چھوٹا سا کھٹکا دبانے سے کھٹ سے کھل جاتا تھا۔ ابا قربانی کے موقع پر اسے عموماً استعمال کرتے تھے۔ میں نے سوچا یہ چاقو بنچ کی لکڑی میں اپنے اور کورا کے درمیان گاڑ دوں۔

میں اسی طرح کی باتیں سوچتا رہا کیونکہ آنے جانے والوں کی نظریں ناقابلِ برداشت ہو گئی تھیں۔ مجھے غصہ تھا، خوف تھا، غم تھا، مجھ پر متضاد کیفیتیں غالب تھیں۔ اسٹیشن پر سنسناہٹ ہونے لگی، گاڑی کی آمد کا غلغلہ ہوا، مغرب کی طرف سے آنے والی گاڑی کی روشنی ایک ہلکے سے نقطے کی صورت میں اُبھری، یہ نقطہ بتدریج بڑھتا گیا۔ سب لوگ گاڑی کی طرف جھپٹ پڑے، میں بھی سوٹ کیس اُٹھا کے بنچ سے اُٹھا مگر میں نے اتنی وحشت کے بجائے

تحمل سے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا، مستورات کے ڈبے کے اوپر ایک عورت کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ رات کے وقت وہ تصویر روشن ہو جاتی تھی۔ میں نے گاڑی پر ایک سرسری نظر ڈالی، لوگ ڈبوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے، جانے والوں کو بھی جلدی تھی، آنے والوں کو بھی۔ گاڑی وہاں کوئی پندرہ منٹ ٹھیرتی تھی مگر لوگ بہت دیوانگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے ویسے بھی سوار ہونے میں تاخیر کی تاکہ بدھ یاتریوں کی رہبری کے لیے آنے والے رضا کار طالب علم اسٹیشن سے نکل جائیں۔

ہمارے سامنے عورتوں کا کوئی ڈبا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کورا کو اشارہ کیا اور تیزی سے انجن کی طرف جانے لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے ڈبے ڈھونڈتے ہوتے آگے بڑھ رہے تھے اور ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ قدم کس بے ترتیبی سے پڑ رہے ہیں۔ اچانک کسی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کورا مجھ سے پیچھے تھی۔ وہ وہیں ٹھٹک گئی جہاں کھڑی تھی۔ ایک لمحے میں جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھالا، وہ میرا کلاس فیلو جگ دیش تھا۔ "کہاں؟" اس کی آواز مجھے زہر لگی۔

"کچھ نہیں ذرا بردوان تک، دو تین روز میں آ جاؤں گا۔" میں نے گڑبڑا کے جواب دیا۔ "تم نے کہیں میرے چھوٹے بھائی کو تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، کیا وہ نہیں مل رہا ہے؟" اس نے ہمدردی ظاہر کی۔

"شاید ماموں کے ساتھ ہو۔ ممکن ہے ماموں کو کہیں اور جگہ مل گئی ہو۔ میں انھی کو تلاش کر رہا ہوں۔"

اس نے میری بوکھلاہٹ محسوس کر لی تھی۔ قریب ہی سہمی ہوئی کورا کھڑی تھی۔ "سسٹر؟" اس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"ہاں، اب تم ایسا کرو جگ دیش! ذرا گاڑی کے اس سرے تک چلے جاؤ، ممکن ہے چھوٹا بھائی تمھیں نظر آ جائے۔ میں ادھر دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کے میں نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا۔ جگ دیش ڈبوں میں جھانکتا ہوا مجھ سے دور ہوتا گیا۔ سب سے آگے کے ڈبوں میں عورتوں کا ڈبا بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے رک کر کورا سے کہا کہ وہ کسی سے بات نہ کرے۔ گونگی اور بہری بنی رہے۔ کورا میری نصیحت گرہ میں باندھ کے سر ہلاتی ہوئی ڈبے میں داخل ہوئی۔ خوش قسمتی سے جگہ کم نہیں تھی، میرے اندازے کے مطابق اُن میں مسلمان عورتیں بھی موجود تھیں۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کورا کے پہنچنے پر سبھی نے منہ بنایا کیونکہ وہ اُن کی نیند میں خلل کا سبب بنی تھی۔

میں نے عورتوں کے برابر کے ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر مسافروں نے مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ میں چیختا چلاتا رہا۔ انھوں نے سامان ہی دروازے کے نزدیک رکھ دیا تھا تاکہ دروازہ آسانی سے نہ کھل سکے۔ "جگہ نہیں ہے کوئی اور ڈبا دیکھو۔" ایک گرج دار آواز آئی۔

"جناب! میں کھڑا ہو کے سفر کر لوں گا۔" میں نے التجا کی۔

"دوسرا ڈبا دیکھو میاں!" ایک مولوی صاحب نے کہا۔

"جناب! مجھے بس ذرا سی جگہ چاہیے۔ میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔ گاڑی چلنے والی ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے آرام میں مخل نہیں ہوں گا۔"

"میاں! آپ سے کہہ رہا ہوں، یہاں بالکل جگہ نہیں ہے۔"

"مولوی صاحب! کچھ تو انسانی ہمدردی کیجیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"کہاں اُترنا ہے بالک؟" ایک نسبتاً نرم آواز نے پکارا۔

"جناب! جانا تو دور ہے مگر میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔"

ڈبے میں بھن بھناہٹ ہوئی۔ مسافر کسمسانے لگے۔ ایک صاحب نے سامان ہٹایا، دوسرے نے دروازہ کھولا، تیسرا اوپر کی برتھ پر لیٹے لیٹے حکومت کو برا بھلا کہنے لگا۔ مولوی صاحب بھی بدبدا رہے تھے۔ ذرا سا دروازہ کھلا تو میں تیر کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ ڈبے میں اتنے زیادہ مسافر نہیں تھے مگر ایک برتھ پر دو دو آدمی سو رہے تھے، کچھ نے فرش پر چادر بچھائی ہوئی تھی، میں بیت الخلا کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

"صاحب زادے! کیا تنہا سفر کر رہے ہو؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔

"نہیں، ساتھ میں بھی ہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ہیں، وہ کہاں ہیں؟" انھوں نے تشویش سے کہا۔

"ساتھ والے ڈبے میں۔"

مولوی صاحب نے کچھ سوچ کر کہا، "اچھا۔ میاں! مسافروں کا حال عجیب ہے، سب ایک ہی ڈبے پر پل پڑتے ہیں، جگہ تلاش نہیں کرتے، بے آرام رہتے ہیں اور بے آرام کرتے ہیں۔"

میں سہما اور دبکا کھڑا رہا، اسی اثنا میں کسی نے مجھے آواز دی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ وہ جگ دیش ہی تھا، کم بخت پیچھے پڑ گیا تھا۔

"بابر؟" اس نے کھڑکی کے اندر جھانک کے آواز لگائی۔

میں نے جواب دینے سے گریز کیا مگر اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ "میں آ گیا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"چھوٹا مل گیا؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں، دونوں مل گئے۔ پچھلے ڈبوں میں ہیں۔"

"یار! کھڑے کیوں ہو؟ ٹرنک پر بیٹھ جاؤ۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ٹرنک میرا نہیں ہے۔"

"تو کیا ہوا، اس طرح کب تک کھڑے رہو گے، کن جانے کا ہے یہ صندوق؟" ڈبے کے ہر شخص نے اس کا سوال سنا۔

سب دم سادھے بیٹھے رہے۔ جگ دیش کی یہ مداخلت مجھے بہت بری لگی۔ بڑی مشکل سے تو جگہ حاصل کی تھی، وہ مسافروں کو ناراض کیے دے رہا تھا۔ "بیٹھ جاؤں گا جگ دیش! سفر ہی کتنا ہے۔"

انجن کی تیز سیٹی کے ساتھ ساتھ گاڑی کے پہیے چرمرائے۔ جگ دیش ڈبے سے چپکا ہوا کچھ دور تک دوڑا پھر دعا سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی یقین نہیں آیا کہ گاڑی گیا شہر سے روانہ ہو چکی ہے وہ جب [illegible]شینوں سے دور آگے بڑھی اور ک[illegible]ں سے گزری تو کلیجے میں ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ زنجیر کھینچ کے گاڑی سے اُتر جاؤں۔ بے اختیار گھر یاد آ گیا، سب کے چہرے نظروں میں گھوم گئے۔ ابا جاگ گئے ہوں گے اور انھوں نے بستر پر مجھے نہیں دیکھا ہو گا تو ان کا کیا حال ہوا ہو گا؟ پھر انھوں نے امی کو جگایا ہو گا۔ امی کا دل دھک سے رہ گیا ہو گا، وہ زار و قطار رونے لگی ہوں گی۔ ابا نے دروازہ کھلا دیکھا ہو گا تو ساری بات سمجھ گئے ہوں گے پھر انھوں نے چھت پر جا کے کورا کی موجودگی کی تصدیق کی ہو گی، وہ کیسے پریشان ہوں گے، نیچے اُتر کے سامان دیکھیں گے، اپنی جیبیں اور نقدی دیکھیں گے اور سر پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جائیں گے، پھر اماں انھیں دوڑائیں گی، ابا اسٹیشن تک آئیں گے، اس وقت تک گاڑی گیا سے بہت دور آ چکی ہو گی۔

♥

گاڑی نے رفتار پکڑی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آتے تو سبھی دوبارہ اونگھنے لگے۔ میں کمپارٹمنٹ کی دیوار سے لگا کچھ دیر کھڑا رہا اور اپنے زاویے بدلتا رہا۔ درمیان میں مولوی صاحب کی آنکھ کھلی تو انھوں نے مجھے دیکھا۔ "بیٹھ جاؤ میاں! کھڑے کیوں ہو؟ اب آ ہی گئے ہو تو آرام سے بیٹھو۔"

"شکریہ جناب! میں ٹھیک ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔ وہاں تکلیف ہے تو ادھر آ جاؤ۔" مولوی صاحب نے حکم دیا۔

میں نے ٹرنک پر بیٹھ کے دیوار سے سر ٹکا دیا۔ نیند آنے کا کوئی سوال نہیں تھا، یہ بیداری کی بھی سب سے آگے والی کیفیت تھی۔ صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا، اُدھر کورا موجود تھی۔ اس کا خیال میرے ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہو؟ گھبرا تو نہیں گئی ہو گی؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہو گی؟ کاش میں اُس کے پاس ہی بیٹھ سکتا تاکہ اسے تسلی دیتا رہتا۔ سنا تھا، کلکتہ دن کے ساڑھے دس گیارہ بجے آتا ہے، یہ وقت انتہائی مناسب تھا مگر میں کلکتے میں کہاں جاؤں گا؟ کہاں ٹھیروں گا اور لوگ میرے اور کورا کے بارے میں پوچھیں گے تو انھیں کیا بتاؤں گا؟ خیالوں کے بھوت طرح طرح ستاتے رہے، کبھی حوصلہ، کبھی خوف، کبھی آنے والے دنوں میں کورا کے ساتھ رہنے کی سرشاری، کبھی وسوسے اندیشے لیکن میں اپنی جگہ جما بیٹھا رہا، مولوی صاحب کو چونکنے کی عادت تھی، ہر پانچ منٹ بعد اُن کی آنکھ کھل جاتی تھی اور وہ انگڑائی لے کے میری خیریت دریافت کر لیتے تھے۔ کچھ دور آگے اندھیرا مرنے لگا اور ہر طرف ایک مٹیالی روشنی پھیلنے لگی اور لمحہ بہ لمحہ اُجلی ہوتی گئی۔ ڈبے کے بہت سے مسافر جاگ پڑے۔ گھٹے ہوئے سر والا ایک ہندو سب سے پہلے جاگا۔ مجھے اندر آنے کی اجازت اُسی نے دی تھی۔ پھر مولوی صاحب آیتیں پڑھتے ہوئے اٹھے۔ وضو کرنے کے بعد جیسے ہی انھوں نے مصلا اٹھایا، لوگوں نے جگہ چھوڑ دی، انھوں نے نماز جلدی ہی ختم کر لی، پھر ڈبے کے سبھی لوگ چہچہانے لگے اور انھوں نے میری شکل دیکھی۔ میری شکل پر کچھ ایسی ہی علامتیں ہوں گی کہ اُن کی توجہ میری جانب مبذول ہو گئی۔ ایک صاحب نے کھسک کر مجھے باقاعدہ سیٹ پر بٹھا لیا۔ "ماشاء اللہ میاں کسی اچھے خاندان سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔" مولوی صاحب نے میرا چہرہ اور لباس دیکھتے ہوئے رائے دی۔

"کچھ پڑھتے ہیں آپ؟"

"بی اے کے پہلے سال میں ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"ماشاء اللہ! ماشاء اللہ۔"

"یہ بی اے کی عمر نہیں ہے۔" ایک صاحب نے کہا۔ "بہت خوب۔ آپ کی آنکھوں پر چشمہ ہونا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بھئی حد سے زیادہ پڑھنے والے تمام بچوں کی آنکھوں پہ چشمہ ہی لگا رہتا ہے۔" ڈبے میں سب ہنسنے لگے۔ میں نے بھی مسکرا کے ان میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ ماحول کی اجنبیت ختم ہو گئی۔ مولوی صاحب نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا تھا۔ انھوں نے میرا نام پوچھا تو میں نے اپنے نام کا دوسرا لفظ بتایا، زماں۔ وہ مجھ سے میرے خاندان اور والد صاحب وغیرہ کے متعلق سوالات کرتے رہے اور میں انھیں کچھ سچ کچھ جھوٹ بتاتا رہا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو میں نے اُن سب کا شکریہ ادا کیا۔

"تمھیں تو آگے جانا ہے۔" مولوی صاحب نے نکتہ چینی کی۔

"مگر میں نے آپ سے اسی اسٹیشن تک بیٹھنے کی اجازت لی تھی۔ اب میں کوئی دوسرا ڈبا ڈھونڈ لوں گا۔" مولوی صاحب کے ساتھ تمام مسافروں نے یک زبان مجھے اپنے ساتھ بٹھانے پر اصرار کیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں ضرور اسی ڈبے میں آؤں گا، ذرا زنانے میں خیریت دریافت کر لوں۔ وہاں سے اُتر کے میں برابر کے ڈبے کی کھڑکیوں پر جھپٹا۔ اندر جو عورتیں بیٹھی تھیں، اُن کے مردوں نے کھڑکیاں گھیر لی تھیں۔ کورا نے مجھے دیکھا تو بے تاب ہو گئی۔ اس نے نقاب ناک تک پہن رکھی تھی، اُس کی آنکھوں اور پیشانی کے کچھ حصے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے پاس ایک اور برقع پوش مسلمان عورت بیٹھی تھی۔ میں نے کھڑکی میں گردن ڈال دی۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا مگر فوراً خیال آ گیا لہٰذا میں نے اشارے سے اُس کی خیریت پوچھی۔ اُس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا کہ وہ ٹھیک ہے۔ پھر میں نے ہاتھوں سے چائے کی پیالی کی شکل بناتے ہوئے پوچھا کہ وہ چائے پیے گی یا کچھ کھائے گی؟ کورا نے اثبات میں سر ہلایا، اس موقع پر اُس کے برابر بیٹھی ہوئی عورت بول پڑی۔ "بھیا! یہ تمھاری بہن ہے؟" میرے اقرار پر اُس نے کہا۔ "مجھے بہت دکھ ہوتا ہے بڑی صابر بچی ہے۔ ایک

پہلو سے بیٹھی ہوتی ہے۔ ویسے تم بے فکر رہو، میں اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔"

میں نے اُس نیک خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اسٹال سے دو پیالیاں چائے اور بسکٹوں کی ایک پلیٹ لاکے اُن کے سپرد کر دی۔ کورا نے چائے پینے کے لیے نقاب ہٹائی تو ڈبے میں چکاچوند ہو گئی۔ جو مرد کھڑکیوں پر کھڑے تھے وہ مبہوت رہ گئے، ناچار کورا کو اپنا رُخ بدلنا پڑا۔ بُرقع والی دوسری عورت نے اُس کی دیوار بننے میں تعاون کیا۔ جب تک گاڑی نہیں چلی، میں پلیٹ فارم پر کھڑا رہا پھر واپس اپنے ڈبے میں آگیا۔ مولوی صاحب نے اپنا ناشتے دان کھول لیا تھا۔ جبراً انھوں نے مجھے بھی شریک کر لیا اور میں ہر اسٹیشن پر اُتر کے کورا کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ کلکتہ آنے تک مولوی صاحب سے بہت سی باتیں ہو چکی تھیں، اُن کی عمر زیادہ نہیں تھی، یہی کوئی پینتالیس سال کے ہوں گے۔ اُن کے چہرے پر تراشی ہوئی داڑھی تھی، اُن کی آنکھیں چمکیلی اور تیز تھیں، پیشانی اور چہرے کا رنگ کھلتا ہوا تھا، قد بھی مناسب تھا۔ کھلے ہوئے بٹنوں کی شیروانی میں وہ خاصے سلجھے ہوئے، مستعد اور تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ڈبے میں ہم دو ہی مسلمان تھے۔ مولوی صاحب کا نام محمد شفیق تھا۔ وہ مراد آباد سے آرہے تھے اور اُنھی کے قول کے مطابق وہ ایک مدرسے میں درس و تدریس کے لیے کلکتے جا رہے تھے۔ جز وقتی طور پر وہ مراد آبادی برتنوں کی کمیشن ایجنٹی بھی کرتے تھے۔ اُن کے پاس ایک صندوق میں مختلف قسم کے برتنوں کے نمونے رکھے ہوتے تھے، یہ نمونے وہ دُکانوں پر دکھا کے آرڈر لیا کرتے تھے اور آرڈر مراد آباد بھیج دیتے تھے۔ مولوی صاحب بہت شائستہ گفتگو کرتے تھے اور تب و تاب سے رہتے تھے۔ کلکتے تک وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اُنھوں نے شادی نہیں کی تھی، سیاحت اُن کا شغل تھا۔ وہ سارا ہندوستان دیکھ چکے تھے۔ میں نے اُن سے کلکتے کا پتہ لیا، اسی بہانے میں نے بازاروں اور محلّوں کے نام بھی معلوم کر لیے۔ اُنھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کلکتے میں اُن سے ضرور ملاقات کروں گا۔

ہوڑا اسٹیشن پر ظاہر ہے مجھے میرے ماموں جان لینے نہیں آئے۔ مولوی محمد شفیق بھی سخت پریشان ہوتے۔ میں کورا کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔ ازراہِ ہمدردی مولوی صاحب بھی رُک گئے تھے اور گھور گھور کے کورا کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کے ہاتھ دیکھ رہے تھے، پیر دیکھ رہے تھے۔ اُن کے ٹھہر جانے سے میں بھی رُکا رہا ورنہ اب تک میں اسٹیشن سے باہر ہوتا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، عجب گومگو کا عالم تھا۔ میں اپنے خود ساختہ ماموں کا انتظار کر رہا تھا اور مولوی صاحب کو مجھ سے اتنی اُنسیت ہو گئی تھی کہ اُنھوں نے میرے بغیر اسٹیشن سے باہر جانا ملتوی کر دیا تھا۔ ماموں جان کو بھلا کیوں آنا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا۔

"میاں! تمھارے پاس اُن کا پتہ بھی ہے؟"

"جناب! اُن کا آنا بالکل یقینی تھا، تار تک دے یا تھا، ایک ہفتے پہلے خط لکھ دیا تھا۔ وہ کولوٹولا اسٹریٹ میں کہیں رہتے ہیں، نمبر اور بلڈنگ کا نام وغیرہ تو مجھے یاد نہیں ہے۔"

"مجھے بھی قریب ہی جانا ہے، آؤ وہیں کہیں تلاش کرتے ہیں، اب تو اُن کے آنے کی اُمید نہیں ہے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے اور گاڑی پہلے ہی آدھ گھنٹے لیٹ آئی ہے، آؤ میاں! اٹھو۔ اگر وہ آج نہ ملیں تو آپ دونوں میرے ساتھ رہیے گا، اپنا ٹھکانا بھی بُرا نہیں ہو گا۔"

"شکریہ جناب! آپ کہاں زحمت کریں گے۔ میرا خیال ہے میں کچھ دیر اور انتظار کر لوں، آپ اپنا وقت ضائع نہ کیجیے، مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"تکلیف کا تم نے خوب ذکر کیا۔ تم تو غیریت برتنے لگے۔ میاں! آدمی آدمی کے کام آتا ہے۔ میں یہاں سے اُس وقت تک نہیں ٹلوں گا جب تک تمھارے ماموں جان قبلہ آ نہیں جائیں گے۔ یہ کلکتہ ہے صاحبزادے! بہت منحوس شہر ہے، یہاں بذات جنات رہتے ہیں۔ آدمی کھو جاتا ہے تو پتہ نہیں چلتا۔ دیکھ رہے ہو، لوگ کیسے بھاگ رہے ہیں، جدھر دیکھو آدمی ہی آدمی نظر آتا ہے۔"

مولوی صاحب سچ کہتے تھے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ انسان گروہ پسند ہوتا ہے۔ یہاں تو اتنے لوگ تھے کہ دہشت ہونے لگی تھی۔ مجھے حبس سا محسوس ہوا۔ اُدھر مولوی صاحب کو ٹالنا مسئلہ ہو گیا تھا۔ وہ تو دھرنا دے کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے کورا کو بھی اُن کے ساتھ بٹھا دیا۔ وہ میری مجبوری اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ میں نے پھر مولوی صاحب سے اصرار کیا کہ وہ ہم لوگوں کی خاطر اپنا وقت برباد نہ کریں مگر وہ نہ مانے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم اسٹیشن سے اُن کے ساتھ باہر نکلیں اور کولوٹولا اسٹریٹ میں ماموں جان کو تلاش کریں۔

"ماموں جان کا نام اکبر جہاں ہے۔ وہ اجناس کے بڑے بیوپاری ہیں اور اسی سلسلے میں انھیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں جانا پڑتا ہے۔" یہ باتیں میں نے پہلے ہی مولوی صاحب کو بتا دی تھیں، بمبئی قسمت میں بھی وہی ڈبا لکھا تھا جس میں مولوی صاحب موجود تھے۔ میں نے اُس بُرے وقت کو کوسا۔ ڈوبتے ہوئے دل سے مولوی صاحب کے ہمراہ اسٹیشن سے باہر آیا۔ پہلی نظر میں اس شہر کا کوئی اچھا تاثر ذہن پر مرتب نہیں ہوا۔ اب تک میں نے صرف چھوٹے چھوٹے شہر، قصبات اور دیہات دیکھے تھے، یہ تو دنیا ہی اور تھی۔ میں نے بے بسی سے کورا کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب نے ایک ٹیکسی رو رک لی تھی "آؤ میاں بیٹھو!" انھوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں اور کورا ٹیکسی میں قربانی کے بکروں کی طرح پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب ڈرائیور کے قریب بیٹھے تھے۔ کچھ سامان ڈگی میں رکھ دیا گیا تھا اور کچھ ہم نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

میں سوچتا رہا، مولوی صاحب بے چارے ماموں جان کی تلاش میں کہاں کہاں سر ماریں گے؟ کن کن لوگوں سے پوچھیں گے؟ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی، میں نے مولوی صاحب سے کہا "جناب! کیوں نہ ہم آپ کی قیام گاہ چلیں، وہاں نہا دھو کر اطمینان سے ماموں جان کی تلاش میں نکلیں گے۔"

"بخدا! میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا۔" مولوی صاحب اُچھل پڑے۔ "مکان تو نہیں البتہ ایک کمرے کا انتظام ضرور اُن لوگوں نے کیا ہو گا جیسے تیسے گزر کر لیں گے، مجھے تو تمھارے ماموں جان کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ پتہ نہیں کیا حادثہ ہوا؟ خدا خیر کرے۔ انھیں تمھارا تار اور خط مل جانا چاہیے تھا۔" میں خاموش رہا اور شیشے سے کلکتے کا نظارہ کرنے لگا۔ عمارتیں ہی عمارتیں، سواریاں، ٹرامیں، بسیں، ہاتھ گاڑیاں، ہر جگہ انسان، دُکانیں، ہوٹل، بڑے بڑے بورڈ، نیلے پیلے، کالے، ہرے، سفید، سُرخ رنگوں کا شہر۔ مولوی صاحب کے اشارے پر ٹیکسی ایک بڑی مسجد کے قریب ٹھیر گئی، مسجد سے ملحق عمارت میں مدرسہ تھا، مدرسہ بند تھا۔ ٹیکسی ٹھیرا کے مولوی صاحب اندر خبر کرنے چلے گئے۔ میں نے سوچا، یہیں سے فرار ہو جاؤں مگر مولوی صاحب کا سامان بھی ٹیکسی میں رکھا تھا، اُسے کہاں چھوڑتا اور ٹیکسی والے سے کیا عذر پیش کرتا۔ مولوی صاحب جلد ہی واپس آگئے۔ اُن کے ساتھ ایک اور دراز ریش بزرگ تھے۔ انھوں نے سامان اُتروانے میں مدد کی۔ کرایہ بھی اُنھی صاحب نے ادا کیا۔ پھر ہمیں ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جس میں ایک موکھلا اور دروازہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی تھی۔ سیلن تھی اور اندھیرا تھا لیکن کمرے کے باہر چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ ایک طرف باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ روشنی ہونے پر کمرہ کچھ ایسا بُرا معلوم نہیں ہوا۔ "میں باہر چلا جاتا ہوں۔" مولوی صاحب نے چارپائی پر بستر بچھا کے کہا "عزیزہ سے کہو کہ اطمینان سے بیٹھیں، بُرقع اُتار دیں، چاہیں تو غسل کر لیں، ہم لوگ کھانے کا انتظام کرتے ہیں، جس چیز کی ضرورت ہو، صابن، تولیا، لوٹا، وہ سب میرے سامان میں موجود ہے۔"

اصولاً مجھے اتنے مہربان آدمی کے سامنے کورا کا پردہ اُتروا دینا چاہیے تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں مولوی صاحب کے ساتھ کھانا لینے کے لیے روانہ ہو گیا، یہ جگہ محفوظ تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ مولوی صاحب کو صاف صاف بتا دوں مگر ہمت نہیں پڑی، اتنے افسانے تراشے تھے کہ اب حقیقت بیان کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ یہ مسلمانوں کا محلّہ تھا۔ مولوی صاحب نے خاصا پُرتکلف کھانا خریدا۔ کورا کو ان کھانوں کی عادت نہیں تھی۔ میں نے ساتھ میں اُس کے لیے ماش کی دال بھی لے لی۔

جب ہم کھنکار کے اندر داخل ہوئے تو صحن میں ایک اور چارپائی رکھی جا چکی تھی۔ مولوی صاحب صحن میں بیٹھ گئے، میں کورا کے لیے کھانا لے کے اندر چلا گیا، اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ میری بہن فہمیدہ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ میں اُسے تکتا رہ گیا، اس لباس میں تو وہ کوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اُس کے سامنے کھانا رکھ دیا اور خود مولوی صاحب کے ہمراہ کھانے کے لیے صحن میں آگیا۔ مولوی صاحب بضد ہوئے کہ میں اپنی بہن کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں۔ جی تو میرا بھی یہی چاہتا تھا مگر میں نے دل پہ پتھر رکھ لیا۔ کورا کو دیکھ کے سفر کی ساری تکان دور ہو گئی تھی، اتنے قریب تو وہ گھر میں بھی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ صحن سے میری نظریں اندر کمرے ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کورا کو مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے کی آرزو تھی۔ مولوی صاحب تھوڑی دیر کے لیے مدرسے کے دفتر میں چلے گئے تو مجھے آزادی نصیب ہوئی۔ میں نے دروازے کی کنڈی بند کی اور اندر کمرے میں گھس گیا۔ کورا چارپائی پر اُداس بیٹھی تھی۔ نہ جانے کیوں میرے قدم لرزنے لگے۔ اس خیال سے میرا بُرا حال ہو گیا کہ وہ اور میں کمرے میں تنہا ہیں، میں دور ہی کھڑا رہا۔ کورا بھی کھڑی ہو گئی۔ اُس نے نظریں اُٹھائیں، نظریں جھکائیں، اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، میرے دل میں بھی درد اُٹھا لیکن میں نے اپنے آنسو روک لیے۔ "غم مت کرو کورا!" بمشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔ "غم مت کرو، اس اجنبی جگہ چند دن پریشانی رہے گی۔ میری جیب میں ابھی روپے ہیں۔ کچھ دن تو ویسے بھی اچھے گزر جائیں گے۔"

"مگر اب ہم جائیں گے کہاں؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ تو مجھے خود نہیں معلوم۔ یہ شہر تو بہت خراب ہے، ہمارا اس جگہ گزارا نہیں ہو گا۔" پھر مجھے خیال آیا کہ میں خود ہی حوصلہ شکنی کی باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے تو اس کی ڈھارس بندھانی چاہیے۔ میں اُس کے اور قریب ہو کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں اُس کی وجہ سے ایک تازگی اور روشنی معلوم ہوتی تھی۔ ایک نامعلوم خوشبو ہر طرف بسی ہوئی تھی۔ "بیٹھ جاؤ کورا!" میں نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ بھی چارپائی پہ بیٹھ گئی۔ "مولوی صاحب ابھی آتے ہوں گے، تم اُن کے سامنے پردہ کرتی رہنا اور مجھ سے کم ہی بولنا۔ ابھی ہم شاید باہر جائیں اور ماموں جان کی تلاش میں ناکام ہو کے واپس آجائیں۔ ہم مولوی صاحب سے زیادہ دیر جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اگر انھوں نے کہیں تمھاری شکل دیکھ لی تو وہ یقیناً شک میں پڑ جائیں گے چنانچہ ہمیں یہاں سے بھی چلنا ہو گا۔"

"مگر کہاں؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"کہیں بھی۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"بابر! میرا زیادہ گھومنا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ "وہ میرے پیچھے پڑے ہوتے ہیں، اگر اُنھوں نے میرا پتہ چلا لیا تو مصیبت آجائے گی۔ اگر ہمیں مکان نہیں ملا اور تم کسی کام پہ نہ لگ سکے تو ہمارا کیا ہو گا؟ سب پیسے ختم ہو جائیں گے۔"

"ہو جانے دو۔ خدا کی ذات سے اُمید رکھو، میں نہیں سمجھتا کہ ہم نے گھر سے بھاگ کر کوئی بُرا کام کیا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"بابر! مولوی صاحب سے سب کچھ کہہ دو۔ شاید وہ ہماری مدد کریں۔"

"اور اگر وہ خود گھبرا گئے تو کیا ہو گا؟"

کورا کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا، آنسو تھے۔ آنسو بہتے

رہے۔ وہ آنسو تھے یا آگ کے قطرے جو میرے دل و دماغ پر گر رہے تھے کاش میں چند سال پہلے پیدا ہوگیا ہوتا۔ میں خود کو بہت کمزور محسوس کرنے لگا۔ کورا تو میرے پیروں میں لرزش پیدا کیے دے رہی تھی۔ اس اجنبی شہر میں کسی سے مکان اور کام کی بات کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ کسی کی مدد کے بغیر راستے بھی تلاش نہیں کیے جاسکتے تھے۔ کورا کو کسی محفوظ جگہ ٹھہرا کے ہی میں مکان اور کام تلاش کرسکتا تھا۔ انسانوں کے ساتھ انسانوں کی اتنی شدید ضرورت ہوتی ہے، پہلے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اب تک آرام کی کھاتی تھی، نہ صبح کی فکر، نہ شام کی، کھانا خراب ہوتا تو میں پلیٹ پھینک دیا کرتا تھا۔ اپنی انھی سرکشیوں کی وجہ سے میں گھر میں جلی کٹا مشہور تھا۔ سارے کس بل ایک ہی دن میں نکلے جارہے تھے۔ ہم نے غلط شہر کا انتخاب کیا تھا مگر ہم کسی بھی شہر میں جاتے، یہی صورت پیش آتی۔ کورا کو ساتھ لے کے سڑکوں پر گھومنے میں خدشے ہی خدشے تھے، کورا کو کسی الماری میں بھی بند نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ کوئی مکان نہیں تھی جسے مقفل کردیا جاتا۔ وہ نقدی نہیں تھی کہ اُسے جیب میں رکھا جاسکتا کورا تو ایک لڑکی تھی، ایک ہیرا۔ سُو سُو کے نوٹوں کے پہاڑ بنا دیے جاتے تب بھی کورا کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی۔ بہت سی باتیں سمجھ میں آنے لگیں، ہر چیز بدلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جب اُس کی آنکھیں رونے سے باز نہیں آئیں تو میں تلملا کے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "رو ؤ نہیں کورا! خدا کے لیے خاموش ہوجاؤ۔" لیکن مجھے خود بھی رونا آگیا۔

فی الحال بس ایک راستہ نظر آتا تھا کہ ہم کسی ہوٹل کا رُخ کریں۔ ہوٹل مسافروں کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ میں نے اسٹیشن سے آتے ہوئے راستے میں بہت سے ہوٹلوں کے بورڈ دیکھے تھے، انھی میں سے کسی معقول مسلم ہوٹل میں ٹھیر جائیں گے، وہاں کوئی بہانہ بنادیں گے کہ ہم اپنے ایک ناراض بھائی کو منانے کے لیے آئے ہیں۔ جس کے متعلق سُنا ہے کہ وہ کلکتے آگیا ہے۔ وہ ہوٹل اچھا ثابت نہ ہوا تو دوسرے ہوٹل میں مقیم ہوجائیں گے۔ جیب میں روپے کافی ہیں۔ شاید آئندہ دنوں میں جینے کا کوئی آسرا پیدا ہوجائے۔ میں خاکے بناتا اور بگاڑتا رہا۔ ذہن میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ جو ترکیب نظر آتی تھی، اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی اندیشہ بھی ضرور لگا ہوتا تھا۔ سارے مسئلے حل ہوجاتے اگر مولوی صاحب کی داڑھی جیسی داڑھی میرے چہرے پر بھی موجود ہوتی۔

کورا کے گلے میں چھپا ہوا دھانی دوپٹا پڑا ہوا تھا۔ یہ دوپٹا اُسے امّی نے دیا تھا۔ کورا نے فہمیدہ کی طرح اُسے سر پہ اوڑھ لیا تھا۔ میں اُس کا حسین سر اپنے سینے سے لگاکے اُسے تسلی دینے کا ارادہ کرتا تھا مگر سہم جاتا تھا۔ میرے ہاتھ آگے نہیں بڑھ سکے۔ میں سوچتا ہی رہا، اسی اثنا میں دروازے پر کھٹکا ہوا۔ شاید مولوی صاحب آگئے تھے۔ میں اُٹھ کے باہر گیا۔ مولوی صاحب ہی تھے۔ آتے ہی کہنے لگے "میں نے دفتر والوں سے کہہ دیا ہے کہ میرے عزیز ساتھ ہیں۔ فرض کرو، اگر تمھارے ماموں جان نہ ملے تو تم کہاں جاؤ گے؟"

"ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"نہیں بھئی۔" وہ خفا ہوکے بولے۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ حفظِ ماتقدّم کے طور پر دفتر والوں کو آگاہ کردینا ضروری تھا۔ کہو، تم نے کمر لگائی یا نہیں؟ اور عزیزہ کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے، آپ کا بہت شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ آپ نہ ملتے تو ہمارا نہ جانے کیا حال ہوتا مجھے یہ شہر کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"اچھا، میاں! انتہائی نامراد شہر ہے لیکن سیر و سیاحت کے لیے بُرا نہیں ہے۔" وہ اس طرح پیش آرہے تھے جیسے ہم اُن کے آبائی مکان میں مہمان ہوں۔ کچھ دیر وہ کلکتے کے بارے میں معلومات کے دریا بہاتے رہے۔ جو باتیں اُنھوں نے پہلے کہی تھیں، انھیں دہراتے رہے اور اپنے دور دراز کے سفر کے واقعات سُناتے رہے۔ میرا خیال ہے اُن کی زندگی میں ایسا کوئی واقعہ اب تک پیش نہیں آیا ہوگا کہ اُن کی ملاقات ایک سولہ سترہ سال کے لڑکے سے ہوئی ہو جو ایک تیرہ سالہ غیر مسلم لڑکی کو لے کے گھر سے نکل پڑا ہو اور لڑکی بھی کون؟ تبت کے ایک سردار کی لڑکی جو جائز طور پر اپنے قبیلے کے تخت کی وارث تھی اور قبیلے کے موجودہ غاصب سردار کو بُری طرح مطلوب تھی اور اُس نے اُسے ختم کرنے کے لیے ہندوستان بھر میں اپنے آدمی پھیلا دیے تھے جو کتّوں کی طرح اُس کی بُو سونگھ رہے تھے اور اُس لڑکی کے لیے تبت کے ایک ذہین شخص کا قتل ہوچکا تھا۔ اگر وہ موقع پر بھاگ کے ہمارے گھر میں پناہ نہ لے لیتی تو نہ جانے اُس کا کیا حشر ہوتا۔ مولوی صاحب کو کیا معلوم تھا اُن کے ساتھ کون ستم رسیدہ لوگ ہیں۔ میرے ابّا تیار نہیں ہوتے، ایک گنّا سی لڑکی کو گھر میں رکھنے کے لیے ابّا تیار نہیں ہوئے تو غیروں سے کیا اُمید تھی۔ مجھے امّی کے جلے کٹے جملے یاد تھے۔ وہ لوگ ذرا سا حوصلہ رکھتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مولوی صاحب نے بہت سے پھول دیکھے ہوں گے، بڑی عالی شان عمارتیں، باغات، عجائب گھر، نوادر مگر انھوں نے کورا جیسی لڑکی نہیں دیکھی ہوگی۔

میں توقع کر رہا تھا کہ ابھی وہ مجھ سے کہیں گے کہ چلو ماموں جان کی تلاش میں نکلیں، شاید مولوی صاحب کو باتوں میں خیال نہیں رہا تھا یا میں انھیں اس قدر پسند آگیا تھا کہ وہ مجھے کچھ دیر اور ساتھ رکھنے کے لیے دانستہ ماموں کا ذکر نہیں کر رہے تھے۔ میں اُن کی طویل گفتگو حیرت اور اشتیاق سے سنتا رہا۔ پھر انھیں اچانک خیال آیا "ارے وہ بے چاری اندر کیا سوچ رہی ہوں گی؟ تم اُن کے پاس جاکے بیٹھو۔ میں ادھر کمر سیدھی کرتا ہوں۔" پھر کہنے لگے "مگر تمھارا دل اپنے ماموں سے ملنے کے لیے بے چین ہوگا۔ چلو کولوٹولا اسٹریٹ چلتے ہیں۔ اپنی بہن سے کہہ دو کہ وہ اطمینان سے آرام کریں، کسی قسم کی فکر نہ کریں۔"

"آپ پہلے آرام کر لیجیے۔ بعد میں ماموں جان کی تلاش میں نکلیں گے۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

وہ ایک لمحے کے لیے میرے مشورے پر چونکے ضرور مگر پھر مسکرانے لگے "یہ زماں میاں! تم سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں، ماموں مل جائیں گے تو تم چلے جاؤ گے، تم سے بڑی انسیت ہوگئی ہے۔"

"ہم آپ کو بھی وہیں لے چلیں گے۔" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"اپنی زندگی تو تنہا گزری ہے۔" وہ مغموم آواز میں کہنے لگے۔ "تھوڑی سی اور رہ گئی ہے وہ بھی کٹ جائے گی۔"

"آپ کا کوئی نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کے بولے "ہاں یہی سمجھو کہ کوئی نہیں ہے۔"

"گھر، والدہ، والد، بہن وغیرہ؟" میں نے پوچھا۔

"صرف ایک بہن ہے اُس سے بھی ملے ہوئے عرصہ ہوگیا ہے۔"

وہ اُداسی سے بولے "سب مر کھپ گئے، جو زندہ تھے، وہ بھی اپنے لیے مر گئے۔ تم سناؤ، کتنے بہن بھائی ہو؟"

"میں" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "ہم تو دو بہن بھائی ہیں۔ ایک میں، ایک یہ فہمیدہ، ماں باپ مرگئے، چچا کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"گویا تم بھی میری طرح....." وہ کہتے کہتے سانسیں لینے لگے۔ وہ میرے بارے میں کچھ اور پوچھتے مگر میں نے کورا کا بہانہ کیا کہ شاید اُس نے مجھے آواز دی ہے۔ میں تیزی سے اندر گیا۔ کورا دروازے سے لگی ہوئی ہماری باتیں سُن رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "اس کمرے میں تمھارا دم گھٹ رہا ہوگا؟"

"نہیں۔" اُس نے پہلی بار مسکرانے کی کوشش کی۔

"بس تھوڑی سی تکلیف اور رہ گئی ہے ابھی میں اور مولوی صاحب شاید باہر جائیں۔ تم سونے کی کوشش کرنا، رات بھر جاگتی رہی ہو۔ سمجھیں؟ سوؤ گی نہیں تو مجھے دُکھ ہوگا۔"

"اور تم.....؟" وہ کہنا چاہتی تھی کہ تم بھی تو نہیں سوئے ہو، میری نیند تو اُسی دن سے اُڑ گئی تھی جس دن میں نے اُسے دیکھا تھا۔

"میں تمھاری خاطر برسوں جاگ سکتا ہوں۔"

"میری خاطر تم کیا کیا کروگے؟" وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"پتہ نہیں۔" میں مختصر جواب دے کے باہر آگیا۔

کورا کو اندر سے دروازہ بند کرنے کی تاکید کرکے میں اور مولوی صاحب باہر نکلے اور ہاتھ سے چلانے والے رکشا میں بیٹھ کر کولوٹولا اسٹریٹ پہنچ گئے۔ یہاں مولوی صاحب کے کئی شناسا مسلمان دکان دار تھے۔ اُن سے اجناس کی تھوک خرید و فروخت کے لوگوں کا پتہ پوچھتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ دو چار ہی مسلمان یہ کام کرتے تھے اور اُن میں سے کوئی میرے ماموں اکبر جہاں خاں کو نہیں جانتا تھا۔ جب وہ سنجیدگی سے پوچھتے اور بار بار لوگوں سے میری زبانی اُن کا حلیہ بیان کرواتے تو مجھے بڑی وحشت ہوتی۔ جیسے جیسے ہم مایوس ہوتے گئے، مولوی صاحب مجھ پر خفا ہوتے رہے کہ میں نے بلڈنگ کا نام اور پتہ یاد کیوں نہیں رکھا۔ "میں بی اے میں پڑھتا ہوں یا گھاس کھودتا ہوں کہ اتنی اہم بات کا مجھے ہوش نہیں رہا؟" "کیا کلکتے کو تم نے کوئی قصبہ سمجھ لیا تھا میاں؟"

ہم کولوٹولا اسٹریٹ اور اُس سے ملحق تمام علاقے میں ماموں جان کا سُراغ لگاتے لگاتے تھک گئے۔ مولوی صاحب کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔ ایک جگہ سے ناکام ہوکے وہ دوسری جگہ جاتے، دوسری سے تیسری جگہ، اسی تگ و دو میں شام ہوگئی اور ہم تھک ہار کے گھر واپس آگئے۔ "اب کیا ہوگا؟" میں نے سراسیمہ ہوکے پوچھا۔

"اب کیا ہوگا؟ تم یہیں ٹھیرو گے؟ فوراً اپنے گھر ٹیلی گرام دو کہ وہ تمھیں ماموں جان کا صحیح پتہ لکھیں۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ تم نے کولوٹولا اسٹریٹ ہی غلط یاد رکھا ہے۔ کوئی اور علاقہ ہوگا۔"

"گھر تار دیں۔ گویا والد صاحب کو اطلاع دیں کہ بخیر و عافیت یہاں آگئے ہیں۔ آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ..... میں نے فوراً حامی بھر لی اور مولوی صاحب کی تجویز کی تائید میں سر ہلانے لگا۔

"گھر کا پتہ بھی یاد ہے؟" مولوی صاحب نے ہنس کر کہا۔

"جی۔ جی ہاں، خوب یاد ہے۔" میں نے گھبرا کے جواب دیا۔

چلتے چلتے اور بولتے بولتے مولوی صاحب اتنے تھک گئے تھے کہ غنودہ ہونے لگے اور اُن کی آنکھ لگ گئی لیکن وہ پندرہ بیس منٹ بعد ہی جاگ گئے۔ انھیں فوراً چائے کی طلب ہوئی۔ مغرب کا وقت ہوچکا تھا۔ رات ہوئی تو دل کچھ اور ڈوبنے لگا۔ اندر کورا بھی خاموش بیٹھی تھی۔ کھانا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ انھیں بھی کچھ چُپ لگ گئی تھی۔ اُن کی یہ خاموشی مجھے زہر لگی، کھانا کھاکے اُنھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی بہن کو دروازے پر کھڑا کردوں، وہ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اندر جاکے کورا کو بتایا کہ وہ صرف 'جی' اور 'نہیں' اور 'شکریہ' کے سوا کچھ نہ بولے ورنہ مولوی صاحب اُس کے لہجے سے کھٹک جائیں گے کہ کورا دروازے پر آئی۔ مولوی صاحب نے نستعلیق انداز میں اُسے ماموں جان کے نہ ملنے کی تمام تفصیل سے آگاہ کیا، مجھے سرزنش کی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ کورا یقیناً مجھ سے عمر میں بڑی ہوگی، چنانچہ وہ اُسے عزیزہ اور آپ کہہ کے مخاطب کر رہے تھے۔ اُن کی گفتگو کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ جگہ کورا کے رہنے کی تو نہیں ہے مگر مجبوری پر صبر و شکر کرنا چاہیے۔ اُنھوں نے کورا کو نہایت شفقت آمیز انداز میں تسلی دی۔ اُن کے ہر جملے پر کورا جی جی کرتی رہی اور میں خوف سے لرزتا رہا کہ کہیں مولوی صاحب اُس سے کچھ اور نہ پوچھ لیں۔

مجھے اگر یہ خبر ہوتی کہ مولوی صاحب مدرسے سے ملحق مسجد میں عشا کی نماز پڑھتے ہوئے دیر لگادیں گے تو میں کب کا یہاں سے رخصت ہوگیا ہوتا۔ ہم اسی شش و پنج میں مبتلا رہے کہ وہ ابھی واپس آتے ہوں گے، فرار کا ایک اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ ہمارے سروں پر ایک ہول ناک رات مسلط

تھی۔ بہت کم روشنی کا ایک بلب کمرے میں ٹمٹما رہا تھا اور ہال کے تمام بلب بجھے ہوتے تھے، اندر تاریکی ہو تو باہر کی روشنی بھی کچھ کام نہیں کرتی۔ صحن میں کورا اس طرح بیٹھی تھی جیسے اُس کے گھر میں موت ہو گئی ہو۔ میں تو تب بھی کو ختم کر کے آیا تھا۔ میرے گھر میں بھی شاید اپنے بیٹے کی موت پر یہی عالم ہو گا۔ سُنا ہے موت بُری اداکار بھی اچھی نہیں لگتی۔ مولوی صاحب نے آنے کے بعد تار گھر چلنے کے لیے اصرار نہیں کیا، آتے ہی خاموشی سے لیٹ گئے کورا نے اُن کا بستر تین حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ میرے لیے زمین پر چادر بچھا دی تھی اور تکیے کے لیے چند کپڑے دے دیے تھے۔ مولوی صاحب کو آج نیند نہیں آ رہی تھی، وہ مجھ سے کہتے رہے کہ مجھے اندر جا کے بہن کو تسلی دینی چاہیے۔ شاید وہ ہم دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کی سُن گن لینا چاہتے تھے۔ بُرے وقت میں آدمی ہر قسم کے شبہے کرتا ہے۔ آخر آدھی رات کے وقت نیند نے اُن پر قبضہ کر لیا۔ مجھے آنی رات کو یہاں سے بھاگنے کی ہمت نہیں پڑی۔ میں نے کورا کو آہستہ سے آواز دی۔ اُس نے ایک ہی سرگوشی میں دروازہ کھول دیا۔ "نیند نہیں آ رہی ہے؟" میں نے چوروں کی آواز میں کہا۔ اُس نے سر ہلا کے اثبات میں جواب دیا۔ "ہم کل ضرور یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"بیٹھ جاؤ۔" اُس نے کمرے میں رکھی ہوئی اکلوتی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے بیٹھنے سے پہلے ایک بار پھر دروازہ کھول کے دیکھ لیا، مولوی صاحب سوتے ہوتے تھے۔

جب میں نے آہستہ سے کنڈی لگائی تو نہ جانے کیوں میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ حلق خشک ہو گیا اور آنکھیں جلنے لگیں، سارے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میرے لیے چارپائی تک جانا مشکل ہو گیا۔ میں بیٹھ گیا تو میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم کیوں کھڑی ہو؟"

وہ بھی بیٹھ گئی اور میری زبان پر فالج گر گیا۔ مُنہ سے کوئی بات ہی نہیں نکل رہی تھی۔ میں اُسے عزم و ہمت کی تلقین کرنے آیا تھا۔ خود میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے، ہم کچھ دیر یوں ہی ہم چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ بڑی اذیت ناک خاموشی تھی۔ میں اُس کے جسم اور بالوں کی خوشبو صاف محسوس کر سکتا تھا۔ پہلو بدلتے وقت اُس کے کپڑے سرسراتے تو مجھے عجیب لگتا۔ "بابر!" آخر وہ خود بولی۔ "میں نے تمھیں بہت پریشان کیا۔"

"تم دن میں بھی کئی بار یہ جملہ کہہ چکی ہو۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمھیں پتہ نہیں۔ بالکل احساس نہیں کہ تمھیں دیکھ کر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ تمھیں قریب پاکے میری ہمت بڑھ جاتی ہے۔" میں نے بے ترتیب لفظوں میں کہا۔ کوئی لفظ اِدھر تھا کوئی اُدھر۔ زبان میں لکنت آ گئی تھی۔

وہ مجھ سے کچھ اور قریب آ گئی تھی۔ میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیے؟ جی تو بہت کچھ کہنے اور کرنے کو چاہتا تھا مگر خدشہ تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سمجھے گی۔ مجھے بہت چھوٹا آدمی سمجھے گی کہے گی کہ میں عام آدمی ہوں، بے کردار، بدنیت، مجھ پر اُس کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔ "سو جاؤ کورا!" میں نے اُسے تاکید کی۔

"بیٹھے رہو۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

مجھے کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی، اُس چارپائی کا کوئی سرہانا بھی نہیں تھا۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" میں نے بہانہ کیا۔

"میں دبا دوں؟" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں، نہیں، کچھ ایسا خاص درد نہیں ہے۔" وہ جھجکتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ "نہیں، تم آرام کرو۔" میں نے پھٹی ہوئی سرگوشی کی لیکن اُس نے میرے سر پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے۔ سر میں ایک چھناکا سا ہوا۔ اُس کی لمبی اُنگلیوں میں بجلی کے ننگے تار تھے۔ میرے سر میں کرنٹ دوڑنے لگا۔ پھر وہ کرنٹ پورے جسم پر چھا گیا جب اُس کی انگلیاں میری پیشانی پر آئیں میں ڈھیتے ڈھیتے سنبھلا۔

"تمھیں بخار آ رہا ہے۔" وہ میری گرم پیشانی چھوتے ہوئے بولی۔

"نہیں تو، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"مجھے سر دبانا نہیں آتا، مجھے تو کوئی بھی کام نہیں آتا۔"

"تم تو بہت اچھا دبا رہی ہو، درد بس بھاگنے والا ہے۔"

اتنی مدّت میں وہ پہلی بار کھل کھلائی۔ "تم بہت جھوٹ بولتے ہو۔" کمرے میں جل ترنگ بج اُٹھے۔

"آہستہ، مولوی صاحب جاگ جائیں گے۔"

اُس کے ہاتھ میری آنکھوں پر آ گئے۔ اُس کی اُنگلیاں میری پلکوں سے مَس ہوتیں تو میری آنکھیں کپکپانے لگیں۔ زندگی میں بہت سے لذیذ کھانے کھاتے تھے، انعامات جیتے تھے، امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی، شربتیں پیتی تھیں، بہترین لباس پہنا تھا، باغوں کی سیر کی تھی۔ ابّا کے ساتھ ایک بار شکار کا لطف بھی اُٹھایا تھا مگر جو لذّت کورا کے لمس میں تھی اُس کا پہلی بار انکشاف ہوا تھا، اُس کی بے قرار اُنگلیاں میرے سر، پیشانی اور آنکھوں پر رقص کرتی رہیں اور میرے سینے میں جذبات کی فصل لہلہاتی رہی۔ "بس۔ بس۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اُس نے بس نہیں کیا۔ اُس کے نازک ہاتھ میرے بالوں کی گرد سے میلے ہو گئے ہوں گے۔ وہ تو ایک آئینہ تھا۔ ذرا سی ہوا چلی اور گرد جم گئی۔ میں نے بے تابی سے اُس کے ہاتھ تھام لیے اور انھیں گھور کے دیکھا۔ میرے ہاتھوں میں جیسے ریشم آ گیا۔ انھیں احتیاط سے تھامنا چاہیے کہیں خراب نہ ہو جائیں۔ وہ میری فریفتگی، میرا خوف، میری لرزش، میرا اضطراب دیکھتی رہی۔ "کورا! ایک بات کہوں؟" میں نے بے تابی سے کہا۔ اُس نے گردن جھکا لی جیسے میں جو بات کہنے والا ہوں، وہ اُسے پہلے سے معلوم ہو۔ میں ... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا تم ... تم مجھے ہمیشہ یاد رکھو گی؟"

کہنا یہ تھا کہ مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی؟ میں نے یہ سوال کر کے بُرا کیا۔ اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔ شاید یہ بات مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی، اس سے ایک دوری معلوم ہوتی تھی، اجنبیت سی۔ "تم پھر رونے لگیں؟ اچھا تو پھر میں باہر چلا جاتا ہوں۔" اُس نے جلدی جلدی آنسو پونچھ لیے۔

مولوی صاحب کے جاگنے کے خیال سے میں نے ایک بار دروازے سے جھانک کے دیکھ لینا مناسب سمجھا۔ وہ اپنی چارپائی پر کسمسا رہے تھے، میں نے کورا کو ہاتھ ہلا کے الوداع کہا اور اشارے سے اُسے سو جانے کی تاکید کر کے چپکے سے باہر نکل آیا۔ پھر میں زمین پر بچھی ہوئی چادر پر لیٹ گیا۔ "عزیزم! میرے پلنگ پر آ جاؤ، نیچے تمھیں زحمت ہو رہی ہو گی۔"

"آپ جاگ رہے ہیں مولوی صاحب؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "میں فہمیدہ سے سر دبوانے کے لیے اندر چلا گیا تھا۔ وہ بھی جاگ رہی ہے۔"

"ہاں بھئی، ایسے عالم میں کسے نیند آتی ہے؟" مولوی صاحب کا یہ فقرہ میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگا۔ اُنھوں نے ہماری باتیں تو نہیں سُن لیں؟ ہم تو بہت آہستگی سے باتیں کر رہے تھے، ممکن ہے اُنھوں نے دروازے کی جھری سے جھانک کر سب کچھ دیکھ لیا ہو؟ وہ تو صرف میرا سر دبا رہی تھی۔ مولوی صاحب ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہے۔ میں نے اُن سے اس کے بعد کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھی۔ رات کے آخری حصّے میں بہ دقت تمام میری آنکھیں بند ہوئیں۔

صبح طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے میں وہیں لیٹا رہا اور مولوی صاحب کو میں نے ایک غلط پتہ دے دیا تاکہ وہ گھر تار دے دیں۔ مولوی صاحب جیسے ہی تار دینے گئے، میں نے سامان سمیٹ کے سوٹ کیس میں بند کر دیا اور چاقو جیب میں رکھ لیا۔ دفتر ابھی بند تھا۔ گلی میں مولوی صاحب کی عدم موجودگی کی تصدیق کر کے میں نے ایک مختصر خط اُن کے نام لکھا۔

"ہم جا رہے ہیں، آپ کی محبت اور عنایت کا شکریہ۔
ہم آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ یہاں رہ کے ہم
خود پر ایک بوجھ محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے ہم جا رہے ہیں۔"

یہ خط میں نے اُن کے ٹرنک پر پتھر سے دبا کے رکھ دیا۔ تیاری میں کچھ دیر نہیں تھی۔ کورا نے بُرقع اوڑھا، میں نے سُرعت سے شیروانی پہنی اور ایک مرتبہ پھر باہر جا کے دیکھا۔ ہم کسی رکاوٹ کے بغیر گلی میں آ گئے اور گلیوں گلیوں ہوتے ہوتے کسی نامعلوم بازار میں جا نکلے۔ راستے میں ہر طرف سے نگاہیں اُٹھیں مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ایک بُرقع پوش لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ گزر رہی تھی۔ کیڑے نالیوں میں رینگتے رہتے ہیں۔ اُنھی نالیوں کی طرح کلکتے میں گلیوں کا جال بچھا ہوا ہے جس میں انسان رینگتے، کلبلاتے، سڑتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بڑی سڑک پر آ کے ہم ایک رکشا میں بیٹھ گئے۔ رکشا ایک نہایت سیاہ ناتواں شخص چلا رہا تھا جس کی پسلیاں ایک ایک کر کے گِنی جا سکتی تھیں۔ میں نے اُسے ہوڑا اسٹیشن کا پتہ دیا۔ کورا مجھ سے لگی بیٹھی تھی، یہ امر پہلی بار بے حد دلکش محسوس ہوا اور جی چاہا کہ کورا اسی طرح قریب بیٹھی رہے اور رکشا ساری عمر چلتا رہے۔ میری نظریں دائیں بائیں کی ہوٹلوں کے بورڈوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ میری نظر ٹک گئی۔ میں نے رکشا رکوا کے جائزہ لیا۔ یہ جگہ معقول نظر آتی تھی۔ یہاں زیادہ شور و غل بھی نہیں تھا۔ ہوٹل کا بورڈ اردو میں لکھا ہوا تھا۔ رکشے والے کو پیسے ادا کر کے میں نے شیروانی کے بٹن بند کیے اور چال میں ایک ٹھہراؤ پیدا کر لیا۔ دروازے ہی پر میرے ہاتھ سے ایک شخص نے سوٹ کیس چھین لیا۔ "کمرہ چاہیے جناب؟"

"ہاں جی۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "مگر..."

"مگر کیا صاحب؟ ایک نمبر ہوٹل ہے، فلش کا انتظام، مرغن کھانا، صاف ستھرا بستر۔ آپ آزمائیے تو سہی۔ اس علاقے میں دُور دُور ایسا ہوٹل نہیں ہے۔"

"ہمیں زیادہ نہیں ٹھہرنا، یہی دو تین دن۔"

"آپ ایک بار ٹھہر کے تو دیکھیے۔ پھر آپ بار بار اِدھر آئیں گے۔" وہ آگے بڑھتے ہوتے بولا اور ایک زینہ عبور کر کے مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ منیجر نے مجھے دلچسپی سے دیکھا اور جب اُس کی نظر کمرے کے باہر کھڑی ہوئی کورا پر پڑی تو اُس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ پھر اگر وہ فوراً مجھے چابی نہ دے دیتا تو میں وہیں سے واپس ہو جاتا۔ "دوسری منزل، کمرہ نمبر ۲۱۲۔" اُس نے ملازم سے کہا اور مجھے ہدایت کی کہ میں رجسٹر پر آ کے نام اور پتہ لکھوا دوں۔ "ہاں۔" وہ مجھے دوبارہ متوجہ کرتے ہوتے بولا۔ "پندرہ روپے یومیہ ہوں گے جناب!"

یہ رقم بہت زیادہ تھی خصوصاً اُس شخص کے لیے جس کا کُل اثاثہ پانچ چھ سو روپے ہو مگر میں نے بے فکری سے سُنا اور واپس آ گیا۔ دوسری منزل پر ہمیں جو کمرہ دیا گیا تھا، وہ اتنا بڑا نہیں تھا مگر ہمارے لیے کسی محل کے برابر تھا۔ ہمیں تو سر چھپانے کی جگہ چاہیے تھی۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں کسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ کمرے میں دو پلنگ موجود تھے اُن کے درمیان ایک چھوٹی سی میز تھی۔ ایک طرف سنگھار میز اور کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ غسل خانہ بھی صاف ستھرا تھا۔ چٹخنی بند کر کے میں دھڑام سے بستر پر گر گیا۔ کورا نے چہرے سے نقاب ہٹا دی تھی۔ چاند بدلی سے نکل آیا تھا۔ "کیسی جگہ ہے؟" میں نے کسی قدر مطمئن لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" اُس کے لہجے سے مایوسی مترشح تھی۔

"تم تو اپنے بابا کے ساتھ بہت سے ہوٹلوں میں ٹھہری ہو گی، اچھے ہوٹلوں میں۔"

"ہاں، ہندوستان آنے کے بعد ہم کئی جگہ ٹھہرے۔"

"میں نیچے نام پتہ لکھوا کے آتا ہوں۔ تم صرف میری آواز پر دروازہ کھولنا۔ میں تین بار دستک کروں گا۔" یہ کہہ کے میں نیچے آ گیا۔ راستے میں میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے رجسٹر میں کیا اندراج کرانا ہے؟ نیچے کے کمرے میں جو لوگ بیٹھے تھے، وہ مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے، مجھے یہ گمان ہوا کہ وہ میرے ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ منیجر نے ایک رجسٹر میرے سامنے

رکھ دیا۔ میں نے اپنا نام انور علی لکھا، عمر ۲۴ سال، پتہ محلہ فیض گنج مراد آباد۔ اس جگہ کا نام میں نے مولوی صاحب سے سُنا تھا۔ ساتھ میں ایک بہن بہن کا نام کیا بتاؤں اور عمر؟ عمر کا خانہ آیا تو میں جھجکنے لگا، ۲۵، ۲۰، یا ۳۵ اگر کہیں ان میں سے کسی کی نظر کورا کے چہرے پر پڑ گئی تو؟ میں نے بہن لکھ کے جگہ خالی رہنے دی۔ منیجر میرا پس و پیش تاڑ گیا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے مہذب لہجے میں کہا۔ "ہم خواتین کے نام اور عمریں نہیں لکھتے۔"

"شکریہ۔" میں نے مسکرا کے کہا اور اُس کے مطالبے پر ۳۰ روپے پیشگی دے دیے۔ اب تک ہر کام اطمینان بخش طور پر انجام پایا تھا۔ دُوسری منزل پر دونوں طرف کمروں کا ایک سلسلہ تھا۔ درمیان میں ایک تنگ راستہ گزرتا تھا۔ اُس کے آخری سرے پر ہوٹل کے بیرے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں انہیں نظرانداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ "اب کیا ہو گا؟" کورا نے پوچھا۔

"اب کچھ دیر آرام کریں گے، پھر سو میں گے کہ کیا ہو۔ کچھ شہر کی تفریح کریں گے۔" اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دل اُچھل کے حلق میں آ گیا۔ "بیرا ہو گا۔" کورا نے یہ کہہ کے میری دہشت دور کی۔

میں نے کورا کو آرام سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ذرا سا دروازہ کھول کے دیکھا۔ بیرا ہی تھا۔ "کچھ کھانا چاہتے وغیرہ صاحب؟ میں سامنے بیٹھا ہوں، جس چیز کی ضرورت ہو، گھنٹی بجا دیجیے گا۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے اُسے دو روپے تھما دیے۔ مولوی صاحب نے اپنے واقعات بتاتے ہوئے مجھے ایک بیرے کو زیادہ بخشش دینے کا حال سُنایا تھا۔ وہ بات میرے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ واقعی اُس کے چہرے کا موسم ہی بدل گیا۔ اُس نے ادب سے مجھے سلام کیا اور ایک بار پھر اپنی خدمات کی پیش کش کی۔ میں نے جلد سے جلد اُس بلا کو ٹالنے کے لیے دروازہ بند کر دیا۔

"کچھ کھاؤ گی؟" میں نے کورا کے کانوں کے قریب جا کے زور سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"کھایا پیا کرو۔ نہیں تو دُبلی ہو جاؤ گی۔"

"تم ذرا غور کر کے دیکھو۔ چہرہ کیسا ہو رہا ہے۔ پیلا ہو گیا ہے۔ ایک دن میں تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس ذرا رہنے کی جگہ اور کام مل جائے۔ پھر دیکھنا میں کیسا موٹا ہو جاؤں گا۔"

"باہر!" وہ پُرخیال لہجے میں بولی۔ "کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں انسان نہیں رہتے؟ چلو کسی پہاڑ پر کسی جنگل میں چلیں، جب ذرا بڑے ہو جائیں گے چلے آئیں گے۔"

"انسان وہاں بھی ہوں گے۔ انسان ہر جگہ موجود ہیں۔" میں نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ وہ میرے سرہانے بیٹھ گئی تھی اور اُس نے اپنی کہنی میرے شانوں پر ٹکا دی تھی۔

"جب میں یہاں آئی تھی تو سب لوگ مجھے گھور گھور کے دیکھ رہے تھے۔ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں بابر؟"

"پتہ نہیں! شاید ان لوگوں کے گھروں میں عورتیں نہیں ہوتیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"چلو تم تیار ہو جاؤ۔ اس شہر میں رہنا ہے تو ہمارے لیے یہاں کے گلی کوچوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔"

پہلے میں نہایا، پھر وہ نہائی۔ جب وہ غسل خانے سے نہا کے برآمد ہوئی تو مجھے ایک بڑی سی لڑکی نظر آئی۔ وہ شرما رہی تھی، نگاہ اٹھاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ ہمارے پاس کپڑے کم تھے، اس لیے کہ ان ہی کپڑے پہن لیے جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ میں نے صندوق سے مال نکال کے اپنی جیب میں رکھ لی۔ پھر ہم تالا لگا کے ہوٹل سے باہر جانا ہی چاہتے تھے کہ بیرا لپکتا ہوا آیا۔ "سرکار کہیں جا رہے ہیں؟" اُس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو مجھے اچھی نہیں لگی۔ "کب واپسی ہو گی؟"

"معلوم نہیں کب آئیں۔" میں نے جھنجلاہٹ سے کہا۔ "کیا یہاں بتانا پڑتا ہے یا یہاں آنے جانے کے اوقات مقرر ہیں؟"

"نہیں حضور! ایسی کوئی بات نہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ سرکار کچھ خدمت کا موقع دیں! کچھ کھانے پینے کا انتظام کر سکوں؟"

"جب آئیں گے تو بتائیں گے۔" میں زینے سے اُترنے لگا۔ کورا میرے پیچھے پیچھے تھی۔ نیچے اُترنے تک ہمیں دیکھ کے کسی نے گلا صاف کیا، کسی کے لبوں پر مسکراہٹ آئی، کسی کی نگاہ میں چمک پیدا ہوئی، ہم یہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے سڑک پر آ نکلے۔

چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ ایک معقول شکل و صورت کے ٹیکسی والے نے ہمارے قریب ٹیکسی روک کے پوچھا۔ "کہاں جائیے گا جناب؟"

"کہیں نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کسی نہ کسی سواری میں تو بیٹھنا ہی ہو گا۔ "ٹھیرو۔" میں نے اُسے حکم دیا۔

"جناب! کلکتے کی سیر کیجیے۔" ڈرائیور نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"بہت کی ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "ہمیں بڑے بازار تک لے چلو۔" بڑے بازار کا نام میں نے اسٹیشن پر لگے ہوئے اشتہاری بورڈوں میں کہیں دیکھ لیا تھا۔ ڈرائیور نے ایک لمحے کچھ سوچا اور دروازہ کھول دیا۔ اب وہ تھا اور کلکتے کی سڑکیں تھیں ہم میلوں بھاگتے رہنے۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک بازار سے دوسرا بازار۔ نہ بڑا بازار آ کے نہیں دیا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ایسی جگہ کا نام کیوں لے دیا جو ہوٹل سے اتنی دُور ہے۔ ڈرائیور سے یہ پوچھتے ہوئے بھی جھجک ہو رہی تھی کہ وہ کتنا فاصلہ طے کرے گا؟ ممکن ہے، بڑا بازار اتنی ہی دُور ہو۔ آخر بہت دیر بعد میں نے اُسے ٹوکا۔ "تم نے گاڑی غلط راستے پر ڈال دی ہے۔"

وہ کچھ چونکا مگر دوسرے ہی لمحے اطمینان سے کہنے لگا۔ "صاب! راستہ تو غلط نہیں ہے، البتہ میں آپ کو صاف ستھرے راستوں سے لے

کے آیا ہوں، ذرا کلکتے کی بہار بھی دیکھیے۔"

ہمارا مقصد بھی یہی تھا کہ کلکتہ خوب دیکھا جائے۔ پھر ڈرائیور گاڑی ایک ایسی جگہ لے آیا جہاں بڑی بڑی عمارتیں ختم ہو گئی تھیں اور نیم شہری علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ جگہ دیکھ کے مجھے کچھ پریشانی ہوئی۔ ہم بتدریج کسی ویران علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ "یہ تم کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"بڑے بازار۔" ڈرائیور نے گردن موڑ کے کہا۔ "جناب! یہ غریبوں کی بستی بھی دیکھیے۔ آئیے میں آپ کو اپنا گھر دکھاؤں۔"

"میں نے تم سے صرف بڑے بازار چلنے کے لیے کہا تھا۔ یہ تم کہاں لے آئے؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

"بڑے بازار ہی چل رہا ہوں صاب!"

"ہمیں نہیں جانا، واپس چلو۔" میری آواز غصّے سے کانپنے لگی۔ کورا برقع میں سانس روکے بیٹھی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ ہی دور آگے جا کے اُس نے گاڑی روک لی اور انجن بند کر دیا۔ یہ درختوں میں ڈھکا ہوا ایک سنسان علاقہ تھا۔ وہ گردن گھما کے اطمینان سے پیچھے مڑا۔ "ذرا ان کا مکھڑا تو دکھا دیجیے۔" اُس نے عیارانہ مسکراہٹ سے کہا اور ایک دم کورا کے نقاب پر ہاتھ ڈال دیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" میں اُس کا ہاتھ روک کے چیخا۔ "اپنا ہاتھ ہٹاؤ ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟ صاب! ابھی تمہاری عمر ان باتوں کی نہیں ہے انہیں تو ہم پر چھوڑ دو۔" اُس نے خشونت سے کہا۔

"میں کہتا ہوں، گاڑی واپس لے چلو۔" اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔

"ان نازک ہاتھوں کو کیوں زحمت دیتے ہو صاحب؟" اُس نے زور سے جھٹکا دیا۔ میرا ہاتھ دروازے سے لگا۔

کورا نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا لیا تھا اور چیخنا شروع کر دیا تھا۔ ڈرائیور اُس کا چہرہ دیکھ کے بدحواس ہو گیا۔ اس نے اُس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کے منہ پر ایک مکا رسید کر دیا۔ اُس پر وحشت طاری ہو گئی۔ اُس نے میرے سر پر ایک زور کا ہاتھ مارا اور دروازے کا ہینڈل گھما کے مجھے باہر پھینکنے کی کوشش کرنے لگا۔ کورا نے اُس کے ہاتھ نوچنے اور کاٹنے شروع کر دیے تھے۔ ڈرائیور بُری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے میری گردن پکڑ لی۔ کورا نے سراسیمگی میں اُسے کاٹنا اور نوچنا بند کر دیا۔ "کورا! اس کا بچا نار لو۔" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ میری گردن اُس کے نیچے میں تھی۔ کورا نے اس زور سے اُس کی کلائی کاٹی کہ اُس نے بلبلا کے میری گردن چھوڑ دی۔ اس عرصے میں مجھے اپنی اندرونی جیب سے چاقو نکالنے کا موقع مل گیا۔ میں نے چاقو کا کھٹکا دبایا تو اُس کا پھل بجلی کی طرح دستے سے نکل آیا۔ میرے ہاتھوں میں چاقو دیکھ کے ڈرائیور کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ اگر چاقو دیکھ کے اُس کی آنکھیں بجھ نہ جاتیں تو میں چاقو دستے سمیت اُس کی گردن میں اُتار دیتا۔ وہ مبہوت رہ گیا۔ "چل۔" میں نے اُس کی گردن پر چاقو کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔" مجھے اُس سے کسی رواداری کی توقع نہیں تھی، اس لیے میں نے مزید کہا۔ "تو ہمیں جانتا نہیں ہے کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"گاڑی چلاؤ۔" کورا نے بھی تحکمانہ لہجے میں کہا۔

ڈرائیور سکتے میں رہ گیا تھا۔ چاقو کی نوک اُس کی گردن میں چبھ رہی تھی وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ چاقو قربانی اور شکار کے موقعوں کے علاوہ گھر میں بے کار پڑا رہتا تھا۔ اس کی قدر و قیمت آج معلوم ہوئی جب میں نے دو تین بار ڈرائیور کی گردن میں نوک چبھوئی تو اُس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ کورا کو اشارہ کر کے میں نے پھرتی سے چاقو اس کے ہاتھ میں دے دیا اور دروازہ کھول کے اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے صرف ایک لحظے میں چاقو کورا کے ہاتھ سے لے کے ڈرائیور کی داہنی پسلی میں چبھو دیا۔ اُس نے ہلکی سی سسکاری بھری اور چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ جب تک وہ دوبارہ آبادی میں نہیں آ گئی، میں نے اُسی پر نظریں جمائے رکھیں۔ میرا چاقو مسلسل اُس کے جسم سے چپکا رہا۔ جب بھی گاڑی کو جھٹکا لگتا، ڈرائیور کراہ کے دروازے کی جانب سمٹتا۔ "تھانے لے چلو۔" میں نے کرخت آواز میں اُسے حکم دیا۔

"جی؟" وہ بُری طرح گھبرا گیا۔

"ہاں تھانے۔ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم نے کس کے ساتھ گستاخی کی تھی۔ تمہیں دس سال کی سزا نہ کراؤں تو کہنا۔" میں نے اشتعال میں کہا۔

"مجھے معاف کر دیجیے صاب! بال بچے ہیں۔ مجھ پر شیطان سوار ہو گیا تھا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔" وہ گھگھیانے لگا تھا لیکن میں بازار میں پہنچنے تک اپنے فیصلے پر بضد رہا۔

کورا نے اُسے معاف کرنے میں عجلت کی۔ ہم نے ہوٹل جانے کے بجائے اُسے راستے میں چھوڑ دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ ہمیں ہوٹل کے دروازے پر چھوڑ کے جائے۔ میں نے اُس کے سامنے ٹیکسی کا نمبر لکھا اور اُس کا نام نوٹ کر لیا۔ بعد میں مجھے یہ دلچسپ بات معلوم ہوئی کہ بڑا بازار ہوٹل سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ خیر جب وہ چلا گیا تو سڑک پر چلنا ہمارے لیے مشکل ہو گیا۔ اب ہمارے لرزنے اور سراسیمہ ہونے کی باری تھی۔ ہمارے دلوں پر ایک ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں فٹ پاتھ پر گم سم کسی دُوسری ٹیکسی کی تلاش میں جا رہے تھے۔ کورا نے اچانک میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے اختلاجی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کورا کی دہشت زدہ آواز سے میرے سینے پر جیسے کوئی گولا گرا۔ "وہ۔" وہ شارعِ عام پر میرے بازو سے چمٹ گئی۔

"کون؟" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"وہی۔ بھاگ چلو، وہی لوگ۔" وہ پیچھے مڑتی ہوئی بولی۔ میں نے

سامنے کی طرف دیکھا۔ دوسری فٹ پاتھ پر گیروے لباس میں ملبوس دو بدھ راہب نہایت محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوتے آہستہ آہستہ آ رہے تھے، وہ ہم سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ گو کورا برقع میں تھی لیکن میں انہیں دیکھ کے اُسے قریب کی ایک گلی میں لے آیا۔" وہ وہی ہیں میں انہیں جانتی ہوں، وہ ہمارے قبیلے کے لوگ ہیں۔"

گھبراؤ نہیں۔ انھوں نے ہمیں دیکھا نہیں ہے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ ہم ہندوؤں کے ایک محلے سے گزر رہے تھے، یہ بہت گنجان علاقہ تھا۔ گلیوں میں گندگی پھیلی ہوئی تھی، ہندو بنگالنیں ہمیں اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے ہم انسان نہیں، کچھ اور ہوں، جدھر بھی نظر جاتی تھی، ہماری طرف اشارے ہو رہے تھے انگلیاں اُٹھ رہی تھیں، آج شاید اس گلی میں پہلی بار کوئی برقع پوش عورت اور شیروانی پہنے ہوتے ایک شخص دکھائی دیا تھا۔ ہمیں گلیوں کا پتہ نہیں تھا، ہم یوں ہی اِدھر اُدھر گھومتے اور خود کو تماشا بناتے رہے۔ آخر ایک اور سڑک پر جا نکلے۔ خوش قسمتی سے وہاں ہمیں ہاتھ والا رکشا مل گیا۔ ہوٹل جاتے ہوتے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ پیروں میں دُکھن ہونے لگی تھی۔ بھوک اور پیاس کے عالم میں ہم کہیں پانچ بجے ہوٹل پہنچے اور دروازہ بند کر کے ہانپنے لگے۔ کورا کا انگارا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔" بابو! وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "بابو! ہم نے گھر سے آ کے غلطی کی تھی اور دوسری غلطی مولوی صاحب کے ہاں سے آ کے کی۔ واپس چلو نہیں تو میرا دم گھٹ جائیگا۔"

میں نے اُس کی ٹھوڑی اُوپر اٹھائی۔ اُس نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے گردن جھکالی تھی۔ "کورا!" میں نے کرب سے کہا۔ "خدا کے لیے اپنے آپ کو سنبھالو یقین کرو، یہ بُرا وقت ٹل جائے گا، اچھے دن آ جائیں گے۔"

اس کے سوا میرے پاس کہنے کے لیے اور کیا تھا۔ ان لفظوں میں کوئی جان نہیں تھی اُسے ان پر اعتماد کیسے آتا؟ وہ ہچکیاں لینے لگی میں نے اپنی روح جاتی ہوئی محسوس کی جیسے کوئی میری طاقت کھینچ رہا ہو۔ میں نے اُسے اُٹھا کے کھڑا کیا۔ اُس کے سرسبز چہرے پر شبنم پڑی ہوئی تھی۔ میرا جی ایسا اُمڈا، ایسی کھلبلی مچی، سینے میں ایسا درد اٹھا، ایسا طوفان آیا کہ میں نے اُسے بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ کورا کو تو جیسے رونے کا بہانہ مل گیا، جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا۔ وہ ایسا روئی، اتنا روئی کہ شاید ہی کوئی رویا ہو گا۔ میں اسے سمجھاتا اور تسلیاں دیتا رہا۔ روتی ہوئی تسلیاں بے اثر ہوتی ہیں۔ وہ جس ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی، اُس کی بنیادیں ہی کمزور تھیں۔ ستون خود اشک فشاں تھا اور اُس کی مٹی اُس کے آنسوؤں سے بہی جا رہی تھی۔

مجھے اُس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے میری تخلیق اُسی کے لیے ہوئی ہے۔ وہ رو رہی ہے تو میں رو رہا ہوں، وہ مسکرا رہی ہے تو میں مسکرا رہا ہوں، وہ دُکھ میں ہے تو میں دُکھ میں ہوں۔ وہ نہیں ہے تو میں بھی نہیں ہوں اور کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر جب وہ میرے سینے میں سمائی تو مجھے یاد آیا کہ میں تو اُسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا اپنے گھر سے رشتہ تو ایک رسمی چیز تھا مجھے تو وہاں سے اُٹھ کے کہیں اور آنا تھا۔

کمرے میں گہرا اندھیرا ہو گیا۔ ہمیں کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ ہم ایک دوسرے کو شناخت کرتے رہے۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ہم اِس دنیا میں لوٹ آتے لیکن اب ہمارے دلوں پر اِس قدر بوجھ نہیں تھا۔ میں نے اُسے مسہری پر بٹھا کے روشنی کی اور اُس کے آنسو پونچھ کے دروازے پہنچا۔ بیرا خدمت کے لیے حاضر تھا۔ "حضور نے کچھ طلب نہیں کیا؟"

"ضرورت ہی نہیں پڑی۔" میں نے باہر آ کے کہا۔

"میں یہیں موجود ہوں۔ گھنٹی بجا دیجیے گا اور ہاں کچھ شوق ہیں آپ؟" اُس نے گردن گھماتے ہوتے کہا۔ "ان دنوں یہاں بڑی سختی ہے مگر ہم اپنے معزز مہمانوں کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام رکھتے ہیں۔ حکم ہو تو پیش کروں؟ انگریزی راج میں سبھی قسم کی چیزیں ہیں۔" میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ میں ابھی اُس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کہنے لگا۔ "دوسری پری بھی موجود ہو تو سرکار! بہار ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

"تم کس پری کی بات کر رہے ہو؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ اُس کے چہرے پر یک بارگی ناگواری پیدا ہوئی، پھر وہ سنبھل کے بولا۔ "یہاں تو سب اُسے پری کہتے ہیں۔ آپ کے ہاں پتہ نہیں کیا کہتے ہوں گے۔"

"لے آؤ۔" میں نے سرسری انداز میں کہہ دیا۔ کورا اندر تھی۔ مجھے اُس کی فکر ستا رہی تھی۔

"ابھی پیش کرتا ہوں۔" اُس نے چٹکی بجاتے ہوتے کہا۔

ہم دونوں نے دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں سمجھا کہ بیرا اِس وقت کوئی خاص چیز لے کے آنے والا ہے۔ کورا نے برقع اُتار دیا تھا اور کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ دستک ہوئی۔ بیرے نے اخباری کاغذ میں تہہ در تہہ لپٹی ہوئی کوئی وزنی چیز مجھے تھمائی۔ "انگلش ہے جناب! قیمت بھی انتہائی مناسب ہے۔ صرف تیس روپے۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ کہنے لگا۔ "پھر دے دیجیے گا۔ ایسی کون سی جلدی ہے۔ ہاں، ایک بات سرکار!" اُس نے اوپر کی منزل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حضور شوقین معلوم ہوتے ہیں، اوپر بھی جناب کی پسند کے کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ ایک نظر دیکھ لیجیے گا۔ بخدا میرا دل کہتا ہے، آپ کوئی نواب ہیں۔ ہائے لکھنؤ، جس دن سے وہ شہر چھوڑا ہے، آدمی ہی نظر نہیں آتے، مچھ آتے ہیں۔"

"تم کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"واہ حضور! کیسی سادگی ہے، وہی جناب! انجمن آرا، عشرت، ننھی جان۔" وہ ہاتھ نچاتے ہوتے بولا۔ "کلکتے سے تو وہ بہت نالاں ہیں۔ یہاں اہلِ دل کی تلاش میں آئی تھیں مگر یہاں کہاں وہ لوگ۔"

باتیں کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگیں۔ میں نے اپنے پہلو میں ہوئی چیز کے پرت کھولنے شروع کیے۔ جیسا کہ مجھے شبہ ہوا تھا، وہ [illegible] کی بوتل تھی، اسکاچ وسکی مجھے شدید گھن آئی۔ میں نے زندگی میں

دفعہ شراب کی بوتل چھوئی تھی۔ میں نے اُسے بیرے کے سر پر دے مارنے کا ارادہ کیا مگر میرے حیرت زدہ ہاتھ کچھ نہیں کر سکے۔ چند لمحوں تک میں ٹکٹکی باندھے بوتل دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کے میں نے اُسے دوبارہ کاغذ میں لپیٹ لیا۔ "تمہارا نام؟" میں نے مضبوط لہجے میں پوچھا۔

"نام کیا جناب! سب اکن میاں کہتے ہیں۔ کیسی چیز آپ کو پسند آئی؟" اُس نے آنکھ مار کے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے تذبذب سے جواب دیا۔ "اکن میاں! اب ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کھانا بھجوا دیجیے۔"

"ظاہر ہے، ایک دو گھنٹے بعد۔" وہ شوخی سے بولا۔

"نہیں ابھی۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"جیسی مرضی جناب کی۔" اُس نے سر ہلا کے کہا۔ میں نے جھٹ دروازہ بند کر لیا۔ میرے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ یہ ہوٹل شرابیوں اور طوائفوں کا ہوٹل تھا۔ وہ ذلیل کورا کے متعلق بھی یہی سمجھ رہا تھا کتابوں میں یہ باتیں پڑھی تھیں اور یقین نہیں آتا تھا۔ اب سب کچھ سامنے تھا۔ میں نے اکن میاں کو جان بوجھ کر اُس کی بدزبانی کی سزا نہیں دی کیونکہ خطا میری تھی کہ میں کورا جیسی معصوم لڑکی کو ایسے گندے ہوٹل میں لے آیا تھا۔

میں نے بوتل غسل خانے میں رکھ کے ہاتھ دھوتے۔ کھانا تو ہم سے کھایا نہیں گیا سب بچ گیا۔ اُس وقت باہر جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، دھیمی روشنی کر کے ہم دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ رات دبے پاؤں گزرتی رہی۔ ہم دونوں کے سوال ایک ہی تھے اور جواب؟ کاش ہمیں اُن کے جواب معلوم ہوتے۔ آدھی رات کے وقت میں نے دیکھا کہ کورا پلنگ پر بیٹھی ہوئی ایک جانب دیکھ رہی ہے۔ مجھ پر ہیجان طاری ہو گیا۔ میں نے اُس کا حال پوچھا تو وہ نیند نہ آنے کا شکوہ کرنے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر کے واقعات سنا کے اُسے بہلانے کی کوشش کی۔ اُسے ہنسانا چاہا۔ پھر میں نے اُس کے پلنگ پر پہنچ کے اُس کا سر اپنی چھاتی پر رکھ لیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اُسے کچھ سکون آ گیا۔ میں نے اپنی نشست نہیں بدلی تاکہ وہ بے آرام نہ ہو جائے۔ میں اسی طرح ایک کروٹ سے بیٹھا رہا۔ آخر اُسے نیند آ گئی۔

صبح ہوتے ہی میں نے اکن میاں سے آخری بار چائے منگوائی اور تیس روپے کے ساتھ بھری ہوئی بوتل اُس کے حوالے کر دی۔ اُس کے منہ پر تھوکنے کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔ نیچے دفتر میں چابی دے کے میں نے پیشگی کرایہ بھی واپس نہیں مانگا۔ اکن میاں اور منیجر میری صورت دیکھتے رہ گئے۔

دو دن میں دنیا بدل گئی۔ اپنے قد و قامت اور زمانے کی نیرنگی کا اندازہ ہوا۔ کلکتے کی ہر سڑک وزن کا کانٹا تھی جو ہر لمحے آدمی کو اُس کی اوقات کا احساس دلاتی رہتی تھی۔ ایک گھنٹے تک ہم یوں ہی گھومتے رہے۔ کہاں جائیں؟ کس طرف کا رُخ کریں؟ ہمارا کوئی بھی تو نہیں ہے؟ ہمیں نیکی اور محنت سے رہنے کے لیے کوئی جگہ میسر نہیں ہے۔ میں نے سوچا کورا کا برقع اُتروا دوں، اس طرح لوگوں کا تجسس ختم ہو جائے گا مگر اُس کے دشمن یہاں بھی موجود تھے اور مسلسل اُس کا تعاقب کر رہے تھے۔ آدمی کو کہیں آزادی نہیں ملتی۔ اُس کا ارادہ سماج کا پابند ہے۔ میں نے حال ہی میں روسو کا ایک مقولہ پڑھا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جدھر دیکھو، پابہ زنجیر ہے۔ اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ روسو کا مطلب کیا ہے، حالانکہ مطلب گیا میں بھی اتنا ہی واضح تھا جتنا کلکتے میں۔ پھر مجھے ایک ہوٹل نظر آ گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں آدمی چھت کے بغیر رہتا تھا مگر اب چھت کے بغیر اُس کا گزارا نہیں ہوتا۔ یہاں ہر شخص کو ایک چھت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ مجھے کسی دوسرے ہوٹل میں جانے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ یہ ہوٹل پہلے والے ہوٹل سے خاصا مختلف تھا۔ ہم نے کمرے میں جا کے خود کو بند کر لیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں؟ میں کام کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا مگر کورا کو ہوٹل میں تنہا چھوڑ کے کیسے جا سکتا تھا۔ پیسے جیب سے بھاگ رہے تھے۔ میں نے سوچا جلد ہی کام کا کوئی بندوبست نہ ہوا تو سارے پیسے ختم ہو جائیں گے پھر یہ ہوٹل بھی نہ رہے گا۔ کسی سے دل کی بات کہتے ہوتے خوف آتا تھا اور کسی سے کچھ کہے بغیر چارہ بھی نہیں تھا مگر کس سے بات کریں؟ ہر شخص پورا سُراغ لگاتا ہے۔ اس ہوٹل میں بھی یہی ہوا۔ لوگوں نے برقع پوش کورا کو دیکھ کے اشارے کیے، آوازے کسے۔ شام کے وقت میں اُس کے ساتھ سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا۔ ایک آدمی تیزی سے اُترتا ہوا کورا سے ٹکرا گیا۔ کورا سیڑھیوں پر گر پڑی اور لڑھکتی ہوئی دُور جا گری۔ اس افراتفری میں اُس کا نقاب اُٹھ گیا۔ ہوٹل کے بیروں اور دوسرے لوگوں نے اُس کا چہرہ دیکھ لیا، وہ چہرہ جو میں چھپاتے چھپاتے پھر رہا تھا۔ کورا کے گھٹنے میں چوٹ آ گئی تھی۔ ہمارے اردگرد اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ وہ آدمی معذرت کرنے لگا کہ اُس سے چوک ہو گئی۔ ایک دوسرا ادھیڑ عمر شخص ہماری ہمدردی میں اُسے بُرا بھلا کہنے لگا۔ میں حیران و پریشان تھا کہ کس کا گریبان پکڑوں؟ کس کے پیٹ میں چاقو اُتاروں؟ کس کی آنکھیں نکال لوں؟ ہنگامہ بڑھ جانے کا خطرہ تھا مگر کورا نے غیر معمولی برداشت کا ثبوت دیا۔ وہ کراہتی ہوئی فوراً اُٹھ گئی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ سب نے دیکھ لیا تھا کہ میرے ساتھ ایک چھوٹی لڑکی ہے جس کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں ہے مگر ابھی سے اُس کے شباب کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ اُس کی ابتدا ہی سے انتہا کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ کورا لنگڑا رہی تھی۔ اس لیے میں اُسے دوبارہ کمرے میں لے آیا۔ وہ فہمیدہ کا چھوٹی موری کا پاجامہ پہنے ہوتے تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ اپنا گھٹنا دکھاؤ تو وہ شرمانے لگی لیکن اُس کی چوٹ کچھ شدید معلوم ہوتی تھی۔ زخم دیکھے بغیر مجھے قرار نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے اُسے باتھ روم بھیج دیا تاکہ وہ کوئی ڈھیلا لباس پہن لے۔ وہ غسل خانے سے یہ کہتی ہوئی واپس آ گئی کہ معمولی چوٹ ہے۔ میں اُس کی پنڈلیاں دبانے لگا۔ وہ مجھ سے گھر واپس چلنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔

گھر اب کہاں تھا؟ گھر اپنا ہوتا تو ہمیں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی میں اُسے سمجھا ہی رہا تھا کہ ٹک ٹک کی آواز آئی۔ میں نے کورا پر چادر ڈال کے دروازہ کھول کے دیکھا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص میرے سامنے کھڑا تھا جو ہمیں کچھ دیر پہلے سیڑھیوں پر ملا تھا اور جس نے ہم سے بڑی ہمدردی ظاہر کی تھی۔ "مجھے کریم گل کہتے ہیں۔" اُس نے نفاست سے کہا۔ "کیسے اندر خیریت تو ہے؟"

میں نے اُس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "میری بہن کو معمولی چوٹ آئی ہے۔" خیال تھا کہ وہ جلد ہی رخصت ہو جائے گا مگر وہ دروازے ہی پر اپنا تفصیلی تعارف کرانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ کچھ عرصے سے اُس کا قیام مستقل اسی ہوٹل میں ہے اور اس اعتبار سے وہ میرا پڑوسی ہے اور پڑوسی کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ "کبھی اُوپر آئیے۔ اِن دنوں تو گھر سے بھی کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ آپ سے مل کے ہمارے گھر والے خوش ہوں گے۔ آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟" مجھے خاموش دیکھ کے وہ بولا۔

ظاہر ہے میں نے اُسے اپنا غلط نام بتایا۔ کریم گل مجھ سے یہ وعدہ لیے بغیر نہیں ٹلا کہ رات کو میں ضرور اُس کے کمرے میں آؤں گا۔ میں اب ہوٹل میں رہنے والے کسی شخص سے ملنے کا قائل نہیں رہا تھا مگر کریم گل رات کو آٹھ بجے پھر آدھمکا۔ میں نے اُسے اندر نہیں بُلایا، دروازے ہی پر اُس سے کہہ دیا کہ میں کچھ دیر بعد خود آؤں گا۔ شکل و صورت سے وہ رکھ رکھاؤ کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میں فیصلہ کرتا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ اُس نے کورا کو بھی بُلایا تھا لیکن کورا کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں تھا۔ پھر کورا کمرے میں اکیلی رہے گی۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ اگر میں نہ گیا تو وہ پھر آدھمکے گا۔ ممکن ہے وہ کوئی ہمدرد آدمی ہو، شاید ہماری مصیبتیں دُور کرنے کا سبب بن جائے۔ میں نے کورا سے ذکر کیا تو وہ بھی کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ کورا نے کہا وہ اندر سے چٹخنی بند کر لے گی۔ دروازے پر تالا لگا دیا جائے گا۔ جب تک اُسے یہ یقین نہیں ہو جائے گا کہ میں لوٹا ہوں، وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ چنانچہ دو گھنٹے بعد میں چوتھی منزل کے کمرہ نمبر ۲۴۰ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ کریم گل کمرے میں تنہا تھا۔ اُس نے بڑھ کر میرا استقبال کیا، مجھے گلے سے لگایا اور اِدھر اُدھر کی دلچسپ باتیں کرتا اور میرے بارے میں پوچھتا رہا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں آسنسول سے اپنی بہن کو ساتھ لے کے عارضی قیام کے لیے یہاں آیا ہوں اور اپنے بڑے بھائی کی تلاش میں ہوں۔ وہ ہم سے ناراض ہو کے کلکتے آگیا ہے۔ وہی ہمارا سرپرست تھا۔

"آپ اپنی بہن کو نہیں لائے؟" وہ شکایت کرنے لگا۔

"پھر آجائے گی، آپ کے گھر والے کہاں ہیں؟"

"چچی جان برابر کے کمرے میں گئی ہوئی ہیں۔ ٹھہریے میں آپ کو اُن سے ملواتا ہوں۔"

"پھر مل لوں گا۔" میں نے کہا۔ "انھیں کیوں زحمت دیتے ہیں۔" لیکن وہ نہ مانا، باہر چلا گیا اور تین چار منٹ بعد ایک اوسط قد کی عورت کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میں نے اُٹھ کر اُسے آداب کیا۔ عورت نے اشتیاق سے مجھے دیکھا۔ پھر پیار بھرے لہجے میں اُس نے میرے آداب کا جواب دیا۔ "جیتے رہو۔" اُس نے شگفتگی سے کہا۔

اُس کا رنگ گورا تھا اور جوانی زوال پر آگئی تھی مگر اب بھی اُس کے نقش و نگار میں جاذبیت تھی، اُس نے ہلکا میک اپ کر رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ اُس کا بات کرنے کا انداز بڑا دل نشیں اور شاعرانہ تھا۔ وہ اپنے بھتیجے سے زیادہ خوش خلق ثابت ہوئی۔ اُس نے مجھے ڈبیا سے گلوری نکال کے کھلائی۔ وہ خاص انداز سے مُسکراتی تھی۔

"کریم کے رشتے سے تم بھی میرے بھتیجے ہو۔" وہ شفقت سے بولی۔ "ارے تمھاری بہن کہاں ہے؟ کریم اُس کی بڑی تعریف کرتا ہے۔" میں نے اُس کے ساتھ نہ آنے کی معذرت کی اور وعدہ کیا کہ اگلی ملاقات میں اُسے ضرور ساتھ لے آؤں گا۔ وہ میرے بھائی کے بارے میں پوچھنے لگی کہ میں نے زور کہاں کہاں تلاش کیا؟ وہ آخر کیوں ناراض ہو گیا؟ میں افسانے تراشتا رہا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے مجھے چائے بنا کے پلائی۔ وہ اتنی محبت سے پیش آئی کہ اب تک مجھ سے کوئی عورت اس طرح پیش نہیں آئی تھی۔

انھوں نے مشکل سے مجھے اجازت دی۔ کورا صحیح و سلامت تھی۔ میری پرکھ نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے اُسے ساری باتیں بتادیں۔ پھر رات کا کھانا کھا کے ہم اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ کورا کی ٹانگ میں درد ہو رہا تھا۔ یہ بات وہ مجھے پریشان نہ کرنے کے لیے چھپا رہی تھی۔ میں اُس کے پلنگ پر پہنچ گیا کیونکہ اُسے سُلانے کی ترکیب مجھے معلوم ہو گئی تھی۔

صبح ہوئی تو ابھی ہم نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ کریم اپنی چچی کے ساتھ آگیا۔ مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے اُسے اندر بُلا لیا۔ چچی نے اندر آتے ہی کورا کی بلائیں لے لیں۔ پھر وہ دونوں رشتے داروں کی طرح گھل مل گئیں۔ کورا کے لہجے میں ایک اٹک تھی، اُس باتونی عورت سے اُسے کچھ نہ کچھ بات تو کرنی ہی تھی۔ گو اُس نے بہت کم بات کی تاہم اُس کا لہجہ صاف غمازی کر رہا تھا کہ اُس کا تعلق ادھر کے علاقوں سے نہیں ہے۔ ادھر کریم گل مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں ہمیں دیکھ کے اور ہم سے مل کے بہت خوش ہوئے تھے۔ انھوں نے ہماری دوپہر کی دعوت کی۔ دوپہر کا کھانا ہوا پھر رات کا بھی ہوا۔ ایک دن میں وہ ہم سے اس قدر قریب ہو گئے کہ ہمارے درمیان بھید ہی نہیں رہا۔ میں کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ لوگ بہت اچھے ثابت ہو رہے تھے، غم خوار تھے، زیادہ کریدتے نہیں تھے، جو کچھ میں نے کہا، انھوں نے کسی چون و چرا کے بغیر اُس پر یقین کر لیا تھا۔ اس کے باوجود میں اُن سے تعلقات بڑھانے میں خاصا محتاط تھا۔ وہ خود اس قدر آگے بڑھ کے ہم سے پیش آرہے تھے۔ آدمی شرمندہ ہو جاتا ہے اور پھر ایسا آدمی جو محبت اور ہمدردی کی نظر کے لیے ترس رہا ہو۔ کل رات کورا کہہ رہی تھی، کیوں نہ ہم مر جائیں، تمام دُکھوں سے نجات مل جائے گی۔ میں نے اُسے جواب دیا تھا کہ محبت اور پیسے باقی ہیں اور چاقو بھی جیب میں موجود ہے، جب

[...]م ہو جائیں گے اور حوصلہ جواب دے جائے گا تو ہم اسی چاقو سے اپنا کام [تما]م کر لیں گے۔ آج رات ذرا حالت بدلی ہوئی تھی۔ سارا دن ہم نے کریم گل [او]ر اُس کی چچی کی دل کش باتوں کے سائے میں گزارا تھا۔ چچی جان کو کورا [ا]تنی پسند آگئی تھی کہ وہ اُسے اپنے پاس ہی بٹھا کے رکھتی تھیں۔ انھوں نے [ا]یک بار کورا کو پان بھی کھلا دیا۔ لالی اُس کے نازک ہونٹوں پر اتنی رچی [ک]ہ میں دیکھتا رہ گیا۔ اِس سُرخی کا عکس اُس کی صُراحی دار گردن سے بھی جھلکنے لگا تھا، جیسے اُس نے ہونٹوں پر مہندی لگالی ہو۔

دوسرے دن کریم گل کی چچی نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم وکٹوریہ میموریل [د]یکھیں، چڑیا گھر دیکھیں۔ چچی اور اُن کے بھتیجے کریم گل میں کوئی پرایا پن نہیں [ت]ھا۔ وہ زندگی کو زندگی کی طرح گزارتے تھے۔ خوب ہنستے تھے، خوب [ک]ھاتے تھے، خوب تفریحیں کرتے تھے۔ "جب سے چچی دلی سے آئی تھیں،" [و]ہ کہتی تھیں۔ "بھتیج کریم نے تو کلکتے کی ایسی سیر کرائی ہے کہ میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی۔"

میں اُن کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔ وہ اتنے چاؤ، تحکم اور شفقت سے بات کرتے تھے کہ انکار کرنے کے لیے بہت سنگ دل اور غیر مہذب ہونا ضروری تھا۔ دوسرے دن بھی وہ ہمیں کلکتہ دکھاتے رہے۔ انھوں نے مجھے اپنی جیب سے ٹیکسی کا کرایہ بھی ادا نہیں کرنے دیا۔ چچی کورا سے ایسی [و]ابستہ ہو گئی تھیں کہ مجھے اُس سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ مجھے اُن کی یہ قربت زیادہ پسند نہیں آئی۔ میں کورا کو کسی اور سے زیادہ [قر]یب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس رات کھانے کے بعد چچی کو اچانک سینما دیکھنے [ک]ا خیال آگیا۔ بس اُن کے منہ سے بات نکلنے کی دیر تھی، مگر کریم بھی سر پر سوار ہو گیا تھا، اُس نے چچی کی پُرزور تائید کی۔ مجھ سے کہا گیا۔ میں نے صاف [ان]کار کر دیا کہ ہم سینما نہیں دیکھتے۔ چچی سے کون جیت سکتا تھا۔ میرے اور کورا [ک]ے شدید انکار کے باوجود انھوں نے ہمیں اُٹھا ہی لیا۔ وہی ہوا جو چچی چاہتی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہم لائٹ ہاؤس سینما کے گیٹ پر کھڑے تھے۔ میری طبیعت [م]کدر تھی۔ چچی کورا کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں اور کریم مجھے کلکتے کی عمارتوں اور تفریح گاہوں کے بارے میں مسلسل کچھ نہ کچھ بتا رہا تھا۔ اتفاق سے [گ]یٹ ہی پر اُن لوگوں کے ایک شناسا جوڑے سے ملاقات ہو گئی۔ عورت [ب]رقعے اوڑھے ہوئے تھی۔ مرد کا چہرہ درشت تھا۔ اُس کے سر کے بال [کھچڑ]ی ہو رہے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کڑا بھی پڑا ہوا تھا۔ پہلی ہی نظر [می]ں وہ شخص مجھے ناپسند ہوا۔ چچی نے بڑھ کے اُن سے میرا تعارف کرایا۔ [ع]ورت نے نقاب اُٹھا دی۔ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ [و]ہ سُرخی پوڈر میں لپی ہوئی تھی۔ اُس کی ناک میں نتھ تھی اور لبوں پر ایک [عجیب] سی مسکراہٹ تھی جسے کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ اُس نے کورا میں [خ]اص طور پر دل چسپی لی اور سر سے پاؤں تک اُس کا جائزہ لیتی رہی۔

"ماشاء اللہ سہرا ہے سہرا۔" بے اختیار اُس کے مُنہ سے نکلا۔

بیگم نے ناگواری سے منہ بنایا۔ "بچی بی، نظر مت لگاؤ، ہم نے اسے بیٹی بنالیا ہے۔"

"مٹھائی کے بغیر؟" بچی بی نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا، مجھے حیرت ہوئی کہ بھلا کوئی عورت بھی اس طرح قہقہہ لگا سکتی ہے؟

"مٹھائی تمھاری بچی۔" چچی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"پھر کب ارادہ ہے؟" بچی بی نے آنکھیں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"جلد ہی۔" چچی نے شوخی سے کہا۔

اسی اثنا میں مرد کریم گل کا بازو پکڑ کے ایک طرف لے گیا۔ پھر وہ زور زور سے یہ باتیں کرتے ہوئے واپس آئے کہ "نہیں ٹکٹ ہم لیں گے۔" مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کریم گل نے مجھے سُنانے کے لیے اپنی آواز بلند کی ہو۔ وہ سب ابھی تک مجھے نظر انداز کر رہے تھے اور کورا ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چچی نے اس ہجوم میں کورا کے شانوں پر بے تکلفی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میرے خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ جی میں آیا کہ میں کورا کا ہاتھ تھام کے یہاں سے جتنی تیزی سے بھاگ سکتا ہوں، بھاگ جاؤں۔ سینما جانے کے لیے میں پہلے ہی کب تیار تھا۔ ان لوگوں کی باتیں سُن کے اور رویے دیکھ کے مجھے خلجان ہونے لگا۔ درشت چہرے والا مرد ٹکٹ لے آیا تھا اور اب اُن سب کے قدم سینما ہال میں جانے کے لیے اُٹھ چکے تھے۔ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ مجھے کورا کے پاس بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ اُن دونوں عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی، پکچر شروع ہو چکی تھی، انٹرول ہوا تو چچی اور بچی بی کے قہقہے گونجنے لگے۔ میرا دھیان سینما کی طرف نہیں تھا۔ میں اُن دونوں کی سرگوشیاں سُن رہا تھا، وہ دونوں مرد فصلوں کی بات کر رہے تھے۔

جیسے تیسے میں نے وہ وقت گزار لیا۔ رات کو بارہ بجے پکچر ختم ہوئی۔ میں کریم گل کے بجائے کورا کے پہلو میں چلنے لگا۔ چلتے وقت بچی بی اور اُس کا شوہر رُخصت ہونے لگے تو اُنھوں نے چچی سے کہا۔ "ہماری طرف سے بات پکی سمجھو اور خیال رکھنا کہ فصل تیار ہونے میں دیر لگے گی۔ اس عرصے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"اب تک یہی ہوا ہے۔" چچی نے بے دلی سے کہا۔ "بہرحال سوچ لو، تمھاری مرضی۔" پھر اُنھوں نے میری طرف دیکھ کے کہا۔ "میری زمین سے اچھی فصل کہیں نہیں ہوتی اور اس بار تو ..."

"ٹھیک ہے ہم سوچ کے جواب دیں گے لیکن جب تک ہم جواب نہ دے دیں تم کسی اور سے بات نہیں کرو گی۔"

"میں تمھارا انتظار کروں گی اور مجھے معلوم ہے تمھارا جواب کیا ہوگا۔" یہ کہہ کے چچی آگے بڑھ گئیں۔ وہ دونوں دوسری سمت چلے گئے۔ میرے جسم میں آگ لگی ہوئی تھی۔ چچی میری خاموشی محسوس کر کے کہنے لگیں۔ "دلی میں شاہدرے کے پاس ہماری بڑی زمین پڑی ہوئی ہے۔ کوئی اُس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ کریم گل یہاں چلا آیا ہے۔ اِن کے ساتھ ہر سال سودا کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چچی تمام راستے فلم کی باتیں کرتی رہیں۔ اُنھوں نے اصرار کیا کہ آج رات کورا اُن کے پاس سوئے، کورا نے خود سختی سے منع کر کے میری مشکل آسان کر دی۔ رخصت ہوتے وقت اُنھوں نے کورا کی

پیشانی کا بوسہ لیا اور بلائیں لیں۔ کمرہ بند کر کے میں نے کورا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر بھی اضطراب چھایا ہوا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی تمام کپڑے سوٹ کیس میں ڈال لیے۔ اب یہاں ایک لمحے ٹھہرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ احتیاطاً میں نے ایک گھنٹا گزار دیا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے دروازے سے جھانک کے دیکھا، ہوٹل پر پُراسرار خاموشی مسلط تھی جیسے ہی دروازہ کھول کے نکلے بیرے نے ہمیں حیرت سے دیکھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ پر پانچ کا نوٹ رکھ کے اُس کا تجسس دُور کر دیا، وہ سوٹ کیس تھام کے نیچے دفتر میں آیا۔ دو روز کا باقی کرایہ ادا کر کے میں تیزی سے نیچے اُتر آیا نیچے دربان کی حیرت بھی میں نے پانچ روپے ادا کر کے دُور کر دی ٹیکسی ملنے میں دیر لگی تو ہم پیدل چل پڑے رات کے وقت ایک بُرقع پوش عورت کے ساتھ سوٹ کیس ہاتھ میں لے کے چلنے کی دُشواری کا مجھے اندازہ تھا۔ خوش قسمتی سے کچھ ہی دُور ایک ٹیکسی مل گئی۔ زائد کرائے کے لالچ میں وہ آمادہ ہو گیا چاقو جیب سے نکال کے میں نے ہاتھ میں رکھ لیا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے اچانک مجھ سے کہا کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں نے پیچھے کے شیشے سے مڑ کے دیکھا ہم سے کچھ فاصلے پر تیز روشنیاں تھیں۔ جہاں جہاں گاڑی مڑتی تھی، وہ روشنیاں بھی مڑ جاتی تھیں ٹیکسی ڈرائیور کی جیب میں کچھ روپے ٹھونس کے میں نے خوشامد کی کہ وہ گاڑی تیز بھگائے میری نظریں عقبی شیشے کی طرف تھیں گاڑی کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ وہ علاقہ آ گیا تھا جہاں مجھے اُترنا تھا۔ پچھلی گاڑی ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں کورا کو لے کے تیزی سے اُترا اور جیب سے روپے نکال کے گنے بغیر ڈرائیور کو تھماتے ہوئے کہا کہ وہ گاڑی آگے بڑھا لے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک نظر ہم دونوں کو دیکھا پھر اُس نے حکم کی تعمیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ ہم کسی تاخیر کے بغیر ایک چھوٹی سی گلی میں رینگ گئے اور اندھیرے میں چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے چاقو کا کھٹکا دبا کے اُسے برہنہ کر رکھا تھا۔ دو ایک منٹ بعد ہمارے پیچھے والی گاڑی کی روشنیاں سڑک پر نظر آئیں۔ گاڑی زن سے گزر گئی۔ ہم اُس تنگ گلی میں اور آگے بڑھ گئے۔

مدرسے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے زور زور سے پھاٹک پیٹا اور آوازیں لگائیں۔ ایک بوڑھے شخص نے کھانستے ہوئے اندر سے پوچھا "کون ہے؟"

میں نے بلند آواز سے کہا "زماں! میں مولوی محمد شفیق کا مہمان ہوں۔ دروازہ کھولیے۔"

بوڑھے نے کھڑکی کھول کے ہمارے چہروں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور اندر آنے کی اجازت دے دی۔ مولوی صاحب نے ایک ہی دستک پہ دروازہ کھول دیا اور ہمیں دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔ "آؤ۔ اندر آ جاؤ۔" انھوں نے سکون سے کہا۔

ہم دونوں سر جھکائے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ "کہاں رہے؟" انھوں نے چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ اُن کے ٹھنڈے لہجے میں شدید ناراضی چھپی ہوئی تھی۔

"ہمیں معاف کر دیجیے مولوی صاحب! خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے ہم نے آپ کو ناراض کیا لیکن ہم نے بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ اُن کے خوف سے ہم چلے گئے تھے۔ آپ کے سوا اِس شہر میں ہمیں کوئی آدمی نہیں آیا اس لیے ہم آپ کے پاس آ گئے ہیں۔ اب آپ جو بھی چاہیے سزا دیں ہمیں معاف کر دیجیے۔ اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ ہمیں پناہ میں لے لیجیے، آپ ہمیں اپنا غلام سمجھ لیجیے۔ ہم آپ کی خدمت کریں گے، اپنے ساتھ مرادآباد لے چلیے۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ آپ کو دُکھ نہیں پہنچائیں گے"

"سکون، اطمینان۔ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔" مولوی صاحب ہاتھ اُٹھا کے میری تیز زبان قابو میں کی۔

"کورا! تم مولوی صاحب سے پردہ مت کرو، نقاب اُٹھا دو۔" کورا نے نقاب اُٹھا دی اور جھجکتے ہوئے اُن سے معافی مانگنے لگی۔

"ارے تم اتنی چھوٹی ہو؟" مولوی صاحب پر حیرت طاری تھی، وہ کورا کو تعجب سے دیکھنے لگے۔

"اب میری سُن لیجیے۔ میں آپ سے بالکل جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اگر جھوٹ نہیں کہوں گا، اس کے بعد آپ جو چاہیں فیصلہ کر دیجیے گا۔ ہمیں دے کے گھر سے نکال دیجیے یا ہمارا گلا گھونٹ دیجیے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا "یہ لڑکی جسے آپ دیکھ رہے ہیں، یہ ایک غیر مسلم لڑکی ہے۔ اس کا نام کورا ہے"

میں نے شروع سے آخر تک تمام روداد انھیں سُنا دی۔ میں نے قیمتی اور جواہر کا دانستہ ذکر نہیں کیا جو ہمارے گھر میں رکھے ہوئے تھے نہیں بتایا کہ وہ تبت کے قبیلے مانگ کی جائز سردار ہے، میں نے ذرا مناسب سمجھی اور یہ کہا کہ کورا ایک سردار کی لڑکی ہے نیا سردار اس کی کم عمری کے باوجود اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اتالیق اجین اس کے باپ کے بعد اس کی سرپرستی کرتا تھا۔ وہ اسے لے کے ہندوستان چلا آیا نئے سردار نے ان دونوں کے پیچھے آدمی لگا دیے تھے۔ ان آدمیوں نے میں اجین کو قتل کر دیا اور کورا ہمارے گھر بھاگ آئی۔

مولوی صاحب نے ایک ایک بات توجہ سے سُنی۔ "تمھیں یہاں ہوتے تو کسی نے نہیں دیکھا؟ میری مراد اُن لوگوں سے ہے جو تمھارا پیچھا کر رہے تھے۔"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا پھر مدرسے کے دروازے تک پہنچنے تک تفصیل سے انھیں سُنایا۔ "ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے شہر لے چلیے۔ وہاں کچھ بھی کر دیجیے گا۔ میں وہاں کام کروں گا۔ آپ پر بوجھ ہرگز نہیں بنوں گا۔ کورا کے لیے میں سب کچھ کروں گا، مزدوری کر لوں گا، بوجھ ڈھوؤں گا۔ ہمیں صرف رہنے کے لیے جگہ چاہیے۔"

مولوی صاحب چند لمحوں تک خاموش رہے، اُن کی یہ خاموشی گراں گزری۔ ہم عدالت میں کھڑے ہوئے تھے اور اُن کا فیصلہ سُننے کے منتظر تھے۔ انھوں نے اچانک اپنے دونوں بازو وا کیے اور کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ہم دونوں کو سینے سے لگا لیا۔ "بابر! کورا!" انھوں نے ڈوبی آواز میں کہا۔ "اچھا ہوا کہ تم دونوں واپس آ گئے۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا البتہ غلطی ضرور کی ہے۔ خیر، غلطی آدمی ہی سے ہوتی ہے اور تم تو ابھی ... جو غلطی ہو گئی، اُسے بھول جاؤ، وہ ماضی کا حصّہ بن گئی۔ تم نے اس چھوٹی عمر میں بڑی جرأت کا ثبوت دیا۔ اب تم فکروں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ میں تمھاری دیوار ہوں، میں تمھارا گھر ہوں۔"

"مولوی صاحب!" ہم سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بس ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس رات ہم کوئی چار بجے سوئے، اطمینان اور سکون کی نیند۔

❤

میں اب اُس شہر میں ایک پل بھی ٹھہرنے کا حامی نہیں تھا مگر مولوی صاحب نے تین دن بعد جانے کا پروگرام بنایا۔ انھیں کچھ کام نمٹانے تھے، اور اُن کا خیال تھا کہ جب ہم کلکتے آئے ہیں تو ان کے ساتھ کچھ سیر و تفریح بھی کر لیں۔ اب وہ لمحے لمحے ہماری خیر خبر پوچھنے لگے۔ انھوں نے ہمیں خوب سیر کرائی۔ کبھی ادھر لے جاتے، کبھی اُدھر۔ صرف دو دنوں میں انھوں نے ہمارے تمام خوف اور دُکھ دھو دیے۔ کورا بھی اُن کی خوب خدمت کرتی رہی۔ کورا کو مولوی صاحب کی شکل میں اجین بابا مل گئے تھے۔ ان دو دنوں کا پتہ ہی نہیں چلا۔ انھوں نے میرے اور کورا کے لیے نئے نئے کپڑے خریدے، چادریں خریدیں، گھر کا کچھ سامان لیا، پھر ہمیں رات کو دریا کا منظر دکھانے کے لیے لے گئے۔ میں یہاں جہاں گیا اُن سے سنسان مقامات پر بیٹھنے کے لیے زور دیتا رہا۔ دریا کے ایک خاموش کنارے پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا ساتھ لے گئے تھے، ہم نے وہیں کھایا۔ منظر ایسا دلکش تھا کہ اُٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ ابھی ہم کنارے کنارے چل رہے تھے۔ مولوی صاحب آگے تھے کورا اُن کے پیچھے، میں کورا کے پیچھے۔ دفعتاً سامنے سے ہمیں چار آدمی آتے ہوئے نظر آئے۔ آناً فاناً اُن میں سے ایک نے بڑھ کے مجھے اس زور کا ہاتھ مارا کہ میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔ پھر کورا کی ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور معدوم ہو گئی۔ مولوی صاحب نے شور مچا دیا۔ دو آدمی کورا کو اُٹھا کے ایک طرف بھاگے۔ تیسرا مجھ پر جست لگانے کے لیے بڑھا۔ میں نے چاقو کھول لیا تھا۔ چاقو اُس کے پیٹ میں اُتر گیا۔ اُس کی ایک کربناک چیخ اُبھری، میں اُس کے جسم سے چاقو کھینچ کے دیوانوں کی طرح آگے بڑھا۔ جو شخص مولوی صاحب سے زور آزمائی کر رہا تھا میں نے پیچھے سے اُس کی پیٹھ میں چاقو اُتار دیا تھا۔ مولوی صاحب آزاد ہو کے اُن لوگوں کی طرف بے تحاشا بھاگ رہے تھے کیونکہ وہ لوگ کورا کو لیے ہوئے اندھیرے میں آگے بڑھ رہے تھے۔ مولوی صاحب بچاؤ بچاؤ کی آوازیں لگا رہے تھے مجھے دوسرے شخص کی پُشت سے چاقو نکالنے میں دیر ہو گئی چونکہ چاقو اُس کی کمر میں پورا نہیں اُترا تھا اُس نے دہاڑتے ہوئے مجھے دبوچ لیا۔ مجھ سے کچھ اور نہ بنا تو میں نے اُس کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا تو میری ایک لات نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ پُشت کے بل گرا، تو زمین پر پڑا تھا۔ اسے اُٹھا کے میں نے اُس کی پسلی میں اُتار دیا اور پے در پے وار پر بس نہیں کیا، کئی جگہ سے اُس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ پھر میں نے آگے کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ اندھیروں میں گم ہو گئے تھے، مولوی صاحب بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں خون میں تر بتر تھا۔ میں اندازہ لگا کے تیزی سے اُس سمت بھاگا جہاں مولوی صاحب بھاگتے ہوئے نظر آئے تھے۔ دفعتاً ایک شخص نے میرے پیروں پر ٹانگ مار دی۔ میں اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا، وہ کانسٹیبل تھا۔ اُس نے تیز سیٹی بجائی پھر چاروں طرف سیٹیاں بجنے لگیں اور جب میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا تو میں ہر طرف سے گھرا ہوا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو قصّہ ختم ہوا، کانسٹیبل میرے پاسبان آ گئے تھے۔ کورا کو لینے برائی آ گئے۔

اُن میں ایک اور کانسٹیبل کا اضافہ ہو گیا۔

پہلے کے تین کانسٹیبل میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کے مجھے قابو میں کرنے کی فکر میں تھے۔ آنے والے کانسٹیبل نے آتے ہی میرے شانے پر اپنے وزنی بوٹ سے ٹھوکر ماری، میں یہ ٹھوکر برداشت نہ کر پاتا لیکن اُدھر بہت دُور سے کہیں کورا کی چیخ سنائی دی۔ میں نے پھر اُن کے حصار سے نکلنے کے لیے پر تولے۔ کانسٹیبل نے دوسری ٹھوکر کے لیے پیر اُٹھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے بے دم کر دیتا، میں نے اُس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ بے توازن ہو کے زمین پر گر پڑا، دوسرا کانسٹیبل چیختا ہوا میری طرف جھپٹا تو میرا چاقو اُس کے پیٹ میں کمر تک اُتر گیا، پھر مجھے سنبھلنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں چاقو نکالنے کی کوشش میں تھا کہ انھوں نے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ میری فریادوں اور چیخ پکار پر اُن کی گرفت اور سخت ہو گئی اور کسی نے پیچھے سے میری کمر میں اس زور کا گھٹنا مارا کہ میں بلبلاتا ہوا زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میں کچھ دیر زمین پر تڑپا لیکن پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

آنکھ کھلی تو میں ننگی اور کھردری زمین پر پڑا ہوا تھا۔ سارے جسم میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ کروٹ بھی نہیں بدلی جاتی تھی۔ سر کے بال کیچڑ اور خون میں سنے ہوئے تھے۔ شیروانی پر سفیدی برائے نام رہ گئی تھی۔ ہر طرف خون کے دھبّے تھے، ہاتھوں پر، چہرے پر، پیروں پر خون ہی خون جما ہوا تھا۔ کمرے میں ایک مدھم سی روشنی کا بلب ٹمٹما رہا تھا اور آہنی سلاخوں کے پیچھے دو مسلح سنتری پہرا دے رہے تھے۔ میری آہٹ پر انھوں نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی پاگل کتا ہوں، اُن کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت تھی "جاگ گیا۔ جاگ گیا، حرامی بچّہ۔" انھوں نے صدا لگائی۔

اُن کے صدا لگانے کی دیر تھی کہ سلاخوں پر بہت سے سپاہیوں کا اجتماع ہو گیا، وہ سب حیرت اور غصّے سے مجھے گھور رہے تھے، کسی کی نظر میں ہمدردی نہیں تھی۔ طرح طرح کی گالیاں دی جا رہی تھیں، میری ماں اور بہن کے متعلق شرم ناک تبصرے ہو رہے تھے۔ "سالا شکل سے کیسا معصوم نظر آتا ہے۔"

"ایک دم دس نمبری ہے، ابھی اس کی عمر تو دیکھو۔"

"چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کریں گے۔"

یہ سب آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ میرا رُواں رُواں لرزنے لگا۔ میں نے دل کو تسلی دی کہ یہ تو ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ ابھی

آنکھ کھل جائے گی اور میں اپنی دنیا میں واپس آجاؤں گا۔ میں نے دہشت سے زمین پر ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ حالات کی سخت اور کھردری زمین سے میری جلد چھل گئی۔ اُن کی ہنسی نکل گئی "یہ سالا بالکل جنگلی ہے۔"

میں نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

پھر اچانک اُن کی زبانوں پر فالج گر گیا۔ ایک بھاری بھرکم آواز نے ڈپٹ کر اُنھیں سلاخوں سے دُور ہونے کا حکم دیا۔ میں نے دزدیدگی سے سر اُٹھا کے دیکھا۔ پولیس کی وردی میں ملبوس لمبے قد کا ایک شخص مجھے زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی انسپکٹر ہوگا۔ "اسے باہر لاؤ۔" اُس نے درشتی سے سنتری کو حکم دیا۔

سنتری دروازہ کھول کے دروازے ہی پر کھڑا رہا۔ "چل بے صاحب بُلا رہے ہیں۔" اُس نے مجھے نفرت سے مخاطب کیا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مجھ میں کھڑے ہونے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ اُٹھتا کیسے یا نہیں؟ یا دماغ ٹھکانے لگا دوں؟ میں نے کسمسا کے اُٹھنا چاہا مگر اُٹھ نہ سکا۔ "سالا بن رہا ہے۔"

"تم اسے اُٹھا کے سیدھے میرے پاس لاؤ۔" انسپکٹر نے شاید میری مخدوش حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ "خبردار اسے کوئی ضرب نہ پہنچانا۔ بہت احتیاط سے دفتر میں پہنچاؤ۔"

سنتریوں کو نرمی اور احتیاط کا مشورہ دیا گیا تھا مگر اُنھوں نے مجھے کسی جانور کی طرح گھسیٹا۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میں اُٹھا تو میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے دروازے کے پاس لائے۔ اس وقت میرے ذہن میں اپنی ٹیسوں اور کراہوں کے احساس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں دو قدم چلا ہوں گا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میری آمد پر کوٹھری سے باہر بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں انتشار سا پیدا ہوا۔ مجھے ایک مختصر تنگ راستے سے گزار کے انسپکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں پہلے ہی دو کالے پولیس افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ "اسے پانی پلایا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"ابھی نہیں جناب! یہ ابھی تو جاگا ہے۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"کیا یہ بیان دینے کے قابل ہے؟" دوسرے پولیس افسر نے پوچھا۔

"دیکھ لیتے ہیں۔"

میں نے پوری طرح بیدار ہونے اور منتشر اعصاب یک جا کرنے کی کوشش کی۔ بیان؟ کس بات کا بیان؟ میں نے دو آدمیوں اور ایک کانسٹیبل کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی بیان کی ضرورت ہے؟ یہ مجھ سے میرا نام، خاندان، پتہ اور پوری کہانی پوچھیں گے۔ میں انھیں کیا بتاؤں گا؟ کیا سارا واقعہ سچ سچ بتا دوں؟ انسپکٹر نے کاغذ اور قلم سنبھال لیا تھا۔ اب مجھ سے سوالات کیے جائیں گے۔ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ پتہ نہیں، رات کیا ہوا؟ مولوی صاحب کا کیا حشر ہوا؟ گوری کہاں گئی؟ میں انھیں کس طرح کا بیان دوں؟ "تمھارا نام؟" انسپکٹر نے کسی قدر نرمی سے پوچھا۔

میں خاموش رہا۔ ایک سپاہی نے مجھے جھنجوڑ کر کہا "صاحب پوچھتے ہیں۔ سیدھے کھڑے ہو۔"

میں نے ویران نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ "میرا نام... ظہیر خاں ہے۔" میری لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

"ظہیر خاں۔" اُس نے دُہرایا۔ "باپ کا نام؟"

"حسن خاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"پتہ؟"

"میرا کوئی پتہ نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تمھارا گھر کہاں ہے؟" کانسٹیبل نے مجھے ٹھوکا مار کے پوچھا۔

"گھر؟" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میرا کوئی گھر بھی نہیں ہے۔"

"تم کلکتے کب آئے؟" انسپکٹر کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے افسر نے دلچسپی سے پوچھا۔ "دیکھو میاں صاحب! تم نے رات کیا کیا، یہ سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ تمھارا یہ پہلا بیان بہت اہم ہوگا۔ نہیں، کھل کر بات کرو۔ تم کلکتے کب آئے؟"

"بہت دن ہو گئے۔" میں نے بے خیالی کے انداز میں کہا۔

"یہاں کہاں رہتے تھے؟" انسپکٹر کو میرے جوابات پر غصہ آنے لگا تھا۔ "کہیں نہیں، ادھر اُدھر۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"صاحب اس طرح یہ نہیں بولے گا۔ اگر حکم ہو تو اس کی زبان کا انتظام کروں؟" کانسٹیبل نے میرے بازو پر گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔

"تم چُپ رہو۔" انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہاں ظہیر خاں! اس سے پہلے تم کس شہر میں تھے؟"

"میں کسی ایک شہر میں نہیں رہتا، گھومتا رہتا ہوں۔" میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ مولوی صاحب کے بارے میں کچھ پوچھتے یا...

"ماں باپ زندہ ہیں؟"

"مر گئے۔" میں نے کرب سے کہا۔

"کوئی عزیز رشتے دار؟"

"سب مر گئے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"ہوں نہہ۔" انسپکٹر نے اپنے ساتھی پولیس افسروں کی جانب دیکھ کر منہ بنایا۔ "شاید کانسٹیبل کے مشورے پر عمل کرنا پڑے گا۔"

"نہیں۔" افسر نے سختی سے منع کر دیا۔ "اس کی حالت پہلے ہی خراب ہے۔" اُس نے انگریزی میں کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں زیادہ اُلجھن کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک صاف مقدمہ ہے۔ مطلب کی بات پوچھو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کچھ پڑھنا لکھنا جانتے ہو؟"

میں جواب دینے میں پھر جھجکا۔ "نہ جاننے کے برابر۔"

"یہ چاقو کس کا ہے؟" اُس نے میرا چاقو لہرا کے کہا۔

"میرا ہے۔" میں نے نقاہت سے جواب دیا۔

"اور یہ موتیوں کی مالا؟" اُس نے میری آنکھوں کے سامنے مالا گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی میری ہے۔"

"چُرائی ہے؟" وہ مسکرا کے بولا۔

"جی نہیں، یہ میری ماں کی نشانی ہے۔"

"ماں کہاں ہے؟"

"ماں بھی مر گئی۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"کب؟ کہاں؟"

"لکھنؤ میں۔" میرے ذہن میں یہی نام آیا۔

"تو گویا تم لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہو؟"

"جی نہیں۔ میری ماں کو مرے ہوئے بہت برس ہو گئے ہیں۔ اُس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ وہ لکھنؤ شہر میں مری تھیں۔ ہم دونوں ریل میں سفر کر رہے تھے۔ کوئی چور سامان میں یہ مالا دیکھ کے ہمارے پیچھے پڑ گیا، چنانچہ ماں نے احتیاطاً اسے میرے گلے میں بنیان کے نیچے چھپا دیا۔ اس کے بعد میں ریل میں سو تا رہ گیا اور اُٹھا تو ماں نہیں تھی اور وہ چور بھی نہیں تھا۔ میں نے ماں کو بہت تلاش کیا، اُس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔"

"ماں کو چور لے گیا؟" انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔

"انسپکٹر صاحب!" میں اپنی پوری توانائی سے چیخ پڑا۔ "تمھاری بھی کوئی ماں ہوگی، مجھے چاہے جتنا بُرا کہو، میری ماں کے بارے میں ایک لفظ نہ کہنا ورنہ میں تمھارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ کسی مجبور کی مجبوری کا مذاق مت اُڑاؤ۔ میں تمھارے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا ہوں لیکن میری بھی ایک ماں تھی۔"

"کیس دلچسپ ہوتا جا رہا ہے، خاصا تیز لڑکا ہے، اچھی داستان سناتی ہے۔" پولیس افسر نے انگریزی میں تبصرہ کیا۔ "پھر تم یہ مالا لیے شہروں شہروں گھومتے رہے ہو؟" میں نے جواب نہیں دیا، گردن جھکا لی۔

"اچھا ظہیر خاں!" انسپکٹر نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "رات کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"کچھ نہیں، بس میری قسمت خراب تھی۔"

"وہ تو ہے لیکن ہمیں اس کاغذ پر کچھ لکھنا ہے اور عدالت میں پیش کرنا ہے۔ تم چاہو تو سوچ سکتے ہو۔" اب تک اُنھوں نے مولوی صاحب اور گوری کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے ضرور سوال کرتے۔ میں نے چند لمحوں میں ہزاروں باتیں سوچیں۔ کاش مجھے جواب دینے سے پہلے یہ معلوم ہو جاتا کہ اُن دونوں پر کیا گزری؟ میں دو آدمیوں کے قتل سے انکار کر سکتا تھا۔ انکار کرنے میں کیا حرج ہوتا لیکن کانسٹیبل کے قتل کے تین چشم دید گواہ موجود تھے اور مقتول کانسٹیبل کے پیٹ سے جو چاقو برآمد ہوا تھا، اُس سے صاف ظاہر تھا کہ ریت پر آگے پیچھے جو دو لاشیں پڑی ہوئی ملی تھیں، وہ بھی اسی سے شکار کی گئی ہوں گی۔

"وہ وجہ جاننا چاہتے تھے۔ میں انھیں کیا وجہ بتاتا۔" مجھے خاموش دیکھ کے انسپکٹر نے غضب ناک آواز میں کہا۔ "ہمارے سوال کا جواب دو۔"

"میں۔" میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "میں دریا کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ دو آدمیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اُن پر جوابی حملہ کر دیا۔"

"کیا تم انھیں پہلے سے جانتے تھے؟"

"نہیں۔ میں نے اُن کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔"

"وہ تم سے کیا چاہتے تھے؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا انھوں نے تمھیں چھیڑا تھا؟" انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"انھوں نے آتے ہی مجھ پر حملہ کر دیا۔ شاید وہ میری مالا مجھ سے چھین لینا چاہتے تھے۔" میرے لہجے میں تلخی آگئی۔

"انھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ تمھارے پاس ایک قیمتی مالا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"اور انھوں نے کیا کیا؟"

"انھوں نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ ایک نے میرے گال پر مکا مارا۔ میں نے چاقو دکھایا مگر وہ نہیں مانا۔"

"تم اعتراف کر رہے ہو!" پولیس افسر نے کہا۔

"میں سچ بیان کر رہا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ جھوٹ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"اور دوسرا آدمی؟ وہ تو پہلے آدمی سے خاصی دور ہلاک پایا گیا تھا؟" انسپکٹر نے تجسس سے پوچھا۔

"جب میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو دوسرے آدمی نے میرا تعاقب کیا، پھر میں نے اُسے بھی مار دیا۔"

"اور کانسٹیبل؟"

"مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے دو آدمیوں کا خون ہو چکا ہے۔ میں بھاگنا چاہتا تھا کہ کانسٹیبل نے میرا راستہ روک لیا۔" یہ کہہ کے میں خاموش ہو گیا۔

"کچھ اور پوچھنا ہے؟" انسپکٹر نے پولیس افسر سے پوچھا۔

"بظاہر کافی ہے لیکن صرف خانہ پُری کے لیے۔ مجھے یہ معاملہ پیچیدہ نظر آ رہا ہے۔" پولیس افسر نے انگریزی میں کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس تیز لڑکے نے جو بیان دیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ بہرحال اس نے اعتراف کر لیا ہے۔ ہمیں اپنے طور پر تفتیش جاری رکھنی چاہیے۔ کیا یہ معلوم ہوا کہ باقی دو مقتول کون تھے؟"

"نہیں۔ ابھی اُن کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلا۔"

"اس لڑکے کی زبان اور لہجہ صاف ہے۔ تم نے اس خاص بات پر توجہ دی؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"توجہ تو ابھی بہت سی باتوں پر دینی ہے میرا خیال ہے، ہمیں آج صبح اسے عدالت میں پیش کرنے کے لیے خاصی معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔"

"اسے خاص سنتریوں کی حفاظت میں رکھا جائے۔ پولیس میں اشتعال پھیلا ہوا ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔

"اس مالا کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟" انسپکٹر نے دریافت کیا۔

"میں سمجھتا ہوں یہ ایک بیش قیمت مالا ہے۔"

"مجھے تو نقلی نظر آتی ہے، ذرا غور سے دیکھو۔" انسپکٹر نے اُسے افسر کی طرف اُچھال کے کہا۔

افسر نے گھما پھرا کے مالا کا جائزہ لیا اور انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی پھر پہلے افسر نے مالا دوسرے افسر کی طرف بڑھا دی۔ "کیا خیال ہے؟"

"یہ قتل کا کیس ہے۔" اُس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ہمیں یہ مالا فوراً سیل کر دینی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ...."

"تمھاری رائے صحیح ہے۔" انسپکٹر نے بات اُس کی زبان سے اور مالا اُس کے ہاتھ سے تقریباً چھین لی اور لفافے میں بند کر کے اُسے سیل کر دیا۔ لفافے پر تینوں پولیس افسروں نے دستخط کیے اور اسے ایک الماری میں مقفل کر کے الماری بھی سیل کر دی گئی۔ "تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟" انسپکٹر نے گرج دار آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "ورنہ ہم تمھیں تمھارے اس ابتدائی بیان کے بعد عدالت میں پیش کر دیں گے؟"

"مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

میری اُنگلیوں کے نشانات لے کے مجھے پھر حوالات کی کوٹھری میں پھینک دیا گیا۔ صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ میں ایک کونے میں سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ میں نے تھانے اور حوالات کے بہت قصے سُنے تھے اور بہت کہانیاں پڑھی تھیں۔ میں گیا میں روزانہ تھانے کی عمارت سے گزرتا تھا لیکن اندر سے تھانا کبھی نہیں دیکھا تھا اور میری کسی پولیس والے سے بھی دوستی نہیں تھی، محلے کا ایک شخص پولیس میں ملازم تھا۔ مجھے اُس کے چہرے سے ڈر لگتا تھا۔ گیا کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ اس وقت حوالات میں بیٹھا تھا۔ ایک ہفتے میں کیا سے کیا ہو گیا۔ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ اگر کسی طرح ابا اور امی کو خبر ہو گئی کہ اُن کا بیٹا قاتل ہو گیا ہے تو اُن دونوں کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ کمزور ٹانگوں سے اتنی تیز دوڑنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اب چھٹکارے کا کیا موقع ہے۔ میں نے اعتراف کر لیا ہے اور مجھے قتل کی سزا بھی معلوم ہے، کاش سزا پانے سے پہلے مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کورا محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ کاش ایسا ہی ہو، ورنہ میری رُوح بے چین رہے گی۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، میں نے تو مولوی صاحب کو منع کیا تھا کہ وہ رات کے وقت دریا کے کنارے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں، حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو بہت سے دریاؤں کے کنارے جا کے سیر کریں گے مگر مولوی صاحب نے ضد کی اور مجھے یہاں جہنم میں پھنسا کے نہ جانے کدھر چلے گئے ممکن ہے، مولوی صاحب کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو، وہ تنہا دو بدمعاشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ صحیح و سلامت ہیں تو مجھے ضرور پوچھنے آئیں گے، شاید آ جائیں یا شاید نہ آئیں جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ میری گردن پر تین آدمیوں کا خون ہے تو وہ وہیں میرا فرشتہ پڑھ لیں گے اور کسی اُلجھن سے بچنے کے لیے میری خیر خبر لینے نہیں آئیں گے اور اگر وہ کورا کو غنڈوں کے قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، جس کا امکان بہت کم ہے، تو بھی وہ ادھر نہیں آئیں گے، انھیں سارا معاملہ معلوم ہے، وہ مجھ سے کسی طرح اپنا تعلق ظاہر کرنا نہیں چاہیں گے پھر پولیس اُن کے سُراغ میں لگ جائے گی اور کورا تک پہنچ جائے گی، مولوی صاحب کا نہ آنا ہی بہتر ہے، وہ بے چارے میری وجہ سے کیوں اُلجھن میں پڑیں۔

علی الصباح سنتری مجھے انسپکٹر کے کمرے میں لے جا رہے تھے۔ میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا لیکن اب کسی زخم کا احساس نہیں تھا۔ مردہ آدمی کو زخم کہاں ستاتے ہیں، میں نے شیروانی اُتار کے دُور پھینک دی، حوالات کی کوٹھری سے بھی اجنبیت ختم ہوتی جا رہی تھی، ایک سنتری نے سلاخوں سے پانی کا گلاس اندر کر دیا۔ "منہ دھو لے۔" اُس نے حقارت سے کہا۔

"منہ کس کے لیے دھوؤں؟" سنتری اور تھانے دار کے لیے؟ میں نے گلاس لے کے وہیں دو تین چھینٹے منہ پر مارے اور کُرتے سے پانی پونچھ کے پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ سنتری نے پھر ایک گلاس چائے سلاخوں سے میرے ہاتھ میں تھما دی، شکر میں کالا پانی گھول دیا گیا تھا۔ کبھی گلاس میں چائے نہیں پی تھی مگر کبھی حوالات میں بھی نہیں رہا تھا۔ صبر و شکر کر کے ایک گھونٹ بھر کے حلق سے اُتار لی۔ گھر یاد آنے لگا۔ بہنیں، بھائی، ابا، امی اور کورا نہ جانے کورا پر کیا گزری ہوگی؟ میں نے اُسے دُکھ ہی دُکھ دیے۔ مجھے بے اختیار رونا آ گیا۔ سنتریوں نے بھی میری ہچکیوں کی آواز سن لی آنسو ایسے اُمڈ اُمڈ کے آتے کہ یہ خبر ہی نہیں ہوتی کہ کون دیکھ رہا ہے اور کون ہنس رہا ہے۔ مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ پھر میں اپنے حال سے بیگانہ ہو گیا۔

سنتریوں نے اندر آ کے مجھے جھنجوڑا تو مجھے اپنا پتہ چلا۔ "چلو عدالت میں چلنا ہے۔" سنتری کی آواز میں پہلے جیسی گرج نہیں تھی۔ "رو تا کیوں ہے؟ چل اُٹھ۔" اُس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں تھیں، میں نے ہاتھ آگے کر دیے۔ وہ خاصی وزنی ہتھکڑیاں تھیں۔ تھانے کی چار دیواری میں کھڑی ہوئی بند گاڑی کے قریب مجھے دوسرے نئے سپاہیوں کے سپرد کر دیا گیا اور اُنھوں نے مجھے گاڑی میں ٹھونس دیا۔

کوئی ایک میل راستہ طے کیا ہوگا کہ میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے سپاہی نے تاسف سے کہا۔ "کیا کر لیا بھئی؟ صورت شکل سے تو تُو بُرا آدمی نہیں لگتا۔"

میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "کیا تم خاموش نہیں رہ سکتے ہو؟"

"تیری مرضی بھئی، تجھ پر ترس آتا ہے۔" سپاہی نے ہمدردی سے کہا۔ "میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا کم عمر قاتل نہیں دیکھا۔"

میری خاموشی پر سپاہی بھی چپ ہو گیا۔ گاڑی معتدل رفتار سے چلتی ہوئی ایک جگہ ٹھہر گئی، سپاہیوں نے مجھے اشارہ کیا۔ "چلو نانا جان کے پاس چلو۔ چاہو تو بیان بدل دینا، میں پیر صاحب سے تیرے لیے ضرور دُعا کراؤں گا۔" ایک سپاہی نے چپکے سے کہا۔

وہ میرے اردگرد گھیرا ڈالے ہوئے ایک بڑی عمارت میں داخل ہو گئے، وہاں غیر معمولی بھیڑ تھی، مجرم، سپاہی، وکیل، محرر، گواہ، تماش بین، اخباری نمایندے، فوٹوگرافر، ہر قسم کا آدمی نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سارا کلکتہ مجرم ہے اور آج ہی سب کا فیصلہ ہونے والا ہے، چار سپاہیوں اور انسپکٹر کی سرکردگی میں مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ہر شخص مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ لوگ اشارے کر رہے تھے اور جن کی نظریں مجھ پر نہیں پڑی تھیں، انھیں میرے دیدار کے لیے اُکسا رہے تھے۔ دبی دبی سرگوشیاں تھیں، انسپکٹر میرے آگے ہر اشارے اور سرگوشی سے بے نیاز فخر کے ساتھ ہجوم کے درمیان گزر رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ ایک کمرے میں داخل ہو کے انسپکٹر نے مجسٹریٹ کے سامنے میری فائل پیش کر دی۔ میں قریبی دیوار سے چپکا کھڑا رہا۔ فائل کے سرسری مطالعے کے بعد مجسٹریٹ نے عینک اُتار کے میرا جائزہ لیا۔

"یہ ہے وہ؟" اس نے متعجب ہو کے پوچھا۔ "یہ۔ یہ قاتل ہے؟"

"جی جناب عالی! اس نے اعتراف کر لیا ہے۔" انسپکٹر کے اشارے پر مجھے مجسٹریٹ کے روبرو پیش کر دیا گیا۔

اُس نے پھر عینک چڑھا لی اور فائل پڑھنے لگا۔ "یہ بیان اسی کا ہے؟" اُس نے تذبذب سے پوچھا۔

"جی جناب عالی!" انسپکٹر نے مختصر جواب دیا۔

مجسٹریٹ کچھ دیر کشمکش میں مبتلا رہا۔ "تمھیں مزید تین دن کا ریمانڈ درکار ہے؟" اس نے انسپکٹر سے کہا۔ "حالانکہ یہ کیس تو صاف ہے۔"

"ہماری تفتیش مکمل نہیں ہوئی ہے جناب عالی!" انسپکٹر نے مؤدبانہ کہا۔ مجسٹریٹ نے کاغذ پر دستخط کر کے فائل پیش کار کی طرف بڑھا دی۔ مجھے دور بٹھا دیا گیا تھا، پھر انسپکٹر اور مجسٹریٹ کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ وہ میں نہیں سُن سکا مگر دُور سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مجسٹریٹ پر حیرت چھائی ہوئی ہے، وہ کبھی میری شکل دیکھتا تھا، کبھی انسپکٹر کی۔ فائل کی کارروائی مکمل ہو جانے کے بعد مجھے عدالت سے اُٹھا لیا گیا اور جس طرح لایا گیا تھا، اسی طرح واپس لے جا کے کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

سہ پہر کو ایک جلی ہوئی روٹی اور پتلی دال سلاخوں کے اندر سرکا دی گئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مجھے شاید بھوک لگی ہوگی، میں نے ناتواں آواز میں اُن سے کہا۔ "اسے لے جاؤ۔"

"کھا لو میاں جی کھا لو۔" سنتری نے پچکار کے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کیا کھانا پسند نہیں آیا؟ یہاں گوشت اور چکنی روٹی نہیں ملتی، میاں جی! اس کی عادت ڈالو، آگے یہی کھانا ملے گا۔"

دال اور روٹی شام تک یوں ہی پڑی رہی اور میں ایک گوشے میں سکڑا سمٹا بیٹھا رہا۔ شام تک کمزوری میں اور اضافہ ہو گیا کوئی کلیجا نوچ نوچ لیتا تھا۔ اچانک ہُوک سی اُٹھتی تھی اور آنکھوں میں ترمرے ناچنے لگتے تھے۔ کبھی ایسا خوف طاری ہوتا کہ سامنے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ جسم میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی قوت بھی نہیں رہی تھی، ہر طرف سناٹا تھا، ویرانی اور تنہائی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دیواریں مجھ پر گر جائیں گی اور دیواروں میں اُبھرے ہوئے نوکیلے پتھر میرے سر پر پڑنے لگیں گے۔

شام کو پھر مجھے انسپکٹر کے کمرے میں طلب کر لیا گیا اور سوالات کی تکرار کی گئی، میرے جوابات سے انھیں مایوسی ہوئی کیونکہ میں نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب کو آنا ہوتا تو اب تک آ گئے ہوتے۔ وہ کرید کرید کے مجھ سے مختلف قسم کے سوال کرتے رہے۔ پھر وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ اس بار اُن کے چہروں پر تشویش کے آثار نمایاں تھے، اُن کی آپس کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ پولیس مقتولوں کے گروہ سے کچھ معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اُن کے تبصروں کے مطابق دونوں مقتول کلکتے کے اوسط درجے کے بدمعاش تھے۔ اُن کے ساتھیوں سے رابطہ قائم کیا گیا تو کوئی نتیجہ خیز بات نہیں معلوم ہو سکی۔ سب نے شاید لاعلمی ظاہر کی تھی۔ پولیس کو موقع واردات سے بھاگنے والے دو بدمعاشوں کا بھی کچھ علم نہیں تھا۔ اس لیے کہ اُن کا ذکر ہی نہیں کیا جا رہا تھا گویا سپاہیوں نے صرف مجھے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ مولوی صاحب، کورا اور باقی دو بدمعاشوں پر اُن کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میرا واقعہ ہی اتنا سنگین تھا کہ وہ کسی دوسری طرف توجہ دے بھی نہیں سکتے تھے ورنہ میں اُن کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ مجھے آخری بار دُور سے کورا کی ایک چیخ سنائی دی تھی جو شاید انھوں نے نہیں سُنی۔ اگر مولوی صاحب کورا کو چھڑانے میں کامیاب بھی ہو گئے اور پولیس نے مطلوبہ بدمعاشوں سے رابطہ بھی قائم کر لیا تو اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں جائے واردات پر اپنی موجودگی کا اقرار کر لیں گے، پھر مجھے بار بار بلایا جاتا رہا اور مجھے بتایا گیا کہ مقتولین کی لاشوں کے پوسٹ مارٹم سے ظاہر ہے کہ زخموں کے نشانات اُسی چاقو سے لگائے گئے ہیں جس کی ملکیت کا میں نے پہلے ہی اقرار کر لیا تھا۔

ایک دن گزر گیا، میرے معدے میں غذا کا ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔

دوسرے دن دوپہر مجھے جبراً کھانا کھلایا گیا اور شام کو میرے منہ پر طمانچے مارے گئے تاکہ میں اُن کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں۔ وہ لوگ مجھے نرمی سے سمجھاتے رہے اور مجھ پر تشدد بھی کرتے رہے لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ میں اپنے پچھلے بیان پر اصرار کرتا رہا۔ میں نے چیخ چیخ کر اُن سے کہا۔ "جب میں نے

اعتراف کر لیا ہے تو تم اور کیا چاہتے ہو؟"

"ہم تمہارے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتے ہیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے، تم جو سزا مناسب سمجھتے ہو، مجھے دے دو، بار بار کیوں پریشان کرتے ہو۔" میں نے پہلی بار اُن سے تلخی کے ساتھ بات کی۔

"تمھیں پھانسی ہو جائے گی۔"

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے زہرخند سے کہا۔

"تم مر جاؤ گے۔"

"مجھے اب زندگی کی تمنا بھی نہیں ہے۔"

"لڑکے!" ایک ادھیڑ عمر افسر نے شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "پولیس تمہاری دوست ہے، تمھیں اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ ممکن ہے تم ہمیں کوئی ایسا نکتہ بتا دو جس سے تمہاری سزا کم ہو جائے، ہم عدالت میں تمہاری سفارش کر سکتے ہیں۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے، اُس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"کیا تمھیں کسی کا خوف ہے؟ کسی بدمعاش کا؟" اس نے ملائمت سے پوچھا۔ "تم یقیناً کچھ چھپا رہے ہو۔"

وہ خوف کی بات کر رہا تھا۔ اگر میں اُسے بتا دیتا کہ مجھے کورا کا خوف ہے۔ کورا جو ایک معصوم اور ستم رسیدہ لڑکی ہے، جس کے لیے میں نے گھر چھوڑ دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی۔ جسے چھپانے کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ کیا میں اسی کو طشت از بام کر دوں؟ میں اپنے خاندان کی رسوائی کا سبب بنوں اور اپنے باپ کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑوں؟ میں مولوی صاحب کو پریشان کروں کہ اُنھوں نے میرے ساتھ سلوک کیا تھا۔ میں نے دو قتل تو کیے ہی تھے۔ کانسٹیبل کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے تین گواہ جو دو تھے خود پولیس گواہ تھی۔ زیادہ باتیں کرنا فضول تھا، جو ہو گیا تھا، وہ تو ہو گیا تھا اور ممکن تھا، میں انھیں بتا دیتا، اگر مجھے کلی طور پر یقین ہو جاتا کہ کورا کو غنڈے ہی لے کے گئے ہیں، مولوی صاحب ناکام ہو گئے۔ ایک سرا وہ پکڑ لیتے تو دور تک پہنچ جاتے۔ بات کیا تک جا پہنچتی۔ میں نے انھیں اپنا سرا ہی نہیں دیا۔

تین دن بعد مجھے دوبارہ عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ میری حالت ان تین دنوں میں مسلسل جاگنے اور فاقے کرنے سے ایسی ابتر ہو گئی تھی کہ مجسٹریٹ کو مجھے پہچاننے میں دشواری ہوئی۔ "کیا یہ وہی لڑکا ہے؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے، تم نے اسے بہت مارا ہے اور کھانا بھی نہیں کھلایا۔"

"ہم نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے جناب عالی! مگر یہ بہت ڈھیٹ لڑکا ہے، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔" انسپکٹر نے اپنی تلخی چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

وہی سوال، وہی جواب، آخر مجسٹریٹ نے فائل کا بغور جائزہ لینے کے بعد دستخط کر دیے، پیش کار نے مہر لگا دی اور مجھے حوالات سے جیل منتقل کر دیا گیا۔

حوالات کے ماحول سے جیل کی فضا بہت بہتر تھی۔ اس چار دیواری میں آکے میں نے سکون کی سانس لی۔ میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور مجھے ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ کوٹھری میں پہلے سے ایک شخص مقیم تھا۔ مجھے دیکھ کے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک اُبھری۔ میں چپ چاپ ایک گوشے میں سمٹ گیا۔ وہ اپنی بیڑیاں کھڑکاتا ہوا میرے پاس آیا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے درشتی سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور غور سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "لاڈلے تو بھی یہاں آ گیا!" میری آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ "کمال ہے۔ تو نے اتنی عمر میں کمال کر دیا، کسے مارا؟" وہ تجسّس سے بولا۔

"خود کو مار دیا۔"

میری آواز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور میرے کانوں کے قریب منہ لاتے ہوئے رازداری سے بولا۔ "ایک دو؟"

"تین۔"

"تین؟" وہ اُچھل پڑا۔ "شاباش۔ اپنی قسمت بھی کیسی نیاری ہے۔ میرے رب!" وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی ذلیل قسم کا آدمی اِدھر نہ ڈال دیا جائے۔ جی دار آدمی دیا۔ تیرے صدقے جاؤں مالک۔" اُس نے اُچک کے میرے گال کا بوسہ لے لیا۔ میں نے گھور کے اسے دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا ہو گیا تھا لاڈلے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے بگڑ کے کہا۔

وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔ "بالکل نیا نیلا ہے، زندگی میں نیا نیا ہے سب چیز تیری نئی معلوم ہوتی ہے پیارے۔ جیل میں بھید بھاؤ کیسا۔ بتا دے میری جان، بتا دے، ایمان سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اب تو اس کوٹھری میں آ گیا ہے تو اپنے کو یار سمجھ۔ رونا چاہتا ہے تو پہلے رو لے، ہم بعد میں تجھے بڑی ہنسی آئے گی۔ تو میری طرح ہنسے گا۔ تجربے کی بات ہے لالے!"

"تم کون ہو؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

اُس کی پھر ہنسی چھوٹ گئی۔ "واہ رب واہ، پوچھتا ہے تم کون ہو؟ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ ارے جو تو ہے وہی میں ہوں۔ ہم دونوں کی ایک ذات ہے، ایک ہی دھرم، ایک ہی مقدر۔ لو بھئی یہ لڑکا تو کمال کا ہے۔"

وہ عجیب آدمی تھا۔ میں نے ایک بار پھر کنکھیوں سے اُسے سر سے پیر تک دیکھنے کی کوشش کی، وہ میری طرح جیل کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے پیروں میں بھی بیڑیاں تھیں، میرے پیروں میں بھی۔ شاید اُس نے داڑھی بہت دن سے نہیں بنائی تھی۔ اُس کے دانت بھی زرد ہو گئے تھے۔

"تم یہاں کیسے آئے؟" میں نے اُچٹتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

"خوب میرے بھولے بادشاہ!" اُس نے میرے گال کی چٹکی لی۔ "اس سوال سے دودھ کی خوشبو آتی ہے، اے لاڈلے!" اُس نے اپنی منہ مٹک کر کہا۔ "یہ جگہ انھی لوگوں کے لیے بنی ہے جو کچھ کر کے آتے ہیں، کچھ کھیل دکھا کے آتے ہیں، ایک دو کو مار کے آتے ہیں۔"

"تو کیا تم بھی، تم نے بھی کسی کو قتل کیا ہے؟"

"مگر تو مجھ سے بازی لے گیا۔ مجھ سے تو ایک آدمی بھی ٹھیک طرح نہ مر پایا۔ تو نے بھلا کیسے ان نازک ہاتھوں سے تین کو مار دیا؟"

"میں نے تینوں کے پیٹ میں چاقو مار دیا۔"

"ارے واہ!" اُس نے کھل کھلا کے کہا۔ "جواری تھے؟"

"نہیں۔" میں نے منہ بنا کے کہا۔

"پھر کوئی دھوکا کیا تھا؟" اُس نے آنکھ مار کے کہا۔ میں نے وہی بیان دہرانا شروع کیا جو میں نے پولیس کو دیا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب کانسٹیبل کے پیٹ میں چاقو اتارنے کی بات آئی تو اُس نے دونوں ہاتھ بڑھا کے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ "ایک بار پھر سے سنا میرے شیرا!" اُس نے مجھے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ "یقین نہیں آتا۔" میں نے کانسٹیبل والا واقعہ اُسے دوبارہ سنایا۔ "تو نے تو یار بڑے بڑے استادوں کی ایسی کی تیسی کر دی مگر یہ تو بتا اُن دو شہدوں نے تجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟ دیکھ کچھ چھپانا نہیں۔ یہ تھانا نہیں ہے۔ یاروں کا گھر ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم، بس اچانک اُنھوں نے مجھ پر وار کر دیا۔"

"ایسے کوئی وجہ تو ہوگی یا وہ سالے پاگل ہو گئے تھے؟"

"پتہ نہیں، وہ مجھے کیا سمجھے تھے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"میں بتاتا ہوں، وہ تجھے لونڈا سمجھے تھے۔ تو نے ضرور جھگڑا کیا ہوگا لاڈلے اور تو نے انھیں ٹھکرا دیا ہوگا۔"

"کیا بات کر رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ابے جانے دے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "دریا کا کنارہ ہو، تنہائی ہو، رات ہو اور نیت خراب ہو۔ تو جو بھی نہ ہو، تھوڑا ہے۔"

"تم سمجھتے ہو، میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"ارے نہیں۔" وہ اپنے کان پکڑتے ہوئے بولا۔ "تو ہی سچ بول رہا ہے۔ خیر اب نہیں تو پھر بتا دے گا، شرم آتی ہے۔"

"کیسی شرم؟"

"اب یہ ذکر چھوڑ، یہ بتا کیس میں جان کتنی ہے؟"

"میں اعتراف کر چکا ہوں۔"

"کیا ہے، کیا کچی بات کہہ دی تو نے۔" وہ بگڑے ہوئے تیوروں سے بولا۔ "یعنی تو نے حامی بھر لی ہے؟"

"ہاں کانسٹیبل کے قتل کے وقت تین اور کانسٹیبل بھی موجود تھے، انکار کا کیا سوال تھا۔"

"انکار کا کیا سوال تھا۔" وہ برہم ہو کے بولا۔ "ابے ہم تو پھانسی کے پھندے پر بھی انکار کرتے رہیں گے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"حاصل واصل کیا، ذرا آنکھ مچولی رہتی ہے اور کبھی کبھی تکا بھی لگ جاتا ہے۔ بیان بدل دیتا۔" اُس نے میرے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"تم جیل میں پہلی بار آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"پہلی بار!" وہ قہقہہ لگا کے بولا۔ "تو ابھی مجھے نہیں جانتا، بے عزتی کرتا ہے۔ کنوارے! یہ تو اپنا گھر ہے۔ اس بار ذرا اوچھا ہاتھ پڑ گیا تو اس بدبو دار کوٹھری میں رہنا پڑ گیا ہے، باہر بڑی یاد آتی ہے۔ سرکاری وکیل نے جان لڑا دی ہے لیکن اپنا بڈّھا وکیل بھی کچھ کم نہیں ہے شہزادے! ہا کام ہو گیا تو دلانے کو ترسے گا۔"

"گویا تم بچ جاؤ گے؟"

"ابے اگر بچیں گے نہیں تو بچنے کی آس کیوں توڑیں؟"

"کیا تمہارے خیال میں، میں بچ سکتا ہوں؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"کوئی وکیل کیا ہے؟"

"میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔"

"دیکھ بڈھے سے بات کریں گے۔ سالا کیا داؤ پیچ جانتا ہے، سرکاری وکیل کو تگنی کا ناچ نچا دیتا ہے۔ ایسے ایسے پائنٹ ڈھونڈ کے لاتا ہے کہ بھری عدالت چکرا کے رہ جاتی ہے۔"

"مگر۔" میں نے مایوس لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے نہیں بچا سکے گا۔"

"ایسی ناامیدی؟" وہ میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ بڈّھے کو آنے دے، میں بات کرتا ہوں۔"

"نہیں، کسی سے بات نہ کرنا، پھر بہت سی باتیں پھیلیں گی۔"

"زندگی بڑی چیز ہے لاڈلے! اتنی جلدی گھبرا گیا؟ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے، اپنا حال دیکھ، آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ پھر بھی جینے کی آرزو ہے۔ کچھ نشہ وشا کرتا ہے؟" اُس نے تاہنگی سے پوچھا۔

"نہیں، میں نے آج تک سگریٹ بھی نہیں پی۔"

"بالکل کورا ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"تم بار بار ہنستے کیوں ہو؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔ "لاڈلے! کیا ہنسنا بھی بند کر دیں؟ یہ ہنسی ہی تو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اپن تو ساری باتیں ہنسی میں اڑا دیتے ہیں ورنہ اس دنیا میں کیا رکھا ہے۔ یہ دنیا۔" وہ کرب ناک لہجے میں بولا۔ "بڑا رلاتی ہے پیارے! بہت ظالم ہے یہ، میں اسے ہنسی میں ٹال دیتا ہوں۔"

اُس کا نام متھل تھا۔ چھوٹے چھوٹے بالوں کی داڑھی اور گھنی مونچھوں والا متھل، آواز گرج دار، لہجہ تلخ، ہنسی بھی زہریلی۔ میں شروع شروع میں اس سے جھجکتا رہا، مجھے اُس سے خوف آتا تھا لیکن پہلے ہی دن شام تک اس نے اتنی باتیں کیں کہ مجھے اُس کے متعلق اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ ایک قتل کر کے آیا تھا۔ کلکتے کے ایک بدمعاش کا قتل، وہ خود بھی بہت بڑا بدمعاش

تھا اور غنڈوں کے ایک بڑے گروہ کا سرغنہ۔ ٹھل ٹھٹے سے تعلق رکھتا تھا۔ ٹھٹے میں اُس کے ساتھ پے در پے ایسے حادثے پیش آتے کہ اُس نے اپنا آبائی شہر چھوڑ دیا اور کلکتے چلا آیا اور یہاں ترقی کرتے کرتے وہ بد معاشوں کا بادشاہ بن گیا۔ وہ اُونچی اُونچی کڑوی کسیلی باتیں کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ بار بار جیل آتا تھا۔ یہاں کے سب لوگ اُس سے واقف تھے، ہماری کوٹھری پر تعینات سنتری بھی اُسے اچھی طرح جانتا تھا، جب رات کا کھانا آیا تو سنتری نے چپکے سے ایک تھیلا اُس کی طرف اُچھال دیا۔ اس میں سموسے رکھے تھے۔ ٹھل نے کھانے پر مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور چار دن بعد نہ جانے کیوں میں نے بہت اطمینان سے جیل کا کھانا کھایا پتلا شوربہ، ادھ پکی روٹیاں اور دال۔ پیالے مٹی کے تھے۔

رات کو ہم دونوں ساتھ ساتھ لیٹ گئے میرے ساتھ ٹھل کے رویّے میں خاصی تبدیلی آگئی تھی ہم اپنے بازوؤں کا تکیہ بناتے ایک دوسرے کے سامنے کروٹ لیے لیٹے تھے۔ اگر ٹھل نہ ہوتا تو مجھے جیل کے آداب سمجھنے میں بڑی دشواری ہوتی اور اس مختصر تاریک کوٹھری میں میرا دم نکل جاتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے کہیں گم ہو جاتا ہے اور چھت گھورتے آہیں بھرنے لگتا ہے پھر اچانک ہڑبڑا کے مجھ سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے بارے میں اسے کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ اُسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے۔ وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے لگتا تھا۔ اُس نے میرا نام بھی نہیں پوچھا تھا مجھے مسلسل لاڈلے کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں آدھی رات کے وقت اُٹھ کے کوٹھری میں ٹہلنے لگا، بیڑیوں کی آواز سے سنتری چونک گئے۔ اُنھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں چپ چاپ لیٹ جاؤں۔ شاید ٹھل بھی جاگ رہا تھا سنتری کی آواز سن کے اُس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ سناٹے میں اُس کی ہڈیاں چٹخنے کی آواز دُور تک گئی ہوگی۔ اُس نے کھردرے لہجے میں آواز بلند کی۔

"کیا ہے سنتری! کیوں بگڑ رہے ہو؟ ابھی نیا نیا ہے، پہلی رات اسی طرح گزرتی ہے رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سو جا لاڈلے سو جا۔ یہ تو باہر ہی سے حکم بلند کرتے رہتے ہیں، اندر آ کے دیکھیں تو نانی یاد آ جائے۔ زمین کتنی سخت ہوتی ہے۔"

میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ سیلن اور تاریکی کی وجہ سے کوٹھری میں طرح طرح کے کیڑے مکوڑے موجود تھے۔ ٹھل بھی میرے قریب آ کے بیٹھ گیا "لاڈلے!" اُس نے نرمی سے کہا "تو تو واقعی کوئی شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ اِس نامراد شہر میں کیسے پھنس گیا؟"

"بس جو لکھا تھا، وہ پورا ہوا۔" میری آواز بھرا گئی۔

"لے یہ چادر اوڑھ لے کیڑوں سے بچا رہے گا ورنہ تیری نازک جلد خراب ہو جائے گی۔ اب گھر کے بستر کا خیال چھوڑ دے۔"

"کیسا گھر؟" میں نے آہ بھر کے کہا۔

اُس نے اپنی چادر میرے جسم پر ڈال دی۔ یہ سنتریوں کی مہربانی ہے، رات کو چادر مجھے دے دیتے ہیں اور صبح ہوتے ہی واپس لے لیتے ہیں۔

"نہیں پھر تم کیا اوڑھو گے؟ تم سچ کہتے ہو، مجھے سب چیزوں کا عادی ہونا چاہیے۔" میں نے چادر اُسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"اب جی مت جلا لاڈلے! تکلف مت کر جو بات میں کہوں، مان، کر، مجھے حکم دینے کی کچھ عادت ہو گئی ہے۔"

ٹھل اور میں یوں ہی ساکت و صامت رات گئے تک بیٹھے رہے۔ دوسرے دن تعطیل تھی، اس لیے مجھے عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔ ٹھل نے بتایا کہ اب مجھے سیشن کورٹ کے سپرد کیا جائے گا، بیانات، جرح پورے واقعے کی اکھاڑ پچھاڑ ہوگی۔ وکیل عدالت میں عورتوں کی طرح ایک دوسرے کو کوسنے دیں گے اور پہلوانوں کی طرح عدالت کے اکھاڑے میں داؤ پیچ لگائیں گے۔ وہ مجھے کچہری کی اصطلاحیں اس طرح سمجھا رہا تھا جیسے کوئی وکیل ہو۔ دوسرے دن اس کا بڈا وکیل اُس سے ملنے کے لیے جیل آیا۔ وہ واقعی بڈا تھا، سیاہ فام اور پستہ قد، اُس کے گال اندر دھنسے ہوئے تھے اور ناک پر موٹی سی عینک رکھی ہوئی تھی۔ پہلے تو وکیل ٹھل سے اس کے کیس کی پیچیدگی کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ ٹھل کی پیشانی پر شکن تک نہیں آئی پھر ٹھل نے اُس سے میرا تعارف کرایا، وکیل میری روداد سن کے کچھ دیر سوچتا رہا۔ ٹھل نے مجھے کہنی ماری "دیکھا، کوڑی لا رہا ہے، چت کر دے گا، سرکاری وکیل کو ناک چنے چبوا دے گا، چھوٹا ضرور ہے مگر کھوٹا نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے جسم میں عقل ہی عقل بھری ہوئی ہے۔"

چند لمحے غور و فکر کرنے کے بعد بڈے وکیل نے مجھے مشورہ دیا کہ میں عدالت میں اپنے بیان پر جما رہوں اور بہت کم بات کرنے کی کوشش کروں۔ اس پر ٹھل وکیل کو برا بھلا کہنے لگا کہ وہ غلط مشورہ دے رہا ہے۔

"دیکھو بڈے صاحب اکوئی ایسا تیر چلاؤ کہ سیدھا جج کے دل میں لگے اور وہ ترس کھا کے اسے ایک دم رہا کر دے۔"

"یہ ناممکن ہے ٹھل!" وکیل نے سکون سے کہا۔

"ناممکن؟" ٹھل ناراض ہو کے بولا "مجھے اس لفظ سے نفرت ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ وکیل کا یہی جواب ہوگا۔ اُس نے میرے معاملے میں دلچسپی نہیں لی۔ ٹھل اس پر گرم ہوتا رہا اور اُسے گالیاں دینے لگا۔ بڈا وکیل ٹھل کو خوب سمجھتا تھا اس لیے اپنا بیگ دبا کے چپ چاپ چلا گیا۔

اگلے دن مجھے اور ٹھل، دونوں کو ساتھ ہی گاڑی میں بٹھا کر کچہری لایا گیا۔ یہاں ہم جدا ہو گئے۔ مجھے ایک جج کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ پھر پیشیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرکار کی طرف سے مجھے اپنی صفائی کے لیے ایک وکیل دیا گیا۔ وکیل نے مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہا۔ اُس نے کچھ اُگلوانے کے لیے مجھ سے جھوٹ بھی بولے۔ مجھے ڈرایا دھمکایا بھی، عاجزی سے بھی پوچھا اور غصّے سے بھی لیکن میں نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ مجھے عدالت میں پیش کیا جاتا رہا اور اُن سوالات کی تکرار ہوتی رہی جو تھانے میں کیے گئے تھے، ایک ایک نکتے پر بحث ہوتی، تینوں کانسٹیبل گواہوں نے میرے خلاف بیانات دیے، چاقو اور رومال دونوں چیزیں عدالت میں پیش کی گئیں۔ چاقو پر میری انگلیوں کے نشانات تھے اور رومال جوہریوں کی رپورٹ کے مطابق سچے موتیوں کی ایک بیش قیمت مالا تھی، جج کی ہدایت پر مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا، جس نے مختلف طریقوں اور آلوں سے میرے جسم کا معائنہ کیا۔ پیشی والے دن ٹھل مجھے دیر تک سمجھاتا اور میری ہمت بندھاتا رہتا۔ ٹھل کے کرخت لہجے سے مجھے اب ایک اُنسیت سی ہو گئی تھی۔ ادھر میرا وکیل مقدمے کو نئے نئے رنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب تک تم مجھے پوری تفصیل سے واقعہ نہیں بتاؤ گے، میں اندھیرے میں رہوں گا اور صحیح طرح تمھاری وکالت نہیں کر سکوں گا، پیشیاں، سوالات اور بیانات ہوتے رہے، بیس دن گزر گئے، ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق میری جسمانی اور ذہنی حالت نارمل تھی لیکن اُس نے میری رپورٹ میں کوئی ایسی بات ضرور لکھی تھی جو کئی دنوں تک بحث کا موضوع بنی رہی۔ اُس نے لکھا تھا کہ مجھے کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے لیکن میں عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قوتِ برداشت اور دماغی صلاحیتیں رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر نے میری عمر سولہ سال سے زیادہ بتائی تھی، مقتولین کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، اُن کے ساتھیوں کے بیانات، ان باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں تھا، دونوں وکیلوں کے درمیان بھی نوک جھونک ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے کالج کا کوئی تقریری مقابلہ ہے جس میں سب سے اچھی تقریر کرنے والے کو انعام ملنے والا ہے اور موضوع میری ذات ہے۔

میرے وکیل نے سارا زورِ بیان اس نکتے پر صرف کیا تھا کہ میں نے مجرمانہ حملے سے مدافعت کرتے ہوئے پہلے دو آدمیوں کو قتل کیا پھر اسی دہشت کا اثر تھا کہ مجھے پولیس والوں کی نیّت پر بھی شبہ ہوا۔ گو میرے لیے یہ بہت شرم ناک بات تھی۔ میری زبان سے اپنے بارے میں ایسے لفظ ادا نہیں ہو سکتے تھے مگر ٹھل، اُس کے بڈے وکیل اور اپنے وکیلِ صفائی کے بہم اصرار پر میں اپنے بیان میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بڑی مشکل سے عدالت میں میری زبان کھلی۔ بات بھی یہی تھی کہ میں نے اپنی مدافعت میں ان غنڈوں پر چاقو چلایا، وہ مجھ سے کورا کو یعنی مجھ سے مجھی کو چھین لینا چاہتے تھے۔ وہ تو صرف دو سامنے آئے اگر چار ہوتے، اگر دس بھی ہوتے تو میں اُن سب کے جسموں میں چاقو اُتار دیتا۔

وکیلِ صفائی عدالت میں میرے ماضی کے متعلق عدالت کی رائے مشکوک اور متزلزل کرنے کا کام انجام دیتا رہا۔ اُس نے اتنی باتیں کیں کہ ہر بات مبہم اور مشکل نظر آنے لگی۔ میں کٹہرے میں حیرت زدہ ہو کے اُس کے دلائل سنتا رہتا تھا۔ اُس نے بار بار میری عمر کی طرف توجہ دلائی، میرے چہرے کی شرافت پر اصرار کیا، جج سے اپیل کی کہ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرے، اُس نے مجھے زمانے کا ستایا ہوا ایک مظلوم شخص قرار دیا، جو اپنا وکیل بھی نہیں کر سکتا تھا، اُس نے ایسی جوشیلی باتیں اتنے پُر اثر انداز میں کہیں کہ اگر میں جج ہوتا تو اُسے ضرور انعام دیتا۔ بڈا وکیل بھی مشوروں میں اُس کے ساتھ شامل تھا۔ وکیلِ صفائی نے عدالت میں شبہ ظاہر کیا کہ ممکن ہے میرا مؤکل طویل عرصے پہلے کسی زبردست حادثے میں اپنی یادداشت کھو چکا ہو اور اب ماضی کے محض دھندلے دھندلے نقوش اُس کے ذہن میں رہ گئے ہوں یا اسے اپنے معزز خاندان کی نیک نامی کا اس قدر شدید احساس ہو کہ وہ اس شرم ناک واقعے میں ان اہم ناموں اور شخصیتوں کو رسوائی سے بچانے کے لیے ایثار پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یقیناً اس نے جھگڑوں اور رسوائیوں سے بچنے کے لیے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔ ساتھ ہی اپنی حیثیت بھی مشکوک کر لی ہے۔

اُس نے عدالت پر زور دیا کہ اُس کے مؤکل کا کوئی خراب ریکارڈ کہیں موجود نہیں ہے جب کہ مقتولین کا ماضی اور کردار بے حد گھناؤنا تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکے تھے اور متعدد مقدمات میں ماخوذ تھے، بد معاشوں کے ساتھیوں اور رشتے داروں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وکیلِ صفائی نے اس نکتے کی طرف جج کی توجہ خاص طور پر مبذول کرائی اُس نے پُر زور آواز میں کہا "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرے مؤکل اور مقتولوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُنھوں نے اسے دریا کے کنارے تنہا بیٹھے ہوئے دیکھا تو اُن کے غلیظ کردار کی رگ جاگ اُٹھی۔ وہ وحشی ہو گئے۔" جب سرکاری وکیل نے میرے پاس چاقو کی موجودگی کا ذکر کیا تو وکیلِ صفائی نے ان گنت عذر پیش کر دیے کہ وہ چاقو میں نے اپنی حفاظت کے خیال سے رکھا تھا کیونکہ میں دُنیا میں تنہا تھا۔ میرے وکیل نے اصرار کیا کہ غنڈوں نے اپنے شرم ناک منصوبے میں ناکامی کے بعد مجھ سے مالا چھیننی چاہی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ آخر مجھ پر باقاعدہ جرح کا وقت آیا۔ سرکاری وکیل نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں ویسے بھی تھک گیا تھا پھر وہ مجھ سے حیا سوز سوالات کرنے لگا۔ جہاں تک بنا، میں شرماتا اور جھجکتا ہوا بہت مختصر جوابات دیتا رہا لیکن پھر حد ہو گئی، سرکاری وکیل کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے؟ وہ اُس شخص سے مخاطب تھا جسے اب زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اُس کے سوال و جواب بہت جارحانہ ہو گئے تو میں نے بھری عدالت میں چیخ کر کہا "ایسے سوال مت کرو، مجھے پھانسی دے دو میں قتل کا اعتراف کر چکا ہوں۔ ایک آدمی موت قبول کرنے کے لیے تیار ہے تم اُسے سزا دینے سے کیوں کترا رہے ہو؟ موت کے لیے یہ رسمیں کیوں ادا کی جا رہی ہیں؟ اب بہت ہو چکا بس کرو۔ بس کرو۔" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "سیدھی اور صاف بات ہے، تنگ کیوں کرتے ہو؟

میں نے تین قتل کیے ہیں۔ مجھے اس کی سزا موت کی صورت میں دے دو۔ مجھ پر رحم مت کرو۔" میں نے چلّا چلّا کے عدالت سر پر اُٹھا لی۔ مجھے خاموش کرنے کے لیے جج کو کئی بار میز پر ہتھوڑی مارنی پڑی۔ میرا وکیل مجھے صبر تحمل کے اشارے کرسا رہا تھا۔ عدالت میں اس آخری دن میری حالت خاصی خراب ہو گئی۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے روتے ہوئے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے پھانسی دے دیں اور ادھر اُدھر کے فضول سوالوں میں وقت ضائع نہ کریں،

جج نے فیصلے کے لیے چھ دن بعد کی تاریخ ڈال دی تب مجھے قرار آیا۔ میں نے جیل پہنچتے ہی یہ خوش خبری بجلی کو سنائی۔ وہ مقدمے کی ساری کارروائی کے درمیان مجھے مشورے دیتا اور تبصرے کرتا رہا تھا۔ ادھر خود بجلی کا مقدمہ طول اختیار کر گیا تھا۔ میں اُس کے بعد جیل میں آیا تھا مگر میرے مقدمے کا فیصلہ اُس کے فیصلے سے پہلے ہونے والا تھا۔ مجھ پر اُس کی مہربانیاں بتدریج بڑھتی رہی تھیں۔ ان بیس پچیس دنوں میں ہم کیا باتیں کر سکتے تھے۔ بجلی نے اپنی کالی زندگی کے ہزاروں واقعات مجھے سنائے۔ اس دوران میں اُس نے میرا ایسا خیال رکھا تھا جیسے میں اس کا مہمان ہوں۔ اُس نے میرے متعلق خود ہی بہت سی رائیں قائم کر لی تھیں۔ اُس کا خیال تھا کہ میں کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ سنتری بھی اس کی وجہ سے میرا خیال رکھنے لگے تھے اور خود میں نے بھی کبھی انھیں پریشان نہیں کیا تھا۔ میرا فیصلہ ہونے والا تھا۔ بجلی اور سنتریوں کو حیرت تھی کہ میرے چہرے پر فکر اور تشویش کی کوئی علامت کیوں نہیں ہے جب کہ ممکن ہے مجھے موت کی سزا دے دی جاتی۔ میں ہنس کر انھیں جواب دیتا۔ "موت کیا چیز ہے۔ کون شخص ایسا ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے۔" اس پر بجلی مجھے بے اختیار گلے سے لگا لیتا اور میرے ہاتھوں اور پیشانی کو بوسے دیتا۔ "تو بڑا بے جگرا ہے لاڈلے!" وہ مجھ سے کہتا۔ "تو نے تو بجلی کو بھی مات کر دیا۔"

بجلی ایک ایک دن گن رہا تھا۔ جیسے میرے نہیں، اُس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا ہو، جیسے مجھے نہیں، اُسے موت آ رہی ہو۔ آخری دو دنوں میں میری حالت عجیب سی ہونے لگی۔ شاید فیصلے کے بارے میں بجلی کے بار بار ذکر کرنے سے مجھ پر اثر ہونے لگا تھا۔ میں کچھ اُداس اُداس اور خاموش خاموش رہنے لگا۔ فیصلے میں ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں اور وہ زمین پر لیٹے ہوئے تھے کہ بجلی کہنے لگا۔ "لاڈلے! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تیری طرف سے کوئی اور موت قبول کر لے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"مطلب یہ ہے شہزادے کہ اگر ایسا ہو جائے کہ تیری جگہ میں پھانسی کے تختے پر چلا جاؤں اور تو آزاد ہو جائے۔"

"اگر ایسا ممکن بھی ہوتا تو میں اسے قبول نہ کرتا۔"

"پتہ نہیں، اپنا کیا فیصلہ ہو؟ بڈّا کہتا ہے کہ وہ مجھے بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دے گا۔ بڈّا کہتا ہے تو ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ سالے کی زبان میں تاثیر ہے، جو کہہ دیتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ وہ مجھے صاف بچا لے جائے گا لیکن اگر تو زندہ نہ رہا تو مجھے اپنے فیصلے سے کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تیرے بجائے وہ مجھے سزا دے دیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں موت سے زیادہ قریب ہوں، اسے کچھ اور قریب کر لوں گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیسی خرافوں کی باتیں کرتے ہو۔"

"لاڈلے! کل بڈّا کہہ رہا تھا، تیرا مقدمہ اب بھاری نہیں رہا۔"

"یہ تو کل پتہ چل جائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تو اس کی خوشی ہے کہ آخر کوئی فیصلہ تو ہو جائے گا، ادھر یا اُدھر۔"

"لاڈلے! اگر قاتلوں کے لیے یہ کوٹھریاں نہ ہوتیں تو میں تجھے فرار کرا دیتا اور شہر میں میرے لونڈے تجھے اس طرح غائب کر دیتے کہ پولیس کو برسوں تک خبر نہ ملتی۔"

"جو باتیں ہو نہیں سکتیں، تم ان پر سوچتے کیوں ہو؟"

اُس رات ہم دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آئی۔ رات بے مل ٹیل طاری ہو گیا تھا۔ صبح ہوتی تو میں ڈگمگانے سا لگا اور میرا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ بجلی نے گلے لگا کے مسکراتے ہوئے مجھے رخصت کیا۔ ایک ایک پل صدیوں کی طرح گزر رہا تھا۔ کوئی میرے جسم سے طاقت کھینچے لے رہا تھا۔ میں خود کو لاکھ سمجھا رہا تھا کہ جو ہوگا، اُسے ہمت سے قبول کرنا چاہیے مگر اس دن عدالت لے جانے والی گاڑی کی رفتار بھی شاید بہت سست تھی۔ ہر طرف ایک شور سا مچا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ سارے جسم میں سنسناہٹ تھی۔ ایک سرد لہر آتی تھی، گزر جاتی تھی۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب گاڑی عدالت کے احاطے میں ٹھہری اور کب مجھے جج کے کمرے تک پہنچایا گیا۔ میں ترگم سم کم بے جان سا بیٹھا تھا۔ سپاہیوں نے مجھے سنبھالا اور زمین پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ پاتا۔ آخر وہ گھڑی آ گئی جب جج نے اپنا فیصلہ سنانا شروع کیا۔ عدالت میں غیر معمولی خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر شخص دم بخود تھا لیکن میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ شاید میں بہرا ہو گیا تھا۔ شاید جج مقدمے کی نوعیت اور مختلف مدارج کا ذکر کر رہا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ مجھے ہوش اُس وقت آیا جب جیل کے ایک سنتری نے میرا بازو جھنجھوڑ کے مجھے چونکایا۔ جج کہہ رہا تھا۔ "قتل کی ناکافی شہادتوں، پہلے دو مقتولین کے گندے ریکارڈ، ڈاکٹری رپورٹ اور مجرم کی کم عمری دیکھتے ہوئے عدالت اس کے لیے چودہ سال قید بامشقت کی دُہری سزا تجویز کرتی ہے۔ دونوں سزاؤں کا اطلاق ایک ساتھ ہوگا۔"

جیسے ہی جج نے فیصلہ سنایا، وکیلِ صفائی دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا۔ "میں ان حالات میں تمھارے لیے یہی کر سکتا تھا، تمھیں زندگی مبارک ہو۔" عدالت میں بیٹھا ہوا ہر شخص میری طرف لپکنے لگا لیکن سپاہیوں نے انھیں مجھ سے ملنے کا موقع نہیں دیا۔ کمرۂ عدالت میں ایک انتشار سا پیدا ہو گیا تھا۔ بڑے وکیل سے سپاہیوں کی شناسائی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھے جیل کی گاڑی تک پہنچانے آیا اور مبارک باد دی۔

"میں بجلی کو جا کے بتاؤں گا تو وہ کتنا خوش ہوگا۔"

"میں خود بجلی کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اب تمھاری جگہ بدل دی جائے گی۔ بجلی سے تمھاری ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ شاید وہ تم سے پھر کبھی آ کے ملے۔"

۱۴ سال قید بامشقت۔ موت کے بجائے زندگی، آدھی زندگی، زنجیروں میں بند زندگی۔ ۱۴ سال کس نے دیکھے ہیں، ۱۴ سال کے بعد کیا ہوگا؟ وہ سب خوش تھے کہ میں موت سے بچ گیا لیکن مجھے نہ خوشی تھی، نہ غم بلکہ غم ہی کچھ زیادہ تھا۔ ۱۴ سال تک جہنم کا عذاب، زندہ درگور، اس احساس کے ساتھ زندہ رہوں گا کہ کورا بھی اس دنیا میں کہیں ہے اور کہاں ہے؟ یہ مجھے شاید کبھی معلوم نہ ہو سکے۔ کورا کا غم سینے میں چھپائے زندہ رہوں گا۔ صرف ایک رات کے سفر کے فاصلے پر میرا گھر اور گھر والے موجود ہیں۔ مجھے ستانے کے لیے زندگی کی سزا دی گئی ہے۔ میرے ساتھ ایک بے رحم مذاق کیا گیا ہے۔

قیدی وکیل کی بات درست نکلی۔ میری جگہ تبدیل کر کے مجھے عام قیدیوں کی بیرک میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں کا پہلا تجربہ ہی ناخوش گوار ثابت ہوا۔ کوٹھری میں مجھے صرف بجلی ملا تھا مگر یہاں بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے۔ میری آمد پر سبھی نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ ایک نوجوان قیدی میرے جسم کے چاروں طرف گھوم کے میرا جائزہ لینے لگا۔ دوسرے قیدی یہ تماشا دیکھتے رہے اور ہنستے رہے۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" میں نے غصّے سے کہا۔ جواب میں اُس نے ایک بے ہودہ جملہ کہا اور ساتھ بڑھا کے میرے بال پکڑ لیے۔ پھر غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا اور بال پکڑے پکڑے اُس نے چہرہ تمام قیدیوں کے سامنے کیا اور میرے گال کا بوسہ لے لیا۔ میرا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس کے پیٹ میں گھونسا مارنے میں مجھے کچھ دیر نہیں لگی۔ وہ چیخا اور بلبلاتا ہوا فرش پر گر گیا۔ پھر جیسے ہی اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی، میں نے اُس کے جبڑے پر ایک مکّا رسید کر دیا۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اُس نے دوبارہ اُٹھنے کی کوشش کی۔ میرے گھونسوں اور لاتوں نے اسے تباہ حال کر دیا۔ ایک دوسرا قیدی اُسے بچانے کے لیے آگے بڑھا مگر قیدیوں نے اسے روک لیا۔ وہ تجسس اور حیرت سے اپنے ساتھی کو پٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہنے، کیا کہنے، سبحان اللہ، سبحان اللہ۔" ایک شخص نے آگے بڑھ کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرا ہاتھ بلند کر کے مجھے فتح یاب قرار دے دیا۔ قیدیوں میں تالیاں بجنے لگیں۔ جس نوعمر قیدی کو میں نے گرایا تھا، اُسے اٹھا کے میرے پاس لایا گیا تھا۔ اُس کے منہ سے خون جاری تھا۔

"چلیے ہاتھ ملائیے صاحب زادے، ہاتھ ملائیے۔"

اُس نے بہت نفرت اور غصّے سے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "جناب کا نام؟" ادھیڑ عمر کے شخص نے شائستگی کے ساتھ پوچھا۔

"مظہر خان۔" میں نے برہمی سے جواب دیا۔

"ماشاء اللہ، کیا ہاتھ دکھاتے ہیں جناب نے۔ خادم کو عظمت خان عرف نصیب میاں کہتے ہیں۔" اُس نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "کب تک قیام رہے گا؟"

"۱۴ سال۔" میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

یہ سُن کے تمام قیدی میرے اطراف اکٹھے ہو گئے۔ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو چار۔" نصیب میاں نے کہا۔ "جناب کا وطن؟"

"پوری دنیا۔" میں نے جواب دیا۔

"آہا ہا، کیا شاعرانہ بات ہے۔" پھر اُس نے مجھ سے مختلف قیدیوں کا تعارف کرایا۔ "یہ بندھو ہے، یہ سارنگے ہے، یہ چمّن میاں ہیں، یہ جگّو ہے، یہ لیلا ہے، نام اس کا لیلا ہے مگر کام مجنوں کا کرتا ہے، یہ ہرجرن ہے، ہم اسے ہرجری کہتے ہیں، یہ تیجا ہے، چاقو کے فن میں ماہر، یہ شبلی ہے، کم بخت گانا خوب گاتا ہے۔ اور اس کا کوئی نام نہیں ہے، نمبر ہے، چوبیسی۔ یہ نواس ہے، جیب تراشی کے فن میں یکتا۔ یہ گھوش ہے، ایسے ایسے پینترے بدلتا ہے کہ گرگٹ بھی شرما جائے۔ یہ لالہ ہے، دولتی مارتا ہے اور یہ جسے جناب نے شکست فاش دی ہے اس کا نام کالتے ہے۔ اس بیرک میں ایک سے ایک نامی گرامی شخصیت موجود ہے۔ اب اپنے بارے میں بتائیے۔ جناب کا آنا کیسے ہوا؟"

"قتل۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کیا خوب، وہ تو جناب کے تیوروں سے نظر آتا ہے، کس کی بن آئی تھی؟ کچھ تفصیل سُنا کے ہمیں بھی لطف اندوز ہونے کا موقع دیجیے گا۔"

"لمبی داستان ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"تو پھر سوختے میں۔ سنائیے گا۔ جناب خاصے تھکے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔" نصیب میاں کا انداز مضحکہ خیز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب میرا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ نصیب میاں مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ "دیکھ کیا رہے ہو۔ مہمان کی خاطر کرو۔" نصیب میاں نے اُن سب کو اشارہ کیا۔

جس شخص کا نام جگّو تھا، اُس نے بیڑی کا بنڈل میرے آگے کر دیا۔ میں نے نفرت سے منہ سکیڑ لیا، اُس نے بھی منہ بگاڑا مگر ایک دوسرے شخص نے اپنے لمبے بالوں میں اُنگلیاں ڈال کے سگریٹ نکالا اور مجھے پیش کیا۔ "نہیں، میں تمباکو نہیں پیتا۔"

پہلے ہی تجربے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں اور طریقے سے زندگی بسر کرنی ہوگی۔ شکل و شباہت سے اُن میں کوئی معقول آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک ایک چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ ہاں، اُن سب کے نمبر تھا نصیب میاں البتہ کچھ مختلف قسم کا شخص تھا۔ اُس کا رنگ گندمی تھا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اُس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی، بہت چبک چبک کے باتیں کرتا تھا۔ جس شخص کو میں نے مارا تھا، اُس کی عمر بیس پچیس سال ہوگی، رنگ سانولا اور جسم فربہ تھا لیکن اس کا قد میری طرح نکلتا ہوا نہیں تھا۔ چہرے پر چاقو کے دو واضح نشانات موجود تھے۔ اُس کی مونچھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے اُس کا چہرہ ہیبت ناک ہو گیا تھا۔ بعد میں مجھے اُن کی گفتگو سے پتہ چلا کہ کالتے کو فرش بوس کر دینا اُن کے نزدیک بڑے دل گردے کی بات تھی۔ خود کالتے کا یہ حکم تھا کہ جب وہ کسی سے مقابلہ کر رہا ہو تو کوئی درمیان میں دخل دینے کی جرأت نہ کرے۔ سب حیرت زدہ تھے کہ میں کالتے پر غالب کیسے آ گیا؟ وہ نہیں جانتے تھے کہ کالتے میں وہ غصّہ اور اشتعال نہیں تھا جو اُس

نے مجھے دلا دیا تھا۔ اگر میں تھمل کے ساتھ چند دن نہ گزار چکا ہوتا تو مجھے اُس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کبھی نہ ہوتی۔

ایک دن میں وہ مجھ سے خاصے مانوس ہو گئے حالانکہ میں نے اُن سے اپنے سلسلے میں بہت کم باتیں کی تھیں۔ میں رات بھر اپنی سوچوں میں گم رہا، دوسرے دن صبح تمام قیدی میدان میں لائے گئے اور انھیں مختلف کاموں پر لگا دیا گیا۔ میرے لیے ہر بات نئی تھی۔ میدان میں دوسرے بیرکوں کے قیدیوں سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ دو ایک قیدیوں نے مجھ سے گندا مذاق کیا اور کھلنے کی کوشش کی تو میں نے کانتے والا تجربہ آزمایا۔ محافظوں نے سزا کے طور پر بیدوں سے میری کھال اُدھیڑ دی لیکن میں نے بھی اُف تک نہیں کی۔

صرف سو دن میں ہر طرف یہ مشہور ہو چکا تھا کہ میں ہی وہ لڑکا ہوں جس نے کانتے کو گرایا ہے اور میں اکٹھے تین قتل کر کے یہاں آیا ہوں۔ اُن میں مختلف چھوٹی بڑی سزاؤں کے قیدی تھے۔ مجھے سب سے پہلے زمین کھودنے کے کام پر لگایا گیا۔ صبح سے سہ پہر تک میں مٹی ایک جگہ سے کھود کے ڈلیا میں بھرتا اور دوسری طرف ڈال آتا۔ ذرا بھی غفلت ہوتی تو سنتری کا بید میری کمر پر پڑتا، دو دن میں میرے ہاتھ چھل گئے۔ میں یہ سمجھ کے اپنے ہاتھ دوسرے قیدیوں سے چھپاتا تھا کہ وہ میرا مذاق اُڑائیں گے۔ بوجھ اٹھانے پانی بھرنے اور مٹی کھودنے سے میرے جسم میں درد ہونے لگا اور ہر ہر لمحے کورا کا چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہا۔ کاش وہ مجھے ایک نظر دیکھ لیتی کہ میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ اُس سے بچھڑے ہوتے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔

تیسرے دن صبح ہی صبح ایک سنتری نے بیرک میں مجھے تھمل کا پیغام سنایا۔ تھمل نے کہلوا کے بھیجا تھا کہ "لاڈلے کا خیال رکھنا۔"

"کون لاڈلا؟" نصیب میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ نیا لڑکا جو آیا ہے۔" سنتری نے میری طرف اشارہ کیا۔

کانتے پہلی بار جوش میں میرے پاس آیا اور تیزی سے پوچھنے لگا۔

"تم اُستاد تھمل کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

اُس نے مجھے اٹھا کے سینے سے لگا لیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا یار! اُستاد کا آدمی ہے میں بھی تو کہوں یہ چھت سے اچانک کون ٹپک پڑا۔ اُستاد نے اس کے لیے پیغام بھیجا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہو گا۔"

"واہ لاڈلے میاں! تم نے بھی کیسا تکلف کیا۔" نصیب میاں نے بھڑک کے کہا۔ "تھمل بھائی کا آدمی آئے اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ باتھمل بھائی۔ جب سے وہ گئے ہیں، جیل کی رونق ہی چلی گئی۔ سنتری بھی اب منہ آنے لگے ہیں۔ اُن کی کیا بات ہے جب آتے ہیں، جیل کے در و دیوار کانپ جاتے ہیں۔"

"سنا ہے اُستاد اس مرتبہ کچھ گہرے ہی پھنس گئے ہیں؟" لیلا کی آواز بھی اُس کے نام کی طرح نسوانی تھی۔

"ہاں مگر انھیں یقین ہے کہ وہ چھوٹ جائیں گے کیونکہ بڈّا وکیل ہی کرتا ہے۔" میں نے بدیے سے کہا۔ "اُن کا فیصلہ بس ہونے والا ہے۔"

"پھر وہ اِدھر ہی آئیں گے۔" نصیب میاں نے کہا۔

پہلے ہی دو چار واقعوں سے میں تمام قیدیوں کا مرکزِ نگاہ بن چکا تھا، اب تھمل کے حکم نے کچھ اور اثر دکھایا۔ وہ سب میرے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ میں ایک مہینے کی قلیل مدت میں اس نئے ماحول کا عادی ہو گیا۔ صبح اُٹھنا، کام پر لگ جانا، شام کو بیرک میں رہزنی، ڈکیتی، اغوا، قتل، چوری اور جیب کاٹنے کے واقعات، شولی کا گانا اور نصیب میاں کے پھڑکتے ہوئے شعر سننا۔ ہر قیدی کے ساتھ ایک عجیب داستان وابستہ تھی۔ نصیب میاں کسی زمانے میں لکھنؤ کے چھوٹے موٹے نواب تھے۔ پھر ایک حسین و جمیل طوائف پر عاشق ہو گئے اور ساری دولت لُٹا بیٹھے اور بالکل بن کے اپنی محبوبہ کے کوچے کا طواف کرنے لگے۔ وہ طوائف لکھنؤ میں اُن سے محبت کا دعوا کرتی تھی مگر ایک آشنا کے ساتھ کلکتے بھاگ آئی۔ نصیب میاں اپنا سب کچھ اُس پر لٹا چکے تھے، کلکتے میں اُسے مار کے ہی انھیں چین ملا۔ وکیل نے کوشش کر کرا کے اُن کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کروا دی۔ یہ واقعہ سناتے وقت نصیب میاں کی آواز بھرّانے لگی تھی۔ وہ تصورات میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ شولی اپنی پُرسوز آواز میں گانا گا کے انھیں جیل کی دنیا میں واپس لایا۔ جب بھی نصیب میاں ماضی میں جاتے، شولی یہی کرتا تھا اور وہ واپس آ کے پھر ہنسنے بولنے لگتے تھے۔

ہل چلانا، مار کھانا، بوجھ ڈھونا، پانی بھرنا، چادریں، دریاں اور کھادی کے دوسرے کپڑے بنانا۔ جیل کے کارخانے میں مشقت کرانے کے کئی طریقے ایجاد کیے گئے تھے۔ اس چاردیواری میں صرف مرد رہتے تھے اور مرد بھی وہ تھے جو چاردیواری کے باہر علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ جگہ جگہ کے منتخب لوگ یہاں جمع تھے، کوئی ہمیشہ ہنستا رہتا تھا، کوئی ہمیشہ روتا رہتا تھا۔ کوئی زمانے کو ہیر کے انگوٹھے سے ٹھکراتا تھا، کوئی باہر کی دنیا کی یاد میں گم رہتا تھا۔ سب کے چہرے ڈھلکے ہوتے تھے، آنکھیں اندر دھنسی جاتی تھیں، ہر طرف گندگی تھی، مچھر، کھٹمل، پسّو، ناکافی ہوا، گرمی، سنتریوں کی گالیاں، قیدیوں کی باہمی لڑائیاں، بات بات پر تکرار، کبھی دال روٹی کبھی چاول اور پتلی دال۔ ہفتے میں دو بار پانی کا شوربہ، بدبو، ہر سمت ایک سیلی ہوئی بو، حبس، گھٹن۔ ایک مہینے میں جیل کے ماحول سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود مجھے بہت وحشت ہونے لگی۔ ایسی وحشت کہ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جب یہ سوچتا کہ مجھے ۱۴ سال تک اسی چاردیواری میں زندگی بسر کرنی ہو گی اور اس زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی تو میرے اعصاب جواب دینے لگتے تھے۔ میری یہ حالت دیکھ کے کانتے، جگّو، لیلا، شولی، نصیب میاں اور دوسرے لوگ میرے گرد اکٹھے ہو جاتے اور فحش مذاق کر کر کے پوچھتے۔ "کون یاد آ رہا ہے لاڈلے کچھ ہمیں بھی تو بتا یار!"

لاڈلا کیا بتاتا؟ لاڈلے کے تو سارے لاڈ ختم ہو گئے تھے۔ ایک ایسی ہی چاردیواری میں لاڈلے کا گھر کا تھا جس میں آزاد قیدی رہتے تھے۔ فہمیدہ رہتی تھی، شبّو رہتی تھی۔ ایک امّی رہتی تھی، ایک ابا رہتے تھے۔ نہ جانے لاڈلے کے جی میں کیا آئی کہ ایک رات اُس نے سب کو اُس چاردیواری میں دفن کر دیا اور خود بھاگ کے چلا آیا۔ وہ سب اپنی اپنی کہانی سناتے تھے۔ میں نے انھیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ پھر میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ میں تو خالی ہو جاؤں گا۔ جیسے کورا کو میرے سینے سے کوئی چرا کے لے جائے گا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ جیل کی چاردیواری میں انھیں جو میرا جسم نظر آتا ہے، یہ تو ایک ڈھانچا ہے۔ اس کی جان تو باہر کہیں بھٹک رہی ہے۔ اس کی روح تو کورا کو تلاش کر رہی ہے۔ کاش کورا کا کچھ نشان مل جائے، اب کچھ نہیں رہا، صرف اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ ورنہ یہ سانس اٹکی رہے گی۔

ڈیڑھ مہینے بعد جیل کے پُرسکون سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا۔ معلوم ہوا کہ تھمل آ گیا ہے اور اس بار چار سال کے لمبے قیام کے لیے آیا ہے۔ اُس نے آتے ہی مجھے پوچھا اور مجھے دیکھ کے حیرت زدہ رہ گیا۔ "لاڈلے!" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ ڈیڑھ مہینے میں تجھے کیا ہو گیا؟ تیرا رنگ روپ کون چھین لے گیا؟" پھر وہ قیدیوں سے غصّے میں مخاطب ہوا۔ "کیا تمھیں میرا پیغام نہیں ملا تھا حرام کے جنو؟ اس کا کیا حال کر دیا ہے؟ یا تمھیں سنتری نے نہیں بتایا تھا کہ یہ میرا لاڈلا ہے۔"

تھمل کی گرج سے سب کانپنے لگے۔ نصیب میاں سب کے نمایندے کی حیثیت سے آگے بڑھے اور نیازمندی سے بولے۔ "تھمل بھائی! آپ کا حکم ملا تھا، خدا جانتا ہے، لاڈلے کا پورا خیال رکھا۔ ہم نے اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی، اسے کہانیاں سنائیں، اس کے کام میں ہاتھ بٹایا۔ شولی نے اسے روز گانا سنایا مگر یہ روز بہ روز اُداس اور خاموش ہوتا چلا گیا۔ اس نے ہم سے بات کرنی تقریباً بند کر دی ہے۔ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے، کڑھتا رہتا ہے، نہ کسی سے کچھ کہتا ہے نہ کسی کی سنتا ہے۔ تھمل بھائی! بھلا آپ کا حکم ہو اور آپ کے جاں نثار اُس کی تعمیل نہ کریں۔"

"تم نے اسے کام کیوں کرنے دیا کم بختو! تم نے اس کے ہاتھ نہیں دیکھے تھے؟ اس کا رنگ نہیں دیکھا تھا؟ تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا جو تم سب حرام زادوں سے الگ نظر آتا تھا۔" تھمل گرجنے لگا۔ "تم نے میرے لاڈلے کو کیا سے کیا بنا دیا۔"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، سب نے گردنیں جھکا لیں کیونکہ تھمل سخت طیش میں تھا۔ اُس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنے پہلو میں بٹھا کے کہنے لگا۔ "لاڈلے جانی! اِنڈے نے اب کے دیر لگا دی ورنہ میں تو پہلے ہی آ جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھ پر کیا بیت رہی ہو گی۔ اب تو فکر کرنا چھوڑ دے۔ یہ جیل ضرور ہے مگر یہاں تھمل موجود ہے۔ تھمل کی موجودگی میں تو اُداس ہوتا ہے شہزادے؟ اب ہنس دے، قسم خدا کی ہنس دے، تھمل کو خوش کر دے۔" وہ مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "اتنا ہنس کہ آنسو نکل آئیں تیرے آنسو بھی تو ٹھیک سے نہیں نکلے ہیں پگلے، ہنس ورنہ...!"

میں نے بمشکل تمام اُس کے حکم کی تعمیل کرنے کی کوشش کی، ہنسنے کا چہرہ بنایا تو وہاں موجود سب لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔ تھمل بھی ہنسنے لگا۔ تھمل کے آنے کے بعد جیسے جیل کا نظم و نسق تبدیل ہو گیا۔ ہر چیز میں باقاعدگی آ گئی۔ لڑائی جھگڑے کم ہو گئے۔ تھمل کے گروہ کے آدمی سگریٹ، پان اور کھانے کی دوسری چیزیں اُسے پہنچا دیتے تھے اور تھمل انھیں سارے قیدیوں میں تقسیم کر کے پھر خود کھاتا تھا۔ اب میں برائے نام کام کرتا تھا، سنتری بھی تھمل کی وجہ سے درگزر کرتے تھے لیکن چار مہینے کی یکسانی سے اُکتا کے میں نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں قیدیوں کو یہ پتہ لگ گیا تھا کہ میں تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتا ہوں۔ پہلے وہ اپنے خط نصیب میاں اور دوسرے معمولی پڑھے لکھے لوگوں سے لکھواتے تھے، اب اُن کا یہ کام میں کرنے لگا۔ تھمل نے پہلوانی، چاقو زنی اور لٹھ بازی کے بہت سے داؤ مجھے سکھا دیے تھے، وہ کہتا تھا۔ "وہ آدمی مُردار ہے جو اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ ثابت کرنا پڑتا ہے لاڈلے!" تھمل کے حکم سے سرتابی ناممکن تھی۔ اُس کے گروہ کے لوگ اور وہ لوگ بھی جو اُس کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، جیل میں شاگردوں کی طرح اُس کی اطاعت کرتے تھے، اُسے اُستاد مانتے تھے۔ اُن لوگوں نے بھی مجھے فنونِ حرب سے آراستہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

تھمل مجھے اپنے قریب ہی رکھتا تھا۔ اُس سے میری قربت کے باعث جیل میں ہر شخص میری بڑی عزت کرتا تھا، عزت کرتا تھا یا خوف زدہ تھا، کچھ بھی ہو مگر تھمل کے آنے سے پہلے اور آنے کے بعد اُن کے رویّوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح چھ مہینے کٹ گئے۔ جب میں راتوں کو اچانک بے چین ہو جاتا اور اُٹھ اُٹھ کے بیرک میں ٹہلنے لگتا تو دوسرے قیدی تھمل کو میرا احوال سناتے اور وہ میری گردن پکڑ کے اصرار کرتا کہ "لاڈلے! گھن لگ جائے گا، زنگ لگ جائے گا، اتنا مت گھٹا کر۔ دِق ہو جائے گی میری جان! مجھے بتا دے کہ تجھے کیا غم ہے؟ قسم ہے اپنے رب کی، تھمل سات تہہ خانوں سے تیرے لیے خوشی لائے گا۔" تھمل اسی قسم کے وعدے کرتا رہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی کورا کی خبر نہیں لا سکتا۔ میرا دل اب بالکل نہیں لگتا تھا۔ کچھ دن اچھے گزرتے تھے پھر نہ جانے کیا ہو جاتا تھا، دیواروں سے سر پھوڑنے کو جی چاہتا تھا۔ میں کھانا جوں کا توں واپس کر دیتا تھا، پانی نہیں پیتا تھا، راتوں کو جاگتا رہتا تھا، بہت سخت محنت کرتا تھا، دھوپ میں اپنے آپ کو تپاتا رہتا تھا۔ تھمل آ کے مجھے سمجھاتا، ڈانٹتا ڈپٹتا، جھڑکتا، گالیاں دیتا، پیار کرتا، میرے گالوں پر طمانچے مارتا، پھر سینے سے بھی لگا لیتا۔ ہر طرف ایک اندھیرا سا نظر آتا تھا۔ ایک دن بڈّا وکیل تھمل سے ملنے آیا تو اُس نے مجھ سے پوچھا، مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ میں نے اُس سے چند

کتابوں کی فرمائش کردی۔ اگلی ملاقات میں بڈھا کتابیں لے آیا، قصے کہانیوں کی کتابیں۔ کتابوں سے میرا دل خوب بہلا۔ ٹھل کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی اور اُس نے جیل میں اُس سے ملنے کے لیے آنے والے گروہ کے ہر شخص کو نئی نئی کتابیں لانے کا حکم دیا۔ میرے لیے یہ مشغلہ خاصا سودمند ثابت ہوا۔ ٹھل پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتا تھا، کبھی کبھی رات کو مجھ سے فرمائش کرتا، "لاڈلے! کوئی اچھی سی کہانی ہو تو ہمیں بھی سُنا۔" میں اُسے بلند آواز میں کہانیاں سنایا کرتا۔ بیرک کے دوسرے قیدی بھی دل چسپی سے کہانیاں سُنتے۔ جیل میں قیدیوں کو ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ پھر ایک دن بڈھے نے مجھ سے کہا کہ میں جیل میں اپنا تعلیمی سلسلہ کیوں نہ شروع کروں؟

"کیا ایسا ہوسکتا ہے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ میں تمھیں اس کی اجازت دلوادوں گا۔" بڈھے نے گرم جوشی سے کہا حالانکہ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تھا اور فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا لیکن جیل میں میرے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ میں نے بڈھے سے جب یہ کہا کہ میں میٹرک کا امتحان دینا چاہتا ہوں تو وہ ہنسنے لگا۔ "میٹرک بہت اُونچی کلاس ہوتی ہے لاڈلے! ابھی مڈل کی سوچو۔"

"ٹھیک ہے مگر تم میٹرک ہی کی اجازت لو اور مجھے کتابیں لاکے دو۔"

"میٹرک مشکل ہوتا ہے لاڈلے میاں۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔"

بڈھے نے حامی بھرلی اور جیل کے حکام سے مجھے امتحان میں بیٹھنے کی خصوصی اجازت دلوادی۔ اُس نے مجھے میٹرک کا پورا کورس بھی لاکے دے دیا جو میرے لیے بہت آسان تھا، پھر بھی میں شب و روز، جب بھی وقت ملتا، پڑھتا رہتا اور ٹھل میری ہمت بڑھاتا رہتا۔ سنتری بھی اس بات سے خوش تھے کہ میں عام قیدیوں کی صحبت میں بیٹھنے کے بجائے تعلیم کی طرف توجہ دے رہا ہوں اور میٹرک کی تیاری کررہا ہوں۔ میں نے چار مہینے کی مسلسل محنت کے بعد امتحان دیا اور جب نتیجہ آیا تو جیل میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا تھا۔ ٹھل کا خوشی کے مارے بُرا حال تھا، وہ بار بار اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا تھا۔ "دیکھا میرے لاڈلے کا کمال۔" وہ قیدیوں سے مخاطب ہوکے کہتا "یہ ٹھل کا لاڈلا ہے، کسی اور کا نہیں۔"

جیل میں ہر طرف سے قیدی مجھے دیکھنے آنے لگے۔ جن کے گھروں سے مٹھائیاں آئی تھیں، وہ اُنھوں نے ٹھل کی خدمت میں پہنچادیں اور اسے مبارکبادیں دینے لگے۔ ٹھل چودھری بنا ہوا افتخار کے ساتھ مبارکبادیں قبول کرتا رہا۔ بڈھا وکیل بھی حیران تھا کہ میں نے پہلی ہی سیڑھی پر میٹرک کا امتحان کیسے دے دیا۔ "لاڈلے! تُو نے ٹھل کا نام روشن کردیا۔" وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے کہتا۔ "تو نے ٹھل کے زندہ رہنے کا سامان کردیا۔"

ادھر نصیب میاں سب سے کہتے پھرتے تھے "خدا کی قسم جیل میں پہلا جی دار آدمی آیا ہے۔" بیرک میں سنتریوں کی اجازت سے ایک جشن منایا گیا۔ کانتے اور دوسرے قیدیوں نے رقص کیا، شولی نے گانا گایا، طبلے کے طور پر تالیاں بجائی گئیں، منہ سے آوازیں نکالی گئیں اور انگلیاں چٹخائی گئیں۔ میں دولہا بنا ہوا درمیان میں بیٹھا تھا۔ ٹھل کو اگربتیاں بہت پسند تھیں، اس موقع کے لیے خاص طور پر اگربتیاں منگوائی گئی تھیں۔ ٹھل بار بار افسوس کا اظہار کرتا۔ "ہائے، میں باہر نہ ہوا ورنہ ایک ہفتے کا جشن مناتا۔"

جیل میں یہ بڑی بات تھی۔ اس رات تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم آزاد ہونے کی خوشیاں منا رہے ہیں اور یہ جیل نہیں ہے کلکتے کا کوئی محلہ ہے۔ دوسرے دن ہی ہم واپس جیل آگئے۔ کھیتی باڑی، وہی مشقتیں، چادریں اور دریاں بنانا اور سنتریوں کی ڈانٹ اور بیسکھانا، وہی چاروں طرف اونچی دیواریں۔ تقریباً ہر قیدی کو سزا کے طور پر ایک یا دو ہفتے کے لیے تنگ و تاریک کوٹھری میں تنہا رکھا جاتا تھا۔ اِس طرح اُس کے اوسان ٹھکانے آجاتے تھے اور وہ واپس آکے پوری تن دہی سے محنت کرنے لگتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں ابھی تک اُس کوٹھری میں نہیں گیا تھا اور میرا مجموعی ریکارڈ نہایت اچھا جارہا تھا۔ امتحان میں کامیابی کے بعد جیلر اور دوسرے حکام کی نگاہوں میں میرے لیے ایک نرمی آگئی تھی۔ جب میں نے ٹھل سے یہ کہا کہ میں آگے بھی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں تو اُس نے اپنا سینہ کھول دیا۔ "لاڈلے! میں بھی تجھ سے یہی کہنے والا تھا۔ تو نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ اپنا بڈھا بھی کمزور ہوتا جارہا ہے۔ میں تجھے وکیل بناؤں گا، جب تک بڈھا مرچکا ہوگا۔ بھلا وکالت میں کتنے دن لگ جائیں گے لاڈلے؟"

"کوئی چھ سال۔" میں نے جواب دیا۔

"اُس وقت تک تو بڈھا ضرور زندہ رہے گا مگر اُسے مال پانی زیادہ دینا پڑے گا۔ سالے کی ہڈیاں نکل آئی ہیں۔"

"تو تم راضی ہو؟" میں نے جوش سے کہا۔

"میں راضی، میرا خدا راضی لاڈلے!"

ایک سال بعد میں نے فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کرلیا اور دوسرے سال ابھی میں امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ ٹھل کی سزا کے دن پورے ہوگئے۔ جیل میں اُداسی سی چھاگئی۔ اس درمیان کئی نئے قیدی آئے، کچھ چھوٹ گئے۔ کانتے ایک بار باہر جاکے چھ مہینے بعد پھر اندر آگیا۔ ٹھل نے اُسے مار مار کے ادھ مُوا کردیا۔ اُس نے کوئی غلط داؤ لگا دیا تھا۔ رخصت کے وقت ٹھل نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اُس کی عدم موجودگی میں اُداس نہیں ہوں گا اور مسلسل پڑھتا رہوں گا۔ اُس نے تمام قیدیوں کو حکم دیا کہ وہ میرا خاص خیال رکھیں۔ اگر کسی سے ذرا بھی شکایت ہوئی تو اُس کے باہر آنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا، جیل کے اندر ہی سزا دی جائے گی۔ ٹھل کے جانے کے بعد جیل کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی سرپرست درمیان سے اُٹھ گیا ہو۔ نصیب میاں اُس کی نمائندگی ضرور کرتا تھا مگر اُس کا لہجہ [illegible] بانکوں کے تھے۔ اُس میں وہ گھن گرج نہیں تھی جو ٹھل میں تھی۔ دو سال میں میرے بازو خاصے مضبوط ہوگئے تھے اور قد پہاڑ کی طرح نکل آیا تھا۔ داڑھی کے بھورے بھورے بال اُبھرنے لگے تھے اور مسوں کی جگہ مونچھوں نے لے لی تھی۔ میں نے ایف اے کا امتحان دیا اور ساری جیل جیلر اور پولیس کے دوسرے حکام کو چونکادیا، میں پھر فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ ٹھل مہینے میں ایک بار ضرور مجھ سے ملنے آتا تھا۔ یہ خبر سُن کے وہ باقاعدہ جیل میں آگیا۔ اُس نے خود کو چوری کے الزام میں گرفتار کرالیا تھا۔ اُسے تین مہینے کی سزا ہوئی۔ ڈیڑھ دو ماہ گزارنے کے بعد وہ پھر واپس چلا گیا اور میں اپنی تعلیم میں مصروف ہوگیا۔

میرا کام بہت آسان کردیا گیا تھا۔ ایف اے میں میری کامیابی کے بعد جیلر کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔ اُس نے مجھے کلرک کا کام سونپ دیا۔ وہ جیل میں آنے والے پولیس کے حکام کے سامنے مجھے فخر سے پیش کرتا تھا۔ دوپہر کو وہ مجھے دفتر میں بُلاکے اپنے گھر کا پکا ہوا کھانا کھلاتا تھا۔ بی اے کے پہلے سال میری مارکس شیٹ دیکھ کے وہ پہلے تو دنگ رہ گیا پھر ایسا جوش میں آیا کہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ بہت دنوں بعد میں نے ایک گھر دیکھا، وہی بستر، وہی الماریاں، وہی آنگن، وہی گلاس اور سگریٹ، سب کچھ وہی تھا جو میرے گھر میں تھا۔ مرچ مسالوں اور کپڑوں کی خوش بو سارے گھر میں رچی ہوئی تھی۔ جب بھی گھر کا خیال آتا، میں سر جھٹک کے اُسے کوڑے میں پھینک دیتا، یہ کوڑا خود میرے جسم کے اندر رہتا، ایک ملبا اندر جمع ہوگیا تھا۔ یہاں آکے میرا جی گھبرانے لگا۔ جیلر ساتھ نہ ہوتا تو میں بھاگ جاتا۔ اُس نے مجھے اپنی بیوی سے ملایا۔ "یہ ہے وہ قیدی، لاڈلا! اِس کا نام ظہیر خاں ہے مگر جیل میں سب اسے لاڈلا کہتے ہیں۔"

میں نے گھبرا کے اُسے سلام کیا۔ اُس کی آنکھوں میں وہی حیرت تھی جو چڑیا گھر میں ریچھ دیکھ کے بچوں کو ہوتی ہے۔ ریچھ نے سلام کیا لہٰذا اُس کا ڈرنا اور سہمنا لازم تھا۔ اُسے جیلر نے ضرور بتایا ہوگا کہ میری گردن پر تین آدمیوں کا خون قرض ہے جو میں سخت سزا کاٹ کے اُتار رہا ہوں۔

سلام کا جواب اُس نے ہچکچاہٹ سے دیا۔ وہ سُرمئی رنگ کی ایک ۳۵، ۳۶ سال کی عورت تھی۔ "بیٹھ جاؤ۔" اُس کے حکم میں کچھ خوف شامل تھا۔ میں نے کچھ تامل کیا مگر جیلر نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ "یہ ایک نیا آدمی بن کے جیل سے جائے گا۔" وہ افتخار سے بولا۔ "لاڈلے کا ریکارڈ بھی اچھا ہے، میں اسے جلد سے جلد رہا کرانے کی کوشش کروں گا۔ بچے کہاں ہیں؟"

عورت دزدیدہ اور مشتاق نگاہ سے مجھے دیکھ رہی تھی اور مجھے یہ سب نیا اور حیرت انگیز لگ رہا تھا۔ کسی عورت کو دیکھے یا اُس سے بات کیے ہوئے ایک مدت گزر گئی تھی۔ جیل کی کڑی سزاؤں میں سب سے سخت سزا یہی ہے کہ مرد عورتوں کو نہیں دیکھ پاتے۔ اپنی ساڑی کا پلو سنبھالتے ہوئے وہ باہر چلی گئی اور چند لمحوں بعد واپس آئی تو اُس کے ساتھ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ اُن میں سب سے بڑی لڑکی کا رنگ سونے کا تھا۔ دوسری کی عمر کورا کے برابر ہوگی۔ وہ استری کے بغیر کپڑے کی طرح رسّی پر لٹکی ہوئی تھی۔ لیکن بڑی لڑکی ایک شگفتہ استری کی ہوئی لڑکی تھی، تیکھے نقش و نگار، بدن کا ہر حصہ ترشا اور سلیقے سے اپنی جگہ رکھا ہوا تھا، متناسب، بے داغ، متوازن اور ستانہ لڑکا سب سے چھوٹا تھا۔ "لاڈلے یہ ہے میری بڑی بیٹی سونیا۔" جیلر نے کہا۔ "ایف اے کے آخری سال میں ہے اور یہ ہے چھوٹی نٹ کھٹ بلو، ببلا، پڑھنے میں اِس کا جی بالکل نہیں لگتا۔ یہ ابھی تک آٹھویں میں ہے اور یہ لڑکا دلو چھٹی کلاس میں پڑھتا ہے۔ چلو بھئی سب نمسکار کرو لاڈلے کو۔" سب نے ایک ساتھ ہاتھ جوڑ لیے مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آج وہ کسی قاتل کو پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ وہ سب گنگ تھے۔ "ارے، تم سب خاموش کیوں ہو؟" جیلر نے ناراضی سے کہا۔ "لاڈلے سے باتیں کرو، یہ بہت اچھا لڑکا ہے۔"

بڑی مشکل سے سونیا کے لب کھلے اور اُس نے مجھ سے بی اے میں میرے مضامین کے بارے میں پوچھا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں اور پسینہ سا آرہا تھا۔ اُس کی آواز سُریلی تھی۔ کورا کی آواز میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ وہ اسی طرح ٹھیر ٹھیر کے سنبھل سنبھل کے بولتی تھی۔ کورا اب سونیا کے مانند بڑی ہوگئی ہوگی اور بڑی ہوکے وہ کیسی عظیم الشان لڑکی بن گئی ہوگی۔ وہ تو قلوپطرہ کی طرح حسین ہو گی، میں تصور میں اُس کے خاکے بناتا تھا۔ میری کسمساہٹ، کم گوئی اور گریز سے اُن کی جھجک کچھ دور ہوئی اور وہ سب مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ میرا گھر کہاں ہے؟ میری ماں کیسی ہیں؟ میرے کتنے بہن بھائی ہیں؟ جیلر نے انھیں مجھ سے ایسی باتیں پوچھنے سے منع کیا۔ آدمی کو گھر کی قیمت کا پتہ جیل میں چلتا ہے۔ جیلیں شاید اسی لیے بنائی گئی ہیں کہ لوگ گھروں اور گھر والوں کی قدر و منزلت سے آشنا ہوسکیں، نصیب میاں کہتا تھا کہ بیوی کی اہمیت کا اندازہ طوائف کے پاس جاکے ہوتا ہے۔ اُنھوں نے مجھے انناس کا شربت پلایا اور بڑی ہمدردی اور محبت سے باتیں کیں۔ منہ ایسی غذائیں کھانے اور کان ایسی باتیں سُننے سے ناآشنا ہوگئے تھے۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرکے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہا لیکن جیلر نے روک لیا۔ جب انھیں یہ یقین ہوگیا کہ میں ایک قاتل اور قیدی کے علاوہ ایک انسان بھی ہوں تب کہیں اُن کا خوف دور ہوا اور اُنھوں نے آہستہ آہستہ مجھ میں دل چسپی لینی شروع کی۔ سونیا نے سب سے زیادہ باتیں کیں۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے میں آزاد ہوگیا ہوں اور کورا کے سائے سے باتیں کررہا ہوں لیکن میں پھر قید ہوگیا۔ اپنی بیرک میں آکے میں خاموش لیٹا رہا، نصیب میاں مجھے چھیڑتا رہا، مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ کچھ ایسا لگتا رہا کہ کسی نے جسم کو دیا سلائی لگادی ہے اور وہ بھڑک اُٹھا ہے اور کسی نے پھونک مار کے دبی ہوئی آگ کو ہوا دے دی ہے۔

"یہ سُرخی ہے؟" نصیب میاں نے میری آنکھیں دیکھ کر کہا۔ "میں اسے خوب جانتا ہوں لاڈلے صاحب! یہ کب اُبھرتی ہے، خدا کی قسم آپ کو دیکھ کے بڑی تسلی ہوتی ہے کہ جوانی کے دن ضائع نہیں گئے، جو کچھ ہوگیا، وہ تو خیر ہوگیا، پر کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی۔ یقین کرنا، اِس عمر میں نظریں ٹھیرتی ہی نہیں تھیں۔ صبح کچھ اور رنگ ہوتا تھا، شام کو کچھ اور۔ جسم میں انگارے سے بھرے ہوتے تھے اور اُس آگ میں ایسا لطف آتا تھا کہ ہر وقت جلتے رہنے کو جی چاہتا تھا، لاڈلے میاں! ہم پہ جوانی ٹوٹ کر آئی تھی اور ہم نے بھی ٹوٹ کر اُس سے پیار کیا تھا۔"

نصیب میاں کی باتیں آج بہت دل کو لگیں، کچھ مجھے بھی ایسی چنگاریاں اُبھرتی محسوس ہوتی تھیں لیکن میں نے کتابوں کے بوجھ سے اُنھیں دبا دیا تھا، جیلر نے مجھے اپنے گھر سے جا کے بہت بُرا کیا۔ میں رات کو پھر سلاخوں سے باہر سنا ہا تکتا رہا اور اپنا بکھرا ہوا جسم سمیٹنے کی کوشش کرتا رہا، رات بھر میں کورا کے حصار میں رہا، وہ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے، کبھی اِس طرف سے کبھی اُس طرف سے آتی رہی میں سلاخوں سے اپنا سر پھوڑنے اور چیخنے لگا۔ بیرک کے سارے قیدی جاگ گئے نصیب میاں مجھے اپنے دامن سے ہوا دینے لگا۔ پھر جیلر کے گھر میں میری آمدورفت بڑھ گئی اور سونیا مجھ سے اپنے مضامین اور کتابوں کے بارے میں مشورے کرنے لگی یہ دیکھ کے جیلر نے مجھ سے سونیا کو پڑھانے کی باقاعدہ فرمائش کر دی، میں روزانہ دو گھنٹے اُس کے گھر میں بیٹھا سونیا کو پڑھاتا رہتا، سارے گھر والے میرا احترام کرنے لگے، یہ احترام رفتہ رفتہ ایسے تعلق میں بدل گیا جو عزیزوں کو عزیزوں سے ہوتا ہے، وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی اور بی اے میں آ گئی۔ میں نے بی اے میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔

سنجیدہ، متین، اور حسین سونیا بڑے انہماک سے پڑھتی تھی۔ ہم دونوں میں تعلیمی موضوعات کے سوا، دوسری باتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ میں جب دوپہر کو وہاں جاتا تو وہ کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوتی اور جب میں واپس ہوتا تو وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی۔ میں روز اُس کی سوندھی سوندھی خوش بو سونگھتا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے میری نظریں ٹکرا جاتیں تو وہ کچھ لرز کے اپنی لانبی اور گھنی پلکیں جھکا لیتی۔ اُس کی متانت میں ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی مگر وہ فوراً اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ شروع شروع میں سونیا کی ماں بھی ہم دونوں سے کچھ دور بیٹھی اپنا کام کرتی رہتی تھی، پھر اُس نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔

میں ڈیڑھ سال تک بلاناغہ وہاں جاتا رہا۔ اب میں ایم اے کی تیاری کر رہا تھا۔ تھل کو یہی معلوم تھا کہ میں وکالت کا امتحان دے رہا ہوں۔ وہ چھوٹی موٹی چوریاں کر کے ایک ایک دو دو مہینے کے لیے میرے پاس رہنے آ جایا کرتا تھا۔ میں جیل میں جس طرف سے بھی گزر جاتا، لوگ میرا حال پوچھتے، سلام کرتے، ہر طرف لاڈلے میاں، لاڈلے صاحب ہی کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ جس دن نصیب میاں کو رہائی ملی، وہ میرے گلے لگ کے بہت رویا۔ "میں باہر آپ کا انتظار کروں گا لاڈلے صاحب"۔ وہ جو ہر وقت شوخیاں کرتا اور چُہل چھیڑیاں چھوڑتا رہتا تھا، مجھ سے رخصت ہوتے وقت بہت اُداس تھا۔ جیل کے بہت سے ساتھی چلے گئے لیکن یہ تو جیل تھی، قیدیوں کا بازار۔ جیل کی دُکان ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ آنے والوں کو اس کے دروازے کبھی مایوس نہیں کرتے مگر واپسی کے لیے یہی دروازے بڑے تنگ ہو جاتے ہیں۔

نصیب میاں بھی چلا گیا اور اُس کے جانے سے جیل خالی خالی معلوم ہونے لگی، نئے نئے چہرے آ گئے پُرانے قیدیوں میں میرے سوا چند ہی قیدی اور رہ گئے تھے۔ ساڑھے چار سال گزر گئے اور ایک دن سونیا نے مجھ سے کہا کہ جیلر کا تبادلہ ہو گیا ہے اور اب وہ لوگ جلد ہی یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے۔ یہ خبر سناتے ہوئے سونیا کی آواز بھرّا رہی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا، کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میری زبان کو تالا لگ گیا۔ میں نے اپنی ریگ زار آنکھوں سے اُسے دیکھا، اُس کی گھنیری پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔ میرا دل سُن ہو گیا۔

"ہم یہاں سے شہر چلے جائیں گے، پتا جی کہہ رہے تھے کہ آپ کی سزا کے دن پورے ہونے والے ہیں۔" اُس نے اُنگلیوں سے اپنے دراز گیسوؤں کے لچھے بناتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "آپ وہاں تو آئیں گے نا؟"

"ہاں۔" میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

"آپ سیدھے وہیں آئیے گا؟" اُس نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔" میں اُس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکا۔

"یہاں سے چھوٹنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں معلوم۔" میں نے سرد آہ بھر کے جواب دیا۔

"پتا جی کہتے تھے کہ وہ آپ کی مدد کریں گے وہ آپ کا بہت ذکر کرتے ہیں، آپ۔ آپ آئیں گے نا؟" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"آپ کب جائیں گی؟" میں نے اپنی آواز مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

"تین چار روز میں۔" اُس نے اُداسی سے جواب دیا۔

ہم دونوں دیر تک چُپ چاپ بیٹھے رہے، نہ کوئی سوال، نہ کوئی جواب۔ اُس کی ماں نے آ کے ہمیں چونکا دیا۔ سونیا نے ہڑبڑا کر آنسو خشک کیے اور کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُس کی ماں میرا حال پوچھتی رہی۔ ضیا وحید کا حال پوچھ رہا تھا۔

پُرانا جیلر چلا گیا، نیا جیلر آ گیا، نیا جیلر بہت درشت آدمی تھا۔ اُس کے آنے کے بعد جیل میں سخت احکام جاری ہوتے، قیدیوں میں سراسیمگی پھیل گئی بید، ہنٹر، کوڑے برسنے لگے حالانکہ میرے متعلق پُرانا جیلر اُس سے سفارش کر گیا تھا اور میرا سابقہ ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا مگر وہ آدمی طبیعت کا تھا، جیل کے لیے انتہائی موزوں۔ تھل کے گروہ کے لوگوں کا بھی اُس نے ناطقہ بند کر دیا۔ قیدیوں کو بیرک کے باہر ملنے جلنے پر پابندی عائد کر دی تھی مجھ سے کلرکی کا کام چھین لیا گیا اور مجھے دوبارہ مشقت پر لگا دیا گیا۔ دن میں کئی وقت جیل کے حکام معائنے کے لیے آتے اور نئے نئے احکام صادر کرتے۔

تھل، شرلی، کانتے، جگتو، لیلا، سارنگی، نصیب میاں اور بہت دوسرے ساتھیوں کے جانے سے جیل یوں بھی اُجڑ گئی تھی۔ نیا جیلر آیا سارا نقشہ ہی پلٹ گیا، پھر سونیا بھی چلی گئی۔ جیل میں جو چند گھنٹے آزادی مل جاتے تھے، وہ بھی ختم ہو گئے، گھر گیا، کورا گئی، سب چلا جائے یہ جو کچھ باقی یہ بھی کیوں ہے؟ مجھے بعض اوقات خود پر حیرت ہوتی کہ میں کیوں باقی ہوں۔ میرے باقی رہنے کی اب کون سی ضرورت ہے؟

جیل میں سختی کے اُس زمانے میں ایک نیا قیدی داخل ہوا، وہ مجھے بیرک کے باہر نظر آیا تھا، میں نے اُسے پہچان لیا لیکن وہ مجھے شناخت نہیں کر پایا کیونکہ میرا قد دارنٹ کی طرح لمبا اور جسم گھوڑے کی طرح پھیل گیا تھا، میرے گالوں پر بھوری سی داڑھی تھی اور مونچھوں سے چہرہ اور بھی بدل گیا تھا۔ سنتریوں کا پہرا سخت تھا مگر میں اُس کے قریب پہنچ گیا اور جاتے ہی میں نے اس کی گردن پر وار کیا۔ وہ فوراً گر پڑا۔ میں اُس پہ چڑھ کے اُس کا نرخرا دبانے لگا۔ سنتریوں اور دوسرے قیدیوں نے اُسے میرے پنجے سے نجات دلائی۔ سب حیران تھے کہ آج یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اُسے دیکھ کے میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا، میرے غیظ و غضب کی ایسی کیفیت قیدیوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی، کئی آدمیوں نے مجھے پکڑا لیکن میں ان سب سے آزاد ہو کے اُس پر پل پڑا، وہ میری گرفت میں آتے آتے رہ گیا اور میدان میں اِدھر اُدھر بھاگنے اور شور مچانے لگا پیچھے پیچھے سنتری دوڑ رہے تھے، انھوں نے سنگینیں تان لی تھیں مگر وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ "میں تمھیں پہچان گیا ہوں مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔" اُس نے گھگیا گھگیا کر کہا۔ "تمھیں اپنی ماں و بہن کی قسم، مجھے معاف کر دو۔"

میں نے اپنے مضبوط پیروں سے اس پر ٹھوکر ماری۔ "میں تجھے نہیں چھوڑوں گا کمینے!" میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ سنتریوں نے مجھے پکڑ لیا تھا اس کے باوجود وہ میرے پیروں پر سر رکھ کے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔

وہ کریم گل تھا، وہ ظالم کریم گل جس نے اپنی چچی کے ساتھ مل کر کورا کو بیچنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ سنتری مجھے پکڑ نہ لیتے تو میں وہیں اُس کا کام تمام کر دیتا۔

"وہ کہاں ہے؟" میری گرج سے وہ لرز لرز گیا۔

"کون؟" اُس کی کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

"وہی، جسے تو، چچی بی اور اس حرام زادے کے ہاتھوں فروخت کر دینا چاہتا تھا کمینے، مجھے بتا دے وہ کہاں ہے؟ ورنہ میں تجھے یہیں زندہ دفن کر دوں گا۔"

"خدا کی قسم، مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ عاجزی سے بولا۔

سنتری مجھے پکڑ کے ایک طرف لے گئے، کچھ میرے پُرانے ریکارڈ کا اثر تھا کہ اُنھوں نے صرف تنبیہ کر کے مجھے چھوڑ دیا لیکن جیسے ہی میں اُن کی گرفت سے آزاد ہوا، میں نے کریم گل کی گردن دبوچ لی۔ "مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔" سنتریوں نے مجھے دوبارہ پکڑ کے جیلر کی خدمت میں پیش کر دیا اور جیلر نے کسی تاخیر کے بغیر مجھے ایک ہفتے کی قید تنہائی سے نواز دیا۔ مجھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ سزا کاٹنے کے بعد جب میں اپنی بیرک میں واپس آیا تو وہاں تھل پہلے سے موجود تھا۔ "لاڈلے!" اُس نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ "جانی! یہ تجھے کیا ہو گیا؟ تو تو اب پڑھ لکھ گیا ہے۔ تیرا حال سن کے مجھے فوراً یہاں آنا پڑا۔" میری خاموشی پر اُس نے بتایا کہ اُسے کریم گل کی زبانی سارا حال معلوم ہو گیا ہے۔ "کون تھی وہ لاڈلے؟ تیرے لیے تو میں آسمان سے پری اُتار لاؤں گا۔ جیلوں میں آدھے سے زیادہ قیدی عورتوں کی وجہ سے آتے ہیں، تو نے بہت چھپایا، لاڈلے! مجھے بتا تو سہی وہ کون تھی اور کہاں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم کہ وہ اب کہاں ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"تو اتنی عمر میں اُسے کہاں سے لایا تھا اور تیرا ارادہ کیا تھا؟ کیا تو پاگل ہو گیا تھا؟"

"مجھ سے کچھ مت بولو۔" میں نے اشتعال میں کہا۔

"میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں لاڈلے!" وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "تیرے ساتھ کیا گزری ہے؟ پر وہ کہتا ہے کہ اس نے بُری نیت ضرور کی تھی مگر اس کے بعد اُسے کچھ نہیں معلوم۔"

"جھوٹ بکتا ہے۔"

"وہ جھوٹ نہیں بول سکتا، یہاں اُس کی میرے مُریدوں نے جس طرح خاطر کی ہے اُس میں آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

تھل کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک رات بیرک میں اُس کے آدمیوں نے ایک ساتھ اُسے اتنا مارا کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ بیرک کے سارے قیدیوں کو سزائیں ملیں، اُن کی کمر ننگی کر کے کوڑے برسائے گئے مگر اُنھوں نے اُف تک نہیں کی، اُنھوں نے میرا انتقام لے لیا تھا۔ تھل نے اُسے میرے پیروں پر لا ڈالا۔ کریم گل نے اعتراف کر لیا تھا کہ میرے ہوٹل سے فرار ہونے کے بعد اُس کے آدمیوں نے ٹیکسی میں میرا تعاقب کیا تھا چونکہ اُسے یقین تھا کہ کورا میری بہن نہیں ہے لیکن راستے میں ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے بعد اُس نے کچھ نہیں کیا۔

پھر وہ کون لوگ تھے، جو ہمارا پیچھا کرتے کرتے دریا کے کنارے تک پہنچ گئے؟ کریم گل اس سے زیادہ نہیں بتا سکا، وہ اب بھی ایک لڑکی کے اغوا کے جرم میں سزا کاٹنے آیا تھا۔ یقیناً وہ کوئی اور لوگ تھے جو ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے، ممکن ہے وہ ٹیکسی والا ہی شکار ہو گیا ہو، ممکن ہے وہ چچی بی اور اُس کے شوہر کے زر خرید غنڈے ہوں، کریم گل نے بتایا کہ ہوٹل والوں کو یہ خبر ہو گئی تھی کہ میں نے دو بدمعاشوں اور ایک کانسٹیبل کو قتل کر دیا ہے مگر اُنھوں نے میرے بارے میں پولیس کو کچھ بتانے کے بجائے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی کیونکہ اس طرح اُن کا ہوٹل بدنام ہونے اور پولیس کی نظروں میں آنے کا خدشہ بھی تھا۔ تھل دو مہینے کی سزا کاٹنے کے بعد مجھے سمجھا بجھا کے باہر چلا گیا۔ کریم گل اب دن رات میری خدمت میں لگا رہتا تھا، کبھی وہ میرے پاؤں دباتا اور سر کی مالش کرنے لگتا، یا کبھی میرے قریب بیٹھ کے مجھے تکتا رہتا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے جھڑک کے اپنا پیچھا چھڑایا۔

کریم گل کے واقعے سے جیل کے حکام کی نظروں میں میری جو ساکھ خراب ہو گئی تھی وہ ایم اے سال اوّل کے امتحان میں کامیابی کے بعد کچھ بحال ہو گئی۔ نیا جیلر بھی احکام دیتے دیتے تھک گیا تھا، جیل کا پہیا پھر اپنی رفتار سے چلنے

لگا، قیدی آتے رہے اور اپنے جرائم کا جزیہ ادا کر کے واپس جاتے رہے، چھ سال میں، جیل کے اندر میں نے رنگ رنگ کے چہرے دیکھے، جیل میں بھی ویسے ہوتے ہیں، چھوٹا قیدی، بڑا قیدی، کمزور قیدی، طاقت ور قیدی، کالا قیدی، گورا قیدی۔ بجل اور اُس کے آدمیوں نے مجھے جیل میں رہنے کا سلیقہ سکھایا۔ جیل کے باہر بھی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور جیل کے اندر بھی۔ کتابوں سے زیادہ میں نے اُن سے پڑھا اور اُن سے زیادہ خود سے پڑھا کہ میں اتنی طویل مدت کے بعد بھی خود کو نہ بھلا سکا۔ میرا خود میری کورا تھی۔ ان چھ سال میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا جب وہ مجھ سے دُور رہی ہو۔ میں جیل میں قید تھا، وہ میرے سینے میں قید تھی۔

میں ایم اے کے دوسرے سال کی تیاری کر رہا تھا کہ جیل میں ایک نیا قیدی وارد ہوا، وہ چوبیس پچیس سال کا ایک تنومند شخص تھا۔ اُس کے چہرے سے شرافت ٹپکتی تھی۔ وہ نہ کسی سے بات کرتا تھا، نہ کسی کی سنتا تھا، بس خاموش اور اُداس رہتا تھا، اپنے آپ میں گم، جو میرا حال تھا وہی اُس کا تھا، یہی بات مجھے اُس کے قریب لے گئی لیکن وہ میری طرح اپنا غم راز نہ رکھ سکا۔ اُس نے اچھا ہی کیا، جیل میں ویسے بھی گھٹ گھٹ کے سارے غم گرد ہو جاتے ہیں، وقت کی دھول اُن پر جم جاتی ہے۔ جس نے اپنے غم کا اظہار کر دیا، اُس نے اسے ننگا کر دیا۔ میں نے اُسے باہر ہی نہیں نکالا تھا کیونکہ وہ مجھے بہت عزیز تھا۔ نوجوان سوشیل میری باتوں میں آگیا۔ وہ بنارس کا گریجویٹ تھا اور اپنے مختصر خاندان کا واحد کفیل، وہ روزی کی تلاش میں کلکتے آگیا تھا کہ ایک دن اُس کی بڑی بہن ہگلی میں ڈوب گئی کیونکہ اُسے سوشیل کے ایک امیر دوست نے دھوکا دیا تھا۔ وہ غیرت مند لڑکی جس نے اپنا سب کچھ اپنے بھائی کے عزیز دوست کے حوالے کر دیا تھا، اس صدمے کی تاب نہ لا سکی، سوشیل نے اپنے دوست کو قتل کر دیا لیکن قتل کرتے وقت اُس نے اپنی بوڑھی ماں، دو چھوٹے بھائیوں اور ایک بہن کے متعلق نہیں سوچا، اگر وہ انھیں ختم کر کے دوست کو قتل کرتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ وکیل نے اُسے پھانسی سے بچا لیا مگر سزا سے نہیں بچا سکا، اب کلکتے میں اُس کا خاندان فاقے کر رہا تھا اور وہ جیل میں تھا۔

میں نے بجل سے کہہ کے اُس کے خاندان کے لیے گزارے کا انتظام کرا دیا۔ سوشیل نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ ایک صبح بیرک میں اُس کی لاش پائی گئی۔ وہ شدتِ غم سے مر گیا تھا، اس اعتبار سے وہ مجھ سے زیادہ غیرت مند ثابت ہوا، اُس نے مجھے شکست دے دی، مجھے مات دے کے چلا گیا۔

ساتویں سال جب میں فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کا امتحان پاس کر چکا تھا تو ایک دن مجھے جیلر نے طلب کیا اور آزادی کا مژدہ سنایا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ یہ تو صحیح تھا کہ اس سال کے اختتام پر شب و روز ملا کے میری سزا مکمل ہونے والی تھی مگر اس قدر جلدی اور اچانک یہ پروانہ آ جائے گا، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے پڑھا اور آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے، جیلر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے نصیحتیں کر رہا تھا، مجھے اس کی کوئی بات یاد نہیں۔ اس خبر سے میرے اعصاب جواب دے گئے۔ رگ و پے میں جیسے برف گھل گئی۔

میں نے بیرک میں آ کے کسی کو نہیں بتایا کہ اب میں اُن سے بچھڑنے والا ہوں، یہ خبر بجل تک ضرور پہنچ جاتی اور وہ ایک جلوس کی شکل میں دروازے پر میرا استقبال کرتا، میں ساری رات بیرک میں ٹہلتا رہا اور صبح آٹھ بجے جیلر کے دفتر میں حاضر ہو گیا، اُس نے میری خون آلود شیروانی، کُرتا، پاجامہ اور سات سال پُرانے نوٹ، جو میری جیب سے برآمد ہوئے تھے، واپس کر دیے اور میری مالا بھی میرے سپرد کر دی۔ میں نے جیلر کے سامنے بے اختیار ہو کے اُسے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اب پُرانا لباس میرے جسم پر نہیں آ سکتا تھا، اُس سخت مزاج جیلر نے میری مجبوری محسوس کر لی اور اپنا کرتا پاجامہ مجھے دے دیا، پھر اُس نے میری کمر تھپتھپائی، میری ناک پکڑی اور مجھے اپنے دفتر کے دروازے پر رخصت کرنے آیا۔ "میں نے تمھارا چاقو واپس نہیں کیا ہے اس لیے کہ اب تمھیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اُس نے مسکرا کے کہا۔

"جناب...." مجھ سے کچھ کہا نہ جا سکا۔

"جاؤ، میں دوبارہ تمھاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"جناب...." میں نے بے تابی سے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

سنتریوں نے مجھے جیل کے خاص دروازے تک پہنچا دیا۔

کچھ دیر بعد میں جیل کے آہنی پھاٹک کے باہر کھڑا تھا۔

باہر کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی، یہاں نہ سنتری تھے، بیرکیں تھیں، نہ یہاں پتھریلی دیواریں تھیں اور نہ لوہے کی سلاخیں، چوڑی چوڑی سڑکیں، بلند و بالا عمارتیں، بھاگتے چیختے ہوئے لوگ، دکانیں، ٹھیلے، گاڑیاں، بڑا عجیب منظر تھا، میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں، گے۔ یہ خواب تھا یا حقیقت؟ جو کچھ پیچھے رہ گیا وہ خواب تھا یا جو سامنے موجود ہے، یہ خواب ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے خوف سا محسوس ہوا، مجھے نیند سے بیدار نہ کر دے اور میں دوبارہ سلاخوں کے پیچھے نہ چلا جاؤں۔ نے تیز قدموں سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ جیل میں جانے کا اتنا دُکھ نہیں تھا جتنا واپس آنے کی خوشی ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ مگر یہ کلکتہ ہی تھا اور میں جیل سے آزاد ہو گیا تھا، سات سال میں دوبارہ کھلے آسمان کے نیچے تھا۔ اب میں جہاں اور جدھر چاہتا، خوب بھاگ سکتا تھا۔ اونچی آواز میں گانا گا سکتا تھا، میں دکانوں پر دیر تک کے نت نئی چیزوں کا نظارہ کر سکتا تھا، یہاں ٹھیلوں پر پھل بکھرے ہوئے تھے، ہوٹلوں سے کھانوں کی مست خوشبو آ رہی تھی۔ چائے کی پیالیاں کھڑک رہی تھیں، میں نے پورے سات برسوں میں صرف ایک بار جیلر کے گھر کی دیکھی تھیں، سونیا، اُس کی ماں اور چھوٹی بہن مگر اب یہاں تو عورتیں نظر آ رہی تھیں، رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس۔ معلوم ہوتا تھا جیسے د

تبدیل کر گئی ہے، ہر چیز بدلی ہوئی تھی۔ میں حیران حیران نظروں سے جیل کے پھاٹک کے باہر کی دنیا کے مناظر دیر تک دیکھتا رہا۔ میں نے خود کو اجنبی محسوس کیا حالانکہ کسی شخص نے مجھ پر توجہ نہیں دی تھی، سب اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ کوئی آ رہا تھا، کوئی جا رہا تھا، ہر شخص کو جلدی تھی جیسے آج کے بعد دنیا ختم ہو جائے گی، ہر کام نمٹانا ہے، آج ہی نمٹا لیا جائے۔ خاصی دیر بعد مجھے کچھ ہوش آیا اور سب سے پہلے مجھے کرا کا خیال آیا۔ جیل سے آزادی کی حیرت میں یہ خیال چند لمحوں کے لیے مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ شاید اسی لیے تنہائی اور اجنبیت سی محسوس ہوئی تھی، کسی چیز کی کمی تھی جیسے میں جیل میں کچھ بھول آیا ہوں۔ میں نے بجل کو اپنی رہائی کی اطلاع جان بوجھ کر نہیں دی تھی۔ ورنہ دروازے پر میرے استقبال کے لیے ایک بھیڑ موجود ہوتی، بجل خوشی سے دیوانہ ہو جاتا اور مجھے جلوس کی شکل میں اپنے اڈے تک لے جاتا۔ اب اس شہر میں میرے جاننے والوں کی کمی نہیں تھی، سات سال میں نہ جانے کتنے قیدی جیل میں آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے۔ بدنصیب میاں کانتے، شوبی، چوبیس، بندھو، سانولے، لیلا، تیجا اور بہت سے دوست، یہاں سابق جیلر کا گھر بھی تھا اور سوشیل کا کنبہ بدنصیب خاندان بھی یہیں رہتا تھا، جسے یہ معلوم ہوتا کہ آج لاڈلا جیل سے رہا ہو رہا ہے، وہ دوڑا ہوا آ جاتا۔

وہی شہر، گلیاں، عمارتیں اور وہی لوگ تھے لیکن میں وہی نہیں تھا۔

میرے چہرے پر اب بھوری داڑھی تھی اور میرا قد پہلے سے لمبا ہو گیا تھا، میرے شانے پھیلے ہوئے تھے، سینہ چوڑا تھا اور ٹانگیں مضبوط تھیں، مجھے بہت سے آدمیوں میں علیحدہ سے پہچانا جا سکتا تھا۔ یہ تو تھی ظاہری حالت۔ اندر سے میرا حال وہی تھا، وہی بے چینی، مایوسی، خوف اور کرا۔ ایسا لگتا تھا جیسے صرف ایک رات گزری ہے اور صرف ایک بھیانک رات میں میرے جسم کا حلیہ بدل گیا ہے اور کرا کل رات ہی مجھ سے جدا ہوئی ہے۔ یہ ایک طویل سیاہ رات تھی۔ میں نے بجل اور اُس کے ساتھیوں کو اسی لیے اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ آ جائیں گے تو مجھے کرا کو ڈھونڈنے کا وقت نہیں مل سکے گا۔ جب تک اُس کے بارے میں کوئی خبر نہ مل جاتی، اُس وقت تک مجھے چین کیسے نصیب ہو سکتا تھا۔ جیل سے رخصت ہوتے وقت جیلر نے وہ روپے بھی میری جیب میں ڈال دیے تھے جو سات سال پہلے میری جیب سے برآمد کیے گئے تھے۔ میں نے انھیں گنا نہیں تھا، دو ڈھائی سو سے کم کیا ہوں گے۔ مالا میں نے گلے میں کرتے کے اندر چھپا لی تھی۔

میں نے بے تابی سے ہاتھ اُٹھا کے ایک خالی رکشا کو آواز دی۔ خلیما فاصلہ طے کرنے کے بعد رکشا اُس بازار سے گزرنے لگا، جہاں سے میں کرا کے ساتھ کئی بار گزرا تھا۔ مجھے اُن موتروں، ہوٹلوں کے بورڈ بھی نظر آئے جن میں ہم دونوں نے وحشت ناک وقت بسر کیا تھا۔ میرا دل اندر سے کسی نے پکڑ لیا، اُس وقت کا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا۔ رکشا مدرسے کے سامنے جا کے ٹھہر گیا، مدرسے کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، بس دیواروں پر نئی نئی سفیدی کی گئی تھی۔ میں دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوا اور میری نگاہ کسی شناسا کو تلاش کرنے لگی۔ کوئی پرانا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے دفتر کی چق ہٹائی، میز پر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ کے اندر بلا لیا۔ "فرمائیے؟" اُس نے سپاٹ آواز میں کہا۔ مجھے کچھ کہتے ہوئے جھجک ہوئی، میں سوچنے لگا کس طرح پوچھوں؟ وہ شخص میرے پس و پیش پر جھنجلا گیا اور کہنے لگا: "فرمائیے، کیا کام ہے؟"

"جناب میں ایک صاحب کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ گم شدہ لوگوں کا دفتر نہیں ہے، مدرسہ ہے۔" اُس نے کہا۔ "البتہ اگر مدرسے کے کسی صاحب کے بارے میں پوچھنا ہے تو فرمائیے، میں حاضر ہوں۔"

"جناب! میں مولوی محمد شفیق کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "وہ مراد آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"مولوی محمد شفیق؟" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس نام کے کسی صاحب سے واقف نہیں ہوں۔"

مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ "وہ یہیں پڑھاتے تھے۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "وہ مراد آباد سے کبھی کبھی یہاں پڑھانے آتے تھے، آپ انھیں ضرور جانتے ہوں گے۔"

"بھائی! میں نے عرض کیا نا کہ میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔ مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے پانچ سال گزر گئے ہیں۔" اُس نے کسی قدر ناراضی سے جواب دیا۔

"پانچ سال؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "اور پانچ سال میں اس نام کے کوئی مولوی صاحب اِدھر نہیں آئے؟"

"جی نہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، قطعاً نہیں، اور میری یادداشت ایسی کمزور بھی نہیں ہے۔"

"اس سے پہلے؟" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "کوئی سات سال پہلے وہ یہاں ضرور آتے تھے۔ آپ مدرسے کے کسی بزرگ سے پوچھیے۔"

"ہاں ممکن ہے۔ اب میں اپنے پیدا ہونے سے پہلے کی باتیں تو یاد رکھ نہیں سکتا۔" وہ تلخی سے بولا۔ "فرض کیجیے، میں آپ کو کسی بزرگ سے ملا بھی دوں تو آپ کو کیا حاصل ہوگا۔ جو شخص پانچ سال سے یہاں نہیں آیا اُس کے بارے میں آپ کچھ جان کر کیا کریں گے اور وہ آپ کو کیا بتا پائیں گے۔"

"مجھے اُن کے بارے میں کچھ ضروری باتیں معلوم کرنی ہیں۔" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "شاید کوئی بات معلوم ہو جائے۔ براہِ مہربانی میری مدد کیجیے، میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

اُس نے قلم دوات میں رکھ دیا اور اکتاہٹ سے بولا: "آئیے میرے ساتھ، لیکن آپ کا نام کیا ہے؟"

میں نے اپنا نام ظہیر خان بتلایا اور اپنے آنے کی غرض و غایت بتاتے ہوئے بھی جھوٹ بولا۔ وہ جھجکتے ہوئے مجھے ایک بزرگ کے پاس لے گیا۔ بزرگ ایک جماعت کو درس دینے میں مصروف تھے۔ میں اُن مولوی صاحب کو پہچان گیا۔

اب وہ خاصے ضعیف ہو چکے تھے۔ جب اُن سے مولوی محمد شفیق کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ چونک پڑے، ساتھ ہی میرا دل بھی اُچھل کے حلق میں آگیا۔ "پتہ نہیں میاں!" وہ تاسف سے بولے۔ "پتہ نہیں مولوی محمد شفیق کہاں ہیں، کدھر کو چلے کے بس گئے۔ یہ لت آٹھ سال پہلے کی بات ہے، وہ اپنے عزیزوں کے ہاں سے گئے تھے پھر آج تک واپس نہیں آئے، کوئی خیر خبر بھی معلوم نہیں ہوئی۔ اُن کی خیریت پوچھنے کے لیے مراد آباد کئی خط ڈالے گئے مگر کسی نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ پھر مراد آباد کے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ وہاں بھی موجود نہیں ہیں۔"

"کیا وہ اُس دن کے بعد سے واپس نہیں آئے؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "وہ کہاں چلے گئے؟"

"اللہ جانتا ہے۔" بزرگ مولانا ٹھنڈی سانس لے کے مختلف آواز میں بولے۔ "ایسے گئے کہ اب تک نہیں لوٹے۔ اُن کا سامان بھی بہت دنوں تک حجرے میں پڑا اُن کا انتظار کرتا رہا، پھر میں نے اُسے اپنے حجرے کی الماری میں بند کر دیا۔"

میرے اعصاب جھن جھنا گئے۔ میں سکتے کی حالت میں انھیں گھورنے لگا۔ میری یہ کیفیت دیکھ کے بزرگ مولانا نے پوچھا: "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ آج اتنے برسوں بعد مولوی مرادآبادی کا جاننے والا کہاں سے آگیا؟"

"کیا آپ مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہیں؟" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں اُن کے مرحوم دوست کا لڑکا ہوں۔"

"ضرور ضرور۔" بزرگ نے شفقت سے جواب دیا۔ "کہو۔"

"کیا آپ اُن کا سامان مجھے ایک نظر دکھا سکتے ہیں؟"

بزرگ نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "کیوں نہیں لیکن سامان تو اُنھی کا ہے، میں اُنھی کے حوالے کروں گا۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میں اُسے صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی چیز طلب نہیں کروں گا۔"

"بہر حال۔" بزرگ شخص جھجکتے ہوئے بولے۔ "آپ کا اصرار ہے تو یہی سہی، وہ معمولی سامان ہے، آیئے میرے ساتھ۔"

★

وہ مجھے ایک حجرے میں لے گئے، بڑے صاحب بھی تنہا رہتے تھے۔ یہ حجرہ اس حجرے سے مختلف نہیں تھا جس میں ہم لوگ ٹھہرے تھے۔ بزرگ نے اپنے کمزور ہاتھوں سے الماری کا تالا کھول کے میرا سوٹ کیس اور مولوی صاحب کا کچھ سامان باہر نکالا۔ سب کچھ جوں کا توں محفوظ تھا۔ میری بہن فہمیدہ کا دوپٹا اور کورا کے کپڑے، سینڈل، میرے کپڑے، میری میٹرک کی سند، مولوی صاحب کے کپڑے، جلد بین، تکیہ، لوٹا اور وہ تمام سامان جو آخری دو دنوں میں مولوی صاحب نے ہمارے لیے خریدا تھا۔ میں نے فہمیدہ اور کورا کا دوپٹا اُٹھا کے بے اختیار اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا مگر میرے آنسو بُری طرح نکل آئے۔ اتنے آنسو نکلے کہ ہچکیاں بندھ گئیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر میں نے دوپٹا

جھپٹ کر سینے سے لگا لیا۔ سینا لیا گر جانے ایسا اُٹھا کہ بزرگ کی موجودگی کا خیال نہ رہا۔ انھوں نے میرے کندھے پر اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولے:

"میاں! آپ کو کیا ہو گیا؟ کیا ان کپڑوں سے آپ کا بھی کوئی تعلق ہے؟ کیجیے آرام سے بیٹھیے اور مجھے اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔ آپ نوجوان آدمی ہیں، ضبط سے کام لیجیے۔"

میں نے اُن کے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اُن کے ہاتھ آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ بزرگ نے اپنے بھیگے ہوئے ہاتھ ہٹا کے میرے سر پر رکھ دیے۔ "میاں بات ہے؟ آپ مجھ سے اپنے دل کا حال کہہ دیجیے اور خوب رو لیجیے۔ آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ یقیناً آپ کے ساتھ کوئی بڑا سانحہ ہو گیا ہے۔ اگر آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھیے۔" میں نے لیا: "بس مولوی صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے رقت، "یہ سامان واپس رکھ دیجیے، شکریہ، بہت بہت شکریہ۔" میں نے آپ کو دی۔ میں آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان بولا اور ایک پل میں حجرے کے دروازے پر آ گیا۔ بزرگ مجھے بلاتے اور چیختے رہ گئے۔ میں وہاں ایک لمحے بھی نہ ٹھہرا۔ انھوں نے اس ضعیفی میں نہ جانے کس تیزی سے حجرے کے باہر آ کے مجھے آوازیں دیں لیکن میں وہاں سے بھاگتا اور مدرسے کی عمارت عبور کرتا ہوا

◙

گلی میں آ کے میں ہانپتا ہوا فٹ پاتھ کے ساتھ ایک کھمبے سے سر ٹکا گیا۔ مجھ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا رہا تھا۔ اسی کھمبے سے سر ٹکرا پاش کرنے کو جی کرتا تھا۔ مولوی صاحب کا کوئی پتہ نہیں! پھر وہ ایسی میں کہاں چلے گئے کہ انھیں مدرسے سے اپنا سامان اُٹھانے کی بھی مہلت نہ ملی؟ دماغ میں کن سلائیاں رینگنے لگیں۔ میں خود کو اچانک ایک بوڑھا شخص محسوس کرنے لگا۔ بزرگ نے میرے جسم کی ساری طاقت کھینچ لی تھی۔ خبر نہیں کہ کتنے لوگ مجھے اس عالم میں دیکھ کے گزر گئے تھے اور کتنے قریب کھڑے تھے۔ ایک کانسٹیبل نے آ کے اپنی لاٹھی میرے بازو میں چبھوئی حالانکہ میں خاموش بیٹھا تھا، کسی سے کچھ کہہ رہا تھا، نہ میری کوئی فریاد تھی۔ اُس نے مجھے وہاں بیٹھنے تک نہیں دیا۔ "کون ہے تو!" اس نے نفرت سے پوچھا۔

میں نے سر اُٹھا کے دیکھا، کانسٹیبل کے ساتھ اور راہگیر بھی کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے انداز میں استہزا اور تمسخر تھا۔ میں چپ چاپ وہاں سے اُٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ "سکرو ڈھیلا ہے۔" "لگتا ہے سالا ابھی جیل سے چھوٹ کے آیا ہے۔" "بال تو دیکھو، بڑے بھگوں کی طرح اُگے ہوئے ہیں۔" لوگ میرے حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ بڑی بے بسی سے پیچھے مُڑ کے دیکھا تو وہ سہم کر چپ ہو گئے۔

میں گلی گلی کوچے کوچے ویران نظروں سے لوگوں کو دیکھتا رہا اور نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اور

تا لیے تھے مولوی صاحب مدرسے واپس نہیں آسکتے اگر کورا کو وہ غنڈوں کے نرغے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو دوسرے دن تیسرے دن ضرور مجھے حوالات میں دیکھنے آتے یا جیل میں ملاقات کے لیے آتے یا خط کے ذریعے اطلاع دیتے، اُن کی اتنی طویل گمشدگی اس بات کا ثبوت تھی کہ انھوں نے کورا کو حاصل کر لیا اور وہ مجھ سے کوئی رابطہ قائم کرنے میں خوف محسوس کر رہے ہیں۔ میں انھیں کورا کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا، باقی باتیں خود کورا نے انھیں بتا دی ہوں گی کہ بستی کے بانگ قبیلے کے لوگ اُس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ یقیناً پیشِ نظر انھوں نے اپنے آپ کو چھپایا ہو گا۔ اگر وہ کورا کو حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتے تو مدرسے واپس آ کے اپنا سامان ضرور حاصل کرتے۔ اُن کے واپس نہ آنے اور اپنے بارے میں کوئی خبر نہ دینے سے ظاہر تھا کہ کورا کے معاملے کی نزاکت دیکھتے ہوئے انھوں نے کلکتے سے چپ چاپ نکل جانے کو ترجیح دی ہو گی۔ شاید انھوں نے دیکھ لیا ہو کہ میں نے ایک کانسٹیبل کو ہلاک کر دیا ہے اور موقعِ واردات پر پولیس اور کانسٹیبل آ گئے ہیں۔ اُس وقت سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔ جب مولوی صاحب کورا کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے تو ایک غنڈا اُن کے پیچھے لگ گیا تھا۔ اُس کا راستہ روک کر میں نے مولوی صاحب کو آگے جانے میں مدد دی تھی اور چاقو اُس کے پیٹ میں گھونپ کر اُس کا کام تمام کر دیا تھا۔ اگر کانسٹیبل بیچ میں نہ آ جاتا تو میں مولوی صاحب کو پکڑ لیتا۔ مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔ مولوی صاحب اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں نے دوسرے کورا کی ایک آخری چیخ سُنی تھی، اس کے بعد کے واقعات پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے جیل میں جب بھی اس واقعے کا تجزیہ کیا تھا مجھے ایک اطمینان محسوس ہوا تھا اور تجزیہ میں نے ہزاروں بار کیا تھا۔ ہزاروں بار کیا میں سوچتا ہی رہتا تھا۔ اسی لیے میں سب سے پہلے مدرسے آیا۔ خیال تھا کہ مولوی صاحب کے بارے میں یہاں سے کوئی اشارہ ضرور مل جائے گا۔

کیا میں یہی سننے کے لیے جیل سے آیا تھا؟ میلوں پیدل چلتے ہوئے مجھے شام ہو گئی، نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ پینے کا۔ وہ شہر جو جیل کے پھاٹک سے باہر آنے کے بعد بہت حیران کن لگ رہا تھا، اب مجھے اُسے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ شہر تو کوئی صحرا نظر آ رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اس شہر کو آگ لگا دیتا۔ مغرب کے بعد جب شہر روشنیوں میں نہا گیا تو میں نے اپنے آپ کو ہاوڑا اسٹیشن پر موجود پایا۔ جی میں آیا ایک بار مجمل سے ملاقات کر لوں، اسے میری رہائی کی خبر ملے گی تو وہ کیا سوچے گا، کہے گا بہت کمینہ اور کم ظرف نکلا۔ ہر بار جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے جیل آتا تھا، یہی پوچھتا تھا کہ میری قید کے دن کب ختم ہو رہے ہیں؟ وہ کہتا تھا: "لاڈلے! مجمل کے اڈے پر کبھی اتنا بڑا جشن نہیں ہوا ہو گا جو میں تیری رہائی پر مناؤں گا۔"

مجمل کو کیا معلوم تھا کہ میرے لیے دنیا میں سب سے اہم ذات کون سی ہے۔ میں نے اس کی ناراضی نظر انداز کر دی اور کھڑکی سے ٹکٹ لے کے بینچ پر آ کے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ مراد آباد جانے والی گاڑی میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ میں نے

ایسی بینچ منتخب کی تھی جہاں مسافروں کی بھیڑ کم تھی۔ اپنا بازو سر کے نیچے رکھ کے میں نڈھال ہو کے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسٹیشن پر ہونے والے شور سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ مجھے اس نیم جانی کی کیفیت میں پڑے ہوئے کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ میں نے اپنے قریب کسی کی سرسراہٹ محسوس کی۔ کوئی مسافر ہو گا، یہ خیال کر کے میں کروٹ بدلے بغیر ویسے کا ویسا پڑا رہا لیکن دوسرے ہی لمحے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ایک شخص کا ہاتھ میرے گریبان پر تھا اور دوسرے کا جیب میں۔ میری اچانک بیداری سے وہ گھبرا کے پیچھے ہٹے۔ ایک میری مالا پر ہاتھ ڈالنے کی فکر میں تھا، دوسرا میری جیب کاٹنے کی کوشش میں۔ میری ہڑبڑاہٹ پر وہ بھاگنے کے بجائے مجھ پر چڑھ دوڑے۔ ایک نے ناک کے پاس گال پر مکا لگایا، دوسرے نے پیٹ میں گھونسا مارا۔ میں دہرا ہو گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے والے شخص نے مغلوب الغضب ہو کے فوراً میری جیب پر دوبارہ ہاتھ ڈالا اور دوسرے نے میرا گریبان پھاڑ دیا۔ میں نے اسی تکلیف کے عالم میں اپنا سر اُس کے سینے پر مارا۔ وہ دھڑام سے پلیٹ فارم کی سخت زمین پر گر گیا۔ اس اثنا میں جو شخص جیب سے روپے نکالنے کی کوشش میں تھا، وہ سنبھل کر کھڑا ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں روپے نہیں آئے تھے یا اُس نے اپنے دوسرے ساتھی کا حشر دیکھ کے ارادہ ملتوی کر دیا ہو گا۔ اُس نے جیب سے ہاتھ نکال کے مجھ پر وار کرنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ میں نے اُس کا ہاتھ جہاں تھا، وہیں پکڑ لیا اور اُس کے پیٹ میں اتنے زور سے گھٹنا مارا جتنے زور سے اُس کے ساتھی نے مجھے مارا تھا۔ وہ کراہتا بلبلاتا پیٹ پکڑے ہوئے بینچ کے قریب لہرا کے ڈھیر ہونے لگا۔ میں نے وہاں سے فوراً بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن چند قدم آگے مجھے دو اور غنڈوں نے گھیر لیا۔ میں اپنی جگہ رُک کے اُن کے حملے کا جواب دینے کے لیے تیار تھا کہ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس دوران میں دوسرے نے جوش میں آ کے مجھ پر حملہ کر دیا تھا لیکن میرے روکنے سے پہلے اُس کے ساتھی نے اُسے روک لیا اور حیرانی سے مجھے گھورنے لگا۔

"لاڈلے؟" اُس نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے تعجب سے کہا۔ "تو آزاد ہو گیا؟ یہ تو ہی ہے نا؟"

"ہاں میں سالے، یہ میں ہی ہوں۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

"لاڈلے!" وہ چیخ کر جوش میں مجھ سے لپٹ گیا اور اپنے ساتھی کے بال پکڑ کے اُسے اُس نے میرے پیروں پر دھکا دے دیا۔ "یہ لاڈلے ہے بے۔ اپنا لاڈلے، اپنا یار۔ اُستاد جس کا ذکر صبح و شام کرتے ہیں۔ یہ اُستاد مجمل کا لاڈلا ہے۔"

اُس کا ساتھی آنکھیں پھاڑے ہوئے اُٹھا۔ "یہ ہے وہ؟"

"ہاں یہ وہ میرے سینے سے علیحدہ ہو کے فخر سے بولا۔ "ارے اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس نے جیل میں آتے ہی اُستاد کانتے کو چت کر دیا تھا۔ اُستاد نے اسے خود داؤ سکھائے ہیں، سالے تم کیا، تمہارے جیسے دس آدمی بھی اس پر قبضہ نہیں جما سکتے۔" غیرت ہوئی کہ لاڈلے نے ہاتھ نہیں اُٹھایا، مگر لاڈلے

وہ میری طرف متوجہ ہو کے تذبذب سے بولا "تو یہاں کیسے نظر آرہا ہے؟ تو کب آزاد ہوا؟ استاد کو خبر نہیں کی؟"

"میں آج ہی آزاد ہوا ہوں، استاد کے پاس نہیں گیا۔"

"کیوں؟" اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔

"مجھے پہلے ایک اور جگہ جانا تھا۔ میں جلدی واپس آ کے استاد سے ملوں گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"نہیں لاڈلے! اگر استاد کو خبر ہو گئی کہ تو اس سے ملے بغیر چلا گیا ہے تو وہ بہت ناراض ہوگا، آ چل ایک بار اسے اپنی شکل دکھا آ، اسے چین آ جائے گا۔ اس پر تو نے جادو کر دیا ہے چل۔" اس نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔

"نہیں۔ میں ابھی نہیں جا سکتا۔" میں نے اپنا کندھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت بری بات ہے لاڈلے!" اس نے مجھے سمجھانا چاہا۔ "تو نے تو جیل میں بہت پڑھا لکھا ہے، پھر بھی ایسی نادانی کی بات کر رہا ہے۔"

"مجھے بہت ضروری کام ہے سارٹے! اسی لیے میں بھجل بھائی کے پاس نہیں گیا کہ وہ مجھے جلدی نہیں جانے دیں گے۔"

"ابے سالے! سات سال تک کام پڑا رہا، جیل سے آزاد ہوتے ہی تجھے اتنی جلدی ہو گئی! ابے تو تو بڑا بے مروت ہے۔"

"دیکھو سارٹے!" میں نے لجاجت سے کہا "مجھے معلوم ہے کہ یہ اچھی بات نہیں ہے لیکن تجھے اندازہ نہیں ہے کہ مجھے اس دن کا کتنے سال سے انتظار تھا۔ میں تجھ سے منت کرتا ہوں کہ تو استاد کو مجھ سے ملنے کی بات مت بتانا۔"

"لاڈلے! اگر استاد کو معلوم ہو گیا تو وہ میری کھال کھینچ لے گا۔"

"تو کہہ دینا۔" میں نے روٹھی آواز میں کہا "کہہ دینا کہ لاڈلا بہت برا آدمی نکلا۔ ہو سکے تو اسے منانے کی کوشش کرنا ورنہ تیری مرضی۔"

اس دوران میں وہ دونوں غنڈے جنھوں نے میری مالا اور روپوں پہ ہاتھ صاف کرنا چاہا تھا، کراہتے ہوئے اٹھ کر آ گئے اور سارٹے کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ "سالو!" سارٹے نے کہا "غلط آدمی پہ ہاتھ ڈال دیا، میری نظر بھی چوک گئی۔ لاڈلے! تجھے دیکھے ہوئے اتنے دن ہو گئے کہ میں تیرا چہرہ پہچان سکا، بے داڑھی تو نرالی ہوتی۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے، معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے پیارے؟ ضرور کوئی چکر ہے کیا ہمیں بھی نہیں بتائے گا۔ آ چل چائے پی۔"

"جی نہیں چاہ رہا ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"ابے چل۔" اس نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا "اور سنا باقی دن جیل میں کیسے گزرے؟ کوئی ہاتھ اس درمیان اچھا ہی نہیں پڑا کہ تیرے پاس آ جاتا۔ تجھے دیکھے ہوئے تین سال ہو گئے مگر تو نے مجھے خوب پہچانا۔ میں بھی تو کہوں کون سالا ایسا جیالا آ گیا جس نے ایک ہاتھ میں دو آدمیوں کا دھڑن تختہ کر دیا۔ چلو بے۔" اس نے اپنے ساتھیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا "لاڈلے سے معافی مانگو، سالے اپنے آدمی پہ ہاتھ ڈالنے کا گناہ کر رہے تھے۔" پھر اس نے اپنے گال پر سو چار طمانچے رسید کیے، کان پکڑے "یار معاف کر دے لاڈلے!"

"جانے دے سارٹے! تیری اور ان کی کیا غلطی ہے، یہ مجھے جانتے تو تھے نہیں۔ جو ہو گیا ہو گیا۔ اپنی سنا، شول کیسا ہے؟ گاتا گاتا ہے یا نہیں؟ کانتے کا کیا حال ہے؟ بندھو کیا کر رہا ہے اور وہ چاقو باز تیما کرم، نصیب میاں کیا کر رہے ہیں؟"

"یار سب سے ایک ساتھ مل لے گا، میں کہتا ہوں میرے ساتھ چل، کا وقت ہے سبھی ڈیرا ڈالے ہوئے ہوں گے۔ سفر پہ جانا ہے تو کچھ ڈھنگ کے کپڑے پہن کے جا، استاد بھجل کا آدمی اور اس حلیے میں سفر کرے، استاد کے نام کی تو لاج رکھ لے یار۔"

"بس کر سارٹے، اصرار نہ کر، کچھ ایسی ہی مجبوری ہے۔" میں نے عاجزی کی۔ "استاد سے مت کہنا، بس تجھ سے یہی التجا ہے۔"

"دیکھ بھئی لاڈلے! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو بتا، ہاتھ پاؤں سنبھال سے چلانا، ابھی سات سال کی کاٹی ہے، خیال رکھنا۔ ورنہ جہاں جا رہا ہے مجھے بھی ساتھ لیتا چل۔ میں اڈے پہ کہلوا دیتا ہوں۔"

"نہیں سارٹے! میں تنہا جاؤں گا، بے فکر رہ، میں اپنا پورا خیال رکھوں گا اور جلدی واپس آؤں گا، دعا کر کہ میرا کام ہو جائے۔"

"ابے اپنی دعا کہاں قبول ہوگی، ہاں سالا بددعا کرا تو وہ دعائیں بن جائے گی۔ چل چائے پی۔"

چائے کے اسٹال پر آ کے سارٹے نے نہ صرف چائے سے بلکہ اس کے لوازم سے بھی میری خوب تواضع کی اور مجھے ٹھونس ٹھونس کر کھلاتا رہا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی تھی، وہ آخر وقت تک اصرار کرتا رہا کہ میں ایک بار بھجل سے ضرور مل لوں۔ اس نے مجھے اپنی قمیص اور واسکٹ اتار کے دے دی، ان کے ایک ساتھی کا جوتا میرے پیر میں فٹ آ گیا۔ ایک کے گلے میں رومال بندھا ہوا تھا، اس نے رومال میں مکھن اور برٹینیا بسکٹوں کے بہت سے پیکٹ باندھ دیے۔ پھر سارٹے نے ان سب کو حکم دیا کہ وہ اپنی جیبیں خالی کر کے جو کچھ بھی ان کے پاس ہے میرے حوالے کر دیں۔ میں منع کرتا رہا مگر انھوں نے میری جیب میں روپے ٹھونس ہی دیے۔ جب تک گاڑی چلی نہیں اور انھوں نے مجھے کی ایک برتھ پر آرام سے لٹا نہیں دیا، اس وقت تک وہ پلیٹ فارم پر ٹھہرے رہے۔ گاڑی حرکت میں آتے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

★

سارٹے یا اس کے کسی ساتھی کی زبانی بھجل کو میری رہائی کا پتہ چلے گا تو وہ بہت برہم ہوگا مگر اسے یہ خبر دو تین روز بعد ملنی تھی جب جیل کے معمول اس کے آدمی یا وہ خود مجھ سے ملنے کے لیے آتا۔ تب بھی وہ یہ جان کر بہت ناراض ہوتا جس انداز سے سارٹے اور اس کے ساتھیوں نے مجھے رخصت کیا تھا۔ اس سے مجھے یہ توقع تھی کہ وہ بھجل کو نرم کرنے کی ضرور کوشش کریں گے، وہ میری سفارش کریں گے۔ اب جو بھی ہو، ساری دنیا ناراض ہے تو بھجل بھی۔

میں برتھ پر لیٹا ہی سوچتا رہا۔ گاڑی اسٹیشن پر اسٹیشن عبور کرتی رہی، مجھے ایک لمحے کے لیے بھی نیند نہیں آئی حالانکہ سامنے کی برتھوں پر اوپر نیچے ہر شخص سو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب میں جاگ ہی رہا ہوں تو اس بوڑھے شخص کو اپنی برتھ کیوں نہ دے دوں جو زمین پر سکڑا ہوا بیٹھا ہے اور بار بار کروٹیں بدل رہا ہے۔ نیچے اتر کے میں نے اسے جگایا اور اپنی جگہ کی پیش کش کی۔ وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔

"نہیں نہیں بابو جی! میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"جاؤ، مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے اکتاہٹ سے کہا۔

"میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے بابو!" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"لیٹ جاؤ۔ ٹی ٹی آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

وہ جھجکتا اور سمٹتا ہوا اوپر چلا گیا اور میں اس کی جگہ فرش پر بیٹھ گیا۔ باقی رات یوں ہی بیٹھے بیٹھے گزر گئی۔ مجھے کسی کل چین نہیں تھا۔ سفر خاصا طویل تھا اور ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ لکھنؤ اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ ابھی مراد آباد دو سو میل ہے۔ ڈبے میں ہر شخص ایک دوسرے سے مانوس ہو گیا تھا، کچھ درمیان میں اتر گئے تھے، کچھ نئے مسافر آ گئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بات کرنا چاہا "کہاں جانا ہے؟ کیا کرتے ہو؟" میں ہوں ہاں کر کے ٹالتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے مجھ سے بات چیت ہی بند کر دی۔ میرے کپڑوں اور بالوں میں سفر کی خاک دھول اٹ گئی تھی۔ جب میں نے ہاتھ روم کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو پہچاننے میں نہیں آیا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور رپوٹے سوجے ہوئے تھے، دل آئینے میں نظر نہیں آ یا ورنہ وہ بھی سر تا پا ویران دکھائی دیتا۔ میں کسی اور دنیا کا آدمی تھا۔ یہاں تو ہر شخص مجھ سے مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ گاڑی رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ آج ہی اسے لیٹ بھی ہونا تھا۔ جیسے تیسے بریلی اسٹیشن آیا، لوگوں نے بتایا کہ مراد آباد اب پچاس میل کے قریب رہ گیا ہے۔ پھر رام پور اسٹیشن پر یہ فاصلہ گھٹ کے ستر اٹھارہ میل رہ گیا، میں ڈبے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ایک سفر گوری کے ساتھ کیا تھا، اپنی زندگی کا ہولناک سفر۔ گاڑی میں اس کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ بار بار ہر اسٹیشن پر اتر کے میرا اسے دیکھنا، اس کا گونگی بنی رہنا، فہمیدہ کے سیاہ برقعے میں اس کے خوبصورت اجلے چہرے کا جھانکنا، وہ لرزنا، وہ سہمنا۔ یہاں بھی ہر اسٹیشن پر اتر کے میں اسے دیکھتا تھا کہ شاید وہ کہیں نظر آ جائے، شاید کوئی اتفاق رونما ہو جائے مگر اب میں اسے پہچانوں گا کیسے؟ وہ تو بڑی ہو گئی ہوگی۔ اور بڑی ہو کے کیسی ہو گئی ہوگی۔ اف! اس پر تو نظر بھی نہ ٹھہرتی ہوگی۔ میں اسے ہر شکل میں، ہر روپ میں پہچان لوں گا اور وہ بھی مجھے اس حلیے میں دور سے پہچان لے گی۔ میں ہر اسٹیشن پر عورتوں کو گھورتا، داڑھی اور شیروانی والے لوگوں کو غور سے دیکھتا مگر ان میں کوئی مولوی صاحب جیسا شخص نہیں تھا، کوئی گوری جیسی شخصیت نہیں تھی۔ وہ تو سب کالے ناٹے، اجلے ہوتے ہوئے بے ہنگم لوگ تھے۔ مولوی صاحب جیسا فرشتوں کا اور گوری جیسا حوروں اور پریوں کا معصوم چہرہ کسی کا نہیں تھا۔

تاخیر سے سہی مگر آخر گاڑی مراد آباد اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے والا سب سے پہلا مسافر میں تھا۔ میرے حواس بکھرے ہوتے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح باہر آیا، سامنے تانگے کھڑے تھے۔ میں تانگے والے کو فیض گنج کا پتہ بتا کر جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ سکتا تھا لیکن اسٹیشن کے عین مقابل ایک وسیع اور پرشکوہ عمارت پر میری نظر گئی۔ اس عمارت پر یہ بورڈ لگا ہوا تھا "اسلامیہ مسافر خانہ مراد آباد۔" عمارت کی اوپری منزل ابھی تعمیر ہو رہی تھی۔ مسافر خانے کے ساتھ اسلامیہ کا لاحقہ دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ یہاں کے منتظمین سے مولوی محمد شفیق کے بارے میں پوچھوں تاکہ ان کا مکان ڈھونڈنے کی الجھن سے بچ سکوں۔ مولوی صاحب عموماً سفر کرتے رہتے تھے۔ میں نے سوچا، ممکن ہے مسافر خانے کے منتظمین انھیں جانتے ہوں۔ یہ سوچ کے میں عمارت میں داخل ہو گیا۔ میرے پاس چونکہ کوئی سامان نہیں تھا اس لیے کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔

مسافر خانے کی دیواروں پر جگہ جگہ مسافروں کے لیے ہدایتوں کے بورڈ آویزاں تھے۔ مجھے خیال آیا کہ سارٹے صحیح کہتا تھا۔ مجھے کم سے کم بڑھے ہوئے بال ضرور ترشوا لینا چاہیے تھے لیکن اتنا ہوش تھا کسے؟ میں نے اسی حلیے میں منتظم کے دفتر پہنچ کے اپنا مدعا ظاہر کیا۔

"فیض گنج؟" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں فیض گنج کے کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں لیکن یہ زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ پتہ آسانی سے دستیاب ہو جائے گا۔ یہ فرمائیے کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"

میں نے جھنجلا کے جواب دیا "کلکتے سے۔"

"آپ کا سامان کہاں ہے؟ جب تک آپ انھیں تلاش کر رہے ہیں، اس وقت تک اپنا سامان یہاں محفوظ کروا سکتے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو کمرے کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔ یہ مسافر خانہ خدمت خلق کے لیے تعمیر کیا گیا ہے اسی لیے واجبی سا کرایہ رکھا گیا ہے جو ہر شخص آسانی سے ادا کر سکتا ہے۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر مسافر خانہ کہیں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے پہلے آپ نہا دھو کے لباس تبدیل کر لیجیے۔ عمارت کے باہر دکانوں میں حجام موجود ہیں، کھانے پینے کا بھی معقول انتظام ہے۔ پھر اطمینان سے مولوی صاحب کی تلاش میں نکلیے گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے، ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔"

میں اس باتونی منتظم کا شکریہ ادا کر کے اور مسافر خانے کے انتظام کی تعریف کر کے باہر نکل آیا، وہ تو حد سے زیادہ خوش اخلاق شخص

تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آیا لیکن میں تیز رفتاری سے ایک تانگے میں بیٹھ گیا تھا۔ "کہاں صاحب؟" تانگے والے نے کبیدہ ہو کے پوچھا۔

"فیض گنج" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کیا اور سواریاں بٹھالوں؟"

"نہیں۔ میں پورے تانگے کا کرایہ ادا کردوں گا، جلد سے جلد چلو" میری عجلت پر اس نے مجھے گھور کے دیکھا اور گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا۔ تانگا آگے چلا اور مرادآباد کی سڑکوں پر سرپٹ بھاگنے لگا۔ مرادآباد گیا ہی کی طرح کا اوسط درجے کا شہر معلوم ہوتا تھا لیکن یہاں گیا سے زیادہ بھی۔ تانگے والے نے حسبِ عادت مجھ سے مختلف سوالات کرنے چاہے میں اُسے ٹالتا رہا۔ تانگا ایک لمبی سڑک سے گزر کے پُررونق بازار میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک گنجان علاقہ تھا۔

"فیض گنج میں کہاں اُتریے گا؟" تانگے والے نے پوچھا۔

"جہاں فیض گنج آئے، اتار دینا۔"

تانگے والے نے منہ بنا کے گھوڑے کو ایک گالی دی۔ یہ گالی گھوڑے نے تو شاید نہیں سنی ہوگی، یا گھوڑا گالیوں میں تمیز کرتا ہوگا کہ کون سی اُسے دی گئی ہے اور کون سی مسافر کو۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ڈھائی تین میل کے سفر کے بعد تانگا ایک جگہ رُک گیا "لیجیے سرکار! جناب کا فیض گنج آگیا۔ دیکھیے سامنے چوکی ہے فیض گنج پولیس چوکی" تانگے والے نے میرا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھا تو اُسے اپنے رویّے پر شرمندگی ہوئی۔ "مرادآباد میں بلاتے ہیں سرکار؟" اس نے پُرتکلف انداز میں کہا۔ "میرا نام خیرالدین ہے، لوگ مجھے خیرا کہتے ہیں۔ یہیں فیض گنج کے قریب کمبل کے تعزیے پر تانگا کھڑا کرتا ہوں یا پھر اسٹیشن پر۔ مجھے بتا دیجیے گا صاحب کہ آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟ ابھی کچھ دن تو قیام رہے گا؟ جب ضرورت ہو بلا لیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے" میں لکڑی کی ٹال کے برابر ایک گلی میں گھس گیا۔

یہ فیض گنج ہے۔ کاش یہاں کہیں قریب ہی کوئی موجود ہو۔ اس کے تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ممکن ہے مولوی صاحب نے کلکتے کے مدرسے سے آنے والے خطوں کا جواب دانستہ نہ دیا ہو اور اپنے کسی عزیز سے جواب لکھوا دیا ہو کہ وہ تو جب سے کلکتے گئے ہیں، واپس ہی نہیں آئے کیونکہ خیال سے مولوی صاحب نے ہر ممکن احتیاط برتی ہوگی۔ کاش مجھے اُن کے گھر کا پتہ معلوم ہوتا اور میں اُن دونوں کو چونکا دیتا۔ یہ چند ہی لمحوں کی خوش خیالیاں تھیں، ہوا کی طرح گزر گئیں۔ گلی میں چند لوگ نظر آتے۔ میں نے اُن میں سے معقول شکل و صورت کے ایک شخص کو روک کے مولوی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ وہ میری کوئی امانت کرنے کے بجائے حیرت میں پڑ گیا۔ "مولوی محمد شفیق؟" اُس نے ماتھے پر اُنگلی مارتے ہوئے آنکھیں موند کے کہا۔ "ہاں ہاں۔ وہ۔ اب آپ کہیں اُن مولانا کی تو بات نہیں کر رہے ہیں جو عرصے سے نظر نہیں آئے؟ ہم نے سنا تو تھا کہ وہ کسی اور شہر میں جا کے بس گئے ہیں، واللہ اعلم۔ بہرحال وہ اب اس محلے میں نہیں رہتے۔ شہر میں ہوتے تو کبھی نظر تو آتے۔ خدا مجھے جھٹلوائے، میں نے انھیں برسوں سے نہیں دیکھا۔"

مرادآباد کا ہر شخص باتونی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس کی زبان روکی۔ "تو اب وہ یہاں نہیں رہتے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں صاحب وہ یہاں نہیں رہتے بالکل نہیں رہتے۔ اتنی بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، اب رہا یہ سوال کہ وہ کہاں رہتے ہیں تو میں نہیں جانتا۔" اُس نے فیصلہ کُن انداز میں جواب دیا۔

"اُن کا کوئی عزیز وغیرہ؟" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "وہ اس شہر میں پیدا ہوئے تھے، کوئی رشتے دار ہے، کوئی تو ہوگا جسے اُن کے بارے میں کچھ علم ہو۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُن کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور اُن کے والدین بھی نہیں ہیں، یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ یہاں پیدا ہوئے تھے اور اگر وہ یہیں پیدا ہوئے تھے تو اُن کے والدین کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں اور سے آئے ہوں، اس صورت میں عزیزوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دور کیوں جائیں مجھی کو دیکھ لیجیے میں یہاں پیدا ہوا۔ یہیں پلا بڑھا لیکن میرے والد بارہ بنکی سے آئے تھے۔"

"جناب جناب! کوئی بزرگ کوئی تو ایسا ہوگا جو اُن کے بارے میں آپ سے زیادہ جانتا ہو۔ از راہِ کرم مجھے ایسے کسی شخص سے ملا دیجیے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"کیوں نہیں ہوگا، آئیے کوشش کرکے دیکھتے ہیں مگر آپ نے اپنے اسمِ گرامی اور دیگر حالات سے آگاہ نہیں کیا۔ خادم کو بشیر حسین کہتے ہیں۔ یہیں چونگی میں ملازم ہوں۔" اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے سرسری طور پر اپنا تعارف کرایا۔ ایک گھر، دوسرا گھر، تیسرا گھر۔ وہ شریف آدمی اپنا کام چھوڑ کے مجھے کئی گھروں میں لے گیا۔ کسی نے کچھ بتایا کسی نے کچھ، آخر ایک صاحب مولوی صاحب کے کچھ قریبی عزیز نکل آئے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کے بہت سے عزیز شہر کے مختلف محلوں میں رہتے ہیں لیکن مولوی صاحب نے شروع ہی سے اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ رکھا تھا، وہ لوگوں سے بہت کم ملتے تھے اور عموماً مطالعے میں مصروف رہتے تھے یا سفر کرتے رہتے تھے۔ یاد آ رہا ہے کہ ایک رات اُنھوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ اُن کا کوئی نہیں ہے، ننہال نہ باپ، صرف ایک بہن ہے اور اُس سے بھی ملے عرصہ ہوگیا ہے۔ میں رات ہوتے تک مختلف محلوں میں اُن کے عزیزوں کے گھروں کے چکر لگاتا رہا مگر ہر جگہ سے مایوسی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولوی صاحب کی کسی کو فکر ہی نہیں ہے۔ جس شخص سے بھی پوچھا، اُس نے یہی کہا۔ "ہوں گے کسی پُرفضا مقام پر درس دے رہے ہوں گے یا سیاحت کر رہے ہوں گے۔" تعجب ہے کہ اُن کے دو چار قریبی عزیزوں نے بھی اُن سے زیادہ دل چسپی کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ مولوی صاحب بڑی جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی گفتگو میں شائستگی تھی اور لوچ تھا۔ وہ بہت جلد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے، لباس بہت عمدہ پہنتے تھے، بڑی نفاست سے رہتے تھے، احتیاط پسند ضرور تھے مگر ملاقاتی کے دل میں دوبارہ ملنے کی خواہش یقیناً پیدا کر دیتے تھے۔ ایسی باغ و بہار شخصیت سے اُن کے عزیزوں کی بے تعلقی اور لاعلمی عجیب بات تھی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ خود میں بھی اپنے عزیزوں، محلے کے لوگوں اور گھر والوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ جیل میں ہم سب قیدی ایک ہی بیرک میں رہتے تھے مگر میں حقیقت میں کبھی اُن کے ساتھ نہیں رہا۔ میں تو ہمیشہ کورا کے ساتھ رہا۔

کتنے ہی گھر دیکھ ڈالے، اُن کے کتنے ہی عزیزوں سے پوچھا۔ مولوی صاحب کے ذکر پر کچھ لوگ تو مجھ سے اُن کی شکایت کرنے لگے کہ وہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ اُن کے ماں باپ کے انتقال پر لوگوں نے اُن کی خبرگیری کرنی چاہی تھی مگر وہ کسی دینی درس گاہ میں چلے گئے تھے۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کے آئے تو عزیزوں نے اُن سے شادی کرنے اور گھر بسانے کی خواہش ظاہر کی، اُنھوں نے انکار کر دیا۔ جب وہ خود ہی اپنے رشتے داروں کی فکر سے آزاد تھے تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ اُن کی فکر کرتا۔ فکریں تو اُن لوگوں کی کی جاتی ہیں جو خود کسی کی فکر کرتے ہیں۔ محبت تو ایثار کا باہمی معاہدہ ہے مگر کچھ لوگ اس سے بلند ہوتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ دوسرا کس رویّے کا اظہار کر رہا ہے۔ وہ سودے بازی نہیں کرتے۔

گویا مولوی صاحب کلکتے کے مدرسے میں اپنا سامان واپس لینے نہیں گئے تو مرادآباد بھی نہیں آئے۔ میں اس کے باوجود مرادآباد میں اُن کا نام جاننے والوں کے دروازوں پر دستک دیتا رہا۔ بہت سے نیک لوگوں نے مجھے اپنے گھر میں مہمان بنانے کے لیے اصرار کیا، میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔ رات خاصی گزر گئی تھی۔ اگر کچھ اور وقت ملتا تو میں مزید لوگوں سے رابطہ قائم کرتا۔ تھک ہار کے میں مسافر خانے چلا آیا اور ایک کمرے میں بند ہوگیا۔ ریل کی دو راتیں بھی جاگ کر گزری تھیں مگر نیند آج بھی آنکھوں سے غائب تھی۔ دل اُمڈا آتا تھا کہ بُری طرح دُکھ رہی تھی۔ بعض گھروں میں جو شربت چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی تھی، وہی پیٹ میں پڑ گیا تھا۔ جیل سے باہر کی دنیا بہت وسیع تھی۔ صبح اُٹھ کے میں پھر محلے محلے گھومتا رہا۔ بعض لوگوں سے دوبارہ ملاقات ہوئی، اُتنا ضرور پتہ چلا کہ مولوی صاحب کی والدہ بہن شاید حیدرآباد دکن میں رہتی ہے۔ کسی کو اُس کا پتہ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں مرادآباد کی ایک مسجد میں بھی گیا جہاں ایک بڑی درس گاہ میں مولوی صاحب دینی تعلیم دیتے تھے۔ یہاں بھی مولوی صاحب کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔ کلکتے کے مدرسوں کی طرح وہ سب بھی مولوی محمد شفیق کی روپوشی پر حیرت زدہ تھے۔ میں پوچھتا پاچھتا مرادآبادی برتنوں کی اُن دکانوں پر بھی گیا جن کے برتنوں کے نمونے دکھا دکھا کے مولوی صاحب مختلف شہروں سے آرڈر لیا کرتے تھے اور انھیں مرادآباد بھیج دیا کرتے تھے۔ یہ مولوی صاحب کا جز وقتی کام تھا۔

جہاں بھی مولوی صاحب کی خیر خبر کا ذرا امکان ہوا، میں وہاں ایک پیشہ ور سُراغ رساں کی طرح گیا۔ دو دن میں مرادآباد کے بہت سے لوگ مجھ سے واقف ہو چکے تھے۔ مرادآباد کے آخری سرے کے محلے کٹ گھر سے لال کوٹھی تک، دیوان کا بازار، محلہ پیر غیب، کسرول، مفتی ٹولا، حبشی محلہ، محلہ تمباکو والان، گل شہید، مغل پورہ، محلہ قانون گویاں، مسلمانوں کے جتنے بھی محلے تھے، میں مسلسل تین دن تک اُن کی خاک چھانتا رہا۔ ان تین دنوں میں میری حالت اور خراب ہوگئی، کپڑے سیاہ ہوگئے، پاؤں میں گٹے پڑ گئے۔ مجھے پاگل سمجھا جانے لگا۔ مجھ جیسے شہر میں چلتا ہوا آدمی بار بار نظروں میں آتا ہے۔ تین دن میں مرادآباد کے لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے اشتیاق اور تپاک کے بجائے تجسس، طنز اور مزاح پیدا ہوگیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ اس شہر میں کوئی شخص مولوی صاحب کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور جب یہ امکان ختم ہوگیا تو میری آنکھوں کی روشنی ماند پڑنے لگی اور میرا حلق خشک ہونے لگا، سانس رُکنے لگی، کھانسی ہونے لگی۔ حتیٰ کہ بخار آگیا۔ میں اسی حالت میں ایک رات پھر فیض گنج گیا اور گلیوں میں گرتا پڑتا مارا مارا پھرتا رہا۔ مسافر خانے واپس جاتے ہوئے منڈی چوک کی ایک دُکان کے تختے پر نڈھال ہو کے بیٹھ گیا۔

مجھ سے آگے نہیں چلا گیا۔ یہاں بھی کلکتے کے اسٹیشن والا واقعہ دُہرایا گیا، میرے ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ وہ تین لفنگے تھے۔ پہلے تو اُنھوں نے مجھے فقیر سمجھ کر چھیڑا، پتھر مارا۔ میں نے اُن کی جانب سے بے نیازی برتی تو وہ شرارت پر اُتر آئے۔ وہ شاید آخری شو دیکھ کے واپس آ رہے تھے، ترنگ میں تھے۔ "کچھ جیب ویب میں ہے میاں جی؟" ایک نے یہ پوچھتے ہوئے میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے اُسے ڈانٹ کر بھگانا چاہا تو وہ سب ہنسنے لگے۔ اُن میں سے دو نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ میری تلاشی لے۔ میں بُری طرح اُن کی گرفت میں تھا۔ میں اپنے آپ کو خود اُن کے حوالے کر دیتا لیکن میری گردن میں مالا پڑی ہوئی

تھی اور جو روپے میری جیب میں تھے، وہ میرا آخری سہارا تھے۔ میں نے اُن سے منت کی کہ وہ مجھے چھوڑ دیں، ایک بے گھر غریب آدمی کو پریشان نہ کریں۔ اُس نے روپے جیب سے نکال لیے۔ اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "ابے یہ دیکھ۔ یہ دیکھ۔ اس کی جیب میں تو بڑا مال ہے۔" اُس نے اپنے ساتھیوں سے چیخ کر کہا۔

"اور دیکھ اور دیکھ۔ ان فقیروں کے پاس مال نہیں ہوگا تو کیا ہم کنگالوں کے پاس ہوگا۔ چل جلدی سے اپنا کام کر۔ وہ حوالدار اِدھر ہی ٹہلتا رہتا ہے کسی بھی سمے آسکتا ہے۔" اُس کے ساتھی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"میرے روپے واپس کرو۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔

"ضرور ضرور، ہم تجھے سویرے ناشتے کے اور کل شام کی پکچر کے پیسے ضرور دیں گے، بتا اور مال کدھر ہے؟"

"روپے واپس کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"ابے۔" جس شخص نے میری جیب سے روپے برآمد کیے تھے، وہ میرا انیفا اور جسم ٹٹولتے ٹٹولتے جب گردن تک پہنچا اور مالا سے اُس کے ہاتھ ٹکرائے تو حیرانی سے بولا۔ "ابے یہ تو ایک مالا بھی پہنے ہوئے ہے۔"

"کھینچ لے گردن سے۔" اُس کے ساتھی نے گرج کے حکم دیا۔

"ہاتھ مت لگانا۔" میری آواز غصّے سے کانپنے لگی۔ اُس کا ہاتھ میرے گریبان کے اندر پہنچ چکا تھا۔ میں نے یک بارگی اُچھل کے اپنی دونوں ٹانگیں اُس خبیث کی ٹانگوں پر مار دیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سامنے کی دُکان کے بند دروازے سے ٹکرایا اور چیخنے لگا۔ یہ اُس کے ساتھیوں کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ دونوں میرا بازو چھوڑ کے بجلی کی طرح سامنے آگئے اور ایک نے کمر سے چاقو نکال کے اور پینترا بدل کے تیزی سے کہا۔ "مالا نکال۔"

میں ایک لمحے تک سُن کھڑا رہا۔ اُس نے چاقو لہرا کر مجھے گردن سے مالا نکالنے کا دوبارہ حکم دیا۔

"کیا مالا تیرے باپ کی ہے۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"یہ تو تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا۔" میں یہی چاہتا تھا کہ وہ چاقو کا کوئی غلط ہاتھ دکھاتے۔ وہ مجھ سے اور نزدیک ہو گیا۔ میں یوں ہی کھڑا اُن دونوں کو گھورتا رہا۔ "یہ چاقو ابھی تیرے پیٹ میں اُتر جائے گا۔ جان پیاری ہے تو مالا حوالے کر دے۔"

میں نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے گردن کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے۔ ایک ثانیے بعد میرا پھرتیلا ہاتھ چاقو والے شخص کے پنجے پر تھا۔ دوسرے نے مجھے لاتیں ماریں اور مجھ پر گھونسے برسائے۔ لیکن میں نے اُس کے ساتھی کا پنجہ نہیں چھوڑا اور اُس کا بازو مروڑ کے چاقو اُس سے چھین لیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں آتے ہی اُن کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ گھگھیانے لگے۔ اگر مجھے سات سال کا تلخ تجربہ نہ ہوتا تو میں اُن کے پیٹ میں چاقو اتار دیتا۔ "روپے واپس کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"ابھی میاں جی ابھی۔ جانے دیجیے، روپے لے لیں۔" اُس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ "جبرو! اِدھر آ۔ ایک پائی کی بھی کمی ہوئی۔ میاں جی مجھے کوئی آدمی دکھتے ہیں۔" میں نے اُس کے تبصرے پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ دوسرا ساتھی بھاگا ہوا اپنے کراہتے ہوئے ساتھی کے پاس گیا جو اوندھا پڑا تھا۔ وہ روپے اُس کی جیب سے نکال کے تیزی سے واپس آیا۔ "گن لیجیے میاں جی!" اُس نے روپے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ میں نے گنے بغیر انھیں جیب میں رکھ لیا۔ "پہلے تو نہیں دیکھا، نئے نئے شہر میں آئے ہو استاد؟"

سپاہی کی چاپ سے تینوں پریشان ہو گئے۔ میرا جواب سنے بغیر اُنھوں نے زمین پر دُہرے پڑے ہوئے ساتھی کو اُٹھایا۔ پندرہ بیس قدم بعد ایک گلی میں بھاگنے ہی والے تھے کہ میری ہری آواز نے انھیں روک لیا۔ "ٹھیرو۔ اپنا چاقو لیتے جاؤ۔"

اُنھوں نے چاقو واپس لینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے دم ہی نہیں رہا کہ میرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو ہے، سپاہی میرے پاس آ چکا تھا۔ میرا حلیہ اور چاقو دیکھ کے اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ "کون؟" اُس نے سپاہیانہ آواز میں پوچھا۔

"ایک مسافر ہوں۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"یہاں کون تھا ابھی؟ یہ شور کیسا ہو رہا تھا؟"

"تین لڑکے تھے، چاقو چلانا آتا نہیں اور چاقو لیے پھرتے ہیں، مجھے یہ دکھا کے روپے لُوٹنا چاہتے تھے۔ میں نے چاقو چھینا تو بھاگ گئے۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"چاقو دیکھ کے بھاگ گئے یا میرے قدموں کی آواز سُن کے۔"

"جو سمجھ لیجیے، قسمت نے آپ کو بھی وقت پر بھیج دیا۔"

"میں تمھارے بیان پر کیوں یقین کروں؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "اُن کا چاقو میرے ہاتھ میں ہے، شاید آپ نے اُنھیں بھاگتے ہوئے بھی دیکھا ہو؟"

"یہ چاقو تمھارا بھی تو ہو سکتا ہے۔" وہ بگڑ کے بولا۔ "کون ہو تم؟ کیا نام ہے؟" میں نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں یہاں آدمی کی تلاش میں تھا۔ "انھیں دیکھتے دیکھتے تین دن ہو گئے۔"

"اُس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔" "مجھے تم کوئی خطرناک معلوم ہوتے ہو۔ اِس شہر میں تمھیں کون جانتا ہے؟"

"کوئی نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہر شہر میں آدمی کا جاننے والا ہو۔" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ چاقو آپ لے لیجیے۔"

اُس نے ایک کر چاقو میرے ہاتھ سے لیا جیسے میں نے اُسے دیا نہیں ہے بلکہ اُس نے مجھ سے چھینا ہے۔ "معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے، شاید تم لوگوں کا ڈاکا ڈالنے کا پروگرام تھا۔ تم نے اپنے ساتھیوں کو بھگا دیا۔"

"حوالدار صاحب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" میں نے تلملا کر کہا۔ "یہ دیکھیے میرا ہاتھ۔ بخار میں جل رہا ہے، یہ دیکھیے۔" میں نے اپنی کلائی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمھیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔" وہ برہمی سے بولا۔

"کیوں؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟"

"جرم؟" وہ چاقو لہراتے ہوئے بولا۔ "یہ جرم نہیں ہے؟ رات کے اس وقت یہاں بیٹھنا، شور شرابا کرنا جرم نہیں ہے؟ باقی جرم تھانے دار صاحب ثابت کریں گے اور وہ صبح سے پہلے تمھیں نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک اُنھیں اس علاقے میں آج کی رات صحیح و سلامت گزرنے کا یقین نہیں ہو جائے گا۔ چلو۔"

میں نے اُس کی منت سماجت کی، شہر میں کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس سے میں اپنے تعلق کا حوالہ دے دیتا، اُس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ آدمی دُنیا میں تنہا نہیں رہ سکتا، اُس کی کوئی بنیاد ضرور ہونی چاہیے۔ کسی محلّے، کسی گھر اور کسی گروہ سے اُس کی وابستگی ضروری ہے کیونکہ یہاں پولیس والے بھی رہتے ہیں۔ اُنھیں سب سے زیادہ ضرورت شناخت کی پڑتی ہے۔ اگر میں اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا تو وہ اپنے گلے میں لٹکی ہوئی سیٹی بجا دیتا۔ اِس سیٹی سے مجھے بہت خوف آتا تھا، جب بھی سنتری جیل میں سیٹیاں بجاتے تھے، میں اپنے کان بند کر لیتا تھا۔ سیٹی کی آواز سے میرا رواں رواں لرزنے لگتا تھا۔ حوالدار میری منت سماجت سے فیدر پر آ گیا۔ میں نے بہت کہا مگر وہ نہیں مانا، میں نے اُسے دس روپے نکال کے دیے۔ وہ کچھ دیر جھجکا، ہنسا، متذبذب ہوا لیکن اپنی بات پر اڑا رہا۔ ہاتھ میں چاقو، گلے میں قیمتی مالا، جیب میں روپے، اندھیری رات، اجنبی شہر، ملنگوں کا حلیہ، ان تمام خصوصیات میں کی ایک باتی سے کسی کو بھی مجرم ثابت کیا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ تو ایک خصوصیت بھی تھی۔ اگر کوئی یہ پہچان لیتا کہ کلکتے میں تین قتل کر کے سات سال کی سزا کاٹنے والا شخص اُس کے سامنے موجود ہے تو میں جلتے توے پر نسیاں رکھ دیتا پھر بھی اُسے میری بے گناہی کا یقین نہ آتا۔ میں کچھ دور تک خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا پھر ایک نیم تاریک گلی کے قریب رک کے میں نے اُس سے ایک بار پھر درخواست کی۔ تھانا بہت قریب ہے، زیادہ دور نہیں جانا ہے۔ اُس نے طنزاً کہا۔

"سنو حوالدار جی!" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے، آپ مجھے وہاں لے جا کے وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"سب مجرم ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔"

"آپ مجھے مجرم کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"چلو، مُلزم کہہ لو۔" وہ مضحکہ خیز انداز میں بولا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے برہم ہو کے کہا۔

"کیا؟" اُس نے میرے تیور دیکھ کے سیٹی پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے اُس کا ہاتھ وہیں روک لیا اور سیٹی کی ڈوری کو جھٹکا دیا۔ سیٹی دُور جا گری۔ "کیا کیا؟" وہ بوکھلاہٹ میں بولا۔ "یہ ایک اور جرم ہے۔ بھگوان کی سوگند! اتنی مار لگواؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔"

"چپ رہو۔" میں اُسے گریبان سے کھینچتا ہوا گلی میں لے آیا۔ "چپکے سے یہاں بیٹھ جاؤ اور آواز مت نکالو۔ شور کیا تو سمجھ لینا ہاں۔" میری آواز میں ایسی گرج تھی کہ اُس کی زبان کو قفل لگ گیا۔ "میں تمھیں یہیں ختم کر کے فرار ہو سکتا ہوں لیکن تمھارے بیوی بچوں کا خیال آ گیا۔ جاؤ اپنا راستہ سنبھالو۔"

وہ ٹھٹک سا گیا۔ اُس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اُسے میرے ہاتھ پاؤں کے زور کا اندازہ نہیں تھا، جب اپنے شانوں پر اُس نے وزن محسوس کیا تو غصّے یا خوف سے اُس کا انگ انگ تھرکنے لگا۔ اُس نے اپنی ٹوپی سنبھالی اور بھاگتا ہوا گلی کے پار ہو گیا۔ میں اندر گلی میں رینگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اُنھی سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہی ہیبت ناک آوازیں جو برمے کی طرح دل میں گھس جاتی تھیں۔ میں بھوک اور بخار کی ناتوانی میں اِس گلی سے اُس گلی میں بھاگتا رہا۔ سپاہی نے مجھے معاف نہیں کیا۔ ایک سیٹی بجی تو ہر طرف سیٹیاں گونجنے لگیں۔ نتیجتاً مجھے خود کو ایک نیم پختہ مکان کی شکستہ و ویران اوٹ میں چھپ کے بیٹھ جانا پڑا۔ وہاں مُرغیوں کا ڈربا تھا۔ میری آہٹ پر مُرغیوں میں افراتفری پھیل گئی وہ پھڑپھڑانے اور شور کرنے لگیں لیکن میں چپ چاپ پڑا رہا۔ یہ کسی کمرے کا ٹوٹا ہوا حصہ تھا جو کبھی مکان کے اندر شامل ہوگا، آدھی چھت سلامت تھی۔ آدھی کی گری ہوئی اینٹیں اِدھر اُدھر کئی ڈھیروں میں پڑی ہوئی تھیں جو حصہ زمانے کی دستِ بُرد سے محفوظ رہ گیا تھا، اب اُسی میں مکان تھا۔ مکان کے ایک مرکھلے میں روشنی ہوئی اور کسی عورت کی لرزیدہ آواز اُبھری۔ "کون ہے؟" میں دم سادھے پڑا رہا، مُرغیاں کُڑکُڑاتی رہیں۔ عورت نے ایک ہاتھ سے لالٹین باہر نکالی۔ "کون ہے؟" وہ پھر چلائی۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا، دوسرے ہی لمحے ایک اینٹ میری پیٹھ پر آ کے لگی۔ میری کراہ نکل گئی۔ اگر میں اسی طرح پڑا رہتا تو وہ اور اینٹیں پھینکتی۔ میں وہاں سے کھسک کے دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ باہر سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ میں کسی دوسری جگہ بھی پناہ نہیں لے سکتا تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ عورت

کے گھر والے جاگ کر شور نہ مچا دیں۔ میں نے آہستگی سے جواب دیا: "ایک پناہ گیر ہے۔"

"پناہ گیر؟" عورت کی خوف زدہ آواز ابھری۔

"ہاں اماں پناہ گیر۔ چور نہیں ہوں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولی: "یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو؟"

"کچھ دیر میں چلا جاؤں گا۔ یقین کیجیے۔ آپ کی کسی چیز پر ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔ اطمینان سے سوئیے۔"

"مگر، مگر تم ہو کون؟" عورت کا خوف بڑھ گیا تھا۔

"میں ایک مسافر ہوں اماں! وہ شاید قریب آ رہے ہیں لِلّٰہ کچھ دیر کے لیے لالٹین اندر کر لیجیے اور خاموش ہو جائیے۔"

اس نے میری بات مان لی، موکھلے سے لالٹین اور اپنا سر ہٹا لیا، مرغیاں بھی شاید اپنی مالکن کی آواز پہچان کے خاموش ہو گئی تھیں۔ دیوار کے قریب تیز سیٹیوں اور تیز قدموں کی آوازیں آئیں۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ عورت نے لالٹین پھر موکھلے سے نکال لی تھی۔ "آپ کا شکریہ۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔" یہ کہہ کے میں شکستہ دیوار سے باہر نکلا۔

"سنیے۔" اس نے مجھے جاتے دیکھ کے روکا۔ میں پیچھے مڑ کے دیکھنے لگا، لالٹین پھر موکھلے کے اندر ہو گئی اور آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی، چادر میں لپٹی ہوئی ایک ادھیڑ عمر عورت برآمد ہوئی۔ اس کا چہرہ سفید تھا۔ "اگر آپ کے پاس رات بسر کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے تو آپ یہاں ٹھیر سکتے ہیں مگر صبح ہونے سے پہلے چلے جائیے گا۔"

"شکریہ۔" میں نے مہذب لہجے میں کہا: "میں مسافر خانے میں ٹھیرا ہوا ہوں اور پہلی گاڑی سے واپس جانے والا تھا۔ گاڑی صبح چھ بجے جاتی ہے۔ راستے میں یہ لوگ پیچھے پڑ گئے۔"

"اندر آ جائیے۔ میری نظریں زمانے کے سرد و گرم سے خوب واقف ہو چکی ہیں، اندر آ جائیے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے تکلف کیا: "آپ کے گھر والے....."

"انھیں میں سمجھا لوں گی۔ آئیے۔" اس نے مخلصانہ لہجے میں اصرار کیا۔ میں انکار کرتے کرتے رہ گیا اور اس کے پیچھے جھجکتا جھجکتا مکان کے اندر داخل ہوا۔ کسی زمانے میں یہ ایک چھوٹی سی خوب صورت حویلی ہو گی۔ اب کھنڈر میں بدل گئی تھی۔ رات کو مزید ویران اور پُراسرار ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے برآمدے کی چوکی پر بٹھا دیا اور خود اندر جا کے شاید بستر کا انتظام کرنے لگی۔ پھر وہ مجھے ایک شکستہ کمرے میں لے گئی جہاں ایک چارپائی پر صاف ستھرا بستر بچھا دیا گیا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا، ایک اجنبی کے لیے یہ ایثار بڑی حیرت کی بات تھی۔ "آپ یہاں آرام کیجیے۔ میں فجر کی نماز سے پہلے آپ کو اٹھا

دوں گی۔"

"آپ نے بہت زحمت کی اماں! آپ تو فرشتہ ہیں ا... میرا یہ حلیہ دیکھنے کے باوجود احسان کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا... تک میرا خیال ہے آپ یہاں تنہا رہتی ہیں؟"

"ہاں آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ میرے شوہر مر چکے ہیں... دو بچیاں ہیں۔ ایک کو اس کے ماموں علی گڑھ لے گئے ہیں۔ دوسری... یہاں اردگرد سب میرے شوہر کے عزیزوں کے مکانات ہیں... کے ملنے ہی نے مجھے متاثر کیا۔ وہ پڑھی لکھی عورت معلوم ہو... ہو جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ آپ ایک اچھے آدمی ہیں اس لیے یہ جرأت کی اور پھر یہاں کیا رکھا ہے ـــــ ڈرتے تو مال و... والے ہیں ہم غریبوں کے پاس خلوص کی دولت کے سوا کیا ہے... کھائیے گا یا پیجیے گا؟"

"نہیں مجھے بھوک نہیں ہے ایک گلاس پانی پلا دیجیے مجھے بخار ہے مسافر خانے جاتے جاتے میں ایک دکان کے تختے کے لیے رک گیا تھا کہ....." میں نے مختصراً اپنی روداد سنائی۔

"توبہ ہے۔" وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کے بولی: "آج تو آپ... مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ایک شریف اور بہادر شخص میرے گھر مہمان... آپ کو بخار ہے؟ لائیے مجھے اپنا ہاتھ دکھائیے۔" اس نے اپنا ہا... کے میری کلائی پکڑ لی۔ "ارے واقعی۔ آپ کو تو بہت تیز بخار... اللہ تیرا شکر ہے۔ مجھ سے گناہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یقیناً گھر آپ کو اللہ نے بھیجا ہے۔ بھلا اتنے بہت سے گھروں میں آپ... کیوں آتے مگر میں آپ کو پانی نہیں پلاؤں گی۔ بغیر دودھ کی... پیجیے۔ آپ بالکل لیٹ جائیے۔ کمر سیدھی کر لیجیے، دیکھیے کوئی تکلف... کیجیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

بستر پر لیٹتے ہی جسم جیسے کسی نے بھٹی میں جھونک د... دن کی مسلسل تھکن اور بھوک سے حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ تھی... بستر کے اور اس نیک عورت کے گداز نے تمام طاقت چھین لی... تپ کے بخار آیا کہ ہوش و حواس جاتے رہے۔ نہ جانے وہ عورت... واپس آئی اور میں بخار میں کیا کیا بکتا رہا۔ جب مجھے کچھ ہو... میں نے دیکھا، میرا سارا کرتا پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔ میں کت... میں دبا ہوا تھا اور عورت میرے سرہانے بیٹھی ہوئی میرے... بھیگا کپڑا رکھ رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی تیز تھی اور قریب... کی بچی ایک تسلے میں کپڑا بھگو بھگو کے اسے دے رہی تھی۔... بے چینی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ عورت نے میرے سینے... رکھ کے مجھے لیٹے رہنے دیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ کو پسینہ... ورنہ آپ کی حالت تو بگڑ گئی تھی۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے ناتواں آواز میں پوچھا۔

"فجر قریب ہے۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو آنکھوں کے آگے ...یرا چھا گیا، سارا کمرہ گھومنے لگا۔

"آپ اس حالت میں کہیں نہیں جا سکتے۔"

"تو میں یہاں بھی تو نہیں رہ سکتا۔"

"مگر آپ جائیں گے کیسے؟" وہ فکرمندانہ لہجے میں بولی۔

"کسی نہ کسی طرح مسافر خانے تک پہنچ ہی جاؤں گا۔"

"آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ دیکھیے اگر آپ کو اچھی دوا اور پرہیزی غذا نہیں ملے گی تو ـــــ ...یعت اور خراب ہو جائے گی۔ میرے لیے ایک اجنبی مرد کو یہاں ...نا مشکل ہے۔ طرح طرح کی باتیں ہوں گی لیکن میں آپ کو اس حالت ... باہر بھی نہیں جانے دے سکتی، اب ایک ہی شکل ہے کہ میں آپ کو ...س مکان کی اس بوسیدہ کوٹھری میں ٹھیرا دوں جہاں کسی کی نظر ...ں جاتی۔ وہاں میرے مرحوم شوہر کا سامان بند ہے۔ مجبوری کی ...ت ہے وہ کوٹھری رہنے کے لائق تو نہیں ہے مگر آپ بھی ...ر جانے کے لائق نہیں ہیں۔"

یہ اس کا فیصلہ تھا، کہنے کا انداز مختلف تھا۔ اس نے پہلے ہی ...یصلہ کر لیا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے مجھے اس بوسیدہ کوٹھری ...ں منتقل کر دیا گیا اور دن کے وقت باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ جب ...ر میں کسی کے آنے کا اندیشہ نہ رہا تو وہ میرے لیے عجلت میں ...ا بنا کے لائی اور اصرار کر کے ایک قدح مجھے پلوایا۔ باہر اس کی بچی ...رانے رہی تھی تاکہ جیسے ہی دروازے پر دستک ہو، وہ باہر ...ں جائے۔ یہ ترکیب سود مند ثابت ہوئی۔ وہ دن میں متعدد بار مجھے ...یکھنے آئی۔ دوپہر کو اس نے مجھے دلیا بنا کے کھلایا۔ صرف ایک دن ...ں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی بڑی بہن، اپنی ماں، اپنی ...ی کے گھر میں ہوں۔ اس نے مجھے رات کو بتایا کہ میں بخار کی حالت ...ں کورا، فہمیدہ، امی، ابا، تھل جیل، چاقو اور نہ جانے کیا کیا بڑبڑا... تھا۔ دوسرے دن رات کو وہ مسلسل کوٹھری میں رہی اور اس کی ...ری بچی میرے پیر دباتی رہی۔ پہلے وہ سہمی ہوئی تھی، بعد میں اپنی ...کی دیکھا دیکھی مجھ سے کھل گئی۔ وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن معلوم ...تی تھی بالکل ایسی ہی تھی، اتنی ہی پیاری، اتنی ہی معصوم۔ دوسری ...ت اور دوسرا دن بھی میں نے اس کوٹھری میں گزارا۔ عورت ...نام ارجمند تھا، وہ ریاست رام پور سے بیاہ کے مراد آباد آئی تھی۔ ...ا نے دن کے اجالے میں اس کا چہرہ دیکھا، بردباری، برداشت ...ر تمکنت کے علاوہ عزم اور حرکت بھی اس کے چہرے سے نمایاں

تھی۔ کسی زمانے میں اس کا رنگ سرخ ہو گا۔ اب سفید ہو گیا تھا۔

اب وہ غریبی اور محرومی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے شوہر کے عزیزوں کے ظلم و ستم، طعنوں تشنوں اور الزام تراشیوں کی ایک طویل اور دردناک داستان سنائی۔ اسکول میں ٹیچر تھی اور محلے کی بچیاں بھی اس کے ہاں پڑھنے آتی تھیں، وہ ایک سلیقہ مند عورت تھی مگر غربت میں سلیقے کا رنگ کہاں نکھرتا ہے۔ میری موجودگی کے دوران میں اس نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے اسکول سے چھٹی لے لی تھی اور بچیوں کو منع کر دیا تھا۔ چار دن تک وہ خدا ترس عورت میری تیمارداری کرتی رہی۔ چار دن بعد میری حالت کسی قدر سنبھلی، اس نے اپنے گھر کی کئی مرغیاں کاٹ کے اور ان کا شوربا بنا کے مجھے پلایا۔ وہ میرے بارے میں کچھ جاننے کی مشتاق تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ کلکتے میں ایک استاد تھے جو اچانک غائب ہو گئے، میں انھی کی تلاش میں آیا ہوں۔ میں نے بخار کے ہذیان میں جن جن لوگوں کے نام لیے تھے، وہ میرے عزیز تھے یا ملاقاتی۔

چوتھے دن بھی اس نے مجھے نہیں جانے دیا۔ پانچویں روز بڑی مشکل سے اجازت ملی۔ میرے چلتے وقت وہ بہت روئی، وہ اور اس کی بچی رات بھر جاگتی رہیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اس سے دوبارہ ملنے آؤں گا۔ صبح کاذب کے وقت میں نے اس کے گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا، جب میں آنسوؤں کے ساتھ اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے میرے ہاتھ میں کرمچ کا ایک تھیلا تھما دیا۔ میں نے اسے کھول کے دیکھا، اس میں کرتے پاجامے کے دو جوڑے، دو چادریں اور دو بنیان رکھے ہوئے تھے۔ ایک پوٹلی میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ کچھ نہیں بولی، سسکتی رہی۔ میں نے سوچا، اس کی بچی فرح کو کچھ روپے دے دوں لیکن یہ بات مجھے کچھ اچھی نہیں لگی۔ میں نے فرح کو گلے سے لگا کے خوب پیار کیا۔

مراد آباد اسٹیشن سے دلی جانے والی گاڑی صبح سویرے روانہ ہوتی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ دلی اترا اور ایک دن کی مسافت کے بعد حیدر آباد دکن کے نامپلی اسٹیشن پر اترا۔

اسٹیشن سے باہر آتے ہی مجھ پر مایوسی کا غلبہ ہوا۔ میرے ذہن میں اس شہر کا تصور کچھ اور تھا۔ یہ تو ایک وسیع اور گنجان شہر تھا۔ چھوٹا موٹا کلکتہ۔ قدیم و جدید طرز کی عمارتیں، چوڑی سیاہ سڑکیں، میلوں پھیلے ہوئے بازار مگر دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہ ایک بدلا ہوا شہر تھا۔ یہاں کے ہنگامے میں بھی سکون تھا، سڑک پر اد...

دکانوں میں جتنے بھی آدمی نظر آتے سب بند گلے کی شیروانیوں میں ملبوس تھے، ہر جگہ اُردو کے بڑے بڑے بورڈ آویزاں تھے۔ لوگوں کے انداز میں ایک تکلف تھا، نفاست اور سجاوٹ تھی۔ میں سارجے کی رنگی ہوئی واسکٹ پہنے ہوتے تھا۔ میں ہوٹل میں ٹھہرنے اور اپنا حلیہ درست کرنے کے بجائے ارجمند بانو کا تھیلا ہاتھ میں لیے جدھر منہ اُٹھا، اُدھر نکل پڑا اور مختلف مدرسوں اور مسجدوں میں جا کے محمد شفیق نامی ایک مولوی کا پتہ پوچھتا رہا۔ لوگ مجھ پر ہنسنے لگتے۔ میں عاجزی سے درخواست کرتا کہ وہ ذرا توجہ سے میری بات سُن لیں، مجھے مولوی محمد شفیق یا اُن کی بہن کا پتہ بتا دیں۔ اُن کا اور اُن کے شوہر کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ نام پلی اسٹیشن سے کئی میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا میں پرانے شہر میں داخل ہو گیا اور اُس آخری سرے تک گیا جہاں چار مینار ہیں جہاں نواب بستے تھے اور جہاں نظام نے ایک پُرشکوہ عمارت فلک نما بنائی تھی۔ اب تو منہ کھولتے ہوئے بھی ندامت ہوتی تھی۔ پہلے ہی دن کی ناکامی دیکھ کے مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ یہاں تو وقت محض ضائع کرنا تھا مگر وقت کی کمی کس کے پاس تھی۔ میرے پاس زندگی باقی پڑی تھی۔ ابھی میری عمر ۲۳، ۲۴ سال سے زیادہ نہیں تھی جب کچھ نہ بنا تو میں نے حیدرآباد میں مرادآباد کے لوگوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ لوگ طرح طرح کے سوال کرتے کہ اُن کی شادی کب ہوئی تھی؟ وہ کب حیدرآباد منتقل ہوئیں؟ اُن کے شوہر کا نام کیا ہے؟ کہیں یہ تو نہیں ہے، کہیں وہ تو نہیں ہے؟ اس تگ و دو میں ایک اخبار نویس سے میری ملاقات ہو گئی۔ اُس نے میری درخواست پر اپنے اخبار میں اس مضمون کا اشتہار شائع کیا۔

> مرادآباد (یوپی)، کے جناب مولانا محمد شفیق
> بالقابہ اور اُن کی ہمشیرہ محترمہ جہاں کہیں بھی قیام
> فرما ہوں، توجہ فرمائیں اور مدینہ ہوٹل میں بابر خاں
> سے رابطہ قائم کریں۔ بابر خاں کے پاس ہر دو موصوف
> کے لیے ایک امانت محفوظ ہے۔"
>
> مشتہر: احقر بابر خاں

اخبار میں اشتہار چھپنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اخبار پرانا ہو گیا۔ میں حیدرآباد میں ایک ہفتے قیام کرنے کے بعد آخر دلی آ گیا۔ دلی سے لاہور اور پشاور گیا اور وہاں سے دیوبند، بریلی پھر لکھنؤ آ گیا۔ اس سفر میں مجھے دو مہینے لگ گئے۔ میں نے مختلف دینی درس گاہوں میں مولوی صاحب کو تلاش کیا لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کہیں نہیں ملے۔ آخر میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ لکھنؤ آخری شہر تھا جہاں مجھے اپنے آپ کو یہ جبریہ سمجھانا پڑا

کہ مولوی صاحب سے ملاقات اب ممکن نہیں ہے، نہ جانے اُن کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ وہ کس کھوہ میں گم ہو گئے۔ اتنے بڑے ہندوستان میں کس سے اُن کا پتہ پوچھوں؟ ابھی تو صرف چند شہر دیکھے ہیں، کہاں کہاں جاؤں۔ اب مجھے کچھ سکون ہو چلا، مُردوں جیسا سکون، مفلوج اور معذور آدمیوں جیسا سکون۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی، نہ وحشت۔ جیب میں صرف چند پیسے باقی تھے مگر اور انتظام کرنے کی فکر بھی نہیں تھی۔ بس ایک کرب کہ مرنے کی ہمت بھی نہیں ہے۔ سات سال کس اُمید پر کاٹے۔ پڑھا لکھا تھا اور قیدیوں سے زندگی سمجھنے کی کوشش کی۔ کورا کو کبھی پریشانی نہ رہے۔ میں اُس کے لیے اپنی ذات کا ایسا حصار بناؤں کہ کوئی اُس پر نگاہ اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ قلعہ! کو تلاش کر رہا تھا مگر ہوا کیا؟

قیاس کیا تھا کہ مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ خون کی واردات سرزد ہو گئی ہے، اب کورا کی موجودگی میں مجھ سے رابطہ قائم کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے اُنھوں نے جیل کا رُخ... وہ کبھی خط کے ذریعے تو مجھے مطمئن کر سکتے تھے مگر انھیں کیا معلوم میں نے جیل میں اپنا نام کیا بتایا ہے؟ ممکن ہے انھوں نے میرے نام پر خط لکھا ہو اور جیل کے حکام نے اُسے تلف کر دیا ہو کہ اس نام کا کوئی شخص یہاں موجود نہیں ہے۔ بہرحال اب سات سال گزر گئے تھے، درمیان میں وقت کی موٹی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مولوی صاحب کو کیا سانحہ پیش آیا۔ میں نے کسی شک کو دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ شاید اسی مثبت خیال سے میں اتنے دن کاٹ سکتا تھا۔ سوچا تھا کہ مولوی صاحب نے ضرور کورا کو حفاظت سے رکھا ہو گا، ورنہ وہ کبھی تو وہ نہیں آتے۔ انھیں معلوم ہو گا کہ میں جیل سے چھوٹتے ہی آؤں گا۔ وہ کورا کو دلاسا دے کے زندہ رکھے ہوتے ہوں گے۔ کورا ایسی لڑکی تھی جس کے لیے بڑے بڑے ایثار کیے جا سکتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے خود میرے سامنے تھی۔ میں نے ابا کی بات نہیں مانی، امی نے کہا تھا کہ میں کورا کو بدھ گیا کے بڑے بھکشو کے پاس چھوڑ آؤں۔ امی اور ابا سے اتنا پرانا تعلق ہونے کے باوجود کورا کے لیے انھیں چھوڑ دیا۔ بوڑھے متین نے اُس کی خاطر اپنا قبیلہ چھوڑا، مولوی صاحب نے اُس کا چہرہ دیکھا تو اُن میں شفقتوں کے سوتے اُمڈ آئے اور کورا ایسی بدنصیب نکلی کہ اُسے کہیں سکون نہ ملا۔

اب بہت کچھ سوچا جا سکتا تھا۔ کہیں تو مولوی صاحب کا نشان ہوتا۔ یقیناً اُس رات واقعات اُس طرح پیش نہیں آئے جس طرح میں نے سوچا تھا۔ غنڈے میری کورا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے اور اُنھوں نے مولوی صاحب کو ختم کر کے

چھپا دی ہو گی یا پھر کورا کا تعاقب کرنے والے لوگوں نے اُسے اور مولوی صاحب کو کسی جگہ دیکھ لیا ہو گا اور مولوی صاحب کا کام تمام کر کے کورا کو اپنے ساتھ واپس لے گئے ہوں گے۔ ممکن ہے مولوی صاحب سے کہیں چوک ہو گئی ہو اور وہ کورا کو چھپانے میں ناکام ہو گئے ہوں۔ مولوی صاحب بھی میری وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پرمیلا، کورا، مولوی صاحب، تین کا نشیبل، نہ جانے کتنے لوگ میری وجہ سے متاثر ہوئے۔

کورا کو کوئی بھی لے گیا ہو، اُس کے قبیلے کے لوگ یا غنڈے، ضرور زندہ ہو گی۔ میں اُسے ایک بار صرف دیکھنا چاہتا تھا، صرف ایک بار۔ اس سے زیادہ اب میرا کوئی مطالبہ نہیں تھا۔ اس ایک بار کی دید پر کوئی معاوضے میں میری جان بھی لے لے۔ مجھ سے عمر بھر خدمت گاری کا کام لے، مجھے ہمیشہ کے لیے جیل میں رکھوا دے، میری آنکھیں نکال لے، میرے ہاتھ کاٹ دے، مجھے بے دست و پا کر کے کوڑے پر پھینک دے۔ مجھ سے کہے تو میں اُس کے قدموں میں مال و زر کے انبار لگا دوں، میں رہزنی کروں گا، ڈاکو بن جاؤں گا، وہ جسے کہے میں اُسے قتل کر دوں گا مگر ایک بار وہ مجھے کورا کی صورت دکھا دے۔

کہیں ایسا تو نہیں۔ نہیں نہیں۔ میری اُنگلیاں تھرتھرانے لگیں اور سر پھٹنے لگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کئی بار پہلے بھی یہ خیال دل میں آیا تھا۔ میں نے سر جھٹک کے خود پر لعن طعن کی تھی۔ مولوی صاحب کے کردار پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ ایک فرشتہ صفت آدمی تھے، جب اُنھوں نے مجھے سینے سے لگا کر پناہ دی تھی تو اُن کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ پھر اُنھوں نے ہمارے لیے سامان خریدا، کورا کے لیے بہترین لباس خریدا، وہ ہمیں کس ذوق و شوق سے کلکتے کی سیر کراتے رہے۔ وہ ایک مذہبی شخص تھے، ایک دین دار آدمی۔ اُن کی ساری عمر شرافت کے پیشے میں گزری تھی۔ وہ اتنے پست نہیں ہو سکتے مگر وہ میرے اور کورا کے کون سے رشتے دار تھے، مجھے یاد آیا جب میں نے گیا اسٹیشن پر اُن کے ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی تو اُنھوں نے نہایت درشت انداز میں مجھے جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ محبت کے آدمی نہیں تھے۔ مرادآباد میں بھی اُن کے تعلقات محدود تھے، رشتے داروں تک سے رسمی مراسم تھے، نہ اُنھوں نے شادی کی تھی کہ اُن کے دل میں بیوی بچوں کی محبت کا گداز ہوتا۔ اپنی بہن سے بھی وہ عرصے سے نہیں ملے۔ اب کسی کو کیا پتہ۔ میں یہاں بیٹھا ہوں، شکل و صورت سے ایک معصوم شخص نظر آتا ہوں مگر کون جانتا ہے کہ میں نے تین قتل کیے ہیں۔ کون کسی کے دل میں جھانک سکتا ہے۔ چہرے تو سب کے مختلف ہیں۔ دنیا میں ہر آدمی دوسرے سے الگ نظر آتا ہے۔ اندر سے آدمی کریم محل ہوتا ہے، اندر سے عورت اُس کی

تقاضا بھی برآمد ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کو اندر سے دیکھنے کا وقت مجھے کہاں ملا تھا، ریل میں ملاقات ہوئی، ایک رات ساتھ گزاری، پھر دو دن۔ مگر اُنھوں نے جب ریل میں مجھ سے شفقت کا اظہار کیا تھا، اُس وقت اُنھوں نے کورا کو کہاں دیکھا تھا۔ کورا تو دوسرے ڈبے میں بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب اپنے رویے پر شرمندہ تھے۔ مجھے کھانا کھلاتے تھے اور خوب محبت کی باتیں کرتے تھے۔ یاد ہے اسٹیشن پر بھی وہ اندر ٹھہرے رہے، نیچے اُتر گئے تھے کہ ماموں جان ہمیں لینے آ جائیں تو وہ جائیں۔ اُس وقت کورا برقعے میں تھی اور اُنھوں نے اُس کے چہرے اور عمر کا اندازہ نہیں کیا تھا۔ نہیں نہیں۔ مولوی صاحب پر شبہ کرنا گناہ ہے۔ وہ بے چارے تو صرف میری وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ نہ جانے اُن پر کیا گزری ہو گی۔ نہ جانے وہ کس عالم میں ہوں گے۔ پتہ نہیں، زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔

سوچتے سوچتے میرا دماغ پک گیا تھا۔ اب ایک آخری اُمید رہ گئی تھی کہ میں اُن غنڈوں کو تلاش کروں جنھوں نے دریا کے کنارے ہم پر حملہ کیا تھا۔ اُنھی سے کوئی صحیح بات معلوم ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ زندہ ہوں اور کلکتے میں موجود ہوں۔ غنڈوں کی زندگی کا کیا بھروسا۔ سات سال میں کتنے غنڈے مر گئے ہوں گے۔ میں نے لکھنؤ سے ناکام ہو کے کلکتے کا رُخ کیا۔ لکھنؤ اور کلکتے کے درمیان گیا شہر تھا، گیا قریب آنے پر دل میں ہوک سی اُٹھی۔ جی میں آیا، بس ایک بار گھر کی طرف سے گزر کے واپس ہو جاؤں گا۔ کوئی مجھے پہچان بھی نہیں سکے گا۔ میرا حلیہ ہی ایسا ہے، سات سال میں تو لوگ بھول بھال گئے ہوں گے۔ بس دروازہ ایک نظر دیکھوں گا اور چلا آؤں گا۔ شاید کسی کا چہرہ بھی دیکھنے کو مل جائے۔ میں ایک فقیر کی صورت میں جاؤں گا۔ ایک کشکول خرید لوں گا اور دروازے پر کھڑا ہو کے بھیک کی صدا لگاؤں گا۔ کوئی تو دروازے پر آئے گا۔ ممکن ہے امی آ جائیں لیکن اگر کسی نے پہچان لیا تو؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ داڑھی، بدلی ہوئی رنگت، میلے پھٹے ہوئے کپڑے۔ کوئی بھی شناخت نہیں کر سکے گا۔

گاڑی جب گیا اسٹیشن پر ٹھہری تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ اسٹیشن پر اچھی خاصی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ میں لرزتے ہوئے قدموں سے پلیٹ فارم پر اُترا۔ سوندھی سوندھی خوشبو آئی۔ آگے جاؤں یا نہ جاؤں؟ گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں ڈبے کی طرف بڑھا، پھر واپس آ گیا۔ دل و دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر جیسے مسافروں کی چیخ پکار، نفسانفسی تھی، کچھ یہی کیفیت میرے جسم کی تھی۔ اسٹیشن عبور کر کے میں اپنی مانوس سڑک پر آ گیا۔ گھاس کا وہ چھوٹا سا میدان خشک ہو گیا تھا جہاں میں کبھی کبھی صبح سویرے ٹہلنے آتا تھا۔ میرے جانے کے بعد شاید کسی نے اس کی خبر ہی نہیں لی تھی مجھے بہت دکھ ہوا۔ جگت رام

پنیے کی حویلی پر بھی کائی جمی ہوئی تھی، معلوم ہوتا تھا عرصے سے سفیدی نہیں ہوئی ہے۔ جب میں یہاں تھا تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہر سال دیوالی کے موقع پر سفیدی ہوتی تھی۔ اب تو یہاں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ عمارتیں نئی بن گئی تھیں۔ بہتر ہوتا کہ یہ لوگ کلکتے کا نقشہ دیکھ لیتے۔ ایسی بھونڈی عمارتیں بنائی تھیں۔ میونسپلٹی کو بھی سڑکوں کا خیال اس زمانے میں کچھ کم رہا تھا۔ بڑی سڑک سے گزر کے میں تانگے والے چوک میں آگیا اور ٹھٹک کے رک گیا۔ آگے بڑھنے کی قوت جسم میں نہیں تھی۔ سانس قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ کوئی جسم کی چٹکیاں لے رہا تھا اور درد ہو رہا تھا۔ کوئی بجلی کے تار جسم سے مس کر رہا تھا۔ کنپٹیاں سرخ ہو گئی تھیں، چہرہ تمتما رہا تھا۔

میں اپنے محلے میں داخل ہو گیا۔ محلے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ احسان الٰہی پرچونی کی دکان بھی اسی جگہ قائم تھی جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ میں ادھر سے پہلو بچاتا ہوا گزرا۔ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں اور راہ گیروں کی نگاہ مجھ پر پڑی، محلے میں کسی بھی اجنبی کی آمد پر یہی ہوتا ہے۔ میں نگاہ چراتا ہوا گزر گیا۔ کوئی مجھے پہچان نہیں سکا تھا، ایک گلی مڑنے کے بعد میرا گھر تھا۔ میں نے اپنی رفتار کسی قدر تیز کر دی۔ دکان دار احسان الٰہی بوڑھا اور موٹا ہو گیا تھا۔ میں اسے دیکھتا ہوا گلی میں مڑ گیا، سامنے میرا گھر تھا، میرا گھر۔ پہلے ہی میری حالت خراب تھی گھر کا دروازہ دیکھ کے سنسناہٹ ہونے لگی۔ یقین نہیں آیا کہ میں ایک مدت بعد اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہوں۔ مکان کی دیواروں پر حال میں رنگ و روغن کیا گیا تھا، کھڑکیاں بھی تبدیل کی گئی تھیں۔ گلی میں دیر تک کھڑا رہنا نامناسب بات تھی۔ وہاں سے سرسری گزر گیا۔ دوسری بار پھر گلی میں آیا اور ڈیوڑھی میں جھانکنے لگا۔ ڈیوڑھی کا آدھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دوسری بار بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ میں چوروں کی طرح اپنی گلی، اپنے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ میں جب چوتھی بار ادھر سے گزر رہا تھا تو ایک خوش پوش لڑکا اندر سے برآمد ہوا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کون ہو سکتا ہے یہ؟ یہ تو کوئی اجنبی لڑکا ہے۔ مجبور ہو کے میں نے ایک راہ گیر کو روک لیا۔ وہ جلدی میں تھا لیکن میرے منکسر لہجے نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ "کیا ہے بھئی؟" وہ اکتاہٹ سے بولا۔

"بھائی۔ میں بڑی دیر سے زمین دار صفدر زماں صاحب کا گھر دیکھ رہا ہوں۔ کوئی شخص رہبری نہیں کرتا۔ آپ ہی کچھ مدد کیجیے۔"

"صفدر زماں۔ زمیں دار؟" اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ "اب وہ یہاں کہاں بھائی۔ عرصہ ہوا انھیں گئے ہوئے۔"

"اچھا! مگر وہ کہاں گئے؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ کوئی کہتا ہے پٹنے میں جا کے بس گئے۔ کوئی کہتا ہے دلی میں آباد ہو گئے۔ کوئی لکھنؤ کہتا ہے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔"

"وہ کب گئے اور اب یہاں ان کے مکان میں کون رہتا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔ "معاف کیجیے میں آپ کے کام میں خلل..."

"کوئی بات نہیں بھائی! لوگ ان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنا مکان کوڑیوں کے مول فروخت کر گئے۔ ان کا ایک جوان لڑکا گم ہو گیا تھا۔ شاید اس کا ان پر بہت اثر تھا۔ ذہنی حالت بھی کچھ خراب سی ہو گئی تھی۔ گھر بیٹھے کھاتے رہے۔ پہلے بچیں، پھر بیوی کا انتقال ہو گیا۔"

"نہیں نہیں۔ کیا۔ کیا امی؟" میں نے چیخ مار کر کہا۔ اگر وہ بڑھ کے سنبھال نہ لیتا تو میں زمین پر بے سدھ پڑا ہوتا۔ میری امی مر گئی تھی۔ وہ کس روانی سے یہ خبر سنا رہا تھا جیسے میں تو پتھر کا آدمی ہوں۔

"ارے ارے کیا ہوا بھائی آپ کو؟" وہ حیرانی سے بولا۔ "آپ اس قدر پریشان کیوں ہو گئے۔ اور یہ آپ انھیں امی کیوں کہہ رہے ہیں؟ آپ کون ہیں؟" وہ سٹ پٹا کے بولا اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میرے کان بند ہو گئے تھے۔

"کہیں آپ؟" میری حالت دیکھ کے وہ اضطراب سے بولا۔ "آپ وہ تو نہیں ہیں؟"

"تم سچ کہہ رہے ہو یا جھوٹ؟" میں نے اس کا جسم جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "کہہ دو کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔"

"بھائی مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا مگر آپ سے ان کا کیا تعلق ہے؟ آپ کون ہیں؟"

"میں ایک بدنصیب ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کب۔ یہ کب ہوا؟"

"عرصہ ہوا، ان کے صاحب زادے کے فرار ہو جانے کے بعد۔"

"اوہ۔ اوہ۔" میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ مجھے یہ سننے کے لیے آنا رہ گیا تھا۔ میرے منہ میں کیڑے پڑیں۔ میں یہ کہتا تھا کہ وہ دونوں مر گئے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں اپنے کس محلے میں کھڑا ہوں اور کس شخص سے مخاطب ہوں۔ میرے ذہن کا شیرازہ منتشر ہو گیا تھا۔

"کیا آپ۔ آپ ان کے؟" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

"میں بھی ان کا ایک بیٹا تھا۔" میں نے اس کے سینے سے لگتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے نہیں جانتے۔"

"آپ بابر تو نہیں ہیں بابر زماں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"نہیں، میں وہ نہیں ہوں۔ میں تو کوئی اور ہوں۔ میں ان کا اصل بیٹا نہیں تھا۔ وہ مجھے بیٹا سمجھتی تھیں۔ میں تو ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں تھا۔ وہ مجھ پر احسان کرتی تھیں کہ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی تھیں۔ بابر زماں تو کم بخت اسی دن مر گیا تھا جس دن گھر سے نکلا تھا۔ وہ سالا تو پاگل ہو گیا تھا۔ وہ بہت برا لڑکا تھا، اپنی ماں کو قتل کر کے گیا۔" میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے گھر چلیے۔ آئیے آئیے، وہاں آرام سے بیٹھیے گا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے بے خبری میں نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ آئیے میرے بھائی!"

"نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے پھر کے کہا۔ "ہو سکے تو یہ بتا دو کہ اس گھر کے باقی زندہ لوگ کہاں ہیں؟"

"کچھ نہیں معلوم۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "انھوں نے جاتے وقت اپنے عزیزوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ یہاں ان کے بہت سے عزیز رہتے ہیں۔ دور سے تو ہمارا بھی کوئی رشتہ لگتا ہوگا۔ بیٹے کے جانے کے بعد لوگوں نے انھیں بہت کم گھر سے نکلتے دیکھا۔ انھوں نے ملنا جلنا ہی بند کر دیا تھا۔ بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔ کوئی عورت ان کے گھر ملنے جاتی تو وہ کمرے کا دروازہ بند کر لیتے۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کے دماغ پر برا اثر پڑا ہے۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ گھر میں بیٹھے کیمیا بنا رہے ہیں۔ بچوں پر باہر نکلنے کی پابندی تھی۔ بیوی کی موت کے کچھ دنوں بعد ایک دن صبح اچانک لوگوں نے دیکھا کہ گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔ نئے مکینوں سے پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ ان کے ہاتھ مکان فروخت کر کے گئے ہیں۔ بہت دنوں سے بات چیت چل رہی تھی۔ ایک رات وہ چابیاں دے کے چلے گئے۔ کچھ کہہ کے نہیں گئے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ پھر کسی کو ان کے بارے میں خبر نہیں ہوئی۔" وہ میرے کانوں میں زہر انڈیلتا رہا۔

"کسی کو بھی معلوم نہیں؟" میں نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

اس نے دکھ سے انکار میں سر ہلایا اور مجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اس کا شبہ یقین میں بدل گیا تھا کہ میں ہی ان کا گم شدہ بیٹا ہوں۔ محلے کے دو ایک آدمی اور ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہاں بھیڑ لگتی، مجھے ہوش آگیا اور میں اپنے مخاطب شخص کا کندھا پکڑ کے اسے ایک طرف لے گیا۔ وہ حیران و پریشان تھا۔ پہلے ہی بہت رسوائی ہو چکی تھی۔ اب وہ یہاں سے منہ کالا کر گئے تو میں انھیں مزید رسوا کرنے چلا آیا۔ بے خیالی میں نہ جانے کیا کیا منہ سے نکل گیا۔ سامنے میرے گھر کا دروازہ تھا مگر اب اس میں میرے داخلے پر پابندی عائد ہو گئی تھی۔ یہ وہی گلیاں تھیں جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا۔ رونے کے لیے بھی کوئی ہمدرد سینہ نہیں تھا۔ میں نے پھر اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کی اور اس شخص کو ٹالنے کے لیے زور آگیا۔ "میں واپس جا رہا ہوں۔ میری درخواست ہے جو کچھ آپ نے دیکھا اور محسوس کیا ہے، اسے بھول جائیے گا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مگر آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں؟"

ایک جھوٹ چھپانے کے لیے میں نے اس سے بہت سے جھوٹ بولے، وہ مجھے کریدنے لگا۔ وہ میری شکل و صورت سے کچھ خوف زدہ بھی ہو گیا تھا۔ "کچھ مت پوچھو۔" میں نے گرج کے کہا۔ وہ سہم کے رخصت ہو گیا۔ اس کے سوا اس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں جب ایک طرف نکل گیا تو اس نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ میں نے اپنے قریب کے عزیزوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں سمجھی، اب کچھ اور سننے کی تاب نہیں تھی۔ امی بھی چلی گئیں۔ مولوی صاحب اور کورا کی طرح ابا بھی کہیں گم ہو گئے۔ ٹھیک ہے، جائیں سب جائیں، ساری دنیا گم ہو جائے۔

مگر وہ چلے کیوں گئے؟ ایسی بھی کیا بات تھی کہ کسی کو بتایا تک نہیں؟ گھر چھوڑ دیا ہے تو ضرور کوئی اور بات ہے۔ کوئی ایسی بات جس سے وہ شخص بھی واقف نہیں تھا جس نے مجھے یہ سب کچھ بتایا ہے۔ میں تو بہت خاموشی سے چلا آیا تھا۔ ایسا میں نے ابا اور امی کے آرام کے لیے کیا تھا۔ جب تک کورا وہاں موجود رہتی، وہ دونوں پریشان اور خوف زدہ رہتے۔ میں نے تو صرف اتنا کیا تھا کہ چند سو پیسے لے کے کہے بغیر گھر سے آگیا تھا۔ اس میں امی کے اتنے ناراض ہو جانے کی کیا بات تھی۔ سنا ہے جنھیں اپنی اولاد کا انتظار ہوتا ہے موت بھی انھیں انتظار کا وقت دیتی ہے، ان کی سانس رکی رہتی ہے۔ بڑے بڑے مشکل وقتوں میں میں نے ان کا نام نہیں لیا تھا۔ میں نے تھانے میں ان کا نام چھپایا، جیل میں کسی کو ہوا نہیں لگنے دی کہ میرا باپ کون ہے اور میں کس شہر سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایک ذرا انتظار کر کے دیکھ لیا ہوتا۔ جب میں واپس اسٹیشن جا رہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے خود کو سمجھایا۔ مجھے رونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس گھر سے میرا تعلق تو فرار کے وقت ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں تو سیدھا کلکتے واپس جا رہا تھا۔ یہاں اتفاقاً آگیا تھا۔ نہ میرا گھر جانے کا ارادہ تھا۔ نہ کسی سے بات کرنے کا۔ میں تو یوں ہی ادھر آگیا تھا۔ بس اپنی پرانی گلیاں اور گھر دیکھنے کے لیے، اپنا کالج دیکھنے کے لیے۔

میری جیب میں صرف چند آنے رہ گئے تھے۔ جیب میں وہی ٹکٹ تھا جو میں نے لکھنؤ سے کلکتے کے لیے خریدا تھا۔ خیال تھا کہ ایک گاڑی سے گیا جاؤں گا، دوسری سے کلکتے کی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا لیکن اسٹیشن پر بدھ راہبوں کو دیکھ کے میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہو گیا اور میں ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ یہ میلے کا زمانہ نہیں تھا۔

اس لیے بدھ گیا میں شاکیہ منی کا سکون پھیلا ہوا تھا۔ راہبوں کی ٹولیاں ایک مندر سے دوسرے مندر آجا رہی تھیں، اور اس پیڑ کے نیچے بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ جہاں شاکیہ منی نے نروان حاصل کیا تھا۔ میں بھی ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میلا ہو رہا ہوتا تو بدھ گیا کے منتظم میرے اس طرح دھرنا دے کے بیٹھنے پر کئی مرتبہ مجھے ٹوکنے آتے۔ اب کسی نے خبر بھی نہیں لی۔ دیر تک میں یوں ہی سکڑا سمٹا بیٹھا رہا۔ شام کو ایک بھکشو ادھر سے گزرتے وقت مجھے دیکھ کے رک گیا اور ملائمت سے کہنے لگا۔ "شاکیہ منی تم پر سکون کی بارش کریں۔ تمھیں کیا دکھ ہے؟"

"زندگی کا دکھ ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم ٹھیک جگہ آ گئے ہو۔ ایسے دکھیاروں کے لیے شاکیہ منی کے پاس بڑی اچھی دوا ہے۔"

"زہر سے اچھی دوا کون سی ہوگی۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"نہیں نہیں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "شاکیہ منی کے پاس آ کر ایسی بات نہیں کرتے۔"

"میں نے پہلے بھی اس کے پاس آنا چاہا تھا، مجھے کلکتے میں جانگ قبیلے کا ایک بھکشو ملا تھا۔ وہ میرا دوست بن گیا۔ میں دنیا میں تنہا تھا اور دنیا نے مجھے بہت دکھ دیے تھے پھر اس نے مجھے شاکیہ منی کے سکون کی تعلیم دی۔ میں نے جو کچھ میرے پاس تھا، وہ لوگوں میں بانٹ دیا۔ ایک رات وہ غائب ہو گیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا جب میرے پاس پیسے نہیں رہے تو سب مجھ سے روٹھ گئے۔ پھر مجھے ایک ناکردہ گناہ کے الزام میں جیل ہو گئی، میں سات سال کی سزا کاٹنے کے بعد اس کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟ اس کا نام کیرسا تھا۔"

"کیرسا، ایک بھکشو۔" وہ اداسی سے بولا۔ "ایک بھکشو۔"

"ہاں جانگ قبیلے کا ایک بھکشو۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "میں شاکیہ منی سے اس کی شکایت کرنے آیا ہوں۔"

"شاکیہ منی ضرور تمھاری شکایت سن رہا ہوگا۔ میں کسی ایسے بھکشو کو نہیں جانتا لیکن یہاں تبت کے چند لوگ آئے ہوتے ہیں۔ میں تمھیں ان سے ملواتا ہوں، آؤ میرے ساتھ۔"

وہ تاسف کا اظہار کرتا ہوا مجھے ایک بھکشو کے پاس لے گیا جو اپنی کٹیا میں ریاضت کر رہا تھا۔ آواز سنتے ہی وہ باہر آیا اور میرے ساتھی بھکشو کی زبانی میری داستان سن کے حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے کیرسا کے متعلق لاعلمی ظاہر کی تو میں نے اس کے متعلق کچھ اور معلومات سے اسے آگاہ کیا۔ میں نے کہا۔ "وہ کہتا تھا کہ وہ اجتین نامی ایک شخص کی تلاش میں آیا ہے۔ اجتین اس کے قبیلے کی ایک لڑکی کو ہندوستان لے آیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے قبیلے کے سردار سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کی بھتیجی ضرور واپس لے آؤں گا۔ وہ تو بہت سی باتیں کرتا تھا۔"

"وہ بھکشو نہیں ہوگا، وہ بھکشو نہیں ہوگا۔ وہ جھوٹا ہوگا۔ کوئی بھکشو جھوٹ نہیں بولتا اور کوئی بھکشو ایسے کام نہیں کرتا۔" وہ تیزی سے بولا۔ "دوست! تمھیں دھوکا ہو گیا۔ تم سچ کہتے ہو، اجتین نا ایک شخص جانگ قبیلے سے ایک لڑکی کو ہندوستان لے آیا تھا۔ اجتین کو یہاں بدھ گیا میں کسی نے مار دیا۔ لڑکی کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تو پھر وہ لڑکی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہوگا۔"

"یہ بہت پرانی بات ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر مجھے یقین ہے وہ بھکشو نہیں تھا۔"

"کیا میں جانگ قبیلے جا سکتا ہوں؟ میں اسے تلاش کرو
وہ ایسا نہیں تھا، وہ میرے ساتھ کئی دن ٹھیرا تھا۔"

"تم جانگ قبیلے کسی وقت بھی جا سکتے ہو مگر تمھیں وہاں کیا ملے گا دوست؟ آؤ ہمارے ساتھ رہو۔ بھکشوؤں کو ان با سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ آؤ، ہم تمھیں شاکیہ منی کے پاس لے جائیں"

میں نے تذبذب سے حامی بھر لی اور پیلے بھکشو کے ساتھ اس کی کٹیا میں چلا گیا۔ تمام رات اس نے مجھے صبر و ضبط کی تلقین کی۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے ساتھ میرے ٹھیرنے کا مقصد یہی تھا کہ میں کسی طور اس بھکشو سے ملاقات کر لوں جو جانگ قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، یقیناً کوئی ایسا بھکشو یہاں موجود ہوگا، نہیں آ جائے گا۔ بدھ گیا میں ہزاروں یاتری روزانہ آتے جاتے رہتے۔ دوسرے دن میرے ساتھی بھکشو شندر نے نہلا دھلا کے مجھے کپڑے پہننے کے لیے دیے۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس کو میں نے پہلے ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ میں شاکیہ منی کے پاس آنے کے لیے اپنا سب کچھ لٹا چکا ہوں۔ میں نے کپڑے پہن۔ گیروے رنگ کا بھکشوؤں کا لباس لیکن اب مالا چھپانے کا پیدا ہو گیا تھا۔ شندر نے مالا دیکھی تو مجھ سے کہا کہ میں اسے دوں لیکن میں نے بہانہ بنا کے اسے اپنے گلے میں ڈال لیا کہ میری ماں کی یادگار ہے۔ شندر نے سوچا ہوگا کہ چند دنوں بعد خود اسے اتار کے کسی کو دان کر دوں گا۔

میں پانچ چھ روز بھکشوؤں کی ٹولی کے ساتھ مندر میں گھومتا اور بدھ کی تعلیمات سنتا رہا۔ وہ سب میری بہت ع کرتے تھے۔ تمام راہبوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ ایک شخص نے شاکیہ منی کی تعلیمات سے متاثر ہو کے ادھر کا رخ

مجھے ریاضتوں کے طریقے سمجھانے اور یک سو ہونے کی مشقوں کی دینے لگے۔ میں بار بار ان سے کیرسا کا ذکر کرتا تھا اور انھیں داستان سناتا تھا۔ بدھ گیا کا ماحول بہت پُراسرار تھا۔ بھکشو کسی جگہ جم کر بیٹھ جاتے تو پتھر بن جاتے تھے۔ پھر انھیں دنیا کا ہوش رہتا تھا۔ ابھی تک خاص جانگ قبیلے کا کوئی ایسا بھکشو مجھے ملا تھا جس سے کورا کے بارے میں کوئی خبر مل سکتی۔ چھٹے روز آدھی رونے کے بعد میں کٹیا میں لیٹا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آواز میں اٹھ کے بیٹھ گیا اور میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔

راہبوں کے مخصوص لباس میں وہ شخص تیزی سے اندر ہا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کے اس نے یکایک اپنا ہاتھ بلند کیا، کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ "یہ مالا تمھارے پاس کہاں سے آئی؟" اس ت لہجے میں پوچھا۔ میں نے بستر سے اٹھنا چاہا۔ اس نے چھرے میرے سینے کے سامنے کر دی۔

اندھیرے میں اس کا چہرہ خوف ناک ہو گیا تھا۔ اس کی راہبوں جیسی معصومیت اور سادگی، سفاکی اور ں میں بدل گئی تھی۔ اس کے چھرے کی نوک میرے سامنے تھی۔ وہ اگر چاہتا ہی جھٹکے میں میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ پہلے پہل تو میں کچھ بھی نہیں سمجھا اچانک آمد اور حملے سے گھبرا اٹھا لیکن پھر میرے ذہن نے تیزی سے نا شروع کر دیا۔ میری مزاحمت میں نرمی آ گئی۔ یہ وہی شخص تھا جس کا مجھے تھا اور جس کے لیے میں نے بدھ گیا کے اس اجنبی ماحول میں بدھ راہبوں اختیار کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ ضرور آئے گا، یہ ایک یا دوسرے ساتھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری گردن میں لٹکی ہوئی مالا دیکھ کے ن ہو جائیں گے اور تفتیشِ حال کے لیے ضرور میرے پاس آئیں گے۔ صرف صول اس شخص کے لیے اتنا اہم نہیں تھا جو خنجر بدست مجھ پر حملہ آور تھا۔ ہ بھی جاننا چاہتا ہوگا کہ میں نے یہ مالا کہاں سے حاصل کی ہے اور جب یہ معلومات اسے فراہم کر کے مطمئن نہ کر دیتا۔ اس وقت تک میری زندگی فوظ تھی۔ میرے بلتے ہوتے رویّے اور چہرے پر چھائے ہوتے سکون سے ل ہو گیا اور جھنجلا سا گیا۔ اس نے میرے گال پر ایک مکا مارا اور دوسرے چھرا تان کر میرے اور قریب ہو گیا۔ اب میں حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"میری بات کا جواب دو۔" اس نے شقاوت سے کہا۔

"چھرا سامنے سے ہٹاؤ اور جو کچھ پوچھنا ہے وہ اطمینان سے پوچھو۔" سی قدر بے پروائی سے کہا۔

"نہیں۔" اس نے میری آنکھوں میں اپنی سرخ آنکھیں ڈال دیں اور سے بولا۔ "بتاؤ تم نے یہ مالا کہاں سے حاصل کی؟"

"الا کے پیچھے ایک طویل داستان ہے لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کے بل پر مجھ سے کوئی راز اگلوا لو گے تو تم غلطی پر ہو۔" میں نے جرأت سے کہا۔

اس نے چھرے کی نوک میرے سینے میں چبھو دی۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھیں باہر نکلنے لگیں لیکن میں نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ "میں اسے تمام کا تمام تمھارے سینے میں اتار دوں گا۔" اس نے کہا۔

اس کے لہجے میں رحم یکسر مفقود تھا۔ میرا اندازہ غلط نکلا۔ مالا دیکھ کر وہ کچھ پاگل سا ہو گیا تھا اور لمحہ بہ لمحہ متشدد ہوتا جا رہا تھا۔ "اتار دو لیکن پھر کبھی کچھ جان نہیں سکو گے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جاؤ گے، بہت سال ہو گئے۔ اب تو تمھیں کچھ ہوش آ جانا چاہیے۔" میں نے اسے متزلزل کرنے کے لیے بے سر و پا باتیں شروع کیں۔ وہ کچھ سوچنے اور مجھے گھورنے لگا۔ اس نے چھرا کچھ پیچھے ہٹا لیا، اور اپنے جسم کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ میرے گھٹنے اس کے دباؤ سے کچھ آزاد ہو گئے۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور آہستہ سے کہا۔ "یہ مالا میری ماں کی نشانی ہے۔"

وہ ایک دم برانگیختہ ہو گیا۔ "جھوٹ، میں تمھیں قتل کر دوں گا۔"

"میرے باپ کے ایک تبتی دوست نے یہ مالا تحفے میں دی تھی۔ شاید اس کا نام اجتین تھا۔ اس بات کو سات آٹھ سال گزر گئے۔"

"ہاں ہاں۔" وہ بے تاب ہو گیا۔ "اجتین، اجتین، اس کا نام یہی تھا۔ آگے بتاؤ کیا ہوا۔" وہ وحشت سے بولا۔

"اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی، بہت پیاری سی لڑکی۔" میری آواز پگھلنے لگی۔ "بالکل گڑیا جیسی تھی، اس کے دانت چاندی کے بنے ہوتے تھے اور چہرے پر چاندنی چھٹکی ہوتی تھی۔ اس کا جسم قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔" یہ کہتے کہتے میں خاموش ہوا اور کہیں کھو گیا۔

میرے بیان پر وہ بھی مبہوت ہو گیا تھا۔ پھر جھرجھری لے کے بولا۔ "اجتین تو مر گیا؟"

"ہاں۔" میں نے دکھ بھری آواز میں جواب دیا۔ "اسے مار دیا گیا۔"

"اور لڑکی کہاں ہے؟" اس نے یہ سوال اتنی تیزی سے کیا کہ زبان ہکلانے لگی۔ میں نے اس کا سخت رویّہ دیکھ کے جان بوجھ کر اجتین کا نام لیا تھا اور کورا کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ یہ وقت ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے ٹالنے اور کچھ چھپانے کا نہیں تھا۔ مجھے اس شخص سے کورا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا، ہم دونوں کی حیثیت ایک ہی تھی۔ اس کی تشویش سے ایک بات تو واضح ہو گئی کہ کورا اپنے قبیلے واپس نہیں پہنچی مگر یہ کیا راز ہے کہ لوگ ابھی تک اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں؟ اتنی مدت گزرنے کے بعد انھوں نے یہ کیوں نہیں سمجھ لیا کہ کورا کو کوئی غیر معمولی حادثہ پیش آ گیا ہوگا۔ اس کا نگراں بوڑھا اجتین مر چکا تھا، یقیناً کم عمر کورا نے کسی شخص کا سہارا لیا ہوگا۔ اتنے بڑے ہندوستان میں وہ نہ جانے کہاں اور کس عالم میں ہوگی۔ کیا یہ لوگ اس خوف میں مبتلا ہیں کہ کورا کسی بھی وقت قبیلے میں نمودار ہو کے اپنا سردار منتخب کر کے سرداری کا اعلان کر سکتی ہے؟ وہ مجھ سے کچھ جاننے کے لیے بری طرح مچل

رہا تھا اور میں اُس کی زبانی کچھ سُننے کا شدت سے منتظر تھا۔
"تم چُپ کیوں ہوگئے؟ میں پوچھتا ہوں کہ لڑکی کہاں ہے؟" اُس نے چھرے کا ہاتھ بلند کر کے دوبارہ اُسے میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ جیسے شاید میں اپنے اور اُس کے درمیان اس تیز دھار ہتھیار کی موجودگی بھولا جا رہا ہوں۔
"وہ زندہ ہے۔" میں نے پُراُمید لہجے میں کہا۔
"وہ کہاں ہے؟" اُس نے پھر سے تکرار کی۔
"تمہارا اُس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے نفرت سے پوچھا۔
"میرا تعلق؟" اُس کے تیور بگڑ گئے مگر وہ جلد ہی سنبھل کے بولا۔ "میں اُسی کے قبیلے کا ایک آدمی ہوں۔ ہم اُسے مدتوں سے تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ہمارے سابق سردار کی بیٹی ہے اور قبیلے کی امانت ہے۔ ہم کسی بھی قیمت پر اُسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے تیار ہیں۔"
"تو تم نے اُسے قبیلے سے نکال کیوں دیا تھا؟"
"اُسے بوڑھا اُجین اغوا کر کے لے آیا تھا۔" وہ مجھے جواب دینے پر مجبور تھا کیونکہ میں اُسے یہ تاثر دینے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ میں کورا کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ اُس کے پاگل پن میں کسی قدر کمی آگئی تھی، اس دوران میں کتنی ہی بار میں نے بھل اور اُس کے ساتھیوں کے سکھائے ہوئے داؤ آزمانے کا ارادہ کیا مگر وہ پوری طرح چوکنا تھا اور ہتھیار رکھنے کے آداب جانتا تھا۔ قبیلے کے سردار نے لوگ چھانٹ چھانٹ کر کورا کی تلاش میں دوڑائے ہوں گے۔ اُس نے مجھے ایک بھی داؤ آزمانے کا موقع نہیں دیا البتہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا کہ میں نے لپنے سینے اور گردن پر چھرے کا خوف کم ہی محسوس کیا ہے۔
"بوڑھا اُجین اُسے اغوا کر کے نہیں لایا تھا۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "تم جھوٹے ہو۔ اُجین نے اپنے سردار سے دوستی کا فرض نبھایا تھا، اُس نے اُس کی بیٹی کو ظالموں کے پنجے سے بچایا، اُسے پناہ دی، ضعیفی اور ناتوانی میں دُور دراز کا سفر اختیار کر کے اُسے زندہ رکھنے کے لیے یہاں تک لے آیا اور تم اُس سے زندگی چھیننے کے لیے گلی گلی کوچے کوچے اُس کا تعاقب کرتے رہے۔ تم اُجین کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے مگر کان کھول کے سُن لو کہ کورا تمہارے ہاتھ نہیں آسکتی، جاؤ، اپنے قبیلے واپس چلے جاؤ۔ اپنے سردار سے کہنا، سرداری تمھی کو مبارک ہو، کورا واپس نہیں آئے گی۔"
"ارے تم اُس کا نام بھی جانتے ہو؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "بتاؤ، وہ کہاں ہے؟" وہ میرے منہ پر اپنے سخت مکوں سے مسلسل ضربیں لگانے لگا۔ میرا ایک دانت ٹوٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ پھر اُس نے میرے بال پکڑ لیے اور وحشت ناک طریقے سے سر فرش کے ساتھ پٹخنے لگا۔
بھل کہتا تھا کہ جب ایسی کوئی صورت پیش آجائے اور تم خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگو تو اپنے مخالف کو حد سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کرو، اشتعال میں وہ ضرور کوئی غلطی کرے گا۔ بس تم اُسی لمحے کے منتظر رہو۔

اب کورا کا ذکر ہو رہا تھا اور اُس کا دشمن میرے سامنے تھا۔ وہ کورا کو ... تھا اور میں اُسے تاقیامت زندہ دیکھنے کا آرزومند تھا۔ وہ کورا کا دشم... لہٰذا میرا دشمن تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے کورا جیسی پھول لڑکی کا ... حرام کر دی تھی اور اُسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا تھا ... دل میں اُس کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ میرے منہ سے خود ہی ... نکل گئیں جو اُستاد بھل کے فرمودے پر پوری طرح اُترتی تھیں۔ وہ ... غضب ناک ہو گیا تھا۔ طیش کے عالم میں اُس کا دھڑ بے اختیار میرے ... اُوپر اُبھرا۔ میں نے فی الفور پوری طاقت سے اپنے گھٹنے اُس کے ... مار دیے۔ وہ گیند کی طرح اُوپر اُچھلا، میں چمک کر چشم زدن میں ایک ... ہٹ چکا تھا۔ وہ ایک ثانیے کی مدت میں تڑپ کر سیدھا ہوا ... کہ میں نے درمیان میں اُسے جالیا اور سینے کے بل دوبارہ زمین ... کا پابند کر دیا۔ میں اُس کی پُشت پر سوار تھا۔ اُس کا چھرے والا ہاتھ ... میں آچکا تھا۔ ویسے بھی وہ زمین پر بے بسی سے اوندھے منہ پڑا ہوا تھا اس ... کے ہاتھ دکھانے سے معذور ہو چکا تھا۔ میں نے اچانک اپنی گرفت ... اُس نے میری توقع کے مطابق نیچے کی طرف سے میرے جسم پر ایک ... دیا۔ میں اس جھٹکے کے لیے آمادہ تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ میں نے اپنا ... اُس کے ہاتھ پر لگا دیا ہے، اُس کے جھٹکے سے میں ایک طرف تو جا ... ہاتھ نہ چھوڑنے سے اُس کی کلائی کھنچ گئی۔ وہ تکلیف سے بلبلانے ... سے میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ میں نے اُس کے سینے پر نشست ...
"تم پوچھ رہے تھے کہ لڑکی کہاں ہے؟ اب تمھیں لڑکی کی کیا ... ہے؟ وہ کبھی وہاں واپس نہیں جائے گی۔" میں نے تحمل سے کہا۔
"لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ وہ گئی کہاں؟ اُسے ..." اُس کی آواز بالکل بدل گئی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا، کراہ رہا تھا۔
"کیوں؟" میں نے تلملا کر کہا۔ "آخر کیوں؟ جب تمہارا اُس ... تعلق ہی نہیں رہا اور تم سے کہہ دیا گیا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی ... پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟ تم اُسے اُس کے حال پر کیوں نہیں ...؟"
"کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ کرب سے بولا۔
"ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟ وہ تمہارے لیے مر چکی ہے ... تم اُسے کس طرح معاف کر سکتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔
"ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اُسے تلاش کرنا ہی ہے۔"
"تم اُس کی گرد بھی نہیں پا سکتے، میں تمہارے سینے میں ... دوں گا تاکہ تمہارے سردار کو معلوم ہو جائے کہ کورا کو بچانے والے ... زیادہ طاقت ور ہیں۔"
"مجھے مت مارو۔" وہ گڑگڑا کے بولا۔ "میں اُن کا ایک ... میرے جیسے بہت سے لوگ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تم تمام آدمیوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ پورے جانگ قبیلے کو ختم نہیں ...

... گا تو میری جگہ کوئی دوسرا اُس کی تلاش میں نکل آئے گا۔"
"تم ہندوستان کے کتنے گھروں کتنے تہہ خانوں میں جھانکو گے؟"
"پروہت کہتے ہیں کہ ایک دن وہ ضرور ملے گی۔"
"پروہت جھوٹ بولتے ہیں۔" میں نے نفرت سے کہا۔
"تو کیا، تو کیا وہ مر چکی ہے؟" اُس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔
میں نے اس بدزبان کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔ "وہ زندہ ہے اور ... ح تک زندہ رہے گی۔"
"تو پھر مجھے اُس کا پتہ بتا دو۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "اور میری بات کا ... کرو، میں اُس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اُس سے صرف کاغذات حاصل ... تبت چلا جاؤں گا اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔"
"کیسے کاغذات؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔
"وہ متبرک کاغذات جو اُجین کورا کے ہمراہ قبیلے سے لے آیا تھا۔ اُجین ... ہیرے جواہر کا ایک بڑا خزانہ بھی تھا۔ ہمیں اُس خزانے اور کورا سے ... دلچسپی نہیں ہے۔ ہمیں کاغذات درکار ہیں۔ تم نہیں جانتے، وہ کاغذات ... کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ردّی کے ٹکڑے ہیں مگر ہمارے ... کے لیے اُن کی حیثیت متبرک ہے۔ آج سے صدیوں پہلے ہمارے ... نے شاکیہ منی کے فرمودات اُن کاغذات پر لکھے تھے۔ شاکیہ منی اُس ... ہم لوگوں کے درمیان زمین پر موجود تھے۔ پھر وہ آسمانوں میں چلے گئے ... عقیدہ ہے کہ جب قبیلے میں وہ کاغذات محفوظ رکھنے کی طاقت نہیں ... یا وہ اپنی کوتاہیوں اور بے پروائیوں کے باعث ان سے محروم ہو ... گا تو قبیلے پر نحوست کے بادل منڈلانے لگیں گے، قبیلے میں خوں ریزی ... ہے گی۔ قبیلے کے سردار کے لیے لازم ہے کہ وہ یہ انمول دستاویزات ... دل میں رکھے، وہ قبیلے کی جانب سے اُن کا امین ہے، جب ایک سردار ... زوؤں میں طاقت نہیں رہتی تو اُسے ہونے والے سردار کو کاغذات ... کر کے اقتدار سے دست کش ہونا پڑتا ہے۔ قبیلے میں صرف بڑے پروہت ... اور سردار کو اس کا علم ہوتا ہے کہ یہ متبرک دستاویزیں کہاں چھپا کے رکھی ... ہیں۔ اُجین انھیں ہم سے چھین کے لے گیا۔ اُس وقت سے اب تک ہمارا ... قبیلے بہت سے آدمی کھو چکا ہے۔ کئی بار آسمانی آفتیں ہماری زمینوں ... نازل ہوئیں، ہم دانے دانے کو محتاج ہو گئے، ہر نئے سردار کے ساتھ قبیلہ ... وابستہ کرتا ہے کہ وہ متبرک کاغذات ضرور حاصل کرے گا۔ اُسے دس ماہ ... مہلت دی جاتی ہے مگر جب اس مدت میں وہ ناکام ہو جاتا ہے تو دوسرا سردار ... مقرر کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم متعدد سردار بدل چکے ہیں اور قبیلے میں ... بے یقینی بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ہمیں وہ کاغذات دوبارہ مل جائیں تو ... ہم صدیوں سے بلبر نہیں آئیں گے۔"
میں نے درمیان میں دخل نہیں دیا، اُسے بولنے دیا۔ اُس کی آنکھیں ... میدان لرزی اور گھگی کی غمازی کر رہی تھیں۔ اُس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا، زبان میں لکنت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے یہ انکشاف کرتے ہوئے سخت روحانی اذیت ہو رہی ہو۔ برسوں بعد اُسے ایک شخص ملا تھا جو اُس کے سامنے کورا کا نام لے رہا تھا۔ چھرے کی نوک اور موت کے خوف سے زیادہ اُس کے دل میں یہ اضطراب آمیز تجسس موجود ہوگا کہ میں ضرور اُس کی رہبری کر سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے مفاہمت کرنے اور اعتماد میں لینے کے لیے ہر کمزور بات ہر اہم انکشاف کرنے پر مجبور تھا۔ میرے لیے اب اس میں زیادہ کشش نہیں رہ گئی تھی۔ کورا کا نام اُسے پتہ تھا نہ مجھے۔ وہ جن کاغذات کی بات کر رہا تھا، وہ اباجان کی تحویل میں تھے اور مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ انھوں نے اُنھیں محفوظ بھی رکھا یا نہیں۔ میں اباجان کے موجودہ پتے سے بھی ناواقف تھا۔ میں اُس سے اور کیا بات کرتا؟ کاغذات کے بدلے کورا کا سودا کرتا تو کورا کہاں تھی۔ اُسے تو میرے مقدر نے مجھ سے چھپا دیا تھا اور کاغذات حوالے کر کے جانگ قبیلے کا سکون واپس کرنے اور کورا کو ایک عذاب ناک تعاقب سے نجات دلانے کی کوشش کرتا تو اباجان کہاں تھے۔ میری خاموشی پر وہ مجھ سے فریاد کرنے لگا۔ میں جست لگا کے اُس کے سینے سے اُٹھ گیا۔ "جاؤ، مجھے کچھ نہیں معلوم۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "خود میں بھی اُس کی تلاش میں ہوں، وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگئی ہے۔"
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ شاکیہ منی کی قسم، تم سب کچھ جانتے ہو۔" وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ "میں دنیا بھر کا خزانہ تمہارے قدموں پر ڈال سکتا ہوں۔ میرے قبیلے کا یقین مجھے واپس دلا دو۔ اُسے نحوستوں سے بچا لو۔"
میں نے ٹھوکر مار کے اُسے اپنے پیروں سے جدا کر دیا۔ وہ مجھ سے دولت کی بات کر رہا تھا۔ میرے لیے کورا کے بغیر ہر دولت بے کار تھی۔ میرے لیے کورا ہی سب سے بڑا خزانہ، سب سے بڑی دولت تھی۔ اُس پر دوبارہ وحشت کا دورہ پڑا۔ اُس نے حیرت انگیز پھرتی سے میرے سینے پر اپنا سر مارا، چھرا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اُس نے جھپٹ کر اُسے اُٹھا لیا، میں نے پھر مزاحمت ترک کر دی تھی۔ اُس کے سامنے کسی حیل و حجت کے بغیر تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میری بے حسی پر وہ ہراساں ہو گیا اور اُس کا بلند ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا۔ "تم اپنی طاقت ضائع کر رہے ہو، یہ چھرا پھینک دو اور انسانوں کی طرح بات کرو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔
"میں تمھیں قتل کر دوں گا۔" اُس نے طیش میں کہا۔
"تم کبھی یہ حماقت نہیں کر سکتے۔"
"تو مجھ پر رحم کرو۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، صرف وہ کاغذات میرے حوالے کر دو۔" وہ کبھی نرم پڑتا، کبھی گرم ہو جاتا۔ "نہیں تو۔" اُس نے پھنکار کے کہا اور دفعتاً میری گردن پر ہاتھ ڈال دیا، مالا ٹوٹ کر نیچے گر پڑی۔ اُس کے دانے فرش پر بکھر گئے۔ میرے خون میں رعشہ ہونے لگا۔ وہ میرے چہرے کی جانب متوجہ تھا کہ شاید اب میں اُس کے سامنے کوئی انکشاف کروں گا۔ اُس کی اِس بے خبری کے وقت میں نے اڑنگا مار کے اُسے

بے توازن کر دیا اور جب اُس کا چھرا میرے ہاتھ میں آیا تو نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ چھرا سیدھا اُس کے دل میں اُتر گیا۔ ابھی کُٹیا میں اُس کی بھیانک چیخ اُبھری ہی تھی کہ میں نے اُس کا منہ بند کر دیا۔ دوسرے وار میں اُسے چیخنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر وہ فرش پر تڑپا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے جلدی جلدی مالا کے دانے سمیٹے۔ ایک ایک کونے میں چراغ لے کے اُنھیں ڈھونڈا کہ کوئی دانہ رہ نہ جائے۔ پھر میں نے خون آلود چھرے سے اس کے لباس کا ایک حصہ کاٹ کے اس میں دانے احتیاط سے باندھ دیے۔ ایک کونے میں میرے پُرانے کپڑے پڑے تھے۔ راہبوں کا گیرا لباس اُتار کے میں نے وہی میلے اور شکستہ کپڑے پہن لیے۔ چھرا وہیں رہنے دیا۔ رات کو وہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ میں رات بھر میں کہیں سے کہیں پہنچ سکتا تھا۔ چار بجے ہوڑا ایکسپریس کلکتے کے لیے گیا اسٹیشن سے گزرتی تھی۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن اندازے کے مطابق ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے۔ میں آہستہ سے کُٹیا کے باہر آ گیا۔ بُدھ گیا کے مندروں اور مورتیوں پر سکوت طاری تھا، جیسے مورتیاں بھی کھڑے کھڑے بیٹھے بیٹھے نیند کی آغوش میں پہنچ گئی ہوں۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔ چند بدھ راہب آلتی پالتی مارے مراقبے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پیپل کے درخت کے نیچے چراغ جل رہا تھا۔ میں نے اپنے پیر زمین سے چپکا دیے اور بہت آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتا رہا۔ اگر میں راہبوں کے لباس میں ہوتا تو فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ باہر آنے کے بعد میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور درختوں کی اوٹ میں کبھی بھاگتا، کبھی ٹھہرتا اسٹیشن جانے والا راستہ کم کرتا رہا۔ پتا بھی کھڑکتا تھا تو دل لرز جاتا تھا۔ خود اپنے سائے سے ڈر لگتا تھا۔ اُس سائے نے راستے بھر مجھے بہت پریشان کیا جیسے کوئی میرے پیچھے لپک رہا ہو۔ میں بدحواسی سے پیچھے مڑ کے دیکھتا تو تاحدِ نظر تاریکی اور ویرانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ رات گہری نیند میں تھی۔

میں گیا اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرنے کے بجائے قریب ہی ایک سنسان جگہ بیٹھ گیا۔ ذہن کے پردے پر جیل کی بیرکوں، سنتریوں اور سلاخوں کا منظر بار بار اُبھر آتا تھا اور میرے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ میں نے راہبوں کے لباس میں چھپے ہوئے جانگ قبیلے کے اُس بدمعاش کو معاف کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا حالانکہ پہلے میرا ارادہ یہی تھا کہ کورا کا کم از کم ایک دشمن تو کم ہو جائے گا اور دوسرے لوگوں کو عبرت ہوگی۔ وہ اگر میری مالا نہ چھیڑتا تو شاید یہ نوبت نہ پہنچتی۔ وہ تو دیوانہ ہو گیا تھا۔ میں اسے مارتا نہیں تو وہ نہ جانے کہاں کہاں میرا پیچھا کرتا۔ اُس کے تمام ساتھیوں کی توجہ مجھ پر مبذول ہو جاتی۔ اُسے ختم کرنے کے بعد مجھے کوئی دکھ نہیں تھا بلکہ کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے اُجین جیسے شریف شخص کا بدلہ لے لیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ مجھے کچھ نہیں بتا سکتا تھا اور میں اُس کے دل میں ہمیشہ خلش کا سبب بنا رہتا۔ اُس کے لیے میری زندگی

اور میرے لیے اُس کی موت اہم تھی۔ وہ مجھے زندگی دے کے ایک نہ ختم ہونے والے عذاب سے دوچار کر دیتا۔ اب صبح پولیس آئے میری گم شدگی کے باعث قتل کا شبہ مجھ پر کیا جائے گا۔ مگر میں میں کہاں کا کہاں پہنچ چکا ہوں گا۔

میں نے پہلے ہی ہر طرف سے ناکام ہو کے کلکتے جانے کر لیا تھا۔ بُدھ گیا آ کے یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ کورا اپنے قبیلے نہیں پہنچی ہے۔ کاش میں گیا رُکنے کے بجائے سیدھا کلکتے چلا پھر نہ اپنا گھر غیروں کے ہاتھ میں دیکھ کے سینے کی جلن میں اضا نہ اُمی کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا، نہ اُس بدمعاش سے واسطہ پڑ پر چہل پہل ہونے لگی تو میں اپنی کمیں گاہ سے نکل کے باہر آیا اور کا سہارا لیتا ہوا خاص گیٹ سے اندر جانے کے بجائے ایک لمبا کے اسٹیشن پہنچ گیا۔ گاڑی صرف چند منٹ لیٹ تھی۔ میرے پاس چھدام بھی نہیں تھا۔ جسم پر راہبوں کا لباس ہوتا تو ٹکٹ چیکر سے آسانی ہو جاتی۔ گاڑی کے آخری سرے پر تیسرے درجے کے ایک مجھے بڑی مشکل سے جگہ ملی۔ میں وہیں فرش پر دروازے کے بیٹھ ہوئے مسافروں نے میرا حلیہ دیکھ کے پہلے منہ بنایا پھر آنکھیں موند لیں کے دوران میں گیا اسٹیشن پر گاڑی میں جگہ ملنا ایک مسئلہ ہوتا ہے آ کم تھی۔ اس لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ گاڑی نے گیا اسٹیشن کی تو بھاری تن و توش کے ایک شخص نے جماہی لیتے ہوئے مجھے اور بولا "ٹکٹ ہے؟" میں نے سوچا کہ میں یہی سوال اُس سے اُس کا نشتر برداشت کر کے میں نے آہستگی سے اقرار میں گردن گیا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں چنانچہ وہ مجھے ڈرانے اور کہ میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں ورنہ وہ مجھے ریلوے پولیس کر دے گا۔ وہ ریلوے ہی کا کوئی ملازم معلوم ہوتا تھا۔ میری چ کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ وہ مجھے ریلوے کے سخت قوانین سے ڈ کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی معلومات سے متاثر ہو کے بعض د اُس کی تائید کرنے لگے۔ گاڑی کی رفتار کے ساتھ بابو کی گفتار "دیکھو تو کیسا حیوان آدمی ہے۔ ہٹا کٹا ہے، جہاں پاؤں مارے آئے گا۔ اے بھائی! کچھ دوسری دنیا کا بھی خیال کر۔ کچھ کام کیا کر۔ یہ کی عادت پڑ گئی تو چار دن میں ماٹھا ڈھیلا ہو جائے گا۔"

دوسرے مسافر اُس کے طرزِ تکلم پر ہنسنے لگے۔ اب تک تھا اور محض ہوں ہاں کر کے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیتا تھا لیکن رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اس لیے میرا سارا جسم کھولنے لگا۔ "زبان کو لگام دو۔" میں نے بگڑے ہوئے تیوروں سے کہا۔ "تمہاری زبان سے نکلا تو میں تمہیں کھڑکی سے نیچے پھینک دوں گا۔" ڈبے میں ہر شخص کو سانپ سونگھ گیا جس نے بھی مجھ

میرے تیور دیکھ کے وہ آنکھیں مچرا کے کسمسانے لگا۔ ڈبے میں ہمت کی، کوئی آواز، کوئی جھنکار نہیں اُبھری۔ ایک صاحب نے دبے دبے لفظوں تک کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "اگر آپ پہلے بتا دیتے تو بات آگے نہ بڑھتی۔ بہر حال غصہ تھوک دیجیے۔ کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

میں نے کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اُنھی صاحب نے مجھے اپنی نشست پر جگہ دینے کی پیش کش کی۔ یہ پیش کش میں نے مسترد کر دی۔ پھر ڈبے میں مجھ سے کوئی نہیں بولا۔ وہ آنکھیں بند کرتے، پھر کھولتے اور چونک کے ایک نظر مجھے دیکھ کے دوبارہ آنکھیں بند کر لیتے۔ میری آنکھیں جاگ رہی تھیں بلکہ جل رہی تھیں۔ دُنیا میں آدمی کو خاموش نہیں رہنے دیا جاتا۔ آدمی سکون سے بیٹھا ہو تو لوگ اُسے بے سکون کر دیتے ہیں۔ اِس سے ثابت یہ ہوا کہ جب تک اونچی آواز میں نہ بولو کسی کو آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں اِس دنیا کا آدمی ہی نہیں تھا۔ جیل میں بے ہوشی کے سات سال گزارنے کے بعد شاید میں جیل سے باہر کی دنیا سے تعلق بہت کچھ بھول سا گیا تھا۔ اِس دُنیا اور اِس دُنیا کی زندگی سے رفتہ رفتہ مانوس ہو رہا تھا۔ اِس چھوٹے سے واقعے نے میرے ذہن پر بڑا اثر ڈالا اور یہاں کی زندگی کے بارے میں میری یادداشت واپس آنے لگی۔

گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہری۔ میں نے کھڑکی سے جھانک لینا مناسب سمجھا۔ ٹکٹ چیکر تیز تیز قدموں سے اسی طرف آ رہا تھا۔ میں مقابل کا دروازہ کھول کے نیچے اُتر گیا اور اندازے کے مطابق درمیان کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ٹکٹ چیکر کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہوئے مختلف اسٹیشنوں پر میں بار بار ڈبے بدلتا رہا۔ صبح آسنسول کے اسٹیشن پر میری نگاہ نے ایک اور منظر دیکھا۔ پولیس کا ایک دستہ مختلف ڈبوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ مجھے جاڑا سا آ گیا۔ صبح سویرے جاگ جانا بدھ راہبوں کا معمول تھا۔ میری کُٹیا میں میرے بجائے جب اُنھیں ایک لاش ملی ہوگی تو اُنھوں نے فوراً علاقے کے منتظم کو خبر کی ہوگی۔ پھر تار برقی کے سلسلے دوڑ گئے ہوں گے۔ کلکتے کے راستے میں تمام بڑے اسٹیشنوں پر فون کے ذریعے اطلاع دی جا سکتی تھی۔ پولیس نے اندازہ لگا کے جگہ جگہ میرا حلیہ نشر کر دیا ہوگا کہ چار بجے گیا سے گزرنے والی ہوڑا ایکسپریس قاتل کے فرار کے لیے بے حد سود مند ہوگی۔ میں گاڑی سے اُتر گیا اور انجن سے کچھ آگے آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ اُنھیں ضرور کسی کی تلاش تھی۔ معمول کے خلاف آسنسول اسٹیشن پر گاڑی زیادہ دیر تک ٹھہری رہی۔ پھر انجن نے سیٹی دی تو میں نے اپنی رفتار اور سست کر لی۔

یہ جگہ پلیٹ فارم سے خاصی دور تھی۔ یہاں تک آتے آتے گاڑی نے رفتار پکڑ لی تھی۔ میں پہلے ہی تیار کھڑا تھا حالانکہ یہ ایک خطرناک جست تھی مگر جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے میں نے طوفان کی طرح بھاگتے ہوئے ایک ڈبے کا ڈنڈا پکڑ لیا اور اُس سے لٹک گیا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا اس لیے ڈنڈے پر ہاتھ پھسلنے لگا۔ میں نے اُس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ میرا

جسم دو ہاتھوں پر لٹکا ہوا تھا اور گاڑی کا تیز شور دل دہلائے دیتا تھا۔ سب سے نچلے پائدان پر میرا ایک پیر کسی نہ کسی طرح ٹک گیا تھا۔ خوش قسمتی سے دروازے کے برابر کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے ڈنڈے سے ایک ہاتھ ہٹا کے اُسے پکڑ لیا۔ دفعتہً کھڑکی میں ایک نوجوان لڑکی کا چہرہ اُبھرا، وہ دہشت سے چیخی پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے دروازہ کھول دیا اور دروازے پر اُس کے ساتھ ایک عورت بھی نمودار ہوئی۔ کھڑکی پر ہاتھ ٹکا کے میں خود کو متوازن کر چکا تھا اور دوسرے پائدان پر پاؤں رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُن دونوں نے ہاتھ بڑھا کے مجھے کھینچ لیا۔ "کیا مرنے کا ارادہ تھا؟" عورت نے منہ بگاڑ کے کہا۔

"گاڑی روانہ ہو چکی تھی۔" میں نے شرمساری سے کہا۔

"کون ہو تم؟" وہ نخوت سے بولی۔

"میں بھی آپ ہی کی طرح ایک مسافر ہوں۔ مجھے اگلے اسٹیشن تک یہاں پناہ لینے کی اجازت دے دیجیے۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"یہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ ہے۔" وہ طمطراق سے بولی۔

"جی میں نے دیکھ لیا ہے۔ میں یہیں دروازے پر بیٹھا رہوں گا۔ آپ اطمینان سے آرام کیجیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے آرام میں مخل ہوا۔" میں نے نظریں جھکا کے ندامت سے کہا۔ "اگلے اسٹیشن پر اُتر جانا۔" وہ تحکمانہ لہجے میں گویا ہوئی۔

ڈبے میں اُن دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں جدید فیشن کے سیاہ برقعوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اُن کے نقاب اُٹھے ہوئے تھے۔ کسی مرد کے بغیر اُن کا تنہا سفر کرنا ایک حیرت انگیز بات تھی لیکن زمانہ بدل گیا تھا۔ کلکتے میں تو اور بدلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں دروازے کے قریب فرش پر اپنا جسم سکیڑ کے بیٹھ گیا۔ جب ذرا سانس قابو میں آئی تو مجھے اُن کے چہرے دیکھنے اور اُن کے بارے میں کچھ سوچنے کا شعور آیا۔ میری نظریں عورت کے چہرے پر ٹک گئی تھیں۔ یہ شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ مجھے اپنی جانب اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے عورت بے قرار ہونے لگی۔ اُس نے نفرت سے منہ پھیر کے کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ اسے کہاں دیکھا ہے؟ بہت قریب سے دیکھا ہے مگر کہاں؟ کس جگہ؟ میں مسلسل ذہن پر زور دے رہا تھا لیکن کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ہاں اُس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی کا چہرہ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ کالے برقعے میں قمقمے کے مانند چمک رہا تھا۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں نیلاہٹ کی آمیزش تھی۔ اُس کے بالوں کی کئی لٹیں پیشانی پر بکھری ہوئی تھیں اور کھڑکی سے آنے والی تیز ہوا میں اُڑی اُڑی جاتی تھیں۔ اُس کے نقوش تیکھے، رنگ گلابی اور ہونٹ ترشے ہوئے تھے۔ جب اُس کی نظریں مجھ سے ٹکرا جاتیں تو وہ بہت گھبراتی اور اپنی لمبی اُنگلیاں مروڑنے لگتی اور پلکیں جھکا لیتی۔ میں بھی کچھ یہی کرتا۔ وہ بار بار کہیں کھو جاتی۔ پھر چونک کے اردگرد دیکھتی۔ اسی عالم میں اُس کی اور میری نظریں چار ہو جاتیں۔ میں نے اُس کی اُداسی

اور سوگواری صاف محسوس کر لی تھی جیسے اسے سفر کی صعوبتوں کی عادت نہ ہو، جیسے وہ تھک گئی ہو، جیسے اُس نے گھر سے پہلی بار قدم نکالا ہو۔

کھڑکیوں سے بوندیں اندر آنے لگیں۔ عورت نے اُٹھ کے کھڑکی بند کر لی اور مُنہ پر ہاتھ رکھ کے جماہی لینے لگی۔ اِس بار پھر بے اختیار میری نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور جب میں نے اُسے پہچانا تو پہچانتا چلا گیا۔ مجھے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ سات سال میں اُس کے چہرے پر صرف معمولی ردّ و بدل ہوا تھا جسے اُس نے غازے کی تہہ میں چھپانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ میری آنکھوں میں سوزش سی ہونے لگی۔ میری ساری رگیں تن گئیں اور خون شریانوں میں اُبلنے لگا۔ وہ کریم گل کی چچی تھی، خود ساختہ پاپیشہ ور انہ چچی۔ کلکتے کے ہوٹل میں اُس نے مجھ پر بڑی نوازشیں کی تھیں۔ کورا پر تو وہ جی جان سے فدا تھی۔ چہرے مُہرے سے وہ اب بھی کوئی بیگم نظر آتی تھی۔ اُس نے کورا کو فروخت کر دینے کا سودا کر لیا تھا۔ میں اُسے کیسے بھول سکتا تھا؟ اُس نے میری عزت، میری ناموس نیلام پر چڑھا دی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اُس کی آنکھیں نکال لوں اور اُس کی زبان کاٹ لوں۔ میں نے اُسے خوب پہچان لیا تھا مگر اُس نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا تھا کیونکہ سات سال میں میری وضع قطع بہت تبدیل ہو گئی تھی۔ اُسے دیکھ دیکھ کے میں خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ فرسٹ کلاس میں تنہا سفر کرنا، ساتھ میں ایک نوجوان لڑکی۔ گویا اُس کا کاروبار اچھا چل رہا تھا۔ مجھے وہ لڑکی کورا کی طرح معصوم لگی۔ بے بس، گرفتار۔ میں نے سوچا کہ یہ کسی معزز خاندان کی لڑکی ہو گی جو اِس ذلیل عورت کے پھندے میں نہ جانے کس طرح پھنس گئی ہے۔ اُس کا چہرہ مضطرب تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے ڈر لگ رہا ہو گا۔ آگے نہ جانے کیا ہو؟ پشیمان ہو رہی ہو گی۔ گھر واپس جانے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گا مگر پیچھے کا تمام راستہ مٹا ہوا نظر آ رہا ہو گا۔ چند لمحوں میں ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اُن دونوں کے درمیان عزیزوں جیسا ربط ضبط معلوم نہیں ہو رہا تھا بے ساختگی کے بجائے ایک جھجک تھی۔ میری عقل خبط ہو گئی۔ گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ میں چھُرا بھی کٹیا میں چھوڑ آیا تھا ورنہ اُس کے سینے میں بھونک دیتا۔ میں شعلوں میں گھِرا بیٹھا تھا۔

"بیگم صاب! کچھ کھانے کو ہو گا؟" میں نے اپنی زبان پر بمشکل قابو پاتے ہوئے التجا آمیز انداز میں کہا۔

اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اِس بار اُس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور طنطنے سے بولی۔ "بھوکا ہے؟"

"جی!" میں نے بے تابی سے گردن ہلا کے جواب دیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" اُس نے ٹھسّے سے پوچھا۔

"کلکتے۔ روزگار کی تلاش میں۔"

اُس نے کنڈیا میں سے کچھ بسکٹ اور پوریاں نکال کے میری طرف بڑھا دیں۔ مجھے بہرصورت اُنھیں زہر مار کرنا تھا۔ میں نے بسکٹ اور پوریاں اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لیں اور بے تحاشا منہ میں ٹھونسنے لگا۔ چچی کے لبوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ "اطمینان سے کھا۔" اُس نے نرمی سے کہا۔ "کہاں سے آ رہا ہے؟"

"بنارس سے بیگم صاب!" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"بنارس میں کیا کرتا تھا؟"

"کوئی ایک کام کیا ہو تو بتاؤں؟ پر قسمت خراب ہے بیگم صاب! پہلے ایک ہندو سیٹھ کے ہاں نوکر تھا۔ وہ مر گیا تو اپنا کام بگڑ گیا۔ کیا گیا، اپنی قسمت بھی ساتھ لیتا گیا۔"

"کچھ پڑھنا لکھنا آتا ہے؟"

"بس جی اپنا نام لکھ لیتا ہوں۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"پتہ نہیں کہاں ہیں بیگم صاب! سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجھے تو ہندو سیٹھ کسی میلے سے پکڑ کے لایا تھا۔ بہت خاطر کرتی تھی اپنی۔ اب وہ مزہ کبھی نہیں آئے گا۔ مسلمانوں سے نفرت کرتا تھا لیکن خیال رکھتا تھا۔ جتنے بھی اچھے اچھے پکوان پکتے تھے، وہ مجھے کھلاتا۔" میں بولتا رہا مگر میرے ہی لفظ میرے دل پر گھونسے مارتے رہے۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا، بہت جبر کیا، تب کہیں اپنا لہجہ بدلنے پر قادر ہو سکا۔ اُس نے میری کہانی میں خاصی دلچسپی لی۔ لڑکی بھی گوش بر آواز تھی۔ "نام کیا ہے رے تیرا؟" چچی نے پوچھا۔

"فقیر دین۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

"فقیرے!" وہ اونچی آواز میں بولی۔ "کلکتے میں کسی کو جانتا ہے یا یوں ہی مُنہ اُٹھائے چل پڑا ہے؟"

"بس چل پڑا ہوں بیگم صاب! اللہ میاں کوئی سبب بنائے گا۔ اتنی بڑی جگہ ہے، کہیں نہ کہیں تو سر چھپانے کو جگہ مل جائے گی اور میاں نے منہ چیرا ہے تو کھانے کو بھی دے گا۔ اب دیکھیے نا، دانے دانے پر مُہر لگی ہوتی ہے۔ آج آپ کا دانہ قسمت میں لکھا تھا، کھینچ کر یہاں لے آیا۔"

"تو باتیں تو خوب کرتا ہے پر تو کلکتے میں کام کیا کرے گا؟ وہ تو بڑی نامراد جگہ ہے۔ میں کہتی ہوں واپس چلا جا بنارس ہی میں تلاش کر۔"

"اب چل دیا تو چل دیا بیگم صاب!" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تیری مرضی۔ یہ بتا تجھے کون سا کام پسند ہے؟"

"مجھے کسی کام میں عار نہیں ہے۔ بھوکے کو کیا چاہیے، دو روٹی۔" زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ جیل سے آنے کے بعد اب تک میں نے اتنی باتیں نہیں کی تھیں اور جیل کی مہمانی میں بھی کہاں کی تھیں۔ ایک کمین عورت تھی۔ وقت اور مقام دونوں بُرے تھے۔ پولیس مستعد ہو گئی تھی۔ بردوان کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس بار صرف پلیٹ فارم پر موجود ہو، وہ دونوں طرف کھڑی ہو کے اُترنے والے مسافروں پر نظر رکھ سکتی تھی۔ اگر میں چچی سے ایسی باتیں شروع نہ کرتا تو مجھے اگلے اسٹیشن پر اُترنا پڑتا، پھر پولیس کی زد سے بچ کے دوبارہ کسی ڈبے میں چڑھنا پڑتا۔ ایک شخص جس کے پاس سفر کا ٹکٹ بھی نہ ہو، جو پولیس کو مطلوب ہو اور جس کا حلیہ بھی مشکوک ہو اور جس کے لیے فرار کے راستے محدود ہوں، وہ کیسی کیسی بدترین مفاہمت پر نہ اُتر آئے گا۔ چچی سے اسی حال میں ملاقات ہونا سہ گیا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ کلکتے اُترتے ہی میرا رُخ جیل کی طرف ہو گا۔ وہاں میں کریم گل سے ملوں گا اور اُس سے اُس شیطان کا پتہ پوچھوں گا جو سات سال پہلے سینما میں کریم گل اور چچی سے کورا کا سودا کر رہا تھا۔ اُسی نے ہمارے پیچھے بدمعاش لگائے ہوں گے۔ اب دو ہی امکانات تھے۔ یا تو کورا اُن غنڈوں کے ہاتھ لگ گئی ہو گی جنھوں نے اُس رات ہم پر حملہ کیا تھا یا اُسے مولوی صاحب لے گئے ہوں گے اور آج کریم گل کے بجائے براہِ راست اُس کی چچی سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ اُس کے سامنے کریم گل کی حیثیت تو محض ایک کارندے کی تھی۔ چچی اُس سے کہیں زیادہ مشّاق اور مجھتہ کار عورت تھی۔ خیریت گزری کہ چچی مجھے پہچان نہیں سکی۔ اگر پہچان جاتی تو واقعات مختلف انداز سے پیش آتے۔ ممکن تھا کہ میں اُسے کھڑکی سے پھینک دیتا۔ اندھیری رات میں اونگھتے ہوئے مسافروں کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کس گنہ گار کے بوجھ سے گاڑی کا وزن کم ہو گیا ہے۔ دوسرے میں نے چچی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر، غصّے کے باوجود ہر طرح لڑکی کا جائزہ لے کے گفتگو کی ابتدا کی۔ میرا یہ یقین بتدریج پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اس لڑکی کی حیثیت کورا سے مختلف نہیں ہے۔ یہ بھی کہیں سے خواب دکھا کے لائی گئی ہے، کسی بے غیرت نے اسے بیچ دیا ہے یا یہ اپنے حالات سے تنگ آ کے چچی کی خواب آور باتوں پر ایمان لے آتی ہے۔ میں نے کورا کا کرب دیکھا تھا۔ میں نے جیل میں ایک نمبری بدمعاشوں سے بے ضمیری اور انسانیت سوزی کے ہزاروں واقعات سُنے تھے۔ مجھے اُس کی منزل معلوم تھی۔ "سُن بھئی فقیرے!" چچی نے کندھے اُچکا کے کہا۔ "بنارس اور کلکتے میں بہت بڑا فرق ہے۔ بنارس کی دُنیا اور ہے، کلکتے کی اور۔ کلکتے میں تجھے نئی نئی باتیں سُننے کو ملیں گی۔ تیرا دیدہ پھٹ جائے گا۔ اب اگر تو مجھ سے حامی بھرے کہ تو میرے اشاروں پر چلے گا، میری مرضی کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھائے گا تو میں تیرے لیے کچھ سوچ سکتی ہوں۔"

"بیگم صاب! بیگم صاب!" میں نے مچل کے کہا۔ "میں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ آپ رات کو دن کہیں گی تو میں بھی اُسے دن کہوں گا۔ آپ دن کو رات کہیں گی تو میری پھوٹی زبان پر ایک بھی لفظ شکایت کا نہیں آئے گا۔ بس آپ ہاں کر دیجیے۔ کہہ دیجیے نا۔"

"بھئی دیکھ فقیرے!" چچی نے گھبراتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے نہیں جانتی۔ تیرا اگلا پچھلا مجھے کچھ نہیں معلوم مگر تو انسان کا بچہ لگتا ہے اس لیے اعتماد کرتی ہوں۔ مجھے تیری جوانی پر ترس آ رہا ہے۔ بنارس میں ہندو بنیے کے ہاں حلوے مانڈے کھانے سے تیرے چہرے پر یہ جو رنگ پھوٹا پڑتا ہے، میں اِس کا ذمہ تو نہیں لیتی، پر تجھے اپنے گھر بھی سب کچھ نصیب ہو گا۔ خدا نے ہر چیز دی ہے لیکن بس ایک بات گدّی میں دھر لے کہ میں کسی چیز پہ کوئی اعتراض پسند نہیں کرتی۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ ہم لوگ پُرانے چونچلوں اور بناوٹی رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں ہیں۔ ہم فیشن بھی کرتے ہیں اور جی بھر کے دُنیا کا مزا بھی لیتے ہیں۔ سمجھا؟ کچھ آیا دماغ میں؟"

"سب کچھ آ گیا۔" میں نے جوش سے کہا۔ "بس جی پھر اپنے تو مزے آ گئے بیگم صاب! آپ مجھے ہر معاملے میں دو قدم آگے پائیں گی۔ جس کھونٹ کہیں گی، بگٹٹ بھاگوں گا لیکن......" میرا چہرہ لٹک گیا۔

"لیکن کیا فقیرے! کیا تنخواہ کی بات کر رہا ہے؟"

"نہیں بیگم صاب!" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب تو میں نے خود کو آپ کے قبضے میں دے دیا ہے بیگم صاب! بس ایک غلطی ہو گئی۔" میں نے اٹک اٹک کے کہا۔

"کیسی غلطی؟" وہ چونک کے بولی۔ "کچھ منہ سے تو پھوٹ۔"

"گیا اسٹیشن پر ایک ہندو سے لڑائی ہو گئی تھی۔" میں نے منمناتے ہوئے کہا۔ "اُس نے میری ماں کو گالی دے دی تھی۔ میں برداشت کر گیا۔ پھر نہ جانے وہ کیا کیا اول فول بکتا رہا۔ میں چپ رہا۔ پھر اُس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔ بس مجھے غصّہ آ گیا۔ میں نے اُسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ اُس کا خون بہنے لگا۔ آدمی کوئی بڑا تھا۔ پولیس میں رپورٹ کر دی گئی۔ اب پولیس مجھے اسٹیشن اسٹیشن پکڑنے کی فکر میں ہے۔"

"تو لڑتا جھگڑتا بھی ہے؟" اُس نے ناگواری سے کہا۔

"بس بیگم صاب! غصّہ آ گیا۔ دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

"خیر آدمی کو کبھی کبھی لڑتے جھگڑتے بھی رہنا چاہیے۔"

"اب وہ بردوان اسٹیشن پر پھر میری تلاش میں آئیں گے۔ اسی لیے میں کچھ دیر کے لیے باہر جاؤں گا اور دوبارہ آپ کی خدمت میں یہیں آ جاؤں گا۔"

"آنے دے اُنھیں، تجھے کھا تھوڑی جائیں گے۔"

"ان پولیس والوں کا دین ایمان کچھ نہیں ہوتا بیگم صاب! میں اُن کے سامنے آنا ہی نہیں چاہتا۔" میں نے مضطرب ہو کے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا رے، بردوان تک اطمینان سے بیٹھا رہ۔" یہ کہہ کے چچی نے مٹّی کے برتن سے مٹھائی کا ایک دونا نکال کے مجھے دیا۔ میں نے بے ڈھنگے پن سے اُسے سلام کیا۔ لڑکی میری داستان اور بے چین باتیں حیرت اور حسرت سے سُن رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ میرے کسی جملے پر مسکرانے کی کوشش کرتی اور پھر اداسی میں ڈوب جاتی۔ "یہ چھوٹی بیگم آپ کی بہن ہیں؟" میں نے چچی سے لڑکی کے متعلق پوچھا۔ بیٹی کا لفظ میں

نے دانستہ استعمال نہیں کیا تھا۔ چچی نے جس طرح ایک بار کورا کی بلائیں لی تھیں اسی طرح اُس کی تھوڑی پکڑ کے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ چچی کی اس وارفتگی پر لڑکی کا رنگ سُرخ ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں شرم کے ڈورے پڑ گئے۔ "یہ میری زندگی ہے، یہ میرا سہارا ہے۔" چچی نے اُسے بازو سے پکڑ کے خود سے قریب کر لیا۔ لڑکی دُہری ہو گئی۔

بردوان اسٹیشن تک میں اُس سے بنارس کی باتیں کرتا رہا پھر جب پلیٹ فارم پر گاڑی سُست پڑنے لگی تو چچی نے میری طرف دیکھ کے لیٹرین کی جانب اشارہ کیا۔ اس کے سوا اُس کے ذہن میں مجھے چھپانے کے لیے کوئی ترکیب ہی نہیں آسکی تھی۔ میں وہاں چلا گیا۔ پھر ڈبے کے اندر کون آیا؟ کون گیا؟ میں اس تمام روداد سے بے خبر رہا۔ پلیٹ فارم سے اُٹھنے والا شور اتنا تیز تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پولیس والوں نے کھڑکی سے جھانک کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والی ان دو برقع پوش معزز خواتین سے ادب کے ساتھ پوچھا ہو گا کہ انھوں نے اپنے ڈبے میں کوئی شخص تو نہیں دیکھا؛ چچی کے تیور بگڑ گئے ہوں گے اور پولیس والے کوئی جواب دیے بغیر آگے نکل گئے ہوں گے۔ اندر میرا دم گھٹتا رہا۔ ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ میں کریم گل کی تو چچی کی مٹھی میں بند تھا۔ میں نے سوچا کہ فرض کرو اُس نے یہ بہروپ مجھے پہچان کر بھرا ہو اور پولیس کے انتظار ہی میں بیٹھی ہو؟ مجھے جھرجھری آگئی۔

بردوان اسٹیشن سے گاڑی کی روانگی میں خاصی تاخیر ہوئی میرے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ خدا خدا کر کے جب گاڑی نے حرکت کی تو میرے اوسان بحال ہوئے۔ پھر چچی کی دستک پر میں باہر نکلا۔ "آئے تھے وہ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"آئے تھے اور جیسے آئے تھے، ویسے ہی چلے گئے۔" چچی مسکرائی۔

"کیا کہتے تھے؟" چچی اکیلے میں یقیناً مجھ پر احسان جتانے کے لیے باتیں بنا سکتی تھی مگر لڑکی کی موجودگی میں مبالغے سے کام نہیں لے سکی۔ اُس نے صرف یہ کہا۔ "بس بیٹھ جا آرام سے، کاہے کی فکر کرتا ہے۔ تیرے لیے جھوٹ بولنا پڑا۔"

میں نے احسان مندی کے طور پر اُسے سلام کیا۔ میری سادگی پر وہ کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ لڑکی اُس کی ہنسی میں شریک نہیں ہوئی۔ جیسے جیسے کلکتے کا فاصلہ گھٹ رہا تھا، لڑکی کے چہرے پر دھند سی چھاتی جا رہی تھی۔ کسی اسٹیشن پر ٹھیرنے کے لیے گاڑی کی رفتار مضمحل ہونے لگی۔ میں نے دوبارہ چھپنے کے لیے پر تولے۔ "بیٹھا رہ۔" چچی نے حکم دیا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ "کہاں تک تلاش کریں گے۔ بس اب نچلا ہو کے بیٹھ جا۔"

چچی کا اندازہ درست تھا۔ پتہ نہیں، وہ کون سا اسٹیشن تھا۔ وہاں پولیس کا کوئی ہرکارہ ڈبے کی طرف نہیں پھٹکا۔ دو اسٹیشنوں پر مطلوبہ ملزم کی تلاش میں ناکامی کے بعد انھوں نے ہار مان لی ہو گی اور یہ قیاس کیا ہو گا کہ ملزم گیا سے رات کو جانے والی ہوڑا ایکسپریس میں سوار ہو گیا ہو گا۔

وہ اتنی ہی تگ و دو کر سکتے تھے۔ ممکن ہے، انھوں نے شبہے میں ... مسافروں کو پکڑ بھی لیا ہو۔ پولیس خانہ پُری کو سب سے زیادہ ... ہے لیکن ابھی گاڑی ٹھیرے ہوئے چند ہی منٹ گزرے ہوں ... ہٹے کٹے آدمی نہایت بے تکلفی سے کھڑکی پر کھڑے ہو گئے۔ مجھے ... کہ اُن کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ شکل و صورت سے اُن کے ... نظر آ رہے تھے۔ میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ ایسے ہی لوگوں کی ... گزارا تھا۔ ایک کچھ لمبا اور دوسرا اوسط قد کا تھا۔ وہ معمولی کپڑے ... تھے۔ "خیریت تو ہے؟" لمبے قد کے آدمی نے چچی سے پوچھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" چچی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اُس آدمی نے میری جانب آنکھ کا اشارہ کیا۔ چچی نے ... سے اُسے مطمئن کرنا چاہا لیکن وہ چچی کی خاموش زبان سمجھ نہیں سکا ... آنکھوں میں ایک دم شعلے لپکے اور وہ مجھے گھور کے دیکھنے لگا۔ چچی کی طرف بازو بڑھا کے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پہلے تو اُسے ... لیکن پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ لڑکی نے اُن دونوں کے آنے ... منہ پھیر لیا تھا اور چہرے پر نقاب ڈال لی تھی۔ وہ چچی کے یہ اشا... نہیں دیکھ سکی تھی۔ چچی کے ملازموں کے سامنے وہ بے پردہ ... ہونا نہیں چاہتی ہو گی۔ ظاہر ہے چچی نے اُسے یہ بتایا ہو گا کہ اُس ... خدام چل رہے ہیں۔ پہلے مجھے تعجب تھا کہ چچی جیسی جہاں دیدہ ... جوان لڑکی کے ساتھ تنہا کیسے سفر کر رہی ہے۔ دونوں خادموں کی آنکھوں ... میرے لیے خشونت اور حقارت بھری ہوئی تھی۔ چچی نے پان دان ... اُن کے لیے گلوریاں بنائیں اور مجھ سے پوچھا۔ "کھاتا ہے؟" ... بڑھا دیا۔ مدتوں بعد پان کھانے کو ملا۔ آخری پان بھی سات، ... اسی نے کھلایا تھا۔ میرے ہونٹ لال ہو گئے۔ چچی نے دیکھ... ہوئے کہا۔ "کم بخت کے لب کیسے رچ گئے ہیں۔" اس تبصرے ... پہلو بدل کے میری طرف یاس بھری نظر کی اور خود لال ہو گئی۔ جیسے ... ہزاروں پان کھلا دیے گئے ہوں۔ کلکتے تک آنے والے ہر اسٹیشن ... خدام حاضری لگا جاتے اور مجھ پر نفرت برساتے ہوئے رخصت ... میں سارے وقت فرش پر بیٹھا رہا۔ اونگھ بھی نہیں آئی۔ چچی اور ... درمیان بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں نے چچی کی غفلت کا بہت ... کہ وہ اِدھر اُدھر ہو تو میں لڑکی سے کچھ بات کروں مگر کسی بھی ... آنکھ نہیں لگی اور نہ اُس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔

ہوڑا اسٹیشن پر گاڑی فاتحانہ انداز میں داخل ہوئی۔ آ... سنبھل کا کوئی آدمی ہوتا تو وہ مجھے پہچان سکتا تھا جب میں یہا... جا رہا تھا تو مجھے سارے مل گیا تھا۔ اِن دنوں پتہ نہیں اسٹیشن ... میں کس کی ڈیوٹی ہو گی۔ مجھے یہ خوف بھی تھا کہ بردوان اور آسا... طرح پولیس ہوڑا اسٹیشن پر ایک آخری کوشش کر ڈالنے کا

...سی خوف کے باعث میں نے سامان چچی کے محافظوں اور قلی کو نہیں ... نے دیا بلکہ بڑھ کے بستر بند، سوٹ کیس، کنڈیاں اور تھیلے خود اپنے ہاتھوں ... ہوں پر اٹھا لیے۔ کندھوں پر رکھے ہوئے سامان سے میرا چہرہ بڑی حد ... چھپ گیا تھا۔ میں تو چچی کے پیچھے پیچھے اُن کے نقوشِ قدم پر چلتا ہوا ... حفاظت باہر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ خادموں نے جلد سے ... ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ ٹیکسی آگئی تو وہ مجھے ٹیکسی سے اتار کے خود ... بیٹھنا چاہتے تھے لیکن چچی نے انھیں دوسری گاڑی میں بیٹھنے کا ... دیا کیونکہ اُسے کلکتے میں میرے کھو جانے کا ڈر تھا۔ ٹیکسی روانہ ... در خاصا سفر طے کر کے درمیانے درجے کے ایک چھوٹے سے بنگلے کے ... جا کے ٹھیری۔ اُس علاقے میں ہر طرف چھوٹے بڑے بنگلے بنے ... تھے۔ ہم بنگلے میں پہنچے۔ میں تو چچی کی شان و شوکت دیکھ کے دنگ ... میں نے سامان کمرے میں رکھ دیا۔ بنگلے میں قیمتی فرنیچر موجود تھا۔ تمام ... سجے ہوئے تھے۔ ایک بڑا سا ڈرائنگ روم تھا۔ اُس کی سجاوٹ پر خاص ... گئی تھی۔ یہاں آ کے لڑکی کچھ اور گھبرا گئی تھی۔ اُس کی نظریں کسی ایک ... ٹک رہی تھیں۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر بنگالی ملازم تھا اور ایک بوڑھی ... تھی۔ چچی کی آمد پر اُن دونوں نے مسکرا کے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ... اُن سے میرا تعارف کرا کے فیصلہ کن اور حکمیہ لہجے میں کہا کہ "یہ لڑکا ... ہمارے ساتھ رہے گا۔ اس کے لیے کوٹھڑی کا بندوبست کر دو۔ یہ ہمارے ... کام کیا کرے گا۔"

چچی لڑکی کو اپنے ساتھ اندر کے کمروں میں لے گئی۔ میں نے پہلی بار ... زبانی لڑکی کا نام سُنا۔ اُس کا نام زریں تھا۔ دونوں خادم ڈرائنگ ... آ کے بیٹھ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد چچی بھی لباس تبدیل کر کے اُن ... پہنچ گئی۔ چچی نے اب ایک کسی ہوئی ساڑی پہن لی تھی اور ہلکا ... میک اپ بھی کر لیا تھا۔ اُس کا رنگ بہت اجلا تھا اور اس عمر میں بھی ... ایک طلسم والی جاذبیت تھی۔ میں نے سوچا کہ اُس لڑکی کے ... اور اُسے آگاہ کروں کہ وہ کن لوگوں کے درمیان آ پھنسی ہے ... اس اقدام کا موقع نہیں آیا تھا۔ پورے سفر میں اُس نے مجھ سے ایک ... نہیں کی تھی۔ دونوں ملازم چچی سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد چلے ... پھر چچی زریں کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ برقع میں تو اُس کے ... روپ کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ اب غرارے، جمپر اور دھانی دوپٹے ... کچھ اور ہی لڑکی نکل کے آئی تھی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ... بدن چمپئی اور جیسا قوسِ تراش کر بنایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ "بھئی اب بولو، ... بات چیت کرو۔ تم نے تو چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے۔ دیکھو، یہ ریڈیو، ... گراموفون ہے۔ اللہ کا شکر ہے، اس گھر میں ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ ... کیا ہوا اٹھاؤ اور برتو۔" چچی نے ناز سے کہا۔ زریں بس مسکرا کے رہ گئی ... یہ نیا نیا گھر ہے، دل لگتے لگتے لگے گا۔ مجھے تمھاری چپ کھائے

ڈالتی ہے۔ کچھ ہنسو، بولو، ناچو گاؤ۔ ہر بات ذہن سے نکال دو۔" میں وہیں بیٹھا تھا۔ چچی نے مجھے ڈانٹ کے بھگا دیا۔

گھر میں کھانے کا ایک الگ کمرہ تھا۔ اُس کمرے میں ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ چچی سچ کہتی تھی کہ اس گھر میں آسائش کی ہر چیز موجود ہے۔ بنگالی ملازم کا نام راجو تھا۔ اُس نے شام تک میرے کپڑے دھو دیے۔ میں جب نہا دھو کے اور لباس تبدیل کر کے چچی کے سامنے خدمت بجا لانے کے لیے پہنچا تو وہ حیران رہ گئی۔ زریں نے بھی بہت غور سے مجھے دیکھا۔ پھر رات تک بنگلے میں کئی موٹریں آ آ کے رکیں۔ چچی نے مہمانوں کو پورے احترام سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مشروبات سے اُن کی تواضع کی۔ میں ہر وقت وہاں گھسا ہوا نہیں رہ سکتا تھا مگر جیسے بھی بنا، میں ڈرائنگ روم کے اندر باہر کی سُن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ کمرے میں ہنسی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چچی نے زریں کو کسی کے سامنے نہیں بلایا۔ ابھی وہ اُسے نئے ماحول سے مانوس کرنا چاہتی ہو گی۔ پہلے ہی دن اجنبی لوگوں کے ساتھ اُسے بٹھا دینا اُس کے نزدیک مصلحت کے خلاف ہو گا مگر وہ کسی بھی وقت اُس کا سودا کر سکتی تھی۔ اُسے ہر قسم کے گاہک آسانی سے مل جاتے ہوں گے۔ کچھ ایسے ہوں گے جنھیں سدھی ہوئی لڑکیاں پسند ہوں گی اور کچھ ایسے ہوں گے جو خود سدھانے کا فن جانتے ہوں گے۔ کورا کے معاملے میں تو اُس نے عجلت دکھانے کی کوشش کی تھی لیکن زریں کورا سے کچھ زیادہ عمر کی تھی۔ اُس کی عمر اٹھارہ اُنیس برس ہو گی اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ چچی کے گھر میں تھی اس لیے چچی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ اُس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی فکر میں ہو گی۔ اس مدت میں اُس کا تجربہ خاصا وسیع ہو گیا ہو گا۔ اُس نے نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔ بہر حال مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد زریں کی انواع و اقسام کی غذاؤں سے تواضع کی گئی۔ پھر کیرم بورڈ سجا دیا گیا۔ زریں کی دل جوئی اور دل بستگی کے لیے ہر طرح ریاضت کی گئی۔ میں بہت چوکا ہوا تھا لیکن درمیان میں زریں کی بات آگئی۔ ورنہ میں باورچی خانے میں رکھے ہوئے لمبے چاقو کی نوک پر چچی سے اُس بدمعاش کا پتہ کبھی کا پوچھ چکا ہوتا۔ جس سے اُس نے کورا کو فروخت کرنے کا معاملہ طے کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ زریں جیسی سادہ اور معصوم لڑکی چچی کی بے باکی، بے حجابی اور گھر کے آزادانہ ماحول سے جلد اکتا جائے گی، بوکھلا جائے گی۔ اگر میں ابھی سے اُس پر چچی کی بے حیائی اور درندگی کا راز فاش کر دیتا تو اُسے یقین نہ آتا بلکہ وہ الٹا میری شکایت کر کے سارا کام بگاڑ سکتی تھی۔ اس لیے پہلے چچی کے بارے میں اُس کا مشکوک ہو جانا ضروری تھا اور ظاہر ہے کہ میں اُسے بوری میں چھپا کے تو کہیں لے جا نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ ایسی کوشش کی تھی تو اُس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا تھا۔ اُس وقت تو کورا کی مرضی شامل تھی اور وہ ہر طرح مجھ میں شامل تھی۔ پھر بھی راستے میں ہر جگہ کانٹے بو دیے گئے تھے۔ اُس وقت تو میری جیب بھری

ہوئی تھی اور لباس بھی ڈھنگ کا تھا مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا میں زرّیں کی مرضی کے خلاف اُسے ساتھ لے کے گھر سے باہر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ جس بدمعاش کی مجھے تلاش ہے، وہ چچی کے ہاں ایک نئی لڑکی کی آمد کا ذکر سُن کر خود اس طرف آ جائے۔

سوتے وقت چچی نے مجھے اپنے پیر دبوانے کے لیے طلب کر لیا۔ یہ بات بڑی انوکھی تھی مگر چچی کے ہاں ہر چیز جائز تھی۔ مجھے بڑی جھجک ہوئی۔ پھر بھی قہرِ درویش برجانِ درویش، مجھے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ میرا جی چاہا کہ میں اُس کے پیروں کی انگلیوں کے بجائے ناخن کھینچ لوں مگر میں ضبط کیے ہوئے نہایت احتیاط سے اُس کے پیر دباتا رہا۔ زرّیں اُس کے ساتھ ایک پلنگ پر نیم دراز تھی۔ چچی نے مجھے ڈانٹا۔ "کم بخت ہاتھوں میں دم نہیں ہے کیا؟ ذرا زور سے داب، سارے بدن کی جان نکلی ہوئی ہے۔" یہ سُن کے زرّیں نے اِس خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ "نا نا۔" چچی نے اٹھلا کے کہا۔ "یہ نازک ہاتھ پیر دبانے کے لیے نہیں، چوڑیاں پہننے، مہندی لگانے اور پیار کرنے کے لیے ہیں۔" میں نے زور زور سے اُس کے پیر دبانے شروع کر دیے۔ "ہاں، اب ٹھیک دبا رہا ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "ابھی اپنی نوکری پکی مت سمجھو، جب تک میں تجھے اچھی طرح دیکھ اور پرکھ نہ لوں گی، کوئی پکی بات نہیں کروں گی۔"

دوسرے روز میں نے گھر کے کاموں میں زیادہ تن دہی سے حصّہ لینا شروع کر دیا اور ہر چیز چمکا دی۔ کرسیاں، الماریاں اور شیشے کے برتن۔ اِس طرح میرے کام اور میری زبان سے چچی مطمئن ہونے لگی۔ شام کو چار بجے وہ ٹیکسی منگوا کے اور زرّیں کو ساتھ لے کے گھر سے کہیں جانے لگی۔ میں اُس کے پیچھے پڑ گیا۔ "بیگم صاحب! مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔ کلکتہ دیکھ لوں گا، موٹر میں بیٹھوں گا۔" میں نے بچوں کی طرح ضد کی۔ اُسے مجھ پر ترس آ گیا اور اُس نے اپنے ساتھ مجھے بھی گاڑی میں بٹھا لیا۔ ٹیکسی کلکتے کی سڑکوں پر گھومتی رہی۔ چچی زرّیں کو وکٹوریہ گارڈن لے گئی۔ وہ پہلے مجھے اور کورا کو بھی اسی جگہ لائی تھی۔ ہم خوب گھومے اور آخر تھکے ہارے گھر واپس ہوتے۔ دوسرے دن زرّیں کچھ کچھ کھلنے لگی۔ میں بیشتر وقت اُس کے قریب گزارنے کی جستجو میں رہا۔ رات کو بھی موٹریں آئیں اور مہمان چچی کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کے چلے گئے۔ پھر رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھ گئی۔ تین دن بعد صرف ایک بار چچی اکیلی کہیں باہر گئی۔ میرے لیے یہی وقت مناسب تھا۔ میں زرّیں کے پاس بیٹھا اُس سے مختلف باتیں کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے کچھ بات کرے گی، اپنے بارے میں مجھے کچھ بتائے گی لیکن وہ تو صرف سرد آہیں بھرتی رہی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اتنا اعتماد تو مجھے ہو گیا کہ زرّیں مجھے ایک بے ضرر، خدمت گزار اور وفا شعار شخص سمجھنے لگی ہے۔ تین دن تک میں نے جی جان سے چچی کی خدمت کی تھی۔ "زرّیں بیگم! آپ سے ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔" میں نے آخر جرأت کر ہی لی۔ میرا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اُس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "آپ ہی کے فائدے کی ایک بات ہے۔" میں نے زور دے کے کہا۔

"کہو۔" وہ آہستگی اور سنجیدگی سے بولی۔

"پہلے ایک وعدہ کیجیے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے ک[illegible]

"کیسا وعدہ؟"

"یہ وعدہ کہ میں جو کچھ کہوں گا، اُسے آپ اپنے ہی تک محدو[illegible] گی۔ میرے خلوص پر شبہ مت کیجیے۔ میں آپ سے کچھ کارآمد باتیں کرنا چا[illegible]

"ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتی ہوں۔" وہ تجسس سے بول[illegible]

"آپ کو اپنی سب سے عزیز چیز کی قسم، میں جو کچھ کہوں [illegible] اُس کا ذکر کرنے سے پہلے تصدیق کر لیجیے گا کہ میں نے سچ کہا ہے یا [illegible]

"تم بات تو بتاؤ۔" وہ اکتا کے بولی۔

"آپ۔ آپ مجھے کسی معزز اور شریف خاندان کی لڑکی معل[illegible] ہیں۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "لیکن آپ بُرے لوگوں میں پھنس [illegible]

اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "کیا؟" وہ سٹ پٹا کے بولی۔ "[illegible] بارے میں کہہ رہے ہو؟"

"ان لوگوں کے بارے میں جو آپ کو یہاں تک لائے ہ[illegible] مضبوط لہجے میں کہا۔ "آپ بہت معصوم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم، وہ کون [illegible] تھے کہ آپ کو یہاں تک آنا پڑا۔ آپ بیگم صاحب کو کب سے جانتی [illegible] جواب دینے میں گریز ہوا۔ میں نے کہا۔ "زیادہ دنوں سے نہیں۔ آ[illegible] یقیناً یہی ہو گا۔"

"ہاں۔ زیادہ دنوں سے نہیں۔" وہ حواس باختہ ہو گئ[illegible]

"میں جانتا ہوں۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"تم کیسے جانتے ہو؟" اُس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"میرے جاننے کی بات بعد میں پوچھیے گا۔ پہلے یہ بتا[illegible] یہاں آنے پر تیار کیسے ہوئیں؟ دیکھیے، آپ کو یہ بتانے میں ج[illegible] لیکن بہر حال میرا مقصد آپ کے نجی حالات جاننا نہیں ہے۔ [illegible] بروقت ایک خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ باقی آپ جا[illegible] کا کام۔ آپ نے بہت بُرا کیا جو گھر سے چلی آئیں۔ چند ہی دنو[illegible] کو پتہ چل جائے گا کہ آپ کن مصیبتوں میں گھر گئی ہیں۔ میں کہتا ہ[illegible] بھی واپس چلی جائیے۔"

"مگر میں کیسے جا سکتی ہوں؟ گھر کے دروازے ت[illegible] مجھ پر بند ہو گئے ہیں۔" اُس نے کرب سے کہا۔ "میں تو کہیں بھ[illegible] نہیں جا سکتی۔"

"آپ کے والدین آپ کو پھر گلے لگا لیں گے۔"

"میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ میں اپنے باپ کی اک[illegible] اُن کا انتقال ہو گیا تو خالو مجھے اپنے گھر لے گئے لیکن پھر انھو[illegible]

[illegible] نے میری زندگی عذاب کر دی۔ پھر ایک دن تمھاری [illegible] بچوں [illegible] صاحب سے میری ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے ہمارے پڑوس میں گھر [illegible]رکھا تھا اس لیے اُن کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہو گیا اور جب انھوں [illegible] مجھ پر ٹوٹنے والے ظلم و ستم دیکھے تو پریشان ہو گئیں۔ وہ مجھ سے [illegible] ہمدردی کرنے لگیں۔ شاید خالو مجھے اس لیے برداشت نہیں کرتے [illegible] کہ میں اپنے باپ کی تمام جائداد کی تنہا وارث تھی۔ بہر حال میں وہاں [illegible] تکلیف میں تھی۔ اس لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بیگم صاحب کے ساتھ [illegible] آئی۔ انھوں نے مجھے اُس جہنم سے نکالا۔ میرے ساتھ بڑی مہربانی سے [illegible]س آئیں۔ اب تم اُن کے بارے میں ایسی باتیں کر رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں، آپ ایک جہنم سے نکل کے دوسرے جہنم میں [illegible] ہیں۔ پہلے والے جہنم میں کم سے کم آپ کی عزت تو محفوظ تھی مگر یہاں [illegible]ی چیز محفوظ نہیں ہے۔ میں آپ سے اتنی بات نہ کرتا لیکن میں چونکہ [illegible] اس جہنم سے گزر چکا ہوں۔ اس لیے زبان بند نہ رکھ سکا۔"

"کیا تم بیگم صاحب کو پہلے سے جانتے ہو؟"

"چونکہ آپ اخفائے راز کا وعدہ کر چکی ہیں اس لیے یہ بتا دینے [illegible] کوئی حرج نہیں ہے کہ ہاں میں انھیں پہلے سے جانتا ہوں اور اچھی طرح [illegible]تا ہوں۔"

"لیکن وہ تو تمھیں نہیں جانتیں؟"

"ہونہہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "انھیں اگر چہرے یاد رہتے اور انسانو[illegible] کوئی ہمدردی ہوتی تو وہ مجھے ضرور پہچان لیتیں۔ اب وہ مجھے بھول گئی ہیں۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ نے اس ماحول پر غور نہیں کیا؟ بیگم صاحب نے آپ کی [illegible]ھوں پہ غلاف ڈال رکھا ہے۔ آپ ذرا غلاف اٹھا کے دیکھنے کی [illegible]ش کیجیے۔ رات کو یہاں جو لوگ آتے ہیں، ذرا اُن کی اور بیگم صاحب کی [illegible]ں سننے کی کوشش کیجیے گا۔ پھر مجھ سے بات کیجیے گا۔"

اُس کی زبان گنگ ہو گئی۔ میں نے اُسے بیٹھے بٹھائے خوف زدہ [illegible] سراسیمہ کر دیا تھا۔ "کیا تم ..... وہ نہیں ہو.....؟" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "تم نے [illegible] ان کی نوکری کی ہے اور تم.....؟"

"ہاں نوکری کی ہے اور سُن لیجیے کہ صرف آپ کی وجہ سے کی ہے۔"

"میری وجہ سے؟"

"جی ہاں آپ کی وجہ سے۔ بیگم صاحب کے ساتھ آپ کو دیکھ کے [illegible] بڑے بہت سے دکھ تازہ ہو گئے۔ اب آپ کو کیا کیا بتاؤں.....؟" میں [illegible] نے ایک لمبی سانس لے کے کہا۔

اچانک برآمدے میں کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں فوراً اُس [illegible] کے پاس سے اُٹھ بیٹھا۔ میں نے چلتے چلتے اُسے تاکید کی کہ اگر وہ اپنے وعدے [illegible] برقائم رہی اور اُس نے میری باتوں کی تصدیق کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور کان کھڑے رکھے تو امکاناً اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس بات پر اُس کا تاثر دیکھنے کا وقت بھی نہیں ملا۔ چچی کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے بھاگ کر باورچی خانے میں پناہ لی۔ زرّیں تو کورا کی طرح سفید کاغذ تھی۔ وہ میری باتیں بڑی حیرانی سے سُن رہی تھی مگر چچی کا رنگ اتنا ہلکا نہیں ہوتا تھا کہ دھوپ سے اتر جائے۔ ویسے میں اُس کے لیے ایک بالکل نیا آدمی تھا۔ اُس کے نزدیک ابھی میرے مقابلے میں چچی کی حیثیت زیادہ مستند اور محترم تھی۔ چچی بہر حال اُسے ایک خرابے سے بچا کے لائی تھی لیکن اگر میں کسی اور اچھے موقع کا انتظار کرتا تو کس امید پر کرتا۔ چچی کا کیا بھروسا تھا۔ اگر زرّیں نے اُس سے میرے بارے میں کچھ کہہ بھی دیا اور چچی نے مجھے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دینے کا حکم دے دیا، تب بھی مجھے اسے بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

چچی کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اُس کا چہرا اُس کے پیشے کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ بھاری بھر کم جسم اور کلّے ٹھٹے کی عورت تھی۔ چچی نے اُسے بڑے کمرے میں بٹھایا اور زرّیں کو ساتھ لے کے اندر آ گئی۔ میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر منڈلانے لگا۔ آنے والی عورت کی گونج دار آواز اچانک بلند ہوئی۔ "چشمِ بد دور۔ یہ ہے وہ؟ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ اس بار تو نسترن خانم! تم نے ہم سب کو شکست دے دی۔ بھئی یہ لڑکی تو اب ہماری ہو گئی۔"

"تمھاری ہی ہے۔" چچی فراخ دلی سے بولی۔ اُس کا نام مجھے پہلی بار معلوم ہوا۔ "میں نے کب انکار کیا ہے۔" پھر وہ زرّیں سے مخاطب ہوئی۔ "آئیے آداب کرو۔ جب ہے، تمھارے سامنے کون بیٹھا ہے؟ یہ کلکتے کی نامی گرامی بیگم ہیں — مہتاب بیگم۔" میں نے جھانک کر دیکھا۔ زرّیں نے اُسے آداب کہا۔ مہتاب بیگم نے جواباً اُسے سینے سے لگا لیا۔

چچی نسترن خانم نے باورچی کو آواز دی۔ باورچی اس طرف آیا تو مجھے اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا اس لیے میں باقی حال دیکھ اور سُن نہیں سکا۔ مہتاب بیگم دیر تک بیٹھی رہی۔ پھر نسترن زرّیں کو اُس کے کمرے میں بھیج کے مہتاب بیگم کو بڑے دروازے تک رخصت کرنے گئی۔ موقع اچھا تھا مگر میں جان بوجھ کر زرّیں کے کمرے میں نہیں گیا۔ پھر نسترن خود بھی کہیں باہر چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک آتا تھا، ایک جاتا تھا۔ دوسرے دن صبح تک خیریت رہی۔ زرّیں نے نسترن سے میرے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ میرے ساتھ نسترن کا رویّہ بدستور نرمی اور اپنائیت کا تھا۔ البتہ زرّیں کچھ اداس ہو گئی تھی۔ جب کبھی میرا اور اُس کا سامنا ہوتا، میں اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھتا۔ وہ گردن جھکا لیتی۔ اُسی دن شام کو جاتے کے وقت نسترن نے ایک بار پھر زرّیں سے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "بی بی! یہ تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ رنگ اُڑتا جا رہا ہے۔ کیا تجھے کسی چیز کی ضرورت ہے؟ کیا تجھے کسی سے کوئی شکایت ہے؟

باکوئی ملازم تیرا کہنا نہیں مانتا؟ مجھے بتا کہ آخر کیا بات ہے؟ میں تیرے لیے
نیا بھر کی خوشیاں خرید لوں گی۔"

زریں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "نہیں، یہاں ہر چیز موجود ہے،
مجھے تو کوئی غم نہیں ہے۔"

"اب اپنا وہ مچھلی بازار بھول جا بی بی! توبہ توبہ تیرے ساتھ کیسا
بُرا سلوک کرتے تھے وہ لوگ۔ میں جب بھی خیال کرتی ہوں، میرے رونگٹے
کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"بھول ہی گئی ہوں۔" زریں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"اور یہ تو اندر کیا چھپی بیٹھی رہتی ہے۔ کچھ باہر بھی آیا جایا کریگی!
اس مکان میں صرف ایک کمرہ تھوڑی ہے۔"

"جی۔" زریں اُس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"تو یہاں کھڑا کھڑا منہ کیوں تکتا رہتا ہے؟" اچانک نسترن میری
طرف متوجہ ہو گئی۔ "کچھ بی بی کا بھی خیال رکھا کر، اس کی خدمت کیا کر۔"

"میں تو بہت کہتا ہوں بیگم صاحب!" میں نے فدویانہ انداز میں کہا۔
"مگر زری بی کو تو کمرے میں بند پڑے رہنے کی عادت ہے۔"

"نہیں، نہیں بس بہت ختم ہو چکا۔" نسترن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
"آج سے کمرہ بند۔ شام کو میرے دو منہ بولے بھائی آ رہے ہیں، اُن کے مجھ
پر بڑے احسانات ہیں، اُن سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ آج شام اُن کے
ساتھ بائسکوپ چلیں گے۔ زریں! تم اپنے سب سے اچھے کپڑے پہن لینا۔
سمجھیں، میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"جی۔" زریں نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "میری طبیعت کچھ
ٹھیک نہیں ہے۔ آج آپ ہو آئیے۔ مجھے مردوں کے ساتھ جاتے ہوئے
شرم آتی ہے۔" زریں نے جرأت کر کے کہا۔

"کون مرد؟" نسترن کچھ تلخی سے بولی۔ "بی بی! وہ اپنے بھائی ہیں،
چاہے سگے نہ ہوں مگر کیا عزیزوں سے کم ہیں۔"

"پھر بھی میرے لیے تو اجنبی ہیں۔" زریں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اجنبیت تو ختم کرنے سے ختم ہو گی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ
دیا تھا میری لاڈلی کہ یہ کلکتہ ہے، فیض آباد نہیں ہے، لکھنؤ نہیں ہے۔ یہاں
تم وہاں کی باتیں کرنے لگیں تو بس کام ہو گیا۔ اری ننھی بی! میری جان!
جب میں تمھاری عمر کی تھی، اُس وقت میرا بھی یہی حال تھا۔ اب عمر گزرنے
کے بعد پتہ چلا کہ سارا وقت کیسے ڈھکوسلوں، کیسے ڈھونگوں میں گزر گیا۔"

زریں کا یہ بدلا ہوا انداز نسترن کے لیے تازیانہ ثابت ہوا۔ اُس
نے اتنی باتیں کیں، ایسی نرمی، گرمی، تلخی اور شفقت سے باتیں کیں کہ زریں
کے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ پھر اُس دن نسترن غیر
متوقع طور پر کہیں باہر گئی۔ میں اسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس لیے جھٹ
زریں کے کمرے میں پہنچا۔ وہ سسک سسک کے رو رہی تھی۔ "رونے

سے کچھ نہیں ہوگا زریں!" میں نے یہ پروا نہیں کی کہ میں اُسے کہ پہنچ گیا۔ نسترن سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کے دونوں بھائیوں کی پشتیں میری
میں مخاطب کر رہا ہوں۔ "اب تم نے زیادہ نہ سہی، کچھ نہ کچھ اندازہ جانب تھیں۔ نسترن کی رازدارانہ نگاہ پر اُن کی آوازیں ایک دم ماند ہو گئیں۔
لیا ہوگا۔ میں اِس وقت صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تم اُن مردوں کے سارے دونوں نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گئی
جانا جنھیں بیگم صاحب نے اپنے منہ بولے بھائی بتایا ہے۔ تم صرف بلکہ پیالیوں میں ایک چھنا کا ہوا۔ نسترن ہنس کر بولی "نیا نیا ہے، ہر وقت
تاکہ تمھیں میرے انکشاف پر مکمل یقین ہو جائے۔ گھبرانے کی کوئی بات ہوا میں اُڑتا رہتا ہے۔"
نہیں ہے۔ میں یہیں موجود ہوں اور ہاں یقیناً تم مجھ پر بھی شبہ کرتی میرے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ میں پورے سات سال کے بعد اُس
کیونکہ میری عمر، میرا حلیہ اور میرے کپڑے میری باتوں کی نفی کرتے شخص کو دوبارہ دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی بدمعاش تھا جس نے ایک رات سینما
یقین کرو، تم جس طرح خود پر اعتبار کر سکتی ہو، اُسی طرح مجھ پر نسترن سے کورا کی فروخت کے سلسلے میں بھاؤ تاؤ کیا تھا۔ کریم گل نے
اور باقی معاملہ اپنے خدا پر چھوڑ دینا۔ سمجھیں۔ تم نے بیگم صاحب کے ہوٹل میں قسمیں کھا کھا کے کہا تھا کہ اُس کے غنڈوں نے ہمارے ہوٹل سے
کے مجھ پر اور خود پر احسان کیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمھارے رہنے کے بعد صرف اُس وقت تک ہمارا تعاقب کیا تھا جب تک
پورا اُتر دوں۔ اب تمھیں کیا بتاؤں کہ میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتا ہوں۔ ٹیکسی نظر آتی رہی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اُسے کوئی خبر نہیں تھی۔
بس اپنا خیال رکھو، میں یہی کہنے آیا تھا۔" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔ مل کے ساتھیوں نے صحیح بات اگلوانے کے لیے کریم گل کی چمڑی اُدھیڑ
زریں نے لرزتی ہوئی پلکیں اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھوں دی تھی مگر اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کام کریم گل کا نہیں، کسی
سے چہرہ ڈھانپ کے رونے لگی۔ "رونا بالکل بند۔" میں نے اُس کا ارادہ کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کام اُس شخص کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا، جو
ہو کے کہا۔ "رونے سے کام اور بگڑ جائے گا۔ تمھیں تو یہ تاثر دینا چاہیے اُس وقت یہاں موجود ہے۔ اُس رات سینما میں اس نے اور اُس کے
اس ماحول میں بہت تازگی محسوس کر رہی ہو۔" ساتھ والی عورت سچی بی نے جن ہوس ناک نظروں سے کورا کی پذیرائی کی
"میں اُن مردوں کے سامنے نہیں جاؤں گی۔" وہ رقت سے بولی، وہ میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ اُن کے تیوروں سے اندازہ
"آج کے بعد مت جانا۔" میں چاہتا ہوں، تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے ہوتا تھا کہ وہ کورا کو نسترن سے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی
دیکھ لو۔ میں قریب ہی کہیں موجود رہوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔" ممکن تھا کہ اُسے میرے اور کورا کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہو یا اُس نے
نے سارے نوکروں کو چوکنا رکھا ہوگا۔ اپنے رویے سے کسی قسم کا اظہار اور کورا کو مولوی صاحب کے ساتھ کہیں بازار وغیرہ میں دیکھ کے
تعاقب کیا ہو۔ میں اندر سے ٹھٹک رہا تھا۔ اس لیے مجھے میز تک پہنچنے
میں اُس کے کمرے سے نکل آیا۔
نسترن خانم کا کوئی بھی وفادار ملازم اُسے میرے بارے میں بڑی دشواری ہوئی۔ میرے پیر من من بھر کے ہو گئے تھے۔ دل کی
کر سکتا تھا۔ ویسے ابھی تک تو بات ٹھیک چل رہی تھی۔ چائے کی رفتار اچانک بندسی ہو کے تیز ہو گئی تھی۔ پھر بھی میں نے خود کو سرزنش کی
نسترن کا اچانک گھر سے باہر جانا کسی خطرے کی علامت ضرور تھا۔ قابو میں رہتے ہوئے اُن دونوں کو سلام کیا۔ وہ میری جھجک پر ہلنے
کا زندگی میں بے شمار لڑکیوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ لڑکیوں کے سے۔ دونوں تنومند تھے۔ میرے مطلوب شخص کا رنگ روپ خاصا بدل گیا
مزاجوں سے خوب آشنا ہو گئی ہوگی۔ آج اُس نے زریں کے سر کے بال اور اُڑ گئے تھے۔ ہاتھ میں کڑا بھی نہیں تھا۔ وہ لباس
ترشی محسوس کر لی ہوگی۔ نسترن کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آ گئی۔ معقول پہنے ہوئے تھا۔ کیوں نہ پہنتا، ایسے نامعقول لوگوں کو معقول
جھنجلائی ہوئی تھی۔ آج اُس نے مجھ پر بھی ملائمت کی وہ نظر لباسوں کی کیا کمی؟ اُس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اُس کے ہونٹوں پر تلوار
اب تک ڈالتی رہی تھی۔ پھر جب اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو گیٹ کی مانند کھنچی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں بہت تیز چمک تھی۔
ہوئے بوڑھے جاٹ ملازم نے اُسے اُس کے دونوں بھائیوں دوسرا شخص سفید شیروانی میں ملبوس تھا اور تن و توش کے اعتبار سے چوڑے
کی اطلاع دی۔ وہ اُن کے استقبال کے لیے دوڑتی ہوئی دروازے تک گئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ سرخی مائل تھا۔ انگریزی بال نفیس تراش
پہنچی۔ ڈرائنگ روم کی تمام بتیاں روشن کر دی گئیں۔ باورچی خانے سے آراستہ کیے گئے تھے۔ وہ اگر خود کوئی نواب نہیں تو کسی نواب
حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ کچھ شیرینی کا انتظام کرلے۔ میں بھی اُسی وقت صاحب ضرور معلوم ہوتا تھا۔ نسترن کو اپنے گاہکوں کی قسموں کا خوب
کی خاطر باورچی خانے میں مصروف تھا مگر ڈرائنگ روم میں جانے کو اندازہ ہوگا کہ کون سی لڑکی کے لیے کس قسم کے گاہک سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔
تڑپ رہا تھا۔ وہاں کچھ دیر بعد ہی جانا مناسب تھا۔ باورچی نے خانم: ہماری بے چینی کب دور ہوگی؟" نواب زادے نے کہا۔
کرلی تو اُس کے بجائے میں خود چائے کی ٹرے لے کے ڈرائنگ "گھبرائیے نہیں مرزا صاحب!" خانم کے بجائے وہ بدمعاش بولا۔

"پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ ہمیں یقین ہے، چاند میاں کہ تم اس
بار بھی ہمیں تباہ کرواؤ گے۔" نواب ہنس کر بولا۔

کم سے کم مجھے اُس بدمعاش کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ میں وہاں زیادہ
دیر ٹھہرنے کی غرض سے خود چائے بنانے لگا۔ نواب نے بے جا مداخلت کی۔
"بھئی خانم! ہم تو آپ کے ہاتھ کی چائے پییں گے۔"

"ذرا دیکھیے تو سہی۔" خانم نے ایک ادا سے کہا۔ "نفیر! کیسی عمدہ چائے
بناتا ہے۔ میں اندر جا رہی ہوں۔ ذرا سنبھل کے بیٹھیے اور سینے پر بائیں جانب
ہاتھ رکھ لیجیے۔"

"تسلیم ہے۔" نواب اپنے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "خانم! آپ بھی
کچھ کم نہیں ہیں۔ آپ کا ہم سے بڑا قدر دان کون ہوگا۔"

"چلیے، جانے بھی دیجیے۔ اب بہار چلی گئی ہے تو آپ کے چونچلے
شروع ہو گئے۔" خانم نے اُٹھتے ہوئے کہا مگر کچھ سوچ کے پھر بیٹھ گئی۔ اُس
نے مجھے حکم دیا۔ "جا ذرا بانو سے جا کے کہہ کہ اندر کیا چھپی بیٹھی ہیں، باہر آئیں،
میرے محسن بھائی آئے ہیں۔" خانم نے میرے ہاتھ سے پیالی چھین لی۔

میں دروازے سے باہر جا کے آگے بڑھنے کے بجائے وہیں ٹھہر رہا۔
اندر چاند میاں کہہ رہا تھا۔ "خانم! چھوکریوں کے انتخاب میں تو دور دور تک
تمھارا کوئی ثانی نہیں، یہ چھوکروں پر تمھاری نظر کب سے پڑنے لگی ہے، چھانٹ
کے لائی ہو۔ خیال رکھنا۔ اس کے چہرے سے یہ جھاڑ جھنکار مت ہٹوانا ورنہ
سمجھ لو، چھوکریاں باہر جانے سے انکار کر دیں گی۔"

"چلو ہٹو، کچھ مرزا صاحب کا بھی خیال کرو۔" خانم کی آواز آئی۔ "تمھاری
یہ عادت کبھی نہیں جائے گی۔ موقع بے موقع زبان خرچ کرتے رہتے ہو۔ بس
اب وہ آنے ہی والی ہے۔ ذرا احتیاط سے بیٹھو اور خبردار، اُس کے سامنے
کوئی اول فول بات مت کرنا۔"

میں نے زریں کے کمرے میں جا کر اُسے خانم کا حکم سنایا۔ زریں نہایت
بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔ شاید نسترن نے اُس کی آرائش و زیبائش
میں خاص طور پر دل چسپی لی تھی۔ وہ ایک دلھن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ وہی
غرارہ تھا اور تنگ جمپر۔ سر پر دوپٹا تھا۔ دو چوٹیوں میں سے ایک آگے
کی طرف پڑی ہوئی تھی۔ میں مبہوت رہ گیا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔" اُس
نے منہ پھیر کر کہا۔

"چلی جاؤ زریں! چلی جاؤ۔ میری مانو اس وقت یہی مناسب ہے۔
میں تمھیں کوئی غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ کبھی کبھی آدمی کو حالات سے سمجھوتا
کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ سمجھ لینا کہ ایک بُرا خواب دیکھا تھا جو کبھی شرمندہ تعبیر
نہیں ہوگا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

"ایک طرف تو تم منع کرتے ہو، دوسری طرف مجھے وہاں بھیجنے
کے لیے بھی مُصر ہو؟" وہ اضطراب سے بولی۔ "میرا جی وہاں جانے کو نہیں چاہتا۔"
"جی تو میرا بھی نہیں چاہتا مگر مجبوری ہے زریں!" میں نے نرمی سے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟" اُس نے ایک غیر متعلق سوال کیا۔
"میں کوئی بھی ہوں لیکن ہوں تمہارا غم خوار۔ خدارا اِس وقت میرے بارے میں مت سوچو۔ تمھیں پہنچنے میں دیر ہو گی تو بیگم صاحب خود اندر آجائیں گی۔"

وہ بہت مشکل سے آمادہ ہوئی۔ میں اُسے ساتھ لے کے چلا۔ اُس کا لباس خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ سن کے نسترن لپکی اور اُسے شانے سے پکڑ کے اس طرح آگے لے چلی جیسے دلہنیں لے جائی جاتی ہیں۔ نواب مرزا اور چاند میاں کے دیدے پھٹ گئے۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت سے ہو گئے۔ چاند میاں کی پتلیاں اُس کی آنکھوں میں پارے کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ اُس نے مرزا کا ہاتھ پکڑ کے کوئی سرگوشی کی۔ تب کہیں مرزا ہوش میں آیا۔

"میں نے ان دونوں سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا دیا ہے۔" نسترن نے چہک کے زرّیں سے کہا۔ "انھیں تسلیمات کرو۔"

"آداب!" زرّیں کا سیدھا ہاتھ اُٹھتے ہوئے کپکپا گیا۔

"تسلیمات، تسلیمات۔" مرزا کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "ہم نے جب سے آپ کا تذکرہ سنا ہے، آپ کو دیکھنے کے لیے طبیعت بے قرار تھی۔ ماشاءاللہ، ماشاءاللہ گویا خانم نے آپ کی تعریف میں بخل سے کام لیا تھا۔"

زرّیں نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔ نسترن اشتیاق سے اُن دونوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُن کے چہروں پر تو بس حیرت چھائی ہوئی تھی۔ زرّیں کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے شاید اُن دونوں کے چہرے تک نہیں دیکھے ہوں گے۔ "خانم باجی! آپ نے شاید انھیں بتایا نہیں کہ آپ سے ہمارا کیا رشتہ ہے؟" چاند میاں نے زبان کھولی۔ "یہ تو ہم سے اچھی خاصی اجنبیت برت رہی ہیں۔"

"میں نے بتا دیا ہے لیکن یہ تو فطری شرم ہے۔ اب تم ٹھہرے کلکتے کے آدمی۔ اس گڑیا کو تو ابھی یہاں کی آب و ہوا سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا۔"

"ہمیں نہیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں ایسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہم زرّیں بانو کے لیے تو کچھ بھی نہیں لائے۔" نواب مرزا بے قراری سے بولا۔ "خالی ہاتھ چلے آئے۔" اُس نے شیروانی کا بٹن کھول کے اندرونی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ "خانم! آپ ہماری طرف سے یہ پانچ ہزار روپے رکھیے اور زرّیں کے لیے ان کی پسند کے مطابق ایک بہت عمدہ ساتحفہ خریدیے۔"

"ارے نہیں مرزا بھائی! زرّیں بھی یہیں ہے آپ بھی یہیں ہیں۔ دسیوں موقع آئیں گے۔" نسترن نے گڈی واپس کرتے ہوئے کہا۔

"بھلا آپ کون ہوتی ہیں درمیان میں دخل دینے والی؟ یہ ہمارا اور زرّیں بانو کا معاملہ ہے۔" مرزا کو اپنی جگہ قرار نہیں تھا۔

"اچھا تو دیکھیے زرّیں سے پوچھ لیجیے۔ کیوں زرّیں؟" ز
زرّیں کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی
زرّیں نے پہلی مرتبہ چہرہ اوپر کیا۔ میں سامنے کھڑا تھا۔ ایک
لیے اُس کی نظر میری طرف اُٹھی۔ میں نے اشارے سے تحمل کی
اسی وقت نسترن کو جیسے پہلی بار میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اُس نے مجھ
کے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میں باہر تو آگیا لیکن جانے کے بر
میٹھی اور نمکین نعمتوں کی پلیٹیں سجانے کے بہانے بار بار اندر جا رہا
خاموش بیٹھی تھی۔ وہ تینوں بات بات پر کھلے جا رہے تھے۔ نسترن
"آج ہمارا خیال آپ لوگوں کے ساتھ سیر کو جانے کا تھا۔"
"چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ موٹر حاضر ہے۔" مرزا چہک کے بولا۔
"لیکن زرّیں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"
"طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ پھر تو انھیں ضرور سیر کرنی چاہیے۔ طبیعت
گی۔ ہم انھیں دریا کے کنارے لے چلیں گے۔ رات کا کھانا لارڈ ز میں کیوں
کیوں زرّیں! آپ کا کیا خیال ہے؟" نواب مرزا بلاواسطہ اُس سے مخا
زرّیں کے بدن میں رعشہ سا پیدا ہو گیا اُس کے بجائے نسترن
"آج نہیں پہلے آپ سے زرّیں کا حجاب تو ٹوٹ جائے۔"
"تو گویا ہمیں روز یہاں حاضری دینی ہو گی؟"
"آپ کا گھر ہے، جب چاہیں تشریف لائیے۔"
خاصی دیر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ رات کو نو بجے وہاں
نسترن نے زرّیں کو اُن کے جانے سے پہلے اُس کے کمرے میں بھیج دیا تھا
پنج میں مبتلا تھا کہ چاند میاں آگے چلا بھی گیا اور میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا!
میں یا تو نسترن کی فکر کر سکتا تھا یا چاند میاں کی۔ میں نے سوچا کہ خیر جا
گزر گئے ہیں، وہاں چند روز اور سہی کم سے کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ بد
میں موجود ہے اور اُس رُوسیاہ کا نام چاند میاں ہے۔ میرے دل میں خو
ہوئی کہ کاش اُسے کورا کا پتہ معلوم نہ ہو۔ کاش وہ انکار کر دے کہ اُس
کورا کو حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ زرّیں نے رات کا کھانا کھا
کر دیا تھا۔ میں ایک بار اندر گیا تو وہ تکیے میں منہ چھپائے پڑی تھی ا
کی کمر سہلاتے ہوئے اُسے سمجھا بجھا رہی تھی۔ میں نے بھی اُس رات
ویسے بھی میں محض زندگی برقرار رکھنے کے لیے چند لقموں سے صبح و شا
جہنم بھر لیتا تھا۔
اب مجھے ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا
اور نواب مرزا کی باتیں سننے کے بعد زرّیں کا کیا حال ہو گا۔ کوئی اگر
لیتا ہو گا۔ میں اپنی کوٹھری کے فرش پر بیٹھا ہوا آنے والے لمحوں
تھا۔ اب زرّیں کو یہ بتانا آسان تھا کہ نسترن اُس کے لیے کیا سوچ ر
اس سے آگے خود مجھے راستے گم نظر آتے تھے۔ کوئی گھر نہیں تھا۔ کو
وہی کلکتہ تھا، وہی سڑکیں وہی ویرانی اور وحشت تھی لیکن کوئی او
تھا۔ ابھی مجھے اپنے ذہن کے جالے صاف کرنے کی کوشش کرنے

ں کہ ملازم نے اطلاع دی بیگم صاحب طلب کر رہی ہیں۔ میں اُٹھ کے بنگلے
پہنچا۔ زرّیں کا کمرہ بند تھا۔ برابر کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندر سے نسترن
آواز آئی "یادھر آجا۔"
میں کشمکش کے عالم میں اندر پہنچا۔ نسترن بستر پر تنہا پڑی ہوئی تھی۔ آج
نس ہی نہیں تھا کہ ساڑی کا پلو کدھر گرا ہوا ہے اور بدن کا کون سا حصہ عریاں
ہے۔ "دروازہ بھیڑ لے۔" اُس نے مجھے دوسرا حکم دیا۔ "آج مجھے پھر وہی درد ہو رہا
ہے۔" وہ کروٹ بدلتے ہوئے بولی۔ "دیکھتی ہوں تیرے ہاتھوں میں کتنا دم ہے اور
لے بنارس والے سیٹھ کے ہاں کیا کھایا پیا ہے۔"
میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ نکلا اور کانوں میں سائیں سائیں
نے لگی۔ "جی۔" میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "آج تو خود میرے ہاتھوں میں بھی درد ہے۔"
"آج ہی تیرے ہاتھوں میں درد ہونا رہ گیا تھا کم بخت! میں انکار سننے
عادی نہیں ہوں۔ چل آ، ہاتھ چلائے گا تو تیرے ہاتھ بھی دب جائیں گے۔"
"جی بہت درد ہے۔" میں نے گھبرا کے کہا۔
اُس نے مجھے گھور کے دیکھا پھر اُس کے لبوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ
پھیلنے لگی۔ "آ، تیرا درد میں دُور کرتی ہوں۔"
"آپ؟" میری آواز میں لرزش تھی۔
"وہاں کھڑا کھڑا کیا لرز رہا ہے۔ جا دفان ہو جا اور اسی وقت میرے گھر
سے نکل جا۔ جا دُور ہو۔ مُردار کہیں کا۔" وہ درشتی سے بولی۔ میں نظریں جھکائے
کھڑا رہا۔ اُس نے چیخ کر کہا۔ "جاتا ہے یا بُلاؤں دربان کو اور اُس سے کہوں کہ
ل مُوئے کو گھر سے نکال دے، یہ تو نخرے کرتا ہے۔"
"میں کہیں نہیں جاؤں گا، آپ ہی کے پاس رہوں گا۔" میں نے تلملا
لیا۔ "آپ دھکے دے کے نکال دیں گی تو دوبارہ واپس آجاؤں گا۔"
"بکتا ہے۔" وہ ناگواری سے بولی۔
اُس سے بعید نہیں تھا کہ وہ مجھے اسی وقت نکال باہر کرتی۔ میں آہستہ
آہستہ اُس کی مسہری کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر میں نے پائنتی بیٹھ کے اُس کے پیر
لیے۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کراہنے لگی۔ میرے ہاتھ تیز تیز حرکت
رہے تھے۔ نسترن نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔ "یہ روشنی آنکھوں میں چبھ
رہی ہے، اُٹھ کے بڑا بلب بجھا دے۔" میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ "ارے تیرے
ہاتھ تو خشک ہونے میں نہیں آتے۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں
میں لیتے ہوئے بولی۔ "کہاں درد ہو رہا ہے تیرے؟"
"سارے ہاتھوں میں۔" یہ لفظ بہ مشکل تمام میرے منہ سے نکلے۔ اُس نے
میرا ہاتھ دبانے شروع کر دیے اور ایک بھرپور انگڑائی لی۔ زور پڑنے کی وجہ سے اُس
کے بلاؤز کے بٹن ٹوٹنے کی آواز آئی۔ "کم بخت بہری ہو گئی ہے۔"
میں نے شرم سے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔ ایک لمحہ ایک صدی کے مانند
گزر رہا تھا۔ مجھ پر غصے اور خوف کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ میرا دل دو حصوں میں
بٹ گیا تھا۔ ایک دل یہ کہتا تھا کہ پیروں کے بجائے اُس کی گردن دبا دوں، درد ہمیشہ
کے لیے نکل جائے گا۔ دوسرا دل کہتا تھا، چند دن اور گزار لے۔ میں نے اس سے پہلے

کسی عورت کی آنکھ میں ایسی چمک نہیں دیکھی تھی۔ مجھ پر جہاں جہاں اُس کی نظر پڑتی تھی، وہاں وہاں آگ سی لگنے لگتی تھی۔ "تو جو کچھ کہتا تھا وہ سچ تھا۔" وہ خوابیدہ آواز میں بولی۔ "تو میری آزمائش پر پورا اُترا۔ تیری نوکری پکی۔ اب میں تیرے لیے اچھے اچھے کپڑے بنواؤں گی۔ مٹھائیں بنا دوں گی تجھے لیکن دیکھ، آنکھیں مت پھیر لینا۔ یہ نہ ہو کہ تو مجھے عورت سمجھ کے کہیں دیوانہ ہو جائے۔" اُس نے باتیں کرنے پر کمر باندھ لی تھی اور مجھ پر اپنی نوازشیں نچھاور کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے کچھ سکون ہوا۔

"اب میں یہاں آگیا ہوں تو کہیں اور کیوں جاؤں گا۔ ایسی اچھی جگہ کہاں ملے گی۔" میں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا۔

"تب سمجھ لے۔" تو نے میرے تعلقات تو دیکھ ہی لیے ہیں۔ کلکتے کا بڑے سے بڑا آدمی یہاں آتا ہے۔ تو نے اگر بھاگنے کی کوشش کی تو میں تجھے سات تہہ خانوں سے بھی نکال لاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گئی۔ اُس نے مجھے حکم دیا۔ "ذرا میرے بازو تو دبا۔" میں نے اس بار کسی چون و چرا کے بغیر اُس کے بے لباس بازوؤں پر ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ وہ کسمساتی اور آہیں بھرتی رہی۔ کبھی اِس کروٹ ہوتی، کبھی اُس کروٹ۔ اُس کا لباس بستر پہ بکھر گیا تھا۔ میں نظریں چرا تا رہا۔ پھر اچانک کسی نے ہولے سے دروازے پر کھٹ کھٹ کی۔ وہ بے چینی سے اُٹھی۔ اُس نے مجھے بستر پر رُکنے کا حکم دیا اور کواڑ کا ذرا سا پٹ کھول کے باہر جھانکا۔

"کون؟ چاند میاں؟ ساتھ میں اور کون ہیں؟"

ملازم نے جواب دیا۔ "اکیلے ہیں۔" نسترن نے منہ بنایا اور ملازم کو ہدایت کی کہ وہ چاند میاں کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔

"جا آرام کر۔" اُس نے بے دلی کے ساتھ مجھ سے کہا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں کمرے سے نکل کے باورچی خانے میں گھس گیا۔ وہ اپنا لباس درست کر کے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ مجھے اُن کی یہ گفتگو سننے کا موقع نہیں ملا۔ پھر باورچی خانے کے دروازے کی آڑ سے میں نے دیکھا کہ وہ چاند میاں کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی ہے۔ گویا معاملہ گمبھیر تھا۔ اتنی رات گئے چاند میاں کا آنا اور آتے ہی کمرے میں بند ہو جانا بے علت نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ہزار اندیشے گردش کرنے لگے۔ جیسے ہی اُن کا کمرہ بند ہوا، میں نے باہر جا کے دیکھا۔ وہاں وہی موٹر کھڑی تھی جس میں شام ڈھلے نواب مرزا اور چاند میاں آئے تھے۔ ممکن ہے وہ زرّیں کو لینے آیا ہو؟ اندھیری رات ہے۔ ایسے میں اُسے ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل کرنے میں کیا دشواری ہو گی۔ سات لاکھ روپے پر بات ہوئی ہو گی۔ زرّیں کا حال دیکھ کر خود نسترن بھی جلد از جلد اُس سے پیچھا چھڑانے کا ارادہ رکھتی ہو گی اس لیے وہ کم کے سودے پر بھی آمادہ ہو جائے گی۔ نواب مرزا کو کسی کل قرار نہیں آیا ہو گا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور اہلِ نظر نسترن کو لالچ دیتا، اُس نے پہلی فرصت میں چاند میاں کو نسترن سے گفت و شنید کے لیے بھیج دیا ہے۔ میں نے رینگتے ہوئے زرّیں کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ مجھے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ پھر اندر سے زرّیں کی ناتواں آواز آئی۔ میں نے سرگوشی میں اُسے اپنا نام بتانے کی کوشش کی لیکن اُس تک میری آواز نہیں پہنچ سکی۔ چنانچہ مجھے دوبارہ باورچی خانے میں جانا پڑا۔ وہاں میں نے ایک ردی کاغذ پر

کوئلے سے اپنا نام لکھا اور وہ کاغذ جھاڑو کے تنکے کے ذریعے دروازے کے نیچے سے اُس کے کمرے کے اندر ڈال دیا۔ زرّیں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ کمرہ روشن تھا مگر زرّیں کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں سوج کر سرخ ہو گئی تھیں
"خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو۔" اُس نے چیخنے کی کوشش کی۔

میں نے ایک دم اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں تو پہلے ہی تمھیں لے چلتا لیکن تم سے یہ بات کہتا کس طرح؟ اب تو تم نے خود دیکھ لیا۔ سنو، چاند میاں پھر آیا ہے۔ جاگتی رہنا اور ہوشیار بھی رہنا۔ میں یہیں کہیں رہوں گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو فوراً مجھے آواز دے لینا۔"

"میں اب ایک لمحے بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔" اُس نے سسکتے ہوئے کہا۔

"میں خود ایک لمحے بھی تمھیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتا مگر باہر سوچ سمجھ کے قدم نکالنا ہوگا۔ یہ رات خیریت سے گزر جائے تو یہی بہت ہے۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" اُس نے پوچھا۔ میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ کورا بھی مجھ سے بار بار یہی سوال کرتی تھی۔

"دُنیا بہت بڑی ہے۔ یہاں سے نکلیں تو سہی پھر دیکھا جائے گا کہ کہاں جانا ہے۔ تم بس حوصلہ قائم رکھنا۔ تم تو مسلسل رو رہی ہو۔"

"اور تم جو رو رہے ہو۔" اُس نے میرے آنسو دیکھ لیے تھے۔

"مجھے ایک پُرانی بات یاد آ گئی تھی۔" میں نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اچھا دروازہ بند کر لو۔"

اُس نے کچھ اور کہنا چاہا مگر میں نے نہیں سُنا کیونکہ نسترن اور چاند میاں کسی وقت بھی باہر آ سکتے تھے۔ میں باورچی خانے کی روشنی گل کر کے پھر چوکیداری کرنے لگا۔ میں نے احتیاطاً پیاز کاٹنے کا چاقو سنبھال لیا تھا اور لوہے کی سنسی ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ کچھ دیر تک کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ میں نے دبے قدموں نسترن کے کمرے کے دروازے پر جا کے کان لگا دیے۔ اندر دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ اب میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ بس کسی طرح یہ رات گزر جائے، صرف ایک رات کی مہلت اور مل جائے۔

میں چوکنا ہو کے بیٹھ گیا۔ جسم کی تمام طاقت کانوں میں سمٹ آئی۔ پھر چاند میاں بہت دیر بعد نسترن کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ جب اُن کی چاپیں باورچی خانے کے قریب سنائی دیں تو میری رگیں جلنے لگیں۔ چاقو اور سنسی پر میرے ہاتھ تڑپنے لگے۔ وہ زرّیں کے کمرے سے آگے گزر گئے تھے۔ میں دم سادھے اندر بیٹھا رہا۔ گاڑی چلنے کی آواز آئی اور چند منٹ بعد نسترن نے زرّیں کے دروازے پر ٹھوکے مارنے شروع کر دیے۔ پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ نسترن اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ وہ دوبارہ واپس نہیں آئی۔ میں ساری رات جاگتا رہا۔ گویا نسترن نے چاند میاں کو ناشاد و نامراد واپس کر دیا تھا۔ اُسے اُمید ہوگی کہ کل نواب مرزا دیوانہ ہو کے اپنی پیش کش میں اور اضافہ کر دے گا۔ اُسے اس دشت کی سیاحی میں زمانہ گزر گیا تھا۔

مگر میں زرّیں کو کہاں لے جاؤں گا؟ میری جیب میں ایک دمڑی بھی نہیں تھی۔ ایک نوجوان بُرقع پوش لڑکی کے ساتھ بڑھی ہوئی داڑھی اور اُول جُلول کپڑوں والے ایک نوجوان کو دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟ اس لیے میں نے سوچا، اس بار پہلے سے سوچ لیا جائے ورنہ کورا کے وقت کی طرح زرّیں کے ساتھ دربدر مارے مارے پھرنا ہوگا۔ مجھے سوشیل کا گھر یاد آیا۔ بنجل کے اُس بدقسمت گھر کے گزارے کے لیے ماہانہ رقم اب بھی پہنچتی ہوگی۔ مجھے تو میں زرّیں کو اپنی بہن بتا کے چند دنوں کے لیے وہاں ٹھہرا مگر میں نے تو اُس کا گھر بھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ معلوم کیسا ماحول ہو، اردگرد رہتے ہوں۔ ہندوؤں کے محلّے میں ایک بُرقع پوش لڑکی کا ٹھہرنا سو والوں کے لیے مصائب میں اضافے کا سبب بن جائے گا۔ سوشیل کے گھر کے کسی فرد سے واقف نہیں تھا۔ اُن کے سامنے خود کو شناخت کرا گا کہ میں سوشیل کا وہی دوست ہوں جس کی ایما پر انھیں ہر ماہ ایک ہے اور اب میں اُس رقم کا محصول وصول کرنے آیا ہوں۔ پھر ایک ہی بنجل کا اڈّا۔ زرّیں جیسی نازک اندام لڑکی کو کلکتے کے خطرناک بدمعاش پڑے جائیں؟ میں نے جیل میں اُس ماحول کے قصّے سُنے تھے، خود اپنی وہ جگہ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سوچنے اور منصوبے بنانے کا وقت بھی نکل مرزا زرّیں کے حسن و جمال کا نظارہ کر چکا تھا۔ اُس کی بے تابیاں بتا اب مجھے بہرطور جلد از جلد اُسے یہاں سے لے جانا تھا۔ چاہے بعد میں کچھ پیش آئیں۔ میری جیب میں مالا کی چھوٹی سی پوٹلی پڑی تھی۔ میں نے دیکھا اور آنکھوں سے لگا لیا۔ اس قیمتی مالا کا صرف ایک دانہ میری بہت کر سکتا تھا مگر کورا کی ایک ہی یادگار تو رہ گئی تھی۔ اس یادگار کی میں حفاظت کی تھی۔ جسے دیکھیے، سب سے پہلے اُس کی نظر اسی پر پڑتی تھی۔ موتیوں میں کوئی خاص بات ضرور ہوگی اسی لیے بدھ گیا میں اُس مصنف مجھے شناخت کر لیا تھا ورنہ ایسی مالائیں تو ہزاروں گلوں میں پڑی ہو خیال آیا تو میں بہتا چلا گیا۔ میرا چہرہ بھیگ گیا۔ امّی یاد آئیں، ابّا یاد آ کی شکلیں باورچی خانے کی دھندلی دیواروں پر اُبھر آئیں۔

نہ معلوم اُن کے چہرے دیکھنا کبھی نصیب بھی ہو۔ بابا کے بعد ابّا جان کے چڑچڑے پن سے وہ کتنی پریشان ہوں گی۔ مجھے بہاتی ہوں گی۔ بے چاریوں نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ میں مر گیا ہوں۔ ہاں میں اُن کا بھائی ہوتا تو اُن کے پاس ہوتا۔ اس وقت وہ کہاں رہی ہوں گی؟ کیسا مکان ہوگا؟ محلّے والے کیسے ہوں گے؟ چھو ہوں گے۔ کاش ابّا جان کا سایہ اُن کے سروں پر سلامت رہے مگر بھائے کیا ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انھیں گیا میں رہنے لگا ہو۔ اُن کے پاس کورا کا خزانہ محفوظ تھا۔ تا۔ جانگ قبیلے کے بزرگ بوڑ کر آیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وہ ایک انمول خزانہ ہے۔ ممکن ہے وہی خزانہ ٹھکانے لگانے کے لیے گیا کی سکونت ترک کر دینا مناسب کاغذات وہ متبرک کاغذات جن کی جانگ قبیلے کے لوگوں کو ضرور نے ضرور اُن کاغذات کا مطالعہ کیا ہوگا اور اُن کی سمجھ میں کوئی با ہو سکتا ہے بدھ راہب جھوٹ بول رہا ہو اور اُن کاغذات میں کو پوشیدہ ہو۔ جانگ قبیلے کے لیے مہاتما بدھ کی وصیت یا کوئی راستہ یا کچھ اور ہو بھی تو وہ اتنا پریشان تھا۔ متبرک کاغذات کی گمشدگی پر اُس کا یہ اضطراب ناقابلِ فہم تھا۔ خصوصاً ایسے لیے جس نے اعلا تعلیم حاصل کی تھی، اُس کی یہ بات میرے دل کو نہیں لگی۔ اُن کاغذات میں ضرور کوئی اہم نکتہ درج ہوگا۔ ابّا جان نے اُس نکتے کی جستجو کی ہوگی تو اُن کی تشویش بڑھ گئی ہوگی۔ گیا میں اپنے سابق مکان کے قریب جو نیک آدمی مجھے ملا تھا، اُس کا بیان تھا کہ ابّا جان کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے تھے کسی کا گھر میں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے وہ تخلیے میں اُنھی کاغذات کا مطالعہ کرتے ہوں اور انھیں ڈر ہو کہ یہ راز کسی پر کھل نہ جائے اور جب اُن کی تحقیق و جستجو میں رکاوٹ پڑ رہی ہو تو انھوں نے گیا سے کہیں اور منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ کون اپنا آبائی مکان، زمین اور جائداد چھوڑ کے اس طرح روپوش ہو سکتا ہے کہ کسی ہمسائے کو بھی خبر نہ ہو۔ چُپ چُپاتے مکان بیچ دیا۔ نہ کسی سے کہا، نہ کسی پر اعتماد کرتے۔ کسی غیر معمولی واقعے کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس منظر میں کوئی بے حد اہم بات ہوگی۔ ذہن کو کسی کل چین نہیں تھا۔ انھی قیاس آرائیوں اور خیال آرائیوں میں صبح ہو گئی اور مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں کہاں اور کس گھر میں ہوں۔ میں تو زرّیں کی چوکیداری کر رہا تھا۔ اس غفلت پہ مجھے جرم کا احساس ہونے لگا۔

ناشتے کی میز پر نسترن کا چہرہ فکر میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے مجھ پر بھی کوئی توجہ نہیں دی، جیسے رات اُس نے مجھے قریب بُلا کے کوئی بات ہی نہ کی ہو۔ البتہ زرّیں موقع پا کے کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج کم سے کم رات تک تو امان ہے کیونکہ نسترن کے گھر سے کوئی دن دہاڑے زرّیں کو لے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہاں، یہ دوسری بات ہے کہ خود نسترن سیر و تفریح کے بہانے کہیں لے جا کے چھوڑ آئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ آج چاند میاں، نواب مرزا اور بہت سے دیگر لوگوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔ نسترن نے زرّیں کے حسن کا چرچا دُور دُور کر دیا ہوگا۔ گیٹ پر دربان، اندر کئی ملازم، مہمانوں کی مستقل آمد کا خطرہ اور نسترن کی گھر میں موجودگی۔ میں زرّیں کو ان سب بلاؤں کی آنکھوں میں دھول جھونک کے کیسے لے جا سکتا تھا۔

دو دن سے میں گھر کے ہر فرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ کون کس وقت کہاں رہتا ہے۔ دربان کی کوٹھڑی گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہ عموماً صرف ضروریات کے لیے وہاں سے ہٹتا تھا ورنہ وہیں بیٹھا ہوا حقّہ گڑگڑاتا رہتا تھا۔ میں نے ان چار دنوں میں اُس سے خاصی دوستی کر لی تھی۔ شروع شروع میں گھر کے تمام ملازموں نے مجھے خشونت کی نظروں سے دیکھا مگر بعد میں وہ سب مجھ سے گھل مل گئے۔ باورچی روزانہ صبح گوشت ترکاری لینے کے لیے جاتا تھا۔ غرض میں نے فرار کے طریقوں پر بہت غور کیا لیکن عمل کے قابل کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آئی۔ اُس روز جب باورچی ہدایت لے کے بازار روانہ ہو گیا تھا اور نسترن زرّیں کے کمرے میں چلی گئی تھی تو ایک تدبیر میرا دماغ جھنجوڑنے لگی۔ میں نے باہر جا کے دیکھا دربان حقّہ گڑگڑا رہا تھا۔ میں بنگلے میں آ گیا۔ آیا ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھی۔ دوسرے ملازم اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں تھے۔ پھر میں ایک فیصلہ کر کے زرّیں کے کمرے میں گھس گیا۔ نسترن اُس سے کہہ رہی تھی کہ آج نواب مرزا شاید دو چار دنوں کے لیے تمھیں اپنے گھر لے جائیں۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔" میں جیسے ہی کمرے میں اچانک داخل ہوا، وہ بات کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس نے مجھے اچٹتی نظر سے دیکھا۔ میرے بے اجازت اندر پہنچنے سے اُس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں اُبھر آئیں۔ میں ایک دم اُس کے بہت قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے پھرتی کے ساتھ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اُسے پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے لیے مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ "زرّیں!" میری دھیمی آواز اُبھری۔ "کسی تاخیر کے بغیر دروازہ بند کر دو اور تیار ہو جاؤ۔" میرا لہجہ حکمیہ تھا۔ زرّیں سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ "دیر مت کرو، وقت نہیں ہے۔"

اُس کے تساہل پر مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ نسترن میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ کس کی گرفت میں ہے۔ زرّیں نے کمرہ بند کر دیا۔ نسترن چیخنے کی کوشش بھی کر رہی تھی لہٰذا میں نے اُس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ اگر مجھے زرّیں کی موجودگی کا خیال نہ ہوتا تو میں اُسے اتنے طمانچے مارتا، اتنے طمانچے مارتا کہ وہ لہولہان ہو جاتی۔ پھر جب اُس نے شور مچانے کا ارادہ کیا تو میں نے باورچی خانے سے اٹھایا ہوا چاقو نکال لیا اور اپنے وجود کی تمام نفرت سمیٹ کے اُس سے کہا۔ "نسترن خانم! میں زرّیں کو لے کے جا رہا ہوں۔ پہلی بار تو میں چوٹ کھا گیا تھا مگر اب دوسری بار ایسا نہیں ہوگا۔ میں اس شریف اور معصوم لڑکی کو تم سے بہت دُور لے جاؤں گا۔ چیخنے کی کوشش نہ کرو۔ اس وقت تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ چاند میاں کہاں رہتا ہے؟"

"تم کون ہو؟" دہشت سے اُس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

"یہ میں تمھیں پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس وقت تو مجھے چاند میاں کا پتہ چاہیے۔"

"وہ کیلا بگان میں رہتا ہے۔" نسترن لرز کے بولی۔ "کیا تم زرّیں کو اُس کے پاس لے کے جا رہے ہو؟"

"تم نے کیا سب کو اپنے جیسا سمجھ لیا ہے۔ اس دنیا میں سبھی تم جیسے کمین نہیں رہتے نسترن خانم! وقت کم ہے۔ تم ذرا اس کرسی پر سیدھی طرح بیٹھ جاؤ۔" میں نے اُسے جھٹکا دے کے اُٹھایا اور زرّیں سے چادر مانگی۔ نسترن تڑپنے لگی تھی اس لیے مجھے اُس کے منہ پر ایک اور ضرب لگانی پڑی۔ وہ ہوشیار عورت تھی۔ سمجھ گئی کہ مزاحمت کرنا بے کار ہے۔ زرّیں نے اسے کرسی سے باندھنے میں میری مدد کی۔ نسترن کو چاروں طرف سے باندھ کے میں نے زرّیں سے پوچھا۔ "تمھارے پاس کچھ نقدی ہے؟"

"نہیں، وہ تو سب میں نے انھیں دے دی تھی۔" زرّیں نے معصومیت سے کہا۔

میں نے نسترن سے کہا۔ "تمھارے روپے کہاں رکھے ہیں؟ میں صرف

وہ روپے مانگ رہا ہوں جو زریں نے مجھیں دیے تھے۔ وہ پانچ ہزار روپے نہیں جو نواب مرزا نے زریں کی رونمائی کے لیے دیے تھے۔"

نسترن نے آنکھوں کی پتلیوں سے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے تیزی سے سنگھار میز کی دراز کھولی۔ دراز میں اُس کا چھوٹا سا بٹوا موجود تھا۔ بٹوے میں چابی رکھی تھی۔ چابی سے میں نے الماری کھولی۔ الماری میں بہت قلیل رقم تھی۔ وہ میں نے گنے بغیر جیب میں ڈال لی اور زریں کو ہدایت کی کہ وہ دروازہ بند کرے اور میرا انتظار کرے اور جب تک اُسے تصدیق نہ ہو جائے کہ خود میں آیا ہوں، اُس وقت تک دروازہ نہ کھولے۔

باہر آ کے میں نے عمر رسیدہ جاٹ دربان سے کہا کہ بیگم صاحب کو ٹیکسی کی ضرورت ہے۔ وہ کندھے اچکا کر بگٹٹ روانہ ہو گیا۔ میں بھاگا بھاگا اندر آیا۔ میری آواز سُن کے زریں نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے سے نکلتے وقت میں نے آیا کی نقل و حرکت دیکھ لی تھی۔ اُس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زریں نے برقع پہن لیا تھا۔ وہ بالکل تیار تھی اور اپنا سوٹ کیس بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے منع کر دیا اور سوٹ کیس وہیں چھوڑ دیا۔ میں چلتے چلتے ایک دفعہ نسترن کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا مگر اُس کے منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا، صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم نے اُسے ایسا کس کے باندھا تھا کہ وہ جنبش بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُس سے میرا تعارف دوبارہ ہو گیا تھا۔ تعارف کے لیے اگر میں رُک جاتا تو ذرا سی دیر میں معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ میرے سینے میں گھٹن سی ہوئی جیسے کوئی مجھ سے شکایت کر رہی ہو کہ بابر! تم نے اِسے اتنی آسانی سے معاف کر دیا؟

بہرحال میں نے نسترن سے کہا "نسترن خانم! ہم جا رہے ہیں۔ تم نے زریں کے بارے میں غلط رائے قائم کی تھی۔ اگر میں یہاں نہ بھی ہوتا اور تم نواب مرزا جیسے کسی شخص کے ہاتھ اسے فروخت کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتیں تو زریں اپنی عصمت بچانے کے لیے چوڑیاں پیس کر پھانک لیتی۔ یہ اسی کردار کی لڑکی ہے۔ ایک بار پہلے بھی تم نے ایک اور لڑکی کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا، یاد ہے آج سے سات سال پہلے؟"

اُس کی پتلیاں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے زریں کا ہاتھ تھاما۔ اُس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔ "چلو زریں!" میں نسترن پر قہر کی ایک نظر ڈالتا ہوا دروازہ بند کر کے باہر آ گیا۔ زریں میرے پیچھے پیچھے تھی۔ ہم ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ زریں کو بوڑھی آیا کی نگاہ سے اوجھل کرنے کے لیے میں ٹھیر گیا اور زریں کو تنہا آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ احتیاط سے نکل گئی۔ میں بھی چلا۔ اِس طرح ہم گیٹ تک پہنچ گئے۔ دربان اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جب تک دربان ٹیکسی لے کے واپس آئے گا، اُس وقت تک ہم اُس کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کے اِردگرد کی گلیوں میں گم ہو جائیں گے مگر اِس اقدام میں ایک خطرہ تھا۔ وہ یہ کہ ٹیکسی آنے کے بعد دربان اندر اطلاع دینے جائے گا، ٹیکسی باہر کھڑی ہوئی ہو گی اور نسترن کو آزاد ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ وہ فوراً منتظر ٹیکسی میں بیٹھ کے ہمارا تعاقب شروع کر دے گی۔ اگر ہمیں سواری ملنے میں دیر ہو گئی تو وہ آسانی سے ہمارے سر پر پہنچ جائے گی۔ گیٹ سے باہر گلی میں جھانک کے دیکھا۔ دربان ٹیکسی لے کے آ رہا تھا۔ چند منٹ اور ٹھیر جاتا تو دربان اندر اطلاع دینے پہنچ جاتا یا ہمیں باہر دیکھ لیتا۔ میں نے زریں کو ایک طرف کھڑا کر دیا اور خود گیٹ سے باہر۔ گیٹ کے اندر کھڑی رہی۔ دربان مجھے منتظر دیکھ کے بولا۔ "جاؤ، بیگم صاحب کو خبر کر دو۔"

میں نے جواب دیا۔ "وہ تیار ہیں۔" یہ سنتے ہی زریں باہر نکل ... نے اُس سے پوچھا۔ "بیگم صاحب کدھر ہیں؟"

"آ رہی ہیں۔ آتے آتے انھیں کچھ یاد آ گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے ... میں بیٹھ گئی۔ ہم نے چند لمحے انتظار کیا۔ پھر میں نے دربان سے کہا۔ "بیگم صاحب کہاں رُک گئی ہیں؟" پھر وہ جیسے ہی اندر گیا، میں نے ... کو چلنے کا حکم دیا۔ وہ سُنی اَن سُنی کر گیا۔ میں نے دوبارہ کہا، پھر مجھے ... میں نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کے اُس کے حوالے کیا۔ اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے ایک نعرہ لگایا اور پوچھا۔ "کہاں جانا ہے؟"

"چلتے رہو۔" میں نے اِدھر اُدھر نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ اُس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اگلا موڑ مڑتے ہی مجھے نواب کی کار نظر آئی۔ میں نے زریں کو چپکے سے اشارہ کیا۔ چاند میاں اور نواب پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے پوری طرح دن کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ بہرحال وہ رُکے ہوئے تھے اور ہماری ٹیکسی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح پھر رہی تھی۔ ڈرائیور بار بار نشست ... تھا جیسے اُسے ایڑ لگا رہا ہو۔ وہ نعرے بھی لگا رہا تھا جیسے ... رسید کر رہا ہو یا گالی دے رہا ہو۔ کدھر جاؤں؟ کہاں ٹھیروں؟ کس دروازے پر دستک دوں؟ میرا ذہن بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ بنگلے پر نواب مرزا کی گاڑی بروقت پہنچ گئی تھی۔ اس لیے اب بھی لاحق تھا کہ نواب مرزا کی گاڑی ہمارے تعاقب کے لیے میں آ جاتی گی۔ اگر ایسا ہوا اور انھوں نے راستہ کاٹ کے کسی ... روک لیا تو کیا ہو گا؟ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟" زریں نے اس ... میں مجھ سے پوچھا کہ ڈرائیور اُس کی آواز نہ سُن سکے۔

"تمھیں وہاں سے آنے پر کوئی دکھ تو نہیں ہو رہا۔" جواب دینے کے بجائے میں نے اُس سے ایک عجیب سوال ... اُس سے جواب نہ بن پڑا۔ وہ جز بز ہو کے رہ گئی۔ میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ کچھ توقف کے بعد وہ دھیرے ... "میں تمھارے ساتھ آ گئی ہوں۔"

میرے جسم میں بجلی کا ایک جھٹکا سا لگا۔ کاش اس ... مختلف انداز سے پیش آتیں۔ ٹیکسی بے منزل بھاگتی رہی۔

ڈرائیور نے کئی بار پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ میری خاموشی سے تنگ آ گیا تھا اور منزل کا پتہ پوچھنا چاہتا تھا۔ میری سمجھ میں کوئی منزل نہیں آ رہی تھی۔ جدھر نظر اٹھاتا تھا، وہاں دروازوں پر بھوت کھڑے ہوتے ملتے تھے۔ آخر ڈرائیور نے ایک جگہ ٹیکسی روک دی اور تلخی سے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

میں نے سراسیمہ ہو کے اُسے دیکھا اور تذبذب سے کہا۔ "سیال دے۔"

"سیال دے؟" اُس نے دہرایا۔ "ایسا بولو نا۔"

گاڑی نے پھر اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ اس مرتبہ اُسے کچھ قرار آ گیا تھا۔ رفتار متوازن اور سبک تھی لیکن میری بے قراری بڑھ گئی تھی اور میرے ذہن کی گاڑی کی رفتار اتنی ہی منتشر اور تیز ہو گئی تھی۔ دماغ پھٹنے لگا تھا۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے گاڑی روکی۔

"سیال دے میں کدھر جانا ہے؟"

"استاد بھلّل کے ہاں!"

"استاد بھلّل!" میرے لہجے کی سردی اُسے لگ گئی تھی۔ اُس نے مجھے انتہائی حیران نظروں سے دیکھا۔ "تم بھلّل کے ہاں جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے گردن ہلا کے کہا۔

وہ سٹ پٹا گیا۔ "کیا تم اُس کا اڈا جانتے ہو؟"

"نہیں۔ تم وہاں کسی جگہ بھی پوچھ سکتے ہو۔"

"ہم اُس علاقے میں نہیں جاتا۔ وہاں کی سواری ہوتی ہے تو منع کر دیتا ہے۔" وہ کچھ تنک کے بولا۔

"ہمیں وہیں چھوڑ دو۔" میری آواز میں حکم تھا۔

وہ کچھ جھجکا، پھر ایک تنگ لمبی گلی میں مڑ گیا۔ ایک ہوٹل کے قریب گاڑی روک کے اُس نے پان والے سے کچھ پوچھا۔ میں نے دیکھا پان والا اُسے پتہ سمجھا رہا ہے۔ اُس گلی میں بہت سے ہوٹل تھے اور ہر قسم کی دُکانیں تھیں۔ گاڑی ایک بڑی سی پیلی عمارت کے سامنے جا کے ٹھیر گئی۔ ڈرائیور نے ایک بار پھر اتر کے کسی راہ گیر سے پتہ پوچھا۔ اُس نے ... جانب اشارہ کیا۔ "سنو!" میں نے مرتعش آواز میں ڈرائیور سے کہا۔ میرے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی تھی۔ "اُدھر جا کے کہو استاد بھلّل کا ایک مہمان آیا ہے۔ اُسے اِدھر بھیج دو۔"

"نا بابا!" وہ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ خود اُدھر جاؤ ... جا کے بیتر کرو۔"

"جاؤ۔" میں نے زور دے کے کہا۔ "جاؤ۔"

وہ اُلجھتا، بڑبڑاتا، کسمساتا ہوا بائیں جانب کی عمارت میں گھس گیا۔ یہ عمارت بناوٹ میں دوسری عمارتوں سے مختلف تھی، حویلی ... جسے دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ باہر لوہے کا ایک گیٹ تھا۔ ڈرائیور جھجکتا ہوا جیسے ہی گیٹ تک پہنچا، گٹھے ہوئے جسم کا ایک شخص اُس کے سامنے آ گیا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کی طرف اشارہ کر کے اُسے کچھ بتایا۔ اُس نے مجھے خشونت اور حقارت سے دیکھا اور سینہ پھلاتا ہوا آہستہ قدموں سے میرے پاس آیا۔ "کس سے ملنا ہے؟" سوال اُس نے مجھ سے کیا تھا مگر اُس کی نظریں زریں پر لگی ہوئی تھیں۔

"استاد بھلّل سے۔" میں نے تندی سے کہا۔

"کون ہو تم؟"

"بس تم استاد کو بتا دو کہ اُس کا ایک مہمان آیا ہے۔"

"نام بتاؤ۔" اُس نے سختی سے کہا۔

"تم سے جو کہا جا رہا ہے، وہی کرو۔"

اُس کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔ "استاد مصروف ہے۔"

میں نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جاؤں کیوں کہ ان لوگوں کے تو تیور ہی عجیب ہیں اور پتہ نہیں اس عرصے میں بھلّل کے رویّے میں کیا تبدیلی آ گئی ہو۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد میرے یہاں نہ آنے پر وہ سخت ناراض ہو گا۔ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کے اگلے حصّے پر کھڑا تھا۔ میں ٹیکسی سے اتر آیا اور میں نے آہستہ سے کہا۔ "جاؤ، اُس سے کہو لاڈلا آیا ہے۔"

"لاڈلا؟" اُس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں لاڈلا!"

اُس نے ایک آن میں کئی پہلو بدلے۔ اُس کی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ جیسے اُس کی آنکھ میں تنکا پڑ گیا ہو۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ پھر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر سرپٹ بھاگا۔ دروازے پر ایک آدمی اُس کی ٹکر سے گرتے گرتے بچا۔

میں اپنی زندگی کا سب سے ہول ناک انتظار کرتا رہا۔ میری نظریں گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ چند ثانیوں کے طویل عرصے بعد بلند آواز سے دروازہ کھلا اور اندر سے بھلّل برآمد ہوا۔ ایک لمحے وہیں ٹھٹک کے اُس نے متجسس نگاہ سے مجھے دیکھا اور وحشت میں لپک کے آیا۔ پھر وہ بے تحاشا میرے سینے سے لپٹ گیا۔ "لاڈلے! لاڈلے!" اُس کی آواز بھرّا رہی تھی۔ "میری جان! تو نے اپنے بھلّل کو بھی خبر نہیں کی؟ کہاں چھپ گیا تھا؟"

گلی میں بھیڑ لگ گئی۔

بھلّل کو یہ فکر نہیں تھی کہ گلی میں ہمارے اِردگرد بھیڑ لگ گئی ہے۔ وہ مجھے دیوانگی میں گلے سے لپٹائے ہوئے تھا اور میرے بازو، ماتھا اور گال بے تحاشا چوم رہا تھا۔ اُس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر کے والہانہ انداز سے کہا۔ "میرا چاند آ گیا، آہ، تجھے کیا معلوم، ان حرام زادوں سے پوچھ، میں تیرے لیے کتنا فکرمند تھا؟ یہ نطفہ حرام کہتے تھے، استاد سالا لاڈلا بے مروّت نکل گیا۔ کتابوں نے اُسے بگاڑ دیا، اب وہ کاہے کو تیرے پاس آئے گا۔ میں کہتا

تھا، دیکھ لینا، وہ ایک دن ضرور آئے گا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ لاڈلے جانی! تو نے میری لاج رکھ لی۔" وہ سانس لیے بغیر کہتا گیا۔

گلی کا وہ حصہ لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ وہ سب حیرت زدہ تھے، جو لوگ پیچھے کی جانب تھے وہ اُچک اُچک کے یہ منظر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بچّل نے ایک ذرا سانس لی تو میں نے نرم ساری سے اُسے مخاطب کیا: "بچّل بھائی! میرے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔" میں نے کوشش کی تھی کہ یہ بات اُس کے سوا کوئی نہ سُن سکے۔

"کہاں ہے؟" اُس نے بے تابی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بلند آواز سے پوچھا، پھر اُس کی نگاہ خود ہی ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی بُرقع پوش زرّیں پہ ٹھہر گئی۔ ایک لمحے کے لیے اُس کے چہرے پر تجسّس کے آثار ہویدا ہوئے لیکن اگلے لمحے اُس نے زور سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو للکارا: "ابے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے، منہ کیا دیکھ رہے ہو، اٹھائی گیرو! اپنی بہن کو عزت سے گھر پہنچاؤ۔"

ٹیکسی ہر طرف سے لوگوں نے گھیر لی اور چاروں دروازے کھول دیے جیسے زرّیں چاروں دروازوں سے ایک ساتھ برآمد ہو گی۔ انھوں نے تماش بینوں کو دُور ہٹنے کے لیے ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کر دیا۔ سیاہ بُرقع میں ملبوس وہ سرو قد لڑکی ٹیکسی سے اُتری تو سب کی نگاہیں اُس پر جم گئیں۔ اُس کے سُرخ و سفید مرمریں ریشمیں ہاتھ عریاں تھے اور جھل مل کر رہے تھے۔ تماش بینوں کے دیدے پھٹے ہوئے تھے۔ بچّل کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اُس نے قہر آلود نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھا، سب نے گھبرا کے نظریں نیچی کر لیں۔ "چلو یہاں سے۔" وہ بُری طرح دہاڑنے لگا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا: "آ لاڈلے! چل۔ اپنے گھر چل۔ آ، اب میں تجھے خوب جی بھر کے دیکھوں گا، آنکھیں ترس گئی تھیں۔"

زرّیں بچّل کے آدمیوں کی جلو میں مکان کے اندر چلی گئی تھی۔ بچّل کو قرار نہیں تھا، وہ کبھی میری گردن میں ہاتھ ڈالے مجھے دبوچتا تھا، کبھی پیار کرتا تھا، جب ہم دروازے میں داخل ہوئے تو ٹیکسی ڈرائیور نے خوف زدہ لہجے میں اُسے سلام کیا۔ بچّل کو اُس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بچّل نے مجھے دھکا دے دیا اور اپنی جیبیں لوٹ کر جتنے روپے برآمد ہوئے سب ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ پر دھر دیے۔ ڈرائیور نے خوف و دہشت میں کئی سلام کیے۔ ابھی بچّل چند قدم ہی اندر گیا ہو گا کہ کسی نے باہر سے ہانک لگائی: "استاد! یوں اندر نہ جاؤ اب مٹھائی کا انتظام بھی کر دو۔"

"ابے مٹھائی!" بچّل پلٹ کے تڑپا۔ گیٹ پر ایک بوڑھا شخص مسکرایا تھا۔ "رسیلا وا! تو نے خوب یاد دلایا۔ اُس راون کی اولاد بسنتے سے جا کے کہہ دے دکان میں جتنی مٹھائی ہو جھٹ پٹ اڈّے پر پہنچا دے۔"

"استاد خالی خولی مٹھائی؟" بوڑھے آدمی کے برابر کھڑے ہوئے ایک ادھیڑ عمر آدمی نے کان کھجاتے ہوئے کہا: "سادی مٹھائی کیا مزہ دے گی۔"

"ابے تا تا تھیّا بھی کرائیں گے۔ اُس کنجری لاجو سے جا کے کہہ دے آج اڈّے پر گانا ہو گا اور سُن۔ امیرے سے مل کے کہنا، پانچ بکرے کٹ دے۔ محلّے میں کہہ دے بچو آج رات سب بچّل کے مہمان ہیں۔ امیرے سے کہہ دینا اگر گھی خراب ہوا تو اُس کی انتڑیاں نکال لوں گا۔" وہ دروازے پر یہ احکام صادر کرتا رہا، لوگ اُس سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے رہے، وہ سُنتا رہا اور لوٹ لوٹ کے جواب دیتا رہا۔ ایک آدمی نے یہ دیکھ کے گیٹ بند کر دیا، باہر شور مچنے لگا۔ گرج کے ایک موٹی سی گالی دی۔ گالی کی آواز باہر پہنچنے کی دیر تھی، سب سونگھ گیا۔ پھر بچّل کو مجھ پر توجہ دینے کی مہلت ملی: "تو نے داڑھی بھی بڑھا لی اور کپڑے کیسے گندے پہن رکھے ہیں۔" وہ ناراضی سے بولا: "رنگ بھی کالا کر لیا ہے۔ یہ تو کہاں اُڑن چھو ہو گیا تھا لاڈلے میاں؟" بچّل نے میری طرف بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھا اور بولا: "تو نے بچّل کا کڑا امتحان لیا ہے۔"

اس حویلی نما عمارت کے اندر کا نقشہ باہر سے مختلف تھا، ایسا تھا جیسے اسے باقاعدہ منصوبے کے تحت تعمیر کیا گیا ہے، اندر بھول بھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ چند کمروں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسے کمرے میں پہنچے جہاں ایک دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بچّل نے دری ہٹا کر فرش کا ایک پتھر اکھاڑا، اندر لوہے کا ایک پہیّا تھا، اُسے گھماتے ہی کمرے کے مشرقی حصّے کی دیوار کھسکنے لگی اور پھر ایک روشن کمرہ نظر آیا۔ بچّل مجھے اندر لے گیا اور دیوار برابر کر دی۔ اُس کمرے میں مختلف دروازے تھے، سفید گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کا ایک دروازہ کھول کے بچّل مجھے دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ یہاں مسہری بچھی ہوئی تھی اور دیواروں پر تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ راستے بھر کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ عمارت کے اس پُراسرار ماحول سے مجھ پر ہیبت سی طاری ہو گئی تھی۔ اُس نے میرے کاندھوں پر زور دے کر مجھے مسہری پر بٹھا دیا اور تالی بجائی: "کہاں مر گئے کم بختو؟ اسے بٹھا... ہوئی۔" وہ چیخ رہا تھا: "لاڈلے آ گیا ہے۔"

اُس کی چیخ پکار پر کئی آدمی بھاگ کے اندر آئے۔ اُن میں سے بعض مجھے دیکھتے ہی پھڑکنے لگا اور مسہری سے اُٹھا کے ناچنے لگا۔ اس پر سب ہنس پڑے۔ اُن میں کئی ایسے لوگ موجود تھے جو جیل میں میرے ساتھ رہے تھے، چھوٹی موٹی سزائیں کاٹ کے رُخصت ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں انواع و اقسام کے پھلوں اور کھانوں کا انبار لگا دیا گیا۔ اس عالم میں کچھ کھایا پیا نہیں گیا۔ وہ سب مجھ سے ایک سوال بار بار کر رہے تھے کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد سیدھا اُستاد بچّل کے پاس کیوں نہیں آیا؟ بچّل کی بے تابیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ سارٹے نے آ کے بتا دیا کہ اُسے ہاوڑا اسٹیشن پر ملا تھا۔ بچّل نے اشتعال میں اُسے اتنا مارا کہ کئی دن باہر نکلنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مجھے بڑھ چڑھ کے ساری باتیں سناتے رہے اور بچّل خاموشی سے حقّہ گڑگڑاتا رہا، پھر اچانک غصّے میں آ گیا: "کیا یہیں بیٹھے رہو گے؟ کچھ انتظام و انصرام نہیں کرنا؟ محلّے کے لوگ آئیں گے کہ لاڈلے کے آنے کے بعد بچّل اپنے وعدوں سے پھر گیا۔ ...بوس کے بچّو! اُٹھو، اُٹھو۔" وہ تلخی سے بولا: "محلّے والوں سے کہہ دو کہ آج ... کسی کے گھر کھانا نہیں پکے گا، سب بچّل کے مہمان ہیں۔" بچّل کی گرج پر ... بلا کے اُٹھے۔ لالہ چلتے چلتے ناک پر اُنگلی رکھ کے مٹکنے اور چہکنے لگا۔ بچّل نے ڈانٹ کر بھگایا۔ کمرے میں بچّل اور میں تنہا رہ گئے۔ چند لمحے ایک اذیت ناک خاموشی طاری رہی: "کیا بات ہے، تو کچھ پریشان ہے؟" بچّل نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جھوٹ!" وہ میرے بال پکڑ کے بولا: "خیر تو ہے؟"

"ہاں سب خیر ہے۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

وہ حقّہ گڑگڑاتے گڑگڑاتے رُک گیا: "خیر نہیں ہے، خیر نہیں ہے لاڈلے!" ...نے میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی: "بتا، کیا معاملہ ہے۔ کس نے ...ٹیڑھی کی، میں اُس کی آنکھیں نکال لوں گا۔"

"کسی نے نہیں۔ وقت اور زمانے کی آنکھیں نکال سکتے ہو تو نکال لو۔" ...نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"ہاں یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے لاڈلے!" وہ افسردگی سے بولا: "وقت اور زمانہ کچھ نہیں کہتے، انھیں لوگ کسی کے خلاف بھڑکا دیتے ہیں ...عی لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"چھوڑو۔" میں نے بے پروائی سے کہا: "یہاں کی سناؤ، سب لوگ خیریت ...ین شولی، نصیب میاں، کانتے، یہ سب کیسے ہیں؟"

"...یہ تو سب حرام کی کھا رہے ہیں اور عیش کر رہے ہیں، تو اپنی بتا، بات کیوں ...ہے۔ مجھ سے چھپا رہا ہے جانِ من؟" وہ شکایتی لہجے میں بولا، پھر کچھ سوچ ...لینے لگا: "میں تو بھول ہی گیا۔ تیرے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟"

"ایک لڑکی ہے بس، ستم رسیدہ، آفت زدہ۔"

"صاف صاف بات کر۔" وہ اُلجھ کے بولا۔

"میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں سمجھا تھا کہ وہ اس اطلاع پر ششدر رہ جائے گا مگر اُس کے چہرے پر ...تاثر نہیں اُبھرا، البتہ وہ کچھ سوچنے ضرور لگا: "تو کیا کسی نے دیکھ لیا ہے؟" ...نے بے نیازی سے پوچھا۔

"دیکھا تو نہیں ہے لیکن....." میں کہتے کہتے جھجکنے لگا۔

"لیکن کیا؟" وہ برہمی سے بولا: "لاڈلے! کھل کے بات کر۔"

"بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت مت پوچھو۔"

"تیری مرضی، تو تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے، اچھا ہر اندیشہ ذہن سے نکال کے ...دیر آرام کر لے، تو اب بچّل کے ہاں ہے۔ اس سے زیادہ محفوظ جگہ جیل بھی ...ہے اور یہ اپنا حلیہ تو ٹھیک کر۔ بچّل کے یار آئیں گے تو کیا کہیں گے۔ ...ابے او لالے! او حرام کے جنے!" وہ چیخ کر بولا: "بلا حجّام کو اور لاڈلے کے لیے ...نئے کپڑے لا۔"

بچّل کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ حجّام نے آ کے میری داڑھی مونچھیں صاف کر دیں۔ غسل کے لیے گرم پانی تیار کیا گیا اور ایک سفید کڑھا ہوا کُرتا اور پاجامہ فراہم کر دیا۔ جب میں نہا دھو کے اور کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو بچّل اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور میری صورت تکتا رہ گیا۔ اُس نے آوازیں دے دے کے اپنے لوگوں کو بلایا اور مستانہ انداز میں کہنے لگا: "لو دیکھو لاڈلے کا حُسن دیکھو۔ یہ ہے لاڈلا۔ دیکھا تم نے، کیسا چمک کے آیا ہے، لبے یہ کیا گھور گھور کے دیکھتے ہو، نظر لگ جائے گی سالو! ہے کوئی کلکتہ شہر میں ایسا جوان؟ اگر کوئی ہو تو اُسے ڈھونڈ کے میرے سامنے لاؤ، میں اُسے گولی مار دوں گا۔"

اس اثنا میں نصیب میاں بھی آ گیا تھا۔ اُس کے بالوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ وہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے بالکل نواب لگتا تھا، وہ آتے ہی میری بلائیں لینے لگا: "سبحان اللہ استاد! سبحان اللہ! آہا ہا، چشم بد دور، پہچانا نہیں جاتا، ستم ڈھا رہا ہے۔ رخسار پر کالا نشان لگا دو اُستاد! ہم پر بھی جوانی آئی تھی پر ایسی ٹوٹ کے نہیں آئی تھی۔"

اپنے بارے میں اُن کے تبصرے سُن کے مجھے جھینپ آنے لگی اور میرا دل چاہا کہ میں آئینے میں اپنا چہرہ جا کے دیکھوں اور یہ بھی جی چاہا کہ زرّیں کے پاس جاؤں۔ اب تک مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی کہ اُسے انھوں نے کہاں ٹھیرایا ہے۔ یہاں عورت کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ اکیلے میں گھبرا گئی ہو گی۔ نہ جانے اس پُراسرار جگہ آ کے وہ کیا سوچ رہی ہو لیکن میں اُن سب کی موجودگی میں زرّیں کے پاس جانے کے ارادے کا اظہار نہیں کر سکا۔ جس جس کو خبر ملتی تھی، وہ آتا جا رہا تھا۔ بچّل دوسرے کمرے میں آ گیا تھا۔ جہاں چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ پھر کانتے آیا، سارٹے آیا، شولی آیا، ہرچرن آیا، تیجا، جمّن میاں، بندھوا اور نراس آئے اور مجھ سے بغل گیر ہوتے رہے۔ بچّل کمرے کے درمیان دیوار سے ٹیک لگائے ایک شان سے بیٹھا ہوا حقّہ پی رہا تھا، میں اُس کے برابر موجود تھا۔ جو بھی آتا، بچّل میرے بارے میں اُس سے چار پانچ جملے ضرور بولتا۔ آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب میرے نام سے واقف تھے اور اس طرح مل رہے تھے جیسے میری اُن کی پُرانی شناسائی ہو۔ سب کو ایک ہی شکایت تھی کہ میں نے جیل سے آزاد ہو کے بچّل کے اڈّے کا رُخ کیوں نہیں کیا۔ صاف ظاہر تھا کہ بچّل نے اُن سے میرا اس قدر تذکرہ کیا تھا کہ اب درمیان میں کوئی اجنبیت نہیں رہ گئی تھی۔ اتنی جلدی اتنی بڑی تبدیلی ہوئی تھی کہ مجھے اپنے حواس بجا رکھنے میں دیر لگی۔ صبح تک میں نسرین بیگم کا ملازم تھا اور اس وقت کلکتے کے نامی گرامی بدمعاشوں کے درمیان بیٹھا تھا، وہ سب مجھ پر فدا ہو رہے تھے۔ دوپہر کا کھانا سب نے اسی کمرے میں کھایا۔ کھانے کے بعد جیل کے واقعات دہرائے جانے لگے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں دُنیا کا کوئی کام نہ ہو۔ وہ مجھے کُرید کُرید کے جیل کے واقعات یاد دلا رہے تھے اور مجھے زرّیں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ پھر میں نے ہمّت کر کے بچّل کے کان میں کہا کہ میں لڑکی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔

"بیٹھ لاڈلے!" اُس نے میرا کاندھا پکڑ کے زبردستی بٹھا لیا: "دیکھ یہاں تیرے لیے کون لوگ آئے ہیں، وہ خیریت سے ہے، اپنی بیٹی ہے، بہن ہے۔

تیرے ساتھ آئی ہے تو اُس کے لیے تو عزت ہی عزت ہے۔ اُس کی فکر نہ کرو وہ آرام سے ہوگی۔"

"میں چند منٹ بعد واپس آجاؤں گا۔"

میں نے اصرار کیا تو وہ مان گیا۔ "جا دیکھ آ، پر ابھی واپس آ جائیو۔" میری بے قراری پر سب شوخ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے اور ایک دوسرے کو آنکھ مارنے لگے۔ بجھل نے بھی یہ دیکھ لیا۔ وہ انھیں گھڑکنے لگا۔ "تمھاری ماں سے ملنے جا رہا ہے کتو!" کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ لالہ مجھے لیے ہوئے ایک زینے پر آ گیا، چکردار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرا دل ہولنے لگا اور جسم میں پھریریاں سی اُٹھنے لگیں۔ پہلی اور دوسری منزل پر کمرے بنے ہوئے تھے، جو سب کے سب مقفل تھے۔ تیسری منزل پر لالہ نے مجھے ایک فلیٹ میں چھوڑ دیا۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے دستک دی۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور تحقیق کرکے اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ ایک معمولی فلیٹ تھا لیکن وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بوڑھی عورت کے ساتھ سلونے رنگ کی ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ اُس نے مسکرا کے مجھے دیکھا اور اندر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ میں کھنکارتا ہوا اندر داخل ہوا تو زریں ہڑبڑاتی ہوئی پلنگ سے اُٹھی۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ "آیا نسترن بیگم کا ملازم فقیرا اُس کے سامنے کھڑا ہے یا کوئی اور شخص؟" اُس کی متذبذب اور مضطرب کیفیت سے مجھے کچھ لطف آیا میں نے مسکرا کے اُس سے پوچھا۔ "پہچانا میں کون ہوں؟" اُس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ "یہ میں ہوں فقیر محمد جسے نسترن فقیرا کہتی تھی۔" اُسے شاید پھر بھی یقین نہیں آیا۔ میں نے میز پر رکھا ہوا آئینہ اُٹھا کے اپنا چہرہ دیکھا۔ زریں کی حیرت بجا تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے بھی اپنے آپ کو پہچاننے میں تامل ہوا۔ یہ چہرہ تو کسی اور شخص کا تھا، جیسے بدل گیا ہو۔ "میں وہی ہوں۔" میں نے شوخی سے کہا۔

"تم تو بالکل بدل گئے ہو۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

"صرف چہرہ بدلا ہے یا یوں کہو کہ ایک مدت بعد مجھے اپنا چہرہ واپس ملا ہے۔" میری آواز اچانک بھرانے لگی۔

اُس کی حیرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ اُس میں اشتیاق کا اضافہ ہو گیا تھا۔ "فقیرے تمھارا اصل نام ہے؟" اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا اصل نام یہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟" وہ تیزی سے بولی۔

"اب میں اُسے بھول چکا ہوں یہاں سب مجھے لاڈلا کہتے ہیں، کچھ دن پہلے تک میرا نام ظہیر خاں تھا اور اس سے پہلے کچھ اور۔"

"اُس سے پہلے کیا تھا؟"

"وہ مت پوچھو۔" میں نے بے چین ہو کے کہا۔ "تمھیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ جی تو نہیں گھبرا رہا ہے؟"

"نہیں۔ انھوں نے میرا بڑا خیال رکھا ہے۔ جب سے آئی ہوں یہ بڑی بی اور ان کی بچی میری خاطر مدارات میں لگی ہوئی ہیں۔ انھوں نے یہ ڈھیر سی کتابیں اور رسالے بھی میرے لیے لا کے رکھ دیے ہیں، کپڑے بھی دیے ہیں۔"

"ممکن ہے تمھارا دل گھبرانے لگے مگر یقین کرو کہ وہاں سے یہی اچھا ہوا۔ وہ تو بہت بُری عورت ہے۔ وہ نہ جانے تمھیں کہا[ں]

"میری قسمت کی بات تھی کہ تمھیں اللہ میاں نے بھیج د[یا]" نظریں نیچی کرکے کہا۔ "میں تمھیں کس نام سے پکاروں؟"

"جو تمھیں اچھا لگے۔ چاہو تو میرا کوئی اور نام رکھ لو۔ میں [اب] کا عادی ہو گیا ہوں۔"

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے [...] کچھ مجھے بھی بتاؤ۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"کیا بتاؤں۔" میں نے کرب سے کہا۔ "یقیناً تمھاری یہ جستجو [...] تم جس شخص کے ساتھ آئی ہو اُس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور [...] کہا نہیں جاتا۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمھاری طرح میں بھی ایک بدنصیب [ہوں]، میرا مقدر بھی کھوٹا ہے۔"

اُس کے سر سے دوپٹا ڈھلک گیا تھا اور گیلے بال [...] ہوئے تھے۔ اس حالت میں وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ اُسے [...] جی چاہتا تھا۔ دوپٹا درست کرکے وہ اپنائیت سے بولی۔ "تم [...]

"بہت زیادہ تو نہیں، بھوک ہی نہیں لگی۔"

"سیب کاٹوں؟" اُس نے دھیرے سے پوچھا۔

"کاٹ دو۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ و[ہ سیب] بنانے لگی۔ "تم نے یہ نہیں پوچھا کہ تم کہاں آ گئی ہو اور یہ کون لو[گ ہیں]"

"میں تمھارے ساتھ آ گئی ہوں اور مجھے اب کچھ پوچھ[نا] نہیں ہوتی۔" اُس نے بے باکی سے جواب دیا۔

میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ "میں وہاں سے تمھ[یں] اب تم جہاں جانا چاہو میں تمھیں پہنچا سکتا ہوں اور اگر تم یہا[ں] بھی تمھیں سب کے سینے کشادہ ملیں گے۔" بے خیالی میں سیب گر گیا۔ میں نے سیب اُٹھا کے اُس کے سپرد کیا تو میرے ہا[تھ] گر گئے۔ "یہ کیا؟ تم تو رو رہی ہو۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "[...] بات گراں گزری ہے؟"

اُس نے اپنا منہ پھیر لیا اور دوپٹے کے پلو سے آ[نسو پونچھ کے] بولی۔ "میں اب کہاں جاؤں گی۔ میں سمجھتی ہوں تم مجھے سمند[ر]"

"میں نے ناحق تمھیں پریشان کیا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اگر تم اپنے متعلق کوئی فیصلہ کرنا چاہو تو تمھیں پورا اختیار [ہے] مجھے ٹھیک سے بات کرنی نہیں آتی۔"

اُس نے سیب کی قاشیں کاٹ کر پلیٹ میرے [...] نے دو ایک قاشیں اُٹھا کے منہ میں رکھ لیں اور اُس سے [...] نے کوئی حرکت نہیں کی تو میں نے بے اختیار ایک قاش اُٹھا[کے]

[...] بڑھائی، اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو تھرکنے لگے۔ ہاتھ بڑھا [...]اُس نے اُسے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ دیر تک ہم دونوں کے درمیان کوئی بات [نہی]ں ہوئی جب میں اُٹھ کے چلنے لگا تو اُس نے کہا۔ "ممکن ہے نسترن بیگم مجھے [...]تمھیں تلاش کرنے کی کوشش کرے، باہر نکلتے ہوئے احتیاط برتنا۔"

نسترن کے ہاں میں اُس سے بڑی روانی کے ساتھ باتیں کرتا تھا لیکن [نہ] جانے کیا ہو گیا تھا۔ کہنا کچھ چاہتا تھا، کہہ کچھ جاتا۔ زبان ٹھیک سے چل ہی نہیں [...]ج بھی صبح ہم ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر آئے تھے۔ اب [...] عجیب سا فاصلہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے شام کو آنے کا وعدہ کرکے اُس سے [رخص]ت ہونا چاہا تو وہ بھی مجھے روکنے کی ہمت نہیں کر سکی البتہ زینے تک رخصت [کر]نے آئی اور اوپر کی سیڑھیوں پر اُس نے یہ کہہ کے میرے قدم جکڑ لیے۔ "شام [...]ئیے گا نا؟" میں نے نگاہ اُٹھا کے اوپر دیکھا۔ وہ مجھے تعظیم دے رہی تھی۔ میں [...]ی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے آ گیا۔

زریں کو کیا اندازہ تھا کہ میں نے اپنا کون سا کرب فراموش کرکے اُسے [...] جہنم سے نکالا ہے۔ میں ہی اُسے لایا تھا اور مجھی کو اُس پر رشک آ رہا تھا۔ جی [چا]ہا کہ اُسے واپس کر آؤں۔ جب کورا واپس نہیں آ سکی تو زریں کو ایک محفوظ مقام [...]پناہ حاصل کرنے کا کیا حق ہے۔ یہ کورا کی حق تلفی تھی، جسے یہاں آنا چاہیے تھا۔ [...] نہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ یہ کون سی لڑکی درمیان میں آ گئی۔ پھر [...]ے کسی نے میرے چٹکی لی، کورا بہت بڑے دل کی لڑکی ہے۔ اگر اُسے پتہ چلے [تو] وہ بہت خوش ہوگی کہ میں نے اُسی جیسی ایک مظلوم لڑکی کی مدد کی ہے۔

نسترن کے ہاں چند دن میں نے محض زریں کی وجہ سے گزارے تھے [...] اپنے آپ پر بڑا جبر کیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کورا کی یاد التوا میں [ڈ]الی اور اپنی زندگی کے سب سے بڑے مقصد سے غافل رہا۔ زریں کو یہاں مطمئن دیکھ [کے] پھر میرے سینے میں سوزش ہونے لگی تھی۔ نسترن سے چاند میاں کا پتہ معلوم [ہو] چکا تھا۔ میں پہلی فرصت میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ یقیناً اُس کی اُن غنڈوں تک [رس]ائی ہوگی، جنھوں نے مجھ سے کورا کو چھین لیا تھا۔ بجھل کے ہاں ہتھیاروں [...]کی نہیں تھی۔ یہاں آنے کے بعد متعدد مرتبہ میرا دل چاند میاں کی طرف جانے [کے] لیے تڑپا لیکن بجھل نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل [ہون]ے نہیں دیا۔ میں ہر طرح ناکام ہو چکا تھا۔ اب چاند میاں ہی میری آخری [ام]ید تھا۔ اُسی سے کورا کا سراغ مل سکتا تھا بشرطیکہ وہ غنڈے اُسی کے خریدے [ہو]ئے ہوں جنھوں نے دریا کے کنارے اُس سیاہ رات میں ہم پر حملہ کیا تھا۔ اگر [...]ندوں کی طرح اُسے بھی کورا کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا تو میں کبھی اُن غنڈوں [ت]ک نہیں پہنچ سکتا۔ سات سال میں وقت کی موٹی دیوار درمیان میں حائل ہو [گئ]ی تھی۔ چاند میاں کے علاقے میں اس وقت جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ [نس]ترن بیگم نے اسد اور نواب مرزا کو تمام روداد سنا دی ہوگی۔ نواب مرزا کا تو بُرا [حا]ل ہوگا، وہ ایک طرف نسترن پر شک کر رہا ہوگا کہ اُس نے زریں کے دام بڑھانے کے لیے اُسے کہیں چھپا دیا ہے۔ دوسری طرف وہ میرے تعاقب میں ہوگا۔ نسترن کو بھی اس طرح سیدھے سادے انداز میں باندھ لوندھ کر چھوڑ آنے کا مجھے غم تھا۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ کم از کم دو آنکھیں تو پھوڑ آتا جو حسین لڑکیوں کو تکنے اور بُری نظر سے پرکھنے کا گناہ کرتی تھیں۔ کم از کم اُس کی ناک تو کاٹ آتا تاکہ دُنیا کو معلوم ہو جاتا، اس بدبخت نے کسی سے بے وفائی اور غداری کی ہے۔

بجھل کے اڈے پر شام تک سینکڑوں غنڈوں کا اجتماع ہو گیا۔ دُور دُور خبر پہنچا دی گئی تھی کہ آج بجھل اپنے لاڈلے کی واپسی پر جشن منا رہا ہے۔ اُس لمبی گلی میں چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ لاؤڈ اسپیکروں پر فلمی ریکارڈ بج رہے تھے۔ گلی میں رکشا اور ٹیکسی کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ بنتے حلوائی نے کئی من مٹھائی بنا کے اڈے پر پہنچا دی تھی۔ سرِ شام بجھل مجھے ساتھ لے کے مکان سے باہر آیا اور دندناتا ہوا گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک گیا۔ دکان داروں اور راہ گیروں نے اُسے مبارک باد پیش کی اور اُس نے اپنے ہاتھ سے سب کو مٹھائی تقسیم کی۔ گلی میں شادی جیسا منظر تھا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کے حیرت زدہ تھا۔ بجھل سے کچھ کہنے کا سوال نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اپنا تماشا دیکھتا رہا۔ ایسی صورت میں کیلا بگان میں چاند میاں کی طرف جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بجھل کو ذرا فرصت ملی تو میں نے اُس سے زریں کے پاس چلنے کے لیے کہا۔ وہ ٹالنے لگا لیکن میں اصرار کرکے اُسے اوپر لے گیا۔ دروازہ زریں ہی نے کھولا۔ وہ شاید میرا انتظار کر رہی تھی۔ اب اُس نے دوسرا لباس پہن لیا تھا۔ حسبِ وعدہ مجھے موجود پا کے اُس کے چہرے پر سُرخی چھا گئی لیکن جب اُس کی نظر میری پُشت پر چھپے ہوئے دیو ہیکل بجھل پر پڑی تو وہ سہم کے پیچھے ہٹ گئی۔ خوش قسمتی سے بجھل زریں کی یہ کیفیت نہیں دیکھ سکا تھا۔ اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ "بجھل بھائی آئے ہیں۔" میں نے پُرتپاک آواز میں زریں سے کہا، وہ سمجھ گئی کہ میرے لہجے میں کیا تاکید پوشیدہ ہے۔

"آداب!" وہ اپنا ایک ہاتھ اُٹھا کے ادب سے بولی۔

"خوش رہو۔" بجھل نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے حیرت ہوئی، بجھل کا ہاتھ کپکپا رہا تھا اور وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔

"اندر آئیے۔" زریں نے شیریں آواز میں کہا۔

"نہیں بیٹے! اب ہم چلیں گے نیچے بہت کام ہے۔" بجھل کے منہ سے یہ لفظ بہ مشکل ادا ہوئے۔

"کچھ دیر تو بیٹھیے۔" وہ شگفتگی سے بولی۔

"ہاں آئیے اندر آئیے۔" میں نے ہنس کے بجھل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بجھل جزبز ہوتا ہوا فلیٹ میں داخل ہوا۔ باہر کے کمرے میں ایک پلنگ اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر میں، دوسری پر بجھل بیٹھ گیا۔ زریں کھڑی رہی۔ "ارے تم بجھل بھائی کی کچھ خاطر نہیں کر رہی ہو۔ یہ تمھارے گھر آئے ہیں بھئی۔" میں نے اجنبیت دُور کرنے کے لیے زریں سے کہا۔

"نہیں۔" تجمل اکھڑ کے بولا۔ "لاڈلے اُسے تکلیف کیوں دیتے ہو۔"
"تکلیف کی کیا بات ہے، ابھی آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے۔"
تجمل کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ "ہاں میں نے یہی کہا ہے۔ تم لاڈلے کے ساتھ آئی ہو تو میری بیٹی میری بہن ہو۔" وہ جذبات سے بھرپور آواز میں بولا۔ "تم کسی بڑے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ یہاں یہ گھر، یہ علاقہ، یہ لوگ سب گندا اور بُرا ہے پر ہمارے پاس یہی کچھ ہے۔" وہ یہ کہتے کہتے اداس ہو گیا۔ "کچھ دنوں تک یہاں ہر تکلیف برداشت کرو، پھر میں تمہیں کوئی صاف ستھری جگہ دے دوں گا۔"
"میرے لیے یہی بہت ہے کہ یہاں آپ لوگ موجود ہیں۔"
"میں تمہارے لیے کچھ لایا بھی نہیں، پہلی مرتبہ آیا اور خالی ہاتھ آیا۔ خیر مجھ پر تمہارا اُدھار رہا۔"
"اب میں بری الذمہ ہوا زریں! میں نے تمہیں تجمل بھائی کے حوالے کیا۔" میں تجمل کی طرف متوجہ ہوا۔ "اور تجمل بھائی! اب زریں کا خیال تمہی کو رکھنا ہو گا۔" میں نے جوشیلے انداز میں کہا۔
"مجھ پر اتنی بڑی ذمے داری کیوں ڈالتا ہے لاڈلے؟"
"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ زریں بے حد اچھی لڑکی ثابت ہو گی۔ یہ تمہیں بہت لذیذ کھانے کھلائے گی اور تمہارا گھر دیکھے گی، یہ تمہیں ۔ ۔ ۔ ۔"
"بس بس۔" تجمل نے ترش روئی سے میری بات کاٹ دی۔ "میں بھلا اسے کام کرنے دوں گا۔ اس کے یہ نازک ہاتھ بھلا کام کرنے کے لیے بنے ہیں۔ میں کیا اس سے خدمت لوں گا، معاوضہ لوں گا۔ مجھے لالچ دیتا ہے لاڈلے؟ یہ خوش رہے بس یہی میری لالچ ہے۔"
"ان کا مطلب یہ نہیں تھا۔" زریں جلدی سے بولی۔ "ان کا مطلب یہ تھا کہ ایک بیٹی کو اپنے ماں باپ کی خدمت کرنی چاہیے۔ میں اس فرض میں کوتاہی نہیں کروں گی۔"
"ہاں ہاں تمہی اس کی طرف داری نہیں کرو گی تو کون کرے گا۔" وہ تنہا کے باہر چلی گئی تو تجمل بولا۔ "لاڈلے! کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہا ہے، کیوں میرے زخم کریدنے کی شرارت کر رہا ہے، بڑی مشکل سے تو اسے پتھر بنایا ہے۔" وہ اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"میں اپنا بوجھ کم کر رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اُسے یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ اُس نے کچھ کھویا نہیں، پایا ہے۔ اُسے نرمی، مرہم اور گداز کی ضرورت ہے تجمل بھائی! آپ سمجھتے کیوں نہیں۔"
"میں سب سمجھ رہا ہوں مگر میں خود سے ڈر رہا ہوں۔"
"سچ بتاؤ، کیا وہ تمہیں اچھی نہیں لگی؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔
"اچھی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے لاڈلے! ان آنکھوں نے زمانہ دیکھا ہے، اچھی بُری آنکھوں کا تجربہ کرتے ہوئے عمر گزر گئی ہے۔ تُو اتنی اچھی لڑکی کو یہاں لے کیسے آیا۔ یہ جگہ تو بہت بُری ہے۔"
"اور کہاں لے جاتا، میرے پاس کوئی اور چھت تھی ہی نہیں۔"

"اس چھت سے پانی ٹپکتا ہے۔ یہاں کی سیلن یہاں کی بُو مار دے گی۔ میں یہی سوچ کے پریشان ہو رہا ہوں، وہ تو شہزادی ہے لا... شہزادی کا دل ان کھولیوں میں کہاں لگے گا۔"
"اُسے دل لگانا پڑے گا، اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔"
زریں چائے کی ٹرے لے کے اندر آئی تو ہم نے خاموشی اختیا... دیر تک پیالیاں کھنکنے کی آواز آتی رہی۔ تجمل سر جھکائے بیٹھا... نے اُسے چائے دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکا... چائے صرف دو گھونٹوں میں اُنڈیل گیا۔ "میٹھا جاؤ، کھڑی کیوں ہو۔" اُس... کہا۔ وہ سمٹ کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنے ناخن کریدنے لگی۔ "زریں!"... لے کے بولا۔ "ہمیں کسی بڑی آزمائش میں مت ڈالنا۔" یہ کہہ کے وہ اُٹھ... تھام کے دروازے کی طرف چلا۔ زریں اُس سے کچھ نہیں کہہ سکی۔ نہ... کچھ خیال آیا، وہ واپس مڑا۔ کمرے میں پہنچ کے اُس نے زریں کے سر... پھر وہاں سے نکل کے کھٹ کھٹ سیڑھیاں اُترنے لگا۔
"کیا بات ہے؟" نیچے آ کے میں نے تجمل سے پوچھا۔ "تم ...نہیں ہو؟ میں کوئی غلط لڑکی نہیں لایا ہوں۔ کسی بھی معزز اور نیک... بیٹی ایسی ہو سکتی ہے۔"
اُس نے پلٹ کے میرے بازو جھنجوڑ ڈالے۔ "لاڈلے... دُکھانے والی بات کیوں کرتا ہے۔ تُو کنجری بھی لاتا تو میں اُسے سر... تُو تو ایک فرشتہ لڑکی لایا ہے۔ سمجھا، ان دونوں باتوں میں فرق... کی باتیں مت کر۔"
تجمل کی برہمی دیکھ کے میں نے اُس وقت خاموشی مناسب... اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔ رات ہوتے ہوتے گلی میں میلے کا سماں... کانتے اور نصیب میاں تجمل کو اُن چوکیوں پر لے گئے جو دیگوں کے تر... تھیں۔ گلی کے اس حصے میں ایک پرائمری اسکول تھا، اسکول سے ملحق... میدان میں تیز روشنیاں ہو رہی تھیں اور ایک شامیانہ نصب تھا۔... چوکیوں، اسٹولوں، بینچوں اور چارپائیوں پر سینکڑوں آدمی بیٹھے ہوئے... ناچ رہے تھے۔ مجھے اور تجمل کو ایک اونچی کرسی پر بٹھا کے ہمیں ہار... سے لاد دیا گیا۔ جو آتا، اُس کے اور میرے گلے میں ہار ڈال کے چلا... والوں میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے۔ جب سے تجمل زریں کے پا... تھا کچھ متفکر اور اُلجھا ہوا نظر آتا تھا لیکن اب اُس کی شادابی لوٹ آ... میں زیادہ تر ہندو رہتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں کی تعداد بہت... کی رات کوئی تفریق کوئی امتیاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ تجمل کسی زندہ پیر... مسند پر شان و شوکت سے بیٹھا تھا۔ بس اتنی ہی کسر تھی کہ لوگ مریدوں... اُس کے ہاتھ پیر نہیں چوم رہے تھے۔ اس کے باوجود اُن کی نگاہوں... کے لیے جو محبت اور عقیدت تھی، وہ الگ سے پہچانی جا سکتی تھی۔ تجمل... گلی کے ایک ایک بچے کا نام معلوم تھا۔ وہ ہر ایک کا نام لے کے اُن...

...دریافت کرتا۔ بچوں سے اُن کے والدین اور والدین سے اُن کے بچوں کا حال ...پوچھا۔ جب دیگیں کھلیں اور تمام چینی کی پلیٹیں کھڑکھڑائیں تو ایک ہنگامہ برپا ...ہو گیا۔ ایک گھنٹے تک کھانے کا زور و شور رہا۔ بوڑھی عورتیں ہاتھ پھیلا پھیلا کے تجمل کو دعائیں دے رہی تھیں۔ جیل میں مجھے تجمل کے آدمی اس جشن گرج کے متعلق بہت کچھ بتاتے تھے۔ جیل میں جو چیزیں کسی کو نصیب نہیں ہوتیں، وہ ...کی وجہ سے اندر آ جاتی تھیں لیکن یہاں تو اور ہی منظر تھا۔ جو کچھ میں نے جیل ...میں سُنا تھا وہ اس کا نصف بھی نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ مذاق ...کیا جا رہا ہو اور جن خوبیوں کا میں مستحق اور اہل نہیں ہوں، مجھے انہی کا انعام ...دیا جا رہا ہو۔ نہ جانے یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔ کھانے کے بعد عورتوں ...اور بچوں کو رخصت کر دیا گیا پھر طبلے، ہارمونیم والے ایک گول دائرے میں بیٹھ گئے۔ ...ایک جانب سے رنگ برنگے کپڑوں میں سولہ سنگھار کیے ہوئے تین لڑکیاں برآمد ...ہوئیں۔ اُن کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ چاروں نے تجمل کو جھک کر سلام کیا ...اور اپنی نشست پر جا بیٹھیں۔ قمقموں کی روشنی میں اُن کا سنگھار چمک رہا تھا۔ ...ایک تو بہت چھوٹی سی لڑکی تھی، کوئی بارہ تیرہ سال کی ہو گی، دوسری سترہ سال ...کی زیب ہو گی، تیسری بیس بائیس سال کی۔ بڑی لڑکی متانت سے بیٹھی ہوئی ...تھی۔ مجھے اس سے پہلے ناچ رنگ کی کسی محفل میں بیٹھنے کا تجربہ نہیں تھا۔ میں تصور ...نہیں کر سکتا تھا کہ اتنی خوب صورت اور سلیقے کی لڑکیاں مردوں کے سامنے ...پیروں میں گھنگرو باندھ کے آئیں گی اور گانا گائیں گی۔ ان کی آواز کیسے نکلے گی، ...ناچنے کے لیے ان کے پیر کیسے اُٹھیں گے۔ سب سُنا ہی سُنا تھا۔ میں نے جیل ...میں سات سال دوسروں کی سننے ہی کا کام کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ لوگ جھوٹ بولتے ...ہیں۔ بہرحال، ہارمونیم اور طبلے کی آواز گونجی تو لڑکیاں اپنی جگہ سے اُٹھیں، انھوں ...نے تھوڑی ہی دیر میں محفل اپنے طلسم میں جکڑ لی۔ اُن کے گھنگرو بج رہے تھے، ...ہر چیز ہی شاید رقص کر رہا تھا۔ تجمل کے سامنے نوٹوں کی گڈیاں رکھی تھیں۔ بڑی ...لڑکی ہمارے سامنے آ کے ناچنے لگی۔ اُس نے خصوصاً مجھے اپنی نگاہوں کی زد پہ ...لے لیا۔ اُس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں، کولھوں میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ لمبی، ...گلاب کے پھول کے رنگ کی۔ پیشانی پر ستارے جگمگا رہے تھے۔
...دل میں کالا جادو بھرا ہوا تھا۔ میں اُس کی اس خصوصی توجہ سے گھبرا گیا۔ میری ...اس بات سے اِرد گرد قہقہے اُبلنے لگے اور لوگ میرے کانوں، ناک، سر، ہونٹوں ...اور ہاتھوں سے نوٹ چپکانے لگے۔ رقاصہ انھیں نوچتی رہی۔ میں شرم سے ...پانی پانی ہو گیا۔ میری یہ حالت دیکھ کے لڑکی کو بھی شاید مجھ پر ترس آ گیا۔ اُس نے ...ایک ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو منع کیا۔ وہ گا بھی رہی تھی، ناچ بھی ...رہی تھی۔ اُس کی آواز تینوں لڑکیوں میں سب سے اچھی تھی۔ ناچ میں توازن تھا، ...پیر بہکا ہوا نہیں پڑتا تھا۔ درمیان کی لڑکی کچھ زیادہ پھرتیلی اور لچک دار ...ہوئی تھی۔ وہ میرے سامنے آئی تو جم گئی اور آنکھوں سے اشارے کرنے لگی۔ ...پھر نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس کھلی فضا میں مجھے حبس محسوس ...ہونے لگا۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ لڑکیوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے

تڑپے جا رہے تھے۔ ایک نوٹ جیب سے نکالتے تھے، ابھی وہ ہٹتی نہیں تھی کہ دوسرا نوٹ نکال کے اُس کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ فضا میں گھنگرو کھلے ہوئے تھے۔ ہارمونیم کی تانیں ہوا میں رچ گئی تھیں، طبلہ گرج رہا تھا اور لڑکیوں کے بدن پھڑک رہے تھے۔
تجمل سرِ مسند بیٹھا حقے کے کش پہ کش لگا رہا تھا۔ وہ میری کمر پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ بڑی لڑکی نوٹ اُٹھا کے بار بار اُسے سلام کرتی تھی۔ گانے کے دوران میں ایک جگہ رک کے اُس نے مجھ سے شائستگی کے ساتھ پوچھا۔ "آپ ہمیں داد نہیں دے رہے ہیں؟" میں بوکھلا گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کے پہلو بدلنے لگا۔ وہ زیرِ لب مسکرائی۔ "یہ تو عام محفل ہے، کبھی غریب خانے آئیے، پھر ہم آپ سے دل کو دعا... کریں گے۔" میں نے نظریں جھکا لیں۔
کانتے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور سرد آہ بھر کے بولا۔ "کیوں زِنو! کبھی ہم سے تو تم نے ایسے نہیں کہا۔ ہائے، تڑپتے ہی رہ گئے۔"
"ہٹو، ہم لاڈلے صاحب سے بات کر رہے ہیں۔"
"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لاڈلا صاحب تو سالا آج دولہا بنا ہوا ہے۔ تازہ تازہ ہے زِنو! اس پہ بجلی گرانے کی کوشش مت کرنا۔ ہمارے ہی سینے کافی ہیں ہائے۔" کانتے نے دل پر ہاتھ مار کے کہا۔ "زِنو! تم میری بات مان لیتیں تو آج میری دُنیا بدلی ہوئی ہوتی۔ تم نے مجھے انگاروں پر چھوڑ دیا اور اب لاڈلے کو نشانہ بنا رہی ہو۔"
"تم بالکل نہیں بدلو گے کانتے! تم ہمیں بہت ستاتے ہو۔"
"ہے ہے۔" کانتے دُہرا ہو گیا۔ "زِنو تم نے بدلنے ہی نہیں دیا۔ خیر تمہاری مرضی، اب ذرا لگے ہاتھوں وہ ظالم گانا تو سُنا دو، ہم کو تمہاری نظر لینے مار اُڈ اٹھکا۔"
وہ ہنس کر بولی۔ "ذرا نشان دار۔"
"ہوں۔" اُس نے ناگواری سے منہ بنایا پھر مہذب لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آپ بھی سُنیں گے؟"
"سنائیے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔
"سُنائیے۔" کانتے نے میری نقل اُتاری۔ "جیسے دولھا کہہ رہا ہو قبول ہے۔"
زِنو کے موتی جیسے دانت چمکنے لگے۔ "کانتے! تم بہت وہ ہو۔" اس نے سازندوں کو اشارہ کیا اور درمیانی لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ لمحوں میں ساز بدل گیا۔ طبلہ کسی اور انداز سے صدائیں لگانے لگا۔ تینوں لڑکیاں ایک ساتھ فرش پر کھڑی ہو گئیں۔ ایک نے آغاز کیا، دوسری نے آدھا مصرع اُٹھایا اور تیسری کا نمبر آیا تو محفل میں شور مچ گیا۔ اُس کی دل کش آواز پر بعض من چلے ناچنے لگے۔ تجمل کے قریب بیٹھے ہوئے تماش بین ہنس ہنس کے دُہرے ہو گئے۔ تجمل نے انگلی سے اشارہ کر کے انھیں خاموش کیا۔ زِنو نے رقص میں کمال کر دیا۔ وہ اس بار کسی کے پاس نہیں آئی، بس رقص کرتی اور گاتی رہی اور لوگ نوٹ پکڑے اُس کی طرف اشارے کرتے رہے۔ پھر لوگ زِنو کی آواز کے سحر میں ایسے ڈوبے کہ ہر قسم کی آواز، چہکار بند ہو گئی۔ صرف زِنو کی سُریلی آواز گونجتی رہی جیسے اُس نے

سب کی توانائی کھینچ لی ہو۔ ابھی یہ محفل شباب پر تھی کہ سامنے سے رنت چہروں کے کئی قوی ہیکل اشخاص اس طرف آتے نظر آئے۔ ہر ایک کی نگاہ ان کی طرف اٹھ گئی۔ مجمع میں بھن بھناہٹ سی ہوئی اور زِلّو کی نغمہ سرائی پر دبی دبی سرگوشیاں غالب آگئیں۔ بجّھل کے چہرے پہ بے شمار لکیریں کھنچ گئیں۔ اُس نے کلنتے کو اشارہ کیا۔ کلنتے تیزی سے اُٹھ کے آنے والے اشخاص کی طرف دوڑا اور اُس نے آگے جاکے ہاتھ پھیلا کے بجّھل کی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

سب سے آگے ایک گرانڈیل شخص تھا، وہ قد میں پستہ اور جسم میں بھاری تھا۔ اُس نے کلنتے کا ہاتھ جھڑک دیا اور سینہ پھلائے ہوئے آگے بڑھا۔ زِلّو نے گانا روک دیا۔ ہارمونیم کی آواز سسکنے لگی اور طبلچی کے ہاتھ طبلے پر ٹھٹھر سے گئے۔ بجّھل اُٹھ کے کھڑا ہوگیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور سب سے آگے آنے والے شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "آؤ آؤ موجمدار! بیٹھو بیٹھو۔" اُس نے اپنی نشست پہ بیٹھے لوگوں کو جگہ دینے کا اشارہ کیا۔ "تم نے آکے جی خوش کر دیا۔" بجّھل نے شادمانی سے کہا۔ میں بھی بجّھل کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ اُسی لمحے میری نظر موجمدار کے ساتھ آنے والے لوگوں میں سب سے پیچھے کھڑے ہوئے چاند میاں پر پڑی۔ میرا دماغ سنسنا گیا۔ کھڑے کھڑے میرا جسم لہرا گیا۔ "ہم یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آئے ہیں اُستاد بجّھل!" موجمدار نے سخت لہجے میں کہا۔ "لڑکی ہمارے حوالے کر دو۔"

"کون سی لڑکی؟" بجّھل کے تیور بھی بدل گئے۔

"وہ لڑکی جو آج تمھارے اڈّے پر آئی ہے۔" اُس نے تندی سے کہا۔

"موجمدار!" بجّھل گرج کے بولا۔ "جو آدمی بجّھل کی پناہ میں آتا ہے، اُسے واپس نہیں کیا جاتا۔ اُس کی حفاظت کی جاتی ہے۔"

"دیکھو بجّھل! ہم تمھارے معاملے میں کبھی نہیں بولتے۔ وہ ہمارے آدمی چاند میاں کی امانت ہے، اُسے واپس کر دو اور بات مت بگاڑو۔ ایک لڑکی کے لیے ہمیں آپس میں بگاڑ نہیں کرنا چاہیے۔"

"بگاڑ؟ بگاڑ تو تم کر رہے ہو موجمدار! تم دیکھ رہے ہو کہ میں اپنے لاڈلے کی واپسی کا حسین جشن منا رہا ہوں، تمھیں آنے سے پہلے اس بات کی احتیاط رکھنی چاہیے تھی۔ ہم کبھی تمھاری خوشیوں میں اس طرح خلل نہیں دیتے۔ آؤ یہاں بیٹھ کے گانا سنو۔"

"میں گانا سننے نہیں، لڑکی لینے آیا ہوں۔" موجمدار کا لہجہ اور سخت ہوگیا۔

"میں تمھیں کوئی لڑکی نہیں دے سکتا۔"

"میں تمھیں سوچنے کا وقت دیتا ہوں۔"

"میں تمھیں آخری جواب دے رہا ہوں۔"

"بہت خون خرابہ ہو سکتا ہے استاد بجّھل!" موجمدار قہر آلود لہجے میں بولا۔ "میری بات مان لو تمھارا آدمی لڑکی کو بھگا کے لے آیا ہے۔ نمٹنا تو ہمیں اُس سے چاہیے تھا مگر ہم سیدھے تمھارے پاس چلے آئے کیونکہ وہ تمھارا آدمی ہے۔"

"وہ میرا لاڈلا ہے۔" بجّھل میری گردن میں بانہیں ڈال کے فخر سے بولا۔

"یہ ہے وہ؟" موجمدار نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں بے چاند میاں!"

وہ پیچھے مڑ کے بولا۔ "پہچانتا ہے اسے؟" چاند میاں جھجکتا ہوا آگے آیا۔ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ میرا حلیہ بدل چکا تھا اس لیے اُسے پہچاننے میں "ابے کیا ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے۔" موجمدار نے اُس کی گردن پکڑ کے کہا۔ "یہی"

"ہاں استاد یہی تھا۔ پر یہ تو نسترن کے ہاں گھر کے کام کاج تھا مگر وہ یہی تھا۔ تو یہ کسی چال سے وہاں نوکر بنا ہوا رہ رہا تھا۔"

"ہاں۔" میں نے آگے بڑھ کے کہا۔ "حرام کی اولاد! وہ میں ہی ابھی تو نے صرف مجھے لڑکی لے جاتے دیکھا ہے۔ جب میں تجھے اُس وقت دیکھنا، ابھی میرا قرضہ ادا نہیں ہوا۔ میں تیری تلاش میں تھا بعد میں نمٹوں گا۔" بجّھل نے میرا کاندھا دبایا۔ میری درشتی پر سب چمکنے لگی تھیں، دُور کھڑی ہوئی زِلّو کانپنے لگی تھی۔

"اپنے آدمی کی زبان بند کرو بجّھل!" موجمدار غضب ناک ہو کے "اس سے پوچھو کہ کیا یہ لڑکی اس کے باپ کی تھی۔" میں نے میں کہا۔ "یہ کہاں کا دعوے دار بن کے آگیا۔ اس سے کہہ دو واپس چلا چلا جائے گا، چلا جائے گا لاڈلے! تُو تو خاموش رہ۔ میں اِس کے بالی موالیوں کو دیکھ لوں گا۔ تو نے میری موجودگی میں بولنا شر" بجّھل نے مجھے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "چل اُدھر بیٹھ۔ گانا شروع کرو۔ کیوں بند کر دیا؟ لئے وہ لاجو کنجری کدھر گئی؟ گانا شروع کرو۔"

"گانا بعد میں شروع کرنا بجّھل! گانے کے لیے رات پڑی ہے بات کا جواب دو۔ لڑکی واپس کرنی ہے کہ نہیں؟"

"موجمدار تم جانتے ہو کہ بجّھل کو اس انداز میں بات کرنا پسند اور جب بجّھل کا لاڈلا درمیان میں ہو تو تمھیں سوچ سمجھ کے بولنا چاہیے جشن لاڈلے کی خاطر منایا جا رہا ہے اور اسے کم نہ سمجھنا، سات سال میرے آدمیوں نے ہر قسم کے داؤ پیچ سکھائے ہیں۔ اسے انیلامت سمجھنا۔ کوئی ہوتا تو میں تمھاری بات پر ضرور غور کرتا مگر یہ تو لاڈلے کی بات ہے کسی کنجری کو پکڑ کے نہیں لایا۔ وہ ایک بڑے خاندان کی ایک شریف لاڈلا اُسے بچا کے لایا ہے۔ سمجھے موجمدار! تم اس کتے چاند میاں میں آکر آپس میں بیکار کی تناتنی پیدا کر رہے ہو۔" بجّھل نے کبھی نرم لہجے میں کہا۔ "اس سے پوچھو کیا وہ لڑکی اس کی بہن تھی؟ اس کی ماں"

"تو تمھارا جواب یہی ہے؟" موجمدار نے سرد آواز میں کہا۔ "جواب صاف ہے۔ کیا تمھیں لکھ کر دیا جائے؟"

موجمدار نے زمین پر پیر پٹخا۔ "ٹھیک ہے بجّھل! اب ہمارا سن لو، ہم سے اب کوئی اُمید مت رکھنا۔ میں تمھیں کل شام تک اور دیتا ہوں۔ سوچ سمجھ لینا۔ لڑکی شام تک آئی تو پھر تمھارے علاقے لڑکی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ہم آزاد ہوں گے۔"

"جاؤ۔ جاؤ۔ تم بجّھل سے بات کر رہے ہو قسم ہے لاڈلے کی ہر لڑکی میری بیٹی ہے۔ تم نے اگر ایسی کوئی نادانی کی تو نکلنے جائے گی۔ بس موجمدار! تم نے بہت کہہ لیا اور ہم نے بہت سن لیا۔ گانا شروع کرو۔ زِلّو! موجمدار! تمھاری دوستی کا خیال ہے ورنہ میرے علاقے میں سے اس طرح کی باتیں کرنے والا واپس نہیں جاتا۔"

بجّھل کی آواز فضا میں گرجی تو طبلے والے نے سہم کے ہتھیلی تھپ اور ہارمونیم والے نے جلدی جلدی ہاتھ مارنے شروع کر دیے۔ زِلّو کے گھنگرو حرکت میں آگئے۔ موجمدار چند لمحے ٹھیرا۔ پھر سارے مجمع کو نفرت سے گھورتا ہوا واپس جانے لگا۔ جاتے جاتے وہ دوبارہ ٹھیرا اور بلند آواز میں بولا۔ "کل شام تک بجّھل! ہم کل شام تک انتظار کریں گے۔"

کلنتے، شرفو، لیلا اور سارٹے وغیرہ ہاتھوں میں کھلے چاقو لیے بجّھل کے اردگرد کھڑے تھے، اُن کے جسم اکڑے ہوئے تھے۔ کلنتے نے ہاتھ اُٹھایا تو بجّھل نے اُس کا بازو پکڑ کے مروڑ دیا۔ کلنتے کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا اور وہ زمین پر تین چار لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک طرف بلکنے لگا۔ "واپس جاتے ہوئے آدمی پر ہاتھ اٹھاتا ہے بے غیرت!" بجّھل نے نفرت سے کہا اور خاموشی سے اپنی نشست پر آکے بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ غصّے سے تمتما سا تھا۔

محفل میں سخت کشیدگی پائی جاتی تھی۔ بجّھل کو اس کا احساس شاید سب سے زیادہ تھا۔ اُس نے روپے لٹانے شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ محفل پر بہار آگئی۔ جیسے ابھی یہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ طوائفوں نے بھی رنگیلے ناچ اور گانوں سے کبیدگی دُور کرنے کا کام کیا۔ پھر ہر طرف سے روپے برسات بجنے لگی۔ یہ دھوم آدھی رات تک مچتی رہیں۔ طوائفیں روپے لوٹتے لوٹتے تھک گئیں۔ نصیب میاں میرے پاس ہی بیٹھا تبصرے کرتا جاتا تھا اور زِلّو کی گائیکی پہ بار بار پھڑک اُٹھتا تھا۔ "اے میاں لاڈلے! دیکھتے ہو، عشق کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آہاہا۔ کیا ستار گلا پایا ہے، پنڈا تو دیکھو، شباب امڈا پڑ رہا ہے، شراب کا پیالہ ہے، رنگ تو دیکھو ہاتھ لگاؤ تو میلا ہو جائے۔ اے جانی! دیکھتے ہو، وہ تمھاری طرف آ رہی ہے۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کے رکھنا، یہ آنکھیں جلا کے رکھ دیتی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہو، سارا جسم جھلسا ہوا ہے۔" نصیب میاں کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ میدان میں کود کے زِلّو کے ساتھ ناچنے لگے۔

جاتی رات کو روشنیاں ماند پڑنے لگیں۔ سازندوں نے ساز غلاف میں لپیٹے اور طوائفوں نے پیروں سے گھنگرو کھولے۔ پھر بجّھل کو آداب کرتی ہوئی وہ ٹم ٹم میں بیٹھ کے اپنے ٹھکانے چلی گئیں۔ کسی نے اب تک موجمدار کے متعلق بجّھل سے بات کرنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ سب لوگ دوبارہ راگ رنگ میں شامل ہو گئے تھے۔ صرف میں ایک ایسا شخص تھا جو یہاں نہیں بیٹھا تھا۔ خیال میں تو چاند میاں کا تعاقب کر رہا تھا، بار بار میرا ہاتھ اُس کے گریبان تک جاتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تو کورا بیٹھی تھی۔ میری تپتی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ وہ کوئی اور شخص تھا جو نصیب میاں کے تبصرے سن رہا تھا اور زِلّو کا ناچ دیکھ رہا تھا۔ وہ سموچا آدمی نہیں تھا، آدھا آدمی تھا۔

اڈّے پر واپس آ کے بجّھل اپنے پلنگ پر ڈھے گیا۔ میں سامنے دھری ہوئی کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ "کیا تو اوپر جا کے سوئے گا؟" بجّھل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"تم کیا سمجھ رہے ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"تو کاہے کو منہ لٹکائے بیٹھا ہے پیارے! اب آرام کر، دن بھر میں تھک گیا ہوگا۔" وہ انگڑائی لے کے بولا۔

"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کیا موجمدار کا خیال آگیا ہے؟" بجّھل بے پروائی سے بولا۔

"میں نے یہاں آکے بُرا کیا۔" میں نے یاسیت سے کہا۔ "میں اگر اُسے لے کے کہیں اور نکل جاتا تو یہ نوبت نہ پہنچتی۔"

وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "ادھر آ لاڈلے! یہ تو کیا بک رہا ہے اور کس زبان سے بک رہا ہے۔ تو میرے پاس نہ آتا تو اور کہاں جاتا۔ میں نے تیرا برسوں انتظار کیا ہے۔ اب آیا ہے تو ایسی باتیں کرنے لگا۔ تُو میرا دل دُکھا رہا ہے۔ تیرے لیے تو میں نے نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ تُو سب کچھ خاک میں ملائے دے رہا ہے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے، تم غلط سمجھے۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ ایک لڑکی کسی بہت بڑے ہنگامے کا سبب بن سکتی ہے اور یہ سب میری وجہ سے ہوگا۔"

"ہوگا تو کیا ہوگا۔" وہ بگڑ کے بولا۔ "ابے کیا دنیا کو سُسرے دانی کی سلائی سمجھ لیا ہے۔ یہ کتّے کی دُم ہے۔ تُو نے تو میرا جی خوش کیا ہے لاڈلے! اگر تیری پروا میں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ تیری غلطی میری غلطی ہے۔ بس چپ رہ اور زیادہ بات نہ کر۔"

"تم نہیں سمجھتے، وہ لڑکی مجھے راستے میں مل گئی تھی۔"

"ہر شخص کسی نہ کسی کو کسی نہ کسی راستے ہی میں ملتا ہے۔ یہ راستے اسی لیے ہیں لاڈلے کہ لوگ ایک دوسرے سے ملا کریں۔ وہ لڑکی کہیں بھی ملی ہو، اب تو ہماری عزت ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر...." میں کہتے کہتے رہ گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔" وہ چڑ کے بولا۔ "لاڈلے میاں! تُو جو بات کہنا چاہتا ہے، وہ مجھے معلوم ہے، یہ جو تو گھٹا گھٹا رہتا ہے۔ اپنے آپ میں گم، یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ تو دل کھول کے بات نہیں کرتا، میں نے یہ بات جیل ہی میں محسوس کر لی تھی۔ میں جانتا ہوں یہی لڑکی تھی نا وہ جس کے لیے تو نے اُس اُچکے کریم گُل کو مارا تھا؟ جسے تو یاد کرتا رہتا تھا؟"

"نہیں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "یہ لڑکی وہ نہیں ہے۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ لڑکی تو مجھے راستے میں مل گئی۔"

بجّھل چونک کے مجھے گھورنے لگا۔ "ابے تو بات صاف صاف کر۔"

میں نے سوچا بجّھل کو ساری بات بتا دوں کہ وہ لڑکی کون تھی لیکن

یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے اپنی زبان کی لگام تھامی اور کہا: "میں اُسے تلاش کر رہا ہوں۔"
"وہ کہاں ہے؟ مجھے بتا۔ وہ ہندوستان، ایران توران کے کسی کونے میں ہو، میں تیرے لیے اُسے لا دوں گا۔"
"یہی تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔
"کوئی اتا پتا؟ کوئی نشانی؟" اُس نے میرا ہاتھ کھینچ کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا: "کیا وہ بہت خوب صورت تھی؟ تیری پسند ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی۔"
"وہ بہت خوب صورت تھی۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔
"تُو نے اُسے کب سے نہیں دیکھا؟"
"جب سے میں جیل گیا ہوں۔ سات سال سے زیادہ ہوگئے۔" میری آواز بھیگ گئی۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا۔
"اے لاڈلے! اے لاڈلے! ابے تُو تو بہت تھڑ دلا ہے۔ ہائیں رو تا ہے؟ مرد ہوکے روتا ہے! ابے یہاں نہ جانے کیا کیا گزر گیا۔ ہمیشہ آنکھوں کو مات دے دی۔ جب بھی آنکھوں نے کمزوری دکھائی، کسی دوسری طرف دیکھنے لگے۔ آنکھوں کو دھوکا دے دیا۔ میری جان مجھے بتا وہ کون تھی؟ کہاں تھی اور کیسے تجھ سے دُور ہوگئی؟ کچھ تُو نے بتایا، کچھ کریم گل کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ تیرے ساتھ ایک بہت خوب صورت لڑکی تھی جس پہ اُس نے بُری نظر ڈالی تھی۔ جیل میں آنے کا واقعہ تُو نے دوسرا سنایا، میرا خیال ہے تُو مجھ سے جھوٹ بولتا رہا۔ بتا دے اُسی لڑکی کا چکر تھا نا؟ کسی کا نام بھی جانتا ہے، اُسے کون لے گیا۔"
"نہیں نہیں، کچھ نہیں، میں کچھ نہیں جانتا۔" اگر چاند میاں موجمدار کے ساتھ یہاں نہ آتا تو شاید میں بچل کو چاند میاں کا نام بتا دیتا یا شاید پھر بھی نہ بتاتا۔
بچل گہری سوچ میں ڈوب گیا: "لاڈلے! اگر ایک بات تو بتا، تو چاند میاں کو دیکھ کے اتنا کیوں بھڑک گیا تھا؟ سبھی کو اس پر حیرت ہوئی تھی۔ اُس پہ تیرا کون سا قرضہ ہے جو تجھے ادا کرنا ہے؟ اشارہ تو کر، اُسے ابھی اُٹھوا لوں۔"
مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا: "وہ تو ... وہ تو زریں کا معاملہ تھا۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا: "زریں کے ساتھ اُس نے زیادتی کی تھی۔"
"نہیں کچھ اور بات بھی ہے۔ تُو چھپا رہا ہے۔"
"میں کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ میری تلخی دیکھ کے بچل چپ ہوگیا۔ اگر میں اُس سے یہ کہہ دیتا کہ چاند میاں ہی وہ شخص ہے جس نے نسترن سے کورا کا سودا کرنا چاہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اُسی نے ہمارے پیچھے بدمعاش لگائے تھے تو بچل اپنے قول کے مطابق صرف چند ساعتوں میں چاند میاں کو یہاں میرے قدموں میں ڈال سکتا تھا۔ چاہے بعد میں اُسے موجمدار کے آدمیوں سے کتنا ہی بڑا فساد مول لینا پڑتا مگر مجھے یہ بتاتے ہوئے کچھ لرزدی محسوس ہوتی تھی۔ جرم کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے میں نے کورا کو رسوا کر دیا ہو۔ میں ایک کمزور آدمی ثابت ہوا، کورا کا بوجھ نہیں اُٹھا سکا۔ جیسے میں ہار گیا اور میری آگ بجھنے لگی اور مجھ سے کچھ بن نہ سکا تو میں نے اپنی مدد کے لیے لوگوں کو بلا لیا۔ ابھی کچھ پتہ نہیں کورا کہاں ہو؟ کس حال میں ہو۔ اگر اُس کا نام طشت از بام ہو جائے گا تو وہ کیا کہے گی۔ مجھے ایک ملال سا محسوس ہوتا تھا اور اگر خدا نہ کرے کورا کا حال کچھ انھیں معلوم ہوا تو ایک ... ملے ہے۔ پھر اُس رات انھوں نے مولوی صاحب کو ختم کر دیا تھا۔ اس لڑ... ہوئے معاملے میں بچل اور اُس کا گروہ پڑ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ میں تو ... دیکھتا رہ جاؤں گا اور لوگ تماشا دیکھیں گے۔ میں نے بچل کو کچھ نہیں بتایا ... وہ جانتا تھا کہ میں اُس سے کچھ چھپا رہا ہوں۔
"سن میرے طوطے!" بچل فیصلہ کن انداز میں بولا: "اب یہ بار ... کھل کے سامنے آگئی ہے کہ تُو بچل کے جنگل کا جانور ہے۔ اب تُو اپنے ... کوئی قدم اُٹھانے کی نادانی نہ کرنا۔ موجمدار کے لوگ پتلا نہیں موتتے۔ تُو کوئی ... ویسی بات کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لینا۔ اپنے پاس بھی لوگوں کی ... نہیں ہے۔"
"اور زریں کے متعلق تم نے کیا سوچا ہے؟" میں نے اُس کا دھیان ... ہٹانے کے لیے کہا: "فرض کرو، موجمدار کے آدمی پاگل پنا کرنے لگیں؟"
"ہم وقت پر سوچتے ہیں جانو! پہلے سوچتے تو یہاں نہ بیٹھے ہوتے ... شمار بھی آدمیوں میں ہوتا۔ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔" وہ جماہی لے کے بولا: "اب سو جا۔ تُو تو آتے ہی پریشان ہونے لگا۔ ابھی کچھ دن آرام کر۔ تیرے پیروں کے گھٹے میں نے دیکھ لیے ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا ہے۔" وہ چادر تان کے لیٹ گیا۔ میں کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا، پھر ... کے برابر کے کمرے میں آگیا۔ بچل نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ ... جاؤں۔ میرے لیے سونا اور کھانا اتنا آسان ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ ... جیسے تیسے زہر مار کر لیتا تھا۔ جیل سے آنے کے بعد بھوک اور نیند ... ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی مالا کے دانے پرونے شروع کر دیے اور باقی رات ... اُسے اپنے چہرے پہ رکھ کے کھیلتا رہا۔ صبح سویرے مرغوں کی بانگ ... کسمساتا ہوا اُٹھا۔ بچل سو رہا تھا۔ میری ایک ذرا سی آہٹ پر وہ بیدار ہو ...
"کون ہے؟" اُس نے ہڑبڑا کے پوچھا۔
"میں ہوں اور کون؟" میں نے مختصر جواب دیا۔
اُس نے آنکھیں کھول دیں: "نیند نہیں آ رہی ہے؟"
"صبح ہوگئی ہے۔" میں نے تندی سے کہا۔
"ابے یہ کیسی جوانی ہے۔ جا سو جا۔" وہ کروٹ لے کے بولا۔
میں دبے قدموں چلتا ہوا اُس چاقو کے نزدیک پہنچا جو بچل ... رکھا ہوا تھا۔ جب بچل کی گہری سانسیں تواتر کے ساتھ شروع ہوگئیں ... یقین ہوگیا کہ وہ سو گیا ہے۔ میں پنجوں کے بل اُس کے سرہانے کے ...
... میں نے دھیرے دھیرے پلنگ کی طرف ہاتھ بڑھانا شروع کیا۔
... دیا پھر میں ... جانتا تھا کہ بچل کروٹ بدلنے کی کوشش کرتا تو میں ایک لمحے میں ... ہاتھ پھیلا کے اُس سے دُور جا پہنچتا۔ اب میرا ہاتھ چاقو چھونے لگا ... اور میں نے اپنی سانس روکی ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے چاقو اُٹھایا ... بچل نے کروٹ بدلی۔ میرا دل اُچھل کے حلق میں آگیا لیکن میں ایک جست ... اُس کے پلنگ سے چند قدم کے فاصلے پر آنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ... نے پھر آنکھیں کھول دیں اور خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا۔ نیم تاریک ... میں اُس کی سُرخ سُرخ آنکھیں دو چراغوں کے مانند جل رہی تھیں۔
"... طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے کیا؟" وہ بے چینی سے بولا۔
"نہیں، میں ذرا سویرے اُٹھنے کا عادی ہوں۔"
"ہاں جیسے میں تو تیری عادتیں جانتا نہیں۔ ایک ایک بات کی خبر ... تھا۔ جب تیرے ساتھ جیل میں نہ رہا تو لوگوں سے پوچھ لیا کرتا تھا۔"
"میں باہر جا رہا ہوں، کچھ دیر ٹہل کے آ جاؤں گا۔"
"اکیلے مت جانا، تھوڑی دیر میں کوئی جاگ جائے گا۔"
"تم مجھے بالکل بچہ سمجھتے ہو۔"
"تو میرے لیے ابھی تک بچہ ہے۔ مجھے یاد ہے جب تیری مسیں بھی ... بھیگی تھیں اور تو ڈرا ڈرا سہما سہما سلاخوں کے اندر بیٹھا تھا۔ یاد ہے نا؟"
"ہاں یاد ہے مگر میں ڈرا ہوا تو نہیں تھا۔"
"ہاں! تو شیر کا بچہ ہے۔ تُو نے کانتے کو پچھاڑا، کریم گل کو چت کیا، ... رٹے کو بے بس کیا اور رات بھی تیری زور دم زور دیکھ لی۔" وہ نیند سے اُٹھ ... اس طرح باتیں کر رہا تھا، گویا سویا ہی نہ ہو۔ میں نے اپنی پشت پر چاقو ... چھپا لیا تھا۔ بچل پھر اونگھنے لگا تو میں موقع دیکھ کے چپکے سے باہر نکل آیا۔ ... دروازہ بند تھا۔ نصیب میاں برآمدے میں سو رہا تھا اور دوسرے لوگ ... اِدھر اُدھر پلنگ ڈالے پڑے تھے۔ میں نے کنڈی کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوگیا ... اُسے کھولنا آسان نہیں ہے، سب جاگ جائیں گے اور شور سن کے بچل ... باہر آ جائے گا۔ باہر دروازے پر چوکی دار بھی ہوگا۔ جلد ہی مجھے اپنی ... غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں دوبارہ بچل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ جاگ گیا ... میرے پہنچتے ہی مسکرا کے مجھے دیکھنے لگا اور اُٹھ کے باتھ روم کی طرف ... بڑھ گیا۔ میں نے اُس کا چاقو تکیے کے نیچے رکھ دیا اور دوسرے کمرے میں ... تکیے پر سر ٹکا دیا۔ جب باہر آوازیں آنے لگیں تو میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ بچل برآمدے میں ... چائے پی رہا تھا اور ایک لڑکا اُس کے جسم کی مالش کر رہا تھا۔ نصیب میاں ... کے قریب کھاتے گالیاں کھاتے ہوئے بیٹھا تھا۔ چائے کی پیالی اُس کے ... نے بھی رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کے نصیب میاں نے آواز لگائی: "تالے چھو کرے! ... لاؤ۔ اپنا خورشید نکل آیا ہے۔"
مالش سے نمٹ کے بچل نہانے چلا گیا اور میں نے نصیب میاں کو ... کسی نہ کسی طرح ایک چاقو حاصل کر لیا۔ نصیب میاں نے مجھے پانچ روپے ... دیے۔ اُس کی آنکھ اوجھل ہونے کی دیر تھی کہ میں سامنے والے دروازے سے نکل کے بھاگا۔ یہ مکان دو طرف سے کھلتا تھا۔ کچھ اور دروازے بھی یقیناً ہوں گے جو ابھی میرے علم میں نہیں آئے تھے۔ جس دروازے سے میں باہر نکلا، وہاں ایک تنگ گلی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی دُور تک چلی گئی تھی۔ گلی کے درمیان دوسری گلیوں میں جانے کے لیے مختصر راستے بھی بنے ہوئے تھے۔ مکان سے کچھ فاصلے تک تو میں آہستہ آہستہ چلا۔ رات کے تماش بینوں کی مجھ پر نظر پڑی تو انھوں نے جگہ جگہ مجھے سلام کیا لیکن اگلے چند منٹوں میں میں دوسری پھر تیسری اور پھر بڑی سڑک پر تھا۔ میں نے سوچا، پہلے چل کے نسترن کا حال کیوں نہ پوچھوں لیکن ٹیکسی میں بیٹھتے ہی میں نے کیلا ایگان کا نام لیا۔ نصیب میاں نے الماری سے نیا اور تیز دھار والا لمبا چاقو مجھے دیا تھا۔ میں نے چاقو نیفے میں اُڑس لیا تھا۔ بچل کے گھر سے کیلا ایگان کا فاصلہ خاصا تھا۔ ٹیکسی آڑے ترچھے راستوں سے گزرتی ہوئی آخر کیلا ایگان کے علاقے میں پہنچ گئی۔ چاند میاں جیسے لوگوں کا پتہ چائے خانوں، پان فروشوں یا حجام کی دکانوں سے آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ تین چار دکانوں پر تگ و دو کے بعد مجھے اُس کے مکان تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ متوسط درجے کے فلیٹوں کا علاقہ تھا۔ کوئی عمارت بڑی تھی، کوئی چھوٹی۔ ایک ایک منزل کی عمارتیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ چاند میاں کا گھر نسبتہً پُرسکون جگہ واقع تھا۔ اچھا خاصا صاف ستھرا۔ گاڑی رکھنے کی جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔ اِردگرد خاموش اور بے نیاز عمارتیں تھیں۔ مجھے احساس تھا کہ چاند میاں اپنے پیشے کے لحاظ سے عام مکانوں سے ذرا مختلف مکان میں رہتا ہوگا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ گیٹ کے ساتھ چاروں طرف لمبی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے عمارت کے گرد ایک چکر لگایا۔ پیچھے کی گلی میں بھی ایک راستہ تھا۔ میری دستک پہ مسخ چہرے کی ایک عورت نے دروازہ کھولا اور منہ بنا کے پوچھا: "کس کو مانگتا ہے؟"
"چاند میاں کو۔" میں نے تحمل سے جواب دیا۔
"چاند میاں کو؟" اُس نے پھر مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور بولی: "وہ تو آج کل خالی بیٹھا ہے، اُس کے پاس کیا رکھا ہے۔"
"مجھے اُس سے ملنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔
"کیا آپ باہر سے آیا؟" میرا لباس دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی: "پٹنہ سے کہ ڈھاکا سے؟"
میں نے تنگ آ کے جواب دیا: "لکھنؤ سے۔"
"کب آیا؟" وہ پُرشوق لہجے میں بولی۔
"کل رات آیا۔" میں نے تلملا کے کہا۔
اُس نے آنکھ ماری: "اندر آؤ۔" میں نے اُس سے دوبارہ چاند میاں کی موجودگی کے بارے میں پوچھا۔ وہ مجھے اندر لے گئی اور ایک آراستہ کمرے میں بٹھا کے چند لمحوں بعد ایک گداز بدن کی اوھیڑ عمر عورت کو ساتھ لے آئی۔ عورت مجھ پر تیز نظریں ڈالتی ہوئی آہستہ قدموں سے آگے بڑھی اور معنی خیز انداز میں بولی:
"چاند میاں بھی اپنا عزیز ہے۔ ہم بھی تمھاری خاطر تواضع میں کمی نہیں کریں گے۔ جو کام تم کو چاند میاں سے لینا ہے، وہ ہم سے کہہ کے دیکھو۔"

"مجھے چاند میاں سے ملنا ہے۔" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مل لینا اُس سے بھی۔ یہاں بھی قدرداں لوگ رہتے ہیں ذرا چائے وغیرہ تو پی لو۔ رانی! دَوڑ کے چائے لاؤ۔"

"کیا چاند میاں یہاں نہیں رہتا؟" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے بٹھا لیا۔ "چاند میاں کا مہمان اپنا مہمان ہے۔" وہ کھسک کے میرے قریب آگئی اور رازداری سے کہنے لگی "کچھ لینے آئے ہو؟" میں نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا اور ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ مسکرانے لگی۔ "تو کچھ دینے آئے ہو؟"

اسی اثنا میں ایک نوجوان شوخ لڑکی اپنے حال سے بیگانہ ہانپتی ہوئی اندر آئی۔ "کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں میں نے چائے کے لیے تمھیں آواز دی تھی۔ دیکھو! ایک مہمان آیا ہے' ناشتے وغیرہ کا انتظام کرو۔" اُس نے تکلف سے کہا۔ لڑکی ناخن منہ میں لیے مجھے مُڑ مُڑ کے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ پھر عورت نے لاکھ مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میری سمجھ میں ساری بات آگئی تھی۔ میں نہیں رُکا۔ میرے چلتے چلتے وہ کہنے لگی۔ "چاند میاں سے بات نہ بنے تو یہ دروازہ کھلا ہے' میرا نام دینا ہے۔" میں پیر پٹختا ہوا باہر آگیا۔ وہ ساری عمارت چاند میاں کے ہم پیشہ لوگوں سے آباد تھی۔

خوش قسمتی سے تیسرا دروازہ خود چاند میاں نے کھولا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کے سکتے میں رہ گیا۔ "تم؟" وہ رعشہ زدہ آواز میں بولا۔

"ہاں میں۔" میں نے پھرتی سے چاقو نکال کے کھر رکھر ننگا کر دیا۔

"تم کیوں آئے ہو؟" وہ گھگیا کے بولا۔

میں نے اُس کے منہ پہ ایک مکّا مارا۔ اُس کا سر دیوار سے لگتے لگتے بچا۔

"میں ایک پُرانا حساب چکانے آیا ہوں۔" میں نے تھوک کر کہا۔

"کیسا حساب؟" اُس کی نظریں چاقو پر جمی ہوئی تھیں۔

"پُرانا حساب ہے۔"

"تمھیں غلطی ہوئی ہے' مجھ سے نسترن بیگم بھی کہہ رہی تھی کہ تم کسی سات سال پرانی بات کا ذکر کر رہے تھے۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی اور تم بھی بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔ بات تمھارے لیے پُرانی ہے مگر میرے لیے بالکل نئی ہے۔ مجھے بتاؤ' وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"تم کس لڑکی کا ذکر کر رہے ہو؟ یہاں تو لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے تمھیں سات سال پہلے کبھی دیکھا ہو۔" وہ اپنے ہوش و حواس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"میں تمھیں ساری بات یاد دلائے دیتا ہوں۔ اگر تمھیں آسانی سے یاد نہیں آیا تو یہ چاقو تمھارا حافظہ کُرید کے تمھیں یاد دلائے گا۔ میں تمھارے چہرے کبھی فراموش نہیں کر سکتا' یاد ہے' تم نے اور اُس کمین کی بچی سچی بی نے سات ساڑھے سات سال پہلے نسترن بیگم اور کریم گل نے سینما گھر میں ایک کم عمر لڑکی کا سودا کیا تھا۔ تمھارے' نسترن اور کریم گل کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ میرے ساتھ برقع میں ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ جب میں ہوٹل سے فرار ہو گیا تو کریم گل نے ہمارا تعاقب کیا مگر وہ ہمیں ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ میں سچی بی کی ہوس ناک نظریں دیکھ لی تھیں۔ تم نے شکست قبول نہیں کی۔ تلاش کرتے رہے اور آخر تم نے ہمارا سراغ لگا ہی لیا۔ اُس رات تینوں دریا کے کنارے سیر کے لیے گئے تھے تو تمھارے آدمیوں نے۔۔۔ کچھ یاد آیا؟ یہ ایسا واقعہ نہیں ہے جو تم آسانی سے بھول سکو۔ ایک کانسٹیبل اور تمھارے دو آدمی مارے گئے تھے' باقی دو بدمعاش ا۔۔۔ گئے ہو۔ میں وہی قرض چکانے آیا ہوں۔ افسوس ہے' چاقو وہ نہیں اور اس کی دھار بھی پہلے والے چاقو سے تیز ہے اور اب مجھے اس فن بھی آتا ہے۔"

اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ خوف سے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ چاقو کی نوک اُس کی گردن پہ ٹکا دی۔ "چاند میاں! میں جاننا چاہتا ہوں وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے تمھارے پیچھے بدمعاش نہیں۔۔۔"

"تمھارے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں کریم گل کو بھگت چکا۔ آخری آدمی ہو جس کے پاس میں ہر طرف سے مطمئن ہو کے آیا ہوں۔ کچھ صاف صاف بتا دو' شاید اِس طرح تمھاری جان چھوٹ جائے۔ مجھے صحیح و سلامت واپس مل گئی۔"

"لڑکی کہاں ہے' مجھے لڑکی کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں' میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔"

"تمھاری قسمیں؟ چاند میاں!" میں نے چاقو کی نوک اُس میں چبھو دی۔ "میں قسمیں سُننے نہیں آیا ہوں' لڑکی کا پتہ بتاؤ' باقی۔۔۔"

"لڑکی۔ لڑکی نہیں ملی' لڑکی نہیں ملی تھی۔" وہ کانپتے ہوئے۔۔۔

"لڑکی گئی کہاں؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"لڑکی۔ مجھے یاد آیا۔ ٹھہرو' ٹھہرو' بتاتا ہوں۔ جب دونوں کانسٹیبل کی سیٹیوں کی آواز سُنی تو لڑکی کو چھوڑ کے بھاگ گئے اور۔۔۔ میاں کے پاس رہ گئی۔"

میری سانس رُک گئی۔ "کیا تم بھی اُن کے ساتھ تھے؟ کرو چاند میاں! ذہن پر زور ڈالو۔" میں نے اُس کے پیٹ میں ایک گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ میرا دوسرا ہاتھ چاقو سمیت اُس کی گردن پر تھا۔ وہ بلبلا اُٹھا۔

"میں اُن کے ساتھ نہیں تھا لیکن انھوں نے آ کے مجھے۔۔۔"

"سچ سچ بتاؤ چاند میاں! جھوٹ کا نتیجہ بُرا ہو گا۔ ایک۔۔۔"

"میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اپنی ماں۔۔۔" وہ ماں۔۔۔ والا تھا لیکن میری آنکھوں کی سُرخی دیکھ کے اُس کی زبان مفلوج۔۔۔

"ممکن ہے' انھوں نے لڑکی تم سے چھپا لی ہو؟"

"وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے بہت دنوں تک اُن کا۔۔۔ مگر ٹھہرو' ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو کیونکہ ایک آدمی نے کچھ دنوں۔۔۔ بتایا تھا۔" وہ اٹک اٹک کے بولا۔

"یہ چال بازی کا وقت نہیں ہے۔" میں نے اپنے جوتے سے اُس کے پاؤں کی انگلیوں پر ضرب لگائی۔ وہ ایک زمین کھڑاؤں پہنے ہوئے تھا۔ "کون تھے وہ آدمی؟"

"وہ بہت معمولی آدمی تھے' کرائے کے آدمی۔"

"اُن کا تعلق کس گروہ سے تھا؟"

"کسی سے نہیں۔ وہ چار پانچ آدمیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا۔ مگر اُن کا ایک آدمی موجمدار کے گروہ میں شامل ہے۔" اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"مجھے اُس کے پاس لے چلو' اگر بات صاف نہ ہوئی تو میں تم دونوں کو ایک ساتھ جہنم رسید کر دوں گا۔ جھوٹ اور فریب سے کام نہیں بنے گا چاند میاں! تم مجھے نہیں جانتے۔ میں اِس وقت تمھیں زندگی اُدھار دے رہا ہوں' چلو۔" میں نے اُس کی ناک پر مکّا مارتے ہوئے کہا۔ ناک سے خون بہنے لگا۔ چاند میاں بُری طرح گھبرا گیا تھا۔

"میں وہاں جا کے کیا کروں گا؟" وہ تھرتھراتے ہوئے بولا۔

"تمھارے سامنے بات ہو گی چاند میاں! آج کا دن تمھاری زندگی یا موت کا دن ہے' چلو۔" میں نے دروازے کی طرف اُسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا زینے پر گرا۔ میں نے چاقو جیب میں رکھ لیا۔ چاند میاں کی حالت ایسی تھی کہ اُس کے لیے میرے ساتھ خاموشی سے چلنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں گھونسے نشانوں پہ لگا رہا تھا۔ وہ اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے وہ میری خوشامد کرنے لگا۔ چاقو کی دھار دوبارہ دکھانے پر وہ کہیں چپ ہوا۔

چاند میاں میرے ساتھ تھا۔ کورا کو مجھ سے جدا کرنے والا شخص' چاند میاں جس نے وہ سہانی اور سنہری رات گرمی اور تیرگی میں بدل دی تھی۔ اُس وقت مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ میرے جسم میں جنگل جل رہا تھا۔ میری رگیں چٹخ رہی تھیں۔ ٹیکسی کی رفتار سُست تھی یا مجھے سُست محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے کا حکم دیا۔ چاند میاں مجھے اُس شخص کے پاس لے جا رہا تھا جس نے کورا کے نازک ہاتھوں کو اذیت دینے کا جرم کیا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ میں پہلے اُس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالوں گا کیونکہ وہ ہاتھ کورا پر اُٹھے تھے اور وہ آنکھیں نکال لوں گا جنھوں نے کورا پر بُری نگاہ ڈالی تھی۔ اگر اُسے کورا کا پتہ معلوم ہوا' اگر اُس نے بتا دیا کہ کورا کہاں ہے' اگر اُس نے بتایا بھی تو وہ کوئی اچھی جگہ نہیں ہو گی۔ میں تو وہاں جاتے جاتے راستے میں دم توڑ دوں گا۔ اے کاش وہ انکار کر دے کہہ دے کہ کورا اُن کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔

گاڑی تنگ گلی کے ایک بڑے مکان کے سامنے رُک گئی۔ چاند میاں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کے کرایہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر میں نے ٹیکسی والے کو حکم دیا کہ وہ ہمارا انتظار کرے۔ ٹیکسی والا صورتِ حال بڑی حد تک سمجھ چکا تھا' خاموش ہو گیا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں دو چار ایسے آدمی موجود تھے جن کے چہرے پیشے پہ لکھے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے آگے بڑھنے میں کچھ تامل ہوا کہ چاند میاں مجھے کسی اور جگہ تو نہیں لے آیا لیکن اب میں ڈیوڑھی میں داخل ہو چکا تھا۔ چاند میاں کو اندر بھیج کر اُس بدمعاش کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فرار کا اس سے اچھا موقع چاند میاں کو پھر کب نصیب ہوتا۔ میں نے چاقو ہاتھ میں رکھ لیا۔ مختصر ڈیوڑھی میں تین چار آدمیوں نے درشتی سے ہمیں دیکھا اور حقارت سے زمین پر تھوک کے رہ گئے۔ اگر میں تنہا ہوتا تو وہ مجھ سے ضرور باز پرس کرتے مگر میرے ساتھ چاند میاں تھا اور اُس نے یقیناً کوئی اشارہ کیا تھا اسی لیے اُن کے ہماری طرف بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ جب ہم آگے نکل گئے تو وہ کچھ فاصلے سے ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میں نے چاقو کھول لیا اور چاند میاں کا ہاتھ پکڑ کے اُسے اس کی پُشت سے ٹکا دیا۔ چاقو کی نوک اب چاند میاں کی ذرا سی غیر مشتبہ حرکت کی متحمل نہ ہوتی۔ یہ مکان نسترن کے مکان جیسا پیچیدہ تو نہیں تھا مگر عمارت اور ہیبت میں اُس سے کچھ کم بھی نہیں تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی میں نے آگے پیچھے اِدھر اُدھر سونگھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے پوچھنا چاہا کہ وہ کہاں جا رہا ہے لیکن مجھ سے اپنی یہ ہتک نہیں ہو سکی میری نہیں تو کم سے کم یہ اُس چاقو کی ضرور ہتک تھی جو میرے ہاتھ میں مچل رہا تھا۔ اب جہاں بھی آ گئے تھے' ٹھیک تھا۔ ایک دروازہ عبور کر کے ہم ایک بڑے ہال میں آ گئے۔ ہال کا درمیانی حصہ کھلا ہوا تھا۔ چاروں طرف ستونوں پر ایک بڑا پختہ سائبان بنا ہوا تھا اور اندر۔ ہر طرف کمرے تھے' جیسے ہندوؤں کی کوئی دھرم شالہ۔ سائبان کے اندر کمروں کے آگے اِدھر اُدھر چوکیاں پڑی تھیں اور دو تین پارٹیاں تاش کھیل رہی تھیں۔ درمیان میں ایک چوکی پر موجمدار بیٹھا ہوا تھا۔ ایک لڑکا اُس کی پنڈلیوں کی مالش کر رہا تھا' دوسرا کاندھے دبا رہا تھا۔ وہ ایک بنیان اور دھوتی میں بیٹھا اینڈ رہا تھا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ اُس نے ایک لڑکے کو ہاتھ' دوسرے کو ٹانگ مار کے پرے دھکیل دیا اور پُشت سیدھی کر کے مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ "اُستاد جی!" چاند میاں نے لرزتے ہوئے فریاد کی۔ "بینی کہاں ہے؟"

"کون بینی؟" موجمدار نے کڑک کے پوچھا۔

"بینی' بینی' اپنا بینی اُستاد!" چاند میاں نے مظلوم آواز میں کہا۔

موجمدار نے چند لمحے توقف کیا پھر اُس کے ہونٹ مسکراہٹ سے چمکنے لگے۔ "بینی۔ ہاں بینی۔ بینی کی تجھے کیا ضرورت پڑ گئی چاند میاں؟ ہم سے بات کر۔"

"لاڈلے کو بینی کی ضرورت ہے۔" چاند میاں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ہم جو یہاں بیٹھے ہیں' آ اِدھر آ کے بیٹھ۔"

"اُستاد بینی کا پتہ بتا دو' وہ اس وقت کہاں ہو گا؟"

موجمدار نے اپنی دھوتی کی طرف اشارہ کر کے گالی دی اور کہنے لگا۔ "میں تو سمجھا تھا نسترن نے صبح صبح لڑکی بھیج دی ورنہ لاڈلے اور نسترن سے تو شام کو جھنجٹ ہوتی۔"

"وہ شام کبھی نہیں آئے گی موجمدار!" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"خیر وہ تو شام کو دیکھا جائے گا۔ ہم جو وقت دیتے ہیں اُس سے پہلے

بتھیلا اُٹھانا پاپ سمجھتے ہیں تمام تک لاڈلے سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تو بتا کیسے آیا؟ یہ مینی کا کیا معاملہ ہے؟ ذرا سمجھ میں آنے والی بات کر۔"

"استاد موجی! لاڈلے کو مینی کی تلاش ہے۔"

"کیوں؟ لاڈلے کو ہمارے آدمی کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"یہ اس کا اور لاڈلے کا پرانا معاملہ ہے۔ اس معاملے میں تم نہ بولو۔" چاند میاں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "بتاؤ استاد! مینی کہاں ہے؟"

"ارے مینی بھی آ جائے گا سالا، وہ کدھر جائے گا۔ آ لاڈلے ادھر آ کے بیٹھ۔ تو بتھل کا لاڈلا ہے تو اپنا بھی لاڈلا ہے۔"

"موجدار! اس بدمعاش کو میرے حوالے کر دو۔" غصے میں چاقو کی نوک چاند میاں کی کمر میں لگ گئی۔ وہ چیخ پڑا۔ پیچھے آنے والے آدمی دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے، چوکیوں پر تاش کھیلنے والے بھی سائبان میں کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے اپنے چاقو کھول لیے تھے۔

"یہاں تو سب بدمعاش ہیں لاڈلے، ذرا رسان سے بات کر۔ یہ بتھل کا اڈا نہیں ہے۔ چاند میاں کو چھوڑ دے۔"

"چاند میاں کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک مینی کو سامنے نہ لایا جائے۔" میں نے کڑے لہجے میں کہا۔

"چھوڑ دے۔ میں بولتا ہوں اسے چھوڑ دے۔ جرأت کرنی ہے مجھ سے کر۔" موجدار نے اپنی آواز پُرسکون رکھنے کی ناکام کوشش کی۔

"میں اسے نہیں چھوڑوں گا، پہلے مینی کو بلاؤ۔"

موجدار چوکی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آ کے بولا۔ "میں بولتا ہوں، کھیل مت خراب کر۔ تو جیسے آیا ہے، اسی طرح تجھے عزت کے ساتھ واپس کر دیا جائے گا۔ ہم تجھ سے یہاں کچھ نہیں کہیں گے ورنہ پھر بتھل کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"میں تمھارے پاس نہیں آیا، یہ جانور مجھے دھوکے سے یہاں لایا ہے۔ میں اسے لے کے جا رہا ہوں، معلوم ہوتا ہے، تم بھی مینی کو نہیں جانتے ورنہ معاملہ اتنا نہ بڑھاتے۔"

"مگر چاند میاں ہمارے پاس کسی اُمید سے آیا ہے۔ یہ ٹھیک جگہ آیا ہے اور ہمارا آدمی ہے، ہم اسے تجھے کیسے واپس کر دیں؟"

"پھر تم کل رات لڑکی کو لینے ہمارے پاس کیوں آ گئے تھے؟ تم جانتے تھے کہ اُسے بتھل نے پناہ دی ہے۔"

"وہ لڑکی ہمارے علاقے سے اُٹھائی گئی ہے۔ چاند میاں بھی ہمارا آدمی ہے۔ میں بتھل کے علاقے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ جا تو ابھی بچہ ہے، پہلے بتھل سے پوچھ کہ بات کس طرح کی جاتی ہے۔ بتھل نے رات ضرور سوچا ہو گا اور شام تک وہ لڑکی ہمارے حوالے کر دے گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "بتھل کبھی ایسا سنگدل نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکی اپنی مرضی سے آئی ہے، اُسے جبراً نہیں اُٹھایا گیا۔"

"پر یہ تو شام کی بات ہے، اس سے پہلے کوئی بات کر لے تو لاڈلے کا ہے۔ مجھے مجبور نہ کر۔ تیرے ساتھ اگر زیادتی ہوئی ہے تو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ چاند میاں اور مینی کو ضرور سزا دی جائے گی۔ ان کا حقہ پانی بند کر دیا۔"

"میں چاند میاں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" میں نے چاقو ... ہوئے اسے دھکا دیا۔ "چل آگے بڑھ۔" چاند میاں کرب ناک انداز میں ...

"تو اسے نہیں لے جا سکتا۔" موجدار نے غصے سے کہا اور ... اوپر کیا۔ اچانک ایک جانب سے اس کی سمت چاقو پھینکا گیا۔ اُس نے ... سے اپنے ہاتھ میں اس کا قبضہ لے لیا اور اُسے بار بار فضا میں اُچھال ... کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "چھوڑ دے۔"

"تم اسے زندہ حاصل نہیں کر سکتے۔" میں نے پھرتی سے چاقو ... کے سینے پر تان لیا۔ "یہ تمھارا آدمی ہو یا کسی اور کا، اب یہ میرے قبضے میں ہے۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا لیکن تم نے اگر ضد کی تو میں اسے وقت سے پہلے ختم کر دوں گا۔"

"الّو کے پٹھے!" موجدار نے بھڑک کے کہا۔ "تو یہاں سے زندہ نہیں جانا چاہتا۔ میں تجھے سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں۔"

"الّو کے پٹھے تم ہو موجدار! میں یہاں اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کر آیا ہوں۔ جان کی پروا تم جیسے لوگ کرتے ہیں۔ مجھے جانے دو اور دور ہٹ جاؤ، زیادہ دیر چاقو کھلا رکھو گے تو اسے زنگ لگ جائے گا۔"

"تو سیدھی طرح نہیں مانے گا۔ میں موجدار ہوں، کلکتے میں کون موجدار کا نام نہیں جانتا۔"

"میرا اصل نام بھی تمھیں معلوم نہیں ہے اور میرے سینے میں ہے وہ تمھاری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں موجدار! مجھے پہچاننے کی کوشش کرو، تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ میں وقت سے پہلے تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ نہ تم لڑکی حاصل کر سکتے ہو، نہ چاند میاں کو یہاں روک سکتے ہو۔ اگر تمھاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو میں اسے سمجھا سکتا ہوں۔"

موجدار کا پارۂ غضب انتہا کو پہنچ گیا۔ اُس نے اپنا چاقو اُٹھایا ہی تھا کہ میں نے اپنا چاقو چاند میاں کے سینے میں اُتار دیا۔ اس نے ایک فلک شگاف لرزہ خیز چیخ ماری، اُس کا جسم تڑپا، پھر میں نے اُسے موجدار کی طرف پھینک دیا۔ موجدار کے اُٹھے ہوئے ہاتھ پر ... گئی تھی۔ وہ سکتے میں رہ گیا۔ پورے مکان میں چاند میاں کی دم توڑتی کراہوں کے سوا کوئی آواز، کوئی آہٹ نہیں تھی۔ پھر موجدار کے آدمیوں نے میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کر لیا۔ "ہٹ جاؤ استاد! ہم اس سے سمجھ لیں گے۔" ایک طویل قامت شخص آگے آیا، اُس کی ناک اور نچلا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ آنکھ کے نیچے بھی چاقو کا ایک گہرا نشان تھا جس نے اُس کی ... کر دی تھی۔

"اسے سنبھالو موجدار!" میں نے سرد آواز میں کہا۔

موجدار کو کچھ ہوش آیا۔ اُس نے تیزی سے آنکھیں ... اور اپنے آدمیوں کو دور ہٹنے کا اشارہ کیا۔ "میں خود اس سے نمٹوں گا۔" ... نے ہاتھ اُٹھایا۔ "دور کھڑے رہو۔ تم اس پر کئی نشان ڈال دو گے اور ... بتھل کے سامنے شرمندہ کر دو گے۔ ہاں لاڈلے! ہتھیار ڈالنا ہے یا مرنے کو تیار ہے؟"

"موجدار! تم نے ابھی اس کا حشر دیکھ لیا ہے اور پھر تکرار کی حماقت کر رہے ہو۔ جھجکتے کیوں ہو، ہاتھ اُٹھاؤ۔"

موجدار نے پھر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ اس انتظار میں رہا کہ پہلے میں وار کروں۔ ایک طرف چاند میاں کی لاش پڑی تھی۔ اُس نے ٹھوکر سے ... چند قدم دور کر دیا۔ اُس کے آدمی لاش کھینچ کے سائبان میں لے گئے۔ ... خون آلود ہو چکا تھا۔ میں پوری طرح چوکنا کھڑا تھا۔ جب موجدار نے ... کے میری پسلی میں چاقو اُتارنا چاہا تو میں اس کا رُخ بھانپ کے ... زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ فضا میں لہرا گیا مگر اُس نے حیرت انگیز پھرتی ... ٹھوکر ماری۔ میں بیٹھے بیٹھے فرش پر لوٹ گیا اور ابھی سنبھلنے کی ... کر رہا تھا کہ موجدار میرے سر پر پہنچ گیا۔ جب اور کوئی صورت سمجھ میں ... آئی تو میں نے اُس کی ٹانگ میں چاقو مار دیا۔ وہ بس ایک ثانیے کے لیے ... ڈگمگایا۔ چاقو اُس کی ٹانگ میں ٹھیک سے پیوست نہیں ہوا تھا۔ اُس نے ... رفتاری سے جھک کے میری گردن پر وار کر دیا۔ چاقو میرے شانے کا ... کاٹتا ہوا گزر گیا۔ شانے میں درد کی ایک شدید لہر اُبھری۔ میری ... کے سامنے دھندلاہٹ سی آ گئی۔ میں نے اپنی بینائی بحال رکھنے ... سر جھٹکا۔ موجدار کا خیال ہو گا کہ ضرب شدید لگی ہے۔ اُس نے پہلے ہی ... کر دیا تھا کہ وہ ایک ہی وار میں میرا کام تمام کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ... کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا لیکن میں اس مختصر ترین عرصے ... پیچھے ہٹ کے ایک زقند میں کھڑا ہو چکا تھا۔ موجدار نے اپنی جگہ ٹھہر ... ایک بار مجھے چاقو پھینکنے کا حکم دیا۔ خود اُس کی ٹانگ سے خون نکل رہا تھا۔ ... وار کرنے کے لیے پر تولے۔ موجدار کے پوش کا کوئی عالم نہیں رہا تھا۔ ... کھلی جگہ حرکت کرتے ہوئے ایک دوسرے کو تول رہے تھے۔ اُس ... سے خون رس رہا تھا اور میرے شانے سے خون بہتا ہوا پیٹ تک ... چکا تھا۔ اُس نے نت نئے پینترے بدل کے مجھ پر وار کیے اور میں نے ... کے تعلیم کیے ہوئے تمام نکتے آزمائے۔ دیر تک ہم دونوں کے تمام ... چلتے رہے، دونوں محتاط ہو گئے تھے۔ موجدار کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا ... کا مقابل کون ہے۔ کیا ہوا جو میرے جسم کی چادر پر اُس کے ساتھیوں ... داغ دھبے نہیں تھے۔ موجدار کے دل میں کوراہیں بیٹھی تھی جو اُس ... اُمید بھری نظروں سے دیکھتی۔ موجدار کا سینہ خالی تھا، اُسے کوئی یاد ... آتا ہو گا، میرا تو جسم سلگ رہا تھا، چنگاریاں اُٹھتی رہتی تھیں اور اب ... شعلے پھوٹ رہے تھے۔ وہ کس سے جنگ کر رہا تھا! ایک تازہ آدمی ... ایک انگارا آدمی سے۔ دیر ہو گئی تو وہ جھلا گیا اور جھلاہٹ میں میری ... جانب چھلانگ کر دوبارہ پسلی پر حملہ کرنے کے لیے چیتے کی تیزی سے بڑھا۔ اس طرح اُس نے میری مشکل آسان کر دی۔ میں نے خود کو ذرا سی جنبش دے کے اُسے چکرا دیا اور اُس کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کے اُس کا پورا جسم ایک طرف گھسیٹ لیا۔ وہ جھونک میں آتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ یہی موقع تھا جب میں اُس کے سینے میں پورا پھلکا اُتار دیتا مگر اُس نے کمال کیا۔ دیوار پر جگنو کی طرح چمکا اور زخمی شیر کی طرح بپھر کے مجھ پہ دوڑا۔ ادھر میں بڑھ چکا تھا۔ ہمارا ٹکراؤ درمیان میں ہوا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ میں نے اپنے ہاتھ پر روک لیا مگر میرا چاقو اُس کے کولھے میں کھُب گیا۔ خون کا ایک فوارہ چھوٹ پڑا۔

یکایک سائبان میں کھڑے ہوئے موجدار کے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک شور ہوا۔ ہم دونوں کو کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ گمان ہوا کہ پولیس آ گئی ہے۔ میں نے اچٹتی نظر سے دیکھا، بتھل، کانتے، لالہ، شولی اور دوسرے لوگ چہروں پر غیظ و غضب بکھرائے کھڑے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو چمک رہے تھے۔ موجدار کے آدمیوں نے بتھل اور اس کے آدمیوں پر حملہ کرنا چاہا تو اُس نے گالی دے کے انھیں منع کیا۔

"بتھل اپنے لاڈلے کی لاش لینے آیا ہے۔"

اُدھر بتھل کے ساتھی جامے میں نہیں تھے، وہ میری طرف بڑھنے کے لیے بے چین تھے۔ بتھل نے انھیں روک دیا۔ "ٹھیرے رہو سور کے بچو! دیکھتے نہیں میرے لکھنؤے بالک کے تیور کیا ہیں۔ دولھا بنا ہوا ہے، یہ بجلی اس میں کہاں سے آ گئی۔ صبح تک کیسا سُست اور ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔ ہاں میرے شہزادے! دکھا دے بہتر واں ہاتھ، بس اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔"

موجدار کے جسم کا نچلا حصہ لہولہان ہو گیا تھا۔ بتھل کے آنے کے بعد اُس میں کچھ اور تیزی آ گئی۔ اُس نے تڑپ کے ایک بار پھر میرے پہلو پہ وار کیا۔ میں پھرکی کے مانند گھوم گیا اور اپنے چاقو پر اُس کا وار روکا۔ اگر ایک لمحے کی بھی غفلت ہو جاتی تو اُس کا چاقو میرے دل میں ترازو ہو جاتا۔ جب اُس نے یہ وار خالی جاتے دیکھا تو میرے چاقو پر زور دیتا ہوا وہ اپنا چاقو آہستہ آہستہ میرے چاقو پر گھسنے لگا۔ میں نے ہاتھ پر اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اُسے پیچھے دھکیل دیا اور جست لگا کے دائیں جانب ہو گیا۔ "جیتے رہو میرے بادشاہ!" اُسی لمحے بتھل کی آواز گونجی۔ بتھل کی آواز پر موجدار کے لوگوں نے موجدار کا حوصلہ بڑھانا شروع کر دیا۔ پے در پے حملوں کی ناکامی کے بعد موجدار کی پیشانی پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ شاید کولھے کی ضرب شدید تھی۔ اُس کے چہرے پہ درد و کرب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہ دیکھ کے میں نے اُسے میدان میں نچا نچا دیا۔ وہ ایک ماہر چاقو باز تھا۔ اُس کے بھاری جثے میں ایسی پھرتی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

آخر وہ وقت آ گیا جب اُس کے ہاتھ بہکنے لگے۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا، چاقو کا صرف دستہ باہر رہ گیا تھا، باقی سب کا سب اُس کے سینے کے اندر تھا۔ اُس کے آدمی اُس کی طرف دوڑے۔ اُس نے ایک کراہ کے ساتھ مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا، میں سمجھا کہ شاید وہ کوراہ کے بارے میں کچھ جانتا ہے

اور آخری وقت میں اُسے ایک نیکی کا خیال آگیا ہے۔ اُس کا لرزتا ہوا ہاتھ میری کمر کی جانب اُٹھا اور اُس نے میرا کُرتا پکڑنے کی کوشش کی "تو ببّھل کا لاڈلا ہے۔" اُس نے کراہ کر کہا۔ کہتے ہی اُس کی گردن ڈھلک گئی۔
موجدار کے آدمی اُس کی لاش پر جھکے ایک ناقابلِ بیان کیفیت سے دوچار تھے۔
"اپنے ہتھیار ڈال دو۔" ببّھل کی آواز نے انھیں چونکا یا۔
اُن سب کا رُخ ایک آن میں ببّھل اور اُس کے ساتھیوں کی طرف ہوگیا۔ کانتے، شرلی اور لالہ نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ وہ اپنی آستینوں سے میرا سینہ اور خون پونچھ رہے تھے۔ "ابھی ہم زندہ ہیں استاد ببّھل! موجدار مرگیا مگر اُس کا نام لینے والے ابھی زندہ ہیں۔" وہ طویل قامت پُرہیبت شخص جو موجدار سے پہلے میری طرف بڑھا تھا، اپنا چاقو لہرا کے اور سینہ پھُلا کے بولا۔
"گھوشی۔" ببّھل کی آنکھیں خون اُگلنے لگیں۔
"ببّھل! فیصلہ ہوچکا ہے اور ہم یہ فیصلہ دل سے قبول کرتے ہیں۔ بس اپنے لاڈلے کو یہاں سے لے جاؤ، لڑکی بھی تم اپنے پاس رکھو۔ موجدار کا اڈّا اُس کے نام پر چلتا رہے گا۔"
"اور کوئی احسان کرنا ہو تو کر دے۔"
"یہ احسان نہیں، لاڈلے کا انعام ہے۔"
"انعام۔" ببّھل زمین پر تھوک کر بولا۔ "راجا جی انعام دے رہے ہیں، سُنا تم نے کانتے، راجا جی نے انعام کا اعلان کردیا ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔
"ببّھل بات نہ بڑھاؤ۔" گھوشی نے دبنگ لہجے میں کہا۔
"ہتھیار رکھ دے گھوشی!" ببّھل نے نرمی سے کہا۔
"اور تم کیا چاہتے ہو؟"
"لو۔ یہ پوچھتا ہے اور میں کیا چاہتا ہوں کیا مجھے جتانا پڑے گا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" ببّھل نے تمسخر سے کہا۔
"تم ہم سب کو مجبور کر رہے ہو۔"
گھوشی کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ ببّھل کے ہاتھ خالی تھے اس کے باوجود وہ آہستہ آہستہ گھوشی کی طرف بڑھنے لگا۔ "ہاں گھوشی! میں تم سب کو مجبور کر رہا ہوں۔" ببّھل نے ایک ہی جست میں جادوئی انداز میں اُس کا چاقو چھین لیا۔
موجدار کے تمام ساتھیوں نے اُس کے قدموں پر چاقو ڈال دیے۔ صرف گھوشی کھڑا رہا۔ ببّھل نے گھوشی سے چھینا ہوا چاقو بے نیازانہ پھر اُس کی طرف اُچھال دیا جسے گھوشی نے اپنے ہاتھ پہ لے لیا۔ "گھوشی!" ببّھل نے پیار سے اُس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔ "مجھے تیری بات پسند آئی۔ میں تیرا خیال رکھوں گا۔ اب اِس لاش کا بندوبست کر، فرش صاف کروا اور سب بھول جا بُشنا۔"

گھوشی نے اپنا چاقو بھی اُس کے قدموں میں ڈال دیا۔ ببّھل بڑھ کے اُسے گلے لگا لیا۔ پھر ببّھل میری جانب گھوم کے مجھے حیرت و اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ اُس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ میرا لباس خون سے تر تھا۔ اُس نے مجھے اپنے سینے میں جکڑ لیا۔ "جانی! لاڈلے جانی! تُو ببّھل چھیڑ کرتا ہے۔"
میں نے اپنی گردن اُس کے شانے پر ٹکا دی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس نے مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ "کوئی ہے۔ کوئی ہے؟" وہ بلند آواز میں بولا۔ "جو میرے لاڈلے جیسا جوش رکھتا ہو۔"
سب نے ببّھل کے گرد گھیرا ڈال دیا اور مستانہ وار میرے ہاتھ ... سب کے کپڑے خون سے لال ہوگئے۔
ہر شخص باری باری مجھ سے بے تابانہ بغل گیر ہونے لگا۔ ... سے بھینچتا پھر دوسرا اُسے کھینچ کے اُس کی جگہ خود لے لیتا۔ سبھوں نے دستوں میں گرا لیے تھے۔ موجدار کے تمام ساتھیوں کے چاقو قدموں میں پڑے تھے۔ ببّھل نے مجھے کانتے کے حوالے کر کے موجدار ... خاموشی سے چادر ڈال دی۔ چاند میاں کی لاش ننگی پڑی رہی۔ "لا... ببّھل کی بھاری آواز عمارت میں گونجی۔ "بیل اور نواس بچے! اور قد... سب گھوشی کا ہاتھ بٹاؤ۔ ابے گھوگھو کے کیا دیکھ رہے ہو، وہ کوئی اب سب اپنے ہیں۔ موجی کی لاش پوری عزت سے ٹھکانے لگا... مت کٹوا دینا ببّھل کی۔"
ببّھل کی آواز پر عمارت میں افراتفری سی مچ گئی۔ موجدا... کے سائبان کے تخت پر ڈال دی گئی اور چاند میاں کی زمین پر۔ ... بالٹیاں فرش پر بہائی جانے لگیں۔ ببّھل موجدار کے ہر آدمی کے کند... اور اُسے گلے لگاتا رہا۔ اُس نے ایک ایک دو دو جملوں میں سب کچھ ... نے چاقو ببّھل کے قدموں میں ڈال دیے تھے، اُن کے چاقو واپس... "سب ٹھیک ہے؟" ببّھل نے بلند آواز میں پوچھا۔
"سب ٹھیک ہے اُستاد!" لالے نے جوش میں ...
"چپ بے۔" ببّھل نے اُسے جھڑک دیا۔ "ہاں گھوشی! کام ... گا یا مجھے یہاں ٹھہرنا پڑے گا؟"
"نہیں اُستاد! تم جاؤ۔ لاڈلے کے زخم لگا ہے، جلدی کراؤ۔ ہم سب نمٹا لیں گے۔" گھوشی کے لہجے میں اُداسی شامل تھی۔
"میں یہی چاہتا ہوں گھوشی! بعد میں تجھے شکایت نہ ... کے ساتھ وہ نہیں کیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا۔ تُو جیسا چاہے کر، ... ہو تو بات کر لے۔"
"استاد! اتنا ذلیل مت کرو۔" گھوشی نے تلخی سے کہا۔ "اُستادوں کے پاؤں دباتے ایک ٹائم ہوگیا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ... ہی ہوا اور بات والا آدمی تھا اُستاد! ہم نے چاقو تمھارے قدمو...

... اور زبان دے دی ہے۔"
ببّھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گھوشی کی بات سُنی اَن سُنی کرتا ہوا کانتے ... پاس آیا، اُسے اشارہ کیا اور میری گردن میں ہاتھ ڈال کے دروازے میں آگیا۔ ... ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ کانتے، ببّھل اور میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے، باقی ... دوسری ٹیکسی میں بیٹھے۔ ببّھل کے آدمیوں کی بڑی تعداد موجدار کے اڈّے ہی ... گئی تھی۔ اُن میں بعد میں پہنچنے والے آدمی بھی شامل تھے۔ شاید جس جس کو خبر ... ببّھل موجدار کی طرف گیا ہے، وہ اسی طرف آتا گیا۔
گاڑی گلیوں سے گزرتی رہی۔ ببّھل گم سُم سا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ... حرکت دی تو وہ چونکا اور مجھے خود سے قریب کر کے بولا۔ "کیا حال ہے شبیر؟"
"ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔
"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" وہ تیز و تند لہجے میں بولا۔ "ہم نے تو ... بہن رکھی تھی لاڈلے! ہم تو مرگئے تھے نا۔ تُو نے ہمارا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔"
میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن الفاظ میرے ہونٹوں پہ لرز ... گئے۔ اُس نے خاموشی اختیار کرلی اور ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے کا حکم دیا۔ ... کانتے اگلی نشست پر کسی خیال سے بہک گیا۔ "اُستاد! سالے لونڈے ... خراب نہ کردیں۔" اُس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "کوئی کُتّے کا بچہ کم اصل ... جائے۔"
"ابے تُو لونڈا ہے، وہاں جو تیری بہن کے یار چھوڑے ہیں، وہ کس لیے ...؟" ببّھل چمک کر بولا۔ "میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ بات بدلی تو نقشہ بدل ... گا۔" ببّھل کے تیور دیکھ کے کانتے کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ٹیکسی ... پیچ گلیوں کے چکر کاٹتی ہوئی ببّھل کے اڈّے پہنچ گئی۔ مکان میں اچھی خاصی ... لگی ہوئی تھی۔ ببّھل کے داخلے پر بھن بھناہٹ سی ہوئی۔ ببّھل اُن سب کو نظر ... انداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے کئی اور لوگ بھی اندر آ ... اُن میں ایک قوی الجثہ، پستہ قد، ادھیڑ عمر، سیاہ رو شخص بھی تھا جس کے چہرے پر ... مار کے نشان تھے۔ "کیا بات ہے؟" اُس نے ببّھل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے پوچھا۔ ... اُدھر کیسے جانا ہوگیا؟"
ببّھل نے پلٹ کر دیکھا اور اُس کے چہرے پہ ایک کڑوی مسکراہٹ ... "کچھ نہیں موتی! لاڈلا جوان ہو کے جیل سے باہر نکلا ہے۔ ببّھل اور اُس کے ... ساتھ دو کے یہ رنگ تو آنا ہی چاہیے۔" اس نے چاقو کے کمال ہاتھ دکھائے ... ایسی بجلی تُو نے کہیں نہ دیکھی ہوگی موتی! مجھے تیرا بڑا خیال آیا۔"
"یہ ہوا کیا ببّھل؟" موتی نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔
"ہونا کیا۔ لاڈلے نے اُس تیس مار خاں کو ختم کردیا۔"
"موجدار کو؟" موتی ہڑبڑا کے بولا۔ "نہیں نہیں۔"
"اب حجت بعد میں کرنا۔" ببّھل نے مجھے بستر پہ لٹاتے ہوئے کہا۔ ... میں میرے پاؤں تیرے سامنے کھڑا تھا۔ ببّھل نے اُسے میرے جسم کو ہاتھ نہیں ... دیکھ میرا کُرتا پھاڑ کے اُس نے شانے کا زخم دیکھا۔ "سالے نے چاقو چلانا بھی

نہیں آتا تھا اور بنا پھرتا تھا کوتوال کا بچہ۔ دیکھ موتی! کیسا اوچھا وار کیا ہے۔ دیکھتا ہے کانتے! ایسے ہے موجی اُستاد موجدار کلکتہ شہر کے ٹھیکے دار کا ہاتھ۔" ببّھل نے زمین پہ تھوک دیا۔
چاقو نے میرے شانے کی کچھ کھال اُدھیڑ دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جرّاح آگیا۔ نصیب میاں نے گرم دودھ کا ایک گلاس مجھے اپنے ہاتھ سے پلایا۔ میرا لباس تبدیل کردیا گیا۔ مجھے اپنے اِرد گرد یہ جمگھٹ دیکھ کے اُلجھن ہو رہی تھی۔ ہر شخص کی نگاہ مجھ پہ مرکوز تھی۔ جب جرّاح معمول مرہم پٹی سے فارغ ہوگیا تو موتی میرے پاس آیا اور میری آنکھوں میں اپنی چھوٹی مگر چمک دار آنکھیں ڈال کے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے نظریں نہیں ہٹائیں۔ "شاباش۔" وہ دونوں ہاتھوں سے میری پسلیوں پر گھونسے مارنے اور قہقہے لگانے لگا۔ "مجھے آنے میں دیر ہوگئی بچو! سالی گاڑی نکل گئی ورنہ میں رات ہی تیرا دیدار کرلیتا۔" موتی نے میرے ہاتھ چوم لیے۔
"موتی! تُو ذرا میرے ساتھ چل۔" ببّھل نے اُسے کھینچتے ہوئے کہا اور کانتے کو ہدایت کی کہ وہ میرا خیال رکھے۔
"وہیں جانا ہے ہونا استاد؟" کانتے کی زبان سے یہ جملہ نکلا ہی تھا کہ ببّھل نے اُس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔ کانتے کا توازن بگڑ گیا، وہ پلنگ پر گرتے گرتے بچا۔ پھر اُس نے نظریں نہیں اُٹھائیں۔ ببّھل کسی تاخیر کے بغیر موتی کو ساتھ لے کے کمرے سے نکل گیا۔
اُس کے جانے کے بعد میں نے کانتے سے ببّھل کی پریشانی کی وجہ پوچھنی چاہی حالانکہ وجہ مجھے معلوم تھی۔ کانتے نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، بات گھما کے مجھی سے پوچھنے لگا۔ "بھلا تُو موجدار کے اڈّے پر اکیلا کیوں چلا گیا؟ کیا تُو یہ سمجھتا تھا کہ اُستاد گھبرا کے لڑکی اُس کے حوالے کردے گا؟"
"نہیں، وہ کوئی اور بات تھی۔" میں نے ناگواری سے کہا۔
"اور کیا بات تھی؟" وہ آنکھ مار کے بولا۔ "لڑکی ہی کی بات تھی۔ تُو نے پہلے چاند میاں کو پچھاڑا تھا۔ اب ہم سے بات مت بنا۔ اُستاد تیرے غائب ہوجانے سے بہت پریشان تھا۔ تجھے چاقو اور پانچ روپے دیتے پر نصیب میاں کو نہ جانے کیوں اُستاد نے گالیاں دے کے چھوڑ دیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اُس کی لاش پڑی ہوتی۔"
میں نے معذرت خواہانہ انداز میں نصیب میاں کو دیکھا۔ نصیب میاں نے کہا۔ "لاڈلے میاں! آج تم نے ہمیں استاد کے سامنے بڑا خوار کیا۔" نصیب میاں کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ "خدانخواستہ کچھ ہو ہوا جاتا تو ہم تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے تھے۔ جانے سے پہلے اشارہ ہی کردیا ہوتا۔ ایک سے ایک شہ زور یہاں موجود ہے۔"
"نصیب میاں!" میں نے تاسف سے کہا۔ "وہ میرا ہی معاملہ تھا۔"
"اے میاں! یہ میرا تمھارا کیا، قسم اُس بے وفا کی، اُستاد کے رو بہ رو یہ کفر در بات مت کہنا۔ بہرحال رات گئی بات گئی۔ چھوڑو میاں شہزادے! یہ بتاؤ آخر یہ کون سی رگ پھڑک اُٹھی تھی؟ بخدا استاد ناپتے ہی رہ گئے۔ ہماری رگوں میں بھی کبھی خون دوڑا کرتا تھا مگر وہ آدمی ہی کا خون تھا۔ یہ تو شیروں اور چیتوں کی خصوصیات ہیں۔ میں واری جاؤں۔ مجھ سے کہا ہوتا تو میں اِس چاند سے مکھڑے پر ایک کالا ٹیکا ... گ

دیتا۔ تباؤ جانی میاں! کیا معاملہ تھا؟ یہ بیٹھے بٹھائے شاعری کی کیا سوجھ گئی تھی؟ سُنا ہے آمد ہی آمد تھی۔"

"کچھ نہیں ہوا نصیب میاں! اپنا مقدر ہی کھوٹا ہے۔" میری آواز بھرانے لگی اور میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ نصیب میاں بے قرار ہو گیا اور میری بلائیں لینے لگا۔

"لاڈلے میاں! اے سبحان اللہ تمہارا جیسا مقدر ہو، ستارے بھی ناز کریں۔ جیل میں رہے تو کسی نواب زادے کی طرح۔ واپس آئے تو پذیرائی کے لیے ایک پلٹن موجود۔ وجاہت یہ کہ کسی کی طرف ایک بھرپور نظر دیکھ لیا تو خاک کر دیا۔ رنگ گلنار، چہرہ کتابی، لب گلابی، گفتار میں دم خم، چال میں دبدبہ، سینہ مردوں کا، دل شیروں کا۔ آتے ہی اِدھر اُدھر نظر کی تو ایک ہی وار میں اِدھر ماہ جبیں کو اسیر کیا، اُدھر ایک خلقت کو اپنے زندانِ الفت میں گرفتار کیا۔ ہتھیار ہاتھ میں لیا تو بجلی دوڑا دی، قدم بڑھایا تو زلزلے آ گئے۔ لاڈلے میاں! یہ موجدار کا معاملہ کلکتے میں کسی زلزلے سے کم نہیں اور پھر تم مقدر کو کہو؟.....؟"

کالنتے نے گرج کے نصیب میاں کی زبان روکی۔ "بدنصیب میاں! تمھیں تو کسی کوٹھے پر ہونا چاہیے تھا، کہو تو لالا جی سے بات کر لوں؟"

"ہے کالنتے!" نصیب میاں سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "کوٹھا ہی تو آباد کیا تھا کہ یہ بربادی مل گئی۔ سنو کالنتے صاحب! یہ گھن گرج کسی اور کو دکھانا، کسی خیال میں مت رہنا۔ بخدا جو تمھیں اب بھی نہیں آتا، وہ ہم نے بچپن میں سیکھ لیا تھا۔ شمشیر، چاقو، لٹھ، بلم، تیر تفنگ، شہ زوری، منہ زوری، سب ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن ایک تیر نگاہ نے مار ڈالا کہ سینے میں دل بھی لیے پھرتے تھے جو بدقسمتی سے تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ کالنتے میاں! سوچ سمجھ کے بات کیا کرو کہ کس سے مخاطب ہو اور کون سامنے موجود ہے۔"

"چپ رہو۔" کالنتے نے ڈپٹ کر کہا۔ "کچھ خیال بھی نہیں، کہ لاڈلا تھکا ہوا ہے، خون بھی کافی نکلا ہے، اُسے آنکھیں بند کر کے ایک ذرا سستا لینا چاہیے اور بس تمھاری قینچی چل رہی ہے۔"

"پہلے سے ہمیں کیوں نہیں ٹوکا۔ آدمی تم بھی ہماری صحبت میں رہ کے قرینے کے ہوتے جا رہے ہو کالنتے یار؟" وہ کسی قدر خفت سے بولا۔ "اب ہماری زبان پر قفل لگ جائے گا۔ ہم نے اپنے ہونٹ سی لیے مگر ایک بات ضرور پوچھیں گے ورنہ ہمیں بے کلی رہے گی۔ اُدھر تو سب کام حسبِ منشا ہوا ہے؟"

"اب استاد خود گیا ہے تو سب ٹھیک ہی ہو جائے گا۔" کالنتے نے نصیب میاں کو آنکھ ماری۔ اُس کی یہ حرکت میں نے دیکھ لی۔ پھر نصیب میاں نے اپنی تیزی و طراری برقرار رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنے چہرے پر لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی فکریں نہ چھپا سکا۔ باہر اور آدمیوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ کالنتے بار بار اُٹھ کے اُن سے ملنے جاتا اور تھوڑی دیر ٹھہر کے واپس آ جاتا۔ میں نے اُن دونوں سے ایک بار کہا بھی کہ وہ مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں اور میرے لیے اتنی زحمت نہ کریں مگر وہ نہیں ٹلے بلکہ کچھ اور جم کے بیٹھ گئے۔ اُن کی آنکھیں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں اور وہ جس تشویش میں مبتلا تھے، میں اُسے بخوبی سمجھ رہا تھا۔

جب تجمل نے گھوشی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد اُسے فرش، موجدار اور چاند میاں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا تو میرے ذہن میں خدشے نے سر نہیں اُبھارا تھا جس سے اب میں دوچار تھا۔ یہ لوگ ... میں کیوں آ گئے۔ مجھ پر جو کچھ بھی گزرتی، وہ گزر جاتی۔ تجمل نے موقع پر ... لیے پریشانیاں مول لے لی تھیں۔ یقیناً کالنتے، نصیب میاں، موتی، تجمل ... دوسرے آدمیوں کو تشویش ہوگی کہ موجدار اور چاند میاں کی لاشیں کہاں چھ... لاشیں چھپانے کا مرحلہ بخیر و خوبی نمٹ بھی گیا تو اِس کی کیا ضمانت ہے ... نہیں کرے گا۔ موجدار کا گروہ خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا اور لازم نہیں ... ہر آدمی بے چون و چرا تجمل کے حکم کی تعمیل کرے۔ کوئی بھی شخص کسی ... کے ساری روداد پولیس کے گوش گزار کر سکتا تھا۔ چاہے وہ آدمی تجمل ... آدمیوں کی نظروں میں کتنا ہی معتوب و مطعون قرار پاتا، یہ بعد کی بات ... وقت تک وہ آدمی پولیس کی توجہ موجدار اور چاند میاں کی گمشدگی ... چکا ہوگا اگرچہ تجمل کے لہجے میں اعتماد کی مضبوطی موجود تھی مگر وہ ... اچانک کیوں روانہ ہو گیا تھا؟ اِس سلسلے میں صرف سوچنے اور کڑھنے ... کر سکتا تھا۔ چاند میاں کی موت کا ذمے دار موجدار تھا۔ میں اُسے مارنا ... میرا مقصد تو کچھ اور تھا، موجدار نے خواہ مخواہ ضد کر کے اُس کے سینے پر ... کرا دیا اور پھر مجھے موجدار سے بھی کوئی بیر نہیں تھا۔ اُس نے خود ہی ... دو آدمی جب ایک دوسرے پر جا تو تول لیں تو اُن میں سے کسی ایک ... ہی ہے۔ وہ نہ مرتا تو میں مر جاتا۔ موجدار نے خود مجھے دعوت دی ... واقعے کے گواہ تھے۔ پہلا زخم کھانے کے بعد موجدار اپنی گدی پر بیٹھ ... آتی تو گے نہ بڑھتی۔ چاند میاں مجھے فریب دے کے اُس کے اڈے ... کے پاس جانے سے پہلے میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجدار کا خ... نے اُس کا علاوہ ہی پہلی بار دیکھا تھا۔ میری غلطی صرف اتنی تھی کہ میں ... پر چاند میاں کو آزاد نہیں کیا اور واپس نہیں آیا لیکن اگر مجھ ... جاتی تو میں کبھی آئینے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا اور میرا سر کرا... اُٹھ سکتا تھا۔ پھر مجھے کرا کی اُمید ترک کر دینی پڑتی اور صرف اپنے ... رکھنا پڑتا۔

ساری باتیں صاف تھیں کسی کی لب کشائی کی گنجائش ... آدمیوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ منظر دیکھا تھا اور مشتعل ہونے ... کر لیا تھا۔ یہ عدالت خود اُن کے اُستاد نے لگائی تھی۔ تجمل کو اُس ... حامل تھا جو ایک شخص کو اِس صورتِ حال میں ہونا چاہیے مگر بعد ... اس پر غالب آ گئی کہ اُس کا اطمینان منتشر ہو گیا۔ تجمل کو یہ آنکھ ... ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ موجدار کے گروہ میں ہر قسم کے آدمی موجود تھے ... چھوٹے لمبے، سب کے چہرے مختلف تھے، سب کا ظرف بھی مختلف ... تھے اور ایک نے انھیں مارا تھا۔ تجمل کے ذہن میں گرہ لگ گئی ... موجدار اور چاند میاں کا نام و نشان نہ مٹ جاتا، اُس وقت تک ...

... موجدار کے جو دوسرے جاں نثار موقع پر موجود نہیں تھے، ضروری نہیں ... پاسکتا تھا، موجدار کے ... وہ بھی فیصلہ قبول کرتے جو وہاں موجود لوگوں نے کیا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی ... اپنے اُستاد موجدار کی روح سے وفاداری نبھانے کے اِیثار میں یہ صاف اور ... واقعہ پیچیدہ اور مشکل بنا سکتا تھا۔ میں جس قدر سوچ رہا تھا، تجمل کی پریشانیوں کا ... احساس ہوتا جا رہا تھا اور میں کوئی واضح بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہی ... نہیں تھا کہ ایسے معاملوں میں حالات عموماً کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ میں بدتر نتیجے ... اخذ کر سکتا تھا۔ کالنتے اور نصیب میاں نے اس موضوع پر مجھ سے بات نہ کرنے ... قسم کی لی تھی۔ میں اُن کا تذبذب اور اُن کے چہروں پر بتدریج بڑھتا ہوا اضطراب ... سانی سے پڑھ سکتا تھا۔ کاش میں زریں کو لے کے کہیں اور نکل جاتا اور کاش کسی اور ... تجمل کے پاس آ جاتا۔ مجھ ایک شخص کے اُلجھے ہوئے معاملے سے کتنے لوگ متاثر ہو ... تھے جب کہ میں نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ کورا کا فسانہ عام کرتا پھروں۔ میں نے ... سینے میں چھپا رکھی تھی۔ اب بھی کوئی اُس کا نام نہیں جانتا تھا۔ نصیب میاں ... کالنتے پر فکریں چھائی ہوئی تھیں۔ چند ثانیوں کے لیے میں بھی اُن کی اس کیفیت ... سے متاثر ہوا لیکن پھر میرا ذہن کورا کے خیال سے قوی ہوتا گیا اور میں نے طے کیا اگر ... تجمل پر کوئی آنچ آئی یا کسی کم ظرف نے موجدار کی موت اُس طرح تسلیم نہ کی جس ... طرح خود اُس نے کی تھی تو میں موجود ہی رہوں گا۔ میں کہاں بھاگا جا رہا ہوں۔ میں ... تجمل کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ کہیں شام ڈھلے تجمل واپس آیا۔ سب اُس کی ... طرف دوڑ پڑے۔ موتی، شمولی، لالا، فدا، گھوشی اور موجدار کے کئی دوسرے آدمی بھی اُس ... کے ساتھ تھے۔ تجمل کے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے۔ اُس نے آتے ہی مجھے ... گلے لگایا، میرا حال پوچھا اور نصیب میاں کو حکم دیا کہ وہ سب کے کھانے کا انتظام کرے ... اور سونا گاچھی آدمی بھیج کے کنجریوں کو بلا لے۔ تجمل کے اس اعلان پر سب ٹھٹکنے ... لگے۔ استاد! آج تو وہیں چل کے سُنتے ہیں، تمھیں اُس علاقے میں گئے ہوئے بھی بہت ... دن ہو گئے ہیں۔ آج تو کچھ دھوم دھڑکا ہو جانا چاہیے۔" شمولی نے ناچتے ہوئے کہا۔

"کیوں گھوشی! تیری کیا منشا ہے؟" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب اِن ... لوگوں کا بھی کچھ خیال کر، فکر چھوڑ۔"

"نہیں استاد!" گھوشی نے نیاز مندانہ کہا۔ "مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ میں ... اِن لوگوں کی خوشی میں پوری طرح شریک ہوں۔ اب تیرے ہی ساتھی ہیں۔"

"ہائے مستانہ۔" موتی نے گھوشی کی کمر پر زور کا دھپ مارتے ہوئے کہا اور پھر تجمل ... سے بولا۔ "کیوں تجمل! کیا تیرا دیوالا نکل گیا ہے؟ نہ رنگ نہ ڈھنگ۔ گھوڑا اگوا دے، بس اب ... برداشت نہیں ہوتا۔ ناچ میں کیا خاک مزہ آئے گا۔"

"کوٹھے میں کیا مزہ رہ گیا ہے موتی! اگر دس سے ایک نمبر کی ولایتی میم آتی ... ہے تو آج میں کسی کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟" موتی ناراضی سے بولا۔ "آج ہی تو دن آیا ہے، سالی کچھ عجیب ... ماحول رہی تھی۔ میں نے تو آسنسول میں اُکتا کے تین چار کو دیا پار اتار دیا تھا۔ تمھارے ... ترپ لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سب مر گئے ہو یا مرگھٹ میں رہنے لگے ہو۔"

"کل تو بڑا نقشہ جما تھا استاد موتی!" نصیب میاں نے ہاتھ نچا کے کہا۔

"واہ نواب صاحب! کیا ایسا سوکھا ہی ٹرخاؤ گے؟ مہمان آئے ہیں تمھارے گھر۔ کیا تم بھی انھی جیسے ہو گئے نصیب میاں! لگا دو چٹائی!" موتی ترنگ میں بولا۔

"آج رہنے دے موتی! بات مان کر۔" تجمل نے اُسے تھپک کے کہا۔

موتی جز بز ہوا لیکن تجمل کی بات مان گیا۔ وہ سب ایک بڑے کمرے میں آ گئے اور بات بات پر قہقہے لگانے لگے۔ تجمل نے مجھے اپنے قریب ہی بٹھا لیا تھا۔ دوپہر کو اُن لوگوں نے شاید کھانا نہیں کھایا تھا۔ نصیب میاں اور لالے نے نہ جانے کیا کرشمہ دکھایا کہ دو گھنٹے کے اندر اندر کھانا فراہم ہو گیا۔ رات تک اُس کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ تجمل کے سامنے رکھے ہوئے طشت میں مٹھائی کے تھیلوں اور پھولوں کے ہاروں کا انبار لگ گیا تھا۔ جو آتا سب سے پہلے تجمل کے ہاتھ چومتا، مٹھائی پیش کرتا، اُس کے گلے میں ہار ڈال کے میرے پاس آتا اور میرے گلے میں ہار ڈالتا، میری پیشانی چومتا۔ تجمل نے بہت سے ہار دوسرے لوگوں کے گلوں میں ڈال دیے تھے۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ کھانا کھانے کے بعد کوئی رات کے دس بجے موتی نے تجمل کو اُٹھایا۔ تجمل کچھ آمادہ معلوم نہیں ہوتا تھا مگر موتی کے اصرار پر گھر سے باہر نکل آیا۔ میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ گلی ٹم ٹموں کی گھنٹیوں سے گونجنے لگی۔ تجمل نے چند آدمیوں کو اڈے پر رہنے کی ہدایت کی اور ٹم ٹم میں سوار ہو گیا۔ اُس کے دائیں طرف میں، بائیں طرف موتی بیٹھا تھا۔ سامنے کی سیٹ پر گھوشی اور کالنتے تھے۔ ہماری ٹم ٹم کے پیچھے کئی ٹم ٹمیں چل رہی تھیں۔ وہ جس طرف سے گزرتیں، بازار میں شور مچ جاتا۔ موتی تجمل کی کمر سے اپنا ہاتھ گزار کے بار بار میری کمر میں گدگدیاں کرتا تھا۔ مجھے اُس کی اِس حرکت پر ہر بار مسکرانا پڑتا تھا۔

ایک چوراہے پر جا کے یہ قافلہ ٹھہر گیا۔ سب لوگ سواریوں سے اُتر کے ایک جگہ اکٹھے ہوئے پھر منتشر ہو گئے۔ اُن کی باتوں سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ ناچ گانا سننے کی جگہ آئے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے اس جگہ کے متعلق سنا ہی تھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی ہارمونیم، طبلوں اور گھنگروؤں کی آوازوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم پانچ آدمی کالنتے، گھوشی، موتی اور تجمل ایک ساتھ چل رہے تھے، دوسرے لوگ ہم سے کچھ فاصلے پر مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یہ گلی عام گلیوں سے قطعی مختلف تھی، یہاں گھومنے والے لوگ بھی عام آدمیوں سے علیحدہ معلوم ہو رہے تھے۔ میری رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ جدھر نظر پڑتی، وہاں روشنیوں میں چمکتی دمکتی لڑکیاں دکھائی دیتیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُن کی جبینوں اور رخساروں پر ستارے اُگ آئے ہوں۔ گلی میں تجمل داخل ہوا تو لوگ دس دس قدم پیچھے ہٹ گئے یا آگے بڑھ گئے۔ شور تھم گیا جیسے کسی نے لگام کھینچ لی۔ ہر طرف دبی دبی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ راہگیر اچٹتی نگاہوں سے تجمل کو دیکھتے، کترا کے ایک دوسرے کو اشارہ کرتے اور پرے ہٹ جاتے۔ تجمل کا سینہ کچھ آگے نکل آیا تھا اور چلتے ہوئے اُس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ یہی حال کالنتے، موتی اور گھوشی کا بھی تھا۔ گلی میں تنبولی، گل فروش اور چائے والوں کی صدائیں گونج رہی تھیں مگر اب ہر ایک نے اپنا کاروبار چند لمحوں کے لیے معطل کر دیا تھا۔ کوئی دُکان سے اُٹھ کر بھاگا ہوا آتا اور تجمل کے گلے لگ جاتا، کوئی دور سے سلام کر کے رہ جاتا۔ پان والی

نے بیڑے بنا بنا کے طشتری میں تجمل کو پیش کیے۔ ایک بیڑا میں نے بھی کھایا۔ میرے منہ میں عطر گھل گیا۔ ہر جانے والے نے اصرار کیا کہ تجمل اُس کی دکان پر ایک پیالی چائے پیے۔ کچھ لوگ تھڑوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اُٹھ کے تجمل کے گرد جمع ہو گئے۔

گل فروشوں نے ہم سب کے ہاتھوں میں ہار باندھ دیے اور ایک ایک پڑا ہمارے حوالے کر دیا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھا۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ تجمل اُس کی دکان پر ایک لمحے کے لیے سہی مگر ٹھیرے ضرور۔ تجمل ایک خفیف تبسم سے اُن کے سلام کا جواب دیتا اور اُن کی صداؤں پر سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ جب ہم گلی کے نکڑ سے گزرتے ہوئے دوسری گلی میں داخل ہوئے تو بے داغ سفید کرتے اور دو پلی ٹوپی والے ایک دُبلے پتلے بزاز نے ہمارا راستہ روک لیا۔ تین فرشی سلام کیے اور کہنے لگا: "ایسے نہیں جائیے گا، راستہ ہم نے بند کر دیا ہے۔ ہماری لاش سے گزر کے آگے جائیے گا۔"

تجمل نے اُسے سینے سے لگا لیا اور پہلی بار کھل کے ہنسا۔ "چھٹن صاحب! یہاں سلام کیے بغیر کون آگے جانے کی ہمت کر سکتا ہے۔ ہم تو تمھی کو دیکھنے کے لیے ادھر آئے تھے، تمھارے ہاتھ کا پان کھائے ہوئے دن ہو گئے۔"

چھٹن بزاز آدھا جھک گیا۔ "ابھی پیش کرتا ہوں۔ سرکار نے قدم رنجہ تو فرمایا۔ گلی ویران ویران ہو گئی تھی۔ اتنے دنوں عاشقوں کو کیوں ترسایا اور وہ بڑے نواب صاحب کہاں ہیں؟ نواب نصیب میاں؟"

"نصیب میاں کو آج ہم نے سزا دے دی۔"

"کیسی سزا؟" وہ پریشان ہو گیا۔ "لِلّٰہ خادم کو یقین نہیں آتا۔"

"چھٹن صاحب ہمیں آگے بھی جانا ہے۔" تجمل نے کسمسا کے کہا۔

"یہ لیجیے وہ آیا ہی چاہتا ہے۔" چھٹن نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا۔ لڑکا سنہرا خاص دان دونوں ہاتھوں سے پکڑے ادب سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ چھٹن نے خاص دان اُس کے ہاتھ سے لے کے ڈھکنا کھولا۔ لڑکے نے طشتری آگے کر دی۔ چھٹن کو شاید پہلے ہی ہماری آمد کی خبر ہو گئی تھی اس لیے خاص قسم کے بیڑے تیار تھے۔ چھٹن نے سب کو اپنے ہاتھ سے بیڑے کھلائے۔ موتی نے اُس کی انگلی کاٹ لی۔ چھٹن کھل کھلانے لگا۔ "واللہ کیا مذاق پایا ہے۔" اُس نے خوش دلی سے کہا۔ پان کھلانے کے بعد اُس نے عطر کی شیشی کھولی اور ہمارے لباسوں پہ خوشبو مل، پھر ایک ایک پھلیل شیشی میں ڈبو کے ہمارے کانوں میں اٹکا دی اور کہنے لگا: "اب اگر اتنے دنوں میں آئیے گا تو ہمیں ناراض سمجھیے گا۔ وعدہ کیجیے کہ جلد آئیں گے؟"

"آئیں گے، جلد ہی آئیں گے چھٹن صاحب!" تجمل نے آگے بڑھنا چاہا۔ چھٹن نے دو زانو ہو کے اُس کا کرتا کھینچ لیا۔

"نا۔ بس ایک لمحے اور۔ بھلا لاڈلے میاں پہلی بار ادھر آئیں اور صرف گلوری سے شوق کر کے آگے بڑھ جائیں؟" اُس نے مجھے سلام کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ اُسے میرا نام کس طرح معلوم ہوا اور نام معلوم تھا تو اُس نے مجھے پہچان کیسے لیا! میں تو پہلی بار یہاں آیا تھا اور تجمل کے پاس آئے ہوئے مجھے ابھی ایک ہی دن ہوا تھا۔ چھٹن نے عطر کی ایک شیشی مجھے پیش کی۔ تجمل نے مجھے اُس کا شکریہ ادا کرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ مجھے کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ راستے میں زیادہ لوگوں نے تجمل سے اصرار کیا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ چلے۔ اُن میں عورتیں بھی تھیں۔ تجمل نے سب کے اصرار مسترد کر دیے۔ میری نظریں کسی ایک جگہ نہیں تھیں۔ چبوتروں پر، چوکیوں پر، بالکونیوں پر لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اُنھوں نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے جیسے آج گلی میں کوئی بہت بڑا جشن ہو رہی ہو۔ کچھ آگے جا کے موتی نے تجمل کا ساتھ دینے سے انکار کیا۔ منہ بگاڑ کے بولا: "کیا یہاں صرف بیڑے کھانے اور ہار پہننے آیا ہے؟ چل کے کہیں بیٹھ۔ وقت گزرا جا رہا ہے۔"

"ذرا دیر ٹھیر۔" تجمل نے ادھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

"کیا بات ہے تجمل! تیرا جی آج کچھ خراب معلوم ہوتا ہے؟" موتی طنز سے بولا۔ "تُو تو آج کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ ایسا کر موتی! تو چل کے کہیں بیٹھ۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" تجمل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"کس دن کا بدلہ لے رہا ہے یار؟" موتی نے ہونٹ سکیڑ لیے۔

"کیا بکواس کرتا ہے موتی! کہہ جو دیا، میں ابھی آیا۔ چل، باتیں نہ بڑھا۔" تجمل نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"تُف ہے موتی پر جو تیرے بغیر جائے۔" موتی گرج کے بولا۔ "تجمل! میں یہاں کے راستوں سے خوب واقف ہوں۔ اپنی بھی پرانی جان پہچان ہے۔ تیری سفارش کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"میں جانتا ہوں۔ تُو پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔" تجمل نے اُس کے بال بگاڑ دیے۔ "ذرا ذرا سی بات پر مچل جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، تُو آسنسول میں اتنے دن کیا گھاس کھودتا رہا۔ لگتا ہے ابھی تیرے دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ سمجھتا نہیں، بک بک کیے جاتا ہے۔"

"ہاں ہاں میرے تو دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ تیرا تو لگتا ہے تیرے تو دانت ہی نہیں ہیں۔ تُو تو بوڑھا ہو گیا ہے۔ اپنا دل خالی کر، مجھ سے صاف صاف بات کیا کر، ہیر پھیر نہ کر۔"

"آ، تُو استاد! سنا ہے کرمن حیدرآباد سے بڑا مال دولت لے کے آئی ہے اور اپنے ساتھ ایک پری بھی لائی ہے۔ ہر جگہ اُس کی دھوم ہے۔ کلکتے کی پری دیکھو گے تو تڑپ جاؤ گے۔ جب سے آئی ہے سیٹھوں اور ساہوکاروں میں ہلّا بول دیا ہے۔"

تجمل بادلِ ناخواستہ ایک پتلی سی گلی میں مڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ایک خیال سے لرزنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے جھرجھری آ گئی اور سب سے پہلے زمین نے جکڑ لیے۔ تجمل اپنے خیال میں گم ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ میرے ٹھیرنے کی وجہ سے اُس کے ہاتھ کو رکاوٹ محسوس ہوئی۔ پلٹ کے میری جانب دیکھا۔ میں گُنگ کھڑا تھا۔ "لاڈلے!" اُس نے

"ڈر کیوں گیا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے سٹ پٹا کے کہا۔

"کیا کچھ تکلیف ہو رہی ہے؟ زخم کیسا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔" میں نے ہنسی دکھانے کی کوشش کی۔

"اِن علاقوں میں سر جھکا کے نہیں چلتے، ذرا گردن تو ٹھیک طرح جسم پر رکھو، لوگ کہیں گے، تجمل کا لاڈلا خوش نہیں ہے۔"

"میں بہت خوش ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"اور آگے تیرے دل کی کلیاں کھل جائیں گی۔" کلنتے نے نشیلی آواز میں کہا۔ "لاڈلے کے سامنے تو ہم سب کی ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔"

"جانی!" موتی نے مجھے تجمل کے ہاتھ سے چھین لیا۔ "میں تو ابھی تجھ سے پوری طرح ملا بھی نہیں۔" وہ مجھے سڑک ہی پر چمکارنے ہوئے بولا۔ "تیرے بارے میں سنتا رہتا ہوں۔ اُس نے عمر میں ایک ہی سچ بولا ہے اور وہ تیرے بارے میں ہے۔ میں تجھے اپنے ساتھ آسنسول لے جاؤں گا۔" وہ اشتیاق سے کہتا رہا۔ "اور پھر تجمل کو ٹھینگا دکھا دوں گا۔ دیکھ میرے پاس ایسے ہیں کہ تجمل کو بھی نہیں معلوم۔ ایمان سے شہر تو وہ چھوٹا ہے مگر دل کے بڑے لوگ رہتے ہیں۔"

تجمل نے کچھ نہیں کہا۔ کلنتے اور گھوشی موتی کی باتوں پر بُری طرح ہنستے رہے۔ ہم ایک دروازے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ جھریوں سے روشنی چھن رہی تھی، درزوں سے موسیقی ٹپک رہی تھی۔ ایک دل کش آواز روشنی کے ساتھ باہر آ رہی تھی۔ گھوشی نے آگے بڑھ کے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ برآمد ہوا۔ گھوشی نے کہا: "دروازہ کھولو۔"

ہم سب اندھیرے میں کھڑے تھے۔ عورت نے گھوشی سے چمکار کر کہا۔ "معزز مہمان بیٹھے ہیں ذرا کچھ دیر بعد زحمت کرنا۔"

گھوشی نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ عورت احتجاج کرتی رہی۔ "آؤ!" اندر سے گھوشی کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا تو روشنی ہمارے چہروں پر پڑی۔ عورت ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی پھر وارفتہ ہو کے چبوترے پہ آ گئی اور اُس نے تجمل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب تم اس طرح آیا کرو گے؟ نہ خیر نہ خبر۔ جب سے آئی ہوں، خبر بھی نہیں لی کہ میں زندہ ہوں یا مر گئی۔ کیا ہوا جو پردیس میں لٹ گئی یا برباد ہو گئی۔ کہلا بھی دیا کہ آکے شکل دکھا جاؤ۔ تجمل نے پرانا مکان واپس نہیں کیا۔ اس ٹوٹے ہوئے مکان میں رہ رہی ہوں۔ رسید تک نہیں دی۔"

"یہیں کھڑے کھڑے باتیں کرتی رہو گی یا اندر آنے کو بھی کہو گی۔ ساتھ میں مہمان ہیں۔" تجمل نے ناراضی سے کہا۔ "حیدرآباد میں رہ کے کرمن تم نے کمائی بہت کی ہو گی، اخلاق بھی گھٹتا ہو گیا۔"

"وہی، بالکل وہی۔ تم نہیں بدلے۔" کرمن نے شگفتگی سے کہا۔

"اور تم بھی نہیں بدلیں۔ وہی کھنک، وہی تڑپ ہے۔"

"جاؤ جی، اجڑا اجڑا دیار ہوں۔" وہ تجمل کا ہاتھ تھامے ہوئے اندر لے گئی۔ رقص کی محفل جمی ہوئی تھی۔ تجمل کا چہرہ جیسے ہی نمودار ہوا، رقص تھم گیا۔ پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں میں بے چینی سی پیدا ہوئی۔ انھوں نے ناگوار نظروں سے پہلے ہمیں پھر کرمن کو دیکھا۔ جیسے انھیں ہماری آمد نہایت شاق گزری ہو۔ تجمل نے اُن کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ ایک کونے میں لگے ہوئے گاؤ تکیے پر پھیل کے بیٹھ گیا۔ "میں تمھارا تعارف کراؤں۔" کرمن نے تجمل کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ کلکتے کے مشہور سیٹھ لکشمی داس ہیں اور یہ اُن کے مدراس سے آئے ہوئے مہمان۔ سیٹھ صاحب حسن اور آواز پرکھنے کی جو نگاہ رکھتے ہیں یقین کرو وہ میں نے اپنی ساری زندگی میں کسی اور شخص میں نہیں دیکھی۔" کرمن نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ سیٹھ لکشمی داس گھٹنوں سے اوپر کی سفید شیروانی پہنے ہوئے تھا، نیچے دھوتی تھی۔ رنگ کھلتا ہوا، پیشانی تنگ، قد موزوں، عمر پچاس سے اوپر، جسم فربہ، شیروانی میں سونے کے بٹن اور انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ کرمن نے اُس کے اتنے ہی تعارف پر بس نہیں کیا، کہنے لگی: "وضع دار آدمی ہیں، غریبوں کے دوست، فن جاننے والے، دان پُن میں کلکتے کے چند ہی سیٹھ، سیٹھ لکشمی داس جی سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔" سیٹھ کے لبوں پر اپنی تعریف سے کسی قسم کا تاثر نہیں اُبھرا البتہ پیشانی پر کچھ شکنیں اُبھریں اور آنکھیں چڑھ گئیں۔ "اور یہ ہیں تجمل، استاد تجمل۔ ان کا نام تو آپ نے سنا ہو گا۔" کرمن نے سیٹھ کو مخاطب کیا۔

سیٹھ نے جواب دینے کے بجائے سر کی ایک خفیف جنبش سے انکار کیا اور کہنے لگا: "کرمن بانو! معاف کرنا۔ ہمیں بھیڑ میں گانا سننے میں مزہ نہیں آتا۔ جب ہم آئیں تو دروازے پر تالا لگا دیا کریں۔"

"کلکتے میں نئے نئے آئے ہو سیٹھ!" کرمن کے جواب دینے سے پہلے تجمل کی کرخت آواز اُبھری۔ "کرمن تم نے پورا تعارف نہیں کرایا۔" تجمل کی آواز پر سیٹھ نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھولیں اور سر اُٹھا کے اُسے گھورنے لگا۔ اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مہمان مضطرب ہونے لگے۔

"ہاں استاد! سیٹھ کا بڑا کاروبار احمدآباد میں ہے۔ حال ہی میں انھوں نے یہاں جوٹ کا نیا کارخانہ لگایا ہے۔ یہ یہاں رہتے تو ضرور تمھیں جانتے۔ یہ صرف نہ جاننے کا اجنبی پن ہے۔ تم بھی انھیں نہیں جانتے، یہ بھی تمھیں نہیں جانتے۔ بہرحال جان پہچان کا اس سے اچھا موقع اور کب آتا۔ سیٹھ صاحب! یہ تجمل ہیں، شہر میں کون ہے جو استاد تجمل سے واقف نہ ہو۔ ہر جگہ ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ یہ ان کے ساتھی ہیں، ایک تو یہ کلنتے ہے اور اسے بھی میں چہرے سے پہچانتی ہوں حالانکہ میں کئی سال بعد کلکتے واپس آئی ہوں۔" اُس نے گھوشی کی طرف اشارہ کیا "اور یہ جو پیچھے کونے میں دبکے میری سرکار بیٹھے ہیں، یہ سمجھتے ہیں میں انھیں بھول گئی۔ یہ موتی ہیں۔"

موتی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "ہائیں کرمن بانو! خوب پہچانا، میں تو سمجھا تھا، سب کی طرح تم نے مجھے بھی بھلا دیا ہو گا۔"

"موتی میاں! یہ تو نظر نظر کی بات ہے۔" وہ مسکرا کے میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "ماشاءاللہ، چشمِ بد دور، چشمِ بد دور، البتہ انھیں میں نے نہیں پہچانا۔"

"یہ لاڈلا ہے۔" کلنتے جوش میں بولا۔ "استاد کا لاڈلا!"

کرمن آنکھیں پٹ پٹانے لگی، جیسے میری صورت دیکھ کے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ "آپ نے سنا سیٹھ، یہ سب نامور لوگ ہیں۔ جو انھیں نہیں جانتا،

اُسے ضرور جانا چاہیے یہ کام کے لوگ ہیں اب میں آپ دونوں کو ملانے کی رسم سے بھر پائی۔ میں نے اپنی طرف سے سارا حجاب دُور کر دیا ہے سیٹھ صاحب! استاد! ہاتھ ملائیے گلے لگیے۔ ہم سے کھُل جاؤ یہ وقت مے پرستی ایک دن "

دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے کرمن کی بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر تک کمرے میں سکوت چھایا رہا۔ کرمن بیٹھے بیٹھے کروٹیں بدلنے لگی کبھی وہ سیٹھ کی طرف دیکھتی کبھی تجمل کی طرف "گانا شروع کرو کرمن!" تجمل نے جماہی لیتے ہوئے کہا: "وہ کہاں ہے جسے تم نے ہماری نظروں سے چھپا رکھا ہے؟"

"وہ گاتے گاتے تھک گئی تھی، میں نے اُسے آرام کے لیے اندر بھیج دیا تھا پھر جیسے ہی سیٹھ صاحب آئے، میں نے اُسے بیدار کر دیا۔ لباس تبدیل کر کے ابھی آتی ہو گی تم اس عرصے میں پری بانو کا گانا سنو۔ پری کی آواز میں بنگال کا جادو بھرا ہے۔" ایک دُبلی پتلی تیکھے نقش و نگار کی سنجیدہ لڑکی درمیان میں نیچے کی طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔ اپنے نام پر اُس نے اپنی بوجھل پلکیں اُوپر اُٹھائیں وہ پہلے ہی تجمل کو سلام کر چکی تھی اب دوبارہ سلام کیا۔ اُس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ عمر خاصی کم معلوم ہوتی تھی۔

"کچھ شروع کرو کرمن!" موتی نے بپھر کے کہا۔

"اجازت ہے؟" کرمن نے سیٹھ سے پوچھا۔

"ہم چلتے ہیں کرمن بانو! پھر آئیں گے، ہماری طرف سے شہ پارہ کو یہ دے دیجئے گا۔ اُس نے کل ہم سے فرمائش کی تھی۔" سیٹھ نے ایک پیکٹ کرمن کی طرف بے نیازی سے کھسکا دیا مگر کرمن نے پیکٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

"آپ نہیں جائیں گے جناب! شہ پارے کو خود دیجیے گا یہ۔ میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی، وہ آئے گی تو خود آپ سے نمٹ لے گی۔ شام سے وقت پوچھ رہی تھی، میں بھی تو کہوں آج اسے کیا ہو گیا ہے کچھ بتاتی نہیں تھی۔ اب پتہ چلا کیا بھید تھا۔ تشریف رکھیے سیٹھ صاحب!"

"ارے شہ پارے؟" اُس نے اچک کر آواز لگائی "ارے کہاں گم ہو گئیں سنتی ہو سیٹھ صاحب واپس جا رہے ہیں۔ پھر مجھ سے کچھ مت کہنا۔"

اندر سے ایک باریک آواز آئی "آئی، بس ابھی آئی۔"

"اب آؤ بھی نا۔" کرمن سر پر ہاتھ رکھ کے بولی۔

"نہیں کرمن بانو! اُنھیں آج آرام کرنے دو، ہم کل آئیں گے جب بھی [illegible] ملانہ دِیں آئیں گے، اپنے مہمانوں کا خیال کرو۔"

"سیٹھ صاحب! یہ کوئی غیر نہیں ہیں کہ ان کا خیال کیا جائے۔ آپ بھی تشریف رکھیے یہ بھی بیٹھے رہیں۔ دونوں مجھے عزیز ہیں۔ آج یہی سہی دیکھیے تو یہی کیسے ہنر شناس ہیں۔ شہ پارے ان کے سامنے گائے گی تو قیامت برپا کرے گی۔ فن اور حسن تو نگاہوں کی تلاش میں رہتا ہے میرے نصیب جاگے کہ آج ایسے ایسے سننے والے موجود ہیں، میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔" وہ رُوٹھنے کے انداز میں بولی۔

"کرمن بانو! آج ہمیں معاف کر دیجیے۔" سیٹھ نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

کرمن نے اضطراب سے تجمل کو دیکھا۔ "بیٹھیے سیٹھ! کرمن کو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ بیٹھ جائیے۔" تجمل کی آواز میں مختلف عناصر صاف پہچانے جا[...] "بیٹھو سیٹھ بیٹھو!" موتی اُلجھتے ہوئے بولا: "ہم روز کے آنے والے ہ[...] وجہ سے اُٹھنا چاہتے ہو تو مت جاؤ۔ کرمن نے تمھیں یہ نہیں بتایا کہ ہم [...] جانے میں روک ٹوک نہیں ہوتی، ہم کسی بھی وقت کہیں بھی جا سکتے ہیں [...] تم پہلے آئے ہو اس لیے اتنی بات بھی کہی جا رہی ہے، بعد میں آت[...] دوسری ہوتی۔ تجمل بدل گیا ہے میں تھوڑی دیر پہلے اس سے یہی کہ[...] کلکتہ ہے سیٹھ! آسنسول ہوتا تو بات اتنی لمبی نہ ہوتی۔"

"کیا مطلب؟" سیٹھ نے تنک کے پوچھا۔

"مطلب صاف ہے سیٹھ!" موتی نے تلخی سے کہا: "بیٹھ جاؤ۔"

"ہم نہیں بیٹھتے۔" سیٹھ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تو جاؤ۔" موتی نے پھنکار کر کہا۔

"کرمن بانو! آیندہ دو کمرے بنایا کرو، ایک ہمارے لیے ایک ا[...] کے لیے۔" وہ یہ کہتا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت واپس جانے لگا۔ کرمن نے [...] کا بازو پکڑ لیا۔ اسی لمحے اندر سے ایک زرق برق لڑکی بھاگتی ہوئی [...] دروازے پر سیٹھ کی اُنگلی پکڑلی اور کچھ کہا نہیں بس ایک نظر دیکھا [...] بے چینی مترشح ہوئی، وہ مسکراتا ہوا دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا [...] ہماری جانب نظر کی اور ہم نے پہلی بار اُسے غور سے دیکھا۔ وہ شہ پ[...] نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس کے متعلق کانتے نے جو کچھ کہا تھا وہ اُس سے [...] لمبی سی شوخ، چنچل، گھنی پلکیں، لمبی سیاہ چوٹی، سیٹھ نے اُسے سامنے سے اپنا دیا ہوا پیکٹ واپس لے لیا اور اُس کے حوالے کر دیا۔ اُس کی شرارے لپکنے لگے اور چہرہ خوشی سے تمتما گیا۔ اُس نے جلدی جلدی خوب صورت ڈبے سے ایک چمکتا ہوا ہار نکالا۔ لڑکی کی بڑی بڑی بڑی ہو گئیں۔

"سیٹھ صاحب! اپنے ہاتھ سے پہنائیے۔" کرمن نے درخو[...] شہ پارہ نے اپنا چہرہ اُوپر کر کے آنکھیں مُوند لیں۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، رخساروں پر شفق چھائی ہوئی تھی سیٹھ صراحی دار گردن میں ہار ڈال دیا۔ شہ پارہ نے آنکھیں کھول دیں سیٹھ تھام رکھا تھا۔ وہ لہراتی ہوئی اُٹھی اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش جھٹکے سے اُس نے ہاتھ چھڑا لیا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی د[...] گئی۔ پہلی لڑکی کرمن کے پاس آگئی تھی اور کرمن دوبارہ ہمارے قریب شہ پارہ نے پیروں میں گھنگرو باندھے سازندوں نے ساز [...] شوخی اور ناز سے سازندوں سے کچھ کہا اور بیٹھے بیٹھے انگلیاں [...] کے لبوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُس نے پہلے [...] تجمل کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور تان اُٹھائی

یہ جو گردن جھکائے بیٹھے ہیں لاکھ فتنے اُٹھائے

اُس نے اسی پر بس نہیں کیا اُٹھ کے ناچنے لگی اور ایسا نا[...]

[...]ہ نہیں کر سکتا تھا۔ کل رات زہرہ بھی اسی طرح ناچی تھی مگر یہ تو زہرہ سے بڑھ گئی تھی [...]ے کے رواں رواں بدن میں جیسے سنگیت بھرا ہوا تھا، جیسے آگ بھری ہوئی تھی جب [...]رکت کرتی تھی تو چنگاریاں لپکتی تھیں۔ سب دم بخود ہو گئے۔ موتی اپنی جگہ پھڑکنے [...]چلنے لگا پہلا شعر تو شہ پارہ نے اپنی جگہ بیٹھ کے گایا پھر سیٹھ نے اُسے نوٹ دکھا [...]اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اُٹھتی تھی تو سیٹھ ایک اور نوٹ جیب سے نکال کے اس کے [...]نے کر دیتا تھا۔ سیٹھ کی جیب میں جیسے خزانہ بھرا تھا۔ ایک نوٹ اُسے دیتا تھا، [...]بڑا جھٹ جیب سے نکال لیتا تھا، چنانچہ وہ وہیں تھمی بیٹھی تھی۔ اُٹھنے کا نام ہی نہ [...]بھی سیٹھ کے ساتھی بھی نوٹ لُٹا رہے تھے۔ یہ ماحول، یہ کمرہ، یہ حسین لڑکی، یہ [...]از، یہ رقص۔ کل مجھے زہرہ کو دیکھ کر بھی تعجب ہوا تھا، اتنی حسین لڑکیاں کس بے پروائی [...]مرموں کے سامنے ناچ لیتی ہیں۔ میری نظریں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں، رفتہ [...]ہ میری سمجھ میں یہاں کے آداب آ رہے تھے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور شہ پارہ [...]ٹھ کے سامنے سے اُٹھ اُٹھ کے بیٹھتی رہی تو کرمن نے تجمل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ [...]بناؤ! نو دولتیا معلوم ہوتا ہے، باپ کما کے دیا ہے تھوڑی دیر اور برداشت کر لو [...]رمن تمھیں شہ پارہ سے کانٹے کی چیزیں سنواؤں گی۔" وہ اتنی آہستہ آواز میں بولی کہ [...]ارے سوا کوئی نہ سن سکا۔

"ٹھیک ہے کرمن! اسے جیبیں خالی کر لینے دو۔"

"اور اپنی دولت برباد کرتے رہو۔" موتی طیش میں بولا۔ "تجمل! میں چاقو نکالتا [...]ں دیکھتا ہوں روپے میں زیادہ زور ہے یا چاقو میں۔"

کرمن نے اُس کے پیر پکڑ لیے "تمھاری عزت تمھارے ہاتھ میں ہے موتی! [...]ان پر تمھارے آنے کی برکت ہے کہ بارش ہو رہی ہے۔ بس میری خاطر اسی طرح [...]خوش بیٹھے رہو گھر تمھارا ہے، میں تمھاری ہوں، لڑکی تمھاری ہے۔"

شہ پارہ کے ماتھے پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ وہ تھک گئی تھی۔ یہ خوب تماشا تھا۔ [...]ھے اُس لڑکی پر ترس آنے لگا۔ اُس نے اتنی نازک گڑیا سی لڑکی کو کھلونا سمجھ رکھا [...]ا اور تجمل خاموش تھا۔ موتی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کرمن خوشامد کر رہی تھی۔ کانتے [...]ور گھوشی کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہاں کوئی بہت بڑا فساد [...]ہونے والا ہے۔ تجمل کا پرسکون چہرہ دیکھ کے سبھی رُکے ہوئے تھے۔ سیٹھ روپے لٹا رہا تھا۔ [...]م کی آنکھوں سے اب شعلے اُگلنے لگے تھے، اُسے روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ سیٹھ نے [...]ابھی نہیں کیا کہ یہاں کوئی اور بھی بیٹھا ہے اور کوئی اور کون بیٹھا ہے۔ وہ کلکتے [...] یہ بالکل نیا نیا آیا تھا یا اُس کے پاس بہت دولت تھی یا وہ بہت اثر و رسوخ [...]تھا کہ ابھی اُس نے ہماری جانب توجہ ہی نہیں کی۔ وہ کوئی بڑا ہی آدمی ہو گا۔ [...]ٹا نہ ہو تھا۔ ایک ہی غزل میں دیر ہو گئی۔ سیٹھ نے اپنے دونوں ہاتھ گاؤ تکیے پہ [...]رکھے تھے اور گاؤ تکیہ اُس کے زانوؤں پر رکھا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے مخمور نظروں سے [...]ہ پارہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر شاید اُس کے پاس نوٹ ختم ہو گئے۔ اُس نے اپنی گھڑی [...]ار دی، اپنا قلم نثار کر دیا، اپنے ہاتھوں کی انگوٹھیاں نچھاور کر دیں اور جب کچھ نہ رہا [...]شیروانی کے اندر لٹکی ہوئی سونے کی زنجیر بھی اُتار دی۔ اُس نے زنجیر اُتاری تو مجھے [...] کا خیال آیا۔ مالا میری بنیان کے نیچے تھی۔ بُرجدار سے لڑائی کے وقت مجھے

اگر کسی بات کا خیال تھا تو مالا کا تھا کہ کہیں اس کی ڈوری پر بُرجدار کا چاقو نہ چل جائے، وہاں اس کے بکھرے ہوئے دانے سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔ پھر لباس تبدیل کرتے وقت تجمل اور اُس کے آدمیوں نے یہ مالا دیکھ لی تھی مگر اُس وقت اُن کی نگاہیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکیں۔ سیٹھ لکشمی داس نے آج جتنا روپیہ خرچ کیا تھا، زیور، انگوٹھی، قلم، کرتے کے طلائی بٹن، شیروانی کے طلائی بٹن، اُن سب کی قیمت اِس مالا سے کم تھی۔ میرے جی میں آیا کہ میں شہ پارہ کو یہ مالا پیش کر دوں اور سیٹھ سے کہوں، تمھارے پاس اِس سے زیادہ قیمتی کوئی شے ہو تو پیش کرو۔ میں نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھ لیا کہ کہیں کرمن، شہ پارہ یا ہمارے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کی نظر میری مالا پر نہ پڑ جائے۔ سیٹھ خالی ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی جیبیں اُلٹ دیں لیکن شہ پارہ اُس کے سامنے بیٹھی گاتی رہی۔ موتی کا قہقہہ اُبل پڑا۔ سیٹھ نے نخوت و نفرت سے منہ پھیر لیا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اب بھی شہ پارہ اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے اُسے بھی ضد ہو گئی ہو۔ سیٹھ نے اپنے شانے اُچکائے اور شیروانی کی اندرونی جیب سے تمنچہ نکالا۔ شہ پارہ اُسے دیکھ کے کچھ پیچھے ہٹی۔ سیٹھ نے اپنا تمنچہ چلانے کے لیے تیار کر لیا۔ بس لبلبی دبانے کی دیر تھی کہ کرمن ہکا بکا رہ گئی، سازندوں کے ساز گڑبڑا گئے، طبلہ لرزنے لگا۔

کانتے نے جھٹ اپنی جیب سے چاقو نکالا اور کھڑ کھڑ کھول لیا۔ موتی اور گھوشی نے بھی یہی کیا۔ تجمل نے اُن کی یہ وحشت دیکھی تو دونوں ہاتھ پھیلا کے اُنھیں صبر و ضبط کی تلقین کی۔ اِس اثنا میں سیٹھ تمنچہ شہ پارہ کے حوالے کر چکا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے اپنا گریبان چاک کر دیا اور سینہ آگے کر کے شہ پارہ کو اشارہ کیا کہ وہ اس پر گولی چلا دے۔ اُس کے ساتھی اُسے روک رہے تھے۔ شہ پارہ کے ہاتھ میں کانپتا ہوا تمنچہ دیکھ کے کرمن کے چہرے پر طمانیت کی لہر دوڑی۔ وہ اُٹھنا چاہتی تھی کہ تجمل نے اُسے روک لیا۔ پہلے تو شہ پارہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا، وہ گانا وانا بھول گئی تھی۔ سازندوں کے ہاتھوں پر برف جم گئی تھی۔ شہ پارہ نے کرمن کی طرف دیکھا۔ کرمن چیخ کر شاید یہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ تمنچہ ایک طرف پھینک دے۔

"تمنچہ سیٹھ کو واپس کر دینا چاہیے۔" تجمل نے کرمن سے کہا۔

"وہ اِس وقت ہوش میں نہیں ہے استاد! میں نے اتنا ضدی آدمی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔ تمنچہ اُسے واپس نہیں کرنا چاہیے۔" کرمن سرگوشی میں بولی۔

"تمنچہ اُسے واپس کرا دو۔" تجمل نے سختی سے کہا۔

"استاد! اب تک تم نے جس ظرف کا ثبوت دیا ہے، خدا کے لیے اُس پر قائم رہو۔ یہ جگر آزمائی مت کرو۔" کرمن لجاجت سے بولی۔

"اور ہمیں بھی تماشا نہ بناؤ کرمن بانو!"

"کرمن یہ جرأت کیسے کر سکتی ہے تجمل! کرمن یہاں کس کے آسرے پر سر اونچا کیے بیٹھی ہے۔ تجمل کے۔ تم کہتے ہو تو میں اُس سے کہے دیتی ہوں۔" کرمن نے شہ پارہ کو اشارہ کیا۔ شہ پارہ نے تمنچہ سیٹھ کو واپس کر دیا۔

سیٹھ نے فرطِ جذبات میں اُس کی انگلیاں چوم لیں۔ شہ پارہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اُٹھی تو سیٹھ بھی بے تابی سے اُٹھ گیا۔ "اب کہیں نہ جاؤ۔" اُس نے لڑکھڑاتی

ہوئی آواز میں کہا: "اب تم صرف ہمارے لیے گانا گاؤ گی، صرف ہمارے لیے ناچو گی، صرف ہمارے دل پر راج کرو گی۔ ہم تمھیں اپنی رانی بنائیں گے اور تمھارے قدموں میں دنیا بھر کی خوشیاں بکھیر دیں گے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے، وہ تمھارا ہے۔ کرمن بانو!" وہ بلند آواز سے بولا: "ہم شہ پارہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اب وہ کسی اور کے سامنے نہیں ناچے گی۔ جو تم کہو گی، وہ ہم پیش کر دیں گے۔ بتاؤ ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"سیٹھ! آپ کی باتیں سن کے میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں، کم ہے۔ میری محنت کا صلہ مل گیا مگر سیٹھ، شہ پارہ ہی میری پونجی، میری کل جائداد ہے۔"

"ہم تمھیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔"

"میں جانتی ہوں، اللہ نے آپ کو ہر نعمت سے نوازا ہے۔ آپ کے بہت سے کارخانے ہیں، میرا کارخانہ تو ایک ہی ہے۔"

"ہم شہ پارہ کے لیے تمھاری ہر خواہش پوری کریں گے۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔ یہ باتیں ایسی تو نہیں ہیں کہ ابھی اور اسی وقت طے ہو جائیں۔ میں نے تو ایسا کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا، آپ مجھے کچھ وقت دیجیے۔"

"نہیں۔ ہم تمھارا جواب اسی وقت سننا چاہتے ہیں۔"

"اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے غریب خانے پر مہمان موجود ہیں۔ ابھی تک انھوں نے شہ پارہ کو ٹھیک سے سنا بھی نہیں ہے۔"

"ہم اسی لیے جلد از جلد جواب چاہتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو شہ پارہ سے پوچھ لو، وہ انکار نہیں کرے گی۔ ہم نے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب شہ پارہ صرف ہمارے دل کی دھڑکن بنی رہے گی۔ ہم اس کا کسی اور کے سامنے ناچنا گانا پسند نہیں کریں گے۔"

"سیٹھ صاحب! سیٹھ صاحب! یہ فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔" کرمن نے خوشامدانہ انداز میں کہا: "آپ کو بھی میرا تجربہ کارانہ مشورہ ہے کہ ذرا رات کو بستر پر ٹھنڈے دل سے سوچیے گا۔" کرمن دبے دبے لفظوں میں سیٹھ کو سمجھاتی بجھاتی رہی مگر اس کی ضد بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم میں سے کسی شخص نے ابھی تک اس معاملے میں دخل نہیں دیا تھا۔ کرمن کی زبان تھک گئی مگر سیٹھ کی ضد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا تمنچہ تھا۔ کرمن کو خوف ہوگا کہ بات قابو ہی میں رہے، اسی لیے وہ نرمی، خوش اخلاقی، معذرت اور خوشامد کے لہجے میں سیٹھ لکشمی داس سے مخاطب تھی۔ سیٹھ نے کلکتے میں قائم کیا ہوا اپنا کارخانہ کرمن کے نام کرنے کی پیش کش کی۔ ایک ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ، پچیس ہزار روپے نقد جسے بڑھا کے اس نے ایک لاکھ روپے کر دیا۔ کرمن مبہوت ہو گئی تھی۔ اس کی خاموشی پر سیٹھ اپنی پیش کشوں میں اضافے پر اضافے کیے جا رہا تھا۔

"ہم شہ پارہ کو اس تنگ و تاریک جگہ سے نکال کے تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ اس کی صحیح جگہ وہی ہے۔" وہ جوش میں بولا: "ہم اسے ہر صورت میں یہاں سے لے جائیں گے۔"

کرمن جز بز بیٹھی تھی۔ سیٹھ نے شہ پارہ سے کہا: "چلو، ہمارے ساتھ چلو شہ پارے! ہم تمھاری قدر کریں گے۔"

"مگر۔۔۔ مگر اس وقت؟" شہ پارہ جھجک کے بولی۔

"ہاں اسی وقت، ابھی۔ ہم کرمن کے نام کاغذ لکھے دیتے ہیں۔ ہم اپنے وعدے پورے نہیں کر دیں گے، اس وقت تک تمھارے قریب نہ آئیں گے۔"

"یہ وقت مناسب نہیں سیٹھ صاحب!" شہ پارہ نے حوصلے سے کہا۔

"ہم نے انکار سننا نہیں سیکھا ہے شہ پارے!"

"کنیز انکار نہیں کر رہی ہے۔ کنیز کی درخواست ہے کہ اسے ماں کو کچھ تو مہلت دی جائے۔ ہمیں آخر اتنا اختیار تو حاصل ہے۔"

"گانا شروع کرو۔" اچانک بجھل نے گرج دار آواز میں حکم دیا: "گانا شروع کرو۔"

"شہ پارہ نہیں گائے گی۔" سیٹھ نے درشتی سے کہا۔

"کیوں نہیں گائے گی؟" بجھل نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تحمل سے کہا۔

"تم سن نہیں رہے ہو؟ ہم شہ پارہ کا سودا کر رہے ہیں۔"

"اور اس کی ماں تیار نہیں ہے۔ جاؤ سیٹھ، جاؤ۔ کرمن کے پاس پھر آنا۔ ممکن ہے کرمن یہ لڑکی تمھارے سپرد کر دے۔ پھر جو جی چاہے کرنا۔ تمھارے دن ختم ہو چکے ہیں اور اس جگہ اسی آدمی کی قدر ہوتی ہے جس کی جیب بھری ہے۔ تمھاری جیب میں کچھ نہیں ہے۔ جیب میں جب کچھ ڈال کے آنا تو بات کرنا۔ گانا شروع کراؤ کرمن! دیر کس بات کی ہے۔"

"شہ پارہ اب نہیں گائے گی۔ ہم یہیں بیٹھے بیٹھے شہ پارہ کو خرید سکتے ہیں۔ ہماری بات روپیہ ہے، ہماری بات سونا ہے۔"

"تم سے کہہ دیا گیا ہے کہ کرمن کو سوچنے کا وقت دو۔"

"تم درمیان میں مت بولو۔ یہ ہمارا اور کرمن کا معاملہ ہے۔"

"تم ہمیں جانتے نہیں ہو۔ اسی لیے ہم اب تک خاموش رہے اور کچھ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ علاقہ ہمارا ہے اور یہاں ہمارا حکم چلتا ہے۔"

"یہ علاقہ انھی کا ہے سیٹھ!" کرمن گھبرا کے بولی۔

"اور ہماری بات فولاد ہے۔" بجھل بولا۔ "اور ہمارا وقت قیمتی ہے۔ یہ سودے بازی بعد میں کرنا۔ ہمیں گانا سننا ہے۔"

"تم شوق سے گانا سنو مگر وہ گانا شہ پارہ کا نہیں ہوگا۔"

"وہ گانا شہ پارہ ہی کا گانا ہوگا۔" بجھل نے اطمینان سے کہا۔

"ہم گانا نہیں ہونے دیں گے۔" وہ غصے میں بولا: "ہم شہر بند کر دیں گے۔ بہتر ہے تم اپنی زبان بند رکھو۔ ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟۔۔۔ موتی! دیکھتا ہے یہ سیٹھ کا بچہ کیا بک رہا ہے۔" اس نے موتی سے کہا: "ہمیں زبان بند کرنے کا حکم دے رہا ہے۔"

"استاد! اس کی زبان چاقو سے کاٹ لوں؟" گھوشی نے ہنستے ہوئے کہا: "بہت ہو گیا استاد! تم نے تو حد کر دی۔"

"بجھل! کیا ذلیل کرانے لایا تھا؟ یہ کنجر اتنی دیر سے ٹر ٹر کر رہا ہے اور تو بیٹھا سن رہا ہے؟" موتی انگڑائی لے کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے اتنی باتیں کبھی نہیں سنیں۔" سیٹھ جھنجلا کے بولا: "میرے پاس

تمنچہ ہے۔ احمد آباد میں کئی غنڈے اس کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ آگے بڑھنے کی کوشش مت کرنا۔"

موتی نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا: "بجھل ذرا احمد آباد بھی جانا پڑے گا۔ یہ شہر بھلا کلکتے سے کتنی دور ہے؟" وہ آہستہ آہستہ سیٹھ کی طرف بڑھنے لگا۔

"ہزار ڈیڑھ ہزار میل پر ہوگا۔" بجھل نے سرسری جواب دیا۔

"آگے مت بڑھو۔ میں کہتا ہوں آگے مت بڑھو۔" سیٹھ نے تمنچہ تان کر کہا۔

"کرمن! کرمن بانو! تم اسے روکو۔ اس جانور کو روکو۔ اگر ایک خون ہو گیا تو پھر یہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں جائے گا۔۔۔ ہم اب جائیں گے اور شہ پارہ ہمارے ساتھ جائے گی۔"

کرمن کانپ رہی تھی۔ موتی قہقہے لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ شہ پارہ چیختی ہوئی موتی کے پاس آئی اور اس کا بازو جھنجوڑ کے بولی: "رک جاؤ۔ رک جاؤ۔ میں سیٹھ سے بات کرتی ہوں۔ میں نہیں گاؤں گی، نہیں ناچوں گی۔ میں سیٹھ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ یہاں خون مت بہاؤ۔"

موتی رک کے شہ پارہ کو غور سے دیکھنے لگا: "تم اتنی پیاری لڑکی ہو۔ میں تمھیں اس پاگل کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔"

"شہ پارہ! سامنے سے ہٹ جاؤ۔" سیٹھ نے مرتعش آواز میں کہا: "شاید اس کی موت آ گئی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" شہ پارہ ہذیانی انداز میں بولی: "میں تم سے منت کرتی ہوں۔ تمنچہ اندر رکھ لو۔ تمنچہ اندر رکھ لو۔" وہ ایک لمحے میں جست لگا کے سیٹھ کے پاس پہنچ گئی۔

موتی اس کے مقابل کھڑا تھا۔ ان دونوں کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ تمنچے پر سیٹھ کی گرفت سخت معلوم ہوتی تھی۔ بجھل کھڑا ہو گیا۔ شولی، کانتے چند قدم آگے بڑھ گئے۔ ان کے چاقو روشنی میں چمک رہے تھے۔ کرمن سیٹھ کے قدموں پر سر رکھ کے فریاد کر رہی تھی۔ سیٹھ کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ بھی اسے روکنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ادھر بجھل، کانتے اور شولی کھلے چاقو ہاتھوں میں لیے قہر آلود نظروں سے سیٹھ کو گھور رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں چاقو نہیں تھا۔ میں نے کانتے سے کہا کہ اگر اس کے پاس کوئی فاضل چاقو موجود ہو تو وہ میرے حوالے کر دے۔ بجھل نے سن لیا اور اپنا چاقو مجھے دے دیا۔ سیٹھ تمنچہ تانے بار بار موتی کو سامنے سے ہٹنے کا حکم دے رہا تھا اور موتی کسی بت کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چاقو کھولے اس کے رو بہ رو کھڑا تھا۔ پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا۔ میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ موتی کا جسم بائیں طرف پھرتی سے جھکا اور اس کا چاقو والا ہاتھ بجلی جیسی تیزی سے سیٹھ کے ہاتھ پر جھپٹا۔ سیٹھ نے ایک چیخ ماری۔ تمنچے سے گولی کی آواز آئی اور تمنچہ لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ سیٹھ کے ہاتھ سے خون بہنے لگا تھا اور وہ درد کی شدت سے اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے بری طرح پکڑے ہوئے تھا۔ موتی نے جس تیزی اور تیز رفتاری سے یہ کام کیا تھا، وہ چاقو زنی کا کمال تھا۔ اس نے ٹھیک اسی ہاتھ پر چابک دستی سے چاقو کا وار کیا تھا جس میں تمنچہ موجود تھا۔ پہلے موتی نے بائیں طرف جسم جھکا کے سیٹھ کو ورغلایا اور پھر دائیں ہاتھ سے اس کے ہاتھ پر حملہ کر دیا۔

چاقو اس انداز سے لگایا گیا تھا کہ تمنچے کی گولی ضائع چلی جائے ورنہ دوسری صورت میں وہ کسی کو بھی لگ سکتی تھی۔ اپنا جسم ہٹانا اور تمنچے کا نشانہ قائم رکھتے ہوئے حملہ کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ موتی کو اپنی چاقو زنی پر مکمل اعتماد ہے۔ بجھل نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ گھوشی نے تمنچے پر قبضہ کر لیا تھا۔ خون روکنے کے لیے کرمن نے اپنا دوپٹا سیٹھ کے ہاتھ پر باندھ دیا۔ وہ بلبلانے لگا تھا۔ اس کی تین انگلیوں کے درمیانی پوروں پر چاقو کی ایک گہری لکیر کھنچ گئی تھی۔ ذرا ہاتھ اور گہرا پڑ جاتا تو تینوں پورے زمین پر گر جاتے مگر موتی کا مقصد یہ نہیں ہوگا۔ جو مقصد تھا، وہ اس نے حاصل کر لیا تھا۔ سیٹھ لکشمی داس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے درد و کرب دبانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی کراہیں نکل ہی گئیں۔ اس کے ساتھیوں، دوستوں اور کرمن نے اسے فرش پر بٹھا کے گھریلو دواؤں سے اس کی پٹی کر دی۔ بجھل نے دوبارہ شہ پارہ کو حکم دیا کہ وہ گانا شروع کرے۔ شہ پارہ نے گھنگرو اتار دیے تھے۔ بجھل کے حکم پر اس نے کسی توقف کے بغیر عمل کیا۔ جیسے ہی گھنگرو چھنکے اور طبلے پر پہلی تھاپ پڑی، سیٹھ وحشت زدہ انداز میں اٹھ گیا: "نہیں شہ پارے! تم نہیں گاؤ گی۔ انکار کر دو شہ پارے!" وہ چیخنے لگا۔

شہ پارہ نے مصرع اٹھا دیا ع: روتی پھرتی ہے پھولوں کی سواری آپ کی۔

سیٹھ نے تیز نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے ساتھیوں سمیت دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ "سنو سیٹھ!" کانتے کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ کانتے نہ جانے اس سے کیا کہنا چاہتا تھا مگر پھر رک کے کہنے لگا: "جاؤ سیٹھ! آئندہ احتیاط رکھنا۔"

"یہ احمد آباد نہیں ہے سیٹھ!" موتی نے ہنس کے کہا: "وہاں زخمی رہتے ہوں گے۔ اب جاتے کہاں ہو، بیٹھ جاؤ، ہماری طرف سے گانا سنو۔ تم چلے جاؤ گے تو مزہ نہیں آئے گا۔ تمھیں سامنے دیکھ کے شہ پارے کی آواز میں کچھ اور ہی سوز پیدا ہوگا۔"

سیٹھ نے شعلہ بار نظروں کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آخری بار شہ پارہ پر ایک نظر ڈالی اور گردن جھٹکتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔ کرمن کی پکار، موتی، کانتے اور گھوشی کے قہقہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا ہوگا۔ کرمن نے لپک کے دروازہ بند کر دیا اور سیدھی بجھل کے پہلو میں آ بیٹھی: "آج تو خیر ہو گئی استاد!" وہ خفقانی لہجے میں بولی: "اگر تمنچہ چل جاتا تو؟"

"تو کیا ہوتا، تمھاری چاندنی خراب ہو جاتی۔" موتی نے کہا۔

"میرا تو دل ابھی تک ہول رہا ہے۔"

"تم گھاٹے میں نہیں رہیں کرمن بانو!" کانتے نے آنکھ مار کے کہا۔

"آگ لگے ایسی دولت کو۔ سر پہ تلوار لٹک رہی تھی۔" کرمن بولی: "وہ تو آج متھے سے اکھڑ گیا تھا۔ دیکھو میرا دل۔" اس نے بجھل کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سینے سے لگایا: "کیسا دھڑک رہا ہے۔"

"ہم بھی تمھارے پرانے آشناؤں میں سے ہیں۔" موتی نے شکایت کی۔

"یہ تو پیسے کی دھڑکن ہے کرمن بانو!" گھوشی نے کانتے کو کہنی ماری: "سودا برا نہیں تھا، بات اب بھی بن سکتی ہے۔"

"اے جاؤ بھی۔" وہ گھوشی کو ٹہوکا مار کے بولی: "اس جنونی کو کون اپنی بیٹی

دے گا۔" پھر اُسے اچانک کچھ خیال آیا یا شاید وہ موضوع بدلنا چاہتی تھی اُس نے شہ پارہ کو اشارہ کر کے ہمارے پاس بلایا۔ "میں تو بھول ہی گئی۔" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بولی: "آداب نہ تسلیم، سلام نہ دعا۔ اُس ناہنجار نے موقع ہی نہیں دیا۔ تجمل تو شاید پہلی بار شپارے کو دیکھ رہے ہیں۔"

سیٹھ کے جاتے ہی ہم لوگوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کے شہ پارہ نے نغمہ سرائی بند کر دی تھی۔ کریمن کی طلبی پہ وہ فوراً ہمارے پاس آئی۔ سب کو گردن خم کر کے ایک ہاتھ سے تسلیم کی۔ مجھے وہ اُس وقت بہت اچھی لگی۔ میرا جی چاہا کہ وہ ایک بار اور تسلیم کرے۔ پہلی لڑکی ٹرے میں چائے سجا کے لے آئی تھی، خشک میوے اور مونگ پھلیاں وغیرہ۔ شہ پارہ کو اتنے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو بہت معصوم ہے۔ یقیناً اُسے بھی کسی نسترن نے کریمن کے حوالے کیا ہوگا۔ میرا دل اُس سے یہ پوچھنے کے لیے مچلا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ رقص کی یہ تعلیم، یہ گائیکی تو اُس نے اسی جگہ سیکھی ہوگی۔ سیٹھ کے واقعے سے اُس کی شوخی رخصت ہو گئی تھی۔ وہ دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھی۔ یہ بہت اجنبی مسکراہٹ تھی۔ موتی اُس کے حسن کی برملا تعریف کر رہا تھا، وہ شرما شرما جاتی تھی۔ میری نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ جب موتی نے اصرار کیا کہ اب رات جا رہی ہے، کچھ ناچ گانا ہو ہی جائے تو وہ ایک گہری سانس لے کے اٹھی۔ میں نے چاہا اُسے گانے سے منع کر دوں اور کہوں کہ وہ صرف باتیں کرتی رہے لیکن موتی، گھوشی اور کانتے کا اشتیاق دیکھ کے خاموش رہا۔ شہ پارہ نے پھر گانا شروع کر دیا ؎

رونق بھرتی ہے پھولوں کو سواری آپ کی
کس قدر ممنون ہے بادِ بہاری آپ کی

وہ اتنی دل سوز، دل نشیں اور دل کش آواز میں گا رہی تھی کہ سب پر محویت طاری ہو گئی۔ موتی کی جیب میں جو کچھ بھی تھا، وہ اُس نے لُوٹ دیا۔ شہ پارہ اُس کے سامنے آ کے گانے لگی۔ میری جیب میں پیسے ہی نہیں تھے لیکن کانتے اور گھوشی نے کمال والی حرکت کی۔ میرے کان، گال اور ہونٹوں سے نوٹ لگا دیے۔ شہ پارہ انھیں میرے چہرے سے مسکرا مسکرا کے نوچتی رہی۔ میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے اور اُس کی نگاہ میرے جسم میں پیوست ہوئی جا رہی ہے۔ "دیکھا استاد! میں نے پہلے ہی کہا تھا۔" "لاڈلے کے سامنے ملا اپنے کو کون پوچھے گا۔" کانتے نے تجمل سے کہا: "اب ہماری کیا ضرورت ہے، چلو اٹھو استاد!"

"حرام کے جنے! تیری زبان میں کیڑا لگ گیا ہے۔" تجمل نے غصے سے کہا۔ "کسی دن اسے کاٹ کے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

کانتے بھن بھنانے لگا۔ موتی نے اُس کے سر پہ دھپ مار کے اُسے خاموش کیا۔ شہ پارہ کو گاتے گاتے ہنسی آ گئی۔ اُس کے موتیوں جیسے دانت بکھر سے گئے۔ ابھی اُسے گانا گاتے ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر نسود زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ شہ پارہ کی آواز میں لرزہ آ گیا۔ ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گھوشی نے سیٹھ کا تمنچہ تجمل کے حوالے کر دیا تھا۔ کریمن تھوڑی دیر اور دروازے کی طرف نہ جاتی تو شاید دروازہ ٹوٹ جاتا۔ وہ اُدھر گئی اور اِدھر ہم اُٹھنا چاہتے تھے، تجمل نے انھیں بیٹھے رہنے دیا۔ البتہ ہمارے چاقو سے عُور نہیں تھے۔ سازندوں کے ہاتھ بہکنے لگے اور شہ پارہ اپنی آواز قائم رکھنے میں ناکام ہو گئی۔ کریمن نے لرزتے لرزتے کنڈی کھولی۔ دروازہ کریمن کے منہ پر لگا۔ چونکہ باہر سے اُس پر زور پڑ رہا تھا اور حضرت جانے پہلے ایک انسپکٹر دندناتا ہوا اندر گھسا، اُس کے پیچھے دو پولیس والے تھے۔ سیٹھ کشمی داس اور اُس کے دوست تھے۔ انسپکٹر دو چار ہی قدم آگے سٹ پٹا کے ٹھہر گیا۔ اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی درشتی تیزی سے ہو گئی۔ "ارے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا: "استاد تجمل موجود ہیں۔ کہو استاد! کیا معاملہ ہے؟"

تجمل کھڑا ہو گیا: "مکرجی! کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں استاد! یہ کیا؟..." اُس نے سیٹھ کی طرف دیکھ کے کہا: "میں سمجھا تھا کوئی اور ہوگا۔"

"سیٹھ نے تمھیں میرا نام نہیں بتایا ہوگا مگر چلو اچھا ہوا تم آ گئے۔ سیٹھ کے چاقو مار دیا ہے۔" تجمل نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں جی انسپکٹر صاحب اور تجمل کے پاس سیٹھ کا تمنچہ ہے۔"

"زیادہ کیوں بولتا ہے رے۔" تجمل نے موتی کو جھڑک دیا۔ "میں پوری بات بتا رہا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مکرجی جانتے ہیں۔ مکرجی! اسے ہتھکڑی لگا دیجیے۔ موتی نے سیٹھ کے ہاتھ پہ چاقو مارا تھا۔ قتل عمد کی دفعہ لگ سکتی ہے۔ سیٹھ کا خون بھی بہنا ہے۔"

انسپکٹر مکرجی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ کبھی تجمل کی جانب، کبھی سیٹھ کی جانب۔ "ان غنڈوں نے ہماری بے عزتی کی ہے انسپکٹر!" سیٹھ کشمی داس نے غصے میں کہا اور موتی کی طرف دیکھا: "اسے سزا دلواؤ۔"

"بھیڑیے، بھیڑیے سیٹھ صاحب!" انسپکٹر نے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا: "آپ استاد تجمل کو نہیں جانتے؟ یہ سب اِن کے ساتھی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک کوئی خود ان سے چھیڑ نہ کرے یہ آگے نہیں بڑھتے۔"

سیٹھ کی زبان لڑکھڑانے لگی: "انسپکٹر! ہم کیا جھوٹ بولا ... تم یہ ہمارا ہاتھ نہیں دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں سیٹھ صاحب! دیکھ رہا ہوں۔ ایسے موقعوں پر ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں، جانے دیجیے۔" انسپکٹر نے اُس کا تکدر دور کرنا چاہا۔

"انسپکٹر!" اُس نے کپکپا کے انگریزی میں کہا: "تم ہمارے کتوں کو عزت دے رہے ہو؟ ہم کیا تمھیں اسی لیے یہاں لائے ہیں؟ کوئی کارروائی نہیں کروگے تو ہم تمھارے افسروں کے پاس جائیں گے۔ روپے ہم نے تمھیں دیے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ہم اُن پر خرچ کر سکتے ہیں۔ بدمعاشوں نے ہمیں شپارے کے سامنے شرمندہ کیا ہے۔ یہ قصائی میرا ہاتھ اپنے چاقو پہ ملنے لگا۔" میں نے تجمل کی طرف دیکھا۔ اُس کے لبوں پر ایک پُرسکون مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "نادر سیٹھ صاحب!" انسپکٹر نے نرمی سے انگریزی ہی میں کہا: "آپ ان پیچ لوگوں کے منہ کہاں آ رہے ہیں۔ یہ بڑے شیطان ... کے بچے ہیں۔ یہاں ایک سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش بیٹھا ہے۔ اپنی عزت ... ہاتھ ہوتی ہے سیٹھ صاحب! انھیں جتنا چھیڑیں گے یہ اتنا ہی منہ آئیں گے۔ ... ہے کہ معاملہ رفع دفع کر لیجیے۔ یہ جیل خانے اور کچہری وغیرہ سے نہیں ڈرتے۔ پھر آپ کا تمنچہ بھی ان کے پاس ہے۔ یہ رنڈی کا کوٹھا ہے سیٹھ صاحب! ... ان کے خلاف آپ کو کوئی گواہ بھی نہیں ملے گا۔ آپ کیوں ان جھگڑوں میں ... پھنس گئے؟ آپ ان..."

"زبان سنبھالو انسپکٹر!" میں نے آگے بڑھتے ہوئے اُردو میں کہا: "اتنی گالیاں ... دو، ہم بھی کچھ عزت رکھتے ہیں۔"

انسپکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں، رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ سٹ پٹا گیا۔ اُس نے ... بولنا چاہا مگر منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ تجمل نے قہر آلود لہجے میں مجھ سے ... پوچھا: "کیا کہہ رہے ہیں مکرجی؟ ہمیں گالیاں دے رہے ہیں؟"

میں نے تجمل کو نہیں بتایا کہ انسپکٹر نے ہمیں کن القاب سے نوازا ہے۔ "اپنا ... لاڈلا بھی گٹ پٹ جانتا ہے انسپکٹر صاحب!" موتی نے تمسخر آمیز انداز میں کہا: "... اور تمھارے سیٹھ سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہوگا۔ ہاں لاڈلے بول! فر فر گٹ پٹ ... جائے۔"

"یہ لاڈلا ہے؟ وہی لاڈلا جس نے جیل میں تعلیم حاصل کی تھی؟" انسپکٹر ہکلاتے ہوئے پوچھا: "مجھے افسوس ہے استاد!"

"ہاں یہ وہی لاڈلا ہے مکرجی! اچھا ہوا تم نے بھی اسے دیکھ لیا۔"

"مجھے افسوس ہے، میرا مطلب سیٹھ کو کسی صورت سے مطمئن کرنا تھا استاد ... ل! بات اُلجھانے کی کوشش مت کرو، میرا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔"

"میں تمھارا مطلب سمجھتا ہوں مکرجی!" تجمل نے زہرخند سے کہا: "اطمینان سیٹھ کا تھا۔ ہماری تمھاری دوستی تو اپنی جگہ ہے۔"

"استاد تجمل!" انسپکٹر ندامت آمیز لہجے میں بولا: "میں..."

"جانے دو انسپکٹر! گالیاں ہم پر اثر نہیں کرتیں۔ کچھ کارروائی کرنا ہے تو ... ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم یہاں مخول کرنے نہیں آئے۔"

"تم گانا سنو تجمل! کارروائی ہو چکی۔" اُس نے سیٹھ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "آؤ سیٹھ، چلو۔"

"کیا کارروائی ہو چکی؟" سیٹھ مچل کے بولا۔

"چلو سیٹھ! باہر چلو۔" انسپکٹر نے اُسے آسان کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں سیٹھ! ابھی تو شپارے نے آج گانے میں تڑپا تڑپا دیا۔ تم بڑے ... پلی ہو، محفل تو خوب کیا۔ اب بھی قیمت کم ہی رہی۔" موتی نے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا انسپکٹر کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"آئیے میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔" وہ سیٹھ کو کھینچتے ہوئے بولا۔ سیٹھ نے اس دفعہ زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ اُس کے دوستوں نے بھی اُس کی پیٹھ تھپکی حالانکہ وہ سیٹھ کی حمایت میں اس بار پہلے سے زیادہ سرگرم اور پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ چلتے چلتے انسپکٹر نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ کریمن پھر سر پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئی تھی۔ تجمل کا چہرہ چمکنے لگا تھا: "سالا ڈلے! لاڈلے! گلے لگ جا۔" وہ بے تابی سے بولا: "دیکھا موتی! میرے شیر کی گرج سُنی، میری بجلی چمکتی دیکھی؟"

"استاد! لاڈلے کو گٹ پٹ کرتے دیکھنے کی حسرت رہ گئی۔ سالے انسپکٹر کا چہرہ دیکھا تھا۔ اُس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ کیا گالیاں دے رہا تھا لاڈلے؟" کانتے نے میری پسلیوں میں ہاتھ ڈال کے پوچھا۔

وہ سب میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ موتی نے دہاڑ کے کہا: "بس کریمن! اب ایک آخری آئٹم سنوا دے۔ شپارے سے کہہ دے کہ وہ آج سارا ریکارڈ توڑ دے۔"

"اب مجھ سے نہیں گایا جائے گا۔" شہ پارہ نے آہستگی سے کہا۔

"تو مت گاؤ، بس ہمارے سامنے بیٹھی رہو۔ تمھارا تو سامنے رہنا بھی گانا ہے، طبلہ ہے، ہارمونیم ہے۔" موتی نے دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا۔

"مجھے ڈر ہے کہ وہ جونی پھر کسی افسر کو لے آئے گا۔ اُس کے پاس بہت پیسے ہیں۔" کریمن نے خوف زدگی سے کہا۔

"حرام کے ہیں۔" تجمل نفرت سے بولا: "اچھا ہے، کچھ پولیس افسروں کا بھلا ہو جائے۔ سب اپنے ہی آدمی ہیں۔ پر اب وہ ادھر نہیں آئے گا۔"

"تمھیں معلوم ہے؟" کریمن نے حواس باختگی سے کہا: "تمھیں یقین ہے؟"

"ہاں۔" تجمل نے بے پروائی سے کہا: "اب وہ نہیں آئے گا، اب رات کو تم دروازہ کھلا رکھ کے سونا کریمن!"

"رات کو میں چوکیداری کرنے کو تیار ہوں۔ کیوں کریمن؟" موتی نے شوخی سے پوچھا: "تمھارا کیا خیال ہے؟"

"تمھارا گھر ہے موتی! یہاں آج تم لوگ نہ ہوتے تو جھ پر کیا کیا نہ بیت جاتی۔ وہ تو پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ شہ پارہ کا چہرہ دیکھو، تھکا دیا غریب کو، لمحے لمحے پر دل دھڑک رہا تھا۔"

گانے کی محفل تو پہلے ہی اُجڑ گئی تھی، سازندے بھی اپنا اپنا تنبورا سنبھال کے اندر چلے گئے۔ کریمن حیدرآباد کے واقعات سنانے لگی اور شہ پارہ سب کے سامنے میرے قریب آ کے بیٹھ گئی۔ میں گھبرا گیا۔ اُس کے سراپا سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کے آنکھیں پٹ پٹاتی رہی۔ پھر اُس کے لبوں پر تھرتھراہٹ سی ہوئی۔ یہی کیفیت میری تھی۔ "آپ ... آپ۔" وہ جھجک کے بولی: "میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ بولنا نہیں جانتے۔" میرا دماغ سن سنا گیا۔ کوئی معقول بات عقل میں نہیں آئی۔ وہ خود ہی مسکرا کے کہنے لگی: "میرا نام شہ پارہ ہے۔"

"میں نے سن لیا ہے۔" میں بدحواسی سے بولا۔

وہ کچھ جھجکی: "آپ اِن سے بالکل جدا معلوم ہوتے ہیں۔"

"آپ کا خیال ہے ورنہ مجھے تو اپنے آپ میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں

آتی۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "آپ ہی بتلائیے آپ کو مجھ میں کیا چیز جُدا نظر آتی ہے؟"
"ہر چیز۔ جب سے آپ آئے ہیں، خاموش خاموش بیٹھے ہیں۔ نہ داد نہ بیداد۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو رقص و موسیقی سے دلچسپی نہیں ہے اور جیسے آپ کو جبراً یہاں کھینچ کے لایا گیا ہے۔ کہیے، میرا خیال درست ہے نا؟"
"مجھے یہ سب بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔" میں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔
"کیوں؟ آپ تو ان محفلوں کے عادی ہوں گے؟"
"نہیں، میں پہلی بار کسی ایسی جگہ آیا ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔
"سچ؟" وہ تعجب سے بولی۔ "آپ بنا رہے ہیں۔"
"آپ جو سمجھیے۔" میں نے کسی قدر خفت سے کہا۔
"واقعی؟ مجھے یقین نہیں آتا، بھلا آپ۔۔۔" اُس کی پتلیاں تھرکنے لگیں۔ "پھر تو آپ کو یہ سب کچھ اجنبی اجنبی لگ رہا ہوگا۔ سچ بتائیے۔ یہ ماحول آپ کو پسند آیا؟"
"سچ پوچھیے تو نہیں آیا۔ ممکن ہے بعد میں آ جائے۔"
"خدا نہ کرے۔" وہ تیزی سے بولی۔
"کیوں! آپ تو خود یہاں۔۔۔" میں نے پہلو بدل کے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ تو بہت خوش نظر آ رہی ہیں۔"
"ہاں بہت خوش ہوں۔" وہ نظریں نیچی کر کے بولی۔
"آپ خوب گاتی ہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"اور خوب ناچتی ہیں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہ بھی تو کہیے۔"
میں نے چونک کے دیکھا۔ اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی، صرف پلکیں نظر آ رہی تھیں جو تھرتھرا رہی تھیں۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ اُن سب کی توجہ ہماری طرف مرکوز ہو گئی ہے۔ ہم دونوں چپ تھے اور وہ گہری نظروں سے ہمارا جائزہ لے رہے تھے۔ موتی کا قہقہہ اُٹھا تو مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ شہ پارہ کے جسم کا تمام خون چہرے پر سمٹ آیا۔ ہماری گھبراہٹ سے سب کی کلکاریاں چھوٹ پڑیں۔ میری نا تجربہ کاری نے اور جھینپ لگائی۔
"ہم کو تمھاری نجریا نے مارا، نجریا نے مارا، مارا، مارا۔" کانتے نے کولھے پر ہاتھ رکھ کے مٹکتے ہوئے گایا۔ "دیکھا نا استاد!"
تجمل نے اُچک کر اُس کی گردن پکڑ لی۔ "میں تیری کھال اُدھیڑ دوں گا۔" وہ غرا کے بولا۔ "بھڑوے نے مجھے اپنا شاہجہاں پوری سب سے پہلے تیری ہی گردن پر آزمانا پڑے گا۔"
"وہ دن کب آئے گا؟" کانتے نے چاقو کھول کے کہا۔ "اس کی دھار بھی بہت بانکی ہے استاد! کاٹ دو۔"
شہ پارہ اُداس بیٹھی تھی، کانتے کی باتوں پر اُسے ہنسی آ گئی۔ کانتے نے ایک سرد آہ بھری۔ "اُستاد! کبھی کبھی مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ ساری بات گردن کے اُوپر کے حصے کی ہے۔ اگر گردنیں بدل جایا کریں تو کتنا مزہ آتا۔ پھر میں کبھی کبھی بلاڈلے کی گردن اُدھار مانگ کے اِدھر آیا کرتا۔ اپنی قسمت بھی چند گھنٹوں کے لیے بدل جایا کرتی۔"
"کوئی فرق نہ پڑتا۔" موتی نے کہا۔ "گردن سے نیچے بھی ایک چیز ہوتی ہے، کہاں سے لاتا ہے؟"
"استاد! میری مانو تو آج لاڈلے کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ کچھ شرم و دم ...
کریمن! تم لاڈلے کے بارے میں کیا کہتی ہو۔" کانتے نے پوچھا۔
"میرا بس چلے تو انھیں یہیں رکھ لوں۔" کریمن نے وارفتگی ...
"ہے ہے ظالم!" موتی پر جیسے گریہ طاری ہو گیا۔
دیر ہو گئی تھی۔ تجمل جھنجلا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کریمن نے اُس سے بیٹھنے کے لیے اصرار کیا مگر تجمل اُٹھ چکا تھا، وہ دوبارہ فرش پر نہیں بیٹھا۔ اُٹھتے ہی سب ٹھنڈی سانسیں بھرتے، ہائے ویلا مچلاتے، انگڑائیاں لیتے اُٹھ گئے۔ "اب کب آؤ گے؟" کریمن نے تجمل کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے ... دو سال بعد پھیرا لگا جاتا ہے۔"
"جلد ہی آؤں گا کریمن!" تجمل نے جواب دیا۔ "کوئی پریشانی ہو تو ... کوئی ایسی ویسی بات ہو تو گلی سے کسی آدمی کو بُلا لینا۔ اپنے آدمی یہاں گھر ... رہتے ہیں۔"
"اور میرے لیے کیا حکم ہے؟" موتی نے کریمن کے گلے میں بانہیں ... "آسنسول آؤ گی یا بس یہیں یہیں تک بات ہے؟"
"تم دل سے بلاؤ گے تو سر کے بل آؤں گی۔" کریمن کھِل کھِلا ...
"اور ابھی تو تم شہر میں ٹھہرو گے، جب تک یہاں ہو میرے حجرے پر روز ... یہ میرا حکم ہے۔"
شہ پارہ سب سے پیچھے تھی۔ مجھے یقین تھا کہ چلتے وقت وہ مجھ سے ... کرے گی۔ اس لیے میں دانستہ اُن لوگوں سے پیچھے رہ گیا تھا۔ دروازے پر ... جھک کے تسلیم کی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے جواب دیا۔ اُس ... کے ایک جھماکے کی طرح مجھ سے قریب ہو کے چپکے سے کہا۔ "دیکھیے ... کبھی اِدھر نہ آئیے گا۔" اس سے قبل کہ کانتے ہمیں مُڑ کے دیکھتا، وہ اپنا ... کے مکان کے اندر واپس ہو گئی۔
جس وقت ہم یہاں داخل ہوئے تھے، یہ پورا علاقہ جگمگا رہا تھا ... ہوتا تھا، بارات چلی گئی ہے۔ روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ چھیٹن صاحب ... بھی بند ہو گئی تھی لیکن ابھی کچھ راہ گیر موجود تھے۔ کہیں کہیں کوئی دروازہ کھلا ... گلیوں میں جگہ جگہ پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ تجمل کی رفتار تیز ... لگانے والے سپاہیوں کی نظر جب تجمل پر پڑی تو انھوں نے تجمل کی خیر ... دریافت کی۔ واپسی میں ہمیں بہت سے آدمی ٹکرائے۔ اُن میں بیشتر تعداد ... آدمیوں کی تھی۔ وہ بات تجمل سے کرتے تھے اور گھور کے مجھے دیکھتے تھے ... میں اشتیاق تھا، کسی کی نظر میں تجسس، کہیں خشونت تھی کہیں عقیدت ... دو دنوں ہی میں بہت سے لوگوں کے چہروں سے آشنا ہو چکا تھا۔ کے ... ٹیڑھے میڑھے چہرے کل اور آج شُعلہ کے اڈے پر اے میری ...

... ہر کوئی کی مبارک باد دینے آئے تھے۔ کریمن کے اڈے میں بیٹھے ہوئے تجمل اور ... چلتے ہوئے تجمل میں نمایاں فرق تھا۔ اب وہ اتنا خاموش نہیں تھا۔ اُس کی ... میں سُرخی بڑھ گئی تھی۔ سینہ پھولا ہوا تھا، آواز میں غضب اور غصہ تھا جیسے ... سے ناراض ہو اور جیسے کسی نے خلافِ طبع کوئی بات کہہ دی تو اُس کا خون ... جائے گا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا اور یہ کہا جا رہا تھا کہ تجمل اور اُس کے آدمیوں ... طرف آنکھ اُٹھانے والے کی آنکھ نکال لی جائے گی۔ وہ کہتا تھا جس میں حوصلہ ... حسرت نکال لے، کسی میں دم خم ہو تو سینہ ٹھونک کے سامنے آئے اور تجمل کے ... ان پر ہاتھ ڈالنے والے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔ اُس کی بے اندازہ لاف و گزاف ... مجھے خدشہ ہوا شاید تجمل ابھی تک موجدار کی موت کے سلسلے میں اُن اندیشوں ... پاک نہیں ہوا ہے جس کا اشارہ کانتے نے کیا تھا، اُس کا ذہن ابھی تک آگندہ ... بہرحال تجمل کی مستانہ وار ایسی لوگوں کی آمد و رفت، مبارک باد، گھوشی اور ... کے ساتھیوں کی ہم رکابی اور سوناگاچھی میں دِرانہ آمد، کریمن سے ناتوں اور ... کے واقعے میں انہماک دیکھ کے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ اب پوری ... مطمئن ہے۔ موتی، کانتے اور گھوشی نے اس دوران میں کوئی ایسی بات نہیں کہی ... جس سے یہ اندیشے میرے ذہن میں دوبارہ اُبھرتے۔ تجمل کی دیکھا دیکھی موتی، کانتے ... وہاں ملنے والے تجمل کے دوسرے آدمی بھی بڑھ چڑھ کے باتیں کر رہے تھے۔ ہر ... کسی نے وہاں تجمل یا اُس کے کسی آدمی کے بارے میں اپنے بغض کا معمولی سا ... اظہار بھی نہیں کیا۔ وہ سب بڑے تپاک سے ملے تھے۔
ہمیں گھر واپس پہنچنے میں دو بج گئے۔ موتی کو ایک علیحدہ کمرے میں سُلا دیا ... دالان میں بڑے کمرے کی چاندنی پر لیٹ گیا۔ جسم سخت اور کھُردری زمین پر سونے ... کا عادی ہو گیا تھا۔ تکیے کی عادت بھی جیل میں چھوٹ گئی تھی۔ نیند نہیں آئی۔ نیند ... آتی، نیند اس طرح آنے لگتی تو یہ دن کیوں آتے۔ نیند تو اُسی دن سے اُچٹ گئی ... جس دن کورا کو دیکھا تھا۔ وہ نیند کے ساتھ سب کچھ لے گئی۔ خود بھی کانٹوں ... ایسی ہو گی، مجھے بھی کانٹے چبھو گئی۔ برابر کے کمرے سے تجمل کی کھانسی ... آ رہی تھی۔ وہ بھی جاگ رہا تھا۔ میری وجہ سے کتنے لوگ جاگ رہے تھے۔ میں ... یہاں آ کے تجمل کا سکون درہم برہم کر دیا۔ پتہ نہیں موجدار کی لاش کے ساتھ ... تصفیہ ایا۔ تجمل نے اُسے کہاں چھپایا اور شوردہ پشتوں کی زبانیں بند کرنے ... کیا ترکیب ایجاد کی۔ میرے دل کا دھڑکا بے وجہ نہیں تھا کہ کسی وقت بھی ... ہو سکتی ہے۔ میرے پیروں میں تو بیڑیاں پڑیں گی ہی، تجمل اور اُس کے کئی آدمی ... گرفتار ہو جائیں گے۔ تجمل کو جیل میں ڈالنے کے لیے پولیس کو ایک بہانہ درکار ... کیونکہ تجمل سارا الزام اپنے سر لے گا۔ تجمل کے جو آدمی باہر رہ جائیں گے وہ ... اور سراغ کا خون کرتے پھریں گے اور اُس شخص کا گھر ہی نہیں، محلہ تک اُجاڑ دیں ... جس کے متعلق ذرا سا شبہ ہو گا کہ اُس نے موجدار کی موت کی مخبری کی ہے۔ ... ایک ہی بات میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ درمیان میں تجمل کے چہرے ... لیکن دیکھ کے اس گردش میں کچھ کمی ضرور آ گئی تھی مگر وہ سکون میری خوش فہمی ... کریمن کے ہاں سے آنے کے بعد تجمل کے چہرے پر شکنوں کا جال اور گہرا ہو ... گیا تھا۔ مجھے اب کوئی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ دو ہی صورتیں میری عقل میں آتی تھیں۔ یا تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر کے اقبالِ جرم کر لوں کہ موجدار کے ساتھ اصل میں کیا واقعہ پیش آیا تھا، میرا مقصد اُسے مارنا نہیں تھا، پھر عدالت جو چاہے فیصلہ کرے۔ قریب ترین سزا موت تھی۔ زندگی اور موت ویسے بھی میرے لیے یکساں تھیں مگر اس طرح میں تجمل اور اُس کے ساتھیوں کو عذاب سے نجات دلا سکتا تھا جو ایک صرف میری وجہ سے کسی بھی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے تھے یا پھر میرے فرار میں اُن کی نجات تھی۔ فرار ہو کے میں پولیس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتا۔ فرار ہو کے میں کورا کی تلاش بھی جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ کہیں تو ہو گی، کسی نہ کسی جگہ کسی نہ کسی وقت وہ اور مولوی صاحب مجھے نظر آ ہی جائیں گے حالانکہ دھندا اور دیر ہو گئی لیکن اُمید ٹوٹے نہیں ٹوٹتی تھی۔ اسی اُمید میں میں نے چاند میاں کے گھر کا رُخ کیا تھا، چاند میاں کی باتوں سے یہ اُمید پھر ٹوٹ سی گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس رات کے واقعے کے بعد جس رات کورا مجھ سے جُدا ہوئی تھی، وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ بدمعاش مجھے پھسلانے کے لیے موجدار کے ہاں لے گیا اور ایک فرضی غنڈے مینی کا نام بھی لے دیا۔ مینی کا شاید کوئی وجود نہیں تھا مگر یہ اُمید ہی مجھ سے حجت کراتی رہی، وہ دونوں غنڈے یا اُن میں سے ایک اب تک ضرور موجود ہو گا، جس نے دریا کے کنارے اُس منحوس رات میں ہم پر حملہ کیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کی آخری سانس تک کورا کی تلاش جاری رکھنی تھی اور یہ تبھی ممکن تھا جب میں یہاں سے فرار ہو جاتا۔
اور فرار کیسے ہو جاتا، باہر صحن میں تجمل کے کئی آدمی پہرا دے رہے تھے، دن میں اس کا امکان نہیں تھا کہ تجمل مجھے تنہا چھوڑ دے گا۔ ایک ہی واقعہ اُسے میری طرف سے محتاط رکھنے کے لیے بہت تھا۔ تجمل کے آدمی شہر بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس بڑے شہر میں چھپنا آسان، فرار ہونا مشکل تھا۔ جب تک تجمل کو مجھ پر مکمل اعتماد نہ ہو جائے کہ میں ایک بار تنہا جا کے صحیح و سلامت واپس آ جاؤں گا، وہ مجھے ایک قدم بھی اڈے سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ تجمل میری طرف سے بُری طرح کھٹک گیا تھا۔ میں نے ہی اُسے کل رات اشارۃً بتایا تھا کہ وہ لڑکی زرّیں نہیں ہے جس کے لیے میں بھرے مجمع میں چاند میاں پر جھپٹ پڑا تھا۔ اسی لیے آج صبح میرے غائب ہو جانے کے بعد وہ سیدھا چاند میاں کے گھر پہنچ گیا اور جب میں اُسے وہاں نظر نہیں آیا تو اُس نے موجدار کے اڈے کا رُخ کیا۔ تجمل اس حقیقت سے بھی واقف ہو گا کہ چاند میاں کے مرنے کے بعد میری بے قراری میں کمی نہیں آئی ہے بلکہ اس میں اُسے مزید شدت کا یقین ہو گا۔
میرے پیر بندھے ہوئے تھے۔ کلکتے میں ہر جگہ تجمل کی زنجیریں پڑی تھیں اور ایک زنجیر اس عمارت کے اُوپر موجود تھی۔ اُس کا نام زرّیں تھا۔ یہ زنجیر میں نے خود اپنے پیروں میں ڈال لی تھی۔ کل شام سے میں اُس کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ تجمل کے پیروں میں زرّیں کی زنجیر ڈال کے خود کہیں بھاگ جانا بھی مناسب بات نہیں تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ نسترن کے ہاں سے زرّیں کو لانے کے بعد یہ مسائل کھڑے ہو جائیں گے، تب بھی اُسے نسترن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میرے فرار کے بعد تجمل ہر طرح

اُس کی دل جوئی کی کوشش کرتا مگر بچل کی زندگی ہر لمحے خطروں کی زد پر رہتی تھی۔ ایک مہینے آزادی، دوسرے مہینے جیل اور یہ تو صرف میرا فیصلہ تھا۔ زرّیں کو بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے تھا۔ اس کی اپنی بھی تو ایک شخصیت تھی۔ وہ بھی تو کچھ سوچتی ہوگی۔ کچھ خواب اُس نے بھی تو دیکھ رکھے ہوں گے۔ زرّیں کے خیال نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے سوچا ابھی اُوپر جا کے اُس کے فلیٹ کی کنڈی کھٹکھٹاؤں اور کہوں اب تم آزاد ہو، جہاں چاہو جا سکتی ہو، میں تمھارا اتنا خیال نہیں رکھ سکتا کیونکہ مجھے ایک شخص کی تلاش ہے، وہ نہ جانے دُنیا کے کس کونے میں گم ہو گیا ہے۔

میری آہوں اور کروٹوں کی آہٹیں بچل کے کانوں میں بھی پہنچ گئیں۔ اُس کے کان، اُس کی آنکھیں میری ہی جانب لگی ہوئی تھیں، وہ کھانستا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا، بتی جلائی تو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آ کے رُک گیا۔ "جاگ رہا ہے لاڈلے!" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "زخم میں تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر سوتا کیوں نہیں ہے؟"

"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نیند تو کل رات بھی تیری آنکھوں میں نہیں تھی، اب سو جا لاڈلے، سو جا۔" وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"تمھیں بھی تو نیند نہیں آ رہی۔" میں نے تیکھے انداز سے کہا۔

"ہاں! وہ گردن ہلا کے بولا۔ "میری نیند بھی اُڑ گئی ہے۔"

"کیوں تمھیں کیا ہو گیا؟" میں نے تنک کے پوچھا۔

"پتہ نہیں لاڈلے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا ہو گیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کیا بات ہے، میں آ گیا ہوں۔"

اُس نے اضطراب سے پہلو بدلا، گھور کے مجھے دیکھا، پھر تلخی سے کہنے لگا "ہاں شاید یہی بات ہے۔ تو آ گیا ہے۔" اُس کی تلخی کچھ اور گہری ہو گئی۔ "تو جو آ گیا ہے لاڈلے۔"

اُس کا لہجہ ہی ایسا تھا کہ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں نے یہاں آ کے تمھیں سکون دینے کے بجائے اور پریشان کر دیا۔ تم مجھ سے بہت ناراض ہو گے!"

"ہاں! میں تجھ سے بہت ناراض ہوں لاڈلے۔" وہ مضطرب ہو کے بولا۔

"تو ایسی باتیں کرتا رہے گا تو میں تجھ سے بالکل روٹھ جاؤں گا۔"

"تم بھی روٹھ جاؤ، مجھ سے سب روٹھ گئے ہیں۔"

اُس نے میرا سر اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ "یہی تو آفت ہے کہ تجھ سے روٹھا نہیں جاتا۔ میں تجھ سے روٹھ نہیں سکتا۔"

"میں، میں۔" میری آواز گلوگیر ہو گئی۔ "میں چلا جاؤں گا۔"

"چلا جائے گا۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "مجھے چھوڑ کے چلا جائے گا؟ مجھے معلوم ہے تو اتنا بزدل نہیں ہے۔"

"جب تک میں رہوں گا روز کوئی مصیبت آتی رہے گی۔"

"مصیبت یہ نہیں لاڈلے جو تو سمجھتا ہے، مصیبت تو یہ ہے۔" وہ بپھرتے ہوئے بولا۔ "تجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔"

"مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے اور اس لیے میں کہتا ہوں کہ مجھے جانا چاہیے، میرے جانے سے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"کون سے حالات! یہ تو کیا بک رہا ہے؟" وہ کڑوے لہجے

"حالات تمھارے سامنے ہیں، جو کچھ ہوا، وہ اچانک ہو گیا۔"

"کیا تو میرے سامنے صفائی پیش کر رہا ہے۔" وہ بگڑ کے

"میں تمھیں حقیقت بتا رہا ہوں۔"

"لاڈلے جھوٹ مت بول، تو نے حقیقت ہی تو نہیں بتائی! نہیں کوڑے! دُکھ تو یہ ہے کہ تو نے حقیقت نہیں بتائی، یہ حالات بچھونا ہیں، کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں، کبھی ہاتھ اوچھا پڑ جاتا ہے، کبھی ہے۔ تو مجھے حالات سمجھانے چلا ہے۔"

"لیکن اس بار تم جھوٹ بول رہے ہو، تم مجھ سے نہیں خود ہو، تم جانتے ہو اتنے لوگوں کا منہ بند کرنا کتنا مشکل کام ہے اور یہ ایسے ہوں، تمھیں حالات کی سنگینی کا پورا احساس ہے جس کا اظہار تم نہیں چاہتے، تمھارا چہرہ بتا رہا ہے، تمھاری آواز بتا رہی ہے۔"

"میری آواز، میرا چہرہ" وہ منہ چڑا کے بولا۔ "تو نے ان میں ؟ نہیں دیکھا لاڈلے۔ یہ حالات تو میں کسی طرح سنبھال ہی لوں گا، نمٹنے کا کام مجھے آتا ہے، میں تجھے آج اُس بدنام جگہ جان بچے لے گ پتہ چل جائے کہ بچل کے سینے میں کتنی طاقت ہے۔ اس کی ٹکر نہ کتے ہیں جو تیرے بجائے خود جیل جانے کو تیار ہو جائیں گے۔ پولیس تو انھیں دیکھنے کو جی مچلنے لگتا ہے، جیل تو ہماری ڈیوٹی ہے لاڈلے گھر آتے ہیں، یہ بات نہیں ہے میاں مٹھو، سارا شہر سنبھالا جا سنبھالنا اور تجھ سے نمٹنا مشکل نظر آتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا۔ نگاہ کا پتہ نہیں چلتا۔ لاڈلے، لاڈلے۔" وہ بے چینی سے بولا۔ لیے نہیں بتائے تھے کہ تو آزاد ہو کے انھیں زنجیا کھسوٹنا شروع کر آدمی کو دوسروں کی دُکھتی رگیں نہ معلوم ہوں تو اُس کا جینا حرام کچھار سے نکل پڑا، آتے ہی ہاتھ دکھانے شروع کر دیے، کچھ تو تسلی میری بات سُن، تیرے سر کی قسم، چاقو تیرے ہاتھ میں اچھا نہیں لگ وہ بے قرار ہو گیا۔ "مجھے تیری چاقو بازی دیکھنے کا شوق نہیں ہے کتابیں پڑھتا تھا اور قلم سے لکھتا تھا تو بہت اچھا لگتا تھا۔"

"مجھے کیا یہ خود پسند ہے۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کے "میں چاند میاں اور موجدار کے پاس اپنی چاقو زنی کے جوہر دکھا تو وہاں کسی اور کام سے گیا تھا۔"

"اور اکیلا چلا گیا تھا، میری آنکھیں جیسے بند ہو گئی تھ

"میں اُسے اتنا مشکل کام نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے تمھیں نہیں بتایا ورنہ بات بڑھ جاتی اور پھر مجھ سے اپنے سوا کسی کو بتایا بھی نہیں جاتا۔"

"کسی کو تو بتا دے لاڈلے! اتنا مت خوف کر۔"

"کیا بتاؤں!" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"کون ہے وہ، کہاں ہے، کدھر ہے؟"

"کون؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہی جو تجھے جیل لے گئی تھی، کون ہے وہ، کدھر رہتی ہے؟"

"کاش میں اُس کا پتہ جانتا؟ میں نے تمھیں کل ہی یہ بتا دیا تھا۔"

"چاند میاں کو اُس کا پتہ معلوم تھا؟"

"میں اسی خیال سے اُس کے پاس گیا تھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن اُس کا پتہ نہیں چلا۔" وہ تیزی سے بولا۔ "جہاں تک اپنا دماغ کام کرتا ہے لاڈلے! تو بچپنا کر رہا ہے، سات سال کا پھیر پڑ گیا ہے۔ سات سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہو، ہو بھی یا نہ ہو۔"

"ایسا مت کہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہو گی۔"

"مجھے بتا دے تجھے کہاں اور کب ملی تھی؟"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اُس نے میرے ہاتھ چہرے سے ہٹائے تو ناراض ہونے لگا۔ "ہائیں پھر وہی شوشے، سالا بچل کا لاڈلا بچل کے رہتے ہوئے آنکھوں میں پانی لاتا ہے۔"

"مجھے جانے دو، میں اُسے تمام دُنیا میں ڈھونڈوں گا۔"

"کوئی کسی کو اس طرح سے ڈھونڈتا ہے دیوانے۔ سات سال تو نے جیل میں بتا دیے۔ ذرا سا وقت ملا تو اتنا تیز بھاگنے لگا۔ آنکھ میں پانی آ جائے تو چیزیں نظر نہیں آتیں، تیز بھاگنے میں سانس پھول جاتا ہے۔ تو نے کتابوں میں کیا پڑھا ہے رے، تو تو اپنے آپ کو اور اُلجھا رہا ہے وحشی۔ کام خراب کر رہا ہے۔ اس طرح وہ تجھے تھوڑی مل جائے گی۔ دیکھا، بدحواسی میں بات اور خراب ہو گئی۔ یہ کام طریقے سے بھی ہو سکتا تھا، میری مان جانی۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کر۔ میں اس لیے تجھ پر زور دیتا ہوں کہ غور میں نے نہیں کیا تھا۔ لاڈلے تیرے پاس وقت ہے۔ میں جب سوچنے کی قوت آئی تو وقت نکل چکا تھا، تو بھی وہی کر رہا ہے۔ بتا جیل میں چلا جائے گا تو اُسے کیسے تلاش کرے گا۔ ایک جگہ سے بچ گیا ہے، دوسری جگہ پھنس جائے گا۔ اوسان ٹھیک رکھ، پہلے اپنے آپ کو تلاش کر۔"

"جو تم کہہ رہے ہو، وہ میں بھی سوچتا ہوں مگر وہ مجھے بہت یاد آتی ہے، تمھیں کیا پتہ ہے میں نے اُس کے لیے کن کن لوگوں کو چھوڑ دیا ہے۔"

"اور کیا حال ہوا؟"

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں بچل کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں نے اس لڑکی کے لیے اپنے ابا، امی اور بہن بھائیوں کو چھوڑ دیا۔ میرے آبائی گھر میں طلب والے لوگ رہتے ہیں، میری امی مر گئی ہیں، میری کورا کو لوگوں نے بیچنے کی کوشش کی تھی اور امی لوگوں نے اُسے میرے ساتھ رہنے نہیں دیا۔ بچل کو کیا اندازہ تھا کہ میرا سینہ کیسا ہے، میرے اندر بار بار آگ لگتی ہے۔ میرا جی دیواروں سے سر پھوڑنے کو چاہتا ہے، میرا جی کرتا ہے کہ اپنے جسم پر چاقو کے اتنے گھاؤ لگاؤں کہ کوئی جگہ باقی نہ رہے۔ بچل مجھے سمجھاتا بجھاتا رہا اور اس کی باتیں سمجھنے کے سوا میرے پاس راستہ بھی کیا تھا۔ ہر بات پر بچل بیٹھا تھا، ہر چوراہے پر پولیس موجود تھی۔ ایسی حالت میں کورا کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ میں نے چپ سادھ لی۔ "تو آج زرّیں کے پاس بھی نہیں گیا۔" بچل ناراضی سے بولا۔

"وقت ہی نہیں ملا۔" میں نے اُداسی سے جواب دیا۔

"وہ کیا سوچتی ہو گی، اُسے لا کے قید کر دیا۔ صبح اُٹھ کے فوراً وہاں جانا اور دیکھ، میں صبح تیری یہ حالت نہ دیکھوں، سمجھ لاڈلے ایسے وقت میں تو اُداس رہ کے مجھے پریشان کرے گا۔ اس وقت تیرا سنبھلے رہنا ضروری ہے۔ میری خاطر کچھ وقت اور گزار لے۔ اب تو سو جا، چل لیٹ جا۔" اُس نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے لیٹ گیا۔ اُس نے ایک تکیہ میرے سر کے نیچے رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں ٹھہرا رہا، پھر ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتا اور گہری گہری سانسیں لیتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اُس کے جانے کے بعد بھی مجھے نیند نہیں آئی۔ یہاں تک کہ کمرے کی سیاہی اُجلی ہونے لگی۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر گیا تو نصیب میاں اور دوسرے لوگ ورزش کر رہے تھے۔ کوئی دیوار پر لگے تکیے کو بے تحاشا مکے مار رہا تھا، کسی کا سر نیچے اور پیر اُوپر تھے۔ نصیب میاں بنیان پہنے اپنے ہاتھ اور ٹانگیں کھولنے کی مشق کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ورزش ختم کر دی اور بلند آواز میں بولا۔ "آہا آفتابِ عالم تاب طلوع ہو گیا۔" پھر اُس نے خاص انداز میں آنکھیں میچیں اور کہنے لگا۔ "ازراہِ خدا اس نابکار کو پھر آزمائش میں نہ ڈالیے گا، جو کچھ دن رہ گئے ہیں، وہ رُسوائی میں گزریں گے۔ غلاموں کی ہم رکابی کے بغیر باہر جانے کا قصد نہ کیجیے، سرکار کی سواری دھوم دھام سے نکلنا چاہیے۔"

میں نے توجہ نہیں دی۔ وہ اپنے ساتھ چائے کی ایک پیالی پینے کی آوازیں لگاتا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد میں زرّیں کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ تیزی کی وجہ سے میری سانس اکھڑ گئی تھی۔ کسی نے نہایت عجلت میں دروازہ کھولا۔ وہ زرّیں ہی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے، دوپٹا شانے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔ شاید اُسے یہ یقین کرنے میں مشکل پیش آئی کہ میں ہی اُس کے سامنے موجود ہوں۔ پھر اُس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں اور وہ مجھے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گئی۔ "تم نے کل میرا انتظار کیا ہو گا۔" اُس کی شکایت سُننے سے پہلے خود میں نے ہی پہل کر دی۔ "کل دن بھر مصروفیت رہی۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ "کیا حال ہے؟ جی تو نہیں لگ رہا ہو گا؟" اُسے چپ دیکھ کے میں نے گھبرا کے پوچھا۔ "کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" اُس نے ہلکی آواز میں جواب دیا۔ "کوئی پریشانی نہیں۔"

"ناشتہ کر لیا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی نہیں اور تم نے؟" اُس نے نظریں اُٹھا کے پوچھا۔

"میں نے بھی نہیں کیا، سوچا تمھارے ساتھ کروں گا۔" میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر سرخ لہریں آکے گزر گئی ہیں۔

"میں ابھی لاتی ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"ماما سے کہہ دو۔"

"میں خود لاتی ہوں، وہ اور اس کی بیٹی مجھے کام ہی نہیں کرنے دیتیں۔" وہ فوراً باورچی خانے میں چلی گئی، میں اندر کمرے میں آکے اس کی مسہری پر بیٹھ گیا۔ چادر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ رسالے اور کتابوں کا ایک ڈھیر میز پر رکھا تھا۔ اس وقت بھی بجلی جل رہی تھی۔ مجھے اس کے بستر سے اس کی خوشبو آتی محسوس ہوئی ایسی ہی خوشبو کرل کے جسم سے آتی تھی۔ جب میں نے اس کا سر دبایا تھا تو اس کے بالوں میں یہی خوشبو تھی۔ میں نے بے اختیار تکیہ منہ سے لگا لیا۔ زریں کے قدموں کی چاپ سے مجھے ہوش آیا۔ اس نے ٹرے میز پر لاکے رکھ دی اور میرے سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔ اس دوران اس نے منہ بھی دھو لیا تھا، بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی، دوپٹے سے سر ڈھک لیا تھا۔ اتنی جلدی وہ ناشتے کا سامان لے آئی تھی۔ "شروع کرو۔" اس نے مجھے گم دیکھ کے کہا۔

"ہاں تم بھی تو شروع کرو۔" میں نے جھجک کے کہا۔

اس نے پوری کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیا اور سر جھکائے کھاتی رہی۔

"میں نے کل دن بھر تمھارا انتظار کیا۔" وہ دبلے دبلے لہجے میں بولی۔

"بس کل دن بھر الجھنیں ہی رہیں۔"

"مجھے تمھاری مصروفیت کا تھوڑا بہت علم ہو گیا ہے۔" میرے ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ "گھبراؤ نہیں اب مجھے کچھ سمجھ آنے لگی ہے۔"

"تمھیں کیا معلوم ہوا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہی جو کل ہوا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کل کیا ہوا؟" میں نے جھینپ کے پوچھا۔

"معلوم ہوا کہ تم نے چاند میاں اور موجدار سے بدلہ لے لیا اور بھی بہت سی باتیں مجھے تمھارے بارے میں معلوم ہوئیں۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"بس معلوم ہو گیا۔ تم نے ناشتے سے ہاتھ کیوں اٹھا لیا؟"

"پہلے بتاؤ، یہاں کون آیا تھا؟"

"کوئی بھی نہیں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ "مجھے تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔" اس کا انداز شکایت کا ہو گیا۔

"ضرور یہاں کوئی آیا تھا۔ اور تمھیں کیا کیا باتیں معلوم ہوئیں؟"

"تبھی مجھے معلوم ہوا کہ تم نے ایک لمبی مدت جیل میں گزاری ہے۔" وہ سکون سے بولی۔ "تم پر قتل کا الزام تھا، جیل میں تم نے اعلا تعلیم حاصل کی۔"

"اور کیا کیا؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"بس ابھی اتنا ہی کچھ معلوم ہوا ہے۔"

"اور تمھیں ڈر نہیں لگا؟ تمھیں مجھ سے نفرت نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں۔" وہ شرما گئی۔

"تو مجھ پر ترس آیا ہو گا؟"

"ہاں یہ کہہ سکتے ہو۔" وہ شوخی سے بولی۔

"گویا تمھیں اس ماحول کا خوب اندازہ ہو گیا ہے۔"

"ہاں، میرے لیے یہ سب باتیں نئی ہیں جو میں نے کتابوں میں ... اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا مگر تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟" وہ رسانی ...

"کچھ نہیں، میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔"

"کیا بات؟" وہ چونک کے بولی۔

"زریں، اچھا ہوا تمھیں کسی ذریعے سے سہی اس ماحول کا اندا... تم سے اسی سلسلے میں بات کرنے والا تھا۔ نسترن کے گھر سے نکلنے ... میں راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ تمھیں ساتھ لے کے کہاں جاؤں، ہر جگہ نظر ... سوا کوئی جگہ نظر نہیں آئی مگر ظاہر ہے یہ تمھارے لیے مستقل جگہ نہیں ... عارضی پناہ گاہ ہے۔ یہاں عجیب عجیب لوگ رہتے ہیں۔ تم ایک بڑے خا... لڑکی ہو۔ کچھ دنوں بعد تمھیں اس ماحول سے خوف آنے لگے گا۔ یہاں ... بھروسا نہیں کہ وہ کب جیل میں چلا جائے یا قتل ہو جائے۔ یہاں ایک ... چاقو تانے کھڑے ہیں۔ میں جب ادھر دیکھتا ہوں اور جب تمھیں دیکھ... سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔"

"اتنے پریشان نہ ہو، میری کوشش ہو گی کہ میں اپنے آپ کو ... دوں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "اب یہی میرا خاندان، یہی میری تہذیب ..."

"پھر بھی زریں، تمھیں اپنے متعلق کچھ نہ کچھ سوچنا ضرور ہو گا ... شوخی سے گفتگو کر رہی تھی، اتنی سی دیر میں بدل گئی۔ مجھے ... لگی اور بے چینی سے اپنے دوپٹے کا گوٹا ادھیڑنے لگی۔ "زریں، تم ... ہو، بہت خوب صورت ہو، ایک اچھی لڑکی میں جو خوبیاں ہونی چاہیے... میں موجود ہیں، یہ جگہ تمھارے رہنے کی نہیں کیونکہ یہاں کے مکین خو... پسے لیے پھرتے ہیں۔"

"مجھے ان مکینوں سے کوئی غرض نہیں۔" وہ اضطراب سے بولا... اچھے ہیں، انھوں نے مجھے پناہ دی ہے اور پھر تم جو موجود ہو۔"

"میں ... میں ... میں کہاں ہوں، تم مجھے شمارت کر...

"کیوں! کیا تم مجھے راستے میں چھوڑ جاؤ گے۔ اب میرا کو... میں وہاں واپس جا سکتی ہوں، وہ لوگ مجھے پہلے ہی کون سا گھر...

"میں تمھیں کیسے بتاؤں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "مجھے خو... مجھے بہت دور جانا ہے۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"نہیں، میں تمھیں ساتھ نہیں لے جا سکتا، نہ جانے مجھے کہا... میرا کوئی یقین نہیں ہے۔ میں اگر یہاں بھی رہوں تب بھی اپنے آپ...

"آخر وہ کون سی بات ہے جو تمھیں اس قدر الجھائے ہو...

"میں تمھیں کیا بتاؤں۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"تمھارا غبار ہلکا ہو جائے گا، میں کسی سے نہیں کہوں گی، اپنے سینے میں محفوظ کر لوں گی، مجھ پر اعتبار کرو۔"

"زریں، وہ کوئی راز نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"پھر کیا ہے، تمھیں آخر کیا پریشانی ہے؟"

"کوئی پریشانی نہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "اپنے آپ پر سے اعتبار اٹھ ... لیا ہے، میں اپنی ضمانت نہیں دے سکتا، میرا دل دنیا میں نہیں لگتا۔" میں نے ... کا چہرہ دیکھنے کے لیے سر اٹھایا۔ "تم کہتی تھیں تمھاری ایک بڑی جاگیر ہے جس ... تمھارے بددیانت خالو نے قبضہ کر لیا ہے، زریں تم اپنے گھر جاکے ایک نئی زندگی ... شروع کر سکتی ہو، میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، میں تمھارے خالو کو تمھارے ... ن میں ہموار کرنے کی کوشش کروں گا، اپنا گھر پھر اپنا گھر ہوتا ہے، تم کہیں بھی ... لن سے نہ رہ سکو گی، تم میرے ساتھ چلو، اگر وہ نہ مانے تو میں تمھیں واپس لے آؤں گا۔ ... ہم کوئی اور راستہ ڈھونڈ لیں گے۔"

"میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں، کون مجھے اتنے دنوں کی گم شدگی کے بعد ... ل کرے گا، میں کس منہ سے وہاں جاؤں گی۔"

"وقت اور تمھارا رویہ ہر تلخی دور کر دے گا۔"

"نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ تیز آواز میں بولی۔ "میں اب وہاں نہیں ... سکتی، اس سے تو بہتر ہے تم میرا گلا گھونٹ دو۔"

"زریں، ایک بار انھیں اور آزمانے میں کیا حرج ہے، میں تو تمھارے ... تھ رہوں گا، ان سے بات کریں گے، وہ کیسے نہیں مانیں گے، وہ تو تمھیں ... تے ہی خوف زدہ ہو جائیں گے اور ہر حالت میں مفاہمت پر آمادہ ہوں گے، اب ... تم وہاں دب کے اور گھٹ کے رہ رہی تھیں، اب تم ذرا ہمت اور حوصلے سے ... ت کرنا، میں تمھاری خیریت پوچھتا رہوں گا، تم اپنی جاگیر کسی اور کے نام کر کے ... خالو کی دست برد سے محفوظ رہ سکتی ہو، ہزار طریقے نکل آئیں گے۔ ہمت پیدا ... زریں، میں تمھارے بھلے ہی کے لیے اصرار کر رہا ہوں۔ میں تمھارا دشمن نہیں ہوں ورنہ ... تمھیں یہاں کیوں لاتا۔ وہاں اگر تمھیں کوئی پریشانی ہو تو مجھے خط لکھ دینا، ... ل کر تار دے دینا۔ ایک نہیں کئی کئی آدمی تمھاری مدد کو آ جائیں گے۔ مگر ... بشرطیکہ تم خود بے حوصلہ ہو گی تو کوئی بھی تمھاری مدد کو نہیں آئے گا۔"

اس نے منہ پھیر لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں اسے جتنا سمجھانے کی ... ش کرتا اتنا ہی وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ میں بدحواس ہو گیا۔ سمجھ میں ... ن آیا کس طرح اسے خاموش کروں۔ اس کے قریب جانے کی ہمت بھی نہیں ... ہی تھی، جھجکتے جھجکتے اس کی کرسی کے پاس پہنچا۔ مجھے معلوم تھا آدمی کب روتا ... مسل میں کھلبلی مچتی ہے جب روتا ہے، آنکھیں جلنے لگتی ہیں جب روتا ہے۔ ... وقت مجھے خود پر بہت غصہ آیا، میں نے اسے بیٹھے بٹھائے رلا دیا۔ وہ ابھی ... شوخی سے باتیں کر رہی تھی، میں نے پہلی بار اسے اس انداز میں دیکھا تھا۔ مجھ سے ... کی شوخی دیکھی نہیں گئی، میں خوش نہیں ہوں تو شاید میرا جی چاہتا ہے دنیا کا

ہر آدمی ناخوش رہے۔ جی میں آیا کہہ دوں، تم یہیں رہو، مگر رو نہیں، میں تمھاری نگہبانی کرتا رہوں گا کیونکہ میں تمھیں نسترن کے ہاں سے لایا ہوں۔ زبان سے یہ لفظ ادا نہیں ہو سکے، میں نے اپنے آپ پر قابو پا کے اس کا سر اٹھانے کی کوشش کی، میرا ہاتھ اس کے بالوں سے مس ہوئے تو لرزنے لگے۔ "زریں۔ زریں۔" میری ڈگمگاتی ہوئی آواز ابھری۔ "زریں، میں نے تمھارے سامنے ایک تجویز رکھی ہے، تم اس پر سکون سے سوچ سکتی ہو، ہم کسی دوسری ترکیب پر بھی غور کر سکتے ہیں، تم تو ایک بہت اچھی بات پر رونے لگیں۔ مت روؤ، مت روؤ، ورنہ میں تمھیں چھوڑ کے کہیں چلا جاؤں گا۔ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔"

میری بات بے اثر نہیں ہوئی، اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا تو مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ "میں دوپہر کو آؤں گا۔" میں نے گھبراہٹ میں کہا۔ "نیچے میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔ جب میں دوپہر کو آؤں تو تم میرے لیے میٹھے چاول پکا کے رکھنا، مجھے میٹھے چاول کھائے ہوئے عرصہ ہو گیا اور میری بات پر سکون سے سوچنا۔" یہ کہتا ہوا میں وحشت میں وہاں سے بھاگ آیا، اتنی تیزی سے کہ سیڑھیوں سے پھسل گیا، گھٹنے اور کولہے میں چوٹ آ گئی مگر کپڑے جھاڑ کے اٹھ کھڑا ہوا، نیچے مچھل میرا انتظار کر رہا تھا۔

*

اندر کمرے میں، جہاں میں رات سویا تھا، محفل جمی ہوئی تھی۔ موجدار کے آدمی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، موتی مچھل کے بائیں طرف اور نصیب میاں دائیں طرف تھے، درمیان میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے مچھل پیچوان پی رہا تھا، میرے داخل ہوتے ہی شور مچ گیا، موتی نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ مچھل کے سامنے شہر کے مختلف حصوں کی سرگرمیوں کی روداد پیش کی جا رہی تھی۔ فلاں علاقے میں مندی ہے، فلاں میں تیزی ہے، ادھر پولیس کا دباؤ بڑھ گیا ہے، ادھر رسالدے کا ڈی ایس پی تبدیل ہو کے بھاگلپور چلا گیا ہے، تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کسی نے آکے اطلاع دی کہ لکشمی داس استاد سے ملنے کے لیے آیا ہے۔

موتی چونک پڑا، کانتے بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا، لکشمی داس کے نام پر سارے کمرے میں بھن بھناہٹ ہونے لگی، مچھل نے اسے دوسرے کمرے میں بٹھانے کا حکم دیا۔ "وہ پہلے ہی آ گیا۔" وہ مسکرا کے بولا۔ "آ موتی، گھوشی، نصیب میاں، کانتے آ۔" مچھل اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا اور میرا ہاتھ پکڑ کے باہر صحن سے ملحق کمرے میں آ گیا۔ یہاں ایک چوکی بچھی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر مونڈھے پڑے تھے۔ فتّے مچھل کا حقہ اس کے سامنے رکھ کے چلا گیا۔ مچھل نے مجھے اپنے ساتھ چوکی پر بٹھا لیا۔ چند ہی منٹ بعد سیٹھ لکشمی داس دو آدمیوں کے ساتھ کمرے میں نمودار ہوا۔ دونوں آدمیوں نے بڑے بڑے خوان سر پر اٹھا رکھے تھے۔ سیٹھ نے آ کے سب سے پہلے سب کو پرنام کیا۔ اس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ مچھل نے اسے مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر نرمی سے پوچھا۔ "کیا حال ہے سیٹھ؟"

"استاد، رات میں نشے میں تھا، کچھ خیال نہیں رہا۔"

"کوئی بات نہیں سیٹھ۔ رات تم اگر نشے میں نہ ہوتے اور صبح یہاں آ جاتے تو بھی ہمارے دل کے دروازے اسی طرح کھلے ہوئے ملتے۔"

"مجھے بہت دکھ ہے استاد پر وہ مجھے پسند بہت ہے۔" وہ ڈبلے لہجے میں بولا۔
"کریمن سے بات کرو ممکن ہے وہ مان جائے مگر وہ تمنچے سے نہیں مانے گی، تمنچہ اٹھانے سے پہلے یہ خیال کر لینا کہ اُس کی پہنچ دُور دُور ہے۔"
"رات کی بات جانے دو" میں نے کہہ دیا "مجھے دکھ ہے، میں نشے میں تھا۔"
سیٹھ نے تنک کے کہا: "اب اُس کا ذکر مت کرو۔"
"جانے دو۔" تجمل بے پروائی سے بولا "پر سیٹھ ایک بات سن لو زیادہ نشہ ہر چیز کا بُرا ہوتا ہے طاقت کا، دولت کا، حسن کا، شراب کا۔"
"میں سمجھتا ہوں استاد۔" سیٹھ نے نظریں جھکا کے کہا: "یہ خوان نذر کے لیے لایا ہوں اسے قبول کر لو۔"
"اس کی ضرورت نہیں سیٹھ، اسے واپس لے جاؤ، تمہارا آنا ہی بہت ہے۔"
"نہیں استاد، یہ تو تمھیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔" تجمل کے انکار پر اُس کا اصرار بڑھ گیا اور اُس نے خوان قبول کیے بغیر رخصت ہونے سے انکار کر دیا۔ تجمل نے اُسے قبول کر لیا۔ نصیب میاں نے فوراً چلنے کا اہتمام کیا۔ جب خوانوں سے سرپوش اُٹھائے گئے تو سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے تھے۔ تجمل نے خوان پوش ڈھک دیا اور سیٹھ سے اس کے کارخانے کی جگہ اور کام کے متعلق پوچھنے لگا۔ سیٹھ زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ سب سے ہاتھ ملایا۔ جب وہ میری طرف آیا تو اُس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا: "لاڈلا۔" وہ زیرِ لب مسکرا کے بولا۔ "میری خواہش ہے تم میرے ساتھ کام کرو اور اگر کبھی تمھیں میری ضرورت پڑے تو بے جھجک چلے آنا۔"
"شکریہ۔" میں نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔
"استاد کبھی آپ لوگ اُس طرف آئیں، کیوں نہ ایک مجرے کا انتظام کر لیا جائے۔"
وہ مہذب انداز میں بولا: "موتی ابھی تو آپ یہاں ہیں۔"
"ہاں۔ مگر دیکھو سیٹھ شہ پارہ نہیں گائے گی۔"
موتی کی بات پر کانتے کی ہنسی چھوٹ گئی، سیٹھ اور تجمل نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ سیٹھ کے جانے کے بعد تجمل نے دونوں خوان نصیب میاں کے حوالے کیے کہ وہ انھیں اپنے اور موجدار کے آدمیوں میں تقسیم کر دے۔ پچھلی رات کا واقعہ تھا۔ سیٹھ کی اچانک آمد میرے لیے حیرت کی بات تھی مگر تجمل کے بُشرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے سیٹھ کی آمد کا پہلے سے یقین تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے سیٹھ کی آمد سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ سیٹھ آج رات پھر شہ پارہ کے پاس جائے گا اور شہ پارہ اُس کے سامنے ناچے گی اور سیٹھ للچائی نظروں سے اسے دیکھتا رہے گا، اُس کا ہاتھ پکڑے گا۔ وہ تھک جائے گی اور کریمن روپوں کے لالچ میں اُسے سیٹھ کے حوالے کر دے گی۔ مگر مجھے یہ سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔
مجھے حسبِ وعدہ زریں کے پاس میٹھے چاول کھانے کے لیے جاتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی۔ میں سہ پہر تک نہیں گیا۔ پھر زریں نے مجھے ماما کے ہاتھ خود ہی بلوا لیا۔ اُس نے مجھ سے اور میں نے اُس سے کوئی اور بات نہیں کی، چاول کیسے ہیں، اچھے ہیں، بس رسمی بات ہوئی۔ اُس نے بہت لذیذ چاول پکائے تھے، مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔ اسکول سے واپسی پر امی بطورِ خاص میرے لیے میٹھے چاول چھپا کے رکھتیں کہ انھیں کوئی اور نہ کھا جائے۔ رات کو تجمل پھر مجھے اپنے ساتھ لے کے گھومنے نکل گیا۔ نئے پرانے لوگوں سے بھینٹ ہوئی۔ تجمل کی بیکسی کی ٹیکیاں تھیں، وہ کئی ہوٹلوں، جوئے خانوں اور شراب کے اڈوں پر گیا، ہر جگہ گزشتہ رات والی تناتنی کا مظاہرہ کیا۔ ایک بڑے علاقے کا چکر کاٹ کے آدھی رات کو اڈے پر واپس آیا۔ میں موقع کا منتظر تھا۔ رات گہری ہو گئی تو میں نے اُس کے کمرے میں جا کے زریں کا ذکر کیا کہ وہ مجھے کہاں سے آئی ہے۔ میں نے اسے زریں کے متعلق ساری بات بتا دی۔ اصرار کیا کہ زریں کی بہتری اسی میں ہے کہ اُسے اُس کے گھر فیض آباد۔ اُس نے میری باتیں درمیان میں کوئی دخل دیے بغیر اطمینان سے سنیں۔
"اُس کی منشا کیا ہے؟" اُس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔
"اُس کی منشا نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔
"پھر تو اُسے اس جہنم میں دوبارہ کیوں رسید کرنا چاہتا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اُس لڑکی کو بیٹی کہا ہے۔ وہ کیا کہے، بیٹی بنایا۔ بنا کے چھوڑ دیا۔ جا سوچا تو تو کبھی کبھی بالکل بچہ بن جاتا ہے۔"
میں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی اور جن باتوں سے زریں کو ... تھا وہ اُس کے سامنے دُہرا دیں۔
"میں نے تو کچھ اور سوچا تھا، لاڈلے زریں بہت ہی خوب ... بہت بھولی بھالی۔ تو کیا کٹھور بن گیا ہے۔"
"تم میری باتوں پر دھیان ہی نہیں دیتے، اُس کی ایک بڑی ... میں ہے، وہ اُسے مل جائے تو وہ اطمینان سے رہ سکتی ہے۔"
"وہ لڑکی ہے اور جوان ہے لاڈلے، لڑکی کے لیے جاگیر ... بے کار ہوتی ہے جب تک کوئی اُسے سنبھالنے والا نہ ہو، نہیں نہیں ——— ہے وہ جھنجلا گیا اور ناراض ہو کے کہنے لگا: "لاڈلے ... چار دیواری سے تبھی باہر نکل سکتی ہے جب خود اُس کی منشا ہو، ... اجازت نہیں دوں گا۔"
اس کے بعد تجمل سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ میں خفا ہو کے اپنے ... آیا۔ میں نے دوسرے دن اُس سے بات بھی کم کی، دوسرے دن رات گھمانے لے گیا، میں بے دلی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ دوسرے دن ... پاس بھی گیا اور چند لمحے بیٹھ کے واپس آ گیا۔ ہر راستہ بند تھا۔ دو ... گزر گئے۔ اس دوران میں تجمل نے شاید موجدار کے اڈے کا کچھ نہ کچھ بند ... کیونکہ تجمل کے انداز میں اب اُتنا اکھڑ پن نہیں رہا تھا۔ شاید موجدار ... مرضی کے مطابق دب گیا تھا۔ گھوشی کو مستقل طور پر موجدار کے اڈے ... گیا تھا۔ ساتھ میں تجمل کے آدمی بھی تھے۔ جیل میں میں نے اُن لوگوں ... سُنا تھا وہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔ دن بھر یہاں لوگوں کی بھیڑ ... جو تجمل کے ساتھ رہتے تھے، اڈے سے نکل جاتے۔ پھر وہ لوگ آتے ... بیٹھتے، کوئی سلام کرنے آتا، کوئی اُس کے جیب کترا دیتا، کوئی صرف کانتے سے بات کرتا۔ کسی کا تعلق صرف شولی سے تھا، کوئی فتدے کے پاس آ کے روپے جمع کرا دیتا۔ یہ سب مال اکٹھا کر کے نصیب میاں کے حوالے کر دیا جاتا جو ایک بڑے سے سرخ رجسٹر میں اُس کا اندراج کرتے۔ زبانی بات زبانی ہوتی تھی۔ تجمل میٹھا بیجوان پیتا رہتا، یا غصہ ہوتا یا خوش ہوتا، گالیاں دیتا یا آنے والے لوگوں سے اُن کی خیریت دریافت کرتا۔ میں نے محسوس کیا، جب میں سامنے آتا ہوں تو موضوع کچھ بدل سا جاتا ہے، روپے پیسے رہ جاتے ہیں۔ پھر تجمل مجھے ساتھ لے کے دوسرے کمرے میں چلا آتا ہے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے دس دن سے زیادہ گزر چکے تھے۔ میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ تو کمرے میں تنہا خاموش بیٹھا رہوں یا اُن لوگوں کی باتیں سنتا رہوں۔ موتی اسنسول واپس چلا گیا تھا۔ جب طبیعت بہت گھبراتی تو میں زریں کے پاس چلا جاتا۔ لیکن وہاں کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ اُسے دیکھ کے مجھے کرارا یاد آنے لگتی اور میں گھبرا کے پھر نیچے آ جاتا اور پھر اُس کے پاس چلا جاتا۔ زریں کے لمبے بال اور بڑی بڑی آنکھیں مجھے بہت بھلی لگتی تھیں۔ اب وہ عموماً سوچی ہوئی رہتی تھیں۔ جب میں واپس نیچے آتا تو خود کو ملامت کرتا کہ اُس کے سامنے مجھ سے بات کیوں نہیں کی جاتی۔ جو سوچ کے جاتا ہوں وہ بھول کیوں جاتا ہوں اور یاد آتا ہے تو دہرانے کی ہمت کیوں نہیں پڑتی۔ سو ایک دن میں ارادہ کر کے گیا کہ آج اُس سے ضرور بات کروں گا۔ اُس نے حسبِ معمول مجھے چائے پیش کی اور میرے سامنے خاموش بیٹھ گئی۔ میں نے لب کھولنے کی جرأت کی جیسے آج میں پہلی بار اُس سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ میں نے آہستہ سے کہا: "زریں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"
"کیا۔ کیا بات ہے؟" وہ سٹپٹا گئی: "طبیعت تو خراب نہیں ہے؟"
"زریں۔" میں نے اضطراب سے کہا: "میں مر جاؤں گا۔"
"نہیں۔" وہ سراسیمگی سے مجھے دیکھنے لگی: "آخر تمھیں کیا غم ہے۔"
"میرا غم یہ ہے کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ کاش یہ ایک گاؤں یا ایک شہر کے برابر ہوتی۔"
"تو پھر کیا ہوتا؟" وہ معصومیت سے بولی۔
"پھر شاید مجھے قرار آ جاتا۔"
"مجھے بتاؤ تمھیں کس طرح قرار آ سکتا ہے؟" وہ بے چینی سے بولی: "میں تمھارے کسی کام آ سکتی ہوں۔ میں تمھارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟"
"کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔
"ماں اس پریشانی میں تمھیں میری پریشانی بھی لاحق ہو گئی۔"
"ہاں۔ تم میری بات مان لیتیں تو اچھا ہوتا۔ اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ میں تمھیں بار سمجھتا ہوں، میں تم سے پیچھا چھڑا رہا ہوں۔ میں نے اپنی، تمھاری اور اس جگہ کی تمام باتیں ذہن میں رکھ کے یہ تجویز پیش کی تھی۔ میں تم سے رشتہ نہیں توڑ رہا تھا۔"
"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔
"کیا۔ کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"
"یہی کہ تم جہاں کہتے ہو میں وہاں چلی جاؤں گی، چاہے بعد کو کچھ ہو، میں تمھیں اور پریشان نہیں کروں گی۔ تم مجھے جہاں چاہے پہنچا سکتے ہو۔ میں تمھارے اختیار میں ہوں۔"
"زریں زریں۔" میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا: "میں تمھیں تمھارے گھر پہنچانا چاہتا ہوں، تمھارا گھر۔ تمھاری ماں اور باپ کا گھر۔"
"تم چاہے جہاں پہنچا دو، میں تیار ہوں۔"
"زریں! میں تمھیں وہاں مرنے کے لیے چھوڑ کے نہیں آؤں گا۔ میں تمھارے لیے لڑوں گا، تمھیں اپنے گھر میں عزت سے بٹھا کے آؤں گا اور ہو سکا تو تمھارے پاس کوئی آدمی چھوڑ کے آؤں گا۔ میں تجمل سے کہہ کے ماما اور اُس کی لڑکی بھی تمھارے ہمراہ کر سکتا ہوں۔ تجمل کے دوست دُور دُور شہروں میں موجود ہیں، لیکن فیض آباد میں بھی کوئی ہو۔ نہیں ہوا، تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک بار وہاں جا کے صورتِ حال تو دیکھنی چاہیے۔"
"ٹھیک ہے تم جو چاہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اُس نے بمشکل اتنا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے کچھ دیر اُس کی واپسی کا انتظار کیا، پھر کچھ سوچ کے نیچے اُتر آیا۔

مجھے تجمل کو آمادہ کرنے میں تین چار دن لگ گئے۔ اس کے باوجود اس نے خود میرے ساتھ اوپر جا کے زریں سے بات کی۔ زریں نے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ تجمل نے اُس سے کہا کہ فیض آباد میں اگر وہ کسی قسم کی پریشانی سے دوچار ہو تو اُسے فوراً مطلع کر دے۔ تجمل نے اُس سے یہاں تک پوچھا کہ کہیں اُس نے میرے دباؤ میں آ کے تو یہ فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ فیصلہ اُس نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ تجمل اسے سمجھاتا رہا۔ زریں نے اپنے فیصلے میں تبدیلی نہیں کی۔ "تم جب چاہو یہاں آ سکتی ہو، اس کے لیے لاڈلے کی سفارش کی ضرورت نہیں۔ تم میری بیٹی ہو۔" یہ کہتے ہوئے تجمل کی آواز جھرجھرانے لگی اور اُسے نہ جانے کیا ہوا۔ وہ مجھے زریں کے پاس چھوڑ کے تیزی سے نیچے اُتر گیا۔
فیض آباد میں تجمل کا کوئی دوست نہیں تھا لیکن لکھنؤ میں موتی جیسا ایک دوست کتن خاں موجود تھا۔ لکھنؤ اور فیض آباد کا فاصلہ بہت کم ہے۔ تجمل نے نصیب میاں سے کتن خاں کے نام ایک مختصر خط لکھوایا کہ وہ فیض آباد جا کے اُس کی بھیجی ہوئی لڑکی کی جاگیر واپس دلانے کے لیے ضروری قدم اُٹھائے۔ ایسا ہی ایک خط اُس نے میرے حوالے کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجمل مجھے تنہا روانہ نہیں کرے گا۔ اُس نے فتدے، شولی اور سارنے کو میری ہمراہی کے لیے منتخب کیا۔ فتدے کو حکم دیا گیا کہ اگر زریں ضروری سمجھے تو وہ وہاں کچھ دنوں تک قیام کر سکتا ہے۔ تین دن کے اندر اندر زریں کے بیس جوڑے بنوائے گئے اور کئی زیور۔ تجمل نے اُسے کچھ نقدی بھی دی۔ رات کے وقت گہرے اندھیرے میں جب سارا محلہ سویا ہوا تھا۔ تجمل نے زریں کے سر پر ہاتھ رکھ کے اُسے رخصت کیا۔ ماما پچھلے دروازے سے زریں کو لے کے نیچے اتری اور ٹیکسی میں

بیٹھ گئی۔ احتیاطاً یہ رازداری کی گئی تھی۔ اسٹیشن پر ہمیں دیر تک گاڑی کا انتظار کرنا پڑا۔ زرّیں کو فرسٹ کلاس کے ایک ڈبّے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ فرسٹ کلاس میں آئی تھی، فرسٹ کلاس میں واپس جا رہی تھی۔ ہم سب اُس کے برابر کے ڈبّے میں بیٹھ گئے۔ دوسرے دن شام کو گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی۔ بطویل قامت، گرانڈیل، سُرخ و سپید کبن خاں اپنے ساتھیوں سمیت اسٹیشن پر موجود تھا۔ اُس نے ہم سب کو گلے لگایا جیسے ہماری پرانی جان پہچان ہو۔ کبن خاں کا اصرار تھا کہ ہم ایک رات لکھنؤ ہی میں گزاریں مگر ہم اُسی رات فیض آباد روانہ ہو گئے۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر جامو ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں ایک بڑے مکان میں ٹھیرا دیا گیا۔ میں نے سفر میں دانستہ زرّیں کے پاس بار بار جانے سے گریز کیا تھا۔ اب بھی میں اُس سے دُور دُور رہا۔ صبح تک ہم ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہے۔ میں نے کبن خاں اور جامو کو زرّیں کی ساری کہانی سُنائی۔ انھوں نے اُس کے خالو کو کسی قسم کی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ صلاح ٹھیری کہ اُس سے کوئی مفاہمت نہ کی جائے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ہم پندرہ آدمی، کبن خاں، جامو، اُن کے ساتھی اور ہم چار زرّیں کی وسیع و عریض حویلی میں پہنچے تو اُس کا خالو ہمیں دیکھ کے بوکھلا گیا۔ اُس سے کوئی بات ہی نہیں کی گئی۔ اُسے یہ یقین دلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ہم کس مقصد سے آتے ہیں۔ جامو نے اُسے حکم دیا کہ وہ شام تک حویلی خالی کر دے اور حویلی کے علاوہ دوسری تمام جائداد اور زمینوں کی دستاویزیں بھی زرّیں کے حوالے کر دے۔ اس سلسلے میں کوئی چھل، فریب یا کوئی قانونی اُلجھن ڈالی گئی تو انجام تباہ کن ہوگا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، اُس سے کہیں زیادہ آسانی سے بات نمٹ گئی۔ وہ ہم سے اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اُس نے زرّیں کے قدموں پر سر رکھ کے معافی مانگنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس کی ساری منّتیں، خوشامدیں ضائع ہو گئیں، چار آدمی وہاں تعینات کر کے باقی واپس آ گئے۔ حویلی میں سامان کا بیشتر حصّہ زرّیں کی ملکیت تھا۔ جامو نے ایک وکیل بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اُس نے ضروری کاغذات تیار کیے۔ شام کو میں زرّیں کو ساتھ لے کے اُس کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ لرز رہی تھی اور مجھے اُسے سنبھالنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اپنے آدمی پھیلا کے جامو نے اس بات کا بھی انتظام کر دیا کہ محلّے والے کوئی رخنہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کر سکیں۔ جامو کے وکیل نے کاغذات کا معائنہ کرنے کے بعد زرّیں کے خالو اور اُس کے خاندان کو حویلی سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔ زرّیں کو اپنی خالہ اور بہن بھائیوں سے نہیں ملنے دیا گیا۔ اُن کا سامان جامو کے آدمیوں کی نگرانی میں دن بھر ڈھلتا رہا۔

شام تک حویلی پر زرّیں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اپنے مکان میں دوبارہ آ کے اُس کی عجیب حالت ہو گئی تھی، جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے چیزیں دیکھتی تھی، پوری حویلی میں دوڑتی پھرتی تھی۔ حویلی کے آبائی مُلازم دربدر تھے۔ وہ زرّیں کی واپسی پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ زرّیں ملازماؤں سے گلے مل کے روتی تھی اور ایک ایک چیز آنکھوں سے لگاتی تھی۔ اُس نے مجھے پوری حویلی کی سیر کرائی۔ اپنی امّی اور ابّا کی قدِآدم تصویریں دکھائیں۔ بیٹھک کھول دی گئی۔ کبن خاں، جامو اور اُن کے ساتھی وہاں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رات کے کھانے کا انتظام جامو نے کیا تھا۔ حویلی ہی میں کھانا آ گیا تھا۔ حویلی میں کھانے کا فوری انتظام ممکن نہیں تھا۔ یہ سب کچھ ایک دن میں ہو گیا۔ مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا۔ کلکتے سے آتے ہوئے میرا دل بہت پریشان رہا تھا۔ نہ معلوم فیض آباد میں کیا پیش آئیں۔

کھانے کے بعد جامو نے ہم سب کو گانا سُننے کی دعوت دی۔ میں نے تھکن کی وجہ سے انکار کیا مگر وہ نہیں مانا۔ حویلی کے اندر اور باہر جامو کے آدمی موجود تھے اس لیے کسی خطرے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے زرّیں سے اجازت لے لی کہ میں ساتھ کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں، شاید رات کو دیر ہو جائے۔

فیض آباد کا بازار مختصر تھا مگر یہاں کلکتے سے زیادہ نفاست نظر آتی تھی۔ کلکتے کی طرح تو نہیں مگر جامو کی عزت بھی فیض آباد میں کچھ کم نہیں تھی۔ وہ ڈول ڈول مرتی جیسا تھا۔ بہت منہ پھٹ تھا، بات بات پر گالی بکتا تھا۔ میں ایک خاص جگہ لے جا رہا ہوں۔ میں نے پہلے ہی وہاں کہلوا بھیجا تھا کہ آج بعد کسی وقت میں اپنے مہمانوں کے ساتھ آؤں گا۔ وہاں ایک چیز دیکھنے کی ہے۔ زیادہ بات نہیں کرتی، کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ اُس کی یہی ادا اپنا خانہ خراب کر دیتی ہے۔ گاتی کیا ہے، دل پر چھریاں چلاتی ہے۔ راستے بھر جامو اُس کی تعریف کرتا رہا۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کے اُوپر پہنچے، دروازہ بند تھا اور اندر سے کسی کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ میرا دل بے تاب ہو گیا۔ جامو سچ کہتا تھا۔ اُس کی آواز میں جادو تھا۔ جامو کی ایک ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک پختہ عمر عورت نے بڑے ادب کے انداز سے ہمارا استقبال کیا۔ اُس لڑکی نے ہماری آمد کی وجہ سے گانا بند کر دیا تھا۔ سر جُھکائے اپنے ناخن کُرید رہی تھی۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو جامو نے کہا: "نیلم جان، بس آج جادو جگا دو، مہمان دل پھینک کے جائیں تو بات ہے۔" آواز پر اُس نے سر اُٹھایا اور زیرِلب مسکرا کے دیکھا۔ جیسے ہی اُس نے سر اُٹھایا، آنکھیں دُھندلا گئیں، دل کی دھڑکن مفقود ہو گئی، سینہ کسی نے چاقو سے چیر دیا۔ کمرے میں سنّاٹا چھا گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے یہ دُھند ہٹانے کی کوشش کی۔ نیلم جان نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اُس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ بجلی کی سی تیزی سے اُٹھی، اُس نے جھروکے سے چھلانگ لگا دی۔

میں چیختا اور چلّاتا ہوا ایک ہی جست میں سیڑھیاں عبور کر گیا۔ میری بہن فہمیدہ سڑک پر بے حال پڑی تھی، خون سے اُس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے اپنے سینے میں دبوچ لیا۔ گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔

پہلے تو مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ دل کسی نے مٹھی میں بند کر لیا تھا۔ پھر جب خون میں نہائی ہوئی فہمیدہ میرے سینے سے لگی تو میرا رہا سہا ہوش بھی رخصت ہو گیا۔ فہمیدہ کی سانس اُکھڑ گئی تھی اور اُس کی ہر کراہ میرا کلیجا کاٹ رہی تھی۔ جب گلی میں چیخ پکار خروج ہوئی اور کسی نے میرے بال پکڑ کے زور زور سے میرا سر جھٹکا تب کہیں مجھے اِردگرد کا ہوش آیا۔ میں نے دہشت سے اپنے بازوؤں میں جکڑی ہوئی فہمیدہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے کیا۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور خون ہونٹوں سے نکل کے گردن پر اُتر رہا تھا۔ میں نے اُس کا لہولہان چہرہ آستین سے صاف کیا۔ اُس کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ "ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ، دُور ہٹو۔" جب اُس نے نظریں پھرا کے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا تو میں نے چیخ کر کہا۔ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے، میری چیخوں کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شرلی اور قدرے نے چاقو نکال لیے اور تماش بینوں کی طرف دوڑ پڑے۔ چند لمحوں میں جامو، کبن اور سارے کے سوا سب مجھ سے دُور ہو گئے۔ میں نے انھیں گھور کے دیکھا تو وہ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے فہمیدہ کا چہرہ اپنے دامن سے چھپا لیا تھا لیکن اس طرح وہ میری نظروں سے چھپ گیا۔ مجھے شُبہ ہوا کہ وہ فہمیدہ نہیں کوئی اور لڑکی ہے۔ اپنے شُبہے کی تصدیق کے لیے میں نے پھر دامن کھینچ لیا۔ وہ فہمیدہ ہی تھی، میری بہن فہمیدہ ہی تھی، میری بہن، میری فتی، میری بھنتو۔ وہی اُس کی کمان کی طرح کھنچی ہوئی آنکھیں تھیں، وہی اُس کے منہ میں دائیں جانب اُبھرا ہوا دانت۔ وہ فہمیدہ ہی تھی۔ "تم کہاں ہو فتی؟" میری آواز پر لرزہ طاری تھا اور میں اپنا سر اُس کے سینے پر پٹخ رہا تھا۔ "مجھے بتاؤ فتی! تمھیں کون یہاں لایا؟" میری بلکتی ہوئی آواز سے اُس کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہوا، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مسکرا کے رہ گئی اور اُس کی گردن میرے شانے پر ڈھلکنے لگی۔ "نہیں فتی! نہیں۔ تم مجھے بتاؤ۔ بتاؤ تم کیسے آئیں اور وہ سب کہاں ہیں؟" میں نے اُس کا چہرہ تھام کے کہا۔

"بابر! بابر!" بہ مشکل تمام اُس کے منہ سے میرا نام نکلا۔

"بولو فتی! بولو۔ میں بابر ہوں، تمھارا کمینہ بھائی، تمھارا ذلیل بھائی۔ میرے منہ پر تھوک دو۔" میں نے اُس کے ماتھے کے خون سے اپنی تھوتھنی رگڑتے ہوئے کہا۔

اُس کی مُردہ آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے روشنی اُبھری اور معدوم ہو گئی۔ "بابر!" اُس نے سسکتے ہوئے پھر میرا نام لینے کی کوشش کی۔ "تم۔ تم۔"

"ہاں میں۔ میں۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"تم۔ تم۔" اُس نے ایک گہری سانس لی اور اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے چیخ چیخ کر اُسے آوازیں دیں، اُسے جھنجوڑا۔ صرف ایک بار اُس نے آنکھیں کھولیں، میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور میری گود میں لڑھک گئی۔ اس کے بعد وہ نہیں بولی اور نہ اُس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ وہ مر گئی اور میں اُس کا لاشہ لیے اُسے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے شعبدے بازی کرتا رہا، اُسے گلی میں نچاتا رہا۔ پھر سارے نے آ کے مجھے پکڑا۔ کبن خاں نے میری بہن کو مجھ سے جُدا کرنے کے لیے اُس کے جسم پر ہاتھ لگایا تو میں نے اُس کے پیٹ میں لات مار دی۔ پھر جامو اور بہت سے لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ پولیس آ گئی اور اُن سب نے فہمیدہ کو مجھ سے چھیننے کی خاطر مجھ پر حملہ کر کے مجھے بے قابو کر دیا۔ فہمیدہ کے جسم پر چادر ڈال دی گئی۔ میں اُس کے پاس جانے کے لیے پچھاڑیں کھا رہا تھا مگر وہ لوگ مجھے کھینچتے ہوئے ہجوم سے باہر لے آئے۔ سارے نے بے تحاشا میرے گالوں پر طمانچے مارنے شروع کر دیے۔

"لاڈلے! ہوش میں آ لاڈلے! ہوش میں آ لاڈلے! کیوں اپنا تماشا بنا رہا ہے۔ بتا وہ تیری کون تھی؟"

"وہ فتی تھی۔" میں اپنے بال نوچتا ہوا اُس کے جسم پر گر گیا اور میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ سارے نے مجھے گلے سے لگایا اور میں نے اُس کے کپڑے بھگو دیے۔ میرا ایک بازو کبن خاں نے اپنے کندھے پر ڈالا، دوسرا سارے نے اپنے کندھے پر۔ وہ مجھے ایک چبوترے پر لے آئے۔ "کبن! تم اسے سنبھالو۔ میں پولیس سے نمٹ کے آتا ہوں۔" جامو نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ اُسے لے جا رہے ہیں۔"

"کہاں لے جا رہے ہیں؟" میں نے بڑبڑا کے کہا۔

"بیٹھو لاڈلے! ہمّت رکھو۔" کبن خاں مجھے چمٹاتے ہوئے بولا۔

"لاڈلے! تجھے اپنی ماں کی قسم، خاموش ہو جا، لوگ کیا کہیں گے، اتنا بڑا آدمی رو رہا ہے۔" سارے نے میری کمر سہلاتے ہوئے کہا۔

"سارے! اب مجھے اُس کے پاس جانے دو۔" میں نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔

"وہ کہیں نہیں جائے گی، ہمارے ہوتے ہوئے وہ کہیں جا سکتی ہے؟" کبن خاں نے بلند آواز میں کہا۔ "پولیس کو اپنی کارروائی کر لینے دے۔"

"پولیس؟" میں نے اپنا چہرہ چھپا کے کہا۔ "پولیس کیا کرے گی؟"

"پولیس خانہ پُری تو ضرور کرے گی لاڈلے! ذرا سی دیر صبر کر لے۔" سارے آہستگی سے بولا۔ "دیکھ کتنے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ ذرا خیال کر یہ کون سی جگہ ہے۔"

گلی میں ہر طرف سَر ہی سَر نظر آ رہے تھے، پولیس والے چیخ چیخ کر مجمع منتشر کر رہے تھے، سیٹیاں بج رہی تھیں اور ہر طرف شور ہو رہا تھا۔ جس چبوترے پر میں بیٹھا ہوا تھا، وہاں بھی لوگ آ گئے اور انگلیوں سے میری جانب اشارہ کرنے لگے۔ کبن خاں اور سارے نے انھیں ڈانٹ کر بھگانا چاہا۔ وہ میرے کانوں میں سیسہ اُنڈیل رہے تھے۔ ہر طرف نیلم جان نیلم جان کی آوازیں تھیں۔ نیلم جان اس جگہ بہت مقبول معلوم ہوتی تھی۔ نیلم جان اپنے گھر میں بھی اتنی ہی مقبول تھی، محلّے کی لڑکیاں ہر وقت اُسے گھیرے رکھتی تھیں۔ وہ ہر وقت مسکراتی اور شرماتی رہتی تھی۔ تیز تیز باتیں کرتی تھی، اُس کی میٹھی آواز سے سبھی مانوس تھے۔ یہاں بھی اُس کی آواز کا چرچا تھا جس کے جو منہ میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کے سارے نے مجھے کبن خاں کے حوالے کر کے اپنا چاقو لہراتا ہوا اُن کی جانب جھپٹا اور غرّانے لگا۔

"کبن خاں! سارے کو روکو۔ ان سب کو میرا چہرہ دیکھنے دو۔" میں نے

دھاڑیں مارتے ہوئے کہا۔ کبن خاں ان کے ہاتھوں میں پتھر تھے، وہ اپنی نیلم جان کا بدلہ مجھ سے لیں گے۔ میں نے نیلم جان کو مار دیا ہے۔ میں نے نیلم جان کو مار دیا ہے۔" میں نے چلا چلا کے کہا۔ "میں نیلم جان کا قاتل ہوں۔"
میں نے کبن خاں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوئے صدا لگائی اور مجمع کی جانب بھاگنے لگا۔ سارنگے نے درمیان میں مجھے دھکا دے دیا اور میرا ماتھا فرش کی اینٹوں سے ٹکرا گیا۔ کبن خاں نے دوڑ کے پھر مجھے پکڑ لیا۔ اچانک ایک طرف سے ہجوم کا ریلا امڈتا ہوا آیا۔ کبن خاں مجھے لیے ہوئے زمین پر لیٹ گیا۔ جس جھروکے سے فہمیدہ نے چھلانگ لگائی تھی، اُس میں آگ لگ گئی تھی اور لوگ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے۔ کبن خاں مجھے سمیٹے ہوئے زمین پر پڑا رہا۔ اس تنگ جگہ پہ ان گنت آدمی اُس کا جسم روندتے ہوئے گزر گئے۔ اکیلا سارنگے چیخ چیخ کر انھیں میری طرف بڑھنے سے روکتا رہا لیکن کبن خاں اندھا دھند بھاگتے ہوئے لوگوں کی ٹانگوں اور ٹھوکروں سے خود توازن کھو بیٹھا اور مجھے اُس کی گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ فہمیدہ کی لاش ہٹائی جا چکی تھی اور جہاں وہ گری تھی، وہاں سپاہی دائرہ بنائے ہوئے کھڑے تھے۔ فہمیدہ کا خون فرش پہ جم گیا تھا۔ میں اتنی تیزی سے آیا تھا کہ سپاہی دیکھتے رہ گئے۔ میں نے اُن کے دائرے میں داخل ہو کے فہمیدہ کا خون فرش سے کھسوٹ کے اپنے چہرے پہ مل لیا۔ سپاہیوں نے میرے جسم پہ لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ مجھے خبر نہیں پھر کیا ہوا۔ میں وہاں اس جلتے ہوئے مکان میں داخل ہونا چاہتا تھا کہ میرے سر پہ کسی سپاہی نے لاٹھی مار دی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا گھس آیا اور کانوں پہ سناٹا چھا گیا۔ میں وہیں لڑکھڑا کے گر گیا۔

*

جب میری آنکھ کھلی تو سارا منظر بدل گیا تھا۔ میں ایک پلنگ پہ دراز تھا اور میرے اطراف سفید دیواریں کھڑی تھیں۔ میں نے ہڑبڑا کے اُٹھنا چاہا تو دماغ میں دھماکا سا ہوا اور میری یہ خوشی کہ میں ایک بھیانک خواب سے دوچار تھا، ایک ثانیے میں چکنا چور ہو گئی۔ میرے سر پہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور جسم اتنا بوجھل تھا کہ مجھ سے اُٹھا یا نہ جا سکا۔ زریں میرے پاس بیٹھی تھی اور سامنے کی دیوار سے کمر ٹکائے سارنگے کھڑا تھا۔ میں نے وحشت سے اُن دونوں کو دیکھا۔ وہ دونوں آنسو بہا رہے تھے۔ "سب ٹھیک ہے لاڈلے!" مجھے اُٹھتا دیکھ کے سارنگے میرے قریب آ کے بولا۔
"وہ کہاں ہے؟ فہمی کہاں ہے؟" میں اپنی تمام طاقت سمیٹ کے بستر پر بیٹھ گیا اور میں نے سارنگے کا گریبان پکڑ کے پوچھا۔ "اُسے کہاں چھوڑ آئے؟"
"وہ یہیں ہے۔ پولیس نے اُسے ہمارے حوالے کر دیا ہے۔" سارنگے نے دردیلے لہجے میں کہا۔ "تیرا انتظار تھا، پر تو اب کیسے اُٹھے گا، تیرے تو بہت چوٹیں آئی ہیں۔"
"مجھے کیا ہوا ہے، میں ہر حال میں زندہ رہوں گا سارنگے! مجھے موت نہیں آئے گی۔"
میں نے پلنگ سے جست لگانے کی کوشش کی تو زریں نے میرا شانہ پکڑ لیا۔ "تم نہیں جاؤ گے، میں تمھیں اُس کی صورت دکھا دیتی ہوں۔" روتے ہوئے بولی۔ "تمھاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔"
"اپنے آپ کو قابو میں رکھ لاڈلے! جو قسمت کو منظور تھا۔ اس قابل نہیں ہے کہ باہر جا سکے۔ ہم نے تمام انتظام کر دیا ہے۔ دیکھ کے اُسے ہمارے سپرد کر دے۔" سارنگے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اپنا خیال نہیں ہے تو اُسی کا خیال کر۔"
"مجھے بھی مار ڈالو سارنگے! میں اب اُس کے ساتھ ہی رہوں گا۔" میں نے اُس کی گود میں گرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی اُس کے ساتھ ہی دفن کر دو۔"
"لاڈلے!" سارنگے نے تلخی سے کہا۔ "تجھے کیا ہو گیا ہے، تو تو بڑے جی کا آدمی ہے۔ اُستاد تو تیرے جی پہ ہی مرتا ہے۔ کیا تو اُسی طرح... وہ حرام زادی موقع پا کے فرار ہو گئی ہے۔ فدے نے اُسے بہت تلاش کیا، کہیں نہ ملی تو مکان میں آگ لگا دی۔ چل اُٹھ، برابر کے کمرے میں... بدل کر نکلے! ایک دن تو اُسے گھر سے جانا ہی تھا۔" میرا سینہ پھٹنے لگا... نکلے۔ میرے بائیں جانب کھڑی تھی، وہ اپنا چہرہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کے رو... جی! بہن جی!" سارنگے نے اضطراب سے کہا۔ "تم بھی اسے رلانے لگیں... کمرے میں لے چلو۔ اپنا لاڈلا شیر کا بچہ ہے۔ شیر کی طرح آنکھوں میں... کے دنیا کا مقابلہ کرے گا۔"
زریں کو اپنے دوپٹے کا بھی خیال نہیں رہا۔ اُس نے لپکے تابی... دے کے اُٹھایا۔ میں نے اُس پہ اپنا بوجھ نہیں لدنے دیا۔ پھر بھی زرا... ہاتھ تھامے رکھے۔ میں اپنے پیروں سے چلا۔ زریں میرے پہلو سے لگی... اور اپنی لبالب آنکھیں اُٹھا کے بار بار میرا چہرہ دیکھتی تھی۔ دوسرے کمرے... مسہری پر کفن میں لپٹی ہوئی فہمیدہ کا جنازہ رکھا تھا۔ اُس کے اردگرد خو... قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی ملازمہ نے سارنگے کے اشا... کے چہرے سے کفن ہٹایا۔ اُس کے چہرے پہ نور چھلک رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہو، جیسے اُس کے ذہن پر کوئی بوجھ... ابھی گھر کی طرح چہچہاتی ہوئی اُٹھے گی اور باورچی خانے میں جلدی پہلے ناشتہ تیار کرے گی، پھر ابا کے کمرے میں بھاگی بھاگی جا کے پیالی چائے دے گی اور پوچھے گی کہ ابا! آج کیا پکایا جائے؟ پھر باہیں ڈال کے کہے گی "ابا! آج میں آپ کے لیے فیرنی پکاؤں... مجھے جیوتی بیٹے سے چاندی کے ورق منگوا دیجیے۔" میری بھتو کو... پسند تھا۔ کفن میں وہ کیسی مقدس لگ رہی تھی جیسے آسمان سے اُتری پری ہو۔ اُس کے بال شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس... اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں اور اُس کی نظریں میرے جسم میں پیوست... رہی ہوں۔ میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ سارنگے نے آ کے میرے کا... کی۔ "لاڈلے! اب چل۔"
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں فہمیدہ کے پائنتی اسی...

...ہا۔ بوڑھی عورت نے اُس کا چہرہ کفن سے ڈھانپنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ میں نے فہمیدہ کے بال چومے، اُس کی پیشانی اور اُس کی آنکھیں چومیں۔ میرا دل کھنچا جا رہا تھا۔ میں اُس کے سرہانے بیٹھا ہوا اپنے آنسوؤں سے اُس کا چہرہ میلا کرتا رہا۔ پھر زریں نے مجھے اُس کے پاس سے اُٹھایا اور سارنگے مجھے میرے کمرے میں لے جانے لگا۔ میں نے انکار کر دیا اور اُس کمرے میں چلا آیا جہاں دبی دبی سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ میرے پہنچتے ہی وہاں خاموشی چھا گئی۔ فدے، شولی اور کبن خاں نے مجھے درمیان میں بٹھا دیا جہاں ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں اب آنسو بھی نہیں رہے تھے کہ میں اُن کا ساتھ دے سکتا۔ میں گردن جھکا کے بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب نے جھجکتے جھجکتے مجھ سے فہمیدہ کا جنازہ اُٹھانے کی اجازت چاہی۔ جامو اور سارنگے نے اصرار کیا کہ میں حویلی ہی میں ٹھیر جاؤں، وہ فہمیدہ کو دفنا کے آ جائیں گے لیکن میں نے اُن کی بات نہیں مانی۔ میں سارے راستے فہمیدہ کی ڈولی کو کندھا دیتا ہوا قبرستان تک لے گیا۔ کسی نے کندھا دینے کی کوشش کی تو میں نے اُسے اپنی جگہ نہیں لینے دی۔ قبرستان حویلی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے اپنی بہن کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا۔ اُس کی قبر پھولوں سے ڈھانپ دی گئی۔ میں نہ رویا، نہ میں نے کوئی آہ بلند کی۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ مجھے اُس کی قبر سے اُٹھا کے حویلی میں لے آئے اور کب انھوں نے مجھے بستر پہ لٹا دیا۔ مجھے جب مہر بہ لب زریں اپنے سامنے نظر آئی تو پتہ چلا میں کہاں آ گیا ہوں۔ میرا جسم ٹھنڈا پڑا تھا۔ زریں نے اسے حرارت پہنچانے کے لیے چادر ڈال دی۔

★

پھر ایسی حرارت چڑھی کہ سارا جسم بھٹی کے مانند دہکنے لگا۔ زریں کبھی میرے ماتھے پہ برف کے ٹکڑے رکھتی اور کبھی آیتیں پڑھ کے پھونکتی۔ جب بھی میری آنکھ کھلتی، میں اُسے اپنے پاس بیٹھی ہوئی دیکھتا اور گرد و پیش میں مجھے کوئی تبدیلی نظر نہ آتی۔ وہی ایک جیسی روشنی، ایک جیسا اندھیرا۔ گھٹن اور حبس۔ جب تک آنکھیں اور کان بند رہتے، مجھے کچھ خبر ہی نہ ہوتی لیکن جیسے ہی انھیں دیکھنے اور سننے کی تمیز آتی، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی میری بوٹیاں نوچ رہا ہو اور چاقو سے گوشت کاٹ رہا ہو اور کوڑے مار رہا ہو۔ میں چیختا چلاتا رہتا۔ پھر میرے اوسان معطل ہو جاتے اور میں نڈھال ہو کے جیسے اپنے آپ میں گر پڑتا۔
اسی عالم میں جب مجھے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی، ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بہت دور سے مجھے آواز دے رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ آواز اتنی قریب ہوئی کہ میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ کوئی میرے کانوں میں گھسا بیٹھا تھا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی، دیکھا کہ سرہانے بجّل بیٹھا ہے۔ اُس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ میں نے حیرانی سے اُس پہ نگاہیں مرکوز کر دیں۔ "میں آ گیا ہوں لاڈلے!" اُس کی بھاری بھرکم آواز کمرے میں گونجنے لگی۔
یکایک میرے ہونٹوں اور میری پلکوں پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اُس نے میرا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا اور میرے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "اچھا ہو جا لاڈلے! بس اب اچھا ہو جا۔" اُس نے میرے کانوں کی لویں کھینچنا شروع کر دیں۔ "اُٹھ کے بیٹھ۔" اُس نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کے اپنے سینے پہ لٹکا لیا۔ "کیا پاگل ہو گیا ہے؟" وہ ناراضی سے بولا۔ "دنیا میں صرف تو ہی تو نہیں رہتا، اور لوگ بھی بستے ہیں۔ لاؤ زریں! مجھے دوا دو۔" زریں دوا کا پیالہ لیے کھڑی تھی۔ میں نے تذبذب سے اُسے دیکھا۔ بجّل نے زریں کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دوا کا پیالہ چھین کے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے منہ پھیرا تو بجّل نے ایک ہاتھ سے میری گردن پکڑ لی اور میرا سر ہلاتے ہوئے پیالہ میرے حلق میں لوٹ دیا۔ دوا میرے سینے پر گر گئی تھی۔ بجّل نے اپنے کرتے سے میرا چہرہ اور کپڑے صاف کیے۔ "اب بس ٹھیک ہو جا پہلوان!" وہ زور زور سے میری کمر پہ دھپ مارتے ہوئے بولا۔
"ان کا جسم دکھ رہا ہے۔" زریں نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔
"ہاں جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ میں اسے دوا پلانے نہیں، غیرت دلانے آیا ہوں۔ سات سال جیل میں گزارے، موجدا جیسے موذی کو مارا، چاند میاں جیسے سور کے بچے کو شکار کیا، اب ہاتھ پیر پھیلا بیٹھا۔ مرنا چاہتا ہے؟" بجّل نے تلخی سے کہا۔ "بہن کے پاس کس منہ سے جائے گا۔ جا مر جا۔" بجّل مجھے بستر پہ دھکا دیتا ہوا بولا۔
"آپ ان سے، ان سے ایسی....." زریں بجّل کی آنکھیں دیکھ کے چپ ہو گئی۔
"تم اب جاؤ زریں! جا کے سو جاؤ۔" بجّل نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ "اب میں آ گیا ہوں، لاڈلا میرے سامنے بیمار نہیں رہ سکتا۔" زریں وہاں سے نہیں ہٹی۔ بجّل نے اُسے دوبارہ آرام کرنے کا حکم دیا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ "اچھا اچھا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "تم لاڈلے کی اجازت مانگتی ہو؟ لاڈلے!" اُس نے میری ٹھوڑی اوپر اُٹھا کے کہا۔ "اپنا نہیں تو اس کا حال دیکھ۔ زریں نے دو دن سے آنکھ بند نہیں کی ہے۔ میرا حکم اس پر نہیں چلتا، اب تو اپنی زبان سے اسے کمر ٹکانے کا حکم دے۔ بتا دے کہ اب تو اچھا ہو گیا ہے، بتا دے کہ اب بجّل آ گیا ہے۔"
بجّل کی باتوں سے میری رگوں میں کھولن ہونے لگی تھی۔ میں نے پہلی بار زریں کی طرف غور سے دیکھا، اُس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا، سر پہ میلا دوپٹا تھا، اُس نے کپڑے بھی یوں ہی سے پہن رکھے تھے۔ میں اُس کی یاس بھری نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ بجّل نے ٹہوکا مار کے پھر مجھے اکسایا کہ میں اپنی زبان سے زریں کو آرام کرنے کی اجازت دوں۔ میں نے نقاہت سے اُسے مخاطب کیا۔ ابھی میری زبان سے اُس کا نام ہی ادا ہوا تھا کہ اُس کے کمھلائے ہوئے چہرے پر مسرت کی ایک لہر اُبھری اور وہ بے قرار ہو کے میرے قریب آ گئی۔ "اب تم کیسے ہو؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"مجھے موت نہیں آئے گی زریں!" میں نے نحیف آواز میں کہا۔

"یہ مر ہی نہیں سکتا، جاؤ زریں! میں یہاں موجود ہوں۔" تجمل نے سختی سے کہا۔ "اور دیکھو، سورج نکلنے سے پہلے تم یہاں نہیں آؤ گی۔"

"مگر ـــ مگر ـــ"

"اگر مگر کچھ نہیں۔" تجمل تیز آواز میں بولا۔

"دوائیں۔" زریں نے جھجک کر کہا۔ "دوائیں میز پہ رکھی ہیں۔"

"ہاں ہاں میں اسے ایک ساتھ ساری دوائیں پلا دوں گا۔ اب اسے دوا کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دواؤں سے ٹھیک ہوگا تو مجھے اس کے بارے میں فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ دیکھ لینا بٹیا جب تم صبح آؤ گی تو لاڈلا ایک دم فِٹ فاٹ ہو گا۔"

زریں نے بدبدا کر کچھ کہا جسے میں سُن نہیں سکا۔ چند لمحے وہ مذبذب اور متردد وہیں کھڑی رہی۔ تجمل کے اشارے پر ماما اُسے اپنے ساتھ لے گئی لیکن وہ ایک ہی لمحے بعد پلٹ آئی۔ "آپ کا بستر ہیں..... میں یہیں بچھوا دیتی ہوں۔"

"میرا بستر۔" تجمل نے ہنس کر کہا۔ "میں تو خود بستر ہوں دیکھا لاڈلا میرے بستر پہ لیٹا ہوا ہے۔" وہ مجھے اُٹھا کے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

زریں کے جانے کے بعد میں اور تجمل کمرے میں تنہا رہ گئے میں یوں ہی تجمل کے سینے سے چپکا بیٹھا رہا۔ کمرے میں بھیانک خاموشی طاری تھی۔ مجھے یہ خاموشی زہر لگنے لگی۔ "تم کب آئے؟" بہت دیر بعد میں نے ہمت کر کے سرگوشی میں پوچھا۔

"میں شام ہی یہاں پہنچا ہوں۔ ان حرام کے جنوں نے مجھے دیر سے خبر کی۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "بہرحال پھر بھی میں وقت پہ آ گیا ہوں۔ لاڈلے! تُو نے مجھے بہت نیچا کیا۔"

میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "میں تجھ سے خفا ہوں۔"

"پھر تم یہاں کیوں آ گئے۔ تمھیں کس نے بلایا تھا؟"

"تُو نے ہی بلایا لاڈلے! تُو نے ہی بلایا۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"چلے جاؤ، واپس چلے جاؤ، مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"چلا بھی جاؤں گا پر تجھ سے نمٹ کر جاؤں گا۔"

"چلے جاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "نہیں جاؤ گے تو میں دیوار سے اپنا سر پھوڑ لوں گا۔ تم کیوں آئے ہو جاؤ۔" میں نے وحشیانہ انداز میں اسے پلنگ سے دھکیل دیا۔

"پلک مُتنے، تھڑدلے، تجھ سے اور کیا ہوگا۔" وہ فرش سے اُٹھتا ہوا بولا۔ "پھوڑ لے دیوار سے سر پھوڑ لے۔ میں تیرا تماشا دیکھ کے جاؤں گا۔"

"لو دیکھو۔" میں نے اپنا گریبان چاک کر لیا اور اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگا۔ تجمل پُرسکون انداز میں کھڑا مجھے دیکھتا رہا، میں نے اپنا سر مسہری کے تکیے سے پھوڑنا شروع کر دیا۔

"بس تجھ سے یہی ہو گا۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے بستر پہ پٹختے ہوئے [...] "زریں کے کپڑے تیرے جسم پہ فٹ تو نہیں آئیں گے پھر بھی وہ کپڑے [...] ہی ہیں لاڈلے، اپنے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لے، جھومر سجا لے [...] نے اپنا سر تکیے میں چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگا۔ تجمل میرے کان کے [...] بولا۔ "کس پہ ٹائم نہیں گزرا لاڈلے! پر سب تیری طرح لونڈیا بن کے [...] بیٹھ گئے۔ تُو نے تو بستر پہ لیٹ کے تجمل کا سر جھکا دیا۔ باہر وہ سب سالے [...] شہر کے مجھ پہ میرا منہ تک رہے تھے، جب انھوں نے مجھے بتایا کہ لاڈلا [...] دن سے چیخ چلا رہا ہے تو جی چاہا گدی سے اُن سب کی زبانیں کھینچ لوں۔"

"ہونہہ۔" میں نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کے کہا۔ "تمھیں صرف [...] کی پروا ہے، تم کچھ نہیں جانتے، تمھیں چاقو چلانا، حکم دینا اور باتیں کرنا آتا [...] تم کچھ نہیں سمجھتے۔"

"ہاں ہاں تُو سمجھتا ہے۔" وہ زہرخند سے بولا۔ "تُو سب سے زیادہ [...] ہے۔ تیری سمجھ اور جان پہچان دیکھ لی لاڈلے! وہ کنجر کی اولاد کنجری نکلی [...] تُو سڑک پر ٹسوے بہاتا رہا۔ تجھے کچھ خیال بھی نہیں آیا کہ تُو کیا کر رہا ہے۔"

"چُپ رہو، چُپ رہو، میں کچھ سُننا نہیں چاہتا۔" میں نے کان بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں بہت کمینہ، بہت ذلیل اور نیچ آدمی ہوں [...] کُتا ہوں۔"

تجمل کچھ کہنے کے بجائے کُرسی پہ اپنا سر لٹکا کے بیٹھ گیا۔ میری [...] کے سوا وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ جب دیر گزر گئی تو مجھے تجمل کی یہ [...] بھی گراں گزرنے لگی اور احساس ہوا کہ میں نے اُس سے کچھ زیادہ باتیں کہہ [دی] ہیں۔ وہ میرا حال سُن کے اتنی دُور سے یہاں آیا ہے اور میں نے اُسے کیا کیا کہہ دیا ہے۔ شاید وہ ناراض ہو گیا ہے۔ میں نے اُس کی طرف نگاہ کی [...] اپنے آپ میں گُم تھا۔ کُرسی کی پُشت پر باہر کی طرف اُس کا سر ڈھلکا [...] میں نے اُسے آواز دینے کا ارادہ کیا لیکن ہمت نہیں پڑی۔ میرے جسم [...] چھوٹ رہے تھے اور رگ رگ پٹھے میں سَن سَن ہو رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "مجھے کچھ خبر [...] کیا کرنا چاہیے تھا، میں کیا کہہ رہا ہوں اور مجھے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا چا[ہیے]"

تجمل چونک کے کُرسی پہ اُچھل پڑا۔ "لاڈلے میں تیری بات کا [...] مانتا، ان کانوں میں ایک چھلنی لگی ہوئی ہے، صرف باریک باریک باتیں [...] ہیں اور ان دیدوں کو رگڑ گھس کے اس کام کا بنایا ہے کہ پرکھ سکیں [...] کون ہے، سمجھا جانی؟"

"میں بہت ـــ بہت، مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔" میں نے [...] سے کہا۔ "میرا دل تالو میں نہیں ہے۔ یہ ڈوب رہا ہے اور ڈوبتا بھی نہیں [...]"

"کوئی نئی بات کر۔ یہ بتا کہ بہن سے کوئی بات بھی ہوئی؟" [...] لہجے میں بولا۔ "اب مجھ سے کچھ نہ چھپا۔"

میں نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ "کیا سب کو معلوم ہو گیا کہ وہ [...]"

[...] میں نے اُسے مرنے کے بعد بھی بے چین کیا، میں نے اُس کا پردہ چاک کر دیا۔"

[...] کیسی بات کرتا ہے، تُو نے گلا پھاڑ کے سب کو بتایا ہے کہ تیرا اُس [...] کیا رشتہ ہے، بہت مضبوط سینہ چاہیے لاڈلے! لوہے کا بنا ہوا سینہ، تُو [...] ہی وار برداشت نہیں کر پایا۔ اب زندگی میں صرف وہی چاقو نہیں چلتے [...] جیبوں میں رکھا جاتا ہے، ہر طرف سے چاقو چلتے ہیں میری جان! [...] میں [...] کے پھلکے نظر نہیں آتے، یہ داؤ پیچ جو تُو نے جیل میں سیکھے ہیں یہ تو معمولی [...] ڈوں کے داؤ ہیں، وار کرنے اور وار بچانے کے ہُنر کا پتہ تو زندگی میں ملتا [ہے] شہزادے! اتنا اکیلا مت رہ۔ زندگی کاٹ کھائے گی، زندگی کے وار سے [...] کے یہ کبھی تنہا کبھی مل کے، کبھی سامنے سے کبھی پیچھے سے داؤ پیچ دکھانے [...] تے ہیں۔ تُو نے کچھ بتایا ہی نہیں کیونکہ تجھے لوگوں نے اتنا خوف زدہ کر دیا [...] کہ تُو نے سب پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ خوف دور کر، بہت اکیلا [...] جائے گا لاڈلے! میں سمجھتا تھا تُو کتابوں اور قلم کے داؤ پیچ سیکھ کے اور مضبوط [...] ان نکلے گا۔ تُو کاہے سے ڈرتا ہے رے؟"

میں گُم سُم اُس کی باتیں سُنتا اور صورت دیکھتا رہا۔ "جانے دے۔" وہ ہاتھ [جھٹ]ک کے بے پروائی سے بولا۔ "اس بات پر غور کر کہ وہ یہاں آ کیسے گئی؟"

"مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ وہ میری بہن فہمیدہ تھی مگر وہ تھی وہی۔ [...] کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آ گئی۔ وہ تو بہت شرمیلی چار دیواری میں رہنے [وا]لی لڑکی تھی۔ کسی اجنبی آدمی نے کبھی اُس کا سایہ تک نہیں دیکھا تھا۔ اُسے [...] کے مجھے ہوش ہی نہیں رہا، پتہ نہیں میں نے کیا کیا اور کیا کہا ہو گا۔ آدمی کے [...] ن ہتھیار ہو تو اُسے یہ خیال رہتا ہے کہ وہ قتل بھی کر سکتا ہے یا قتل بھی ہو [سکت]ا ہے۔ آدمی جانتا ہے کہ ان جانے راستوں پر سفر کرنے سے بھٹک جانے [کا] اندیشہ ہے، آدمی یہی باتیں تو سوچ سکتا ہے جو اُس کے دماغ اور دل میں آتی [...] ل، آدمی رات کو دن کیسے کہہ سکتا ہے۔" میری آواز پر کپکپی طاری ہو گئی۔ "تجمل بھائی [ہم]اری کوئی بہن ہوتی اور بہن بھی فہمیدہ جیسی ہوتی پھر میں تم سے پوچھتا۔"

تجمل سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر خون اُبھر آیا۔ پلکیں [...] ری سے جھپکنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی بُری بات کہہ [دی] ہے یا تجمل کہیں کھویا ہوا ہے، اُس نے میری بات سُنی ہی نہیں۔ وہ کُرسی [سے] اُٹھ کے کمرے میں ٹہلنے لگا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "رات کو دن بھی کہنا [پڑت]ا ہے لاڈلے! چلتے چلتے زمین پھٹ جاتی ہے، آنکھ کھلی ہے تو سب کچھ [...] سب آنکھ بھی ایک حیا تو ہے۔ بدن پر موجود ہے تو کچھ بھی دکھا سکتی ہے۔" [...] لمبی سانس کھینچتا ہوا سرگوشی میں بولا۔ "باقی لوگ کدھر ہیں؟"

"کیا پتہ، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تُو نے انھیں کہاں چھوڑا تھا؟"

"میں نے انھیں جہاں چھوڑا تھا، اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ وہ نہ جانے [...] کہاں گُم ہو گئے۔ میں نے انھیں تلاش بھی نہیں کیا۔ میں تو اُن کے لیے [اُس]ی دن مر گیا تھا جس دن گھر سے رخصت ہوا تھا۔ اب سات سال بعد میں اُنھیں اپنا کالا چہرہ دکھا کے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا اور پھر مجھے تو کسی اور شخص کی تلاش تھی۔"

"دیوانے! یہ آدمی کا بچہ بھوبھل کے موافق ہوتا ہے، تنکے سے کرید تو نہ جانے کتنی چنگاریاں پک پڑیں۔ میں جانتا ہوں، ایسی چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں ہوتی۔ مجھے یقین تھا، ایک دن تُو خود ہی تنگ ہو جائے گا۔ سات سال تو بڑی بات ہے، ایک لمحے میں کایا پلٹ جاتی ہے مگر تُو نے سات سال اپنے آپ کو برف خانے میں رکھا۔ لاڈلے! اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بس دل پہ برف رکھنی پڑتی ہے جبھی آدمی ٹھیک طرح سوچ سکتا ہے، تُو نے سوچنے کا کام نہیں کیا اور کیا کیا؟ تجھے کیا ملا، تُو اپنے آپ کا اتنا دشمن کیوں ہے۔ میری بات سُن، غور سے سُن، آدمی کی جون میں آ، یہ آدمیوں کی دُنیا ہے کھال سے بخار اور سینکے سے ڈھول جھاڑ۔ ندّے، شولی، سارٹے، جامو اور کبن خاں حرامی بھی تیری طرح نشے میں آ گئے تھے مگر میں اُسے تیرے لیے ضرور تلاش کروں گا۔ اطمینان رکھ، تجمل اُس چنڈال کو تیرے قدموں میں ضرور ڈال دے گا جو تیری بہن کو لائی تھی۔ یہ تجمل کا وعدہ ہے، لاڈلے میری خاطر اب اکیلا کہیں جانے کی کوشش مت کرنا، اکیلا آدمی پاگل ہوتا ہے، تجھے پتہ نہیں، کون کون تیرا طلب گار ہے جانی! اور سُن تجھے جس لڑکی کی تلاش ہے، وہ ایسی آپا دھاپی میں کبھی نہیں مل سکتی، تُو اس طرح اُسے کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔"

تجمل رات بھر میرے جسم میں سوئیاں چبھوتا رہا۔ وہ سچ کہتا تھا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ حواس باختہ زریں جب کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے دیکھ کے دنگ رہ گئی۔ اُس کی آمد پہ مجھے خیال آیا کہ رات گزر گئی ہے اور تجمل رات بھر جاگتا رہا ہے۔ زریں نے مجھے دوا کا پیالہ دیا تو تجمل نے اُسے سلپچی میں اُلٹ دیا اور ہنس کے کہنے لگا۔ "زریں! لاڈلے کو بھوک لگ رہی ہے۔"

*

جب تجمل مجھے باہر لایا تو بیٹھک بھری ہوئی تھی۔ مجھے اور تجمل کو دیکھتے ہی وہ سب کھڑے ہو گئے۔ ان میں جامو بھی تھا، کبن خاں بھی، ندّے، شولی، سارٹے بھی، نواس بھی موجود تھا۔ وہ شاید تجمل کے ساتھ آیا تھا۔ میرے سر پہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں لیکن میری آنکھیں خشک تھیں اور میں اپنے قدموں پہ کھڑا تھا، میرے چہرے پر بھی انھیں نمایاں تبدیلی نظر آئی ہو گی۔ وہ سب مجھ سے لپٹ گئے اور کبن خاں تجمل کا بازو پکڑ کے جوش میں بولا۔ "اُستاد! کیا جادو کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔" سارٹے ٹھنک کے بولا۔ "اگر استاد کو پہلے سے خبر کر دیتے تو لاڈلا ہمیں اتنا پریشان نہ کرتا۔ استاد لاڈلے کی رگ رگ سے واقف ہے۔"

"تیری زبان بھی کلنتے کی طرح چلنے لگی؟ کترمعں گا۔" تجمل نے گھڑک کے کہا پھر کبن خاں کو مخاطب کر کے بولا۔ "کبن خاں! کیا پتہ چلا؟"

"اُستاد تجمل، وہ سالی لکھنؤ میں بھی نہیں ہے۔" کبن خاں سر کھجاتے

تجے بولا۔ بہرحال استاد! جائے گی کہاں میں اُسے پاتال سے بھی زندہ پکڑ کے لے آؤں گا۔ ذرا اُسے سانس تو لینے دو، کہیں نہ کہیں جا کے تو ٹکے گی۔ لوٹ پھر کے آجائے گی اپنی اوقات پہ۔ لاڈلے! فکر مت کر، قسم سے کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ سالا سب کچھ ایسا نابڑ توڑ ہوا کہ اُس کی طرف نظر ہی نہیں گئی۔ استاد! بڑی شرمندگی ہے۔"

"نہیں کتن، تُو نے تو بڑا کام کیا۔" بخشل اُسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ اور یہ جامو، تُو نے اسے مجھ سے پہلے نہیں ملوایا۔ کہاں چھپا کے رکھا تھا، تم کو شہر میں کیا رنگ جمایا ہے میرے شیر نے۔"

"استاد بس تمھاری دعا ہے۔" جامو نے انکسار سے کہا۔ "میں تو لاڈلے کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتا، نہ جانے اُس دن میرے منہ سے کیا کیا نکل گیا۔"

ملا ڈالا جاتا ہے کہ تیری اس میں کوئی خطا نہیں تھی جامو!"

"استاد وہ لڑکی بہت اچھی تھی، بہت ہی اچھی۔ ان بدمعاشوں سے پوچھ لو۔" وہ اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ندامت سے بولا۔ "میں ہمیشہ اُس کا ذکر کرتا تھا، نگاہ نہیں اُٹھاتی تھی مگر استاد! تم جانتے ہو، اپنے کام سے اور اپنے آپ سے بھی کبھی تو بڑی گھن آتی ہے۔ یہ آنکھیں سب کچھ دیکھتی ہیں اور یہ ہاتھ سالے کچھ کر نہیں پاتے۔"

"رہنے دے جامو! کوئی اور بات کر۔" بخشل میری آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو دیکھ کے بولا۔ "جامو! تُو نے تو کمال کر دیا، ایک ہی دن میں بٹیا کے لیے حویلی خالی کرا دی۔"

"استاد! کیوں شرمندہ کرتے ہو، سب کھاد ہو گیا۔ میں نے کیا کیا، بٹیا کی حویلی تھی، اُسے مل گئی۔ کتن خاں کا حکم تھا۔ میں بٹیا کے لیے شہر فیض آباد کی تمام حویلیاں خالی کرا سکتا تھا۔ کتن خاں نے زندگی میں پہلی تو فرمائش کی تھی۔ وہ خالو کا بچہ یہاں سے تو دُم دبا کے نکل گیا مگر بعد میں اُس نے شہر میں بڑا ہنگامہ مچایا۔ کئی رئیسوں اور محلے کے چودھریوں کے پاس گیا۔ اپنی بھی نوابوں رئیسوں سے صاحب سلامت ہے۔ پہلے تو سب بگڑے مگر جب میں نے انھیں ساری بات بتائی تو گھڑوں میں ویک گئے۔ اب بٹیا آرام سے رہ سکتی ہے اور میں تو یہاں موجود ہوں۔ میں نے کہہ دیا ہے کسی نے حویلی پہ نگاہ اُٹھا کے دیکھا تو آنکھیں نکال لوں گا۔" جامو نے طیش میں کہا۔

مالمنے آ کے اطلاع دی کہ ناشتہ تیار ہے۔ دوسرے کمرے میں فرش پہ ناشتہ سجا ہوا تھا۔ زرین نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ فہمیدہ کے واقعے کو تین دن گزر گئے تھے۔ تین دن سے ایک کھیل بھی اُڑ کے منہ میں نہیں پہنچی تھی۔ اب بھی بھوک نہیں تھی، میری نظر اِن سب کے سامنے اُٹھتی ہی نہیں تھی حالانکہ وہ بار بار میرے قریب آ کے مجھے گلے لگا کے مجھ سے اپنے لگاؤ کا اظہار کر رہے تھے۔ مجھ سے کچھ کھایا نہیں گیا لیکن پھر سب نے ہاتھ اُٹھا لیا اور کہا کہ جب تک میں نہیں کھاؤں گا وہ بھی کچھ نہیں کھائیں گے۔ مجبوراً مجھے اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ ان لوگوں سے مل کے میرا ذہن پھر بوجھل ہونے لگا۔ انھوں نے سکون سے ناشتہ کیا لیکن

ناشتے کے بعد کسی نے اُس رات کا ذکر پھر چھیڑ دیا۔ اُن کی باتوں سے ظاہر تھا کہ انھوں نے فیض آباد شہر کا ہر محلہ چھان مارا ہے مگر چمپا نا گرا اُن کو کہیں نہیں ملی۔ پولیس سے انھوں نے یہ بات چھپانے کی کوشش کی تھی، فہمیدہ میری بہن تھی لیکن پولیس کو پتہ چل ہی گیا۔ اُن کے بیان کے مطابق ملنے حویلی میں مجھ سے سوالات کرنے آئے تھے۔ جامو نے انھیں میری کاغذ لکھ کے ٹال دیا۔ چمپا نا ٹکے کے غائب ہو جانے سے پولیس کی توجہ اُس طرف مبذول ہو گئی تھی، پھر بھی جامو کے خیال میں انھیں ایک بار ضرور پاس آنا تھا۔ جس وقت ہم چمپا کے کوٹھے پہ پہنچے تھے تو وہاں اور بھی لوگ تھے اور نیلم جان گا رہی تھی۔ ہماری آمد سے نیلم جان کے گانے میں مداخلت ہوئی۔ اُس نے گانا بند کر دیا اور پھر اُسے اچانک نہ معلوم کیا ہوا کہ وہ جھرجھری لے کر گو دبڑی۔ سب سے پہلا آدمی میں تھا جو چیختا ہوا نیچے اترا۔ سب نے فہمیدہ کو اُس کی گود میں تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں تو اب سڑک پر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔

جامو نے نیلم جان کو تین سال قبل شہر کے بازار میں پہلی بار دیکھا اور وہ اکثر اُسی کے کوٹھے پر گانا سننے جاتا تھا۔ نیلم جان کبھی بازار میں نہیں نکلتی تھی، بس اپنے بالاخانے پر شام کو محفل سجاتی تھی اور درد بھرے نغمے گاتی تھی، ناچتی بھی ہو گی، فہمیدہ ناچتی ہو گی۔ زلّو، پری بیگم اور شمہ پارہ کی طرح ناچتی۔ جامو کہتا تھا وہ بہت دُکھی نظر آتی تھی اور اپنی بستی کی دوسری طوائفوں سے کم ہی ملتی جلتی تھی، وہ سب اُس سے جلتی تھیں اور اُس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں بیان کرتی تھیں۔ جامو نے بتایا کہ اُس نے ایک ایک طوائف سے نیلم جان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ خود نیلم جان نے اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا، ہاں کو یہ بات معلوم تھی کہ نیلم جان کسی شریف خاندان کی لڑکی ہے اور مجبوراً اُسے طوائف بنا دی گئی ہے۔ اس بازار میں آنے کے بعد اُس کے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا، اس لیے وہ ناچتی اور گاتی رہی۔ چمپا کے سازندے کہتے تھے کہ انھوں نے پہلی بار نیلم جان کو اُس وقت دیکھا تھا جب چمپا فیض آباد میں اُسے ساتھ لائی تھی۔ اُس کے ساتھ جو مرد تھا وہ واپس چلا گیا تھا۔ چمپا اپنے ساتھ دو لڑکیوں کو لے کے پانچ سال پہلے فیض آباد سے گئی تھی۔ واپس آئی تو اُس کے ساتھ نیلم جان تھی اور یہاں سے جانے والی دونوں لڑکیوں کو وہ کہیں اور چھوڑ آئی تھی۔ چمپا کا کوٹھا اُس کی عدم موجودگی میں ایک دوسری طوائف رانی چلاتی تھی۔ چمپا کے آنے کے بعد رانی شاید بریلی چلی گئی اور چمپا نے نیلم جان کی محفل سجانی شروع کر دی۔ وہ نہایت احتیاط سے بخشل کو نیلم جان کے بارے میں بتا رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ پر بڑا ضبط کیا۔ اگر میں نہ کرتا تو مجھے کبھی اِن واقعات کا علم نہ ہوتا۔ میں بھی نیلم جان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ شاید اُن کی گفتگو میں کوئی ایسی بات آجائے جس سے نیلم جان کے گھر والوں کا حال معلوم ہو سکے مگر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ نیلم جان کو چمپا نے خریدا تھا۔ کس سے اور کہاں سے خریدا تھا؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتی تھی یا چمپا کی کوئی راز دار۔ نیلم جان کا یہ حال ہوا تو یہ تو چمپا ہی جانتی تھی کہ اُس کے باقی گھر والوں کا کیا ہوا ہو گا۔ وہ بدنصیب کہاں ہوں گے۔ میں سب ... میں نے نسرین کو دیکھا تھا، زرین کو دیکھا تھا اور میں نے چاند میاں کو ... جن کے گھر سے بھائی بھاگ جاتے ہیں اور جن کے باپ مر جاتے ہیں، ... لڑکیوں کا یہی ہوتا ہے۔ وہ سب نیلم جان کا تذکرہ کر رہے تھے، اس کی ... عادات و اطوار، شائستگی اور شرافت بیان کر کے مجھے خوش کر رہے تھے اور ... اقرار رہے تھے کہ انھوں نے چمپا کو تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ... بخشل کس کس کی زبان بند کرتا؟ میری صورت دیکھ کے ہر ایک کو نیلم جان ... یاد آ جاتا تھا۔ ایک کی زبان رُکتی تو دوسرے کی چلنے لگتی تھی۔ وہ کہتے تھے ... نیلم جان گانے کے درمیان اچانک پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی پھر ... دن تک چمپا کا بالاخانہ ویران رہا اور لوگ گلی میں بھٹکتے رہے۔

بخشل نے مجھے واپس اندر بھیجنا چاہا لیکن میں نے اُس کا حکم نہیں مانا۔ اُن کی ہمدردیاں سہتا اور اُن کی دل جوئیاں برداشت کرتا رہا اور فرش ... رہا۔ بخشل نے مجھ سے چاقو بھی چھین لیا تھا۔ آخر بخشل کتن خاں اور جامو سے یہ مطالبہ کرتا ہوا اُٹھ گیا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر چمپا کو کہیں نہ کہیں سے برآمد کر کے میرے پیروں پہ ڈال دیں۔ بخشل کے اُٹھتے ہی وہ سب منتشر ہو گئے۔ جامو کے دو تین ساتھیوں، فدّے، شولی اور سلّٹے کے سوا سب وہاں سے چلے گئے۔ بخشل مجھے اندر لے آیا جہاں سُرخ آنکھوں اور زرد چہرے کے ساتھ زرین بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی، وہ ہمیں حویلی کے دالان میں لے گئی جس کے آگے ایک بڑا صحن موجود تھا، صحن میں خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور دھوپ منڈیروں پر پھیل گئی تھی۔ بخشل دالان میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کے پیچوان کے کش لینے لگا، پھر حقے کی نال اُس کے منہ سے ٹک گئی۔ وہ بھی کچھ سوچ رہا تھا، میں بھی اور زرین ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ "بٹیا!" ایک ساعت بعد کہیں بخشل کی گمبھیر آواز نے ماحول کا سکوت توڑا۔ "اس بڑی حویلی میں تیرا جی کیسے لگے گا؟"

زرین ڈری سہمی ہوئی تھی۔ بخشل کی آواز پر وہ چونک پڑی اور دبلے دبلے قدموں سے اُس کے پاس گئی۔ تھم سے سر نکال کے اُس نے جھجکتے جھجکتے جواب دیا۔ "بابا! میں اس گھر میں پیدا ہوئی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" بخشل نے الجھتے ہوئے کہا۔ "پر میں سوچتا ہوں تو اکیلی یہاں کیسے رہے گی؟ گاؤں اور شہر کی جائداد کی آمدنی کی دیکھ بھال کسان اناج ذکر چکر ... اِن سب کو تو اکیلی کیسے دیکھے گی اور پھر یہ سب جنجال نہ بھی ہو تب بھی اس محل میں تو تیرا جی بہت گھبرائے گا۔"

"بابا! اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔" زرین آہستگی سے بولی۔ "یہاں کی دیکھ بھال میں نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا۔"

"تو کیسے کر سکتی ہے پگلی! یہ تو بڑا کام ہے۔"

"جہاں تک بن سکا کروں گی۔" وہ اداسی سے بولی پھر کچھ تذبذب کے بعد کہنے لگی۔ "بابا! ایک بات کہوں؟"

"کہہ بٹیا کہہ۔" بخشل نے تجسس سے کہا۔

"بابا! میرا جی یہ چاہتا ہے کہ یہ سب آپ سنبھال لیں اور میں بس آپ کی خدمت کرتی رہوں۔ اب آپ یہیں رہیے۔ میں آپ کے لیے اچھے اچھے کھانے پکاؤں گی، آپ کا حقہ تازہ کروں گی۔ دیکھیے میری بات ... مت کیجیے گا۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، یہ سب چیزیں میرے لیے بیکار ہیں۔ آپ یہاں رہیں گے تو اس سے بڑھ کے میرے لیے کوئی اور خوشی نہیں ہو گی۔"

بخشل اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے قریب کھڑی ہوئی زرین کا دوپٹا سرکایا اور اُس کا چہرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ بخشل کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے زرین کی پیشانی چوم لی اور اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ زرین پر لرزہ سا طاری ہو گیا مگر بخشل فوراً پیچھے ہٹ گیا اور تیزی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نا نا۔ نا بٹیا نا۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ کوئی بیٹیوں کے دھن پر بھی بیٹھتا ہے۔ ایسی بات پھر مت کرنا۔ اتنا بُرا مت سمجھ بٹیا!"

زرین سہم گئی۔ "بابا! آپ میری بات نہیں سمجھے یا میں آپ کو سمجھا نہیں سکی۔ میں آپ کو خواب میں بھی بُرا تصور نہیں کر سکتی۔"

"نا نا، ایسی باتیں مت کر۔" بخشل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تُو نہیں جانتی کہ ہم کون لوگ ہیں۔ ہم بہت دُور رہتے ہیں۔"

"میں سب جانتی ہوں، پھر آپ نے پوچھا ہی کیوں تھا۔"

"پوچھا تھا پر بٹیا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" زرین مضبوط آواز میں بولی۔

"تُو ابھی بچی ہے کچھ نہیں سمجھتی۔" بخشل جھنجلا کے بولا۔

"تو پھر آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ میں یہاں کیسے رہوں گی۔ میں جیسے تیسے رہ لوں گی۔ زندگی تو گزارنی ہی پڑے گی۔"

"او نہیں نہیں۔" بخشل نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "بس اب خاموش رہ، بس اب کچھ نہ کہنا، میرے کانوں میں اتنا دم نہیں ہے۔" زرین کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر بخشل کی اضطراری حالت دیکھ کے چپ ہو گئی۔ بخشل کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ میں نے اُسے اتنا مضطرب پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بار بار اپنے بال کھینچ رہا تھا۔ زرین وہاں سے چلی گئی تو بخشل کو کچھ قرار آیا اور وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "لاڈلے! لاڈلے! یہ کیسی لڑکی ہے، تُو نے مجھے اس سے کیوں ملایا تھا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ سامنے ہوتی تھی تو میں یہی سوال خود سے کیا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ کاش بدھو گیا سے واپسی کے وقت میرے پاس کلکتے جانے کے لیے ٹکٹ کے پیسے ہوتے اور زرین کے ڈبے میں داخل ہونے اور اسے دیکھنے کی نوبت نہ آتی، میں نسرین اور چاند میاں کو کسی نہ کسی طرح یقیناً ڈھونڈ لیتا اور کورا کی تلاش میں یہ رخنہ پیدا نہ ہوتا لیکن جب ایسا خیال آتا تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی اور میں اپنے آپ کو سرزنش کرتا۔ زرین بھی کورا ہی کی طرح ایک لڑکی تھی، کم سے کم ایک لڑکی تو اپنے گھر واپس آگئی۔ اچھا ہوا، بدھو گیا سے

واپسی پر میری جیب میں پیسے نہیں تھے اور میں زریں تک پہنچ گیا تھا۔ اگر میں اُس کے ڈبے میں داخل نہ ہوتا تو زریں کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ کبھی کورا کو میرے دیر سے پہنچنے کا یہ حال معلوم ہوگا تو وہ بہت خوش ہوگی۔

میری خاموشی سے بجھل کی اُلجھن میں اور اضافہ ہوگیا۔ دھوپ صحن میں پھیل چکی تھی مگر بجھل کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ بیچوان کی نال زمین پر پڑی تھی اور بجھل وحشت سے اپنا چہرہ نوچنے لگتا تھا۔ مجھے اُس کی اس کیفیت سے خوشی سی ہوئی۔ ماما نے آکے اُسے چونکایا کہ باہر بیٹھک میں جامو اُس کا منتظر ہے۔ بجھل کی چال میں پہلے جیسی تیزی نہیں تھی، میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بیٹھک کے دروازے پر بجھل نے مجھے روک دیا۔ میں نے درشتی اور ناراضی سے اُسے دیکھا مگر اُس نے مجھے جامو کی بات سننے کا موقع نہیں دیا۔ شہر سے جامو فہمیدہ اور چمپا بائی کے متعلق کوئی خبر لایا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ سے یہ باتیں کیوں چھپانا چاہتے تھے، اب پردہ ہی کیا رہ گیا تھا۔ وہ نہ جانے اندر بیٹھے کیا کھسر پھسر کر رہے تھے۔ میں دروازے کے قریب منڈلاتا رہا۔ بجھل نے صبح ناشتے کے دوران میں کبن خاں اور جامو کو حکم دیا تھا کہ وہ چمپا بائی کو ایک ہفتے کے اندر میرے قدموں میں ڈال دیں مگر اس طرح بھلا فہمیدہ واپس آسکتی تھی، فہمیدہ تو منوں مٹی تلے دبی ہوئی تھی۔ اُن کا خیال ہوگا کہ چمپا سے اپنی بہن کا بدلہ لے کے مجھے کوئی تسکین حاصل ہو جائے گی۔ چمپا کے نام سے میرے خون کی گردش ضرور تیز ہو جاتی تھی لیکن چمپا کا کیا قصور تھا، یہ تو چمپا کا کاروبار تھا۔ سزا تو مجھے خود کو دینی چاہیے تھی۔ ابا کہتے تھے، جس گھر کی دیواریں نیچی ہوں وہاں چور گھس آتا ہے۔

ایک چمپا بائی ہی کیا، ہزاروں چمپا بائیوں کے جسموں میں چھرا گھونپنے کے بعد بھی مجھے قرار نہ آتا۔ میں نے اپنی بہن کے پیروں میں گھنگرو بندھے دیکھے تھے۔ اُن گھنگروؤں کی بازگشت اب تک میرے دماغ میں گونج رہی تھی۔ بجھل نے آکے مجھے درہم برہم کر دیا۔ میں بستر پر پڑا تھا تو اُن لوگوں کی آنکھوں سے دُور تھا جو یہ جان گئے تھے کہ فہمیدہ سے میرا کیا رشتہ تھا۔ کلکتے میں بجھل نے میرے اردگرد جو پہرا لگایا تھا، وہ یہاں بھی موجود تھا۔ شہر کے کتنے ہی لوگوں نے میرا چہرہ دیکھا تھا اور جامو کے کتنے ہی ساتھی اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ میں شہر میں جامو کے اثر و رسوخ کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ مجھے بھی چمپا بائی کی تلاش تھی لیکن میں اُس سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے فہمیدہ کو کہاں سے حاصل کیا تھا؟ ابا اُسے کہاں ملے تھے؟ بجھل سمجھتا تھا کہ فہمیدہ کی موت کے بعد میری بدحواسی، بے ہوشی اور گم شدگی بے حسی کی بات ہے۔ بجھل کو تمام حالات معلوم کب تھے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ فہمیدہ کا چہرہ دیکھ کے میرے ذہن نے کیسے کیسے بھیانک خواب دیکھے تھے۔ میں بخار میں تپ رہا تھا اور اتی میرے پاس بیٹھی تھیں، ابا میرے سرہانے کھڑے تھے۔ مجھے اُن سے نظر ملانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور میں غش کھا کے گر پڑتا تھا۔

بجھل نے ایک کشمکش سے نجات دلا کے دوسری سے دوچار کر دیا تھا۔ ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھری میں منتقل کر دیا تھا۔ اُس نے مجھے زندگی کے میرے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ باہر جانے کا راستہ بند تھا۔ ممکن ہے وہ چمپا بائی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو۔ وہ زریں تمام ماجرا سنائے گی کہ فہمیدہ کس گھرانے کی لڑکی تھی، اُس کے باپ اُس کے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ کیا گزری۔ مجھے چمپا بائی سے اپنے طور پر ملنا چاہیے تھا۔ یا اُس تک اُن کے پہنچنے سے پہلے اُس کی جان لینی چاہیے تھی۔ اگر بجھل نہ آتا تو شاید میں حویلی کی بڑی بڑی دیواریں پھاند ہوجاتا، بشرطیکہ مجھے اپنا ہوش بھی رہتا۔

بجھل جلد ہی واپس آگیا اور اُس نے مجھے بتایا کہ نیلم جان ایک نواب خاص لگاؤ رکھتا تھا۔ نیلم جان اُس نواب سراج علی کی طور پر بلائی جاتی تھی اور بند کمرے میں نواب کے سامنے ناچتی گاتی سازندوں نے اب تک جامو کو یہ بات اس لیے نہیں بتائی تھی کہ خوف زدہ تھے۔ جب جامو نے انھیں مجبور کیا تو انھیں نواب کا نام بتانا پڑا کوئی خاص بات نہیں بتا سکے۔ صرف اس قدر بتا سکے کہ نواب نے چمپا سے نیلم جان کا سودا کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور چمپا نے خوش اسلوبی سے اُسے ٹال دیا تھا۔ اُس نے نواب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی نیلم جان کا گانا سننے کی فرمائش کرے گا، وہ اُسے اُس کی حویلی لے آئے گی بہت دنوں تک چلتا رہا۔ سازندوں کا خیال تھا کہ خود نیلم جان بھی سے متاثر تھی۔ نواب چمپا اور اُس کے سازندوں کو ہمیشہ انعام و اکرام جب جامو اور کبن خاں نواب سے ملنے کے لیے اُس کی حویلی پہنچے تو کہ نواب ان دنوں سخت بیمار ہے اور ایسی حالت میں ملاقات کر معذور ہے۔

بجھل کی زبانی یہ باتیں سُن کے میرا جسم سُن ہو گیا۔ کانوں میں بجنے لگیں۔ وہ یہ واقعات سپاٹ انداز میں سُنا رہا تھا اور اُس نے دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ اُس کا ایک ایک لفظ میرے رہا ہے۔ وہ نیلم جان کی زندگی کُرید رہے تھے حالانکہ وہ اُسے اپنے چکے تھے۔ میں بجھل کی چال سمجھ گیا تھا۔ وہ یہ سب سُنا کے مجھے یہ تھا کہ کبن خاں اور جامو میرے بارے میں کتنے فکرمند ہیں اور مجھ یہ کہنے کی جرأت نہیں تھی کہ بس کرو، اپنا کام کرو، مجھے میرے حال پر مجھ سے اتنی ہمدردی کا اظہار مت کرو۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے آہستگی سے میرے پاس آئی کہ مجھے اُس کی آہٹ کا احساس بھی "انھیں تبدیل کرلو۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں کپڑے لیے کھڑی تھی۔

مجھے گھر یاد آگیا۔ جمعے کی نماز سے پہلے اتی یا فہمیدہ اسی طرح نکال کے دیتی تھیں۔ میں کتاب پڑھنے یا کچھ لکھنے کے دوران میں تھا کہ اتی یا فہمیدہ کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے بڑ سے اُسے دیکھا اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا: "آج جمعہ"

"نہیں۔" وہ اُداسی سے بولی۔ "آج پیر ہے۔" میں نے بوکھ

کپڑے چھین لیے۔ "پانی گرم ہوگیا ہے مگر نہانے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔" وہ ہچکچاہٹ سے بولی۔ "اگر طبیعت خراب ہو تو مت نہانا۔"

"مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میرا جی کچھ کرنے کو نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ "میں جانتی ہوں، تم کتنے اُداس ہو مگر مرنے والے تو مر ہی جاتے ہیں۔ البتہ اُن کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور سب کچھ دیکھتی رہتی ہیں۔" وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے کیا خبر تھی کہ یہاں آنے کے بعد تم اس حادثے سے دوچار ہو گے۔ میں یہاں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تو آج یہ بات نہ ہوتی۔"

"اُس کی موت اسی طرح لکھی تھی، تم کیا کر سکتی تھیں۔ مجھے یاد ہے تم یہاں اتنی خوش ہوئی تھیں، سوچا تھا کہ تم اپنے تمام دُکھ بھول جاؤ گی اور نئے سرے زندگی بسر کرو گی لیکن تمھیں ایک دن بھی سکون نہ ملا۔"

"میری ایک بات مانو گے؟" وہ افسردگی اور عاجزی سے بولی۔ "گو کہتے ہوئے جھجک ہوتی ہے لیکن تمھارا حال دیکھا نہیں جاتا۔ تم ٹھیک کہتے ہونے والی بات کو کون روک سکتا ہے، نہ تم، نہ میں، نہ کوئی اور۔ تمھیں آگے سے کام کرنے ہیں۔ یہ گھر تمھارا ہے۔ تم ..... یہیں ..... یہیں....." وہ ہکلانے لگی اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سر جھکا کے بولی۔ "جاؤ، کپڑے پہن لو۔ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ اُس کے لہجے میں ایسا سوز تھا کہ میں نے ایک ول کی طرح اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ غسل خانے تک رہنمائی کرتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ابھی میں نے کُرتا اُتارا ہی تھا کہ مجھے پہلی بار اپنے میں کسی چیز کی کمی کا احساس ہوا اور میرے دل کی حرکت جیسے بند ہونے میں نے دیوانگی سے اپنا سینہ ٹٹولا۔ مالا میرے گلے سے غائب تھی۔ میں حالت میں چیختا ہوا غسل خانے سے باہر نکلا۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ را کی ایک ہی چیز میرے پاس رہ گئی تھی، اُس کی بھی میں حفاظت نہیں کر میری چیخ پکار سے حویلی کے ملازمین اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اور انھوں نے کے خبر کی۔ بجھل کے باہر آنے سے پہلے میں خود بیٹھک میں پہنچ گیا۔ "میری کہاں ہے؟" میں نے دہشت زدہ انداز میں اُسے مخاطب کیا۔ "میری مالا واپس کر دو۔"

"کون سی مالا؟" بجھل نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ مالا جو تم نے میرے پاس دیکھی ہوگی، وہ کسی کی امانت تھی۔ وہ میرے گلے میں نہیں ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"لے رے، ایک مالا کے لیے اتنی دیوانگی؟ میں کھیلنے کے لیے تجھے اور مالا لا دوں گا۔" بجھل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں، مجھے وہی مالا چاہیے۔ آہ کسی نے میری مالا چھین لی۔" میں نے واویلا کرتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے جو چاہو لے لو مگر میری مالا مجھے واپس کر دو۔"

"لاڈلے! میں تجھے ویسی بہت سی مالائیں لا دوں گا۔" بجھل نے چمکار کر کہا۔ "اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔"

"تم نہیں جانتے، تم اُس کی قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے بجھل بھائی! خدا کے لیے جامو، کبن خاں اور دوسرے لوگوں سے پوچھو کہ انھوں نے میری مالا تو نہیں دیکھی؟" میں نے اُس کی منت کی۔

"تو دیکھ رہا ہے لاڈلے! سب باہر گئے ہوئے ہیں، میں اکیلا یہاں بیٹھا ہوں۔ آئیں گے تو پوچھ لوں گا۔ مالا انھوں نے دیکھی ہوگی تو جائے گی کہاں۔ تجھے واپس مل جائے گی۔" بجھل ناگواری سے بولا۔

"تم مجھے اُن کے پاس لے چلو۔ آؤ باہر چلو، ہم انھیں کہیں نہ کہیں تلاش کر لیں گے۔" میں نے بجھل کا دامن کھینچتے ہوئے کہا۔

"لاڈلے! اپنے اوسان ٹھیک کر۔ بالکل پاگل ہو گیا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ کچھ تو خیال کر، ہم اُن کے مہمان ہیں۔ ذرا تسلی رکھ۔ انھیں واپس آنے دے۔" بجھل کے لہجے میں ناراضی اور تلخی شامل تھی۔ "چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جا اور اُن کا انتظار کر۔" اُس نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"آہ، آہ۔" میں اپنا ماتھا پکڑ کے بیٹھ گیا۔ "میں کتنا کم بخت ہوں، کتنا کم ظرف ہوں، آہ بجھل بھائی! تم ٹھیک کہتے تھے، مجھے ہوش میں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے فہمیدہ سے بات بھی نہیں کی، کسی حکیم ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بجائے میں اُس کے پاس بیٹھا اُسے موت کے منہ میں دھکیلتا رہا اور میں نے اپنی مالا بھی کھو دی۔" میں گریہ کرنے لگا کیونکہ مجھے اپنی حالت پر کوئی اختیار نہیں تھا۔

بجھل حیرت زدہ تھا اور مجھے خاموش کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے پھر کوئی میرا عزیز مر گیا ہو۔ آہ، وہ مالا جو کبھی نہ کبھی کورا تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی تھی، جس کے لیے میں نے بدھ گیا میں ایک شخص کا خون کر دیا تھا، جو کورا کی غیر حاضری میں اُس کی حاضری کی حیثیت رکھتی تھی، جو میرے دُکھ سکھ میں شریک تھی، جس سے میں راتوں کو کھیلا کرتا تھا اور جس کے دانوں پر میں کورا کے نام کا ورد کیا کرتا تھا۔ جیل سے واپسی کے بعد وہ میرے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ کورا کی تلاش میں ناکامی کا احساس جتنا شدید ہوتا جاتا تھا، اتنی ہی وہ مجھے عزیز ہوگئی تھی۔ فہمیدہ خود تو گئی، مجھ سے میری مالا بھی چھین لے گئی۔ مجھے اپنا وجود حقیر محسوس ہونے لگا، جیسے میں غریب ہو گیا ہوں، جیسے میں مفلوج ہو گیا ہوں، جیسے ہجوم میں کورا کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا ہے۔

نہ جانے کیا ہوتا اگر اُس لمحے ماما اندر آکے بجھل کو یہ اطلاع نہ دیتی کہ بی بی جی اُسے اندر بلا رہی ہیں۔ بیٹھک میں کوئی اور مرد نہیں تھا۔ اس لیے بجھل نے خود جانے کے بجائے زریں کو وہیں بلا لیا۔ وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میں نے اُسے حسرت و یاس کی نگاہ سے دیکھا اور بے تابی سے کہا۔ "زریں! میری مالا کھو گئی۔"

"کیسی مالا؟" وہ آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بولی۔

"تم نے اُسے میری گردن میں دیکھا ہوگا۔ میں اُسے کُرتے کے نیچے چھپا کے رکھتا تھا۔" میں نے رقت بھری آواز میں کہا۔

"اس مالا میں ایسی کیا خصوصیت تھی جو تم اتنے پریشان ہو؟"

"تم نہیں جانتیں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "وہ امانت تھی، وہ ایک تحفہ تھی، وہ میرے لیے سب کچھ تھی۔"

"کیا بہت قیمتی تھی؟ بھلا کتنی قیمت ہوگی اس کی؟"

"اس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔"

"تمھیں کس نے دی تھی وہ؟" زریں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہ۔ وہ بس دی تھی ایک شخص نے۔ اس سے تم واقف نہیں ہو۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ پھر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ مجھے زریں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ "کیا؟ کیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھا۔ "کیا تم نے وہ دیکھی ہے؟"

"ہاں دیکھی تو ہے۔" زریں سرگوشی میں بولی۔

"کہاں؟ مجھے جلدی بتاؤ۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"پہلے انعام کا وعدہ کرو۔" زریں مسکرا کے بولی۔

"انعام۔" میں نے اضطراب میں کہا۔ "جو تم کہو گی، جو تم کہو گی زریں! کیا واقعی وہ تمھارے پاس محفوظ ہے؟"

"بابا! آپ گواہ رہیے، یہ انعام کا وعدہ کر رہے ہیں، منہ مانگا انعام۔" زریں بجّل کے قریب جا کے بولی۔

"میں نے سن لیا ہے بٹیا! لاڈلے! زبان سے مت پھرنا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں، میرے امکان میں جو کچھ بھی ہوگا، میں زریں کو دے دوں گا۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"بابا! دیکھیے، انھوں نے وعدے میں یہ شرط بھی رکھ دی۔"

"شرط نہیں زریں!" میں نے اداسی سے کہا۔ "میرے پاس رکھا ہی کیا ہے مگر میں تمھیں مالا نہیں لوٹا سکتا۔"

"میں اسے نہیں مانگوں گی۔" وہ شوخی سے بولی۔

"تو پھر جو جی چاہے، مانگ لینا۔"

"وعدہ ہے؟" زریں نے تکرار کی۔

"ہاں اب مجھے مالا دکھا دو، تمھارے پاس محفوظ ہے نا؟"

زریں نے اپنی اوڑھنی ذرا سی سرکائی، مالا اس کے گلے میں چمک رہی تھی۔ میرا جی چاہا، میں اسے اس کی گردن سے کھینچ لوں لیکن چند قدم چل کے رک گیا۔ زریں نے مالا اتار کے ایک بار غور سے دیکھی، پھر میری طرف بڑھا دی۔ مالا جب میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے اسے دیوانہ وار آنکھوں سے لگانا اور چومنا شروع کر دیا۔ زریں اور بجّل حیرت سے میری بے قراری دیکھتے رہے۔ پھر مجھے خیال آیا۔ میں نے تمتماتی ہوئی آواز میں زریں کو انعام طلب کرنے کی پیشکش کی۔ زریں کچھ تذبذب میں پڑ گئی اور شرمیلے لہجے میں بولی۔ "میں سوچ کے بتاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر کئی دن کی سرخی ایک ساتھ ابھری۔ بجّل کا قہقہہ بلند ہوا ہی تھا کہ وہ تیز قدموں کے ساتھ بیٹھک سے چلی گئی۔ میں اپنی مالا کے دانے گننے میں مصروف تھا اس لیے میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔

مالا کی گمشدگی اور بازیابی سے مجھے اپنی حالت میں ٹھہراؤ محسوس ہو رہی تھی۔ کورا کی یاد سے دل و دماغ میں ایک تازگی اور توا... ہوئی۔ میں اپنے آپ سے پشیمان ہونے لگا کہ میں تین چار دن کورا کے ... حاضری نہیں دے سکا جیسی حاضری کا سلسلہ اس سے پہلی ملاقات ... سے جاری تھا مگر یہ کیفیت بڑی لمحاتی ثابت ہوئی۔ جامو اور کبن ... آنے کے بعد میرے خواب پھر بکھر گئے۔ وہ آتے ہی فہمیدہ کا تذکرہ کر... کئی دن بھر کی گمشدگی کا حال سن کے میرا سر ندامت سے بوجھل ہونے ... تک انھیں چمپا بائی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ جامو نے اپنے آشنا... میں یہ شوشہ چھوڑ دیا تھا کہ نیلم جان اصل میں چمپا بائی کے کسی حکم ... کے دل برداشتہ ہو گئی تھی اور نتیجے میں اس نے چھلانگ لگا کے خود... جامو نے آج بھی پولیس والوں کو مجھ سے بازپرس کرنے سے روکے رکھا ... میرے سامنے فہمیدہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے تھے۔ رات ... گفتگو ہوتی رہی، لوگ آتے جاتے رہے اور جامو ہر ایک سے اس کی ر... اور تبصرہ کرنے کی تکرار کرتا رہا۔ میں اٹھ کے وہاں سے چلا آیا۔ بجّل ...

رات کو میں نے موقع پا کے حویلی کے گرد ایک چکر لگایا۔ ادھ... مکانات تھے تو ادھر درمیانی باغ کے بعد حویلی کی عمارت تھی۔ حویلی ... خاصی اونچی تھی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں سے فرار ... ناممکن ہے۔ ابھی میں نے پورا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ مجھے ... سائے رینگتے ہوئے نظر آئے۔ میں ٹھٹک کے ایک جگہ رک گیا۔ وہ ... ساتھی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بجّل میرے ارادوں سے پوری ... ادھر حویلی کے ملازم ہیں تو ادھر جامو کے ساتھی، بجّل کی نگاہ ہر جگہ ...

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ تیسرے دن بھی یہی۔ میرا خیال تھا کہ ... کب تک فیض آباد میں مقیم رہے گا۔ کلکتے میں موجدار کے قتل کا وا... تھا اور بجّل کی طویل غیر حاضری کو موجدار کے ساتھی کتنے ہی رنگ د... بجّل کو جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہیے تھا مگر وہ حیرت انگیز ... ٹھہرا رہا۔ اسے آئے ہوئے پانچ دن گزر گئے تھے۔ جامو پہ بتدریج ... بیزاری چھاتی گئی۔ میں نے اس دوران میں راتوں کے وقت کئی با... میں اٹھ کے حویلی سے باہر نکلنے کی تدبیر کی لیکن مجھے ہر بار ناکامی کا... جتنا وقت گزر رہا تھا، مجھ پر مایوسی کا غلبہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ میں ... وقت حویلی کے اندر ہی گزارنا شروع کر دیا تھا اور لوگوں سے با... کم کر دی تھی۔ زریں سے اب رسمی گفت و شنید رہ گئی تھی۔ وہ کھا... کھانا کھانے چلا جاتا، وہ سونے کو کہتی، میں بستر پر دراز ہو جاتا ... کرنے کو کہتی، میں کسی چون و چرا کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کرتا ... تر یہ مجھ سے ادھر ادھر کی بات کرنی چاہی، میری طرف سے کوئی ... ملا تو وہ بھی خاموش رہنے لگا۔ زریں کی آنکھوں میں اب ہمیشہ ...

...اس لیے میں نے اس کی جانب نظر اٹھانے کی بھی احتیاط شروع کر دی تھی۔

پانچویں دن شام کے وقت میں باغ کے سبزے پر لیٹا ہوا تھا کہ ایک ...ٹھے ملازم کے ذریعے بجّل نے مجھے بلایا۔ زریں نے بجّل کے رہنے کا انتظام ...یلی کے اس خاص حصے میں کیا تھا جو ایک زمانے میں اس کے باپ کے استعمال ...ں رہتا تھا۔ میں آہستہ قدموں سے جب اس کمرے میں داخل ہوا تو بجّل وہاں تنہا ...تھا اور ایک پلنگ پر فکرمند سا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے ایک کاغذ رکھا تھا۔ ...ڈلے!" اس نے گمبھیر آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "اب تو تو سب سے خفا معلوم ...وتا ہے۔"

"میں بات کیا کروں؟" میں نے چڑچڑے پن سے کہا۔

"تجھے مرچیں کھلانی پڑیں گی شہزادے! بات کرتا رہا کر۔ آدمی یہ جگالی نہ ...ے تو سارا معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔ لے ذرا یہ کاغذ پڑھ۔" اس نے کاغذ ...ے تھما دیا۔

"کیسا کاغذ؟" میں نے کسمساتے ہوئے اسے ہاتھ میں لیا۔

"دیکھ اس میں کیا لکھا ہے؟" بجّل سنجیدہ لہجے میں بولا۔

میں نے اسے کھول کے دیکھا۔ وہ کوئی قانونی دستاویز تھی، تازہ تازہ۔ ...ری نبضیں تیز ہو گئیں۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو میرے ہاتھ کانپنے ...لگے۔ زریں نے اپنی تمام جائداد، حویلی، زمینیں، سب کچھ میرے نام کر دیا تھا۔ ...یسے جیسے میں کاغذ پڑھتا جا رہا تھا، میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ زریں نے ...یر مشروط طور پر اپنی تمام جائداد سے دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ میری ...قل خبط ہو گئی اور میرے ہاتھوں میں کاغذ تھرتھرانے لگا۔

"کیا ہو گیا لاڈلے؟" بجّل نے میرا شانہ پکڑتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" میرا منہ کھلا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ مذاق نہیں ہے لاڈلے!" بجّل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں جانی! ان چیزوں کی ضرورت سب کو ہوتی ہے۔"

"میں یہ کاغذ پھاڑ دیتا ہوں، میں اسے جلا دوں گا۔"

"وہ کہتی ہے کہ اس کی نقلیں اس کے پاس موجود ہیں۔" بجّل نے ہنستے ...ہوئے کہا۔ "آج اس نے شہر کا بڑا وکیل بلایا تھا۔ اس نے مجھے بھی خبر نہیں ہونے دی۔ ...بس ابھی میرے پاس یہ کاغذ پھینک کے چلی گئی۔ میں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا کہ اس ...میں کیا ہو سکتا ہے مگر لاڈلے! اس نے اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں رکھا۔"

"سب اس کا ہے، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے کاغذ ...مڑ کے اس کی طرف اچھال دیا۔ "وہ کیا چاہتی ہے؟"

"لاڈلے! بٹیا نے تماشا کیا ہے۔ بٹیا نے ہم دونوں کا امتحان لیا ہے۔ اتنی ...جلدی فیصلہ مت کر، سوچ سمجھ لے۔"

"کیسا تماشا؟ کیا زریں ہمیں لالچی سمجھتی ہے؟"

"لالچی نہیں کوڑے! سمجھا کر۔ اس نے کچھ اور کہنا چاہا ہے۔ میں تو بٹیا کا منہ چوم لوں گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا، اس نے یہ کیوں کیا ہے؟"

"بٹیا کی نیت پر شبہ مت کر، نہ وہ ہمیں لالچی سمجھتی ہے نہ تم کو۔ یہ کاغذ بٹیا کے آنسو ہیں لاڈلے! یہ بٹیا کی زبان ہیں۔ تو نے پڑھا نہیں، اس نے کوئی شرط نہیں رکھی ہے۔ آج سے یہ سب تیرا ہے۔ تو بڑا مال دار ہو گیا ہے، جاگیردار ... لاڈلے! یہ مت سمجھنا کہ بٹیا نے تجھے تیری خدمت کا معاوضہ دیا ہے۔ اس کے دل میں کھوٹ نہیں ہے، اس نے خود کو ہماری عدالت میں پیش کر دیا ہے۔"

"میں اس سے بات کروں گا۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "لاؤ یہ کاغذ مجھے واپس کر دو۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔"

"لے۔" بجّل شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "ذرا احتیاط سے بات کرنا، غصے مت ہونا۔ اسے بھی غصہ آ سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میرے قدم رک گئے۔

"بٹیا کا تو نے اندازہ کر لیا، وہ کم عمر ہے مگر بڑی سوجھ والی ہے۔ اسے غصہ آ جائے گا تو وہ عمر بھر ہمیں رلاتی رہے گی۔ پھر فہمیدہ کی طرح تو اس کا بھی سوگ کرتا رہے گا اور اس لڑکی کی طرح بھی، جس نے تجھے غصے میں مبتلا کر رکھا ہے، جس کی مالا تیری گردن میں پڑی ہوئی ہے۔" میں نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگا۔ "اب ٹائم خراب نہ کر لاڈلے! جا بھاگ جا۔"

زریں کے پاس جاتے وقت میری چال میں پھرتی نہیں تھی۔ میں نے طے کیا، میں آج اسے سب بتا دوں گا۔ اس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں یہاں کیوں نہیں ٹھہر سکتا۔ میں نے بارہا اشارتاً اسے یہ بتانے کی کوشش کی تھی مگر وہ کیوں نہیں سمجھتی تھی۔ زریں شاید میری آمد کی منتظر تھی۔ میں جو سوچ کے گیا تھا، وہ دروازے پر قدم رکھتے ہی بھول گیا۔ اس نے غرارہ پہن رکھا تھا اور اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون چھایا ہوا تھا۔ ہونٹوں اور رخساروں سے گلابی رنگ چھلکا پڑتا تھا۔ آج اس کے بال بھی سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔ میری آمد پر جب وہ کھڑی ہوئی تو مجھے خوف آنے لگا۔ وہ ایک مکمل لڑکی، ایک آدمی بھی، اس کا قد نکلتا ہوا تھا جیسے ابھی اور بڑی ہوگی، آنکھیں غزالیں، چہرہ کتابی، رنگ گلابی تھا۔ وہ سانچے میں ترشی ہوئی تھی اور اس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ صرف یہ کہ اس کے قد اور جسم کے مطابق اس کی آنکھوں میں پختگی نہیں تھی، وہ کچی کچی تھیں اور یہ کچا پن اس کے چہرے پر بھی نمایاں تھا، جیسے اس کے چہرے پر ابھی ابھی تازہ گلابی رنگ چڑھایا گیا ہو۔ اسے دیکھ کے مجھے اکثر کورا کا دھوکا ہو جاتا تھا۔ وہ بھی اتنی ہی نئی نئی، کچی کچی، تازہ اور معصوم نظر آتی تھی۔

"زریں!" میں نے اسے مخاطب کرنے کی ہمت کی۔ "تم نے یہ کیا کیا ہے؟"

اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ "زریں میرے لیے یہ سب بے کار ہے، میں ان کا کیا کروں گا؟" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تمھیں بتایا تھا زریں! مجھے دور جانا ہے۔ نہ معلوم کتنی دور جانا پڑے۔ میں نے تمھیں بتا دیا تھا کہ میں کہیں نہیں ٹک سکتا اور اسی لیے میں نے تم سے فیض آباد آنے کے لیے اصرار کیا تھا اور تم نے

میری بات قبول کرلی تھی اب تم نے یہ کیا کردیا؟"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اس بہانے سے میں یہاں رک جاؤں گا؟ زرّیں! میں نہیں رک سکتا۔ میں نہیں رک سکتا، چاہے بجّل بھائی کتنے ہی پہرے لگائیں مجھے ایک دن یہاں سے جانا ہے زرّیں! میں نے تم سے کہا تھا کہ فیض آباد سے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمھیں بھول جاؤں گا، اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو میں ضرور واپس آؤں گا، کوئی میری بات نہیں سمجھتا، بجّل بھائی، جامو، کپتن خاں، کوئی نہیں جانتا۔ تم اُن سب سے علیحدہ ہو، کم از کم تمھیں تو میری بات سمجھنی چاہیے۔"

"تم نے یہ کیسے جانا کہ میں کچھ نہیں سمجھتی؟" اُس نے اپنی زبان کھولی۔

"پھر تم نے یہ حویلی میرے سر پہ کیوں لاد دی۔"

"اس لیے کہ میں اس کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی تھی، خدا کے لیے تم اس سے کچھ اور مطلب نہ لینا۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"مگر میں..... مجھے آگے جانا ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"تمھیں کوئی نہیں روک سکتا۔" اُس نے یاسیت سے کہا۔ "تم جانا چاہو گے تو ضرور جاؤ گے، میں تمھیں روک نہیں رہی ہوں، تم جاؤ۔" اُس کی آواز بھرا گئی۔

"زرّیں؟ زرّیں؟ میری اچھی زرّیں! مجھے اتنا بُرا مت سمجھو، میں مجبور ہوں ورنہ رک جاتا۔ تم یہ کاغذ واپس لے لو۔"

"دی ہوئی چیزیں واپس نہیں لی جاتیں۔"

"میں اس کا کیا کروں گا؟" میں نے پیچ و تاب کھا کے کہا۔

"تم یہ سب جلا دو، گرا دو، جو چاہے کرو، اسے بیچ دو اور فقیروں میں خیرات کر دو۔ مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"تو تمھیں ۔۔۔ تمھیں میرا کوئی خیال نہیں ہے؟"

"میں تم سے منت کرتی ہوں۔" اُس نے عاجزی سے کہا۔ "تم جہاں بھی جاؤ، مجھے اپنے ساتھ لیتے چلو، میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی، بس تمھارے ساتھ سفر کرتی رہوں گی، میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔"

"لیکن ۔ لیکن میں تمھیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"کیوں نہیں لے جا سکتے؟" وہ ناراضی سے بولی۔

"اس لیے کہ مجھے خود پتہ نہیں، مجھے کہاں جانا ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"زرّیں! تم نے ایک بار پہلے بھی میری بات مان لی تھی۔ یہ حویلی تم اپنے نام پر رکھو، جب میں واپس آؤں گا تو چاہے تم مجھے دے دینا۔ میں نے ترشی سے کہا۔ میں تو تم سے یہ کہنے والا تھا کہ تم مجھے کسی راستے سے یہاں سے باہر نکلنے میں مدد دو، جتنی دیر ہو رہی ہے میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے، میرے ساتھ ایک احسان کرو، میں تمھیں ضرور ساتھ لے جاتا زرّیں لیکن میں تمھیں اُن مشکلوں سے دوچار کرنا نہیں چاہتا جو مجھے پیش آسکتی ہیں، تم میرے لیے اس جائداد سے دست بردار ہو سکتی ہو مگر میری خوشی کے لیے کچھ نہیں کر[illegible]"

اُس نے نظر اُٹھا کے دیکھا، اُس کے نتھنے اُبھر گئے تھے اور ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ "جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔" اُس کی آواز پھٹ گئی۔ "[illegible] رات کو حویلی سے نکال دوں گی۔"

"زرّیں!" میں نے اُس کی جانب لپک کے کہا۔ "اس طرح [illegible] مت مخاطب کرو، مدد ہی کرنی ہے تو پھر خوشی خوشی مجھے رخصت کرو، اُس کی خوشامد کی۔" "کیا تم ۔ تم واقعی مجھے باہر نکال سکتی ہو؟ میں تمھارا زندگی بھر نہیں بھولوں گا، کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ خود تم نے مجھے [illegible] فراہم کیا ہے۔ زرّیں پھر تم میرے لیے دعا کرتی رہنا، تمھاری دعائیں [illegible] ہوں گی۔ امی کہتی تھیں کہ لڑکیوں کی دعائیں جلد ہی قبول ہوتی ہیں۔"

"میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔" وہ ٹھیک طرح کہہ نہیں [illegible]

"زرّیں! میں ضرور رک جاتا مگر کیا کروں؟ اگر رک گیا تو میرا [illegible] جو تم دیکھ رہی ہو میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔"

"تم ضرور جاؤ۔" اُس کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی، مجھے [illegible] گیا کہ اگر میں زیادہ دیر وہاں ٹھیرا تو زرّیں کی کیا حالت ہو سکتی ہے [illegible] چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔

شام کو حسبِ معمول فیض آباد کے تمام چاقو باز، لٹھ باز، [illegible] داداگیر اور پہلوان، استاد، شاگرد قسم کے لوگ بیٹھک میں جمع ہو گئے۔ اُن کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ لکھنؤ سے کپتن خاں کے کئی ساتھی آگئے تھے۔ جس جس کو معلوم ہوتا کہ اُستاد بجّل کلکتے سے فیض آباد آیا ہے، اُسے ایک طوائف چمپا بائی کی تلاش ہے، وہ اُسے دیکھنے اور سلام کرنے [illegible] پانچ روز گزر گئے تھے اور ابھی تک جامو نہ تو چمپا بائی کو تلاش کر [illegible] نواب سراج علی سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ بجّل کے [illegible] ہر وقت جامو کے ساتھی موجود رہتے تھے۔ کوئی اُس کے جسم کی مالش [illegible] پیر دباتا تھا اور کوئی اصرار کرتا تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ کلکتے لے [illegible] ہاں کرتا رہتا تھا۔ وہ شام میں نے بڑی بے چینی سے کاٹی۔ رات کا [illegible] نیسے کھایا گیا۔ رات گئے تک بیٹھک میں لوگ موجود رہے۔ میں زرّیں [illegible] ٹٹولنے کے لیے کئی بار اندر گیا تھا اور مجھے ہر بار مایوسی ہوئی تھی۔ [illegible] اور کھوئی ہوئی تھی کہ کوئی بھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ [illegible] بعض ساتھی بیٹھک کی فرشی نشست پر لیٹ گئے اور باقی رخصت [illegible] بجّل اپنے کمرے میں آگیا۔ میرے کمرے کا دروازہ بجّل کے کمرے [illegible] بجّل کے حقّے کی آواز آرہی تھی۔ رات کو زرّیں ماما کے ساتھ دو [illegible] ہوئے پہلے بجّل کے کمرے میں گئی پھر میرے پاس آئی۔ ماما دروازے [illegible] گئی تھی۔ جیسے ہی اُس نے دودھ کا گلاس میری مسہری کے قریب [illegible] پر رکھا، میں نے سرگوشی کی، "یاد ہے زرّیں؟"

اُس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں اور آہستگی سے کہا۔ "میں جاگ رہی ہوں۔"

"[illegible] میں تمھارے ساتھ ہی چلتا ہوں، بعد میں میرا آنا مشکل ہوگا۔"

[illegible] میں دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے کمرے کی روشنی دھیمی کر کے اُس کے [illegible] ساتھ باہر چلا گیا۔ بجّل نے بھی مجھے اُس کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا اور حقہ گڑگڑانے [illegible] میں نے گھڑی دیکھی، بارہ بج چکے تھے۔ زرّیں کے کمرے میں ہلکی روشنی ہو رہی [illegible] ملاتے ہی میں دوسری طرف چلی گئی تھی، میرا دل قابو میں نہیں تھا۔ زرّیں [illegible] زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا، میں شش و پنج میں مبتلا تھا کہ کہیں اُس [illegible] فیصلہ بدل تو نہیں دیا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے کس طرح حویلی سے باہر [illegible] سکتی ہے، کہیں وہ بجّل سے خوف زدہ تو نہیں ہوگئی، کہیں اُس نے شام کو [illegible] ہی تو نہیں کہہ دیا تھا۔ وہ الماری سے کپڑے نکال رہی تھی، یہ کپڑے اُس [illegible] ایک چرمی تھیلے میں رکھے۔ میری آنکھیں حیرانی سے پھٹنے لگیں۔ صابن کی ٹکیا [illegible] ایک چھوٹا آئینہ، منجن کی شیشی، مسواک، کسی دوا کی گولیاں، یہ سب رکھ کے [illegible] نے تھیلا بند کر دیا۔ پھر وہ ایک نفیس کمبل اُٹھا لائی۔ جب وہ یہ سب کام [illegible] تو اُس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر گھڑی پر ڈالی اور کچھ دیر بے حس و حرکت [illegible] رہی۔ میں نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن اُس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے [illegible] آتا تھا، کسی دلیل اور حجت سے بچنے کے لیے میں خاموش ہی رہا۔ جو کچھ مجھے [illegible] تھا، میں نے کہہ دیا تھا، اب اُسے بھی کچھ سُننے کی خواہش نہیں ہوگی۔ گھڑی [illegible] کے وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ دروازے سے باہر جھانک کے دیکھا اور مجھے اپنے [illegible] آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کی چال میں توازن نہیں ہے، [illegible] ہلکا سی رہی ہے۔ "زرّیں!" میں نے اندر کمرے ہی میں اُسے آہستہ سے مخاطب [illegible] "زرّیں! چند لمحے رک جاؤ۔"

وہ سکتے کی سی کیفیت سے دو چار دیوار سے جسم ٹکا کے ٹھیر گئی اور میری [illegible] ٹھیری ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ "زرّیں! تم نے میرا بہت خیال رکھا ہے [illegible] تمھیں کبھی نہیں بھول سکتا، نہ معلوم کیا حالات پیش آئیں، میری واپسی ہو [illegible] یا نہیں لیکن اگر زندہ رہا تو بہرحال ادھر آؤں گا۔ تم مجھے غلط مت سمجھنا، میں [illegible] نے سب کچھ سچ کہا ہے، میں تم سے جھوٹ بھی بول سکتا تھا۔ زرّیں! بس [illegible] خیال رکھنا، میں جب آؤں تو تمھارے چہرے پر فکر کی کوئی لکیر نہ دیکھوں [illegible] مجھے بہت یاد آؤ گی، اپنی صحت کا خیال رکھنا اور یہیں اس حویلی میں رہنے [illegible] کوشش کرنا، کہیں اور مت جانا، بجّل بھائی یقیناً کوئی اچھا انتظام کر دیں گے [illegible] رہی ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں۔" میں نے اُس کے بہت قریب جا کے کہا۔ وہ [illegible] جھکائے کھڑی رہی، کسی بات کا جواب نہیں دیا، نہ ہاں نہ ناں۔ "بولو زرّیں! [illegible] زرّیں نے اٹک اٹک کر لفظوں سے کہا۔ "تم میری غیر حاضری میں خوش رہو گی۔ [illegible] حالات کا جرأت سے مقابلہ کرو گی۔ تم ۔ تم مجھے یاد رکھو گی۔ بولو نا۔" میں نے اُس [illegible] بازو جھنجھوڑنے کے لیے ہاتھ اُٹھائے لیکن میرے ہاتھ اُٹھ کے اُٹھے رہ گئے۔ [illegible] اُس نے تھیلا اُٹھایا، کمبل اپنے شانوں پر ڈالا اور آگے بڑھ گئی۔ میرے دل میں آیا [illegible] اُسے انکار کر دوں لیکن یہ موقع نکل جاتا تو نہ جانے کب ہاتھ آتا، میں خاموشی سے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اُس نے دالان میں آ کے ایک نظر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا، حویلی میں سناٹا طاری تھا۔ زرّیں چند قدم آگے چل کے بائیں جانب مُڑ گئی۔ ایک تنگ جگہ سے گزر کے اُس نے ایک دروازے کو دھکا دیا، میں نے اُس کی پیروی کی۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا، زرّیں نے دیا سلائی جلا کے ایک موم بتی روشن کی تو کمرے کا منظر آنکھوں پر کھُلا، وہ قالین پر دبے دبے قدموں سے چلتی ہوئی ایک دوسرے دروازے سے کمرے سے باہر نکل گئی، دوسرے کمرے میں قدیم کتابیں الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں اور فضا میں ایک عجیب بُو پھیلی ہوئی تھی، کتب خانے کا دوسرا دروازہ باغ میں کھُلتا تھا، باغ میں جھینگروں کا شور غالب تھا اور جگنو چمک رہے تھے، ایک مختصر راستہ طے کر کے زرّیں باغ کے شمالی حصّے میں آگئی اور اُس نے پیچھے مُڑ کے دیکھا، میں نے بھی تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔

زرّیں نے ایک بار پھر گرد و پیش کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ پھر وہ گل دندوں کی باڑھ میں گھُس گئی، یہ جگہ سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ باڑھ کے اندر ایک چھوٹا سا صحن تھا، صحن کے آگے ایک کوٹھری تھی۔ زرّیں نے نہایت احتیاط سے کنڈی کھولی۔ باغ کے سکوت میں کنڈی گرنے کی ہلکی سی آواز سے ایک لمحے کے لیے خلل پیدا ہوا اور دروازہ ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ کھُل گیا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا، زرّیں نے دروازہ بھیڑ دیا اور دیا سلائی روشن کر کے موم بتی جلا دی۔ اُس کوٹھری کے اندر ایک اور مختصر کوٹھری تھی۔ جہاں کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا، مکڑی کے جالے دروازے اور دیواروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ زرّیں نے اس تنگ جگہ آ کے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازے کی لکڑی موٹی اور مضبوط تھی اور درمیان میں ایک بڑی آہنی بلّی کے ذریعے اُسے بند کیا گیا تھا، اندر سے ایک موٹی کنڈی بھی لگی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹا دروازہ پتھر کی طرح مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ زرّیں یہ دروازہ بھی خود ہی کھولنا چاہتی تھی، میں نے اُسے ایک طرف ہٹایا اور بلّی اُٹھانے کے لیے زور کرنے لگا۔ بلّی قبضے میں پھنسی ہوئی تھی تاہم میری ذرا سی جدوجہد سے ہٹ گئی۔ میں نے کنڈی کھولی اور آہستہ آہستہ دروازہ اندر کی طرف کھینچا۔ دروازے کی چولیں چٹخنے کی آواز کوٹھری میں اُبھری تو کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ زرّیں کی چیخ نکل گئی۔ دروازے کا پٹ کھُلنے کی اُمید پیدا ہوئی تو میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور زرّیں کی طرف دیکھنے لگا۔ زرّیں نے تھیلا آگے بڑھا دیا اور کمبل اپنے شانے سے اُتار لیا۔ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ سوچا کہ واپس ہو جاؤں۔ اس اندھیری رات میں زرّیں اکیلی کیسے اپنے کمرے میں واپس جائے گی، اُسے نیند بھی نہیں آئے گی اور پھر نہ جانے بعد میں اس کا کیا حال ہو۔ میں نے تھیلا اور کمبل زمین پر رکھ دیا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اُس کا چہرہ کبھی سُرخ ہوتا تھا، کبھی زرد۔ اُس کی آنکھیں کبھی روشن ہوتی تھیں، کبھی بجھ جاتی تھیں۔ میں نے تھیلا اُٹھا لیا۔ "میں جا رہا ہوں زرّیں!" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا حافظ۔" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

"میں واپس آؤں گا زریں!" میرا دل چاہا بڑھ کے اُسے دیوانہ وار گلے لگالوں۔ میرا سینہ جلنے لگا اور پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ "تم کچھ اور نہیں کہو گی؟" میں نے بد بدلتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ۔ ہوسکے تو خط لکھ دینا۔" وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولی "یہ رکھ لو۔" اس نے ایک بندھا ہوا رومال میرے آگے کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے اُسے جلدی جلدی کھولنا چاہا۔ اس کے اندر نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں اور ایک چاقو تھا۔ بڑا رام پوری چاقو۔

"زریں! اس کی ضرورت نہیں ہے یہی بہت ہے کہ تم نے مجھے باہر آنے دیا۔ مجھے تو کپڑوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں انھیں کہاں رکھوں گا کیونکہ میری کوئی منزل نہیں ہے۔"

"اسے رکھ لو مدد کرتے رہنا۔" اُس نے رقت سے کہا۔

"زریں!" میں آنکھیں مسلتے ہوئے بولا۔ "زریں! حوصلہ مت کھو دینا بس میری تم سے یہی التجا ہے۔ میں ضرور واپس آؤں گا زریں!" میں نے سامان اُٹھا لیا اور زریں کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے دروازہ کھول کے باہر نکل آیا، پھر میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔

❦

حویلی کے باہر ایک چوڑی گلی تھی۔ میں احتیاط سے گلی عبور کر کے دوسری جانب رینگ گیا۔ ہر سُو اندھیرا تھا اور میرے دماغ میں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ زریں کی حویلی سے نکل تو آیا مگر ابھی چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ دل پریشان ہونے لگا۔ زریں کا چہرہ اس اندھیرے میں بھی اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ باہر کی کھلی فضا بڑی حبس زدہ تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ کدھر جاؤں؟ کون سا راستہ اختیار کروں؟ کون سا راستہ کدھر کی طرف جاتا ہے اور کس ہاتھ پہ بابا جان نے ڈیرا جمایا ہوا ہے۔ میں ایک تنگ گلی میں داخل ہوگیا اور وہاں سے مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا کھلی سڑک پر آگیا۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنیاں اونگھ رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے چلتے چلتے مجھے ایک چوراہا نظر آیا۔ دور چھوٹے سے جھونپڑی نما ہوٹل کے جھروکوں میں سے روشنی کی کرنیں نکل رہی تھیں اور زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ وہاں دو تین تانگے بھی کھڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل میں جانے کے بجائے میں ایک تانگے کے قریب کھڑا ہوگیا۔ کچھ ہی دیر میں تانگے والا آگیا اور دزدیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کدھر جانا ہے بابو جی؟"

"کیا تم شہر کے تمام گلی کوچوں سے واقف ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی! ان سڑکوں پر تانگا چلاتے ہوئے عمر بیت گئی ہے۔ کہو کہاں جانا ہے بابو!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجھے نواب سراج علی کی حویلی جانا ہے۔" میں نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ وہ نواب کے نام پر جزبز ہونے لگا اور مجھ سے محلّے کا نام پوچھنے لگا۔ محلّے کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ ہوٹل میں پتہ پوچھنے کے لیے گیا۔ "چلو جناب تشریف رکھو۔ پردیسی معلوم ہوتے ہو؟" اس نے چابک اُٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ "کون سی گاڑی سے آئے ہو جناب؟"

"کسی گاڑی سے نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "باتیں کم کرو اور زیادہ چلاؤ۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔"

اُس نے پلٹ کے تُرشی سے دیکھا اور کہا۔ "اُتر جائیے جناب! ہم ... کی سواری بٹھاتے ہیں، میٹھے بول کے عاشق ہیں۔"

"میں نے کون سی کڑوی بات کہی ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔ "... آدمی میٹھے بول نہیں بول سکتا۔ میری طبیعت خراب ہے۔"

"تو یہ کہیے نا، کہیے تو پہلے کسی حکیم کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔"

"نہیں شکریہ، مجھے پہلے وہیں جانا ہے۔" میں نے اکتا کے کہا۔

"دولت خانہ کہاں ہے جناب کا؟" وہ گھوڑے پر چابک مارتے ہوئے ...

"رنگ پور۔"

"یہ کہاں ہے جناب؟"

"بنگال میں، راستہ کتنی دور ہے؟"

"اطمینان سے بیٹھیے، پہنچا دوں گا بابو جی، تین دن سے جانور دھُن کا تسکار ہے، یہ لفظ بھی بڑی بُری چیز ہوتی ہے۔"

اُس نے راستے بھر ایک لمحے کے لیے زبان بند نہیں کی۔ میں تند ... کا نتیجہ دیکھ چکا تھا اس لیے ہوں ہاں کر کے اُس کی باتوں کے جواب ... شاید ہر تانگے والا اتنا ہی بولتا ہے۔ گیا اور مراد آباد میں بھی یہی ہوا ... گھنٹے بعد تانگا ایک عمارت کے سامنے رُک گیا۔ یہ عمارت زریں کی حویلی ... نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا اور پہرے دار موجود نہیں تھا۔ میں نے جیب سے ... نکال کے تانگے والے کو دیے، وہ مجھے دعائیں دینے لگا اور کھڑا رہا۔

"تم اب جاؤ۔" میں نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی۔

"نہیں جناب! پہلے دروازہ تو کُھل جائے، تسلی کر کے جاؤں گا ... دروازہ نہیں کُھلا تو آپ رات کو کہاں ٹھہریں گے۔"

"دروازہ کُھل جائے گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ میں اُس کی ... میں حویلی کی چار دیواری کا چکر نہیں لگا سکتا تھا اور وہ جاتا ہوا نظر نہیں ... ناچار میں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ تانگے والا بھی میری مدد کو ... سونے والے پہرے دار کو گالیاں دینے لگا۔ خاصی دیر کی تگ و دو کے ... کسی نے آواز لگائی، جواب میں میں نے اپنا نام فتح علی بتایا اور خود کو سراج کا عزیز ظاہر کیا۔ تانگے والے نے میری جانب سے جواب دیا۔ "بابو ... سے آئے ہیں بے خبر میاں، دروازہ کھولو، ورنہ نواب صاحب کی ڈانٹ ..." دروازے کے بجائے کھڑکی کھولی گئی۔ اندر سے ایک معمر شخص جس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھوں کے سوا کچھ نہیں تھا، برآمد ہوا اور میرا ... جائزہ لینے لگا۔ "رنگ پور سے؟" اُس نے منہ بنا کے پوچھا۔ "بھلا آپ ... ہیں نواب صاحب کے؟"

"میں اُن کے لیے اپنے چچا کا خصوصی پیغام لے کے کلکتے سے آیا ..." نے بھاری آواز میں کہا۔ "نواب صاحب کو جگا دیجیے، پیغام نہایت ضروری ہے۔"

"نواب بہادر بیمار ہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "صبح آئیے۔"

"ارے گھر آئے مہمانوں سے ایسی باتیں کرتے ہو۔" تانگے والا ناراض ہوگیا۔ "نواب صاحب کو پتہ چلے گا تو کھڑے کھڑے حساب کر دیں گے۔"

"میں آپ کو مہمان خانے میں ٹھہرا سکتا ہوں مگر نواب بہادر سے ملاقات صبح ہی ہوسکتی ہے اگر اُن کی طبیعت ٹھیک ہوئی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جائیے جناب آرام کیجیے، سمجھ لیجیے گاڑی لیٹ ہوگئی۔ ہمیں ان دربان میاں کی تو خبر نہیں۔ بھلا فیض آباد میں نواب سراج علی کی حویلی کے پہرے دار ان کے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں۔ واہ میاں واہ، بابو جی کا چہرہ نہیں دیکھ رہے ہو، یہ بھی کسی شہزادے سے کم نہیں۔ ان کی طبیعت بھی خراب ہے چاچا۔" تانگے والے اور پہرے دار میں تُو تُو میں میں ہونے لگی تو میں نے دخل دے کے معاملہ رفع کر دیا۔ تانگے والا مجھ سے سلام دعا کر کے بڑی مشکل سے رخصت ہوا۔ پہرے دار دروازہ بند کر کے بڑبڑاتا ہوا مجھے عمارت میں لے گیا۔ عمارت سے خوش سلیقگی ٹپکتی تھی۔ نچلی ہی منزل پر ایک علیحدہ حصّے میں اُس نے مجھے ایک آراستہ کمرے میں پہنچا دیا۔ میں نے اُس کی خوشامد کی کہ وہ نواب صاحب کے کمرے تک چلے اور اُن سے درخواست کر کے دیکھے، وہ میرا نام سُن کے ضرور دروازہ کھول دیں گے۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے توبہ کرنے لگا۔ میں نے اُسے لالچ دیا تو وہ کچھ مشکوک ہوگیا۔ زریں نے مجھے جو چاقو دیا تھا، میں نے سوچا، وہی چاقو دکھا کے اُس سے نواب کے کمرے میں چلنے کے لیے اصرار کروں۔ ظاہر ہے، میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے منہ اندھیرے ہی فیض آباد سے دُور نکل جانا چاہیے تھا۔ ممکن ہے بجّن جاگ رہا ہو اور وہ تھوڑی دیر بعد میرے کمرے میں گیا ہو تو اُسے پتہ چلے کہ میں ابھی تک غائب ہوں۔ پہرے دار کے انکار پر مجھے غصّہ آنے لگا۔ اتنی بڑی حویلی میں کسی کی مدد کے بغیر میں نواب کا کمرہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ وہی میری مدد کرے۔ میں نے اُسے مختلف انداز میں نواب سے فوراً ملاقات کی اہمیت بتائی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ مجبوراً مجھے اُس سے سخت لہجے میں بات کرنی پڑی، اس کا اُلٹا اثر ہوا۔ اُس نے مجھے حویلی سے باہر نکلنے کا حکم دے دیا۔ میں نے اُس کا کاندھا پکڑ لیا۔ "چلو۔" میں نے اپنی جیب سے چاقو نکال کے کہا۔ "مجھے نواب کے کمرے میں لے چلو۔" اُسے مجھ سے ایسی سختی کی توقع نہیں تھی۔ پہلے تو وہ اپنی بات پر جما رہا لیکن جب میں نے اُس کے گال پر ایک ہاتھ رسید کیا تو گھگھیا کے آمادہ ہوگیا۔ "خاموشی سے چلے چلو۔" میں نے اُسے دھکا دیتے ہوئے حکم دیا۔

"جناب ہماری عمر بھر کی بنی بنائی خاک ہو جائے گی۔" وہ گڑگڑایا، پھر اوپری منزل کی سیڑھیوں پر ٹھہر کے بولا۔ "مجھے جان سے مار دیجیے مگر مجھ سے یہ نہیں ہوسکے گا۔"

"تم کسی بات کی فکر مت کرو۔ میں نواب صاحب سے تمہاری سفارش کروں گا، میں کسی بُرے ارادے سے نہیں آیا بڑے صاحب! مجھے یہاں ڈاکا نہیں ڈالنا، ڈاکا ڈالنا ہوتا تو میں تمہیں پہلے ہی ختم کر چکا۔ مجھے نواب سے ایک ضروری بات کرنی ہے، سمجھے! نواب صاحب مجھے دیکھیں گے تو تم سے خوش ہوں گے کہ تم نے فوراً مجھے اُن کے پاس پہنچا دیا۔"

"جناب ایسی کیا بات ہے جو آپ صبح تک نہیں رُک سکتے۔"

"مجھے جواب لے کے فوراً واپس جانا ہے۔"

وہ ٹھٹکتا اور جھجکتا رہا اور زینے پر چڑھ کے ہانپنے لگا۔ حویلی اندر سے سجی ہوئی تھی، جھاڑ فانوس سے آراستہ، دیواریں صاف و شفاف تھیں، ان تمام چیزوں سے نواب کے حُسنِ ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ اُوپری حصّے کے ایک کونے میں دوسرا پہرے دار لٹھ اور ٹمٹماتی ہوئی لالٹین سرہانے رکھے چارپائی پر سو رہا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ اُوپر کے حصّے میں بھی کوئی پہرے دار موجود ہوگا۔ ہماری آہٹ سے اُس کی آنکھ کُھل گئی اور اُس نے پھرتی سے لٹھ اُٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا سُنتا، میں نے اُس کا لٹھ والا ہاتھ پکڑ کے دوسرے ہاتھ سے گردن کی پُشت پر اتنی تیزی سے سیدھا وار کیا کہ وہ فرش پہ بے سُدھ گر گیا۔ اپنے ساتھی پہرے دار کا یہ انجام دیکھ کے نچلے حصّے کا پہرے دار کانپنے لگا۔ میں نے اُسے دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ اُوپر کے حصّے کے تمام کمروں کا راستہ غالباً اسی دروازے سے گزرتا تھا۔ بوڑھے پہرے دار نے چابیوں کا گچھا اُٹھا کے تالا کھولا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ نواب سراج علی باہر سے تالا لگوا کے سوتا ہے۔ یقیناً اُوپر کی عمارت سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہوگا مگر مجھے ان باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ پچاس پچاس قدم تک رہنمائی کرتا ہوا بوڑھا پہرے دار ایک محراب دار دروازے کے سامنے رُک گیا اور لرزتی ہوئی انگلی سے اشارہ کرنے لگا۔ میں نے دستک سے پہلے چند لمحوں تک غور کیا، کمرے کے دروازے کی شان و شوکت سے پتہ چلتا تھا کہ پہرے دار دھوکا نہیں دے رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُسے بھی فرش پر گرا دیا۔ بجّن نے یہ بے ضرر داؤ مجھے خاص طور پہ سکھایا تھا۔

میری معمولی دستک پر آنکھیں ملتے ہوئے سفید پاجامے اور کُرتے میں ملبوس گندمیں رنگ کے ایک پُروقار، بُردبار ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا، میرے ہاتھ میں بند چاقو چھپا ہوا تھا۔ میرا چہرہ دیکھ کے وہ ٹھٹک گیا۔ "نواب سراج علی!" میری آواز بھر بھرانے لگی۔

اُس نے تذبذب سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "آ۔ آپ! وہ سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔ "آپ کون ہیں؟"

"مجھے آپ سے ایک کام ہے۔" میں نے اپنی آواز پر قابو پا لیا تھا۔

"مگر، مگر اس وقت؟" اُس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"ہاں نواب صاحب! کام کی نوعیت ہی ایسی ہے۔"

"مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے لیکن میرے پاس یہی وقت تھا۔" میں نے انتظار کیا کہ وہ اندر آنے کو کہے گا، جب اُس نے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی گفتگو کرنا

چاہی تو میں اُسے ہٹا کے خود اندر چلا گیا۔ نواب سراج علی کو دیکھ کے چاقو پر میری انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی تھی، میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالے رکھا جا مو اور کپتن خاں نے فہمیدہ کے نام کے ساتھ اُس کا نام لیا تھا تو مجھ سے اُن کے سامنے سر نہیں اٹھایا گیا تھا۔ اب نواب سراج علی میرے سامنے کھڑا تھا۔ کاش میں اُس کی آنکھیں نکال سکتا ان آنکھوں نے فہمیدہ کو کن نظروں سے دیکھا ہوگا۔ وہ بظاہر ایک معقول اور سنجیدہ آدمی نظر آتا تھا۔ میری جسارت پر وہ حیرت اور برہمی سے میرا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور ایک ہاتھ سے چاقو اچھال کے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ بے ساختہ عمل یقیناً نواب کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہا ہوگا۔ نواب بوکھلا گیا تھا۔ پھر اُس نے اندر چلنے کے لیے ہاتھ پھیلا کے اشارہ کیا: نواب صاحب! مجھے آپ سے زیادہ بات نہیں کرنی، پہلے میں یہ واضح کر دوں کہ میں آپ کا مال و اسباب لوٹنے نہیں آیا ہوں میں ڈاکو نہیں ہوں۔"

"بیٹھیے بیٹھیے۔" اُس نے اضطراب سے کہا۔

"نواب صاحب! میں نیلم جان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"نیلم جان!" اُس نے چونک کر کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ہاں نیلم جان! مجھے معلوم ہے کہ آپ کے اُس سے خصوصی مراسم تھے۔" میں نے بہ مشکل تمام یہ لفظ ادا کیے: "میں اُسی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"

"نیلم جان!" اُس نے ایک سرد آہ بھری: "وہ تو روٹھ گئی۔"

"ہاں وہ وداع ہو گئی۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا اور کہتے کہتے کہیں کھو گیا۔ نواب کی کسمساہٹ پر مجھے ہوش آیا اور میں نے سنبھل کے کہا: "وہ مر گئی۔"

"آپ اُس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"نواب صاحب مجھ سے کچھ مت چھپائیے جو کچھ آپ نیلم جان کے بارے میں جانتے ہوں سچ سچ کہہ دیجیے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"آپ کون ہیں کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام پوچھ کے کیا کیجیے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا: "مجھے جلد ہی واپس جانا ہے مجھے نیلم جان کے بارے میں بتائیے آپ اُسے کب سے جانتے تھے آپ اُس کے بارے میں کیا کیا جانتے ہیں؟"

"یقیناً آپ کا تعلق محکمہ پولیس سے نہیں۔" نواب فاتحانہ لہجے میں بولا۔ "ازراہِ نوازش سکون سے بیٹھیے اور مجھے یہ بتائیے کہ آپ اُس کے بارے میں اتنے متجسس کیوں ہیں؟"

"نواب صاحب وقت ضائع مت کیجیے۔ میں جس طرح آپ کی حویلی میں داخل ہوا ہوں کچھ اس کا خیال کیجیے بہتر ہے آپ ہر بات بتا دیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سب میرے اور آپ کے درمیان رہے گا، میں آپ کی رسوائی کے لیے یہاں نہیں آیا، میرا کچھ اور مقصد نہیں ہے۔ بتائیے آپ اُس سے کب ملے؟" میں نے بے قراری سے کہا۔

"میری اُس سے کچھ زیادہ شناسائی نہیں تھی۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ آپ نے چمپا بائی سے متعدد بار اُس کا سودا کرنے کی پیش کش کی تھی۔"

"سودا مت کہیے۔" نواب نے بے چینی سے کہا: "یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی پیش کش کی تھی مگر میں اُسے عزت کی زندگی دینا چاہتا تھا۔"

"نواب صاحب للہ کچھ مت چھپائیے آپ کی غلط بیانی سے بہت کچھ بگڑ سکتا ہے۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ آپ بتائیں گے میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔ آپ نیلم جان کے بارے میں اور کیا جانتے ہیں؟"

"برادرم!" نواب گہری سانسیں لینے لگا۔ اُس نے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور دل شکستہ لہجے میں بولا: "میں آپ کو کیا بتاؤں، مجھے کچھ بتاؤں، نیلم جان ایک سربستہ راز تھی، جب سے اُسے دیکھا تھا کسی اور طوائف سے رابطہ قائم کرنے کو جی نہیں چاہا۔ وہ سب سے جدا تھی۔ خوب گاتی تھی اور بڑی باتیں کرتی تھی۔"

"کیا آپ کیا آپ اُس کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتے کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔ آپ نے اُس سے کبھی پوچھا تو ہوگا۔"

"پوچھا تھا" ان گنت بار پوچھا تھا لیکن وہ سرد آہیں بھر کے رہ جاتی تھی مگر جناب!" وہ جھجک کے بولا: "سوال یہ ہے کہ آپ کیوں اُس کے سلسلے میں سرگرداں ہیں۔ آپ کون ہیں، صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔ وہ ایک طوائف تھی، نہایت حسین نہایت نفیس عورت، اُس کی روح مجھ سے شاکی ہوگی اگر آپ اپنے بارے میں بتائیے۔"

"جناب! آپ فضول کی حجت کر رہے ہیں۔" میں نے تلملا کے کہا: "میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ میں آپ کو اپنے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے آپ سے نیلم جان کے سلسلے میں سب کچھ پوچھنا ہے کسی طرح بھی۔" میں نے اُچھلتے ہوئے بپھر کے کہا: "میں نیلم جان کا ایک ہمدرد ہوں۔"

نواب کی آنکھیں چمکنے لگیں: "میں سمجھ رہا ہوں آپ ضرور اُس کے ہمدرد ہیں، مرنے کے بعد لوگوں کو کون پوچھتا ہے کہیں آپ وہ شخص تو نہیں جس کی آغوش میں نیلم جان نے دم توڑا تھا۔ آپ کا چہرہ۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ کا چہرہ۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا: "آپ کا چہرہ نیلم جان ہے، آپ کی آنکھیں، آپ کی پیشانی۔ میں دعوٰی تو نہیں کر سکتا مگر کتنی شباہت۔ مجھے معاف کیجیے، مجھے معاف کر دیجیے، شاید میں نے دورانِ گفتگو نیلم جان کے متعلق کوئی ناروا بات نہیں کی ہے، پھر بھی آپ کے جذبات کو ٹھیس لگی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔"

"نواب سراج علی!" میں نے بلند آواز سے کہا: "میری بات کا یقین کیجیے۔ نیلم جان ایک طوائف تھی، وہ کوٹھے پر بیٹھ کے اپنے طلب گاروں کا دل بہلاتی تھی۔ وہ آپ کے عشرت کدے میں آتی تھی اُس کے متعلق بُرا مانا گیا۔ وہ طوائف ہی تھی۔"

"وہ طوائف نہیں تھی، وہ طوائف نہیں تھی، یہ اُس پر ایک تہمت ہے، ایک گالی ہے۔ میں نے زندگی کے چالیس سال گزارے ہیں۔ میں نے اتنی نفیس عورت نہیں دیکھی، اتنی ادائیں، اتنی نیک نفس، اُس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے میں اُسے اس حویلی کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ میری ایک بیوی تھی، وہ عرصہ ہوا اولاد کے بغیر مر گئی۔ اُس کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ نیلم جان سے ملاقات ہو گئی، میں نے اُس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت لگا دی تھی۔ وہ یہاں آ کے بھی طربیہ گاتی تھی، چمپا بائی کی وجہ سے وہ تو سارے وقت میری باتیں سنتی اور مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی، وہ میری صحت کے بارے میں فکر مند رہتی تھی، اُس نے مجھ سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ میں نے اُس سے بے شمار مرتبہ کسی فرمائش کے لیے کہا مگر اُس نے جواب میں ایک لفظ ادا نہیں کیا بلکہ وہ اس بات پر ناراض ہو جاتی تھی، چنانچہ میں نے اُس سے اس قسم کی باتیں کرنی ہی ترک کر دی تھیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ مجھ سے متاثر تھی۔ اور اُس کی موت کا واقعہ سن کے مجھ سے چلا نہیں جاتا، مجھ سے بات نہیں کی جاتی، اُس کا چہرہ ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا ہے۔" نواب کی آنکھیں نم ہو گئیں، گلے میں جیسے کوئی چیز پھنس گئی: "اب میرا دل باہر نکلنے کو نہیں چاہتا۔ وہ کیا گئی ہے کہ سب چین قرار لے گئی۔ مجھ میں اُس کے کفن دفن میں شریک ہونے کی ہمت نہیں تھی، میں اُس کی قبر پر مٹی بھی نہیں ڈال سکا۔ وہ میرے لیے کھانا پکاتی تھی میرا لباس منتخب کرتی تھی، وہ اس حویلی کی آرائش میں دلچسپی لیتی تھی۔" نواب کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

مجھ پر سناٹا چھا گیا، چاقو میرے ہاتھ سے زمین پر گر گیا اور مجھے اُسے اُٹھانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ میری آنکھیں بہہ رہی تھیں، دیر تک ہم دونوں میں کوئی بات نہ ہو سکی، پھر نواب نے اپنی کرسی میرے قریب کھینچ لی: "آپ اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" وہ کرب سے بولا۔

"آپ کو اُس نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کس گھر سے تعلق رکھتی ہے اُس کا گھر کہاں تھا، اُس نے کچھ تو بتایا ہوگا؟"

"نہیں، کچھ نہیں بتایا، میں نے اُس کا ماضی کریدنے کی بہت کوشش کی اس ذکر سے وہ اداس ہو جاتی تھی اور مجھے اُس کی اداسی گوارا نہیں تھی اتنا تب مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ قسمت نے اُس کے ساتھ کوئی بہت بڑا مذاق کیا ہے۔ اُس کا لہجہ وہ نہیں تھا جو بالاخانوں میں ہوتا ہے، وہ تو بڑی سادہ اور معصوم تھی۔ ایک بار۔ بلکہ صرف ایک بار کسی تقریب پر، شاید عید کے موقع پر نہ جانے کیسے اُس کی زبان سے نکل گیا تھا کہ اُس کا بھی ایک گھر تھا جو اُجڑ گیا۔ البتہ وہ اپنے ایک بھائی کو بہت یاد کرتی تھی جو گھر سے ناراض ہو کے چلا گیا تھا۔"

"اور کیا کہتی تھی وہ؟" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نواب نے مایوسی سے سر ہلایا: "کچھ نہیں عزیزم!" وہ افسردگی سے بولا: "مجھے کچھ اور نہیں معلوم۔ کچھ بھی نہیں معلوم۔"

میرا جی چاہا کہ اپنے گالوں پر طمانچے لگاؤں، نواب کو شاید میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا: "آپ۔ آپ کچھ کھائیں پئیں گے، میں تو بھول ہی گیا۔ اصل میں آپ......"

"شکریہ نواب صاحب! مجھے جانا ہے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی ایک بات اور بتا دیجیے۔ کیا چمپا بائی نے آپ کو کبھی اشارۃً یہ بتایا تھا کہ اُس نے نیلم جان کو کہاں سے حاصل کیا؟"

"نہیں، نائکائیں ایسی باتیں نہیں بتایا کرتیں۔"

"آپ کے خیال میں چمپا اُسے کہاں سے لائی ہو گی؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا، چمپا ایک مشاق نائکہ ہے، ممکن ہے نیلم جان براہِ راست اُس کے ہاتھ آ گئی ہو یا اُسے اُس نے کسی اور ذریعے سے حاصل کیا ہو، بات یہ ہے کہ شہر میں طوائفوں اور اُن کے طلب گاروں کے درمیان ایک غیر رسمی معاہدہ ہوتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کے ذاتی معاملات سے دلچسپی نہیں لیں گے۔ فیض آباد میں اپنی تھوڑی بہت عزت ہے، چمپا بائی نیلم جان کو چھپا کے یہاں بھیجتی تھی ورنہ شہر میں بڑی رسوائی ہوتی۔ بالاخانے پر بھی رفتہ رفتہ جانے سے شرفا گریز کرتے ہیں۔ میں اگر زیادہ تفتیش میں پڑتا تو چمپا بائی مجھ سے محتاط ہو جاتی اور اس طرح نیلم جان مجھ سے دُور ہو سکتی تھی۔"

"چمپا بائی شہر سے فرار ہو گئی ہے اور مجھے اُس کی تلاش ہے نواب صاحب! کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ مجھے کہاں دستیاب ہو سکتی ہے؟"

"آپ اُس سے مل کے کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں، میں اُس سے عاجزی سے درخواست کروں گا کہ مجھے وہ جگہ بتا دے جہاں سے اُس نے نیلم جان کو حاصل کیا تھا۔"

"مگر کیوں، اُس کی موت کے بعد اب آپ کو کیا حاصل ہوگا؟"

"آپ نہیں سمجھ سکیں گے اور آپ پوچھیے بھی نہیں۔"

"میں نے آپ کو اپنی ہر بات بتا دی ہے، کیا آپ مجھ پر اعتماد نہیں کریں گے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہم دونوں کا غم مشترک ہے مجھے بتائیے اور میری طرح یقین کیجیے کہ میں نیلم جان کو اُس کی موت کے بعد رسوا کرنے کی رذالت نہیں کروں گا۔"

"نہ پوچھیے، آپ کچھ مت پوچھیے۔" میں نے جھلّا کے کہا۔

"عزیزم! خیر آپ نہ بتائیے لیکن ایک بات تو طے ہے کہ اُس دن بالاخانے پر آپ نیلم جان کے سامنے موجود تھے۔ آپ کو دیکھ کے اُس کی غیرت کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور جب آپ پاگلوں کے مانند نیچے گئے تو اُس کی سانس اکھڑ گئی، سازندوں نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ اُس کا جنازہ کس گھر سے اُٹھا اور آپ کن لوگوں کے ساتھ بالاخانے تشریف لائے تھے۔ میں نیلم جان کا چہرہ نہیں بھول سکتا، آپ کی آنکھیں، آپ کا چہرہ، ساری کہانی خود بیان کر رہے ہیں۔ خیر جانے دیجیے۔" وہ پہلو بدل کے بولا: "میری نظر میں نیلم جان کوئی طوائف نہیں تھی۔ اُس سے میرے بہت سے جذبات وابستہ تھے۔ اُس کا کوئی عزیز میرے گھر آئے تو مجھ پر اُس کی پذیرائی لازم ہے، وہ میرا مہمانِ عزیز ہے۔ آپ یہاں قیام فرمائیے۔ میرے پاس رہیے، ہم دونوں مل کے چمپا بائی کو تلاش کریں گے۔"

"مہربانی نواب صاحب! خدا کے لیے اب کچھ اور مت کہیے، مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ چمپا بائی کہاں جا سکتی ہے؟"

"وہ کہاں نہیں جاسکتی۔" نواب نے بری مسکراہٹ سے بولا۔ "ہندوستان میں کسی جگہ بھی جاسکتی ہے۔ ہر جگہ اُس کا گھر موجود ہے۔"

"پھر بھی وہ اپنے شناساؤں کے سوا اور کہاں جائے گی؟"

"میں سمجھتا ہوں،" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "آگرے میں اُس کی ایک بہن ہوتیا رہتی ہے، وہاں جاسکتی ہے۔ زیادہ دُور جانے کا تو امکان نہیں ہے، وہ قریب کے شہروں میں کسی جگہ گئی ہوگی۔ ہاں وہ رام پور بھی جاسکتی ہے، وہاں کے نوابوں سے اُس کا تعلق ہوسکتا ہے۔ لکھنؤ تو وہ نہیں گئی ہوگی۔ ریاستوں میں اُس کے چھپنے کا زیادہ امکان ہے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔"

"مجھے اجازت دیجیے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔"

"جناب! میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا، آپ یہاں قیام کریں گے، آپ میرے مہمان رہیں گے اور میں آپ کے ساتھ شہروں شہروں خود چلوں گا۔"

"میں معذرت خواہ ہوں، میرے لیے ایک لمحہ گزارنا مشکل ہے، میں نے جانے کن دیواروں کو عبور کرکے آپ کے پاس آیا ہوں، صبح ہونے سے پہلے مجھے شہر سے نکل جانا ہے ورنہ میں پھر کبھی نہ جاسکوں گا۔ ازراہِ عنایت میرا راستہ نہ روکیے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" نواب ناراضی سے بولا۔ "آپ کے آنے سے تو میری طبیعت سنبھل گئی ہے، ہم رات کے وقت کسی دن یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ ایک آدھ دن تو سفر کی تیاری ہی میں لگ جائے گا، نہ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔"

"نواب صاحب! ابھی آپ مجھے جانے دیجیے، میں پھر فیض آباد آؤں گا اور آپ کے ہاں کئی دن قیام کروں گا۔ مجھے جانے دیجیے۔"

"دیکھیے جناب! چمپا بائی جن علاقوں میں ہوگی، وہاں کچھ اچھے لوگ نہیں رہتے، آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں ہے اور پھر ایسے عالم میں جب آپ کے ذہن پر غم کا بوجھ بھی ہو۔"

"نواب صاحب! میں جانتا ہوں، مجھے اپنے آپ پر کتنا جبر کرنا ہوگا۔"

"تو آپ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے۔" نواب شکایتی انداز میں بولا۔

"اصرار مت کیجیے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" نواب زچ ہو کے بولا۔ "اچھا ایک بات ہماری ضرور مانیے، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کس افراتفری میں سفر کررہے ہیں، میں آپ کو اپنا بھائی، اپنا عزیز سمجھ کر کچھ خدمت کرنا چاہوں گا، آپ انکار نہیں کریں گے کہ میں اُسے تسلیم نہیں کروں گا۔"

"دیکھیے میرے پاس کافی روپے ہیں۔" میں نے جیب سے نوٹوں کا رومال نکال کے اُسے دکھایا۔ "اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پھر بھی آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔" اُس نے اصرار کیا۔

میں نے مزید انکار یوں نہیں کیا کہ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور نواب آسانی سے ہار مانتا نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے دیوار میں نصب ایک تجوری کھول کے رومال میں نوٹ رکھے اور میری جیب میں ٹھونس دیے اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے کمرے سے باہر آیا۔ میں نے معذرت کے ساتھ اُس کے دونوں پہرے داروں کے

ساتھ پیش آنے والا واقعہ بتایا۔ دونوں پہرے دار ابھی تک زمین پر
نواب نے انھیں ہلایا۔ بوڑھا پہرے دار کچھ ہوشیار ہوا اور نواب کو میرے
کے پہلے تو اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور
گر گیا۔ نواب نے فی الفور بگھی تیار کرنے کا حکم دیا۔ میں نے انکار کر دیا
گئے نواب سراج علی کی بگھی سڑکوں سے گزرتی تو کئی نگاہیں اٹھتیں
یکہ نواب خود مجھے رخصت کرنے آیا۔ پہرے دار مہمان خانے سے
آیا تھا۔ نواب نے رخصت ہوتے وقت میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھا
چہرے پر بے شمار لکیریں کھنچ گئیں اور وہ فوراً پلٹ گیا۔ گلی میں آنے کے
کے کھڑکی بند کرنے کی آواز نے دُور تک میرا تعاقب کیا۔

میں اندازے سے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا، رفتار تیز تھی
ایک تانگا مل گیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، گاڑی چھوٹ چکی تھی اور میں
میں دوسری گاڑی کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ تانگے والے نے مجھے لاری
پر پہنچا دیا۔ صبح چھ بجے تک میں لاری کے اڈّے سے قریب سنسان جگہ
رہا، ٹھیک چھ بجے لاری روانہ ہوئی تب مجھے سکون ہوا۔ لاری رکتی
بجے لکھنؤ پہنچی۔ اس وقت لکھنؤ سے کوئی گاڑی آگرے کی طرف روانہ نہیں
تھی۔ میں پھر آگرے کی سمت جانے والی لاریوں میں بیٹھتا اُترتا رہا
طرح فیض آباد اور لکھنؤ سے دُور ہوتا گیا۔ بریلی اسٹیشن پر گاڑی میں
بجائے میں شہر میں اُتر گیا۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ ایک ہوٹل میں سامان
میں نے لباس تبدیل کیا اور تانگے کے ذریعے طوائفوں کے بازار پہنچ گیا
کا نام اعظم نگر تھا۔ رات کا وقت تھا، اعظم نگر میں سوناگاچھی اور
بازار کی طرح رونق تھی، پہلے تو میں چوڑی سڑک اور اُس سے ملحق
بنے ہوئے مکانات میں جھانکتا رہا۔ پھر مجھے جلد ہی احساس ہوگیا کہ
تو چمپا بائی کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ کچھ دروازے بند تھے اور گانے کی
رہی تھی۔ کچھ کھلے ہوئے تھے اور وہاں خوب صورت لڑکیاں انتظار
نچلی منزلوں پر میں کھلے ہوئے دروازوں میں جھانک سکتا تھا۔ میں وہاں
رہا، چمپا بائی کے بارے میں کسی سے براہِ راست پوچھنے میں اندیشہ تھا
میں دو تین بار ادھر سے اُدھر منڈلاتا رہا تو میں نے محسوس کیا کچھ
تعاقب کررہی ہیں۔ گردن میں شوخ رنگ کا رومال ڈالے ہوئے ایک
میرے قریب آکے چپکے سے کہا۔ "میرے ساتھ آئیے۔"

"کہاں؟" میں نے چونک کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"نزدیک ہی۔" وہ آنکھیں جھپکاتا ہوا بولا۔

میں نے چند لمحے سوچا، پھر اُس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے
میں لے گیا اور ہم کشادہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ایک بڑے کمرے
ہوگئے۔ کمرہ روشن تھا اور ایک خوب صورت، نوخیز لڑکی ساز ملا
کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے آتا دیکھ کے اُس نے سلام کے لیے ہاتھ

کے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ اُس کے پاس ہی ایک ادھیڑ عمر عورت
تھی۔ اُس نے اُٹھ کے مجھے قالین پر بٹھایا۔ میرا جی متلانے لگا۔ میں یہاں
اپنے نہیں آیا تھا لیکن اب یوں ہی واپس جاتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوتی
عورت نے مجھے پان کی گلوری پیش کی۔ لڑکی نے گانا شروع کیا۔ وہ گاتی
اور میں اپنے میں گم بیٹھا رہا۔ نہ میں نے اُسے داد دی نہ اپنے پاس بلایا،
دیے۔ اُس نے بے دلی سے جلد ہی غزل ختم کر دی اور حیرانی سے مجھے گھورنے
مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اب گا نہیں رہی ہے۔ ادھیڑ عمر عورت نے
نزدیک آکے پوچھا۔ "کیا سرکار کو غزل پسند نہیں آئی، نصیبِ دشمناں
مزاج کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔" میں نے کسمساہٹ سے کہا اور اُٹھ گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال
کے میں نے دس روپے کا نوٹ لڑکی کی طرف اُچھال دیا۔ وہ شخص اب بھی میرے
ساتھ تھا اور میری ناپسندیدگی کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ "مجھے کہیں اور لے چلو لیکن ضروری
نہیں کہ میں گانا بھی سنوں، میں تو چہرے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"چہرے۔" وہ تعجب سے بولا اور مسکرانے لگا۔ "اچھا میں سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھے؟"

"اے صاحب، آئیے میں آپ کو چہرے دکھاتا ہوں۔ یہ ایک دشوار
ہے مگر مجھے آپ کی خاطر کوئی نہ کوئی حیلہ بہانہ کرنا ہی ہوگا۔" وہ مجھے مختلف
خانوں پر لے گیا، کہیں محفل جمی ہوئی تھی، کہیں ہار سنگھار کیے لڑکیاں گنگنا
رہی تھیں، مجھے چمپا بائی کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ میرا رہبر زینوں پر چڑھتے اُترتے
جوڑ پھلانگتے تھک چکا تھا۔ میں کہیں ٹکتا ہی نہ تھا۔ "کیا
آپ کو کسی خاص لڑکی کی تلاش ہے؟"

"ہاں، پر یہاں وہ لڑکی نظر نہیں آئی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اُس کا نام کیا ہے؟"

"اُس کا نام۔" میں نے سوچ کے جواب دیا۔ "اُس کا نام چمپا ہے۔"

"چمپا! اس نام کی تو کوئی لڑکی اس بازار میں ہے نہیں۔"

"سوچ کے بتاؤ۔"

"نہیں جناب! اس بازار میں کون آتا ہے کون جاتا ہے، مجھے سب علم
ہوتا ہے۔ آپ نے خود دیکھ لیا کہ اپنی یاد اللہ سب سے ہے۔"

"یعنی تم نے چمپا نام کی کسی طوائف کا نام نہیں سنا؟"

اُس نے چند لمحے سوچ کے جواب دیا۔ "نام تو سنا ہے مگر مجھے یقین ہے
یہاں بہت دنوں سے اس نام کی کوئی لڑکی نہیں آئی۔"

"جو نام تم نے سنا ہے اُس کا چہرہ یاد ہے؟"

"مجھے چہرہ یاد نہیں آتا۔"

میں نے نوٹوں کی گڈی میں سے بیس روپے نکال کے دیے۔ اتنی
بڑی رقم دیکھ کے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ کہنے لگا۔ "ٹھیریے، میں ابھی
[illegible] پتہ لیتا ہوں۔"

"اس طرح مت پوچھنا، یوں کرو کہ پچھلے پندرہ دنوں کے اندر جتنی نئی طوائفیں اور اُن کی نائکائیں یہاں آئی ہیں، اُن کے نام پوچھ لو، چمپا آئی ہوگی تو خود پتہ چل جائے گا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے، ٹھیریے، میں ابھی پوچھ کے آتا ہوں مگر یہ آپ کی تسلی کے لیے ہے۔" وہ مجھے ایک جگہ ٹھیرا کے بھاگا ہوا گیا اور پندرہ بیس منٹ بعد منہ لٹکائے واپس آگیا۔ "چمپا بائی نامی ایک طوائف فیض آباد میں رہتی ہے مگر وہ تو نائکہ ہے اور صرف ایک ہی دفعہ بریلی آئی ہے۔"

وہ شخص اسٹیشن تک میرے ساتھ رہا، اتنی مختصر سی ملاقات میں وہ مجھے بے حد پسند کرنے لگا تھا اور اصرار کررہا تھا کہ میں ایک دو روز اور بریلی ٹھیروں، پھر وہ مجھے نینی تال لے جائے گا اور رام نگر کے جنگلات کے مناظر دکھائے گا۔ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر وہ مجھے چائے پلانے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل معمولی سا تھا، گیس کی لالٹین بھڑک رہی تھی، سیاہ دیگچیاں چولھوں پر بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں اور تین چار تپائیاں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں، ہوٹل خالی تھا، صرف ایک مزدور بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ چائے ہمارے سامنے آئی تو دو اور آدمی دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ڈیل ڈول میں بس غنیمت تھے لیکن چہرے مُہرے سے ٹھگ کے گروہ کے آدمی لگتے تھے۔ آتے ہی انھوں نے ایک تپائی کو ٹھوکر سے لوٹ دیا اور ہوٹل والے کو گالی دیتے ہوئے ہمارے برابر تپائی پر بیٹھ گئے۔

میں نے چائے کی پیالی اُٹھائی ہی تھی کہ ایک نے گالی کے ساتھ میری جیب پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لاسکا، تپائی سے زمین پر جا پڑا۔ دوسرے نے میرا تھیلا اپنے قبضے میں کرلیا اور کمبل دُور پھینک دیا۔ گرتے ہی میں نے ایک قلابازی لی۔ اس طرح میری جیب اُن کی دست بُرد سے محفوظ ہوگئی۔ میرا رہبر جس کا نام مُرلی تھا، تیزی سے مجھے سہارا دینے آیا لیکن اُٹھانے کے بجائے اُس نے میرے بازو اس انداز سے جکڑ لیے کہ مجھے ہاتھ چلانے میں دشواری ہوئی۔ اسی اثنا میں اُن بدمعاشوں میں سے ایک نے میرے گال پر زور سے مکا مارا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے مُرلی سے اپنے بازو چھڑانے کے لیے جدوجہد کی مگر مُرلی نے انھیں اور زور سے جکڑ لیا۔ مارنے والے نے ایک اور ہاتھ میرے منہ پر رسید کیا اور چاقو کھول کے مجھ پر تان لیا۔ مُرلی اُن کی خوشامد کرنے لگا کہ وہ ایک مسافر پر کیوں ظلم کررہے ہیں لیکن اب مُرلی کی چال بازی میری سمجھ میں آچکی تھی۔ میں نے ایک نگاہ میں چاقو کی پوزیشن اور چاقو بردار شخص کے تیور دیکھے۔ دوسرے کو میرے تھیلے سے رقم نہ ملنے پر بڑی مایوسی ہوئی تھی اور اُس نے غلیظ گالیاں دے کے تھیلا ایک طرف پھینک دیا تھا۔ وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح چاقو تان کے کھڑا ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ میں پینترا بدل کے مُرلی کو اپنے آگے کرتا، مُرلی نے میرے بازو چھوڑ دیے۔ "رقم نکالو۔" انھوں نے چاقو کچھ آگے کرکے مجھے حکم دیا۔

"میرے پاس کچھ نہیں، صرف سفر کا خرچ ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔ "خبردار جو ایسی ویسی حرکت کی، میں تم سب کو پکڑوا دوں گا۔" میں نے سوچ سمجھ کے

یہ جملہ ادا کیا تھا۔ وہ تعداد میں دو تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے۔ تیسرا بھی اُن کا ساتھی تھا، اُن پر یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ میں نے سادگی میں اُن کے چاقوؤں کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ چاقو مجھ سے دُور رکھیں گے، اُن کا مقصد مجھے خوف زدہ کر کے رقم حاصل کرنا ہے۔ وہ رقم حاصل کیے بغیر نہیں ٹلیں گے۔ رقم میں اُنھیں دے دیتا اگر مجھے ایک نامعلوم سفر درپیش نہ ہوتا اور چونکہ مجھے آگے جانا تھا اس لیے میں اُن سے کوئی بڑا جھگڑا مول لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ہوٹل کی جگہ تنگ تھی، یہ موجمدار کی عمارت نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر تپائیاں بھی راستہ روکے ہوئے تھیں، میری نظر بظاہر اُن پر مرکوز تھی لیکن تمام اطراف کا جائزہ لے رہی تھی، خون خرابے کا موقع نہیں تھا، مجھے جلدی سے آگے بڑھنا تھا۔

"نکالو رقم میرے تساہل پر ایک بار پھر انھوں نے گرج کر دھمکی دی۔

"جیب لوٹ دو ورنہ یہ چاقو تمھارے پیٹ میں اُتر جائے گا۔"

میں نے اپنا جسم سیکڑ لیا۔ "میں نہیں نکالوں گا۔" میں نے ضد کی اور کسی قدر خوف زدہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا۔ میرے سارے حواس جاگے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنی گردن پیچھے کی طرف کر لی جیسے میں گھبرا کے پیچھے ہٹنا چاہتا ہوں۔ میں انھیں یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ مزید خوف زدہ کرنے کے لیے چاقو والا ہاتھ کچھ اور آگے بڑھائیں، جیسے ہی انھوں نے میرے اندازے کے مطابق میرے پیٹ میں چاقو گھونپنے کا خوف پیدا کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا میں نے دائیں ہاتھ والے چاقو بردار کا پہنچا پکڑ کے بتق رفتاری سے بائیں طرف کھینچ لیا۔ میری تدبیر یہی تھی کہ اُس کا ہاتھ میری پہنچ، میری دسترس میں آجائے۔ جیسے ہی دائیں ہاتھ والے شخص کا پہنچا میری گرفت میں آیا، میں نے اُسے بائیں جانب کھینچا تو گھبراہٹ میں بائیں جانب والے شخص کا چاقو اپنے ساتھی کے کولھے میں پیوست ہو گیا کیونکہ وہ پہلے ہی چاقو بڑھا چکا تھا، میری تیزی سے نشانے پر خود اُس کا ساتھی آیا۔ پہلا ساتھی چیخ مار کے زمین پر لڑھک گیا پھر دوسرے کے ہاتھ پر قبضہ جمانے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے اُس کے پیٹ میں لات ماری اور چاقو اپنے قبضے میں کر لیا۔ دونوں زمین پر بلبلا رہے تھے۔ مُرلی بھاگ جانا چاہتا تھا مگر میں نے اُس کی گردن پکڑ لی اور اُسے اُس کے ساتھیوں کی طرف دھکیل دیا۔ وہ تینوں اُٹھ کے بیٹھ گئے تھے حالانکہ پہلے والا شخص تکلیف سے بلبلا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ "استاد! استاد!" وہ تینوں بیک وقت خوشامد کرنے لگے۔ "ہمیں دھوکا ہو گیا استاد!"

میں نے اپنا کمبل اور تھیلا اُٹھا لیا۔ بے ترتیب سامان درست کیا۔ مزدور یہ صورت دیکھ کے پہلے ہی بھاگ گیا تھا، ہوٹل والا کھڑا لرز رہا تھا۔ زخمی بدمعاش کو اُٹھا کے تپائی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اُس کے کولھے سے خون بہہ رہا تھا۔ زخم گہرا نہیں تھا۔ میں نے اِس کا خاص خیال رکھا تھا۔ اگر میں بائیں طرف دُور تک کھینچنے کے بجائے اسے اُس کے ساتھی کے سامنے کر دیتا تو چاقو پھسلتا ہوا نہ لگتا بلکہ کمر میں اندر تک گھس جاتا۔ اپنے زخمی ساتھی کو چھوڑ کے وہ دونوں اُس کے اشارے پر میری طرف لپکے۔ "استاد! معاف کر دو" وہ میرا دامن پکڑ کے بولے۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ انھیں حقارت سے دیکھتا ہوا ہوٹل سے باہر
مُرلی دُور تک میرے پیچھے آیا۔ میں اسٹیشن کی بنچ پر بیٹھ کے گاڑی کا انتظار
کرنے لگا۔ بریلی میں چمپا نہیں ملی اور میری بے خبری کا نتیجہ اس واقعے کی
میں نکلا۔ دلّی جاتے ہوئے درمیان میں مُراد آباد کا اسٹیشن پڑا۔ دل نہیں مانا،
مولوی صاحب اِس عرصے میں واپس آ گئے ہوں۔ ایک گھڑی کے لیے
دیکھ آؤں۔ سار جمند بیگم اور اُس کی بچّی کو بھی دیکھ آؤں گا۔ کوئی فیصلہ کرنے میں
گئی۔ گاڑی مُراد آباد اسٹیشن پر صرف بیس منٹ ٹھیری اور دلّی کے لیے روانہ
دلّی اُتر کے میں نے وہاں کے بازار میں چمپا کو تلاش کرنا شروع کیا۔ چمپا وہاں
نہیں ملی۔ چمپا کا ملنا آسان نہیں تھا، مجھے جن لوگوں کی تلاش ہوتی ہے وہ
نظروں کو فریب دے جاتے ہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں میں نے یہ سفر کس طرح گزا
مسافروں کی بھیڑ میں الگ تھلگ بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا تاکہ وہ مجھ سے
نہ کر سکیں۔ مجھے کسی کی بات اچھی نہیں لگتی تھی، سب جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔
آدمی خاموش رہتا ہے تو دوسرا اُسے بولنے پر کیوں مجبور کرتا ہے، مسافر
کا اتنا خیال کیوں نہیں رکھتے۔ میں گھٹنوں میں سر دیے اپنے آپ میں گم ہو
تھا مگر وہ مجھے سکون سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ کہاں سے آئے ہو، کیا کہتے ہو
حال ہے؟ میں اُن سے کیا کہتا کہ تم میں حال سننے کا حوصلہ نہیں ہے
سُننا چاہتے ہو۔ جب کوئی اسٹیشن آتا تھا میں اُتر کے مسافروں کے چہرے
کرتا تھا اور دیوانہ وار اسٹیشن کے چکر لگایا کرتا تھا کہ شاید کورا یا مولوی صاحب
آجائیں۔ مسافر مجھ پر ہنسا کرتے تھے۔

دن کے گیارہ بجے گاڑی آگرہ اسٹیشن پر ٹھیری۔ پلیٹ فارم پر قدم
ہوئے میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ چمپا اگر اپنی بہن موتیا کے ہاں بھی نہ ملی تو پھر
کہاں کہاں ڈھونڈوں گا؟ میں کس کس کو ڈھونڈھتا پھروں گا؟ مجھے موتیا
کے بالاخانے پر اچانک پہنچنا چاہیے تھا اور اس کے لیے موزوں وقت رات
تھا۔ دن میں وہ کسی اور جگہ کسی اور کمرے میں چھپی ہوئی ہو سکتی تھی لیکن رات
کے درمیان اُس کی موجودی کا امکان زیادہ تھا۔ اُس وقت دوسرے بالاخانے
اپنے کاروبار میں مصروف ہوں گے۔ دن کے وقت سب کی توجہ میری طرف
ہو سکتی تھی مگر مجھے ایک لمحے کے لیے قرار نہیں تھا لیکن میں نے رات تک خود
نہ کسی طرح یہ وقت گزارنے پر آمادہ کر لیا۔ بریلی میں بدمعاشوں نے جس انداز
پر حملہ کیا تھا، وہ یہاں بھی دُہرایا جا سکتا تھا، مجھے اپنے گرد و پیش سے بہت
رہنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنی ضرورت اب فہمیدہ کی موت کے بعد زیادہ محسوس
تھی، اِس ضرورت کا احساس مجھے نخبل نے دلایا تھا۔ دل میں آتا تھا کہ
جوانی کروں، بس کھلا چاقو لے کے پہنچوں اور جو سامنے آئے اُسے کاٹتا ہوا
بڑھتا رہوں، فہمیدہ میرا دل مسوستی رہتی تھی۔ کورا نے مجھے حوصلہ دیا تھا اور
وہ حوصلہ چھین لیا تھا۔

میں اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں ٹھیر گیا اور سہ پہر تک کمرے کا
دروازہ بند کیے بستر پر لوٹتا رہا۔ سہ پہر کو طبیعت بہت گھبرانے لگی۔ ایک
پل کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ میں ہوٹل سے باہر نکل آیا اور آگرے کی سڑکوں پر

مارا گھومتا رہا۔ جامع مسجد، تاج محل، فتح پور سیکری، اکبر کا قلعہ، آگرے میں بہت سی دیکھنے کی چیزیں تھیں، ہوٹل کا بیرا بہت اشتیاق سے اُن کا تذکرہ کرتا تھا۔ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی گائیڈوں نے مجھے گھیر لیا تھا مگر اُن میں کوئی گائیڈ ایسا نہیں تھا جو مجھے کورا تک پہنچا سکے جو میرے ابا جان کا پتہ بتا سکے۔

رات آگے نہیں دیتی تھی۔ ریلوے لائن عبور کر کے میں سیدھی سڑک پر ہو لیا۔ چلتے چلتے شہری حدود سے لمحہ بہ لمحہ دُور ہو رہا تھا۔ باغات شروع ہو گئے تھے۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے میں نے گہری گہری سانسیں لیں مگر اس طرح میری حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ آدھے گھنٹے تک میں اسی جگہ بیٹھا رہا، پھر جب سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا، اُس وقت میں نے چلنے کا ارادہ کیا اور شہر کی طرف واپس ہو گیا۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ایک جگہ ٹھٹک کے رُک گیا۔ سامنے سے اپنے مخصوص لباس میں بدھ راہبوں کا ایک گروہ آہستہ روی سے میری طرف آ رہا تھا۔ انھیں دیکھ کے میرا دل مچلنے لگا اور میری عقل میں نہیں آیا کہ میں انھیں کس طرح مخاطب کروں۔ میں لوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا رہا یہاں تک کہ وہ میرے قریب آ گئے۔ انھوں نے شاید میری بے چینی محسوس کر لی تھی، وہ ایک لمحے کے لیے رُکے، مسکرائے اور ہاتھ ہلا کے مجھے سکون کی تلقین کی اور آگے بڑھ گئے۔ بُدھ گیا میں جانگ قبیلے کا ایک شخص میرے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مجھے انھیں دیکھتے ہوئے بہت سے خوف محسوس ہوئے۔ جب وہ دُور چلے گئے تب مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اُن کا تعاقب شروع کر دیا، وہ آگے آگے تھے، میں خاصے فاصلے سے اُن کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ وہ تین راہب تھے اور ایک دوسرے سے بے نیاز اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ایک موڑ پر جا کے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے رفتار تیز کر دی لیکن میں انھیں دوبارہ نہیں دیکھ سکا۔ اس جگہ جمنا ندی قریب تھی اور علاقہ پُرسکون تھا۔ فاصلے پر سبزے سے ڈھکے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے، وہ موڑ کے قریب ہی کسی مکان میں چلے گئے ہوں گے جو مجھے نظر نہیں آئے۔ جمنا ندی پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی شفق پھیلی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارا پانی سُرخ ہو گیا ہو اور خون کا دریا بہہ رہا ہو۔ میں راہبوں کا ٹھکانا ڈھونڈ کے جانگ قبیلے کی گم شدہ کورا کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر سکتا تھا، شاید وہ مجھے کوئی ایسی بات بتا سکیں جس کا تعلق کورا سے ہو اور مجھے اُمید کا کوئی سرا مل جائے؟ اُن سے مل کے میرے دل کو تسلی ہو جاتی مگر نہ معلوم وہاں کورا تک بات آنے میں کتنی دیر لگ جاتی، اس لیے وہ جگہ ذہن میں رکھ کے واپس آ گیا۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ میں ضروری تیاری کر کے جلد از جلد وہاں سے نکلا اور میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی ہر ممکن تلقین کی۔ ہوٹل سے میں چھم چھم گلی کی جانب روانہ ہوا۔ آگرے کی اس گلی میں بریلی کے بازار سے زیادہ رونق تھی۔ یہاں مکانات قدیم طرز کے اور صاف تھے، بھیڑ بھی بریلی سے زیادہ تھی۔ بہت سے بالاخانوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور زیوروں سے لدی پھندی، رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس، دلھنیں بنی ہوئی نوجوان لڑکیاں اور عورتیں سڑک ہی سے نظر آجاتی تھیں۔ اُوپر کے بالاخانوں کی طوائفیں جھروکوں میں بیٹھی یا کھڑی ہوئی تھیں، میلے کا سا منظر تھا۔ پان والے اور گل فروشوں کی دکانوں پر لوگوں کے گروہ موجود تھے۔ جہاں گانا ہو رہا تھا، وہاں کے دروازے بند تھے۔ میں نے پان کا بیڑا خرید کے منہ میں چبایا۔ کلائی میں ہار لپیٹا تاکہ میری بدحواسی اور اجنبیت کا کسی کو احساس نہ ہو سکے۔ چمپا بائی اگر یہاں موجود ہو گی تو اُس نے اپنی آمد کی خبر مشہور نہیں کی ہو گی پھر بھی ممکن ہے، موتیا بائی نے احتیاطاً یہاں اپنے شناساؤں کو باخبر کر دیا ہو کہ کوئی اجنبی شخص اُسے پوچھتا ہوا آئے تو اُسے فوراً اطلاع دی جائے۔ میں چاروں طرف نظریں ڈالتا ہوا گلی میں اس انداز سے گھومتا رہا جیسے یہاں کے تمام گھروں سے واقف ہوں۔ چمپا بائی کی آنکھوں میں میری شکل محفوظ ہو گی، میری آنکھوں میں بھی اُس کی شبیہہ نقش ہو گئی تھی۔ چمپا کی بہن موتیا بائی کا بالاخانہ بھی یہیں کہیں ہو گا۔ کسی سے پوچھنے کے بجائے میں خود ہی اُسے تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اس مشکل کام کا تجربہ مجھے بریلی اور دلّی میں ہو چکا تھا۔ گلی میں بار بار پھیرے لگانا بھی مشکوک تھا۔ اس تمام احتیاط کے باوجود مُرلی کی طرح ایک شخص میرے پاس آیا اور رازدارانہ انداز میں بولا۔ "کوئی خدمت ہو تو بتائیے؟"

یہاں آ کے میرے پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ مجھے بُرے بُرے وسوسوں نے گھیر رکھا تھا، چمپا بائی سے ملاقات ہوئی اور اُس نے ابا جان اور گھر والوں کے متعلق کوئی اچھی خبر نہ سنائی تو مجھ سے اُٹھا کیسے جا سکے گا؟ بہتر ہے کچھ نہ سنوں اور یہیں سے واپس کہیں اور بھاگ جاؤں۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کے اُس شخص نے دوبارہ مجھے پیش کش کی، میں نے خود کو اُس کے سپرد کر دیا۔ وہ مجھے مختلف بالاخانوں پر لے گیا مگر چمپا بائی کہیں نظر نہیں آئی۔ جب ہم چوتھے بالاخانے سے اُتر رہے تھے تو میں نے تنگ آ کے اُس سے صاف صاف موتیا بائی کے بالاخانے پر چلنے کی فرمائش کر دی۔ "شوخی جان!" اُس کی مسکراہٹ مجھے زہریلی لگی۔ "میں حضور کو وہیں لے جانے والا تھا، شوخی جان پر تو ابھی پوری طرح جوانی بھی نہیں آئی کہ دُور دُور تک اُس کی خوشبو پھیل گئی مگر صاحب! اُس پر نقد مہنگی سجی رہتی ہے اس لیے میں کترا رہا تھا۔ آپ پہلے ہی کہہ دیتے۔" اُس نے آنکھ مار کے کہا۔ "آگرے کا ہیرا ہے، ایک تاج محل یہاں پہلے سے موجود ہے، دوسرا شوخی جان کا بدن ہے۔"

وہ مجھے ایک صاف ستھری کشادہ عمارت میں لے گیا۔ رنگ و روغن تازہ تازہ تھا۔ "یہ موتیا بائی کا ڈیرا ہے۔" جب اُس نے یہ بتایا تو میرے دل کی حرکت معدوم ہونے لگی۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا۔ "ذرا ٹھیرو۔ مجھے سانس لینے دو۔ میں اپنے حواس درست کر لوں۔" وہ تیزی سے زینے پھلانگنے لگا۔ زینے پر ہمارا کئی آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا۔ شوخی جان گا رہی تھی اور دروازہ بند تھا۔ لوگ مایوس واپس آ رہے تھے۔ میرے ساتھ موجود شخص نے بےبسی سے شانے اُچکا کے منہ بنایا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے اُسے اُوپر چلنے کا اشارہ کیا۔ اب انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ کنڈی لگی ہوئی تھی۔

جلد ہی اندر سے بھرے ہوئے جسم اور سُرمئی رنگت کی ایک عورت برآمد ہوئی، اُس کی عمر یہی کوئی چالیس سال ہوگی۔ "موتیا بائی! نواب صاحب بہت دور سے شوخی جان کا چرچا سُن کے آئے ہیں۔" میرے رہبر نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

میں نے اپنی جیب ٹٹولی، چاقو موجود تھا۔ عورت نے انکار میں گردن ہلائی ہی تھی کہ میں آگے بڑھ گیا اور اُسے دروازے سے ہٹا کے اندر داخل ہو گیا۔ درمیان میں چھریرے بدن کی ایک خوب صورت لڑکی دل کش آواز میں گا رہی تھی۔

اور ایک کونے میں پان دان کھولے چمپا بائی بیٹھی تھی۔

فرش پر نوٹ اور پھول بکھرے ہوئے تھے۔

محفل شباب پر تھی۔ چھریرے بدن اور گندمی رنگ کی ایک خوب صورت لڑکی تماش بینوں کے درمیان بیٹھی ہوئی گانا گا رہی تھی۔ اُس کی عمر بہت کم معلوم ہوتی تھی۔ میں دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو ایک طرف ہٹا کے اندر داخل ہوا تو لڑکی نے اپنی پلکیں اُٹھا کے ایک نظر مجھے دیکھا اور شرما کے اُس پستہ قد اور تومند شخص کی جانب متوجہ ہو گئی جو وہاں سب لوگوں سے نمایاں تھا۔ اُس نے میری آمد پر بُرا سا منہ بنایا اور کسمسا کے اپنے ساتھیوں سے ناگواری کا اظہار کیا۔ دروازہ کھولنے والی عورت نے ناچار مجھے ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اُس کی بات پر عمل کرنے کے بجائے چند لمحوں تک وہیں کھڑا رہا۔ میں نے پہلے سرسری نظر سے محفل کا رنگ دیکھا، پھر میری نگاہ چمپا بائی پر جم گئی۔ چمپا بائی پان دان کھولے گلوریاں بنانے میں مصروف تھی۔ اُس نے شاید مجھے دیکھا نہیں یا دیکھا ہوگا تو پہچانا نہیں تھا لیکن میں نے اُسے خوب پہچان لیا تھا۔ اُسے دیکھ کے میرے تن بدن میں چنگاریاں اُٹھنے لگی تھیں۔ جی میں آیا، بڑھ کے اُس کا گلا گھونٹ دوں اور جب تک اُس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نہ اُبل پڑیں، اُسے نہ چھوڑوں لیکن اس طرح آیا جان تک پہنچنے کی یہ آخری اُمید بھی ختم ہو جاتی۔ مجھے یہاں تک لانے والا شخص میری پُشت پر موجود تھا۔ اُس نے ٹھوکا مار کے مجھ سے آگے بڑھنے اور بیٹھ جانے کی درخواست کی اور سرگوشی میں کہا۔ "یہی تھا شوخی جان ہے، ذرا قریب جا کے دیکھیے، پنڈا کیسا دمک رہا ہے۔"

چمپا بائی کے ساتھ ایک اور عورت بھی بیٹھی تھی۔ وہ شاید اُس کی چھوٹی بہن موتیا بائی تھی۔ دونوں کی شکلیں ملتی جلتی تھیں۔ موتیا نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن جب اُس نے یہ محسوس کیا کہ شوخی جان کے بجائے میری نگاہیں مسلسل اُس کی بہن چمپا بائی پر مرکوز ہیں تو اُس نے سہمے ہوئے انداز میں چمپا کے کان میں کچھ کہا۔ چمپا نے ہڑبڑا کے دروازے کی جانب دیکھا، گلوری اُس کے ہاتھ میں جیسے جم گئی۔ اُس نے بدحواسی میں موتیا سے کچھ کہا۔ دونوں بے چین ہو گئیں۔ موتیا نے پان دان جلدی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ چمپا اُچھل کے اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے دائیں جانب کے کمرے کی طرف بڑھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی، میں محفل عبور کرتا ہوا سیدھا اُس کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں ایک دوسرا دروازہ بھی تھا، چمپا بائی بھاگ کے باہر جانا چاہتی لیکن مجھے سر پر دیکھ کے ایک کونے میں دبک گئی۔ وہ بُری طرح لرز رہی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے تھے۔ "تم کون ہو؟" اُس نے گھگھیائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو؟" میری آواز بھی کانپ رہی تھی۔ "تمھاری تلاش میں بہت دور سے آرہا ہوں۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"گھبراؤ نہیں، میں تمھیں مارنے نہیں آیا ہوں۔" میں نے نفرت سے کہا۔ "مجھے صرف ایک بات بتا دو کہ تم نے فہمیدہ کو کہاں سے حاصل کیا تھا؟"

"کون فہمیدہ؟ میں کسی فہمیدہ کو نہیں جانتی۔"

"تم فہمیدہ کو نہیں جانتیں؟" میں نے چیخ کے کہا۔ "تم نیلم جان کو نہیں جانتیں چمپا بائی؟ میں تمھارا خون پی لوں گا۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے مڑ کے دیکھا، موتیا دروازے میں کھڑی ہوئی شائستگی سے کہہ رہی تھی۔ "بیٹھیے، تشریف رکھیے۔ آپ کسی غلط جگہ آ گئے ہیں! یہ تو بالاخانہ ہے جناب اور یہ میری بڑی بہن ہے۔ بے شک ان کا نام چمپا ضرور ہے مگر کسی نیلم جان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ آپ کس نیلم جان کی بات کر رہے ہیں؟"

"موتیا بائی۔ چیلا پن مت کرو اور درمیان میں مت دخل دو۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "مجھے چمپا سے بات کرنے دو۔"

"اے میاں واہ۔" موتیا بائی ہاتھ نچا کے بولی۔ "منہ اُٹھائے گھر میں آئے، پھر اس پہ دیدے دکھاتے ہو، ہم بھی شرفا میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں! یہ کیسا دستور ہے، نہ محفل کا خیال، نہ کچھ عورت ذات کا پاس، چہرے مہرے سے تو خاندانی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کہہ جو دیا تم سے کہ ہم نیلم جان کو نہیں جانتے۔" وہ بگڑ کے بولی۔

"نہیں جانتیں!"

"ہاں نہیں جانتے۔" موتیا نے غصے سے کہا۔

"موتیا بائی! تم بات بڑھا رہی ہو۔" میں نے ضبط سے کام لیا۔ "جھگڑا ٹنٹا کرنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے تمھاری بہن چمپا بائی سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ اُس نے نیلم جان کو کہاں سے اور کن حالات میں اُٹھایا تھا۔ مجھے صحیح صحیح بتا دو۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"یہاں کوئی نیلم جان ولیم جان کو نہیں جانتا، اپنا راستہ لو۔" گرم ہو تا گیا۔ "باہر محفل جمی ہوئی ہے، عزت دار لوگ بیٹھے ہیں۔"

"چمپا بائی! میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" میں نے گرج کے کہا۔

"چمپا سے کیا بات کرتے ہو۔" موتیا نے پھر دخل دیا۔ "چمپا! اندر بیٹھیں اور اے میاں! جاؤ کسی اور بالاخانے پہ جا کے دستک دو۔ نیلم جان کا کہیں نہ کہیں ضرور پتہ چل جائے گا۔"

"چپ رہو۔" میں نے اُلٹے ہاتھ سے موتیا کے رُخسار پہ ایک طمانچہ رسید کیا۔ وہ چنگ پہ جا کے گری۔ سازندوں کے ساز، شوخی جان کے گھنگروں اور محفل کی ہماہمی میں موتیا کی آواز باہر نہ جا سکی۔ اُس نے آتے ہی احتیاطاً دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ [illegible] میں مجھے شہر کے بالاخانے پر اس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ محفل کے وقت کوئی بھی یہ دنگا فساد پسند نہیں کرتا لیکن موتیا بائی نے خود ہی پہل کر دی تھی۔ "چمپا بائی!" میں نے چند قدم آگے بڑھ کے کہا۔ "تم فیض آباد سے بھاگ کے یہاں پہنچیں۔ تم کہیں بھی جاؤ، تمھیں اس سے سروکار نہیں۔ فہمیدہ کی قسمت ہی خراب تھی۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ وہ بدقسمت لوگ تمھیں کہاں ملے تھے؟"

چمپا بائی کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ موتیا بھی طمانچہ کھا کے خاموش ہو گئی تھی۔ میں جب چمپا کے قریب پہنچا تو موتیا تیزی سے اُٹھ کے باہر نکل گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو چمپا نے دوسرے دروازے سے بھاگنا چاہا لیکن میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔" وہ درد سے بلبلا کے چیختی ہوئی بولی۔ "میں نے نیلم جان کو میسور سے خریدا تھا۔"

"میسور سے؟"

"ہاں میسور سے۔ میں نے اُسے پانچ ہزار روپے میں خریدا تھا، میں اُس کا گھر نہیں جانتی۔ میں اُس کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتی۔ میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ عاجزی سے بولی۔

میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "میسور میں تم نے کس سے اُسے خریدا تھا اور کب خریدا تھا؟ وہ تمھیں کس حالت میں ملی تھی؟"

"میں ایک ہوٹل میں ٹھیری ہوئی تھی کہ چند اجنبی لوگوں نے سودا کر کے اُسے میرے حوالے کر دیا۔" وہ رونے لگی۔ "لڑکی اچھی تھی۔ میں نے مول تول نہیں کیا اور نذرانہ [illegible]۔ پھر میں نے اُسی وقت میسور چھوڑ [illegible] تھا۔"

"یعنی تمھیں یہ نہیں معلوم کہ تم نے پانچ ہزار روپے کن لوگوں کو دیے اور اُن کے نام کیا تھے؟ تمھیں کچھ نہیں معلوم تھا؟ چمپا بائی! سچ سچ بتاؤ۔" میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں، نام تو اُن کے ضرور کچھ تھے، مجھے یاد نہیں رہے۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ اُن کا ایک آدمی میرے ساتھ آگرے تک آیا تھا۔ آدھی رقم میں نے اُسے یہیں دی تھی۔"

"جو شخص تمھارے ساتھ آیا تھا، کیا تم اُسے بھی نہیں پہچانتیں؟" میں نے ہاتھ اُٹھا کے چمپا کے گال پہ تھپڑ مارنا چاہا۔

"اُس کا نام بکرم تھا۔" چمپا جلدی سے بولی۔

"تم اُن کا ٹھکانا جانتی ہو؟"

"نہیں، میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ پیچھے ہٹ کے بولی۔ "پانچ سال گزر گئے۔ اس کے بعد میں میسور نہیں گئی۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"ٹھیک ہے چمپا بائی! تمھیں میرے ساتھ میسور چلنا ہوگا۔"

"میں۔ میں۔ نہیں۔" وہ ہکلانے لگی۔

"ہاں تم۔ تم۔ اور ابھی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تیاری کرو۔"

"کیسی تیاری؟" پیچھے سے اچانک کسی مرد کی آواز آئی۔ میرے پیچھے دو آدمی کھڑے تھے، اُن کے ساتھ موتیا بائی بھی تھی۔ یہ چہرے میرے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ ان چہروں پہ پھل اور موجدار کے آدمیوں کی چھاپ تھی۔ پچھلے سات ساڑھے سات برسوں سے میں انھی چہروں کے درمیان رہ رہا تھا۔ میرے تمام حواس انھیں پہچان چکے تھے۔ "کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" اُن میں سے ایک نے میرے سینے پہ ہاتھ رکھ کے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "دُور رہو، یہ میرا اور چمپا بائی کا معاملہ ہے۔ بہتر ہے تم لوگ درمیان میں نہ پڑو۔"

"موتیا بائی!" دوسرا شخص اب تک خاموش کھڑا تھا، اُس نے زبان کھولی۔ "اسے بتا دو کہ اس علاقے میں نوشے کے بغیر پتا تک نہیں ہلتا۔"

موتیا بائی نے اشتعال میں کہا۔ "سن لیا تم نے میاں! اب سیدھے سیدھے یہاں سے بھاگ جاؤ اور آئندہ اس طرف کا رُخ مت کرنا۔ اکیلی عورتیں سمجھ کے ہاتھ اُٹھایا تھا، ابھی نوشہ زندہ ہے۔"

"موتیا بائی! میں نے تم سے کہا تھا کہ بات مت خراب کرو۔ یہ نوشہ اور شہ بالا الگ ہی رکھو۔ چمپا بائی میرے ساتھ جا رہی ہے۔"

"چمپا بائی کہیں نہیں جائے گی۔" نوشہ کی بھاری آواز گونجی۔ "نوشہ کے بغیر یہاں سے کوئی سواری نہیں جاتی۔ ہر معاملہ پہلے نوشہ سے نمٹانا پڑتا ہے۔"

"ان گلیوں میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ نوشہ کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ نوشہ کو مت جگاؤ بیٹا! جیب میں پیسے ہوں تو ٹھنڈے ٹھنڈے تماشا دیکھو۔" نوشے کے ساتھی نے استہزا سے کہا۔

"دفع ہوتے ہو یا نہیں؟" نوشہ گرج کے بولا۔

"چمپا بائی! چلو۔" میں نے نوشہ کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔

"چمپا بائی نہیں جائے گی۔"

"چمپا بائی کو کوئی روک نہیں سکتا۔"

"تھو۔" نوشہ کے ساتھی نے منہ آگے کر کے فرش پر تھوک دیا۔ "کیا بکواس کیے جا رہا ہے سالے! اتنی دیر سے ٹرٹر کیے جا رہا ہے، یہاں سے نکلتا ہے یا اُٹھا کے پھینکنا پڑے گا؟" وہ گالیاں دیتا ہوا طیش میں میرے پاس آیا اور میرے جبڑے پر اُس نے مکا مارنا چاہا۔ میں اُن کے ساتھ کوئی جھگڑا مول لینے سے گھبرا رہا تھا اس لیے جیسے ہی اُس نے ہاتھ اُٹھایا، میں نے پھرتی سے اپنا منہ ایک طرف کر لیا۔ نوشہ کے ساتھی کا چھپتا ہوا ہاتھ میرے بازو پر پڑا۔ وہ جھونک میں کچھ جھکا اور ست پڑ گیا۔ میں نے اس لمحے سے فائدہ اُٹھا کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کسی تاخیر کے بغیر اُس کے پیٹ میں پوری قوت سے گھٹنا مارا۔ گھٹنا معدے کے منہ پر لگا تھا۔ نوشہ کا ساتھی بلبلا گیا اور پیٹ پکڑے ہوئے فرش پر لوٹنے لگا۔ میں نے اُس کے ساتھ احتیاط اس لیے نہیں برتی تھی کہ

نوشہ کے تیور اچھے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ ایک کو ناکارہ کر دیا جائے۔ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کے نوشہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے ایک بار پھر اُسے درمیان میں دخل نہ دینے اور اس معاملے سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا لیکن نوشہ نے اپنے نیفے سے اُسترا نکال کے کھول لیا تھا۔ میرا ہاتھ خالی تھا اور چاقو نکالنے کا وقت نکل گیا تھا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرنیچر کی وجہ سے جگہ بھی تنگ تھی۔ نوشے نے اتنا تو جان لیا تھا کہ میں کوئی اناڑی آدمی نہیں ہوں۔ غنڈے ہتھیار اُسی وقت نکالتے ہیں جب زبانی تنبیہ اور دوسرے حربے ناکام ہونے کا اندیشہ ہو۔ دونوں عورتیں باہر جانے والے دروازے کے پاس ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی کھڑی تھیں۔ موتیا کچھ دیر پہلے شستہ لہجے میں بات کر رہی تھی مگر اب گالیاں بکنے لگی تھی۔ چمپا بائی کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں چمپا بائی فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ دوسری طرف نوشہ اُسترا لیے پر تول رہا تھا۔ اُسترے کی تیز دھار روشنی سے چمک رہی تھی۔ یکایک اُس نے حملہ کرنے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں تیزی سے بائیں جانب ہٹ گیا لیکن اُس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اُس نے چشم زدن میں اُسترا دائیں ہاتھ سے اُچھال کے بائیں ہاتھ میں پکڑا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ بچتے بچتے بھی میرے ہاتھ پر اُسترے نے ایک لکیر کھینچ دی۔ اگر میں چند قدم پیچھے ہٹ کے اُس کے اچانک حملے سے نہ بچتا تو اُسترا میری بائیں پسلی کاٹتا ہوا گزر جاتا۔ پیچھے ایک بڑا صندوق رکھا تھا۔ میں اُس سے ٹکرا گیا۔ نوشہ نے ایک غلیظ گالی دی اور اُسترا تانے ہوئے دھمکیاں دیتا ہوا مجھ پہ دوبارہ جھپٹنے کے لیے پر تولے۔ نوشہ کو توقع نہیں ہوگی کہ میں اتنی جلدی زمین پہ بیٹھ جاؤں گا۔ اُدھر وہ بڑھا اِدھر میں بیٹھا۔ نتیجے میں نوشہ خود صندوق پر گرتے گرتے رہ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح اُس کا دوسرا حملہ میرے سر پہ ہوگا لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ میرے پاس صندوق سے ٹکرانے کے بعد اپنے بچاؤ کی ایک یہی صورت رہ گئی تھی۔ میں اُس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کے اتنی تیزی سے آگے کی طرف اُچھلا کہ اُس کا منہ صندوق پہ جا پڑا۔ اس طرح اُس کی ٹھوڑی شکستہ ہو گئی ہوگی اور نیچے کے کئی دانت ٹوٹ گئے ہوں گے۔ نوشہ اپنی چیخ نہیں روک سکا اور بوکھلاہٹ میں اُسترے پہ قابو نہیں رکھ سکا۔ اُس نے خود اپنی اُنگلیاں کاٹ لیں۔ میں نے اُس کی ٹانگیں نہیں چھوڑیں۔ وہ صندوق سے اُچھلتا ہوا فرش پہ آ گیا اور زمین سے اُس کا منہ ٹکرایا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ نوشہ کا پورا منہ چکنا چور ہو گیا۔ اُس نے اپنی ٹانگیں آزاد کرانے کی تھوڑی سی جدوجہد کی۔ میں نے اُس کی ایک ٹانگ مروڑ دی۔ وہ بھیانک کراہیں بلند کرنے لگا۔ میں اُس سے نمٹنے میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے موتیا اور چمپا بائی کے بھاگنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ وہ دونوں کمرے میں نہیں تھیں۔ نوشہ کا دوسرا ساتھی پیٹ پکڑے ہوئے فرش پر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اُس کی آوازوں میں نوشہ کی آوازیں بھی شامل ہو کے اور دہشت پھیلا رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ نوشہ کچھ دیر ضرور مزاحمت کرے گا مگر وہ تو بہت جلد اوسان کھو بیٹھا۔

صرف چند منٹوں میں کمرے کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ موتیا اور چمپا ابھی دُور نہیں پہنچی ہوں گی۔ میں نوشہ اور اُس کے ساتھی کو چھوڑ کر باہر کی طرف لپکا۔ اندر ٹین کا سائبان پڑا ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان ایک اور سجا ہوا کمرہ کھلا تھا۔ عموماً زینے والے مکانوں میں ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔ مجھے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چمپا اور موتیا اگر دیوار پھلانگ کے دوسرے مکان میں نہیں گئی ہیں تو اسی مکان میں ہوں گی۔ باورچی خانے کے قریب مجھے کوٹھری جیسا ایک کمرہ بند نظر آیا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے کچھ سننے اور جھریوں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آیا، نہ کوئی آہٹ محسوس ہوئی۔ ممکن ہے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ دوسرے مکان میں اُتر کے پولیس کو بلا لیں۔ اندر دو آدمی کراہ رہے تھے۔ ایک کا چہرہ لہولہان تھا۔ میرا کوئی گواہ نہیں تھا۔ یا تو مجھے فوراً یہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا یا پھر پولیس کے خطرے سے بے پروا ہو کے موتیا اور چمپا بائی کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تھا مگر ابھی دیر کتنی ہوئی تھی۔ میں انھیں نیچے راستے میں پکڑ سکتا تھا لیکن راستے میں پکڑنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ پوری سڑک پہ ہنگامہ ہو جاتا۔ میں سارے گھر میں کسی دیوانے کی طرح اِدھر سے اُدھر چکر لگاتا رہا۔ میرے قدم بار بار باورچی خانے سے ملحق کوٹھری کی طرف اُٹھتے تھے۔ اگر وہ دیوار پھلانگ گئی ہیں تو اس کے لیے انھوں نے کسی چیز کی مدد ضرور لی ہوگی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ دیوار کے ساتھ کوئی کرسی یا میز لگی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے بے تحاشا کوٹھری کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ لکڑی کا دروازہ ہلنے لگا۔ "باہر آ جاؤ چمپا بائی! آ جاؤ۔" میں نے چیخ چیخ کر کہا۔

کوٹھری کے اندر ضرور کوئی موجود تھا۔ کوئی چیز گرنے کی آواز سے میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے اور زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ "چمپا بائی! اگر تم باہر نہ نکلیں تو میں اس کوٹھری کو آگ لگا دوں گا۔ باہر آ جاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اگر تمھیں مار بھی دوں تو نیلم جان واپس نہیں آ جائے گی۔ میں تم سے صرف اُس کے گھر کا پتہ جاننا چاہتا ہوں۔" میں چیختا چلاتا رہا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے چمپا بائی! تم ہمیشہ کے لیے اندر رہو، میں باہر سے کنڈی لگا کے آگ لگاتا ہوں۔"

"نہیں، نہیں ٹھہرو۔" چمپا بائی نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ "میں باہر آ رہی ہوں۔" ساتھ ہی کوٹھری کا دروازہ کھل گیا اور اندر سے برآمد چمپا اور موتیا برآمد ہوئیں۔ اُن کے چہرے سفید ہو رہے تھے۔

"موتیا بائی! تم نے خواہ مخواہ زحمت کی۔" وہ دونوں اندر تڑپ رہی ہیں۔ چمپا کو معلوم تھا کہ میں فیض آباد میں اس کے بالاخانے پر کن لوگوں کے ساتھ پہنچا تھا۔ پھر بھی اس نے خیال نہیں کیا۔"

"نیلم جان تمھاری کون تھی؟" موتیا نے سہم کے پوچھا۔

"کیا کرو گی پوچھ کے؟" میری آواز بھر آئی۔ "میں اُس کا کچھ بھی نہیں۔ چلو چمپا بائی! دیر نہ کرو۔ میرا سینہ جل رہا ہے۔"

"ابھی؟ اسی وقت؟" چمپا بائی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"ہاں ابھی اور اسی وقت۔"

"مگر آپ سوچیے تو میاں! اس بات کو برسوں گزر چکے ہیں، نہ معلوم اب وہ لوگ وہاں موجود ہوں یا نہ ہوں۔" موتیا نے نرمی سے کہا۔

"تم پھر فضول باتیں کرنے لگیں موتیا بائی! مجھے چمپا بائی کے ساتھ چاہے دُنیا کے آخری سرے تک جانا پڑے مگر میں نیلم جان کے گھر کا پتہ ضرور چلاؤں گا۔"

"مگر چمپا باجی کو نیلم جان کے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔" موتیا بولی۔ "میاں! جذبات میں نہ آئیے، ہم توبہ کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کو پوچھنے میں غلطی کی۔ ذرا ایک دو دن ٹھہر لیجیے، ہم یہ اطمینان کر کے کیوں نہ چلیں کہ وہاں تک جائیں اور کچھ بات بھی نہ بنے، خواہ مخواہ طُول طویل سفر کرنا پڑے اور حاصل وصول کچھ نہ ہو تو فائدہ؟ آپ چاہیں تو یہاں ٹھہریں مگر یہ جگہ آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آپ یقیناً ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہوں گے۔ میں باجی کی طرف سے وعدہ کرتی ہوں کہ ہم کسی اور طرف نہیں نکلیں گے۔ آپ کے ساتھ ہی چلیں گے، جہاں تک بھی آپ لے جائیں۔ البتہ بالاخانے کا کچھ نہ کچھ انتظام کرنے میں ایک دو دن کی دیر لگے گی۔"

"موتیا بائی! تم نے پھر حیل و حجت شروع کر دی۔" میں نے غصے سے کہا۔ "تمھارے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف چمپا بائی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"اچھا میں باجی کو تنہا آپ کے ساتھ بھیج دوں گی میاں! آپ تنگ نہ کیجیے۔ ایک بار رنڈی کی بات کا بھی اعتبار کر کے دیکھیے۔"

"بس کرو۔" میں نے چمپا بائی کی کلائی تھام لی۔ "چلو۔"

موتیا بائی رونے لگی۔ چمپا کی حالت تو پہلے ہی ابتر تھی۔ "ہم نے نیلم جان کو اپنی بیٹی بنا کے رکھا تھا۔" موتیا سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ "اس کی موت کا جتنا دُکھ تمھیں ہے، اتنا ہی ہمیں بھی ہے۔"

"چمپا بائی تو اپنی بیٹی کے کفن دفن میں بھی شریک نہیں ہوئی۔ یہ کیسی ماں تھی جو اپنی بیٹی کی لاش سڑک پر چھوڑ کے چلی آئی۔ موتیا بائی! اپنی زبان بند رکھو۔ اگر اب تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو...." میں نے دوسرے ہاتھ سے چاقو نکال لیا۔

چاقو دیکھ کے موتیا کی زبان پر جیسے فالج گر گیا۔ وہ اپنے بال کھسوٹنے لگی۔ چمپا نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "مجھے جانے دو موتیا!" چمپا نے اُداسی سے کہا۔ "چلو میرا سامان نکالو۔"

موتیا دہاڑتی ہوئی اپنی بہن سے لپٹ گئی۔ "میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔" وہ بلکتی ہوئی بولی۔ "میں تمھیں اکیلی نہیں جانے دوں گی۔"

"میں چمپا بائی کے سوا کسی کو نہیں لے جاؤں گا۔" میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "اور کان کھول کے سن لو موتیا! اگر تم نے میرے جانے کے بعد کوئی بے وقوفی کی تو تمھاری بہن کبھی واپس نہیں آ سکے گی۔ سمجھیں؟ تم اپنے حمایتیوں کو بُلانے کا حشر دیکھ ہی چکی ہو۔ جلدی کرو، چمپا بائی کا سامان نکالو۔ اندر اُن دونوں کو تمھاری ضرورت ہے۔ اگر تم نے اُن کی جلد ہی خبر نہ لی تو بالاخانے پہ پولیس آ جائے گی اور تمھارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔"

موتیا نے ٹین کے ایک چھوٹے صندوق میں چمپا کا سامان بھر دیا۔ ایک مختصر بستر بھی جلد از جلد تیار کر دیا گیا۔ بستر میں چادر، تکیے اور کمبل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ موتیا، چمپا کے کپڑوں کے لیے اندر گئی تھی تو لگے ہاتھوں نوشہ اور اُس کے ساتھی کی درگت بھی دیکھ آئی ہوگی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت بوکھلائی ہوئی تھی۔ قدم رکھتی کہیں تھی، پڑتا کہیں تھا۔

باہر نکلتے وقت جب ہم اُس کمرے سے گزرے تو نوشہ کا چہرہ خون میں نہایا ہوا تھا اور اُس کا ساتھی ایک طرف بے ہوش پڑا تھا یا مر گیا تھا۔ نوشہ ابھی تک کلبلا رہا تھا۔ چمپا بائی کی سسکی نکل گئی۔ میں نے چمپا اور موتیا کو آگے کیا اور خود اُن کے پیچھے پیچھے چلا۔ دروازہ کھلا تو شوخی جان کی آواز آئی۔ سازندے سُروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شوخی جان ابھی تک اسی شخص کے پاس بیٹھی ہوئی شرما رہی تھی، گا رہی تھی۔ ہم دائیں جانب کے کمرے سے نکلے۔ موتیا نے صندوق اور چمپا نے بستر سنبھال رکھا تھا۔ محفل طے کر کے سامنے کے دروازے سے جانے کے بجائے سازندوں کی نشست عبور کر کے ہم دبے قدموں سے بائیں جانب کے کمرے میں آ گئے۔ یہاں آ کے چمپا نے برقع اوڑھا۔ اس کمرے سے بھی ایک دروازہ زینے میں کھلتا تھا۔ اس طرح ہم تماش بینوں کی نظروں میں آنے سے بچ گئے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے موتیا کو یہ مہلت نہیں دی کہ وہ چمپا سے کوئی بات کر سکے۔ موتیا نے اُسے ایک ٹہوکا دیا اور دونوں ایک بار پھر گلے مل کے رونے لگیں۔ "موتیا بائی! اپنی بہن کی زندگی پیاری ہے تو اس کی واپسی کا انتظار خاموشی سے کرنا۔" میں نے زینے سے اُترتے ہوئے موتیا کے کان میں دوبارہ یہ بات ڈالنی مناسب سمجھی۔

گلی میں کچھ دُور تک ہمیں پیدل چلنا پڑا۔ سڑک کے نکڑ پہ ہمیں ایک تانگا مل گیا۔ وہ شخص جو مجھے موتیا کے بالاخانے پہ لے گیا تھا، پھر کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے تانگے والے کو اپنے ہوٹل کا پتہ بتایا۔ چمپا کو تنہا تانگے میں چھوڑ کے ہوٹل جانا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اُسے بھی ساتھ لے لیا۔ ہوٹل کے لوگوں نے جب میرے ساتھ ایک برقع پوش عورت دیکھی تو اُن کی آنکھیں تلملانے لگیں لیکن میں نے اپنے کمرے میں آ کے بیرے کو فوراً بل لانے کی ہدایت کی۔ چمپا اس دوران میں خاموش بیٹھی رہی۔ بل ادا کرنے کے بعد اپنا مختصر سامان اُٹھا کے میں نے اسٹیشن کا رُخ کیا۔ آگرہ سٹی اسٹیشن پر جب میں چمپا کو ساتھ لیے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف جا رہا تھا تو چمپا نے مجھے مخاطب کیا۔ "میسور کا ٹکٹ مت لینا، بمبئی تک کا ٹکٹ لینا۔" میں ٹھٹھک کے رُک گیا۔

"چمپا بائی! صحیح صحیح بتاؤ، کہاں جانا ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "اور یہ بات جان لو کہ فرار کی کسی کوشش کا نتیجہ بہت ہولناک ہوگا۔ فیض آباد

میں سب کو معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ جا مو کو تو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ جوبات میں موتیا سے کہہ کے آیا ہوں' وہی تم سے کہتا ہوں۔ موتیا بھی جان سے جائے گی۔"

"میں نے تمھیں غلط بتایا تھا' فہمیدہ مجھے بمبئی میں ملی تھی۔" چمپا کے لہجے میں اب پہلے جیسی لرزش نہیں تھی۔

"اچھا تو بمبئی چلتے ہیں' تم جہاں جہاں کہو گی' میں وہاں وہاں جاؤں گا۔" میں اُس پہ نظر رکھے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اُس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کھڑکی سے معلوم ہوا کہ دلّی سے بمبئی جانے والی گاڑی ڈیڑھ بجے آئے گی۔ آگرہ سٹی اسٹیشن پر انتظار کا یہ ڈیڑھ گھنٹہ بہت مشکل سے کٹا مگر گاڑیاں میری خواہش کے بموجب کب آتی جاتی تھیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ بہت ہوتا ہے' ڈیڑھ گھنٹے میں موتیا اپنی رائے بدل سکتی تھی۔ وہ کچھ اور غنڈے اپنی مدد کے لیے طلب کر سکتی تھی یا پولیس بلا سکتی تھی۔ چمپا کی وجہ سے میں نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے تاکہ وہ میری نظر میں زیادہ سے زیادہ رہے۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ میں نے چاقو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ویٹنگ روم میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی درمیان میں آیا تو اُسے تم سے کم چمپا بائی زندہ نہیں ملے گی۔ میری بہن فہمیدہ کی رُسوائی اور موت کا یہ بہت کم خراج تھا مگر اُس کا بے غیرت مجبور بھائی یہی کچھ کر سکتا تھا۔ چمپا بائی نے نقاب چہرے سے ہٹا لی تھی اور سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے فہمیدہ کے بارے میں اُس سے بہت سی باتیں معلوم کرنے اور اُسے مارنے کی حسرت جبراً دبا رکھی تھی۔ گاڑی آنے میں پندرہ منٹ کی اور تاخیر ہو گئی۔ یہ پندرہ منٹ بھی کسی نہ کسی طرح گزر گئے۔ کاش میرے پاس پٹا ہوتا جو میں چمپا کی گردن میں ڈال کے اُس کی زنجیر ہاتھ میں پکڑے رہتا۔ گاڑی آتے ہی اسٹیشن پر بڑی افراتفری مچ گئی۔ میں نے چمپا بائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ قلی اُس کا صندوق اور بستر اُٹھائے ہوئے تھا۔ کمپارٹمنٹ میں صرف ایک مدراسی مسافر موجود تھا۔ پڑھا لکھا شخص معلوم ہوتا تھا۔ اُردو بہت کم جانتا تھا۔ اُس نے خندہ پیشانی سے ہمیں آمنے سامنے والی سیٹ دے دی اور خود اُوپر کی برتھ پر سونے کے لیے چلا گیا۔ میں نے چمپا بائی کو اشارہ کیا کہ وہ بستر بچھا کے آرام کرے۔ چمپا بائی دیر تک سیٹ پر بیٹھی رہی۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ "تم بھی سو جاؤ۔ میری طرف سے اطمینان رکھو۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے' سفر لمبا ہے چمپا بائی! سو جاؤ۔"

وہ ایک دو گھنٹے تک کھڑکی کی طرف منہ کیے ایک پہلو سے بیٹھی رہی پھر تھک کے برتھ پر لیٹ گئی۔ گاڑی مختصر وقفوں کے لیے مختلف اسٹیشنوں پر رُکتی رہی۔ میں تمام رات جاگتا رہا۔ چمپا بائی مل گئی تھی۔ وہ میرے اُجڑے ہوئے گھر کی طرف جانے والا راستہ تھی۔ میری آنکھوں میں ابا اماں کے چہرے گھومے ہوئے تھے۔ کفن میں رکھا ہوا فہمیدہ کا چہرہ بار بار سامنے آ جاتا تھا۔ چمپا بائی کی آنکھیں بند تھیں۔ میرے ہاتھ بار بار اُس کی گردن کی طرف اُٹھتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ نہ معلوم ابا جان کیسے ہوں' اماں کی موت اور فہمیدہ کی جدائی نے اُن کی کمر توڑ دی ہو گی۔ بس میں ایک بار وہاں پہنچ جاؤں' اُن کے پیروں پہ گر جاؤں گا اور بہن بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ جب تک میرے منہ پہ نہیں تھوکیں گے' سکون نہیں آئے گا۔

گاڑی آگرے سے بہت دُور آ چکی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے دُھندلے ہو گئے تھے۔ میں نے اُنھیں صاف کر کے باہر دیکھا۔ سورج نکل آیا تھا۔ چمپا بائی بھی اُٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔ نیند اُسے بھی نہیں آئی تھی۔ اُوپر مدراسی گہری نیند سو رہا تھا۔ صبح بھوپال کے اسٹیشن پر پوری ترکاری لے کے چمپا کے آگے رکھ دی۔ وہ ناشتہ کرتے ہوئے جھجکی۔ "تم نہیں کرو گے؟" آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں' مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔"

"مجھے بھی نہیں ہے۔"

"تھوڑا سا کھا لو' چائے پیو گی؟"

"ہاں' ضرور' چائے پلوا دو۔" اُس نے بوجھل آواز میں کہا۔

میں نے چائے والے کو آواز دی۔ گاڑی کے ساتھ چلنے والا بھی سامنے آ گیا۔ میں نے اُس سے ایک ٹرے لے کے چمپا کو دے دی۔ "تم کچھ نہیں لو گے' میرے ہاتھ کی چائے پیو گے؟" اُس نے کیتلی میں چینی کا ایک چمچہ ڈالتے ہوئے... میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ جی میں آیا کہ دل ہار... لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سرزنش کی۔ "میں ابھی چائے نہیں..." میں نے مختصر جواب دیا اور کھڑکی میں گردن ڈال کے پلیٹ فارم پر منتشر... لگا۔ اچانک میں اپنی سیٹ پر اُچھل گیا' کچھ دُور ایک فرلانگ سے بھی کم... مولوی صاحب جیسی صورت کا ایک شخص ٹی اسٹال پر کھڑا تھا۔ وہی قد... وہی شیروانی۔ میں بے چین ہو گیا۔ چمپا بائی کی طرف دیکھا' وہ چائے پی رہی... دروازہ کھول کے میں نے پلیٹ فارم پر بھاگنا شروع کر دیا۔ کئی مسافر... میں گرتے گرتے بچے لیکن میرے قدم کچھ فاصلے پہ جا کے منجمد ہو گئے۔ وہ مولوی صاحب کی شکل و صورت کا کوئی شخص نظر آتا تھا مگر قریب سے اتنا مختلف تھا کہ مجھے اپنے آپ سے ندامت ہوئی۔ بھلا اب مجھے مولوی... کورا کی صورت کیوں نظر آتی۔ میں تھکے ہوئے قدموں سے واپس آنے... تک پہنچنے کی کچھ نہ کچھ سبیل پیدا ہو گئی تھی مگر کورا نہ جانے کہاں کس... رہتی تھی۔ مجھے ہر سمت اُس کی آہٹ' اُس کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ اگر... بدھ بھکشوؤں کو دیکھ کے ایک موہوم سی اُمید پیدا ہوئی تھی' شاید انھیں... سے غائب ہونے والی لڑکی کورا کا علم ہو مگر موتیلے کے بالا خانے پر پیش... حالات کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ کورا کی فکر کرتا تو چمپا بائی پھر ہاتھ نہ... کہتی تھی کہ اُس نے فہمیدہ کو میسور سے حاصل کیا ہے' اب بمبئی کی طرف... تھی۔ چمپا کی بات اور ارادے کا کیا بھروسا تھا۔ یک بارگی مجھے گمان ہوا

نے میری غیر حاضری سے فائدہ نہ اُٹھا لیا ہو۔ میں دوڑ کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ میری سانس قابو میں آئی' چمپا بائی اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی۔ گاڑی بھوپال اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو چمپا بائی اپنی سیٹ سے اُٹھ کے میرے برابر آ گئی۔ پہلے یوں ہی کبھی کھڑکی میں جھانکتی' کبھی میری صورت تکتی رہی' پھر آہستگی سے اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اگر تمھیں یہ ڈر ہے کہ میں کہیں بھاگ جاؤں گی تو یہ بات دل سے نکال دو۔ میں تمھارے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔"

"تم اپنے حق میں بہتری کر رہی ہو۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "تمھیں یا تمھاری بدزبان بہن کو ڈھونڈنا میرے لیے اتنا مشکل نہیں ہو گا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ گاڑی چلتی رہی' پھر وہ کچھ دیر بعد مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "فہمیدہ تمھاری کون ہوتی تھی؟ وہ تمھیں دیکھ کے کیوں کود گئی تھی؟"

"میری شکل ہی ایسی ہے۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے' ماشاءاللہ تم لاکھوں میں ایک ہو' نوجوان ہو' وجیہہ ہو' اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو مجھے بتا دو' کم از کم یہ خیال کر کے کہ فہمیدہ سے میرا بھی کچھ تعلق رہا ہے۔"

"یہی تو دکھ ہے کہ فہمیدہ سے تمھارا تعلق کیوں رہا ہے چمپا بائی! تمھاری زبان پر اُس کا نام کیوں آتا ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"میاں' ہم بھی تو آخر انسان ہیں' قسمت قسمت کی بات ہے' کون چاہتا ہے کہ وہ محفل سجائے' لوگوں کی نگاہوں میں تماشا بنے' ہم سے اتنی نفرت مت کرو' ہمارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔"

"مجھے شبہ ہے مجھے چمپا بائی کہ تمھارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے' تم فہمیدہ جیسی لڑکی کو لے آئیں' فہمیدہ جس نے اپنے گھر کے مردوں کے سوا کسی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔"

"تم سچ کہتے ہو۔" وہ یاسیت سے بولی۔ "وہ اتنی ہی اچھی لڑکی تھی' مجھے بھی یہ دُنیا دیکھتے اور یہ کاروبار کرتے ہوئے ایک عمر گزر گئی ہے' میں نے اُس جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔ میں تم سے قسم کھا کے کہتی ہوں کہ فہمیدہ کوٹھے پر آ کے بھی اتنی ہی پاک باز تھی' جتنی اپنے گھر میں ہو گی۔ بڑے بڑے نوابوں رئیسوں نے پیش کش کی لیکن اُس نے سب کو ٹھکرا دیا۔ وہ بس ناچتی گاتی تھی' میں نے بھی اُسے نہیں چھیڑا۔ بہت دنوں بعد تو وہ ناچنے گانے پہ آمادہ ہوئی تھی۔ میاں! میں تمھیں خوش رکھنے یا تمھاری خوشامد کے لیے فہمیدہ کی اچھائیاں نہیں کر رہی ہوں۔"

"تم مجھے کیا یقین دلانا چاہتی ہو؟" میں نے اُداسی سے کہا۔ "یہ کیا کم ہے کہ وہ کوٹھے پر بیٹھتی تھی' یہ کیا کم ہے چمپا بائی!"

"میاں! میں اگر اُسے نہ لے آتی تو مجھ جیسی کوئی اور لے جاتی۔ وہ کم لڑکی کسی کے قبضے میں پہنچ گئی تھی' وہاں سے واپسی نہیں ہوتی' وہاں سے لڑکیاں اپنے گھر واپس جانے کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ انھیں یاد بھی رہتا ہے تو غیرت اُن کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتی ہے۔ فہمیدہ واپس نہیں جا سکتی تھی' میں نے تو اُسے بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا۔"

"بس چمپا بائی! بس کرو' مجھ پہ یہ احسان اور کرو کہ مجھے فہمیدہ کے گھر کا پتہ بتا دو۔ تم نہیں جانتیں تو مجھے اُن لوگوں سے ملا دو جن سے تم نے فہمیدہ کو حاصل کیا تھا۔ مجھے کچھ اور غرض نہیں۔ میں کچھ اور سُننا نہیں چاہتا۔"

"میاں! میں تمھارا دکھ محسوس کر رہی ہوں مگر مجھے تم نے بتایا نہیں کہ تم فہمیدہ کے کون ہوتے ہو؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"یہ ذکر چھوڑو چمپا بائی۔" میں نے اپنا منہ چھپا لیا کہ کہیں چمپا مجھے مجھل کی طرح پلک جھپکتا نہ دیکھ لے۔ اُوپر سے مدراسی بابو اُٹھ کے آ گیا تھا۔ انگریزی میں پوچھنے لگا' بھوپال گزر گیا یا نہیں؟ میں نے چمپا کے سامنے انگریزی بولنے سے گریز کیا' آگے نہ معلوم کیسے واقعات پیش آئیں۔ میں نے مدراسی کو اُردو میں جواب دیا کہ بھوپال گزرے دیر ہو گئی ہے' اب گاڑی وندھیاچل کے طویل پہاڑی سلسلے سے گزر رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے حیرانی جھلکنے لگی' وہ سوچ رہا ہو گا یہ کیسے لوگ ہیں جن کا سامان تھرڈ کلاس کے مسافروں کا سا ہے' انگریزی میں بات کرنا بھی نہیں جانتے۔ منہ ہاتھ دھو کے وہ فارغ ہوا تو سامنے کی نشست پر آ کر بیٹھ گیا اور ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں ہماری منزل کا پتہ پوچھنے لگا' وہ بھی بمبئی جا رہا تھا۔ کہنے لگا "یہ عورت تمھاری سسٹر ہے کہ مدر؟" چمپا بھی سمجھ گئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے جواب دینے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔ وہ بہت جھکی آدمی تھا' سمجھا کہ میں اُس کا سوال نہیں سمجھا ہوں۔ میں نے کہا یہ میری عزیز ہے۔ میں نے غلط بھی نہیں کہا تھا' وہ فہمیدہ کے رشتے سے میری بھی عزیز ہوتی تھی' فہمیدہ کو اُس نے اپنی بیٹی بنایا تھا اور میں کبھی فہمیدہ کا بھائی کہلاتا تھا۔

❋

ناگپور کے اسٹیشن پر قریب ہی کسی جگہ اُترنے والا ایک اور مسافر ڈبے میں سوار ہو گیا اور تھوڑی دیر میں مدراسی شخص سے گھل مل گیا۔ وہ دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ میرا خیال درست نکلا۔ مدراسی شخص نووارد مسافر سے اپنے شک کا اظہار کر رہا تھا کہ ہمارے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ بھی ہے یا نہیں' اُن کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ مدراسی شخص مدراس میں پولیس کا کوئی بہت بڑا افسر ہے۔ آنے والا شخص بھی حکومت کے محکمہ جنگلات کا بڑا افسر تھا۔ وہ دونوں چونکہ ہمارے بارے میں تخمینے لگا رہے تھے اس لیے بار بار ہماری جانب اُن کی نگاہیں اُٹھ جاتی تھیں۔ چمپا بائی اُداس بیٹھی تھی۔ شاید مدراسی افسر نے میرے اور چمپا کے درمیان ہونے والی گفتگو کی سُن گُن لے لی تھی۔ وہ پولیس افسر تھا۔ کان کھڑے رکھتا ہو گا۔ گاڑی کے شور میں اُوپر آواز پہنچنا حیرت کی بات تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا کہ نئے مسافر کے آنے سے پہلے مدراسی مجھ سے کیسی قربت کی باتیں کر رہا تھا۔ جیل میں ایک ہی جیسے لوگ رہتے ہیں مگر جیل کے باہر کی دُنیا کے لوگ ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوتے ہیں' خواہ مخواہ دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑاتے ہیں' نووارد

شخص نے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ اگلے اسٹیشن پر اُتر کے متعلقہ ٹکٹ چیکر کو ڈبے میں بھیج دے گا۔ پھر اصل بات خود بخود سامنے آجائے گی۔ میرے کان کھڑے ہوئے اگر چمپا کو کہیں یہ معلوم ہو جائے کہ پولیس کا ایک افسر اُس کے ساتھ سفر کر رہا ہے تو وہ کسی بھی لمحے بدل سکتی ہے۔ مدراسی افسر عورت کی بات سُنے گا، چمپا اُسے بہت بہکا سکتی ہے اور میرے بارے میں مبالغوں کا پٹارا کھول سکتی ہے اور کچھ نہیں ہوگا تو میرے قدم اور اُلجھ جائیں گے اور اگر کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے کلکتے کی جیل میں سات سال گزارے ہیں تو کسی کو بھی میری بات کی صداقت پر یقین نہیں آئے گا اور میں بات بھی کہاں کر سکوں گا۔ کیا میں پولیس کو یہ بیان دوں گا کہ میں چمپا کو اس لیے ساتھ لیے جا رہا تھا کہ وہ میرے گھر کا پتہ جانتی ہے جو میں خود نہیں جانتا۔ بہتر یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح جلد سے جلد یہ ڈبا چھوڑ دیا جائے مگر اس طرح مدراسی شخص کو مجھ پر اور شبہ ہو جاتا اب تک وہ مسافرت کی مروت کر رہا تھا۔

نو وارد شخص اگلے اسٹیشن پر اُتر کے ٹکٹ چیکر کو بھیجنا نہیں بھولا۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ ٹکٹ چیکر کے آنے کے بعد مدراسی افسر مجھ سے کسی قدر مطمئن ہو جائے گا۔ پھر میں کوئی بہانہ کر کے دوسرے ڈبے میں چلا جاؤں گا یا پھر کوئی بھی بات نہ بنی تو زریں کا دیا ہوا چاقو تو میرے پاس موجود ہی ہے۔ بات ختم کر کے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گا اور وندھیاچل کی پہاڑیوں میں گم ہو جاؤں گا۔ میں نے بہت سے منصوبے ذہن میں باندھ لیے۔

ٹکٹ چیکر نے استہزائی انداز میں ہم سے ٹکٹ دکھانے کا مطالبہ کیا۔ میں نے جان بوجھ کے بے نیازی اختیار کی۔ ٹکٹ جیب سے نکالنے میں دیر کی۔ مدراسی افسر مسکرانے لگا۔ جی میں آیا چاقو سے اُس کے موٹے سیاہ ہونٹ تراش لوں۔ ٹکٹ دیکھنے کے بعد ٹکٹ چیکر اور مدراسی دونوں کو مایوسی ہوئی۔ "کیا آپ ہی کے پاس سے نکلا جی گئے ہیں؟" ٹکٹ چیکر نے انگریزی میں پوچھا۔

"وہ جنگلات کے افسر ہیں۔" مدراسی نے کہا۔

"ہاں جی! آپ کو ان مسافروں سے کچھ پریشانی ہوئی جناب؟"

"نہیں۔" مدراسی نے تیزی سے کہا۔ "اصل میں ہم دونوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی کہ یہ لوگ ٹکٹ کے بغیر سفر کر رہے ہیں۔"

"یقیناً جناب۔" ٹکٹ چیکر نے ہمیں سرتاپا گھورتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "آپ کا شبہ درست تھا مگر صاحب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو دُھنیے چمار، تیلی، کمہار جس کے پاس چار پیسے ہیں، اُس کا بول بالا ہے۔ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ جناب کدھر جا رہے ہیں؟" مدراسی نے اُسے بتایا کہ وہ بمبئی جا رہا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ٹکٹ چیکر سے باتیں کرتے کرتے وہ ہماری طرف دیکھ کے کچھ متجسس سا ہو جاتا ہے۔ غرض اُس نے میری اور چمپا کی باتیں سُن لی تھیں۔ اُس نے اچانک اپنی اندرونی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور اُسے چپکے سے ٹکٹ چیکر کو دکھایا۔ ٹکٹ چیکر کے چہرے پر عاجزی اور گہری ہو گئی۔

"جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اُس نے گردن جھکا کے کہا۔

"کیا تم ان کے سامان کی تلاشی لے سکتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

ٹکٹ چیکر بچر مچر کرنے لگا کہ یہ اُس کا کام نہیں ہے۔ یہ تو ریلو[ے پولیس]
ہی کر سکتی ہے۔

"آپ کو ان پر کس قسم کا شبہ ہے صاحب؟" اُس نے تشویش سے پوچ[ھا۔]

"میری پوری زندگی پولیس میں گزری ہے۔" مدراسی نے غرور سے [کہا۔]

"ضرور جناب! آپ تو اُڑتی چڑیا پہچان لیتے ہوں گے۔" ٹکٹ چ[یکر] رشتہ خلطی ہو کے بولا۔ "اب تو مجھے بھی یہ معاملہ خاصا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔"

"بہرحال ابھی سفر طویل ہے، دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"کاش میں آپ کے ساتھ بمبئی تک سفر کر رہا ہوتا۔" ٹکٹ چیکر [حسرت] سے بولا۔ "میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ان کے متعلق کیا رائے قائم کی [ہے؟]"

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک پولیس افسر کو پہلے پوری تفتیش کرنی چا[ہیے] اس کے بعد ہی اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے۔"

"بے شک جناب! کیا اچھی بات کہی ہے لیکن آپ نے کسی بنا [پر] ہی تفتیش شروع کی ہوگی؟" ٹکٹ چیکر دبے لہجے میں بولا۔

"تمھیں پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔" مدراسی ادھیڑ عمر ٹکٹ چیکر کا [شانہ] تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "شک کی بہت سی وجوہ ہیں۔ لڑکا صورت شکل سے خاندانی معلوم ہوتا ہے لیکن بے حد اکھڑ ہے۔ عورت کی آنکھ عام عورتوں کی سی [ہے۔] دونوں میں کوئی تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے [ہوئے] ہیں۔ عورت کا لباس بھڑکیلا ہے، لڑکے کا بے حد سادہ۔ لڑکا بہت پریشان ہے، بیٹھے بیٹھے چونک پڑتا ہے، حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ[تا ہے] جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے۔ عورت بھی کھوئی ہوئی ہے مگر کچھ خوف زدہ ہے۔ لڑکے کے پاس صرف ایک تھیلا ہے۔ عورت کے پاس ٹین کا ایک [بکس] ہے اور چھوٹا سا بستر ہے، اتنے طویل سفر میں یہ مختصر سامان۔ ایسا معلوم ہوتا [ہے] جیسے انھوں نے بہت عجلت میں سفر کا ارادہ کیا ہو۔ فرسٹ کلاس کے [مسافروں] میں جو شائستگی، متانت اور رکھ رکھاؤ آپس میں عموماً ہوتا ہے، وہ ان میں [نہیں] ہے۔ جب لڑکا اس عورت کے ساتھ ڈبے میں داخل ہوا تھا تو میں نے اُس[کے] ہاتھ میں دبی ہوئی ایک چیز دیکھی تھی۔ وہ چیز چاقو کے سوا کچھ اور نہیں ہو سک[تی۔] سفر میں چاقو رکھنا ایسی معیوب بات نہیں مگر جس چابک دستی سے لڑکا اُ[سے] اپنے ہاتھ میں چھپائے ہوئے تھا، وہ کوئی ایسا شخص ہی پہچان سکتا ہے جس[کی] عمر میری طرح پولیس میں گزری ہو۔"

"غلط جناب غلط۔" ٹکٹ چیکر کا سر تیزی سے ہلنے لگا۔ "پولیس میں ہزاروں آدمی ہوتے ہیں۔ یہ کہیے کہ اُس کی نظر بھی آپ جیسی ہو۔ میں بہ[ت] حیرت زدہ ہوں صاحب!"

"اور بہت سی باتیں ہیں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے۔"

"اب آپ کا اگلا قدم کیا ہوگا جناب؟" ٹکٹ چیکر اشتیاق سے بولا۔

"میں ابھی کچھ اور تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکا ایک لمحے کے لیے بھی عورت [کے پا]س سے نہیں ٹلتا۔ میں کوشش کروں گا کہ عورت کو گفتگو پر آمادہ کر سکوں۔"

"سفر میں بھی آپ گویا ڈیوٹی پر ہیں، خوب صاحب خوب! اسٹیشن [قری]ب آرہا ہے، جی تو نہیں چاہتا مگر مجھے بھی ڈیوٹی کے لیے اُترنا ہوگا۔ جب [تک م]یں ساتھ ہوں یہاں آتا رہوں گا، آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہو تو بے تکلف [کہیے]گا۔" ٹکٹ چیکر نیاز مندی سے بولا۔ مدراسی افسر نے اُسے اپنا کارڈ دیا اور [کہا] ایک اہم مشن پر اُس کا تقرر کچھ دنوں کے لیے بمبئی ہو گیا ہے۔ اگر اُس کا [کبھی] بمبئی یا مدراس سے ہو تو وہ ضرور ملے۔ دونوں میں بڑی محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔ [م]یں گونگے اور بہرے کی طرح سُنتا رہا۔ مدراسی افسر نے ٹکٹ چیکر سے [میرے] اور چمپا کے بارے میں جو باتیں کی تھیں، اُن کا مجھے خود اندازہ نہیں تھا۔ آنے [والے] لمحوں میں وہ کوئی بھی ارادہ کر سکتا تھا۔ مجھے اسی ڈبے میں سوار ہونا رہ گیا تھا۔ [چمپا] بظاہر تمام باتوں سے بے خبر کبھی گردن جھکائے، کبھی کھڑکی سے باہر بھاگتی [ہوئی پہاڑ]یاں دیکھتے ہوئے ان کی باتیں سُنتا رہا۔ ٹکٹ چیکر جانے والا تھا۔ مدراسی افسر [کا شب]ہ پھر ہماری طرف مبذول ہو جائے گی اور اگر مجھ سے یا چمپا سے کوئی غلطی ہو [گئی تو ا]ُس کا شبہ اور توانا ہو جائے گا۔ اب اپنی اس کوتاہی پر پشیمان ہونے سے [ک]یا ہو سکتا تھا کہ میں نے مدراسی افسر سے انگریزی کیوں نہیں بولی۔ میرا دماغ [خ]راب ہو گیا تھا۔ جھل بھی یہی کہتا تھا مگر میں کیا کروں، جب مجھے اُس کی یاد [آتی ہ]ے اور گھر یاد آتا ہے تو کچھ خیال ہی نہیں رہتا۔

اس موقع پر ڈبا بدلنا مناسب نہیں تھا۔ ٹکٹ چیکر چلا گیا تو میں نے [اسٹیشن پر]ے کچھ پھل خریدے اور چمپا کو تھما دیے کہ وہ انھیں کاٹ دے۔ ساتھ ہی [میں] نے چائے منگوائی، چمپا نفاست سے امرود اور سیب کی قاشیں بنانے لگی۔ [گاڑی چ]لنے میں ابھی دیر ہو رہی تھی۔ میں نے جیب سے اپنا چاقو نکال لیا اور چمپا [کے ہا]تھ بٹانے لگا اور دانستہ مدراسی افسر کا چہرہ نہیں دیکھا۔ جانے والے بیرے کو [آواز دے]کر میں نے چمپا کے لیے پان بھی منگوا لیے۔ پھر میں نے مدراسی مسافر [سے اصرار] کیا کہ وہ ہمارے ساتھ چائے پیے۔ اُس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔ [م]یری دعوت پر وہ بہت جز بز ہوا۔ پہلے اُس نے انکار کیا مگر میرے اصرار [پر آما]دہ ہو گیا۔ میں اُس کی برتھ پر پڑے سے لے کے چلا گیا۔ چمپا نے اُسے چائے [دی۔ مدر]اسی کے چہرے پر کچھ ہی دیر بعد شگفتگی کے آثار نمایاں ہوئے۔ "تمھارا [چاقو ب]ہت اچھا ہے۔" اُس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میرے اُستاد نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ سفر میں ہمیشہ چاقو اپنے ساتھ [رکھ]نا تا کہ بوقت ضرورت کام آ سکے۔" میں نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔

وہ مسکرانے لگا اور نرمی سے پوچھا۔ "تم کیا کام کرتے ہو؟"

"فی الحال تو آوارہ گردی کرتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "آوارہ گردی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔"

"چاقو بازی، مکا بازی، لٹھ بازی، ہر قسم کے داؤ پیچ اور سارے زمانے کا گشت، کبھی اِدھر جاتا ہوں کبھی اُدھر جاتا ہوں۔"

"اور کہیں سکون نہیں ملتا، دلچسپ نوجوان ہو۔"

"آپ سچ کہتے ہیں۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"بہت دُکھی معلوم ہوتے ہو۔ اصل وطن کہاں ہے؟"

"اب تو کہیں بھی نہیں، کبھی ہوا کرتا تھا۔"

"کچھ پڑھا لکھا نہیں؟" اُس کے لہجے میں طنز تھا۔

"تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا ۔۔۔؟"

"سب بھول گیا ۔۔۔"

"مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں بتاؤ، سفر بھی خاصا طویل ہے، شاید میں تمھارے کسی کام آسکوں۔ مجھے نوجوانوں کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔"

"کیا سُنیں گے آپ۔" میرے منہ سے آہ نکل گئی۔ "لمبی کہانی ہے، سفر ختم ہو جائے گا، کہانی ادھوری رہ جائے گی۔" میں نے بات پلٹ کے کہا۔ "آپ بتائیے، مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی اوٹ پٹانگ باتیں لے کے بیٹھ گیا، آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"میری باتیں اتنی دلچسپ نہیں ہیں، اپنی سناؤ۔ تم مجھے کسی زمیں دار کے بیٹے معلوم ہوتے ہو۔" وہ امرود کی قاش منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"اب تو میں خود اپنا بیٹا، اپنا باپ ہوں، زمین پر بوجھ ہوں۔"

"کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" وہ مہذب انداز میں بولا۔

"کیا بتاؤں ۔۔۔ دُہراتے ہوئے اُلجھن ہوتی ہے۔"

"بمبئی کسی کام سے جا رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک شخص کی تلاش ہے، سُنا ہے بمبئی میں رہتا ہے، کچھ خاندانی معاملہ ہے۔ جب معلوم ہوا تو جیسے کھڑے تھے تیار ہو گئے۔ سفر کی تیاری بھی نہ کر سکے۔" میں نے نجی اور خاندانی معاملہ بتا کے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یقین تھا کہ مدراسی افسر کے ذہن کا غبار کچھ دُور ہوا ہوگا۔ یقیناً تجسس بھی سوا ہوا ہوگا مگر تجسس کا رُخ بدل جانا چاہیے تھا۔

میں اُسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ مجھے بھی باتیں کرنا آتی ہیں لیکن کوئی شخص جب بات نہیں کرنا چاہتا تو اُسے بات کرنے پر کیوں آمادہ کیا جاتا ہے۔ کوئی چُپ ہے تو اس پر شک نہ کیا جائے، کوئی چپ ہے تو اس کے بہت سے سبب ہو سکتے ہیں۔ کوئی چپ ہے تو وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے، اُسے تنگ کیوں کرتے ہو۔ ٹکٹ چیکر دو تین اسٹیشن بعد خیر خبر لینے آیا اور مجھے اُس کے ساتھ گفتگو میں مصروف دیکھ کے سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ تاہم تک مدراسی کے لب و لہجہ میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ گو مجھ میں اُس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پھر بھی اُس سے انگریزی میں بات نہیں کی۔ وہ اٹک اٹک کر اردو میں نہایت سنبھل سنبھل

کے بات کر رہا تھا، شام کے وقت میں نے اپنا تھیلا اُس کے سامنے کھول کے ٹٹولنا شروع کیا، مقصد صرف یہ تھا کہ وہ یہ دیکھ لے، کوئی مشکوک چیز تھیلے میں نہیں ہے، زریں نے اس میں سامان رکھا تھا، میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ سفر کی رفاقت کا ایک دن عام دنوں کی رفاقت کے سو دن کے برابر ہوتا ہے، میرے رویے سے چمپا کے چہرے پر بشاشت آگئی، اس کے باوجود مجھے اطمینان نہیں تھا، ایسے عالم میں جب اعصاب میں کیڑے رینگ رہے ہوں اور دماغ پھٹا جا رہا ہو، فہمیدہ کے مجرموں اور ابا جان سے ملنے کے تصور سے دل ہول رہا ہو، ایسی باتیں کرنی پڑیں، فہمیدہ کے پیروں میں گھنگرو باندھنے والی عورت چمپا کی خاطر داری کرنا پڑے، ایک اجنبی مسافر سے غیر ضروری راہ و رسم رکھنا پڑے، مگر ٹھیک ہے، سات سال جیل خانے میں بھی تو گزرے ہیں، جب سے گھر سے قدم نکلا ہے یہی ہو رہا ہے، ساری دنیا یہی چاہتی ہے کہ آدمی چپ رہے، چاہے جھوٹ بولتا رہے، کیا معلوم اور کہاں کہاں جانا پڑے اور کیا کیا کرنا پڑے۔

چمپا نے پورے دن ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا جب کہ وہ کسی وقت بھی ہنگامہ کھڑا کر سکتی تھی، میری باتوں سے وہ بھی متاثر معلوم ہوتی تھی۔ مدراسی بہت تیز آدمی تھا، سامنے جو کچھ ظاہر کر رہا تھا، کیا خبر اندر بھی وہی سمجھ رہا ہو۔ رات تک کوئی مسافر ڈبے میں نہیں آیا۔ رات کا کھانا مدراسی نے ہمیں اپنی طرف سے کھلایا تب مجھے کچھ سکون آیا۔

کھانے کے بعد وہ مدراس اور دلّی کے کھانوں کے بارے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے دلچسپ واقعات سنانے لگا اور اُس نے مجھے دعوت دی کہ میں بمبئی میں اُس سے ضرور ملاقات کروں۔ اُس کا نام راج کرشنا تھا، آخر وقت تک اُس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ پولیس کا افسر ہے اور اسی بات سے مجھے تشویش ہوتی تھی۔ شاید اُس نے اس کا اظہار ناموزوں سمجھا ہو کیونکہ بات چیت بے تکلفی کی حد میں داخل ہو گئی تھی۔ جہاں افسری برتری کا ذکر مناسب نہیں ہوتا۔

صرف ایک رات درمیان میں باقی رہ گئی تھی۔ علی الصباح گاڑی شہر بمبئی کی سرحدوں میں داخل ہو جائے گی۔ بمبئی شہر قریب آ رہا تھا اور میرے خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے ابا جان بھی بمبئی میں رہتے ہوں۔ جب وہ مجھے دیکھیں گے تو اُن کا کیا حال ہو گا۔ دھتکار دیں گے یا گلے لگا لیں گے؟ پہچانیں گے بھی یا نہیں؟ فہمیدہ نے تو انھیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہو گا۔ کیا آفت آئی تھی کہ اچھا خاصا گھر چھوڑ دیا؟ میں چلا گیا تھا تو کون سی قیامت آ گئی تھی، لوگ اچانک مر بھی تو جاتے ہیں۔ سمجھ لیتے کہ میں مر گیا ہوں، آخر میں نے بھی تو اُن کے لیے یہی سوچا تھا۔

بہار برتن سمیٹ کے جا چکا تھا۔ مدراسی مسافر راج کرشنا پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھیری اور چھوٹنے ہی والی تھی کہ ایک مسافر بھاگتا ہوا آیا۔ اُس نے ایک نظر ہم لوگوں پر ڈالی اور اجازت طلب انداز میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ "معاف کیجیے، مجھے قریب ہی اُتر جانا ہے" اُس نے لجاجت سے کہا۔

"ضرور ضرور، آئیے، بیٹھیے۔" راج کرشنا فراخ دلی سے بولا۔ مسافر برتھ کے ایک جانب بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں صرف ایک چرمی تھیلا تھا۔ عمر کوئی ۳۵، ۳۶ سال، مانگ سلیقے سے نکلی ہوئی، انگریزی لباس پہنے، رنگ سرمئی۔

راج کرشنا معذرت کر کے سونے کے لیے اُوپر کی برتھ پر چلا گیا۔ نووارد مسافر نے اصرار کر کے مجھے بھی لٹا دیا۔ میں نے سگریٹ لیے، وہ کھسک کے بیٹھا تھا۔ اُوپر کی ایک اور برتھ خالی تھی مگر وہ سونے پر آمادہ نہیں ہوا۔ سامنے کی سیٹ پر چمپا اپنے جسم پر چادر ڈال کے لیٹ گئی تھی۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی، نووارد شخص نے کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند کیا اور ہم لوگوں سے روشنی بند کرنے کی اجازت چاہی۔ مدراسی ابھی جاگ رہا تھا، اُس نے اِس زحمت پر اُس کا شکریہ ادا کیا۔ نئے مسافر نے بتی گل کر دی۔ کمپارٹمنٹ میں اب ایک ہلکا بلب روشن تھا اور گاڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی، ہچکولے لے رہی تھی۔ راج کرشنا کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد ایک کروٹ ساکت ہو گیا۔ چمپا بائی نے ساڑھی کے پلّو سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اس لیے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ نووارد کسی گہری سوچ میں گم تھا، پھر وہ پشت سے سر ٹکا کے اُونگھنے لگا۔ میری آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی، کل بھی ایک پل کے لیے آنکھ نہیں لگی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

بمبئی قریب آ رہا تھا، میرے پائنتی بیٹھے ہوئے نئے مسافر کو آئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ دفعتہً مجھے کچھ کھٹکا ہوا، میں نے لیٹے لیٹے نیم باز آنکھوں سے دیکھا، مسافر نے دروازے کے قریب جا کے آہستہ سے کھڑکی کا شیشہ اٹھایا، باہر جھانکا، پھر گھڑی دیکھی اور ایک گہری سانس لے کے اپنی جگہ آ کے بیٹھ گیا۔ میں سمجھا شاید اُس کی منزل آنے والی ہے، مسافر چند لمحے ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ دوبارہ آہٹ ہوئی، مجھے بار بار شبہ ہوتا تھا کہ کہیں چمپا کے اڈے میں سے تو نہیں آ گیا ہے، مسافر پھر اُٹھا۔ اُس نے چمپا کی طرف دیکھا، چمپا کے منہ پر ساڑھی کا پلّو پڑا ہوا تھا، مسافر نے اپنا منہ قریب لے جا کے جیسے اُسے سونگھا، میں اُس طرح چونکا ہو گیا۔ چمپا کے بعد مسافر میری طرف آیا، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ جیسے ہی اُس کے مڑنے کی آہٹ ہوئی، میں نے اپنی آنکھوں کے پردے کسی قدر اُوپر کیے، مسافر راج کرشنا کی برتھ کے قریب تھا۔ اُس نے جیب سے ہاتھ نکالا تو ایک تمنچہ اُس کے ہاتھ میں تھا لیکن میرے جھپٹنے سے پہلے اُس نے تمنچہ راج کرشنا کے سر پر تان لیا تھا، میرا رواں رواں کانپ اُٹھا۔ ہو گیا جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس موقع پر مسافر کو جھپٹنے کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے، میری ایک آہٹ بھی صورتِ حال سنگین بنا سکتی تھی۔ میں بہ مشکل دم سادھے پڑا رہا۔ نہ ہلنے کا یارا، نہ آنکھ کھولنے کی مجال۔ مسافر نے راج کرشنا کے پڑھے پر ٹھوکا مارا۔ راج کرشنا کا جسم اچانک مضطرب ہوا۔ ایک ہلکی سسکاری کی آواز آئی۔ اُس نے تمنچہ دیکھ لیا ہو گا۔ مسافر نے سرگوشی میں کچھ کہا۔ کوشش کے باوجود میں سن نہ سکا۔ راج کرشنا کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا لیکن اُس کے جسم پر دوبارہ خفیف سا لرزہ طاری ہوا۔ اس نے کچھ کہا مگر مسافر نے اُسے شاید دوبارہ دھمکی دی اور تمنچہ کسی قدر دُور کیا کیونکہ راج کرشنا اُٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔ مسافر نے ایک بار پھر مجھ پر نگاہ کی۔ میری آنکھیں اس طرح بند ہوئی تھیں کہ وہ انھیں جھانک کے دیکھتا، تبھی اُسے اُن کے کھلنے کا پتا چلتا۔ راج کرشنا کی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ وہ بہت احتیاط سے نیچے اُترا۔ مسافر نے تمنچے کی نال اُس کی گردن سے ٹکا دی تھی۔ راج کرشنا نیچے آ گیا تھا۔ مسافر نے اُسے دروازے کے قریب چلنے کا اشارہ کیا۔ میرے جسم میں سرد و گرم لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ راج کرشنا نے جوتے پہننا چاہے مگر مسافر نے اُسے اجازت نہیں دی، میں لیٹا ہوا تھا لیکن میرا ذہن کام کر رہا تھا۔ مسافر کے جسم کی ہر جنبش، ہر حرکت میری نگاہ کی زد میں تھی۔ راج کرشنا ایک سعادت مند شاگرد یا کسی معصوم بچے کی طرح مسافر کی ہدایت پر دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ چمپا نے کروٹ بدلی تو مسافر نے ایک لمحے کے لیے چونک کے اُس کی طرف دیکھا مگر وہ ایک لمحہ ہی تھا، جگنو کی طرح چمکا، بجھ گیا اور میں اپنی طاقت جسم میں گھونٹ کے رہ گیا۔ مسافر کا ارادہ ظاہر تھا۔ میں بہت پہلے ہی دھیرے دھیرے اپنی جیب تک ہاتھ لے جا چکا تھا، چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ اُسے کھینچ کے کھٹکا دبانے کی دیر تھی مگر مسافر لمحے کی مہلت بھی نہیں دے رہا تھا۔ راج کرشنا کے بارے میں بہت جلد کوئی فیصلہ ہونے والا تھا۔ مسافر نے ہاتھ بڑھا کے دروازے کی چٹخنی نیچے گرا دی، اب اُس کا ہاتھ زنجیر کی طرف اُٹھ رہا تھا، میں نے ایک بار پوری صورتِ حال ذہن میں تولی، کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے بند چاقو چمپا کے جسم پر پھینک دیا، وہ ہڑبڑا کر اُٹھی، میں گیند کی طرح برتھ کے نیچے گر کے اُوپر کی طرف اُٹھا، چمپا ہڑبڑا کر بے اختیار چیخی۔ مسافر نے تمنچہ چمپا کی سمت کر دیا مگر جب اُس نے دوسرے لمحے میری طرف دیکھا — مگر اُسے دیکھنے کی مہلت نہیں ملی، میں پیچھے سے اُس کے پہنچے پر جھپٹا ہوا اُوپر کی طرف اُٹھ گیا تھا۔ میرے اندازے میں کوئی خامی نہیں تھی، اُدھر چمپا کی سسکی بلند ہوئی، اِدھر میں جھپٹا۔ مسافر نے پہلے چمپا کی جانب تمنچہ تانا، پھر میری آہٹ سے بوکھلا کے تمنچے کا رُخ بدلنا چاہا مگر میں نے اُسے درمیان ہی میں اُچک کے اُوپر اُٹھا لیا۔ تمنچے سے شعلہ نکلا اور ڈبے کی چھت میں سوراخ کرتا ہوا پار ہو گیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اُس کی گردن پر وار کیا۔ راج کرشنا منہ موڑے مبہوت کھڑا تھا، وہ ایک دم مسافر کے جسم سے چمٹ گیا۔ چمپا بھی جاگ گئی مگر تب تک میں مسافر کے تمنچے والے ہاتھ کی ہڈی پر ضرب لگا چکا تھا، جوڑ کھل گیا تھا، تمنچہ نیچے گر گیا اور مسافر درد سے بیر پٹخنے لگا۔ تمنچہ راج کرشنا نے اُٹھا لیا اور مسافر کی جیبوں کی تلاشی لے کے ایک لمبا چاقو برآمد کر لیا۔ میری ضرب سے مسافر کی گردن ڈھلک گئی تھی۔ وہ فرش پر لوٹنے لگا۔ میں نے اُسے ایک ٹھوکر لگانی چاہی لیکن راج کرشنا نے مجھے روک لیا۔ چمپا نے سوئچ دبا کے کمرہ روشن کر دیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ راج کرشنا نے گھڑی دیکھی، ڈھائی بج رہے ہوں گے۔ بمبئی آنے میں ۳ گھنٹے باقی تھے۔ میں نے دوبارہ دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ راج کرشنا نے اپنا ہاتھ بڑھا کے میری طرف اشارہ کیا۔ میں کچھ نہیں سمجھا، وہ مجھے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ میں اُس کے قریب پہنچا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بوسہ دینے لگا، اُسے آنکھوں سے لگا لیا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"میں اسے نہیں جانتا مگر یہ مجھے بہت اچھی طرح جانتا ہے۔" راج کرشنا کا چہرہ دفورِ مسرت سے تمتما رہا تھا۔ "یقیناً یہ اُس گروہ کا کوئی آدمی ہے جس کی تفتیش کے لیے مجھے بمبئی میں تعینات کیا گیا ہے۔ یہ لوگ مجھے بمبئی نہیں جانے دینا چاہتے۔ بہت پیچیدہ معاملہ ہے، پھر کسی وقت سناؤں گا مگر یہ اکیلا نہیں ہو گا۔" راج کرشنا تذبذب سے بولا۔ "اس کے دوسرے ساتھی بھی کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہے ہوں گے۔" راج کرشنا کا زرخیز دماغ کام کرنے لگا۔ اُس نے مجھے ہدایت کی کہ میں کھڑکی سے جھانک کے دیکھوں۔ میں نے شیشہ اُوپر کیا تو دُور سے روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آئیں۔ گاڑی کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ "تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لو۔" اُس نے مجھے متوجہ کیا۔

"تمھارے کتنے ساتھی تمھارے ساتھ ہیں؟" راج کرشنا نے تحکمانہ لہجے میں مسافر سے پوچھا۔ مسافر کی حالت نہایت خستہ تھی، بازو جھٹکتا تھا، گردن پکڑتا تھا، فرش سے سر مارتا تھا۔ گردن پر میری ضرب سے اُسے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا مگر کاٹھی کا مضبوط تھا، گردن پر گوشت بھی زیادہ تھا اس لیے کچھ جھیل گیا۔ اُس نے راج کرشنا کی بات کا جواب نہیں دیا، کراہنے لگا۔ "یہ نہیں بتلائے گا۔" میں نے رائے ظاہر کی۔

"یہ لوگ خاصی دُور سے ہمارا تعاقب کر رہے ہوں گے، جیسے ہی زنجیر کھنچتی اور گاڑی اسٹیشن سے پہلے کسی سنسان مقام پر رُکتی، اِس کے دوسرے ساتھی بھی اُتر جاتے۔ جو مقام طے ہو گیا تھا، وہاں چونکہ پروگرام کے مطابق گاڑی نہیں رُک پائی ہے اس لیے دوسرے ساتھی سبب جاننے کے لیے ہمارے ڈبے کا رُخ ضرور کریں گے۔ ابھی سفر میں تقریباً ۲ گھنٹے باقی ہیں۔ ہم کچھ اور نہیں کر سکتے تو کھڑکیاں، دروازے بند کر کے ڈبے میں بند ہو کر تو بیٹھ سکتے ہیں۔ وہ آنے والے اسٹیشن پر دروازہ کھلوانے کے لیے زیادہ ہنگامہ نہیں کریں گے اور انھیں اپنے ساتھی کا حشر دیکھنے کے لیے کسی ویران جگہ گاڑی رُکوانے کی حماقت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ممکن ہے، وہ بمبئی تک خود ہی اس انتظار میں رہیں کہ اچانک گاڑی رُک جائے۔" راج کرشنا اس انداز سے باتیں کر رہا تھا جیسے اُسے پہلے سے سارا پروگرام معلوم ہو۔

اسٹیشن آ گیا تھا۔ ڈبے میں، باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، شیشے پر ہاتھ مارا مگر ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شاید کوئی مسافر ہوگا۔ گاڑی کوئی سات منٹ ٹھیری ہوگی، پھر اپنی منزل کی جانب رینگنے لگی اور کچھ دُور چل کے ہولے سے باتیں کرنے لگی۔ "آپ کب تک تمنچہ تانے اس طرح کھڑے رہیں گے، بیٹھ جائیے میں اس کا انتظام کر دیتا ہوں، بمبئی تک یہ سوتا رہے گا۔"

"یہ میرے لیے بہت قیمتی ہے عزیز دوست!" راج کرشنا کی آواز مسرت سے معمور تھی۔ "میں اپنے ساتھ ایک تحفہ لے کے اُن کی خدمت میں پہنچوں گا جس اہم کام کی ذمے داری سونپنے کے لیے انھوں نے پہلے مجھے دلی بلایا، پھر بمبئی تعینات کیا، اس کا آغاز ہی اتنا خوش گوار ہوا ہے، میں اسے سنبھال کے رکھنا چاہتا ہوں اور بمبئی تک چھیڑنا نہیں چاہتا۔ یہ سب تمھاری بدولت ہوا ہے۔ میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ میں مدراس کا ایک بڑا پولیس افسر ہوں۔"

میں نے رسمی تعجب کا اظہار کیا۔ "کرشنا جی! آپ ہٹ جائیے، میں اسے تین چار گھنٹے تک بے سدھ کر سکتا ہوں۔ آپ اطمینان رکھیے، یہ مرے گا نہیں۔" یہ کہتے ہی میں نے کرشنا کے جواب کا انتظار نہیں کیا، تاک کے ایک دوسرا ہاتھ مسافر کی گردن پر مارا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ "اب آرام کیجیے۔" میں نے برتھ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

راج کرشنا گھبرا سا گیا۔ اُس نے بے ہوش مسافر کو ٹٹول کے دیکھا اور آنکھوں میں ممنونیت بھر کے بولا۔ "ہاں اب میں سکون سے بیٹھ سکتا ہوں۔" وہ میرے قریب بیٹھ کے پھر شکریہ ادا کرنے لگا۔ "کیا تم جاگ رہے تھے؟" وہ حیرت سے بولا۔

میں نے اُسے تفصیل سنائی۔ راج کرشنا میری پیٹھ تھپ تھپانے لگا، گاڑی چھک چھک چھو چھو کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ راج کرشنا نے چمپا سے پان مانگ کر کھایا۔ اُس نے چمپا سے درخواست کی کہ وہ تھوڑا پانی اور اُس کے سوٹ کیس سے نیلی گولیاں نکال کے اُسے دے دے۔ راج کرشنا نے گولیاں حلق سے اتار کے ایک گھونٹ پانی پیا۔ اب تو چمپا نے بھی سُن لیا تھا کہ وہ ایک بڑا پولیس افسر ہے اور اُس کے ہاتھ میں تمنچہ بھی تھا۔ چمپا کے ایک اشارے پر وہ مجھے بے بس کر سکتا تھا لیکن چمپا ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ میں اُسے جبراً بمبئی لیے جا رہا تھا اور میں نے موتیا بائی کے ہاں دو آدمی زخمی کر دیے تھے۔ یہ بات اتنی اہم نہیں تھی کہ ہمیشہ کے لیے میری زبان بند ہو جاتی۔ میں کبھی واپس آتا تو پھر گلی گلی چمپا بائی، موتیا بائی کو تلاش کرتا، میں فیض آباد کے جامو اور اُس کے ساتھیوں کو بھی اشارہ کر سکتا تھا۔ بات بڑھتی تو چمپا کا دامن بھی مل جاتا، اُس نے میری بہن فہمیدہ اور نہ جانے اور کتنی لڑکیاں خریدی ہوں گی۔ پھر چمپا، نوشہ اُس کے ساتھی اور ریل میں تمنچے والے مسافر کا انجام دیکھ چکی تھی۔

راج کرشنا نے گھڑی دیکھ کے مجھے بتایا کہ بس اب بمبئی آنے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ ہم نے مسافر پر چادر ڈال دی تھی۔ اُسے ہوش آ گیا تھا مگر وہ لیٹے لیٹے کراہ رہا تھا۔ بمبئی آ رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بار بار ابر سا چھا جاتا تھا، راج کرشنا بڑی شدت سے دادر اسٹیشن کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے مجھ کو میں چمپا کے ساتھ اُس کی قیام گاہ پر ٹھیروں۔ وہ میرا کوئی عذر تسلیم نہ تھا۔ "تم میرے ساتھ ٹھیرو گے، اب میں تمھیں کہیں اور نہیں جانے دوں گا۔" میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ دو چار روز میں اُس کے مکان آ جاؤں گا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ راج کرشنا کے توسط سے اُن غنڈوں کو جائے، چمپا، فہمیدہ کے سلسلے میں جن کا حوالہ دیتی تھی لیکن یہ بات خطرناک تھی۔ راج کرشنا کو پھر ساری باتیں معلوم ہو جاتیں۔ وہ ہمیں چھوڑنے پر بہ مشکل سے آمادہ ہوا۔

چمپا نے اُس کا اور اپنا سامان تہ کر لیا تھا، مجھے چمپا سے یہ موقع بھی نہیں ملا تھا کہ اُسے بمبئی کے کون سے اسٹیشن پر اترنا ہے۔ بمبئی سینٹرل اسٹیشن تک جاتی تھی۔ دادر اسٹیشن پر پولیس افسران کی تعداد نے ہمارا ڈبا گھیر لیا۔ چمپا بھی حواس باختہ ہو گئی۔ راج کرشنا سیر کا ڈالے ڈبے سے اُترا۔ تمام افسر آگے بڑھے، سلوٹ کیا اور مصافحہ کیا۔ یہ تمام لوگ راج کرشنا کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ راج کرشنا نے اُن میں سے ایک افسر سے کہا کہ وہ ڈبے میں پڑے ہوئے شخص کو پولیس میں باہر نکالنے کا اہتمام کرے۔ اُس نے مجھے نہیں چھوڑا، آخر تک اصرار کیا کہ میں اُس کے ساتھ چلوں اور وہ اُس شخص کی تلاش میں اپنے اثر و رسوخ سے میری مدد کرے گا جس کے لیے مجھے بمبئی کا سفر کرنا پڑا ہے۔ اُس نے کھڑی ہوئی چمپا بائی سے بھی گزارش کی۔ چمپا نے بہت عاجزی سے کہا کہ جاتے ہوئے ہم دونوں ضرور اُس کے پاس ٹھیریں گے۔ وہ اِن چند رسمی جملے ادا کر کے ہماری ہی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ میری قیام گاہ دادر میں ہے۔ ہم نے اُس کی سواری کی پیشکش بھی قبول نہیں کی۔ اس اجتناب سے وہ کچھ اداس ہو گیا۔

پولیس افسر اُس کی توجہ کے منتظر تھے۔ بمبئی کے متعدد مخصوص لباس میں اُس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ انتظام شاید اُس کی ہدایت کے تحت کیا گیا تھا، وہ جیسے ہی اُس غول میں چھپا، ہم دادر اسٹیشن سے باہر آ کے میں چمپا کے ساتھ ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ دو ایک پل کے لیے آنکھ نہیں لگی تھی۔ سامنے بمبئی شہر پھیلا ہوا تھا۔ خیال آتا تھا کہ اب ابا جان سے کسی بھی وقت ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں خوف دوڑنے لگتا تھا۔ ڈبے سے اُتر کے مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ دوبارہ جیل خانے سے آزاد ہوا ہوں مگر اب یہاں پہنچ کے جب بمبئی کی سڑکوں پر نظر پڑتی اور یہ خیال آتا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی سڑک ابا جان تک جاتی ہوگی تو اعصاب تڑخنے لگتے۔ چمپا نے پریشان ہو کر حال دریافت کیا مگر میں خاموش رہا۔ چند لمحے بینچ سے کھسکنے کے بعد اُس سے پوچھا۔ "کہاں چلنا ہے؟"

"پہلے کسی ہوٹل میں چل کے آرام کرو۔" اُس نے ملائم لہجے میں کہا۔ "اس کی تلاش میں نکلیں گے، میری طرف سے دل صاف رکھو۔"

"کس کے پاس چلنا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس کا نام گلابا ہے، یہیں دادر کے علاقے میں رہتا تھا، پانچ سال گزر گیا ہے، تلاش کرنے میں دیر لگ سکتی ہے۔ کسی ہوٹل میں سامان رکھ کے، کپڑے بدل کے ڈھونڈنے نکلیں گے۔"

میں نے اُس کی بات مان لی۔ چمپا کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی فریب نہیں کرے گی، وہ اس علاقے کے ہوٹلوں کو جانتی تھی۔ خود کو اُس کے سپرد کر دیا۔ ٹیکسی نے ہمیں ایک کئی منزلہ ہوٹل کے سامنے اُتار دیا۔ میرے پاس ابھی رقم کافی تھی۔ اتفاق سے ہوٹل میں ایک ہوادار اور روشن کمرہ خالی تھا۔ کمرے میں آ کے چمپا نے مجھے مشورہ دیا کہ دیر آرام کر لوں، اُسے میری طبیعت اچھی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اُس کے بعد میں نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ بال سفر کی گرد سے اٹے ہوئے تھے، جسم چپچپا رہا تھا۔ چمپا نہا کے بال بکھرائے ہوئے واپس آئی، پھر میں نے بھی اُس کے بعد میں نے جلدی جلدی جسم پر پانی ڈالا اور کپڑے تبدیل کر کے باہر چلنے چائے منگوائی تھی، ہوٹل کا بیرا اُس کے پیروں کے نزدیک فرش پر بیٹھا تھا۔ چمپا نے اتنی سی دیر میں اسے نہ جانے کس طرح ایسا رام کر لیا تھا کہ وہ صاحب جی، بیگم صاحب کہتے ہوئے اُس کا منہ سوکھ رہا تھا۔ چمپا اُسے ہدایات کی ہدایت دے رہی تھی، مثلاً ٹیکسی دروازے پر کھڑی ملے، کوئی پہلے اطلاع دی جائے، وغیرہ۔

بیرا چلا گیا تو چمپا نے مجھے چائے بنا کے دی اور کچھ ٹوسٹ مکھن لینے کو کہا۔ "اب چلو، اُسے تلاش کرنے نکلتے ہیں۔" میں نے اضطراب سے کہا۔

"جلدی مت کرو۔" اُس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "جلدی میں کام بگڑ سکتا ہے۔ اتنا لمبا سفر اُسے تلاش کرنے ہی کے لیے کیا ہے۔ ہم نے جلدی کی تو بھٹک سکتے ہیں۔"

"مگر مجھے تو ایک پل گزارنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔"

"تم بس صبر کرو، باقی باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ سمجھ لو کہ تم ابھی بمبئی نہیں پہنچے ہو بلکہ ابھی مجھے تلاش کر رہے ہو۔" وہ نرمی سے بولی۔

"مگر کب تک؟ کب تک؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے بالکل کچھ نہیں جانتے۔ تم فیض آباد اُن لوگوں کے ساتھ بالاخانے پر آئے تھے، اُن لوگوں کے مزاج سے تو واقف ہوگے؟" وہ سسکتی لہجے میں بولی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"وہی لوگ ہیں، انھی جیسے کوئی بڑا کوئی چھوٹا، کوئی کمزور کوئی طاقت ور، بس یہیں جگہ بدلی ہوئی ہے۔"

"صرف جگہ نہیں بدلتی، لوگ بھی بدلے ہوئے ہوتے ہیں، سب کو ایک ترازو میں مت رکھو۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "جن لوگوں سے تمھارا واسطہ پڑتا ہے، لوگ صرف وہی نہیں ہوتے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" وہ وضاحت کرنے لگی۔

"مطلب کچھ بھی ہو۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کے تلخی سے کہا۔ "ایک شخص محلے کی آبروؤں کا امین ہے، دوسرا انھیں نیلام پر چڑھا دیتا ہے۔ تم دونوں کو ایک ہی خانے میں رکھ رہی ہو چمپا بائی! زبان سنبھال کے بات کیا کرو۔ تم نے صرف نوشے اور گلابے کو دیکھا ہے۔"

"تم تو بگڑ گئے، میری عقل ماری گئی ہے۔" وہ خفت سے بولی۔ "بات کچھ کہنا چاہتی ہوں کہہ کچھ جاتی ہوں، میری بات سے تمھیں تکلیف ہوئی؟"

"تکلیف وکلیف کیا چمپا بائی! بس جانے دو۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"دیکھو، میں تم سے یہ کہنا چاہتی تھی۔" وہ اپنائیت سے بولی۔ "کہ ہمیں ذرا تحمل سے کام کرنا ہوگا۔ تمھارا مزاج دوسرا ہے، مجھے ایک دو دن میں تھوڑی بہت واقفیت ہو گئی ہے۔ اول تو انھیں ڈھونڈنا، پھر اُن کے مل جانے پر اُن سے فہمیدہ کا پتہ پوچھنا کہ انھوں نے اُسے کہاں سے حاصل کیا تھا، یہ ایک مشکل کام ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم انھیں اپنے سامنے دیکھ کے اکھڑ جاؤ گے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ خود اُن کا سراغ لگاؤں اور تم یہیں ہوٹل میں رہو۔ میں اُن کے سامنے تمھیں لے جانا نہیں چاہتی۔ وہ فہمیدہ کا ذکر کرتے وقت تمھارا لحاظ نہیں کریں گے۔ نہ جانے کس کس طرح اُس کا ذکر کریں۔ تم سے برداشت نہیں ہوگا۔"

"میں فہمیدہ کو نیلم جان کے روپ میں دیکھ کے زندہ رہ گیا۔ مجھ سے زیادہ برداشت کس میں ہوگی۔ جو گالی تم نے دی ہے، جو طمانچہ تم نے لگایا ہے چمپا بائی! اُس سے زیادہ کا امکان نہیں ہے۔"

"میاں! خدا گواہ ہے کہ میں آج تک کسی لڑکی کو اُس کے گھر سے گھسیٹ کے بالاخانے نہیں لے گئی۔ میں انھی لڑکیوں کو اِدھر اُدھر سے لے گئی ہوں جن کے پاس اپنے گھر واپس جانے کا راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ فہمیدہ نہ جانے کس طرح گلابے اور اُس کے ساتھیوں کے قبضے میں آ گئی تھی۔ میں نے جب اچھی طرح پرکھ لیا کہ میں نہیں تو کوئی اور اُسے خرید لے گا، تب میں نے گلابے کے ہاتھ میں تھیلی تھمائی۔"

"ہونہہ۔" میں نے نفرت سے کہا۔ "تمھاری کوئی غلطی نہیں، بازار میں اچھے طلب گار موجود ہوں تو سوداگر اپنا ایمان بھی بیچ دیتے ہیں۔" چمپا بائی چپ ہو گئی۔ چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں کھڑکنے لگی، آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے گالوں پر ٹمٹمانے لگے۔ "میں تمھارے ساتھ ہی چلوں گا، کچھ بولوں گا نہیں، وہ سمجھیں گے کہ میں تمھارے کاروبار سے متعلق کوئی آدمی ہوں اور یہ وہ سچ ہی سمجھیں گے۔" میری آواز پھولنے لگی۔ "تمھاری بھی کوئی

غلطی نہیں گلابے کی بھی کوئی غلطی نہیں' غلطی تو اُن بدنصیبوں کی.....
مجھ سے آگے کچھ کہا نہیں گیا۔

"اب تم سے میں کیا کہہ سکتی ہوں' تمہارے سامنے موجود ہوں۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"چلو اٹھو۔" میں نے چاقو کی دھار میز پوش کے کونے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "صبح صبح کا وقت ہے' دیر ہو جائے گی تو لوگوں کا ملنا مشکل ہو گا' اب اٹھو۔"

"یہ بیرا کچھ کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔" وہ رازدارانہ بولی۔ "میں نے اس سے ابھی بات تو نہیں کی ہے مگر میرا خیال ہے کہ گلابے کو جگہ جگہ ڈھونڈنے کے بجائے یہیں بلائے لیتی ہوں۔ میرا نام سن کے وہ ہوٹل میں آجائے گا' بات آسانی سے حل ہو جائے گی۔"

"مگر۔ مگر یہ ایک لمبا طریقہ ہے۔" میں نے اس کی رائے مسترد کر دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پہلے ہوٹل والوں کو علم ہو کہ ہم لوگوں کو کس بدنام شخص کی تلاش ہے' پھر وہ یہاں آئے تو بات اور بڑھے۔ چاروناچار چمپا بائی آمادہ ہو گئی۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ ایک برقع پوش عورت کے ساتھ گلابے جیسے آدمی کا پتہ پوچھنا معیوب سی بات تھی۔ چمپا کے بیان کے مطابق ہوٹل کا ایک بوڑھا بیرا گلابے سے اس کے رابطے کا ذریعہ بنا تھا اب وہ بیرا ہوٹل چھوڑ کے اپنے شہر جا چکا تھا اسی لیے چمپا دوسرے بیرے سے رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ وہ تمام راستے مجھے سمجھاتی رہی کہ اگر گلابے کا سامنا ہو جائے تو میں اپنے آپ کو قابو میں رکھوں' پورا پتہ تو معلوم نہیں تھا۔ اتنا معلوم تھا کہ ہمیں شمبھوناتھ بلڈنگ پہنچنا ہے۔ ٹیکسی والا شاید جان بوجھ کے ٹیکسی مختلف علاقوں میں گھماتا رہا۔ آخر وہ ہمیں ایک ایسی جگہ لے گیا' جہاں چھوٹی بڑی بلڈنگیں ایک دوسرے پہ جیسے گری پڑ رہی تھیں' بلڈنگوں کے درمیان گزرنے والی سڑکیں تنگ تھیں' میں نے ٹیکسی رکوائی' قریبی پان فروش کی دکان پر ایک شخص خاص تیوروں سے کھڑا ہوا تھا' میں نے اس کے پاس پہنچ کے جب اس کے سامنے گلابے کا نام لیا تو وہ اس طرح ہنسنے لگا جیسے میں نے کوئی بہت حماقت کی بات کہہ دی ہو۔ مجھے جواب دینے کے بجائے اس نے پنواڑی کو مخاطب کیا۔ "سنتا ہے چمپا سیٹھ! چھوکرا کس کا نام لیتا ہے' گلابے کا۔" اس کچھ کہا۔ پنواڑی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا' دونوں بار بار مجھے سر سے پیر تک دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

"اوئے! ہنستے کیوں ہو! کیا تمہارا دماغ خراب ہے؟ میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دو۔" مجھے اُن کے برتاؤ پہ غصہ آگیا۔

"اوئے جا۔" اچانک اس کی ہنسی رک گئی اور آنکھیں لال ہو گئیں۔

"جا بابو! جا' اپنا راستہ سنبھال۔" پنواڑی نے کسی قدر مفاہمت سے کہا۔ "دادر میں اب گلابے کا نام نہ لے' وہ ایدھرے دکان بڑھا گیا اب اُس کا اڈا ادھر نہیں چلتا۔ ایدھر تو بسوا ہے بسوا شیر کا بچہ۔ اس کا ایڈریس پوچھے تو بتائیں۔" وہ سامنے شمبھوناتھ بلڈنگ ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے شیر کا پنجہ بناتے ہوئے کہا۔ "گرجتا ہے۔"

"گلابے اب کہاں رہتا ہے؟"

"وہ سالا کہیں نالے میں پڑا ہو گا' مر گیا' ایسا ہی ہو گیا۔" پنواڑی کے جواب دینے سے پہلے دکان پر کھڑے ہوئے شخص نے حقارت سے کہا۔

"ہم اُس کی تلاش میں بہت دور سے آئے ہیں' اس کا پتہ بتا دو۔"

"اُس بھڑوے کا پتہ؟ ۔ لے چمپا سیٹھ!" وہ پنواڑی کو مخاطب کر کے پھر ہنسنے لگا۔ "چھوکرے کو گلابے کا ایڈریس بتاؤ۔" وہ آنکھ مار کے بولا۔ "سنا ہے سالا اب اُوور اندھیری میں مسخری کرتا پھرتا ہے۔"

میں اُن کے پاس سے چلا آیا۔ ٹیکسی اندھیری کے علاقے کی طرف بھاگنے لگی۔ پنواڑی اور اُس کی دکان پہ کھڑے ہوئے شہدے کی باتیں کرتی تھیں کہ گلابے نے کوئی خاص نام پیدا نہیں کیا ہے کبھی اُس کا نام ہو گا مگر اب وہ ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود ہو کے رہ گیا ہے' کلکتہ بڑا شہر ہے پھر بھی یہاں کا حال وہاں کے حال سے مختلف نہیں ہو گا۔ اندھیری میں داخل ہو گئی۔ پان کی دکانوں' چائے کے اسٹالوں پہ میری نگاہیں چہرے ڈھونڈتی رہیں جو مجھے دور سے نظر آجاتے تھے۔ ہم نے اندھیری کی سڑکوں پہ پہلے ایک چکر لگایا۔ شاید چمپا کو گلابے یا اُس کا کوئی ساتھی نظر آ جائے۔ ٹیکسی کی رفتار کم تھی۔ کئی جگہ میں نے ٹیکسی رکوانے کا ارادہ کیا مگر چمپا نے منع کر دیا۔ آخر ایک تنگ چوراہے پہ مجھے گلابے کا پتہ نشان پوچھنے کے لیے اترنا پڑا۔ یہ جگہ گنجان اور گندی تھی۔ گٹر کی بو سے دماغ پھٹا جاتا تھا' وہاں لوگوں کی آنکھوں نے حیرت اور تجسس سے میرا معائنہ کیا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کون سا آدمی بات کرنے کے لیے منتخب کروں کہ ایک شخص نے پیچھے سے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ جھول دار اور اونچے پائنچوں کی پتلون پہنے ہوئے ایک چھریرے جسم اور کالے رنگ کا آدمی تیکھی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ "کیا ہے؟" اُس نے منہ بنا کے پوچھا۔ ایک جھٹکے سے اُس کا ہاتھ اپنے کندھے سے علیحدہ کیا۔ میری اس حرکت پر اُس کے ہونٹ باہر نکل آئے۔ "کس کو مانگتا ہے؟" وہ خشونت سے بولا۔

"گلابے کو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"گلابے کو۔" وہ ہاتھ نچا کے بولا۔ "کیدر سے آیا؟"

"کلکتے سے۔" میں نے سرسری جواب دیا۔ "گلابا کدھر ہے؟"

"وہ سالا ایدر اب کیدر ہے' سالا جیل میں پڑا سڑتا ہے' اُس کا کلٹی کھا گیا۔ ابھی تم اپن سے بات کرو' اکھا چالی اپن دیکھتا ہے۔" بولا کیا مانگتا؟

"وہ جیل کب گیا؟"

"ابھی بہت دن ہوا۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "لمبا ہالی ڈے۔" میرے تذبذب سے وہ آنکھ مار کے بولا۔ "مال ہے؟"

"تم گلابے کے کسی ساتھی کو جانتے ہو؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"ابھی گلابے کی بات چھوڑو! گلابے کا دھندا ایک دم فلاپ ہو گیا۔ اُس کا ساتھی ایک دم فنش' ایدر اُو درون ڈرتھری ہو گیا۔ گلابا سالا چرس لگاتا تھا۔ اُودر اپنی ماں کے گھر میں کیا نگرم لگاتا ہو گا۔ اپن سالا یہی ... رہتا ہے۔"

میں اُس سے باتیں کر رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے آ کے بتایا کہ بیگم صاحب ... بیگم صاحب کے ذکر پہ میرے مخاطب نوجوان نے اچک کے دیکھا' ... سیٹی بجائی لیکن پہلے نقاب اٹھا رکھی تھی۔ نوجوان نے ہونٹ ... لیے۔ میں نے چمپا کے پاس آ کے گلابے کے بارے میں بتایا تو اُس نے کچھ ... ایک اور شخص کا نام لیا۔ بولے کا' میں نے نوجوان سے بولے کا ذکر ... نہیں جانتا تھا۔ بمبئی بہت بڑا شہر تھا' ضروری نہیں کہ نا قابلِ ذکر ... نام دوسرے علاقے کے لوگوں کو ازبر ہوں مگر بمبئی میں بہت سے لوگ ... جو گلابے کے ساتھیوں کو جانتے ہوں گے' میں نے پہلے ہی اُس ... کی ایک جھلک دیکھ کے اُسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی' وہ خود ... آگیا۔

ٹیکسی اندھیری کے علاقے میں کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ نوجوان نے سیٹیاں ... میں روکنا چاہا مگر ڈرائیور نے ٹیکسی نہیں روکی۔ سہ پہر تک ہم ٹھوکریں ... طرح طرح کی باتیں سنتے بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتے ایک ایسے شخص سے ... میں کامیاب ہو گئے جو اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزار چکا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی ... کا ایک شخص تھا۔ آواز میں گونج تھی' رنگ کبھی گورا ہو گا' سر کے بال ... سے زیادہ اُڑ چکے تھے۔ اب تک کئی جگہ جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ ... کے لفنگے نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے تھے۔ کوئی سیدھے منہ بات ... کرتا تھا۔ جسے دیکھو طرم باز خاں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارے لوگ ... سے بات کر رہے ہوں' ایک لہجہ' ایک انداز۔ اعظم خاں ان میں ایک ... شخص نظر آیا۔ میں نے اسے سلام کیا تو اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ... دودھ کی دکان کے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ میں نے اُس کے چہرے کے ... دیکھ کے ٹیکسی رکوائی تھی۔ چاقو کا بہت اچھا ماہر نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ... بہت سے نشان چہرے پر ڈلوا لیے تھے۔ اعظم نے مجھے اپنے برابر کے اسٹول ... بٹھا لیا۔ میں نے اُس کے سامنے گلابے اور بولے کا نام لیا تو وہ سنجیدہ ہو گیا ... اس طرح بند کر لیں جیسے وظیفہ پڑھ رہا ہو' پھر کاندھوں کو تیزی سے ... سنتے ہوئے بولا۔ "کیوں بادشاہ! تمہیں ان مستوں سے کیا کام پڑ گیا؟"

"مجھے اُن سے ایک صاحب کا پتہ پوچھنا ہے۔"

"کیسا پتہ!" وہ دیدے نچاتے ہوئے بولا۔ "جاؤ خلیفہ گھر جاؤ۔ ابھی ... اچھے لگ رہے ہیں۔" پھر وہ چہکنے لگا۔ "گلابے اور بولے یہ ... ڈنگ چوس لیں گے۔"

"آپ بھی میری مدد نہیں کریں گے۔" میں نے شکایت کی۔ "یہ بمبئی کے ... بارے میں آپ تو یہاں کے نہیں معلوم ہوتے۔ مذاق مت سمجھیے مجھے ... صاحب کا پتہ درکار ہے' گلابے یا بولے یا اُن کا کوئی ساتھی اگر مل جائے تو میری مصیبت دور ہو سکتی ہے۔"

وہ ایک آنکھ بند کر کے مجھے سر سے پیر تک گھورنے لگا۔ "گلابے اور بولے جن لوگوں کا پتہ جانتے ہیں اُن سے مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔ تمہیں کسی نے دھوکا دیا ہے۔ میاں جی! گلابے بہت دنوں سے جیل میں ہے' بولا سنا ہے ڈر کے پونا بھاگ گیا تھا' اب پتہ نہیں کہاں ہے۔ بہت حرامیوں نے غل بھی مچایا تھا' دادر تو گندا کیا تھا' اس طرف اندھیری میں بھی اندھیرا کر دیا تھا' سالے کام ہی نہیں جانتے تھے۔ بہک گئے تھے۔ بہت سور کے بچوں کو سمجھایا کہ کچھ خیال کرو' باز آجاؤ' غنڈا گردی کو بدنام مت کرو مگر کم ذاتوں نے اپنی ماں بہنیں بیچنا شروع کر دی تھیں۔ یہ بمبئی شہر ہی بدذات ہے۔ ہے ہے کیا بات تھی شاہ جہاں آباد کی قسم اللہ کی خلیفہ' اُجڑ کے بھی اپنا دیار سوا لاکھ کا۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "آپ بھی کچھ نہیں جانتے۔ میری بات کا جواب دیجیے۔ آپ مجھے گلابے کے کسی ساتھی کا پتہ بتا سکتے ہیں یا نہیں؟"

وہ برہم ہو گیا۔ "خلیفہ! اعظم سے بات کرنی ہے تو نگاہ نیچی کرو' اعظم کو کسی چھوکرے کی یہ اکڑفوں بالکل پسند نہیں ہے۔"

"آپ تو ناراض ہو گئے' دیکھ رہے ہیں کہ ٹیکسی کھڑی ہے اور ایک زنانی اندر بیٹھی ہے۔ میں نے کون سی ایسی بُری بات کہہ دی ہے جو آپ کو ناگوار گزر گئی۔"

"کہاں سے آئے ہو؟" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"میرے سوال کا جواب دینا ہے تو دیجیے۔ میں جہنم سے آرہا ہوں۔" پھر مجھے خیال آیا' میرا لہجہ سخت ہو گیا ہے۔ "آگرے سے آرہا ہوں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "کچھ اور پوچھنا ہو تو ایک ساتھ پوچھ لیجیے' شجرہ وغیرہ۔"

"میاں خلیفہ!" اعظم نے دکان پر بیٹھے ہوئے دودھ والے کو آواز دی۔ "ذرا لونڈے کو بتانا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے۔"

"ارے بھیا' یہ اعظم دادا ہے۔" دودھ والے نے مجھ سے خوشامد کی۔

"ہم بھی کسی وجہ سے یہاں رکے ہیں' ورنہ آگے بڑھ جاتے۔" میں نے ترش روئی سے کہا۔ "اعظم دادا راستہ کھوٹا مت کیجیے' مجھے یقین ہے آپ گلابے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں' میں صبح سے تھک چکا ہوں' میری باتوں کا برا مت مانیے۔ مجھے جلد رخصت کر دیجیے۔"

"خلیفہ! تیری زبان میں بڑا اثر ہے۔" اعظم نے پھر دودھ والے کو مخاطب کیا۔ "لونڈے کی سمجھ میں بات آگئی ہے۔" میں نے برداشت کر لیا۔ اعظم دادا نے بیڑی کا بنڈل نکال کے ایک دو کش لیے۔ اور باقی بیڑی توڑ کے جوتے کے نیچے مسل دی۔ "ہاں کیا پوچھنا ہے؟" میں نے پھر ساری بات دہرائی تو اعظم دادا نے ایک اور شخص نور جانی کا نام لیا۔ "نور جانی سنبھل گیا ہے مگر بہت دنوں تک گلابے کے ساتھ نشے میں رہا۔ یہ اعظم دادا ہی تھا۔" اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جس نے اُس کا نشہ ہرن کیا۔"

"نور جانی! کہاں رہتا ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"سنا ہے آج کل محمد علی روڈ پہ دھندا کر رہا ہے؟"
"کوئی خاص پتہ۔۔۔؟"
"اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں اپنا نورجانی کہ اُس کا پتہ بتانا پڑے۔"
اعظم دادا کا لہجہ پھر تلخ ہوگیا۔"مگر ملیفہ جانے سے پہلے ایک بات مغز میں ڈال لو۔ چھوکرا بازی مت کرنا۔ ہاتھ کا پکا ہے اس نے اپنی ٹھوڑی کے نشان پہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔"یہ ایک چھوٹا سا نشان اُسی کی برکت ہے"۔
"ایسے تو بہت سے نشان ہیں کس کس کو گنو گے دادا" میرے منہ سے نکل گیا۔"معلوم ہوتا ہے ساری عمر نشان ہی لگوائے ہیں؟"
اعظم دادا کا چہرہ لال ہوگیا۔ اُس نے اشتعال میں مجھ پہ ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے اُسے اپنے منہ کے قریب روک لیا۔ اعظم دادا اُٹھ کے کھڑا ہوگیا۔ میرا مقصد اُس سے کسی قسم کی تلخی کا نہیں تھا لیکن اُس کی باتیں سن کے میری زبان سے یہ غلطی ہوگئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پہلو میں مجل بیٹھا ہوا مجھے سرزنش کر رہا ہو۔ اگر میں اُس کا ہاتھ نہ روکتا تو وہ میرا جبڑا ضرور توڑ دیتا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سمیت جسم پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ اعظم دادا دودھ والے کے اسٹولوں سے اُلجھ کے گرتے گرتے بچا۔ اُس نے پھنکارتے ہوئے مجھ پر دوبارہ حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ چمپا نے ٹیکسی سے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اعظم دادا اپنا بھاری سر میرے سینے پہ مارنا چاہتا تھا۔ مجھے جیسے ہی یہ اندازہ ہوا میں نے ذرا بائیں جانب پینترا بدل کے اُس کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے نیچے جھکا دیا سو وہ دُہرا ہوگیا کیونکہ اب اُس کے ہاتھ بھی کام نہیں کر سکتے تھے۔ پھر مجھے چمپا بائی نے تک کے کھینچا تو اعظم کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ چمپا کو اس مرحلے پہ دخل نہیں دینا چاہیے تھا۔ اعظم تندتیز غضب میں آگے بڑھا مگر چمپا درمیان میں آگئی۔ اعظم نے اندھے پن میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ اُس کے ہاتھ چمپا کے بدن کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ وہ چمپا کی چیخوں سے ہوش میں آیا۔ اس عرصے میں بہت سے راہ گیر اکٹھے ہوگئے تھے۔ دودھ والا بھی اُٹھ کے آگیا تھا اور اعظم دادا کو روک رہا تھا۔ اعظم مغلظات بک رہا تھا۔ راہ گیروں نے درمیان میں پڑ کے مجھے اور چمپا کو ٹیکسی میں بٹھا دیا۔
چمپا منع کرتی رہی مگر میں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ ٹیکسی کا رُخ محمد علی روڈ کی جانب موڑ لے۔ چمپا صبح سے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ محمد علی روڈ کے علاقے میں سڑک کے دونوں جانب فلیٹوں پر مشتمل کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی تھیں۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ سڑک پر اچھا خاصا ہجوم تھا۔ چمپا نے مشورہ دیا کہ ٹیکسی چھوڑ کے پیدل نورجانی کو تلاش کیا جائے۔ اُس کا کہنا تھا کہ شاید یہ نام اُس نے پہلے بھی سنا ہے لیکن نورجانی کا چہرہ اُسے یاد نہیں تھا۔ پانچ سال قبل جب وہ فہمیدہ کو بمبئی سے لے گئی تھی تو گلابے اپنے دو ساتھیوں سمیت ہوٹل میں آیا تھا۔ ایک کا نام لولا تھا۔ ممکن ہے تیسرا شخص نورجانی ہو۔ ہمیں دو تین جگہ ٹیکسی رکوانی پڑی۔ معلوم ہوا کہ نورجانی شام کو پارک میں بیٹھتا ہے۔ اس مرتبہ چمپا بھی میرے ساتھ ٹیکسی سے اُتر گئی تاکہ وہ میری لگام تھامے رکھے۔ اگر نورجانی وہی شخص تھا جو گلابے کے ساتھ چمپا سے ملا تھا تو بھی اُسے پہچاننے کے لیے

چمپا کا میرے ساتھ ہونا ضروری تھا۔ چند قدم چل کے چمپا ٹھٹک کے رک گئی۔ نقاب سرکا کے مجھ سے سرگوشی میں بولی۔"سنو، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اُس شخص سے پہلے مل چکی ہوں۔"
میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا۔ ایک بینچ پہ مختصر جسم اور لمبے ہاتھوں والا ایک آدمی اکیلا بیٹھا تھا۔ نیچے سبزے پر دو لڑکے بیٹھے ہوئے اُس کے پیر دبا رہے تھے۔ میں چمپا کو کچھ فاصلے پہ ٹھہرا کے آگے بڑھا۔"کیا نورجانی تم ہو؟" میں نے دبے دبے لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔
وہ چونک گیا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اُس نے دونوں لڑکوں کو ٹانگیں مار کے دھکیلا اور سینہ آگے کر کے بولا۔"کون ہو؟ تم کون ہو؟" میری آواز میرے اختیار میں نہیں رہی۔
"کیا کام ہے؟" اُس نے مجھے حقارت سے گھورتے ہوئے کہا۔
"ضروری کام ہے۔"
"بولو۔" وہ چہرہ جھٹک کے بولا۔
"یہاں نہیں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔
"اِدھر ہی بات کرو۔" اُس نے لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔
میری عقل خبط ہوگئی کہ میں اس کی آنکھیں نکالنے سے پہلے اُس کے بارے میں کیا بات کروں۔ میری اُلجھن دیکھ کے چمپا لپکتی ہوئی آئی اور اُس نے نقاب اُٹھا دیا۔"مجھے پہچانتے ہو نورجانی؟" نورجانی نے آنکھیں پھاڑ کے چمپا کی طرف دیکھا اور کچھ بوکھلا سا گیا۔ وہ بینچ سے اُٹھ کے کھڑا ہوگیا۔ خود ہی نورجانی کی کشمکش دُور کر دی۔"میں چمپا ہوں۔ گھور کیا رہے ہو؟"
"چمپا!" اُس نے حیرانی سے چمپا کا نام دہرایا۔
"ہاں میں! ارے نورجانی! کیا گھاس کھانے لگے ہو؟ چمپا بائی کو نہیں پہچانتے؟ تو پھر تم گلابے کو اور لولے کو بھی کہاں پہچانتے ہوگے۔"
"چمپا بائی؟" نورجانی ابھی تک اُسے پہچاننے کی کیفیت سے دوچار تھا۔
"ارے سب کچھ بھول گئے؟ وہ لڑکی یاد نہیں ہے؟ وہ فہمیدہ۔"
نورجانی کو پھر بھی چمپا کو پہچاننے میں تامل ہوا مگر جب چمپا نے ہوٹل، گلابے، لولے اور فہمیدہ کے متعلق کچھ اور اشارے دیے تو اُس کا منہ کھل گیا۔"چمپا۔ چمپا بائی۔ تم بنارس والی چمپا بائی ہو۔ ارے تم تو بالکل بدل گئی ہو۔ معاف کرنا، میں تو بالکل بھول گیا۔ کب آئی ہو؟ کہاں ٹھہری ہو؟" نورجانی کے چہرے پہ ندامت اور مسرت چھائی ہوئی تھی۔
"اب کیا یہیں کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہو گے؟ کہیں بیٹھو گے بھی یا نہیں؟ اب کے بمبئی بہت بدلی ہوئی ہے نورجانی! اور بات نہیں۔"
"نہیں نہیں چمپا بائی! بتاؤ کہاں ٹھہری ہو؟"
"وہیں جہاں تم گلابے کے ساتھ آئے تھے۔"
"اسی دادر کے ایرانی چوک کے ہوٹل میں؟"
"ہاں ہاں وہیں۔ اور کہاں ٹھہرتی۔"

"گلابے تو سالا بہت بگڑ گیا تھا۔ ایک ہاتھ بڑا اُلٹا پڑ گیا تھا۔ سال ۔۔۔زیادہ ہوگیا۔ اُدھر ہی ہوا کھا رہا ہے۔"
"چھوڑو مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" چمپا لاپرواہی سے بولی۔
"مگر۔ مگر چمپا بائی! اپن نے وہ دھندا چھوڑ دیا۔ وہ بھی سالا گلابے ۔۔۔نہیں میں کچھ دنوں کے لیے مغز پھر گیا تھا۔ یہ دھندا اپن کو سجا نہیں چمپا بائی۔"
"وہ بات نہیں ہے۔" چمپا سرگوشی میں بولی۔
"پھر تو کوئی بھی کام ہو تمھارے لیے سر حاضر ہے۔"
"تو آج رات کو آ جاؤ۔"
"ٹھیک ہے چمپا بائی!" نورجانی نے نیازمندی سے کہا۔"اپن ضرور آئیں گا۔ ۔۔۔کے بل آئیں گا۔ ذرا پان وان تیار رکھنا۔ تمھارے ہاتھ کا بیڑا اب ۔۔۔یاد آتا ہے۔"
"انتظار کروں گی۔" چمپا نے میرا ہاتھ پکڑا۔ میں وہاں سے جانا نہیں چاہتا ۔۔۔ چمپا مجھے کھینچتی ہوئی ٹیکسی تک لے آئی۔
"تم نے اُسے ابھی ساتھ کیوں نہیں لے لیا؟" میں نے تنک کے کہا۔
"رات ہونے میں دیر ہی کتنی باقی ہے۔"
"ابھی کیوں نہیں؟" میں نے غصے سے کہا۔
"ابھی نہیں۔" چمپا نے پہلی بار مجھے رکھائی سے جواب دیا۔ میں خون کا ۔۔۔گھونٹ پی کے رہ گیا۔ ہوٹل واپس آ کے چمپا بستر پہ لیٹ گئی اور مجھے سمجھانے ۔۔۔ اُس کی بات بھی مناسب ہی تھی۔ پھر اُس نے کھانا منگوا لیا۔ وہ سمجھ رہی ۔۔۔تھی کہ مجھے بھوک لگی ہوگی۔ میں نے اُس کے اصرار پر ایک دو لقمے زہر مار کر لیے۔ ۔۔۔نظریں دروازے پہ لگی ہوئی تھیں۔
رات کے نو بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو مجھ سے اپنی بے چینی ۔۔۔برداشت نہیں ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو نورجانی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ۔۔۔اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے اُسے دروازے سے کرسی تک لائی۔ میرا جسم اکڑنے ۔۔۔لگا۔ نورجانی نے اپنی گردن جبراً سینے سے چپکائی۔
اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں کر کے چمپا نے نورجانی کے آگے پھلوں، ۔۔۔بسکٹوں اور چائے کا خوان سجا دیا۔ وہ بمبئی کے حالات پوچھتی رہی پھر خاصی ۔۔۔دیر بعد اپنے مطلب پر آئی۔"نورجانی! یاد ہے تمھیں وہ لڑکی فہمیدہ، پانچ سال ۔۔۔پہلے گلابے نے جس کا سودا کیا تھا۔"
"کیوں یاد نہیں۔" نورجانی ہنستے ہوئے بولا۔"مگر چمپا بائی! تم نے کوڑیوں کے ۔۔۔مول کیا تھا۔ گلابے بعد کو بہت پچھتایا تھا۔ کہتا تھا کہ چمپا بائی من مار کے ۔۔۔لے گئی۔ اگر کچھ دیر اور رک جاتا تو پانچ کے بجائے دس ہزار ضرور ۔۔۔ملتے۔ ایمان کی بات ہے چمپا بائی! چھوکری ایک دم نئی تھی۔ پولیس ۔۔۔ڈبے میں بند تھی۔ ایک دم فسٹ کلاس۔"
چمپا نے اپنا ہاتھ رکھ کے میرا بازو دبایا۔"اُس لڑکی نے نورجانی ہمیں بہت پریشان کیا۔ بہت ضدی نکلی۔"
"جانور کو بھی سدھانا پڑتا ہے تب کھونٹے پہ آتا ہے چمپا بائی، جتنا نگ اچھا ہوگا اتنی ہی قیمت زیادہ ہوگی۔ اتنے ہی اُس کے نخرے اُٹھانے پڑتے ہیں۔ آزاد پنچھی پنجرے میں بند ہو کے پھڑپھڑائے گا تو ضرور۔ بعد کو تو وہ خوب چہکی ہوگی۔ سونا اُگلا ہوگا۔ سونا اُس نے تمھارے لیے۔ سیپی میں بند سچا موتی لے گئی تھیں۔"
"جانے دو مت پوچھو کیسا کیسا ستایا اُس نے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر نتھ کے ہی تم نے دس ہزار سے کم کیا لیے ہوں گے۔ چھوکری اِدھر آئی، اُدھر تمھارے ہاتھ میں چلی گئی۔ گلابے کا دل ریجھ گیا تھا۔ کہتا تھا بس یار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اُسے گھر میں بٹھا لوں اور پوجا کرتا رہوں۔ وہ تو درمیان میں تم ٹپک پڑیں اور گلابے کے کانوں میں سکے کھنکھنانے لگے۔" مجھے چکر آنے لگے۔ چمپا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
"وہ لڑکی مر گئی نورجانی۔" چمپا بائی نے آہستگی سے کہا۔
"مر گئی؟" نورجانی کی آواز بیٹھ گئی۔"نہیں چمپا بائی! مذاق مت کرو!"
"ہاں نورے!" چمپا اداسی سے بولی۔"وہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔"
"ہائے۔" نورجانی کرب سے بولا۔"اسی لیے سالا اپن نے یہ دھندا چھوڑ دیا۔ اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی چمپا بائی! گلابے بھی نہیں پنپا۔ سالے کو آہ لگ گئی۔ وہ لڑکی بہت معصوم تھی چمپا بائی۔ اپن کو پتہ نہیں سالوں نے کہاں سے اُٹھایا تھا، ورنہ جی میں آئی تھی کہ چپکے سے اُس کے گھر چھوڑ آؤں۔" نورجانی کی آواز ڈوبنے لگی۔
"کیا مطلب؟ یعنی نورجانی تمھیں معلوم نہیں تھا کہ گلابے نے اسے کہاں سے اُٹھایا تھا، تم تو بات کرنے یہاں اُن کے ساتھ آئے تھے؟"
"وہ چھوکری لولے نے اُٹھائی تھی چمپا بائی! جب چھوکری اُٹھ کے آگئی تب انھوں نے اپن کو مُلا کے دکھایا تھا۔ پانچ سو روپلے اپن نے بھی حرام کیے تھے، اپن نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ چھوکری اُٹھانے وُٹھانے کا کام اپن سے نہیں ہوگا۔ پر بات ایک ہی تھی۔ چھوکری اُٹھ جانے کے بعد اُن لوگوں کا ساتھ دینا بھی منہ کالا کرنا تھا۔ اپن نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ چمپا بائی۔ تم نے اپن کو بہت بُری خبر سنائی۔"
"کیا بتاؤں نورجانی، اپنے دل میں بھی پھانس لگ گئی۔ بڑے بڑے لوگ دھن کی پوٹلیاں لے کے آئے وہ تیار نہیں ہوئی، آخر چلی گئی۔ نورجانی!" چمپا نے میرا ہاتھ چھوڑ کے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔"کسی صورت سے تم اُس کے گھر کا پتہ چلا سکتے ہو؟"
"اپن کو کیا معلوم۔" نورجانی نے یاسیت سے کہا۔ پھر چونک کے بولا۔"مگر چمپا بائی! تم کو اُس کے گھر سے کیا غرض ہے۔ کیا اس گھر کی اور چھوکری کو نشانہ لگائے بیٹھی ہو۔ اپن تمھارا ساتھ نہیں دے گا۔ صاف صاف کہے

دیتا ہوں۔"

"نہیں نور جانی! ایسی بات نہیں، کچھ اور بات ہے۔ شک مت کرو۔ بات یہ ہے کہ مرتے وقت فہمیدہ نے ایک وصیت کی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم ہوگا، میری عقل پہ بھی پتھر پڑ گئے تھے، ہڑبڑاہٹ میں نام پتہ نہیں پوچھ سکی۔ کسی طرح اس کے گھر کا پتہ چلا سکتے ہو تو ایک بھلائی کر دو، میرے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا، میں اس کے باپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

نور جانی کچھ دیر سوچتا رہا، چمپا نے پھر اسے یقین دلایا کہ اس کی نیت صاف ہے۔ "اب تو ایک ہی طریقہ ہے کہ میں کولے یا گلابے سے ملنے جیل جاؤں۔ پتہ بتانے میں حجر مجر تو بہت کریں گے مگر کسی نہ کسی طرح پوچھنے کی کوشش کروں گا۔ دو تین دن انتظار کرو چمپا بائی!"

"میں انتظار کر لوں گی، میں خود جیل چلی جاتی مگر وہ مجھے آسانی سے نہیں بتائیں گے۔ تم ان کے ساتھ رہ چکے ہو، شاید لحاظ مروت کر لیں۔"

رات کے گیارہ بجے تک نور جانی بیٹھا رہا۔ میں نے تکیے میں منہ چھپا لیا تھا۔ چمپا بار بار میری پشت پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دیتی اور ہمت کی تلقین کرتی تھی۔ چلتے وقت نور جانی کو خیال آیا تو اس نے میرے بارے میں پوچھا۔ چمپا نے ضرور کوئی اشارہ کیا ہوگا کہ نور جانی نے پھر کچھ نہیں پوچھا، چمپا اسے دروازے تک رخصت کرنے گئی۔ دروازے کے باہر اس نے میرے بارے میں کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا۔ ممکن ہے کچھ خیال کر لیا ہو، نہیں بتایا ہو کہ میں ایک بے حیا آدمی ہوں۔

نور جانی کو رخصت کرنے کے بعد چمپا آ کے میرے سرہانے بیٹھ گئی، میں نے اپنا سر نہیں اٹھایا تو اس نے کچھ دیر بعد میرے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہاتھوں کے لمس سے میرے جسم میں ابال آنے لگا۔ میں نے خود کو بہت روکا۔ چمپا نے میرا سر گود میں لے لیا تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا، میں اس کی گود میں ہچکیاں لینے لگا۔ "نہیں بیٹے، روتے نہیں۔" وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولی اور خود پھٹ پڑی۔ اس نے میرے پیروں پہ سر رکھ دیا اور میرے ہاتھوں سے اپنے گالوں پہ طمانچے لگانے لگی۔

صبح ہوتے ہی میں چمپا سے کچھ کہے بغیر ہوٹل سے نکل گیا۔ جیل کے دروازے پر سنتری نے مجھے روک لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جیل میں قیدیوں سے کس طرح ملاقات کی جاتی ہے۔ جب میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچا اور کولے یا گلابے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے حیل حجت سے کام لیا۔ "دو تین دن بعد آنا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تمھاری درخواست پر غور کر لیا جائے گا۔"

"مگر مجھے اس سے ابھی ملنا ہے۔" میں نے التجا کی۔

"تمھیں اجازت کا انتظار کرنا ہوگا۔" وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"سپرنٹنڈنٹ صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ بڑا احسان ہوگا۔" میں نے اس کی منت کی۔ "مجھے واپس مت کیجیے، مجھے گلابے سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"تم سے جو کہہ دیا وہ تم نے نہیں سنا۔" وہ سختی سے بولا۔

"سن لیا جناب! مگر مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میں آپ سے
کر رہا ہوں۔"

"چلو کل دس بجے آ جانا، جیل میں سختی ہو گئی ہے، قیدیوں کی درخواستوں پر جیلر صاحب خود غور کرتے ہیں، سمجھے۔"

"پھر مجھے جیلر صاحب سے ملا دیجیے۔" میں نے تیزی سے

"اور ہم جو تم سے کہہ رہے ہیں، جاؤ کل آنا۔" اس نے

میں وہیں کھڑا رہا تو اس نے مجھے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ میں
رہا۔ سپرنٹنڈنٹ نے توجہ نہیں دی۔ میں مایوس ہو کے واپس
اچانک میرے ذہن میں راج کرشنا کا نام کوندا۔ میں پلٹ کے
کی میز پہ لپکا۔ میں نے اس سے ایک فون کرنے کی اجازت طلب

"کسے فون کرو گے؟" وہ بگڑے تیوروں سے بولا۔

"میں راج کرشنا صاحب کو فون کرنا چاہتا ہوں، وہ پرکل ہی دلی سے بمبئی آئے ہیں، ویسے وہ مدراس کے بہت افسر ہیں۔"

"راج کرشنا!" وہ حیرت سے بولا۔ "تم انھیں کیسے جانتے

"آپ ان سے فون ملا دیجیے، وہ میری سفارش کر د
جوش میں کہا۔ "وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

وہ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے سوچنے لگا، پھر اس نے
بڑھا دیا۔ میں نے اس سے فون نمبر پوچھا تو اس نے فون اپنی
اور گھنٹی بجا کے سپاہی کو طلب کیا۔ سپاہی آیا تو اس نے کولا
کسی کو بلانے کا حکم دیا اور مجھے سپاہی کے ساتھ کر دیا۔ میں
کہا کہ وہ صرف کولا کو بلائے۔

سلاخوں کے پیچھے جب بڑھی ہوئی داڑھی اور ا
تباہ حال شخص برآمد ہوا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ "تم کولا
سلاخیں پکڑ کے بے قراری سے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے زمین پر تھوک کے جواب دیا۔

"کولا دادا! میں تمھارے پاس ایک ضروری کام
میری بات سن لینا، پھر جواب دینا۔"

"بات کرو۔" وہ برگشتگی سے بولا۔

"کولا دادا! دور سے آ رہا ہوں، مایوس مت لوٹانا۔"

"کیا بوم مارتا ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "کون ہے

"کولا دادا! ذرا غور سے سنو۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کے
پانچ سال پہلے تم نے ایک لڑکی کو جس کا نام فہمیدہ تھا،

پانچ ہزار روپے میں چمپا بائی کے ہاتھ بیچ دیا تھا، یہ سودا دادر کے
جوکر کے ہوٹل میں ہوا تھا۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، وہ ہکلانے لگا۔ میں نے اس
آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ "اپن نے کسی چھوکری کو اغوا نہیں
تم کسی نے جھوٹ بکا ہے، اپن کا چھوکری کے دھندے سے کوئی ناتا نہیں۔"

"کولا دادا! تمھارا انکار بے کار ہے، وہ لڑکی مر چکی ہے۔ تم جیل میں
پانچ سال درمیان میں گزر گئے ہیں۔ میں تمھیں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ
کون تھی لیکن وہ مجھ سے اتنی قریب ضرور تھی کہ میں تمھارا خون کر سکتا
میں اب بھی تمھارے جیل سے نکلنے کا انتظار کر سکتا ہوں۔ جو ہو گیا سو ہو
اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ میں یہاں تم سے صرف اتنا معلوم کرنے
ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے گھر کا پتہ بتا کے اپنی زندگی کی ایک نیکی ضرور
میں فہمیدہ کا خون معاف کر دوں گا۔"

"اپن کچھ نہیں جانتا، کچھ نہیں جانتا۔" وہ ہذیان بکنے لگا۔

"تم سب کچھ جانتے ہو کولا! میں تم سے کوئی بڑا مطالبہ نہیں کر رہا ہوں۔
ی جیب میں چاقو ہے اور میں اتنا حوصلہ بھی رکھتا ہوں کہ فہمیدہ کے نام پہ
ارے جسم میں بھونک دوں، تم کسی طرف بھی بھاگ گئے، میرا نشانہ خطا نہیں
تمھارا انکار بے سود ہے۔ میں سب کچھ جان کے ہی یہاں آیا ہوں،
گھر بتانے میں تمھارا کچھ نہیں جاتا۔ کولا بتا دو۔ کسی پہ ایک احسان بھی
کوئی ضرورت مند تمھارے پاس آیا ہے۔" اس نے اپنا چہرہ دونوں
سے چھپا لیا۔ "وقت نکلا جا رہا ہے۔ کولا دادا بتا دو، اپنی ماں اور
کے واسطے بتا دو۔ تمھارا کوئی خدا ہے تو اس کے نام پہ بتا دو۔"

"اپن نے اسے دادر سے اٹھایا تھا۔" خاصی دیر بعد اس کی رندھی
آواز ابھری۔ "وہ گوکل بلڈنگ میں رہتی تھی اور اس بلڈنگ کے ایک
سے ملنے کبھی کبھی دادر کے پارک میں جاتی تھی۔ اپن بہت دنوں
اس کا پیچھا کر رہے تھے، پھر ایک رات....."

"میں صرف پتہ پوچھ رہا ہوں کولا۔" میں نے وحشت سے کہا۔

"وہ گوکل بلڈنگ کے تیسرے مالے پہ رہتی تھی۔ بھاٹیا ریسٹورنٹ
پچھلی والی گلی میں یہ بلڈنگ ہے۔"

"اور وہ لڑکا جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے؟"

"وہ اسی بلڈنگ کی کھولی میں اکیلا رہتا تھا، پڑھتا تھا اور کہیں کام
تا تھا، مگر اس کے بعد اپن نے اسے دادر میں نہیں دیکھا۔"

"لڑکے کا نام؟"

"اپن کو نہیں معلوم۔ پھر اپن نے دادر ہی چھوڑ دیا۔"

میں نے سلاخیں چھوڑ دیں۔ کولا کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، میرے
میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میں تیزی سے اٹھ کے چلا آیا۔ کولا مجھے
دیکھتا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد میں ٹیکسی میں بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے
بھاٹیا ریسٹورنٹ پہ جب گاڑی روکی تو مجھے اپنی خبر ہوئی۔ ہاتھ میں جتنے پیسے آئے، میں اسے دے کے سڑک پہ بے تحاشا بھاگنے لگا۔ بھاٹیا ریسٹورنٹ کے پیچھے والی گلی میں آ کے میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ چکر آنے لگا۔ پیر جواب دے گئے۔ سامنے گوکل بلڈنگ تھی۔ سانس قابو میں نہیں تھی۔ آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ اور ایسا لگتا تھا، جیسے ابھی دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ گوکل بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے جنگلا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ سامنے سیڑھیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا۔ اوپر جاؤں یا واپس ہو جاؤں۔ ابا جان دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ ان کا سامنا کس طرح کروں گا، کیا کہوں گا۔ گرتا پڑتا تیسرے مالے پہ پہنچا تو آمنے سامنے دو دروازے تھے، یہ سوچتے ہوئے دہشت لگ گئی کہ ادھر دستک دوں یا ادھر دستک دوں۔ ہمت کر کے ایک دروازے پہ آہستہ آہستہ ٹھوکے مارے، ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ میرا حلق خشک ہو گیا، لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "صفدر زماں خاں یہیں رہتے ہیں؟"

"کون! کس کو مانگتا ہے؟" بوڑھی عورت نے شفقت سے کہا۔

"صفدر خاں، وہ ایک عمر رسیدہ آدمی ہیں۔ مجھے بتایا ہے وہ گوکل بلڈنگ کے تیسرے مالے پر رہتے ہیں۔ کیا برابر والے فلیٹ میں تو نہیں رہتے؟"

"گوکل بلڈنگ، تیسرا مالا، ہاں ہاں یہ ادھر ہی ہے، پر یہاں کوئی صفدر خاں نہیں، برابر فلیٹ میں لطیف بھائی رہتا ہے، یہ فلیٹ میں داؤد بھائی عینک والا رہتا ہے، تم کیدھر آ گیا بیٹا؟"

"اوپر نیچے کی کسی منزل پر صفدر خاں نہیں رہتے؟" میری زبان میں لکنت آ گئی۔

"ادھر بلڈنگ میں آٹھ فلیٹ ہے۔ ہم کسی صفدر خاں کو نہیں جانتا۔"

"آپ لوگ کب سے رہتے ہیں؟"

"ہم کو چار سال کے لگ بھگ ہو گیا۔"

"چار سال پہلے اس فلیٹ میں کون صاحب رہتے تھے؟" میری آواز ڈوبنے لگی۔ "آپ نے یہ فلیٹ کس سے لیا تھا؟"

"ہو سکتا ہے وہ صفدر خاں ہی ہو جسے تم مانگتا ہے۔" بوڑھی عورت سر ہلا کے بولی۔ "تم ایسا کرو، نچلے مالے پر مولوی اکرم رہتا ہے وہ ادھر کا پرانا آدمی ہے، تم اس سے بات کر کے دیکھو۔"

میں ڈگمگاتے قدموں سے نیچے اتر آیا۔ مولوی اکرم نماز پڑھنے کے لیے گئے ہوئے تھے، ان کی نوجوان لڑکی نے مجھے باہر کے مردانے کمرے میں بٹھانا چاہا۔ میں زینے پر ہی بیٹھ گیا۔ یہ لڑکی ضرور فہمیدہ، فرخ، فریال اور فارہ کو جانتی ہوگی مگر پانچ سال گزر گئے، جب تو یہ بہت چھوٹی ہوگی۔ چشمہ لگائے ہوئے زیادہ عمر اور نورانی چہرے کے مولوی اکرم جلد ہی واپس آ گئے۔ سلام کے بعد جب میں نے انھیں اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینے لگے۔ "پہلے تو مجھے یہ بتاؤ، تم ان کے کون ہوتے ہو؟"

"میں اُن کا عزیز ہوتا ہوں" میں نے نگاہیں نیچی کر کے کہا۔

"وہ تو چلے گئے میاں! اُن کو گئے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ جب جاتے فلیٹ کی چابیاں گھر میں دے گئے۔ میں ہر جمعرات کو شاہ صاحب کے مزار پہ جاتا ہوں، رات گزار کے واپس آیا تو چابیاں موجود تھیں اور گھر میں کوئی نہیں تھا، رات ہی رات تمام بچوں کو لے گئے، ضروری سامان کے سوا باقی تمام سامان بھی چھوڑ گئے۔ فلیٹ کو پگڑی پہ بھی نہیں دیا۔ گھر آیا تو ایک پرچی اور مختار نامہ۔ مختار نامہ ہی اسے کہہ لو۔ رکھا تھا۔ میں نے ایک سال انتظار کیا، سامان ایک کمرے میں بند کر کے فلیٹ کو پگڑی پہ اُٹھا دیا۔ اوپر داؤد بھائی رہتے ہیں، شریف آدمی ہیں۔ اُنھوں نے وعدہ کیا ہے۔ جب صفدر خاں واپس آئیں گے تو یہ اپنی دی ہوئی پگڑی واپس لے کے فلیٹ خالی کر دیں گے۔ پگڑی کی رقم میرے پاس امانت رکھی ہے۔"

"وہ اچانک کیوں چلے گئے؟"

"بس چلے گئے، غیرت مند آدمی تھے، چلے گئے" مولوی اکرم اُداسی سے بولے۔ "آئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ چلے گئے اور ظالم بتا کے بھی نہیں گئے۔ مجھ سے بھی نہیں کہا جس سے روز بات کرتے تھے۔ بلڈنگ میں ایک صرف میں تھا جس سے ملنا پسند کرتے تھے۔"

"وہ یہاں کیا کرتے تھے، آپ نے اُن سے نہیں پوچھا کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کے بمبئی کیوں آ گئے تھے؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں کرتے تھے، دن بھر گھر میں رہتے تھے کبھی باہر نکلتے تو لائبریری جا کے بیٹھ جاتے تھے۔ موٹی موٹی کتابیں تھیں اور وہ تھے۔"

"موٹی موٹی کتابیں، لائبریری۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ انھیں مطالعے کا ایسا شوق تو نہیں تھا۔"

"کیا بتائیں میاں! بس کچھ مت پوچھو" مولوی اکرم رونہاسے ہو گئے۔

"بتائیے۔ میں بہت دور سے انھی کی تلاش میں آیا ہوں، آپ ان کے بارے میں جو کچھ جانتے ہوں خدا کے لیے ہر بات بتائیے" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مگر آپ کون ہوتے ہیں اُن کے" مولوی اکرم نے تشویش سے پوچھا "آپ اُن کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے اتنے مضطرب کیوں ہیں؟"

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ وہ میرے عزیز ہوتے ہیں۔ رشتے داروں — نے بغیر چلے آتے تھے۔ بڑی مشکل سے مجھے اُن کا پتہ چلا تو میں یہاں ہوں۔"

"آپ ان کے کیا لگتے ہیں بھلا؟" مولوی اکرم نے کُرید کی تو میں نے اِدھر اُدھر کی رشتے داری بتا کے اُنھیں ٹالنا چاہا۔ وہ مطمئن نہیں ہوتے۔ اُن کے اطمینان کے بعد ہی ممکن تھا کہ وہ مجھے اپنے دوست کے نجی حالات بتائیں۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اُنھیں نہ جانے اس رازداری کا خیال کیوں آ گیا تھا۔

"اُن کے بچے تو سب ٹھیک تھے؟"

"ہاں سبھی ٹھیک تھے" مولوی اکرم آزردگی سے بولے۔ میں نے ایک ایک کا نام لے کے پوچھا تو وہ مجھے نظروں میں تولنے لگے۔ "کہیں" وہ بوکھلا کے بولے "تمھاری ناک اور آنکھیں اُن سے مشابہ ہیں۔ کہیں تم اُن کے بچھڑے ہوئے بیٹے بابر زماں تو نہیں؟ مجھے سچ سچ بتاؤ؟"

"میں وہ نہیں ہوں" میں نے سر جھٹک کے کہا۔

مولوی صاحب اداس ہو گئے "تم چھپا رہے ہو۔ خیر، مجھ سے چھپانے سے کیا حاصل ہوگا۔ وہ اپنے بیٹے بابر زماں کو یاد کرتے تھے۔ میرا خیال ہے مجھے اب تمھیں سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمھارے لیے کچھ ناشتہ پانی منگاتا ہوں۔" انھوں نے اپنی لڑکی ریحانہ کو آواز دے کے چائے وغیرہ کے لیے کہا۔ مولوی اکرم کے لہجے میں سرگرمی آ گئی تھی۔

"آپ کچھ بتا رہے تھے" میں نے انھیں ٹوکا۔

"ہاں! بتا رہا تھا میاں، کیا بتاؤں، کیا نہ بتاؤں، وہ چلے گئے۔ اتنے دنوں بعد انھیں کوئی پوچھنے آیا ہے۔ صفدر اپنے ساتھ بہت دکھ لائے تھے۔ اُن کا بیٹا گھر سے جا چکا تھا۔ اُن کی بیوی مر چکی تھی۔ انھیں کچھ فکر نہیں تھی۔ دن بھر کمرے میں بند ہو کے کاغذات پر جھکے رہتے تھے، نہ گھر کا ہوش تھا نہ دنیا کی خبر۔ جو جمع پونجی لے کر آئے تھے، اسی پہ گزارا کر رہے تھے۔ بچے نیک تھے۔ یوں کہو انھیں ..."

"مگر اُن کے پاس کیسے کاغذات تھے، جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں —؟"

"نہ جانے کہاں سے ردی کی دکان سے کچھ کرم خوردہ لے آئے تھے، نامعلوم زبان میں ان پر آڑے ترچھے نشان بنے تھے۔ جنھیں سمجھنے کے لیے وہ موٹی موٹی لغات استعمال کرتے۔ صبح و شام بس ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ کاغذات سیاہ کرتے رہیں، ان پہ جھکے رہیں جیسے ان میں کوئی خزانہ چھپا ہو۔ پہلے تو میں سمجھا کہ کسی خزانے کا کوئی نسخہ اُن کے ہاتھ آ گیا ہے۔ بار بار پوچھتا تھا۔ "برادرِ عزیز! باہر نکل کے دیکھا کرو۔ یہ کیا ہر وقت ان بوسیدہ کاغذوں میں ..." وہ میری باتیں ہوش سے سنتے تھے اور مسکرا کے خاموش ہو جاتے تھے۔ ایک دن میں نے ان کے آگے سے کاغذات اُٹھا لیے۔ خاصے ناراض ہو گئے۔ میں نے انھیں جلد ہی واپس کر دیا۔ بعد کو میں نے احتیاط رکھی۔ ایک دن مزاج خوش گوار تھا، شاید کوئی نکتہ ہاتھ آ گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ... جوش میں کہنے لگے۔ میاں مولوی اکرم! یہ خزانہ ہے، یہ کاغذات کی قدر میں ہی جانتا ہوں۔ ان میں دنیا بھر کی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میں نے کہا۔ ہٹائیے بھی صفدر میاں۔ آپ نے اپنی زندگی کیوں کاغذوں کے پیچھے ہلکان کی ہوئی ہے۔ بچوں کو دیکھیے۔ فہمیدہ جوان ہے اور فرخ بھی اب بہت سیانی ہو گئی ہے۔ ان کی شادیاں کیجیے۔ کچھ کام دھام کیجیے۔ باہر نکلیے، رشتے ایسے تھوڑی آ جائیں گے۔ کہتے تھے بس میں فارغ ہونے ہی والا ہوں۔ پھر رشتے گھر آیا کریں گے۔ تم دیکھنا میاں مولوی اکرم، میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ہم بمبئی چھوڑ دیں گے۔ ایک محل بنائیں گے۔ بہت بڑی جاگیر ہو گی۔ ہر طرف کھیت ہی کھیت اور باغات ہی باغات ہوں گے۔ گھوڑے، ہاتھی اور خدام کی فوج، جب سواری نکالا کریں گے لوگ سر جھکا لیا کریں گے۔ میں اُن کا دل رکھنے کے لیے ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ مجھے اُن پر بڑا ترس آتا تھا۔ دن بھر یہی خواب دیکھتے رہتے تھے۔"

"کیسے کاغذات تھے وہ؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"کسی کباڑیے نے دیے ہوں گے۔ مومی کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں بار بار دیکھا تھا۔ ایک ہی چیز مجھے ان میں صاف نظر آتی تھی، وہ تھی مہاتما بدھ کی تصویر۔"

"مہاتما بدھ کی تصویر!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، وہی بدھ کا خاص بیٹھنے کا انداز، دونوں ہاتھ زانوؤں پر رکھے ہوئے، آنکھیں بند، چہرہ پُرسکون، دنیا کے ہر غم سے بے نیاز۔"

"کیا ان کاغذات کی رنگت زرد تھی اور وہ سنہرے کتھئی حرفوں سے بھرے ہوئے تھے؟" میں نے مضطرب ہو کے پوچھا۔

"ہاں! کچھ ایسا ہی تھا۔ صفدر خاں نے سیاہ روشنائی میں ان کی نقلیں اُتار لی تھیں۔ بس انھیں دنیا کی کوئی فکر نہیں رہ گئی تھی۔ کاغذات میں زندہ تھے۔ پیسے ویسے کی طرف سے بے نیاز تھے۔ اچھا خاصا سچ ... فلیٹ اس وقت انھوں نے پچیس ہزار روپے میں لیا تھا، اب قیمت بڑھ گئی ہے۔ کیا تم ان کاغذات کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" انھوں نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

میں دم بخود تھا، ان کے سوال پر چونک گیا۔ "ہاں مجھے کچھ ایسا یاد ہے کہ میں نے یہ کاغذات ان کے گھر میں دیکھے تھے" میں نے سنبھل کر کہا۔

"ہوں نہ ہوں، یہ وہی کاغذات تھے جو کورا بدھ گیا سے فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ لائی تھی۔ ان کے ساتھ ہیرے جواہرات کی ایک تھیلی بھی تھی۔"

"اُس کے بعد ایک حادثہ پیش آ گیا" مولوی اکرم کی آنکھیں بھر آئیں۔ "بس اُس کے بعد وہ اُکھڑ گئے، بات ہی نہیں کر پاتے تھے۔ چپ چاپ پڑے رہتے تھے۔"

مجھے اندازہ تھا کہ مولوی اکرم اب کیا کہنا چاہتے ہیں، میں نے گردن جھکا لی۔ "اُن کی بڑی لڑکی فہمیدہ ایک رات گھر سے غائب ہو گئی" مولوی اکرم کے گلے میں آواز پھنس گئی "اور وہ ہم سب سے منہ چھپا کے چلے گئے۔" انھوں نے اپنے آنسو پونچھ کے کہا "فہمیدہ بڑی سعید بچی تھی، نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ نیچے کھولی میں رہنے والا ایک نوجوان، صورت شکل سے تو شریف ہی معلوم ہوتا تھا۔ اوپر صفدر میاں کے پاس آتا تھا۔ فہمیدہ کے غائب ہونے کے بعد وہ بھی نہیں دیکھا گیا۔ اللہ جانے کیا بیتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آپ کے خیال میں صفدر صاحب اب کہاں ہوں گے؟" میں نے حماقت کی بات پوچھی۔ مولوی اکرم نے اس سوال کا وہی جواب دیا جو انھیں دینا چاہیے تھا۔ مولوی اکرم، آپا جان اور گھر کے حالات بتاتے رہے اور میں گنگ بیٹھا سنتا رہا۔ وہ اپنی آواز کا درد میرے کانوں میں منتقل کرتے رہے اور میں نے ایک آہ بھی نہیں بھری۔ رکھے رکھے چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ پھر اُن کی بچی نے آواز دے کے بتایا۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اٹھ کے چلنے لگا تو انھوں نے میرا دامن پکڑ لیا۔ بہت روکا، گلے لگایا، کہا، کہاں جاؤ گے۔ مگر میں انھیں سلام کر کے چلا آیا۔

واپس آتے ہوئے مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ نہ ذہن پر کوئی بوجھ تھا نہ سینے میں آگ لگ رہی تھی، نہ ٹانگوں میں تھکن کا احساس تھا۔ جدھر منہ اُٹھا اُدھر چلتا رہا، چلتا رہا۔ اسی طرح رات ہو گئی مگر میرے قدم نہیں رُکے۔ کسی جگہ ایک سپاہی نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا اول فول بکتا رہا۔ گالیاں دیں، جھڑکیاں دیں، میں نے کچھ نہیں کہا تو اُس نے ملائمت سے پوچھا۔ "کدھر رہتا ہے؟" میں نے پتہ نہیں کیا جواب دیا کہ وہ میری جیبیں ٹٹولنے لگا۔ "بائیں چاقو! نقدی! تجھے تھانے چلنا ہوگا" میں نے کچھ نہیں کہا مگر جب اُس نے میرا جسم ٹٹولا اور اُس کے ہاتھ مالا کے دانوں سے ٹکرائے تب مجھے ہوش آیا۔ وہ میری مالا اُتارنے ہی والا تھا کہ میں نے چیخ کے اُسے دور دھکیل دیا۔ اُس نے سیٹی بجائی۔ چاقو اور نقدی اُس کے پاس رہ گئی۔ میں بھاگتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا اور راستوں راستوں ہوتا ہوا ایرانی جو کر کے ہوٹل پہنچ گیا۔

چمپا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میں کمرے میں پہنچ کے اُس کے بازوؤں میں گر گیا پھر مجھے کچھ خبر نہ رہی۔ صبح ہوئی اور آنکھ کھلی تو چمپا میرا سر اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھی اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ جھنجھوڑ رہی تھی، پوچھ رہی تھی کہ میں کہاں غائب تھا۔ میری خاموشی سے گھبرا کے اُس نے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ ڈاکٹر نے میرے سوئیاں بھونک دیں اور سُلا کے چلا گیا۔ میں شام تک بے سُدھ رہا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے گھبرا کے چمپا کو دیکھا۔ وہ ایک پہلو سے لگی میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے اطراف میں نظریں گھمائیں "تم ابھی تک یہیں ہو؟" میں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"میں کہاں جاؤں گی؟" وہ بلکتی ہوئی بولی۔

"تم واپس چلی جاؤ۔"

"کیسے چلی جاؤں۔"

"نہیں، اب تم جاؤ۔ میں نے تمھیں بہت تکلیف دی، مجھے معاف کردو۔ اب تمھاری ضرورت نہیں ہے۔" میں نے سرد آواز میں کہا۔

"تم کہاں گئے تھے اور کیا پوچھ کے آئے ہو؟ مجھے نہیں بتاؤ گے؟ یقیناً تم جیل گئے ہوگے۔ کیا پتہ چلا؟" اُس نے میرا بازو زور سے تھام لیا۔

"کچھ نہیں، وہ لوگ اب وہاں نہیں ہیں۔"

"کیا معلوم ہوا۔ کچھ کہہ کے تو گئے ہوں گے؟" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ چمپا پر سکتہ طاری ہوگیا۔

"اب تم چلی جاؤ۔ میں تمھیں اسٹیشن چھوڑ آتا ہوں۔"

"اور تم....؟" وہ متوحش لہجے میں بولی۔

"میرا کیا ہے، میں بھی کہیں جا مروں گا۔"

"میں تمھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔" اُس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ "میں تمام گناہوں سے توبہ کرتی ہوں۔ میں آگرے واپس نہیں جانا چاہتی۔ اب میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔ تم مجھے اپنے گھر کے کسی کونے میں ڈال دینا۔"

"نہیں ــــ نہیں، تم جاؤ۔" میں نے چیخ کے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی، میں تمھاری ماں تو نہیں بن سکتی، ہاں اپنی خادمہ سمجھ لینا، باندی سمجھ لینا۔ میرے آخری دن تو بہ میں گزر جائیں گے۔"

"چمپا بائی! توبہ کی زندگی تم میرے بغیر بھی بسر کرسکتی ہو۔ مجھے چھوڑ دو، تنگ مت کرو۔ میں کسی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔"

"پھر بھی میں اس حال میں تمھیں چھوڑ کے نہیں جاسکتی۔ میری خطائیں معاف کردو۔ میں تمھیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے، میرے پاس گزر بسر کے لیے خاصی رقم جمع ہے، میں تم پہ بار نہیں بنوں گی اور اگر تم کہو گے تو اپنی ساری دولت کو تمھارے سامنے آگ لگادوں گی لیکن مجھے جانے مت دو۔ اُس جہنم میں مجھے مت لوٹاؤ۔"

"چمپا بائی! چلی جاؤ۔ تم تنہا بھی اپنی زندگی بدل سکتی ہو، میرا کوئی بھروسا نہیں ہے، میں اگر زندہ رہا تو کبھی موتیا بائی سے تمھارا پتہ پوچھ کے ضرور تمھارے پاس آؤں گا۔"

چمپا بائی زار و قطار روتی رہی۔ میری جیب کے تمام پیسے سپاہی نے چھین لیے تھے۔ تھیلے میں تھوڑے سے پیسے تھے۔ میں نے ہوٹل کا بل ادا کرنا چاہا مگر چمپا بائی نے پہلے ہی ہوٹل والوں کو منع کردیا تھا۔ ہم دونوں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور میں چمپا کو آگرے جانے والی گاڑی میں سوار کرا آیا۔ وہ واپس جانے کے لیے قطعی آمادہ نہیں تھی لیکن جب میں نے یہ کہا کہ میں کسی وقت بھی اُسے چھوڑ کے کہیں نکل جاؤں گا تو بڑی مشکل سے تیار ہوئی۔ چلتے وقت اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا، میری جیب میں کچھ روپے ٹھونسے اور آنسوؤں سے میرا چہرہ بھگو دیا۔

اسٹیشن پر بہت سی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ کوئی دلی جانے والی، کوئی کلکتے جانے والی۔ میں ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پھر خیال آیا کہ کہاں جاؤں گا لہٰذا اتر کے پھر اسٹیشن پر آگیا اور شہر میں آکے سڑکوں پہ آوارہ پھرنے لگا۔ اب کسی کو تلاش کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک رات زرّیں کا دیا ہوا تھیلا کوئی لے گیا۔ جو کپڑے تن پہ تھے وہ ایک ہفتے میں خاک اور دھول سے میلے ہوگئے۔ پھر ان میں چیتھڑے لگ گئے۔ نہ جانے کتنے دن گزر گئے، ہر گزرنے والے آدمیوں کو تکتا رہتا تھا۔ ہزاروں لڑکیاں اِدھر سے اُدھر گزرتیں مگر اُن میں کوئی گورا نہیں تھی۔ مجھے نہ اُس کا چہرہ نظر آیا نہ مولوی صاحب، نہ ابّا جان ملے اور نہ گھر کا کوئی اور فرد۔ میں رات کو کہیں بھی پڑا رہتا۔ دن کسی طرح گزر جاتا۔ کئی بار دل میں آیا کہ زرّیں انتظار کررہی ہوگی۔ اُس کے پاس چلا جاؤں یا جھل کے پاس چلا جاؤں لیکن کسی کو بے آرام کرنے سے کیا حاصل تھا۔ لوٹ پیٹ کے بھلا ہی دیں گے۔ زرّیں کے پاس جا، مولوی صاحب کے پاس جاتو تھا مگر وہ دونوں میرے لیے گورا اور ابّا جان کو واپس نہیں لاسکتے تھے۔ اپنے لیے ہر جگہ یکساں ہے۔ ہر جگہ ایک جیسی زمین ہے۔ کبھی بھوک بہت ستاتی تو چھابڑی اُٹھا کے اِدھر کا وزن اُدھر پہنچا دیتا اور پیٹ کی آگ بجھا لیتا۔ بدن پر لتّے چیتھڑے ضرور محفوظ تھے کہ میں لوگوں کی نظروں سے چھپی رہے۔ دن گزر گئے۔

پھر ایک شام جب میں جوہو کے ساحل پر پڑا ہوا سمندر میں اٹھنے والی لہریں دیکھ رہا تھا کہ مجھے کسی شخص کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کوئی پولیس والا ہوگا۔ یہ لوگ مجھے ایک جگہ سکون سے نہیں بیٹھنے دیتے، اسی طرح تنگ کرتے رہتے تھے۔ وہ پولیس والا ہی تھا مگر سادہ لباس میں۔ اُس کا نام راج کرشنا تھا۔

میں نے اُسے پہچاننے سے انکار کردیا۔

"جاؤ بھائی! اپنا کام کرو۔"

راج کرشنا اکڑوں بیٹھ کے بغور میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "ظہیر خاں! یہ میں ہوں راج کرشنا، میں تمھارا چہرہ نہیں بھول سکتا۔ میں اپنے محسن کا چہرہ کیسے بھول سکتا ہوں۔" اُس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا اور میرے دونوں بازو زور سے پکڑ لیے۔

"کون ظہیر خاں؟ کیوں تنگ کرتے ہو بھائی! جاؤ ظہیر خاں کو جا کے ڈھونڈو۔" میں نے نقاہت سے کہا۔ "میرا نام ظہیر خاں نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں، ظہیر خاں! تم وہی ہو۔" راج کرشنا بے تاب ہوگیا۔ "تم یقیناً تم وہی ہو مگر تم نے اپنا یہ کیا حال بنا لیا ہے میرے دوست! میں تمھیں تمام دلور میں تلاش کرتا رہا۔ میرے مخبروں نے پتہ چلا لیا تھا کہ تم کس ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہو لیکن تم ہوٹل چھوڑ چکے تھے۔ میں تمھاری طرف سے مایوس ہوچکا تھا۔ اُٹھو اُٹھو۔" اُس نے مجھے اُٹھانے کی کوشش کی۔

"میں وہ نہیں ہوں۔" میں نے کراہ کے کہا۔ "تمھیں دھوکا ہوا ہے صاب! مجھے کہیں مت لے جاؤ، میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"او نہیں۔" وہ کرب سے بولا۔ "تمھارے ساتھ ضرور کسی نے کوئی بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔ تم تو بہت بہادر ہو میرے دوست! بہادر بھی بھلا اس طرح زندگی سے گھبراتے ہیں؟ اُٹھو اُٹھو، گھر چلو۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"اور میں تمھیں ساتھ لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، سمجھے۔"

"نہیں۔" میں نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے اور چیختے ہوئے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو، مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔"

"تم بہت ناراض معلوم ہوتے ہو۔" وہ میری کمر تھپکنے لگا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "آؤ ڈارلنگ! تم چاہے ناراض ہی رہنا اور کوئی بات مت کرنا مگر یہاں سے تو اُٹھو، دیکھو، کتنے لوگ میرے ساتھ ہیں، یہ سب کیا کہیں گے۔ راج کرشنا کا دوست اِس حال میں ہو اور وہ اُسے چھوڑ جائے؟"

"میں تمھارا دوست نہیں ہوں۔" میں نے تڑپ کے کہا۔ "میں ظہیر خاں نہیں ہوں، میرا کوئی نام نہیں ہے، میرا کوئی دوست نہیں ہے۔"

"آؤ اُٹھو ورنہ۔" وہ نرمی سے بولا۔ "دیکھو، میں تمھیں زبردستی بھی لے جاسکتا ہوں۔" اُس نے میری کمر کے گرد حلقہ تنگ کرلیا۔ اُس کے ساتھی حیرت اور تجسس سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب سادہ لباس میں تھے۔

"آئیے اُٹھیے، کرشنا صاحب کی بات مان لیجیے۔" اُن میں سے کوئی بولا۔ کرشنا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔

"گاڑی قریب لاؤ۔" کرشنا نے حکم دیا۔ ایک شخص فوراً سڑک کی جانب بھاگنے لگا۔ کرشنا اعلا درجے کا لباس پہنے ہوئے تھا، میرے جسم پر چیتھڑے لگے ہوئے تھے اور وہ بھی سیاہ ہوچکے تھے۔ کرشنا کسی جھجک کے بغیر اپنے بازو میرے گرد، میری کمر میں حمائل کیے ہوئے تھا اور نرمی سے مجھے ساتھ لے جانے کے لیے آمادہ کررہا تھا۔ جتنا میرا انکار بڑھ رہا تھا، اتنا ہی اُس کا اصرار۔ وہ میرے برابر ریتیلی زمین پہ بیٹھ گیا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "ٹھیک ہے، تم نہیں جاتے تو ہم بھی یہیں بیٹھیں گے۔"

"مجھے چھوڑ دو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میری خطا معاف کردو۔" میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ راج کرشنا نہیں مانا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا، وہ اُس کے منتظر تھے۔ سب نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور میرے دونوں بازو پکڑ کے مجھے زمین سے اُٹھا دیا۔ میں نے اُن سے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے، بہت چیخ پکار کی مگر ناچار خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ راج کرشنا نے طے کرلیا تھا کہ اب وہ میری ذلت نہیں سنے گا۔ اِدھر میں نے مزاحمت ترک کی، اُدھر راج کرشنا کے آدمیوں نے میرا جسم اپنی گرفت سے آزاد کردیا۔ راج کرشنا تیز تیز قدموں سے مجھے گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔ گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔

کار کا دروازہ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا۔ جوہو پر بہت سے تماش بین ہماری جانب متوجہ ہوگئے تھے۔ راج کرشنا نے مجھے پچھلی نشست پر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور راستے بھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں زور سے دبائے رہا۔

گاڑی ایک چھوٹے سے خوب صورت بنگلے میں داخل ہوئی۔ راج کرشنا نے تمام ملازموں کو اکٹھا کرلیا اور کسی کو چائے، کسی کو کھانا بنانے، کسی کو کپڑے لانے اور کسی کو گرم پانی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اُس کے باقی تمام ساتھی راستے ہی میں رخصت ہوگئے تھے۔ وہ شاید دوسری گاڑیوں میں ہوں گے۔ میں مجرموں کی طرح گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ راج کرشنا میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "یہ تمھارا ہی گھر ہے۔ یہاں اگر تم نے کسی قسم کا تکلف کیا تو اب میں تم سے ناراض ہوجاؤں گا اور سنو، میں ایک پولیس افسر ضرور ہوں مگر اسے جیل مت سمجھنا۔ یہاں تم ہر طرح آزاد ہو، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ملازم کو آواز دے لینا۔" وہ میری گردن سہلانے لگا۔

میرے ہونٹوں کو چپ لگ گئی تھی۔ نہ جانے راج کرشنا کیا کیا کہتا رہا۔ پھر ایک ملازم نے آکے اطلاع دی کہ گرم پانی تیار ہے۔ راج کرشنا نے مجھے غسل خانے میں دھکا دے دیا۔ وہاں لباس پہلے ہی تیار رکھا تھا۔ میں نے اپنے پھٹے ہوئے کپڑے اُتارے تو میرے جسم پر صرف مالا رہ گئی۔ مالا دیکھ کے بے اختیار میری آنکھیں بہنے لگیں۔ میں غسل خانے کے فرش پہ دیر تک بیٹھا مالا آنکھوں سے لگائے روتا رہا۔ پھر جب بہت دیر ہوگئی تو راج کرشنا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے ہوں کہہ کے اُسے اپنے زندہ ہونے کی تسلی دلائی اور کئی ہفتوں کی سیاہی جسم سے کھرچنے لگا اور خوب نہا دھو کے اُجلے کپڑے پہن کے باہر نکلا۔ راج کرشنا بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے گلے سے لپٹ گیا۔ "اب بتاؤ تم کون ہو؟ دیکھا ہم نے کیسا پہچانا۔" اُس کی آواز سے مسرت جھلک رہی تھی۔ میں نے ندامت سے نگاہیں اُوپر نہیں اُٹھائیں۔ ڈرائنگ روم سے پیوستہ کمرے کی میز پہ کھانوں کی سرپوش ڈشیں اور پھل رکھے ہوئے تھے مگر میں کیا کرتا، بھوک ہی اُڑی ہوئی تھی۔ صبح چنے کھا کے میں جوہو کی ریت پہ پڑ گیا تھا۔ کل رات بھی کھایا تھا یا نہیں، یاد نہیں تھا۔ راج کرشنا نے سرپوش ہٹائے تو گرم کھانوں کی خوشبو میں نتھنے چیرنے لگیں۔ "کھاؤ۔" اُس نے میری پلیٹ میں اُبلے ہوئے چاول اور شوربا ڈال کے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "خوب کھاؤ۔" مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ راج کرشنا کتنا ہٹ دھرم آدمی ہے اس لیے میں نے کوئی حجت نہیں کی، چپ چاپ کھانا زہر مار کرتا رہا۔ یہ لذیذ غذائیں بہت دنوں بعد پیٹ میں گئی تھیں، اس لیے ایک لقمے کو تو مجھے چکر سا آگیا، معدہ جلنے لگا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں بہت بھوکا تھا۔ میرے ساتھ راج کرشنا بھی کھاتا رہا اور بار بار کھانا میری پلیٹ میں ڈالتا رہا۔

چائے کے بعد راج کرشنا مجھے ڈرائنگ روم میں واپس لے آیا۔ کھانے کے دوران میں اُس نے میرے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی تھی، صرف اپنے بارے میں بتاتا رہا تھا کہ میں نے ریل میں اسے جس آدمی کے پنجے سے نجات دلائی تھی، وہ اُس کے لیے بمبئی میں کامیابی کی کلید ثابت ہوا۔ اُس شخص نے دو!

میں آکے اپنے تمام گروہ کا راز فاش کر دیا اور اس طرح بمبئی پولیس ایک ایسے گروہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی جو ایک عرصے سے اُس کے لیے پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ راج کرشنا کو اُسی گروہ کے لیے بمبئی بلایا گیا تھا۔ وہ گروہ بیرونی مال کی ناجائز تجارت میں ملوّث تھا۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری موجودہ زندگی صرف تمھارے سبب سے ہے۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ "بعد میں اس کیس میں کامیابی کی بنیاد پر مجھے یہیں روک لیا گیا۔ اس شہر میں اس قدر جرائم ہوتے ہیں کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ یہ بمبئی کے پولیس والے نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں۔ دماغ تو کام ہی میں نہیں لاتے۔ آج بھی جوہو پہ میں ایک کیس کے سلسلے میں گیا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ ...میں نے تمھیں کس قدر تلاش کیا، نہ جانے تم کہاں چھپ گئے تھے اور ملے بھی تو کس حلیے میں ملے۔ وہ عورت کہاں ہے جو تمھارے ساتھ سفر میں تھی؟"

"وہ چلی گئی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کہاں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"وہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

میری اکتاہٹ اُس نے نظرانداز کر دی۔ "اور اُس شخص کا کیا بنا جس کی تلاش میں تم یہاں آئے تھے؟" اُس نے کُریدی۔

"وہ بھی نہیں..... نہیں ملا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"خیر سفر کے دوران میں مَیں نے قیافتاً اتنا تو جان لیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو اس عمر میں ایک نوجوان کو ہونا چاہیے۔ میں کہہ نہیں سکتا مگر مجھے شبہ ہے کہ جوانی نے تمھارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تم مناسب سمجھو تو مجھے کچھ بتاؤ۔ اس طرح تمھارا جی بھی ہلکا ہو جائے گا اور اگر میں تمھارے کسی کام آ سکتا ہوں تو میری طرف سے ہر خدمت حاضر ہے۔ تم میرے بارے میں جانتے ہو، میں پولیس کا ایک خاصا اور بڑا افسر ہوں۔ بمبئی میں میری حیثیت ایک ایڈوائزر کی ہے لیکن میں ان لوگوں پر بھروسا نہیں کرتا، اپنی اسکیموں پر خود عمل کرتا ہوں۔ جوہو پر جو لوگ میرے ساتھ تھے، سب کے سب بمبئی پولیس کے بڑے بڑے عہدے دار تھے۔ تمھارے ساتھ اگر کسی نے زیادتی کی ہو تو مجھے بتاؤ۔ وہ شخص کہیں بھی ہو، میں اُسے ہندوستان بھر میں تلاش کراؤں گا۔"

وہ خود ہی سب کچھ کہتا گیا۔ پھر اُسے خیال آیا تو وہ جھینپ کے بولا۔ "میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا ہوں۔ ہاں تو تمھارے ساتھ کیا پیش آیا میرے دوست! کچھ بتاؤ؟" اُس نے اشتیاق سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں، بس وہ مجھے نہیں ملا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اُس کے چہرے پر اُلجھن عیاں ہوئی۔ "بہرحال تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ خیر کبھی کبھی آدمی اُس منزل پہ پہنچ جاتا ہے جہاں ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے اور کسی سے کچھ کہنا سُننا نہیں چاہتا۔ اب یہ بتاؤ، تمھیں آرام کرنے کی خواہش ہے یا میں تمھیں بمبئی گھماؤں؟"

"میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "اب تو تم گرفتار ہو گئے۔ تم میری مرضی سے جاؤ گے اور ستو مئی میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے کسی معاملے میں حائل نہیں ہوں گا لیکن تم ٹھیر رہے ہیں۔ میں ایک بالکل تنہا آدمی ہوں۔ میری ماں مدراس رہتی ہیں۔ اگر یہاں بمبئی میں دیر ہو گئی تو میں اُنھیں بلا لوں گا، وہ تم سے مل کے بہت خوش ہوں گی کیونکہ تم وہ شخص ہو جس نے اُن کے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ وہ دل کی بہت اچھی ہیں۔ میں اس وقت یہاں اکیلا ہوں، تمھیں کوئی ڈسٹربنس نہیں ہو گا۔ میں تمھیں بالکل نہیں چھیڑوں گا۔ پھر تو یہاں رہنے میں کیا عذر ہے۔ میری مانو، جانے کا ارادہ ملتوی کر دو۔ نہیں..." وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

میں نے سپر ڈال دی۔ میری آمادگی دیکھ کے راج کرشنا نے گلے سے لگا لیا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے میرے سامنے شیونگ کا سامان رکھ دیا۔ وہ مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہا تھا جیسے میری اور اُس کی برسوں سے شناسائی ہو۔ مجھے اُس کے اس رویّے سے شرم آنے لگی۔

میں نے شیو بنا لیا تو اُس نے آئینہ میرے چہرے کے مقابل کر دیا۔ "اب ذرا اپنا چہرہ خوب غور سے دیکھ لو۔ پہچاننے کی کوشش کرو اور بتاؤ کہ کیا اتنے دل کش چہرے والے نوجوان کو زندگی سے اس قدر مایوس ہونا چاہیے؟ صبح میرے ساتھی تمھیں دیکھیں گے تو پہچاننے سے انکار کر دیں، کہیں گے کہ میں نے رات بھر میں کوئی جادو کر دیا ہے۔ وہ مجھے کوئی دیوتا سمجھیں گے۔" وہ شگفتگی سے بولا۔ "وہ حلیہ ٹھیک لگ رہا تھا یا یہ؟"

"کرشنا بابو!" میں نے اپنی آواز سنبھالنے کی کوشش کی۔ "میرا حلیہ ہے، اندر کا حلیہ نہیں سنبھلتا۔" میری آواز حلق میں چرمرا کے رہ گئی۔ کہنا چاہتا تھا کہ اندر نہ تو شیو ہوتا ہے، نہ غسل، نہ لباس تبدیل کیا جاتا ہے، اس پہ صابن لگتا ہے، نہ پاؤڈر۔

"وہ بھی ضرور سنبھلے گا۔" کرشنا پُراُمید لہجے میں بولا۔ "وہ بھی سنبھلے گا لیکن دونوں حلیے ایک ساتھ خراب ہو جائیں تو یہ بڑی تشویش ناک بات ہے بلکہ بُری بات ہے۔"

رات کو سونے کے لیے راج کرشنا نے اپنا شب خوابی کا لباس دیا۔ اُس کمرے میں ریڈیو بھی تھا اور گراموفون ریکارڈ بھی۔ کتابیں بھی تھیں اور ... بھی تھے۔ میں نے کوئی چیز نہیں چھوئی۔ پھر راج کرشنا اپنے کمرے میں گیا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چمپا کے جانے کے بعد اب جا کے بہتر بستر نصیب ہوا تھا لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ میں نے سوچا ہی بند کر دیا۔ راج کرشنا نے مقوّی غذائیں کھلا کے اور نرم بستر دے کے مجھے پھر سے کی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ چیزیں مجھے راس نہیں آئیں۔ صبح اُٹھ کے راج کرشنا پھر میرے جسم میں تنکے چبھوئے گا۔ کوئی آدمی کسی آدمی کو اُس طرح قبول نہیں کرتا جیسا وہ نظر آتا ہے۔ اُس کی نسل کا شجرہ، اُس کا نام، عہدہ اور پتہ جاننے کی خواہ مخواہ فکر لگی رہتی ہے گویا کچھ نہیں ہوتا، اُس کا نام اور پتہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اسے چھپانا چاہے کہ اُس کے لیے یہ کوئی اچھا ذکر نہیں ہے تو لوگ کیوں نہیں سمجھتے!

مگر صبح اُٹھ کے راج کرشنا نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ ناشتے کے بعد مجھے گاڑی میں بٹھا کے بازار لے گیا۔ بازار سے اُس نے میرے ناپ کے جتنے بلا کپڑے مل سکے، خرید لیے۔ باقی تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔ پھر اُس نے میرے لیے دو جوڑی جوتے، چپل اور دوسرا سامان خریدا۔ "آپ پیسے ضائع کر رہے ہیں۔" اُس نے بڑے تیل کی بوتل اور شیونگ کا سامان خریدا تو میں نے احتجاج کیا۔

"یہ تمھارے لیے نہیں ہے، یہ سب کچھ ایک بالکل نئے آدمی کے لیے ہے جس کی صرف شکل و صورت اور قد وغیرہ تم سے ملتا جلتا ہے۔" وہ ہنس کے بولا۔ "تم نے سُنا ہو گا کہ ہندوؤں میں آدمی مر کے دوسرا جنم لے لیتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہوسکتے تم نے بھی دوسرا جنم لیا ہے اور پچھلی کوئی بات تمھیں یاد ہی نہیں ہے۔"

"کرشنا بابو! آپ..." مگر اُس نے مجھے کچھ نہیں کہنے دیا۔ گھر پہنچ کے اُس نے مجھے اپنے سامنے نیا لباس پہنوایا اور دُور کھڑا کر کے دیر تک مختلف زاویوں سے مجھے ناپتا تولتا رہا۔

"بالکل بمبئی کا بابو۔ اب تم دیکھنا، اندر کا حلیہ خود بخود تمھیں بدلا بدلا نظر آنے لگے گا۔ وہ لوگ بس اب آتے ہی ہوں گے۔ آج یہاں ایک بہت خاص میٹنگ ہونا ہے، میں تمھیں اُن سے اپنے دوست کے بیٹے یا بھائی کی حیثیت سے ملاؤں گا۔ ویسے تم قطعاً آزاد ہو۔ اگر کہیں جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں دوپہر کے کھانے پر تمھارا انتظار کروں گا۔ مکان کا نمبر، فون کا نمبر اور پتہ نوٹ کر لو۔ یہ باندرہ ہے۔ اگر راستہ نہ ملے تو کسی بھی قریبی پولیس اسٹیشن سے راستہ پوچھ لینا۔"

میں کہاں جاتا؟ تمام راستے ایک جیسے تھے، تمام شہر ایک جیسے تھے۔ راج کرشنا سمجھ رہا تھا کہ اب میری طبیعت کچھ ٹھیک ہو چلی ہے لیکن طبیعت تو پھر خراب ہونی شروع ہو گئی تھی۔ کل شام تک مجھے کسی بات کی خبر نہیں تھی اور اب پھر جی اُڑنے لگا۔ وہی آہٹوں پر چونک پڑنا، وہی اپنے آپ کو نوچنے لگنے کی خواہش۔ جسم پر کپڑے بھاری لگتے تھے اور انگلیوں میں انھیں کُرچنے کے لیے کھولن ہوتی تھی۔ اسی اثنا میں راج کرشنا کے ساتھی آ گئے۔ پولیس کی وردیوں میں ملبوس چھوٹے بڑے قد کے افسران۔ ان میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جنھوں نے کل رات مجھے جوہو سے اُٹھایا تھا۔ اُن کی آنکھوں کو مجھے پہچاننے میں دیر لگی۔ پھر وہ حیرت سے کبھی راج کرشنا کو کبھی مجھے دیکھنے لگے۔ راج کرشنا اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ اُس نے مجھے اُن سے اپنے ایک مرحوم دوست کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ملوایا۔ سب نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ کسی نے انگریزی میں اور کسی نے اُردو میں میری خیریت پوچھی۔ میں سفر میں راج کرشنا سے انگریزی میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کر چکا تھا۔ پھر جب وہ لوگ ایک دوسرے کمرے میں بند ہو کے بیٹھ گئے اور راج کرشنا مجھ سے دو ایک گھنٹے کی معذرت کر کے اندر چلا گیا تو میں کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کے بنگلے سے باہر آ گیا۔ نئے جوتوں نے پیر کاٹنے شروع کر دیے۔ میں گلیوں گلیوں، سڑکوں سڑکوں گزرتا ہوا بہت دُور نکل گیا۔ مجھ کو چھوٹے بچے نیلی نیکر اور سفید قمیص پہنے بستے لٹکائے ہوئے اسکول جا رہے تھے۔ میرے اندر نہ جانے کیا خاص بات تھی کہ کئی راہ گیروں نے مُڑ مُڑ کے اور گھور گھور کے مجھے دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ شاید میں انھیں کوئی نیا یا عجیب آدمی معلوم ہو رہا تھا یا یہ میری آنکھوں کی غلط بینی تھی مگر آگے جا کے کالج کی لڑکیوں کے ایک گروپ میں لڑکیوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کے میری طرف متوجہ کیا، پھر کھِل کھِلا کے ہنس پڑیں۔ مجھے اُن پہ سخت غصہ آیا۔ میں نے انھیں گھور کے دیکھا، وہ سہم گئیں۔ لوگ ہر جگہ یہی چاہتے ہیں کہ آدمی کے ہاتھ میں چاقو ہو اور اُس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی ہوں۔ میں نے واپسی کا ارادہ کیا اور گردن جھکائے ہوئے راج کرشنا کے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔

درمیان میں میرے جی میں آئی کہ یہیں سے بھاگ نکلوں کیونکہ میں اس لائق ہی نہیں ہوں کہ انسانوں کے درمیان رہوں۔ میری وجہ سے راج کرشنا کو فضول تکلیف ہو گی۔ ان پڑھے لکھے لوگوں میں میری باتیں بدتمیزی سمجھی جائیں گی اور آدمی اپنی سکت سے زیادہ بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا جی تو بات کرنے کو چاہتا ہی نہیں تھا۔ اچھا ہے کہ راج کرشنا کے اُکتانے اور گھر سے دھکے دے کے نکالنے سے پہلے میں خود ہی اُس کا گھر اپنی خاک اور دھول کی لوری سے پاک کر دوں۔ ابھی موقع ہے۔ راج کرشنا کا گھر دُور ہے اور بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ راج کرشنا مجھے تلاش کر کر کے خود ہی تھک جائے گا اور پھر میں اسی شہر میں کیوں رہوں، میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی ہے۔ میں بمبئی ہی چھوڑ دوں گا۔ میں نے راستہ بدل دیا لیکن کچھ دُور پہنچ کے مجھ سے آگے نہیں چلا گیا۔ میرے جسم پہ راج کرشنا کے خریدے ہوئے کپڑے تھے۔ وہ صبح کس ذوق و شوق سے میرا لباس خریدنے کے لیے بازار گیا تھا۔ میں چلا جاؤں گا تو وہ بہت پریشان ہو گا اور اگر اُس نے کہیں مجھے پھر ڈھونڈ نکالا تو میں اُس کے سامنے آنکھ بھی نہیں اُٹھا سکوں گا۔ میں اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہوا واپسی کے راستے پر چل پڑا اور آخر وہی ہوا، راج کرشنا میری تلاش میں گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ مجھے راستے میں ملا۔ "مجھے ڈر ہوا کہ تم کہیں واپسی کا راستہ نہ بھول گئے ہو۔" اُس نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "آؤ لنچ پر تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ میٹنگ لمبی ہو گئی تھی اس لیے میں نے اُن سب کو روک لیا ہے۔ تم گھبراؤ گے تو نہیں؟" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ تم ہجوم کے درمیان حبس تو محسوس نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "سڑکوں پر بھی ہجوم ہی ہے۔"

"آدمی کو ہجوم میں رہنے کا عادی بننا چاہیے۔ انسان، انسان سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔"

گھر قریب ہی تھا۔ پانچ چھ منٹ بعد ہم دونوں ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ مجھے چھری اور کانٹے سے کھانے کی تمیز نہیں تھی، پہلے میں نے اُن لوگوں کو دیکھا اور صرف روٹیاں کھانے پر اکتفا کی۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں تھی البتہ راج کرشنا کی عزت کا خیال ضرور تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں اتنے بڑے افسر کا مہمان اس

بدسلیقگی سے کھانا کھاتا ہے مگر راج کرشنا کو جیسے کوئی فکر ہی نہیں تھی، فکر ہوتی تو وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے مجھے پہچانتا ہی نہیں اور اس حیثیت کا ذکر ہی میں مجھے اپنے گھر لاتا ہی نہیں چنانچہ میں نے آزادی سے کھانا شروع کر دیا۔ شاید راج کرشنا نے میری عدم موجودگی میں اُن سب کو کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی پرانی بات پوچھنے کی غلطی نہ کریں اس لیے اُن سب کا برتاؤ بہت لحاظ مروّت کا تھا پھر بھی مجھے اپنی جانب اُٹھی ہوئی اُن کی دلچسپ اور سراغ رس نظریں زہر لگ رہی تھیں۔ راج کرشنا غالباً یہ کہنا بھول گیا تھا کہ وہ مجھے ان آنکھوں سے بھی نہ دیکھیں۔

سہ پہر کو راج کرشنا اپنے کسی کام کے سلسلے میں گھر سے چلا گیا تو بنگلے کے ملازم میرے اطراف اِس طرح منڈلانے لگے جیسے میں ہی اُن کا مالک ہوں۔ وہ میری زبان سے کوئی حکم سننے کے منتظر تھے۔ نوعمر بجّو مجھ پر بطورِ خاص مہربان تھا اور راج کرشنا کی تعریف میں منہ سکھا رہا تھا کہ ایسا صاحب اُسے پہلے کبھی نہیں ملا، وہ پہلے ملازموں کو کھلاتا ہے پھر خود کھاتا ہے۔ بھگوان کرے وہ مستقل طور پر بمبئی ہی میں رہے۔ بجّو ذرا کھلا تو مجھ سے راز دارانہ انداز میں پوچھنے لگا "صاب! ایک بات بتاؤ" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس نے اِدھر اُدھر تاک کے پوچھا "یہ اپنے صاب نے شادی کیوں نہیں بنائی؟"

"مجھے کیا معلوم" میں نے ترشی سے جواب دیا۔ وہ ڈر کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اپنے لہجے کی سختی کا فوراً احساس ہوا، میں نے نرمی سے کہا "یہ بات صاحب ہی سے پوچھنا"

اُس کے چہرے کی بشاشت لوٹ آئی اور وہ پوچھنے لگا "اور صاب آپ نے...؟ آپ کی شادی ہو گئی؟ بیگم صاب کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

بیگم صاحب! شادی! مجھے ہنسی آگئی، وہ یہ کیسی باتیں کر رہا تھا۔ میری ہنسی پہ وہ بڑا حیران ہوا "جا اپنا کام کر" میری تلخ آواز سے وہ گھبرا کے بھاگ گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور بند کمرے میں کو را نہ جانے کس طرف سے آگئی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا، وہ شکایتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنا چہرہ بستر میں چھپا لیا پھر بہت دیر تک کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد پتہ نہیں کس وقت دبلے قدموں سے راج کرشنا اندر آیا۔ وہ میری کمر پہ آہستہ آہستہ ٹھونگیں مار رہا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کے سر اُٹھایا تو اُس نے اپنا رومال آگے کر دیا۔ میں اسی لیے یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا۔ کلکتے میں میں نے نجّل کو تنگ کیا تھا۔ فیض آباد میں زرّین، جامو اور کلن خاں کو اور یہاں کرشنا میرا نشانہ بن رہا تھا۔ آخر کرشنا کے اُٹھانے سے پہلے میں خود ہی اُس کے ساتھ باہر آگیا۔ کرشنا نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا لیکن اُس کے اَن کہے سوال میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے، میرے دماغ میں چبھ رہے تھے۔ کرشنا نے جب یہ کہا کہ وہ مجھے سیر کے لیے لے جانا چاہتا ہے تو میں نے انکار نہیں کیا۔ ہم دونوں کپڑے بدل کے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ مجھے بمبئی کی سڑکوں پر گھماتا رہا، اُن میں سے بہت سی سڑکیں بہت سے فٹ پاتھ میرے جا[نے] پہچانے تھے۔ کرشنا ایک طویل سفر کر کے دادر کے علاقے میں آگیا۔ اُسی ریستو[راں کے] قریب جس کی پچھلی گلی میں آبا جان رہتے تھے اور جہاں اب صرف اُن [کا] سامان ایک کوٹھری میں بند پڑا تھا۔ میں نے سوچا، راج کرشنا سے کچھ لمحوں کی اجازت لے کے مولوی اکرم کے پاس جاؤں اور اُن سے کوٹھری کی چابی لے کے آبا جان کا سامان ٹٹولوں، شاید کسی کی تصویر مل جائے، نہ بھی ملی تو وہ چیزیں تو ہوں گی جنھیں گھر کے لوگوں نے بار بار استعمال کیا۔ ممکن ہے کوئی کام کی چیز مل جائے۔ پرانی کاپیاں کتابیں تو ہوں گی جن پر سب لکھتے ہوں گے مگر انھوں نے اس افراتفری میں بھلا کیا پڑھا کو[ئی] آج یہاں کل وہاں آبا جان پر بھی کورا کا اثر پڑا۔ نہ وہ اپنے سامان میں لاتی، نہ آبا جان یوں دربدر مارے مارے پھرتے۔

کرشنا مجھے ایک بہت اچھے ریستوراں میں لے گیا۔ وہاں دھیمی روشنی میں ہلکی انگریزی موسیقی تیر رہی تھی۔ سب مالدار لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں بھی تھیں اور مردوں کے ساتھ بے تکلفی باتیں کر رہی تھیں، ایک طرف غیر ملکی موجود تھے۔ ریستوراں میں خاصی بھیڑ ہمارے داخل ہوتے ہی ایک باادب بیرے نے ہمیں ایک میز پہ بٹھا دیا۔ سکون تھا، کسی کو کسی کی بات سنائی نہیں دیتی تھی۔ راج کرشنا نے سرگوشی میں پوچھا "جی لگ رہا ہو تو بیٹھیں ورنہ کہیں اور چلیں؟"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، یہ جگہ بہت پُرسکون ہے"

"کیا کھاؤ گے؟" اُس نے مسکرا کے پوچھا۔

"کچھ کھانا کیا ضروری ہے؟" میں نے تذبذب سے جواب دیا۔ یہ میرے لیے بالکل نیا تھا، مجھے یہاں کے طور طریقے معلوم نہیں تھے۔ ممکن یہاں آنے کے بعد کھانا ضروری ہوتا ہو۔

"نہیں، ہم یہاں کچھ پی بھی سکتے ہیں، بھوک لگ رہی ہو تو کچھ منگ[وا لیں]" وہ غیر رسمی انداز میں بولا۔ میں اُس کے خیال سے خاموش ہی رہا۔ کرشنا نے انگلی کے اشارے سے منتظر بیرے کو قریب بلایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری میز [سج گئی] ہوئی تھی لیکن میری نظریں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں، ہر جگہ یہی ہوتا تھا، مجھے یہ گمان ہوتا جیسے وہاں مجھے مولوی صاحب یا کورا یا آبا جان یا گھر کا کوئی اور آدمی نظر آجائے گا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟" کرشنا نے اپنے لبوں پر تبسم بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں" میں نے مسکرا کے جواب دیا "لوگوں کو دیکھ رہا ہوں"

"یہ اس شہر کا بہت مشہور ریسٹورینٹ ہے۔ یہاں تمام بڑے لوگ آتے ہیں۔ اصل میں اس کی حیثیت ایک کلب جیسی ہے۔ دولت میں اور اضافہ کر دیتی ہے، یوں کہنا چاہیے کہ دولت حسن کا سنگھار ہے ... کا سامان ہے۔ دولت کے بغیر حسن آدھا رہ جاتا ہے۔ تم نے دیکھا ... کے بدن پہ قیمتی ساڑی ہے اور زیور بھی کچھ کم قیمت کا نہیں ہے"

زیور کے ذکر پہ مجھے فوراً اپنی مالا کا خیال آیا اور میرا ہاتھ خود بخود گریبان پہ چلا گیا۔ مالا میری گردن میں موجود تھی، میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ راج کرشنا کی باریک بین آنکھوں سے میرا یہ لمحاتی اضطراب چھپا نہ رہ سکا۔ میں کسی چور کی طرح اُس سے نظریں چرانے لگا۔ "ان لوگوں کی دنیا مختلف ہے" کرشنا نے اپنی بات جاری رکھی "یہ غم کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ دُکھ دُور کرنے کے انھوں نے بہت سے علاج دریافت کر لیے ہیں۔ سب سے بڑا علاج خود دولت ہے چنانچہ یہ دن بھر دولت کمانے میں مصروف رہتے ہیں اور شام ہوتی ہے تو اُسی دولت سے دُکھوں کی دوا خریدتے ہیں۔ یہ ریستوراں بھی ایک شفاخانہ ہے۔ یہ میزیں اسپتال کے بیڈ سمجھو، یہ بیرے ڈاکٹر اور یہ غذائیں، دوائیں ہیں۔ موسیقی غذا ہے۔ اچھا لباس پہننا، گانا، ناچنا، سیر سپاٹا، یہ سب دُکھ کی دوائیں ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کو پہلے دولت کا دامن پکڑنا چاہیے لیکن یہاں بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں صرف دولت کمانا آتا ہے، اُسے خرچ کرنا نہیں آتا۔ جس طرح بیمار کو اچھے ڈاکٹر کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح دولت کو اچھے مشاغل کی ورنہ دولت بہت بڑا دُکھ بن جاتی ہے، ناسور۔ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے ہو؟" اُس نے ٹک کے میری آنکھوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" میں نے چونک کر کہا "آپ بہت اچھی باتیں کر رہے ہیں"

"اگر تم نے سننے کا یہی اشتیاق ظاہر کیا تو میں آیندہ اور اچھی باتیں [سنا]ؤں گا" وہ ہنس کے بولا "اچھی باتیں ایک اسکول، ایک کتاب کا درجہ رکھتی ہیں"

"جی ہاں..." میں نے مستعدی سے کہا لیکن ابھی میں نے اپنا [جملہ م]کمل بھی نہیں کیا تھا کہ گندمی رنگت کا ایک موٹا تازہ شخص اسی رنگ [کی] ایک دُبلی پتلی چشمے والی عورت اور اوسط بدن کی ایک نوجوان سرخ و سفید لڑکی کے ساتھ ہماری میز پر آیا۔ کرشنا نے اپنی نشست سے اُٹھ کے اُس سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ "رستم جی، بمبئی کے ایک معزز شخص۔ مسز رستم اور ان کی بیٹی نورین رستم" کرشنا نے مجھ سے اُن کا تعارف کرایا [اور پھر] اُن سے متعارف کرایا۔

رستم جی نے ملائم لہجے میں کرشنا سے پہلے مجھ سے میری خیر خبر پوچھنے میں وقت صرف کیا۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے جھجک [ہو]ئی، کرشنا نے درمیان میں دخل دے کے تمام باتیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور میری طرف سے بتانے لگا کہ میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں، میرا مرحوم بڑا بھائی اُس کا ہم جماعت تھا۔ اُس نے میرے سلسلے میں اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے موضوع ہی بدل دیا اور وہ سب کسی کلب کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ روزانہ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں اور [کسی] مشکل کی وجہ سے کلب بند ہے اس لیے اس ریستوراں میں آگئے ہیں۔ راج کرشنا کا کہنا تھا وہ دُنیا کے کسی دُکھ میں گرفتار نہیں تھے۔ بات بات پہ ہنسنے لگتے تھے جیسے ہنسی کے لیے تیار ہی بیٹھے ہوں۔ رستم جی کی بیوی مجھے چپ دیکھ کے حیران ہوئیں اور مہذب لہجے میں پوچھنے لگیں: "آپ کچھ بول نہیں رہے؟"

"جی" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا "میں کیا بولوں"

"بمبئی میں نئے نئے ہیں" راج کرشنا نے پھرتی سے کہا "ویسے یہ مت سمجھیے کہ انھیں بولنا نہیں آتا، جب باتوں پر آئیں گے تو سب کو ہرا دیں گے"

"آپ انھیں ہمارے ہاں لائیے" نورین رستم نے کہا، اُس کی آواز زرّیں کی آواز کی طرح بہت بھلی تھی "میرا خیال ہے آپ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے" اُس نے اپنے باپ کی طرف تائیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ رستم جی اور اُن کی بیوی نے بھی اصرار کیا مگر کرشنا نے اپنی مصروفیت کا عذر کر کے معذرت کر لی۔

"آپ ٹال رہے ہیں کرشنا جی" نورین نے شوخی سے کہا۔

"کرشنا جی بہت مصروف آدمی ہیں نورین! تمھیں دنیا کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اِن کی آمد سے شہر میں ہلچل مچی ہوئی ہے، کرشنا جی کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے، ہم اِن کا وقت ضائع نہیں کریں گے، انھیں ملنے ملانے سے کہیں زیادہ ضروری کام ہیں"

"مگر کرشنا جی تو روز کلب آتے ہیں پاپا! کیوں نہ ہم کل کلب ہی میں اپنی طرف سے کرشنا جی کی دعوت کریں؟" نورین مچل کے بولی۔

"کرشنا جی! یہ ابھی تک بچی ہے، اسے کچھ نہیں معلوم" رستم جی معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "اس کی باتیں محسوس مت کیجیے اور سنو نورین!" وہ تنبیہی نگاہ سے نورین سے مخاطب ہوا "تمھیں روزانہ اخبار پڑھنا چاہیے تاکہ تم جان سکو کرشنا جی اس شہر کے لیے کتنی بڑی خدمات انجام دے رہے ہیں"

"او نہیں" راج کرشنا نے لجاجت سے کہا "میں اپنا فرض انجام دے رہا ہوں اور رستم جی! مجھے صاف باتیں بہت پسند ہیں۔ نورین کی دعوت مجھے قبول ہے لیکن وقت کا میں ابھی تعین نہیں کر سکتا۔ نورین! میں ضرور تمھارے گھر آؤں گا"

"اور اکیلے نہیں، انھیں بھی ساتھ لائیے گا" نورین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "کیوں جناب! آپ آئیں گے؟ آئیں گے نا؟" وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"جی ہاں" میں نے اُداسی سے کہا "ضرور آؤں گا" اُس نے اپنی دونوں کہنیاں میز پہ ٹکا دیں اور مجھ سے اس قدر قریب ہو گئی کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی "میں نے کبھی کھیت نہیں دیکھے۔ میں آپ سے کھیتوں اور کھلیانوں کے قصے سنوں گی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بہت دنوں تک کسی گاؤں میں رہوں، شہر کا رُخ نہ کروں" وہ خواب آفریں لہجے میں بولی "آپ زمیندار ہیں نا؟"

"جی" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اُسے کیا جواب دوں۔

اُس کے بال سنہرے، دانت سفید چھوٹے چھوٹے اور نقش و نگار تیکھے تھے۔ باتوں میں شوخی تھی۔ وہ بات کرتی تھی تو دانتوں کے ساتھ مسوڑھوں کا سُرخ گوشت بھی ذرا سا نظر آجاتا تھا لیکن مجھے اُس کی بے تکان باتوں اور اس قدر قُربت سے اُلجھن ہونے لگی۔ رستم جی سے گفتگو کے دوران میں راج کرشنا بار بار میری طرف دیکھ لیتا تھا پھر اچانک اُس نے گھڑی دیکھی۔ اسی لمحے رستم جی میز سے اُٹھنے لگے۔ کرشنا نے انھیں مزید روکنا چاہا مگر رستم جی نہیں رُکے۔ وہ تینوں دُور کی ایک میز پر جاکے بیٹھ گئے۔ تو دین چلتے چلتے مجھے اور کرشنا کو ہمارا وعدہ یاد دلانا نہیں بھولی۔

ریستوراں سے باہر آکے کرشنا نے کسی بچّے کی طرح میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میں بھیڑ میں کہیں کھو جاؤں گا۔ بمبئی شہر روشنیوں سے جگ مگا رہا تھا، موٹریں، وکٹوریا، ہر طرف شور، بھاگم دوڑ۔ ہماری گاڑی پھر سڑکوں پر چکّر کاٹنے لگی۔ مجھے یہ شہر نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ رات کے وقت کرشنا مجھے ساحل پر لے گیا۔ وہاں کی سیر سے ہم رات گئے گھر واپس پہنچے تو کرشنا کے چہرے سے تھکن صاف نظر آ رہی تھی۔ اُس نے دو ایک فون کرکے بمبئی کے پولیس افسروں سے رابطہ قائم کیا دوسری طرف سے کی جانے والی باتیں تو میں سُن نہیں سکا لیکن کرشنا کی ناراضی سے اندازہ ہوا کہ آج اُس کے ماتحتوں نے اُسے کوئی تسلّی بخش رُوداد نہیں سُنائی ہے۔ اُس کے ماتھے پر بتدریج شکنیں پڑتی گئیں اور وہ فون ہی پر چیخنے چلّانے لگا۔ "ایڈیٹ، یو آر آل فول۔" اُس کے لہجے میں کسی قسم کی لچک نہیں تھی اور وہ اپنے مخاطب کو بہت تیز انگریزی میں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ فون پٹخ کے وہ تقریباً ہانپنے لگا۔ میں نے اُس کے سامنے سے ہٹ جانے کا ارادہ کیا کیونکہ میری موجودی اُس کے غصّے کے بہاؤ میں رکاوٹ بن سکتی تھی اور مجھے یہ خوف بھی محسوس ہوا کہ اب یہ مجھ پر غصّے ہوگا۔ ممکن ہے یہ مجھے اسی وقت گھر سے نکل جانے کا حکم دے دے لیکن میں نے جیسے ہی اُٹھ کے کمرے سے جانا چاہا، اُس کی بدلی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی میرے جھجکتے ہوئے قدم رُک گئے۔ "کہاں چلے؟" میں نے اندر کمرے کی جانب نگاہ کی۔ وہ تأسف سے بولا۔ "معاف کرنا، مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ یہاں تم بھی بیٹھے ہو۔ بات یہ ہے ڈارلنگ کہ اس شہر میں سب گدھے رہتے ہیں۔ پولیس کا آدھا کام ان نااہلوں کی وجہ سے اُلٹا ہو جاتا ہے۔ پولیس میں ایک دم پرفیکٹ آدمی بھرتی کرنے چاہئیں۔ بہرحال چھوڑو۔ یہ بتاؤ کچھ حال وغیرہ ٹھیک ہے؟ کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"بہت اچھا۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

"اچھا ہوا تم آگئے، میں بہت تنہائی محسوس کر رہا تھا۔" وہ غنودہ لہجے میں بولا۔ "میں تمھیں صاف صاف بتاؤں۔ ریل میں تم مجھے بہت پسند آئے تھے حالانکہ تمھارے بارے میں میری پہلی نظر کی رائے یکسر مختلف تھی۔ بعد میں وہ رائے بدلتی گئی اور اسٹیشن پر تم سے جُدا ہونے کے بعد مجھے یہ ملال رہا کہ میں نے تمھیں جانے ہی کیوں دیا تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم بہت پریشان تھے

مجھے ایسی حالت میں تمھیں روکنا چاہیے تھا۔ وہ عورت بھی تمھاری کر[illegible] نہیں تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تمھارے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آجائے [illegible] برہم تھا اور بمبئی میں قدم قدم پر ٹیڑھے ترچھے آدمی بستے ہیں۔ تم [illegible] نہیں چاہتے تو میں تم سے کچھ پوچھنے پر اصرار نہیں کروں گا لیکن ایک [illegible] ہے کہ تم یہاں سے کہے بغیر کہیں نہ جانا اور اگر گئے تو سمجھ لو مجھے عمر بھر [illegible] گا۔ دوسری درخواست ہے کہ تم مجھ سے کسی قسم کی اجنبیت نہیں برتو[illegible] میں اس بات کی تکرار اس لیے کر رہا ہوں کہ یہاں تمھیں کوئی گھٹن [illegible] اگر تم مجھ سے کسی فرمائش کا اظہار کروگے اور مجھے اپنے دُکھ درد میں [illegible] تو مجھے خوشی ہوگی۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ میرا [illegible] کہ تم جب تک خود نہیں کہوگے، میں تمھارے کسی معاملے میں دخل نہیں [illegible]

"کرشنا جی! میری آنکھوں سے برداشت نہیں ہوا۔ میں [illegible] سے ڈرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو آپ مجھ سے [illegible] گے۔ آپ نے آج دیکھ ہی لیا کہ میں نے ریستوراں میں آپ کے [illegible] کے سامنے چپ رہ کے آپ کو کتنا شرمندہ کیا ہے۔ میرے کانوں اور منہ [illegible] ہی نہیں ہے۔ میں نہ کچھ سننا چاہتا ہوں نہ بولنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمھیں سُننے اور بولنے پر مجبور نہیں کروں[illegible] کے لیے یہ جگہ بہت مناسب ہے لیکن دوست! تم نے اس دُنیا کا [illegible] حواس سے کیا ہے۔ میں نے ایسے بہت سے ستائے ہوئے لوگ دیکھے [illegible] ڈھے جاتے ہیں مگر پھر ہمّت کرتے ہیں۔ میں تم پر ترس نہیں کھا رہا [illegible] مت سمجھنا کہ میں تمھیں بھیک دے رہا ہوں۔ میری تو یہ زندگی ہی تم[illegible] سبب سے قائم رہی ہے سو میرے پاس جو کچھ بھی ہے، اُس پر تمھارا حق [illegible] گھر کی ہر چیز تمھاری ہے۔"

"وہ محض ایک اتفاق تھا کرشنا جی! اس ذکر سے مجھے [illegible] ہے۔ میں نے خاص آپ کے لیے بھلا کیا کیا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی [illegible] ہوتا تو میں یہی کرتا۔"

"مگر اُس جگہ کوئی اور نہیں، تم ہی تھا۔ تم مجبور نہیں تھے [illegible] دہشت خیز وقت میں آنکھیں میچے ہوئے لیٹے بھی رہ سکتے تھے لیکن [illegible] اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اُف وہ [illegible] تکلیف دہ منظر ہے لیکن اس واقعے سے پہلے ہی میری خواہش [illegible] تمھاری کوئی مدد کروں۔ تمھارا یہاں آنا، یہاں رہنا اُس احسان کا [illegible] نہیں ہے۔ اُس عظیم احسان کا معاوضہ تو میں ساری عمر ادا نہیں کر[illegible] اور بات ہے۔ ہاں کہو کہ تم نے میری باتیں توجّہ سے سُن لی ہیں [illegible] مایوس نہیں کروگے؟"

"کرشنا جی! میں آپ کو کیا بتاؤں۔" میں نے زور سے [illegible] بھینچ لیں اور اضطراب سے کہا۔ "منہ نہیں کھلتا، موت بھی نہیں آتی [illegible] ہمدردی مت کیجیے، میں بہت احسان فراموش، بہت بے غیرت [illegible]

[illegible] میں بہت بُرا ہوں، بہت ذلیل ہوں۔" میری آواز بھرّانے لگی۔

"اوہ، آئی ایم ساری۔" وہ بے چینی سے میرے قریب آگیا۔ "مائی ڈیئر [illegible] مطلب یہ نہیں تھا کہ تم ..." وہ شرمساری سے بولا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ [illegible] میرے ساتھ بھی وہی کرنا جو اب تک کرتے آئے ہو مگر یہ کیا ہے؟ ایں!"

"یہ ہی تو ہے کرشنا جی!" میری گھٹی ہوئی آواز نکلی۔

"جانتے ہو تمھاری عمر کیا ہوگی؟ تم چوبیس سال سے کم کے نہیں ہوگے۔ [illegible] چوبیس سال کے آدمی کی آنکھ میں ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں ہونی [illegible] چاہیے۔ اُسے تو دُنیا کو رُلانا چاہیے۔ اُسے تو حالات سے پنجہ آزمائی کرنی چاہیے [illegible] کیا ہونا چاہیے کیا نہیں۔ اگر دُنیا کا رشتہ ہر آدمی سے یکساں ہو تو آدمی کے [illegible] کا سوال بھی اُٹھے۔" وہ جھنجلا سا گیا۔ "میں تم سے کیا کہوں، بس اتنا کہنا [illegible] کہ یہ جگہ جوہو کے ساحل اور فٹ پاتھوں سے بہتر ہے۔ تم یہاں جس طرح [illegible] رہو۔ مجھے اس مکان سے گھٹا کے رہو، مجھے محض فٹ پاتھ سے گزرنے [illegible] کوئی شخص سمجھ لو۔" وہ اُٹھ گیا۔ اُس نے مجھ سے کھانے کو پوچھا، میں نے [illegible] کر دیا۔ وہ مجھے میرے کمرے میں پہنچا کے چند لمحے ٹھہرا، پھر شب بخیر [illegible] مجھ سے رخصت ہوگیا۔

راج کرشنا نے اپنی بات کا عملی ثبوت دیا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے [illegible] روز گزر گئے تھے۔ ان تین دنوں میں وہ بہت مصروف رہا۔ گھر آتا تو مجھ [illegible] کے حال دریافت کرتا پھر کتابوں میں مصروف ہو جاتا یا فون کرتا یا [illegible] ہوئے افسروں سے رازدارانہ باتیں کرتا یا خفیہ میٹنگیں ہوتیں۔ میں اُس [illegible] موجودی میں ہاندرے سے دُور نکل جاتا۔ راج کرشنا نے میرے کوٹ [illegible] چند نوٹ ڈال دیے تھے۔ میں دن بھر یوں ہی گھومتا رہتا۔ مولوی اکرم کے [illegible] کے نیچے سے میں کئی بار گزرا اور سیڑھیوں تک گیا مگر وہاں سے لوٹ آیا۔ [illegible] چیزیں لوگوں کا بدل تو نہیں ہو سکتیں۔ چوتھے دن دوپہر کو میں جلد [illegible] واپس آگیا۔ سٹنگ روم میں ایک اہم میٹنگ جاری تھی۔ میں داخل [illegible] ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ راج کرشنا اپنی نشست چھوڑ [illegible] میرے پاس آیا۔ "آج جلدی آگئے؟ کیا حال ہے؟"

"آپ اپنا کام جاری رکھیے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنے [illegible] جاتے ہوئے کہا اور سب کو باری باری سلام کیا۔ صرف دو ایک روز [illegible] میں سے بہت سے افسروں سے میری صاحب سلامت ہوگئی تھی۔

"ہاں ہم ایک بہت سنگین مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ اگر تم نے کھانا [illegible] کھالو، ہمیں کچھ دیر لگے گی۔" وہ شائستگی سے بولا۔

"آپ کا انتظار کرلوں گا۔" میں نے نیچی نظروں سے جواب دیا اور اپنے [illegible] چلا گیا۔ سٹنگ روم کی آوازیں اندر آرہی تھیں۔ وہ اچانک تیز ہوتی [illegible] کرشنا کی آواز سب سے اونچی تھی۔ وہ شدّت سے کسی نکتے پر اصرار [illegible] میں نے اُن کی آوازیں سمع انداز کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن [illegible] معمولی بات نہیں تھی کہ آدمی اُسے سُن کے کسی اور طرف متوجہ ہو جائے۔

وہ راج کرشنا سے متعلق بات تھی، اُس کے ماتحت افسر اپنے اندیشوں کا اظہار کر رہے تھے اور مشورہ دے رہے تھے کہ اُسے براہِ راست ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ شاید راج کرشنا نے اُن کی بات مان لی۔ میٹنگ ختم ہونے میں دیر لگ گئی۔ وہ لوگ چلے گئے تو راج کرشنا میرے پاس آگیا۔ اُس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے گزشتہ تین روز میں اُسے اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کیونکہ میں اپنی باتیں اُسے کب بتاتا تھا۔ پھر بھی میں نے دبی زبان میں اُس سے اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ "کہتے ہیں کہ یہ بمبئی ہے۔"

"لیکن بمبئی ہے تو کیا ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ بہت جمے ہوئے لوگ ہیں۔ اونہہ۔" پھر اُسے کچھ خیال آیا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہی پُرانے نقشے ہیں۔ انھیں چھوڑو، تم اپنی سناؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے چہرے پر پہلے سے زیادہ رونق ہے۔ خوشی ہوئی۔"

"یہ آپ ہی کی دی ہوئی رونق ہے۔" میں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں دن بھر خالی پڑا رہتا ہوں، مجھے بھی تو کوئی کام بتائیے۔"

وہ اُچھل پڑا۔ اُس کے گال تمتمانے لگے۔ "کام! اِس دُنیا میں کام کی کیا کمی ہے لیکن تمھیں پیسہ کمانے کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کام مصروف رہنے کے لیے کرنا چاہیے۔ پیسے تو میں خوب کما رہا ہوں، ٹھیک ٹھاک حالات ہیں۔ پھر بھی اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو میں تمھیں بہت سے کام بتا سکتا ہوں۔"

"بہت سے کام نہیں، مجھے تو آپ اپنا کوئی کام بتائیے۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔

"اگر تم نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو میں آج سے سوچنا شروع کروں گا۔ آج اس خوشی میں ہم شام کو پھر سیر کریں گے۔ اس شہر میں ایک سے ایک قابلِ دید جگہ ہے۔ دُنیا ہر طرح دیکھنی چاہیے۔"

شام ہونے میں کچھ دیر نہیں تھی مگر راج کرشنا ایک فون آنے سے اچانک مکدّر ہوگیا۔ اُس نے مجھ سے معذرت کی اور فوراً گاڑی میں بیٹھ کے کہیں روانہ ہوگیا۔ میں نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر اُس نے یہ عذر کر دیا تھا کہ وہ ایک بہت اہم میٹنگ میں جا رہا ہے۔ فون کی تمام گفتگو میں نے سُنی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر یوں ہی خاموش بیٹھا رہا، پھر میں نے کوٹ اُتارا، پتلون کی جگہ رات کے سونے کا پاجامہ پہنا اور اُس کے ساتھ قمیص پہن کے بنگلے سے باہر آگیا۔ دروازے پر کھڑا ہوا ایک سپاہی مجھے اِس حلیے میں دیکھ کے بے چین ہوا۔ میں ایک بس میں بیٹھ کے بائی کلا کے علاقے میں پہنچ گیا اور سڑکوں پر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ وہاں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی اس لیے میں نسبتاً ایک گنجان علاقے میں آگیا۔ ایک چھوٹے سے چائے کے اسٹال پر میں نے چائے پی اور سفید بنارسی پان کا ایک بیڑا منہ میں رکھا اور کمر پر ایک ہاتھ ٹکا کے کھڑا ہو گیا۔ ابھی مجھے

اس طرح کھڑے ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دم بہت سی نظریں مجھے اپنے اطراف منڈلاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سر پر بہت کم بالوں والا ایک نوجوان میرے قریب آیا اور اوپر سے نیچے تک میرے جسم کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے بھی اُس کے ساتھ یہی عمل کیا اور اُس کے سینے پر کرختگی سے ہاتھ مار کے اُسے خود سے دُور کیا۔ وہ گرنے لگا مگر گرتے گرتے سنبھل گیا اور فوراً مجھ پر جھپٹا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ منہ کے بل زمین پر پڑا ہوا تھا۔ بمبئی میں راہ گیر اکٹھے ہونے میں وقت نہیں لگتا اور پھر ایسے شخص کے لیے جس کا چہرہ اس علاقے میں شناسا ہو۔ چائے کے اسٹال اور پان والا دونوں اپنے تھڑے سے اُٹھ کے اُس کی مدد کو دوڑے، اُدھر سے ایک تنومند ادھیڑ عمر شخص تیزی سے نوجوان کی طرف بڑھا اور اُسے بازو سے پکڑ کے اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا ماسٹر تارا! یہ سالا تم فٹ پاتھ پر کیا ڈانس کر رہا ہے؟"

"ابھی ہم بتاتا ہے۔" ماسٹر تارا نے آستین سے منہ صاف کرتے ہوئے غصے سے کہا اور کسی تاخیر کے بغیر دوبارہ مجھ پر لپکا۔ میں نہ صرف اُس کا بلکہ اُس کے ساتھیوں کا بھی منتظر تھا مگر وہ نہ جانے کیوں دیر کر رہے تھے۔ ماسٹر تارا نے تیسری بار بیتابدل کے میری ٹانگ میں اپنی ٹانگ مار کے مجھے گرا دینے کی کوشش کی مگر وہ غضب میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ موقع و محل بھول گیا۔ موقع اس داؤ کا نہیں تھا۔ اس کے لیے دونوں فریقوں کے درمیان فاصلہ کم ہونا چاہیے۔ میں نے کچھ پیچھے ہٹ کے اپنے دونوں ہاتھ تیار رکھے تھے۔ وہ میرے ہاتھوں پر آیا اور اب کے میں نے اُسے سر کے بل زمین پر لوٹ دیا۔ ماسٹر تارا کے سر میں گہری چوٹ آئی ہوگی۔ اس بار اُس نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی یا اُس سے اُٹھا نہیں جا سکا۔ مجمع خاصا بڑھ گیا تھا اور ماسٹر تارا کے گرتے ہی لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے مجھے پکڑنا چاہا، کچھ ماسٹر تارا کا حال دیکھنے کے لیے اُس پر جھک گئے۔ میں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے لوگوں کو دُور رہنے کی تنبیہ کی۔

"اوئے ہٹو!" ایک دوسرا شخص مجمع چیرتا ہوا دیوانہ وار میری طرف آیا۔ وہ چہرے مہرے سے ماسٹر تارا کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے آناً فاناً میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ "اوئے چل!" اُس نے ایک ہاتھ سے میرا گریبان پکڑ کے دوسرے ہاتھ سے مکا تان لیا اور مجھے گھسیٹتا ہوا گرجنے لگا۔ "اوئے چل!" میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے اُس کا پہلا مکا اپنے گال پر برداشت کر لیا لیکن دوسرے مکے سے پہلے میں دونوں اطراف سے اُس کی کمر مضبوطی کے ساتھ پکڑ چکا تھا اور میری انگلیاں اُس کی کھال میں پیوست ہو چکی تھیں۔ یہ صورت دیکھ کے وہ گڑبڑا گیا اور اُس کا دوسرا مکا فضا ہی میں معلق رہ گیا کیونکہ اب وہ اپنی کمر کی رہائی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے مہلت نہیں دی۔ سانس اندر دبا کے ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے زمین سے چند انچ اُوپر اُٹھایا مگر اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔ ذرا سی اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔ اُس کا وزن میری توقع سے زیادہ نکلا۔ میں نے اُس کی کمر فوراً چھوڑ دی اور صرف ایک ثانیے کی سرعت میں اُس کے دونوں کانوں پر ہتھیلیاں ماریں۔ وہ بلبلا اُٹھا۔ پھر جیسے ہی اُس نے میرے بال چھوڑے، میں نے اُس کی گردن پر ترچھے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ یہ ضرب ایسی ثابت ہوئی کہ وہ ایک چیخ مار کے پیچھے ہٹا اور کسی شخص سے جا ٹکرایا۔ پھر کسی اور آدمی کو میرے نزدیک آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ایک پولیس والا بھی سیٹی بجاتا ہوا اِدھر آ نکلا تھا اس لیے مجمع منتشر ہونے لگا۔ پان والا دوبارہ دکان پر چلا گیا اور چائے کے اسٹال والا اپنے اسٹال کی طرف بھاگا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔

کانسٹیبل نے ماسٹر تارا کی گردن پکڑ لی۔ "اوئے دادا! خیر منا ؤ تم ایدر مسخری کرتا پھرتا ہے؟ بہت مستی ہو گئی ہے چھوکرا! ابھی ٹائم خراب ہے بابا! بھاگ جاؤ۔ وہ سالا ایدر ہی راؤنڈ پہ ہے۔" کانسٹیبل نے دھیمی آواز سے بولا۔

ماسٹر تارا ابھی مجھے گھور رہا تھا اور وہ شخص بھی جس کی گردن پر میں نے ضرب لگائی تھی لیکن انھوں نے کانسٹیبل کے ڈر سے میری جانب کوئی پیش قدمی نہیں کیا البتہ کانسٹیبل نے خود اُن کی نگاہیں تاڑ لیں۔ وہ میری طرف بڑھا اور مجھے دھکا دے کے چند قدم پیچھے ہٹا دیا۔ میں نے اُس سے الجھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ گیا تو میں دوبارہ اپنی جگہ پہنچ گیا۔ چائے کے اسٹال پر جا کے میں نے چائے کا آرڈر دیا۔ ایک منٹ زیادہ نہیں گزرا تھا کہ میرے سامنے پیالی رکھ دی گئی۔ پورا اسٹال خالی ہو چکا تھا۔ اُس گلی نما لمبی دُکان میں ایک لمبی بینچ اور اُس کے سامنے ایک لمبی میز رکھی ہوئی تھی۔ ابھی میں نے پہلا ہی گھونٹ حلق سے اتارا تھا کہ وہ دونوں اور اُن کے مزید دو ساتھی میرے سر پر آ گئے۔ "ابھی اپن تم کو ایدر نہیں دیکھے۔ ہم بولے دیتا ہے ہاں۔" ایک شخص نے مجھے تحکمانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ اُس کے گلے میں میلا مفلر لٹکا ہوا تھا۔

"کیا تم مجھ سے بول رہے ہو؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

"اور کس سے بولتا ہے۔ ابھی تم ایدر سے جاؤ۔ علاقے کا یہ حصہ استاد مستانہ نے ماسٹر تارا کو دیا ہے۔ تم سالا کس نشے میں ہے۔ یہ بائی کلا ہے۔ یہاں آدمی ترچھی دکھاتا ہے تو اُس کا کھوپڑی پھیر دیا جاتا ہے۔"

"یہ علاقہ اب میرا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اوئے!" وہ اچھل کے بولا۔ "سالا تم کیا پاگل ہے ایک دم؟" پھر اُس نے مصنوعی قہقہہ لگا کے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم نے سنا یہ بودم کیا بات کرتا ہے؟"

"میں اِدھر سے نہیں جاؤں گا۔ میں دلّی سے آ کے کیا یہاں جھک مارنے پھروں گا؟ ماسٹر تارا! تمھارے اندر دم ہو تو نکال کے دکھا دو مجھے یہاں سے ورنہ ہاتھ بڑھاؤ۔ اب میں اِدھر ہی بیٹھوں گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"تم ایدر کیسے بیٹھیں گا؟" ماسٹر تارا کا ترجمان مجھے شعلہ بار آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "میں کہتا ہوں تم سالا بہت چرپا پن کر رہا ہے۔ ابھی اپن نرمی گرمی سے سمجھاتا ہے۔ بعد کو ٹیم نکل جائیں گا۔ تم سالا بہت پچھتائیں گا۔"

"دیکھ لیں گے۔ میں بھی کچھ سمجھ کے ہی اِدھر بیٹھا ہوں۔ تم کیسے آدمی ہو۔ آدمی نہیں پہچانتے۔" اُسے نظر انداز کر کے میں نے چائے والے کو پکارا۔ "اے چائے والا سیٹھ! کل اِدھر کے تمام لوگوں سے کہہ دو کہ اب ہم کو بھتا پہنچائیں۔ استاد مستانہ آئے گا تو میں خود بات کر لوں گا۔ کیا تمھیں کچھ اور سننا ہے؟"

اُن چاروں نے یکے بعد دیگرے مجھے دھمکیاں دیں۔ استاد مستانے کی شخصیت سے خوف زدہ کرنا چاہا مگر میں اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔ میں پوری طرح چوکنا تھا۔ چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بات بڑھی تو یہی کسی کے منہ پہ اُلٹ دوں گا مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ مجھے اس وقت چاقو کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی لیکن مجبوری تھی۔ سب کچھ چھن گیا تھا۔ صرف میں باقی رہ گیا تھا۔ ماسٹر تارا اور اُس کے ساتھی ڈھیٹ پنے سے میرے سر پر کھڑے رہے۔ وہ معمولی درجے کے لوگ تھے اس لیے مجھے اُن کی طرف سے خطرہ تھا۔ وہ کوئی بھی اوچھا ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اوچھے ہاتھ سے اور کچھ تو نہیں ہوتا مگر ہتھل کہتا تھا کہ اوچھا ہاتھ ڈالنے والے کو اس کا خمیازہ بُری طرح بھگتنا پڑتا ہے اور اُسے اپنے جسم کے کسی نہ کسی حصے سے محروم ہونا پڑتا ہے یا ہمیشہ کے لیے جسم پر داغ پڑ جاتا ہے اور جواب دینے والے کو ہمیشہ ملال رہتا ہے کہ اُسے ایک نااہل آدمی کو ایسا جواب دینا پڑا۔ میں نے پہلے ہی مرحلے پر انھیں اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ سوچ سمجھ کے بات آگے بڑھائیں۔ ہتھل نے ایک بات اور کہی تھی کہ ہاتھ پاؤں کی پھرتی سے زیادہ آدمی کو آنکھ کا پھرتیلا ہونا چاہیے۔ آنکھ ایک کسوٹی ایک خوردبین کی حیثیت رکھتی ہے، اگر اس میں مقابل کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

اُن میں سے ایک نے بپھر کے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ کیا مگر اُس کے ساتھی نے اُسے جھڑک کے باز رہنے دیا۔ اسٹال کی لمبی میز کو کئی چھوٹی چھوٹی میزوں سے ملا کے ایک بڑی میز کی شکل دی گئی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی نچلی سطح پکڑ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ چائے والا سہمی ہوئی نظروں سے بار بار چھت دیکھتا تھا۔ "بابا! اے بھائی! ایدر کا بھی کچھ خیال کرو۔" اُس نے عاجزی سے کہا۔ "ابھی سالا اِدھر صبح صبح نہ جانے کس کا منہ دیکھا تھا۔" وہ ہذیانی انداز میں سر جھٹکنے لگا۔

"تم لوگ اِدھر وقت خراب کر رہے ہو۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔ "مجھے یہاں سے کوئی نہیں اُٹھا سکتا اور سن لو! اگر اب تم نے کوئی حماقت کی تو بہت بُرا ہوگا۔"

"اپن تم سے سمجھ لیں گا، سالا ایدر کس کا ٹیم ہے ورنہ اپن تم کو بتا دیتا کہ اپن کون ہے۔ تمھارا سارا ہیکڑی دیکھ لیتا اور تم کو بائی کلا میں پاؤں رکھنے کے قابل نہیں رکھتا۔" میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ پان والے کو آواز دے کے ایک اور بنارسی پان بنانے کے لیے کہا۔ "ابھی تم اصل سے پیدا ہوا ہے تو ایدر ہی بیٹھا رہنا۔ اپن واپس آتا ہے۔"

"تم جاتے ہی کیوں ہو؟" میں نے زہر خند سے جواب دیا۔

"اپن بتائیں گا کہ اپن کیوں جاتا ہے۔ ایدر ٹھنا ہوئیں گا تو دوہی منہ بنائیں گا۔ استاد مستانہ نے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں چھوکرا! ٹیم دوسرا ہے۔"

"جاؤ جاؤ۔" میں نے دھتکار کے کہا۔

وہ چند لمحے ٹھیرے پھر گرجتے برستے گالیاں دیتے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد اسٹال والا میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا اور مجھے یہاں سے فوراً بھاگ جانے کے مشورے دینے لگا۔ وہ استاد مستانہ کے قہر و غضب کا ذکر بہت خوف زدہ انداز میں کر رہا تھا۔ پان والے نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ دونوں اصرار کرنے لگے کہ اگر مجھے اپنی جان عزیز ہے تو ایک لمحے کی بھی دیر نہ کروں، بس میں بیٹھوں اور بائی کلا کا علاقہ فوراً چھوڑ دوں۔ میں نے اُن کی مخلصانہ تجویز سُنی اَن سُنی کر دی۔ آخر پان والے نے میرے پیر پکڑ لیے مگر میں وہاں سے نہیں ٹلا۔ "استاد مستانہ بہت بڑا چاقو باز ہے، تمنچہ بھی ساتھ رکھتا ہے۔ اِدھر اُس کے سب لڑکے گھومتے رہتے ہیں اور وہ خود ان کی نگرانی کرتا ہے۔" ہر بات ٹھیک تھی مگر مجھے زندگی کی ایسی کون سی فکر تھی، اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ اس درمیان چائے کے اسٹال پر بہت سے لوگ چائے پینے کے لیے آئے اور اپنے اپنے راستے پر لگ گئے۔ ماسٹر تارا کسی کو ہدایت دے گیا ہوگا کہ وہ مجھ پر نظر رکھے۔ ایک شخص کو میں نے کئی بار چائے کے اسٹال کے نزدیک پھیرے کرتے ہوئے دیکھا پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ماسٹر تارا کے ساتھ سات آٹھ آدمیوں کا ایک گروہ اسٹال پر آیا۔ وہ سب خاص قسم کے لوگ تھے۔ اُن کے چہروں پر درشت لکیریں کٹے پھٹے نشانات نمایاں تھے۔ آنکھوں میں چنگاریاں لپک رہی تھیں۔ اُن کے درمیان سانولے رنگ، گٹھے ہوئے جسم اور اوسط قد کا ایک شخص کھڑا تھا، وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ صرف وہی شخص تھا جس کی آنکھوں میں شعلوں کے بجائے شعلوں کی چمک تھی، ہونٹوں کا ایک کنارہ مسکراہٹ میں دُور تک کھنچ جاتا تھا، بال لمبے اور بکھرے ہوئے تھے، ٹھوڑی پر چاقو کا ایک ترچھا نشان تھا۔ ایسا ہی ایک نشان پیشانی پر بھی تھا، کان کی ایک لَو کٹی ہوئی تھی۔ گلے میں زنجیر کے ساتھ گینڈے اور گلاب کے پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ گلا ایک ہری چنریا سے لپٹا ہوا تھا۔ چنریا کے تلے سینے پر بالوں کی دو چوٹیوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ استاد مستانے کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے مجھ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اُس کے ابروؤں میں

جنبش ہوئی، بھویں تھرتھرائیں، لب ایک آن کے لیے کپکپائے، پھر اُس کی نشیلی آنکھوں کا نشہ بڑھ گیا۔ وہ دھوپ کے رُخ پر رکھے ہوئے شیشے کی طرح چمکنے لگیں۔ اُس نے اُن پر پلکوں کا آدھا غلاف چڑھا لیا۔ نیم باز آنکھیں کچھ اور اثر انگیز ہوئیں، وہ مجھے کسی استاد سے زیادہ جادوگر معلوم ہوا۔ اُس کے ساتھی پَر تولے کھڑے تھے۔ اُس کے ایک اشارے کی دیر تھی۔ میں نے میز مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ضرورت کے وقت پرچ آدھی کر کے اس سے چاقو کا کام لوں گا۔ چائے والا سیٹھ اسٹال سے باہر آ گیا تھا۔

مستانہ نے اپنے بائیں جانب کھڑے ہوئے ایک شخص کو ابرو کا اشارہ کیا۔ وہ قد و قامت میں میرے برابر ہو گا۔ عمر میں مجھ سے زیادہ تھا۔ اُس کے اعضا میں لچک نہیں تھی، چہرہ بھی بے رحمی کا غماز تھا۔ صرف ایک لمحے میں وہ میرے روبرو موجود تھا۔ میں نے میز ایک طرف دھکیل دی۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو اپنے ساتھیوں کی طرف اُچھال دیا کیونکہ میرے ہاتھ میں چاقو نہیں تھا۔ میں نے بھی پرچ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کا اور میرا فاصلہ بہت کم تھا۔ اُس نے اپنا اُلٹا ہاتھ تیزی سے اٹھایا تاکہ میرے کاندھے پر ضرب لگا کے پہلے ہی وار میں مجھے زمین پر بٹھا دے۔ میں اُس کی ضرب کمزور کرنے کے لیے خود ہی نیچے جھک گیا چنانچہ جب اُس کا ہاتھ میرے کندھے پر پڑا تو اُس میں اتنا زور نہیں تھا، جتنے زور کی توقع میں اُس نے اُسے اُٹھایا تھا۔ اُس کا خیال ہو گا کہ میں نے نیچے جھک کے گویا ایک طرح کا دفاعی انداز اختیار کر لیا ہے لیکن میرا مقصد یہ تھا کہ وہ اُوپر سے میرے کندھے پر ضرب لگائے اور میں نیچے جھک کے اُس کی بغل پر ضرب لگاؤں۔ بغل کی ضرب سے بہت سے لوگ اپنا توازن کھو دیتے ہیں۔ یہی ہوا۔ جب بالکل غیر متوقع طور پر میں نے زمین سے اچک کر اُس کی بغل نشانہ بنائی تو وہ گھبرا اُٹھا اور اُچھل کے ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ قدم پیچھے کرنے کی مہلت میں اگر حملہ نہ کیا جائے تو فریق کو سنبھلنے کا زیادہ بہتر موقع مل جاتا ہے۔ وہ پیچھے ہٹا تو میں اُس کے ساتھ ہی آگے بڑھا اور میں نے اُس کا وار اُسی پر آزمایا البتہ فرق یہ تھا کہ وہ صرف کندھے پر ضرب لگا کے مجھے جھکانا چاہتا تھا، میں نے اُس کی گردن کے جوڑ پر ضرب لگائی۔ وہ بوکھلاہٹ میں اوندھے سیدھے ہاتھ چلانے لگا جو پھسلتے ہوئے میرے سر اور پسلیوں میں لگے۔ تجربے نے نصیحت کی تھی کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے سے بہتر ہے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں کھائے جائیں اور ایسے نشانے کی تاک میں رہا جائے کہ جہاں ضرب لگانی مقصود ہو، وہاں سے مقابل کا ہاتھ فاصلے پر ہو۔ وہ کہتا تھا کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے والا دیر تک محتاط نہیں رہ سکتا بشرطیکہ مقابل کا آدمی جان بوجھ کے اُس کے حملے برداشت کر رہا ہو اور مناسب موقع کی تاک میں ہو ورنہ معاملہ اُلٹا ہو جاتا ہے۔ آدھی لڑائی تو محض احتیاط اور کوشش سے جیتی جاتی ہے۔ لڑائی کے دوران میں مکمل طور پر اپنی ذات کے احاطے میں رہنا چاہیے اور مقابل کو اپنی آنکھ کے حصار میں رکھنا چاہیے۔ میں اِدھر اُدھر پینترے بدل بدل کے اُس کی ضربیں نامکمل کرتا رہا

پھر ابھی اُس کی ضربیں پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہوئی تھیں کہ آخر مجھے ایک ... ہاتھ آ گیا۔ میرا جڑا ہوا پنجہ اُس کی ناک پر پڑا۔ اُس نے تلملا کے برق رفتار... کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑنے کا ارادہ کیا۔ اب اُ... یہی خواہش ہونی چاہیے تھی کہ وہ جوابًا میرے چہرے کے کسی حصے پر خون کی... اُبھارے جیسی اُس کے چہرے پر اُبھر آئی تھی۔ اپنا خون دیکھ کے آدمی پر... طاری ہو جاتی ہے۔ بس اُس کے گردن پکڑنے کی دیر تھی، میں نے اپنا دہ... ہوا سر اُس کی ٹھوڑی کے نچلے حصے پر مارا۔ اُس کے کئی دانت آپس میں... ہو گئے ہوں گے۔ ایک بلند کراہ کے ساتھ ہی اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں... کسی وقفے کے بغیر اُس کے پیٹ میں مکا مار کے پہلے تو اپنی گردن آزاد کرا... اُسے پھر سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

آگرے میں نوشہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مگر اُس کی ٹھوڑی... سر کے بجائے موتیا بائی کے صندوق سے چکنا چور ہوئی تھی۔ وہ ضرب اس... سے زیادہ شدید تھی۔ نوشہ فرش پر بلبلانے لگا تھا۔ یہاں مستانہ کے آدمی کا... مخدوش ہو جانے کے باوجود مجھے پے در پے ضربیں لگانی پڑیں تب کہیں اُ... حواس بجا طور پر باختہ ہوئے۔ وہ گرنے لگا۔ نوشہ کے مقابلے میں یہ شخص... سے دُگنا تھا، داؤ پیچ بھی اچھے خاصے جانتا تھا۔ مستانے کی وجہ سے یہاں... بھی زیادہ اکٹھی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے آدمیوں نے بھیڑ اکٹھی نہیں ہونے د... اسٹال کی کئی میزیں ٹوٹ گئیں۔ پانی کا فلٹر بھی ٹوٹ گیا۔ تقریبًا سارا اسٹ... چند منٹوں میں اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ وہ شخص ابھی تک اُلٹے سیدھے ہاتھ... رہا تھا اس لیے اچانک مستانہ کے اشارے پر اُس کے دو آدمی اُسے بازو... پکڑ کے اپنی جانب کھینچنے لگے۔ میری لاج رہ گئی۔ نصیب میاں ہوتے ت... کیا برجستہ اور بے ساختہ وار تھے۔ جب میں نے جیل میں کانتے کو گرایا... وہاں میرا ایک وار فی البدیہہ وار سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہاں مستانہ کے سا... بھی اتنی ہی جلدی اور تیزی سے فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔ اُس کا آدمی پا... جا رہا تھا اور اپنے ساتھیوں کے قبضے سے آزاد ہو کے دوبارہ مجھ پر حملہ کر... کی فکر میں تھا مگر انھوں نے اُسے بہ مشکل تمام روکے رکھا اور اسٹال والے... میلی تولیا سے اُس کا خون آلود چہرہ صاف کرنا شروع کر دیا مگر خون نہیں رکا... اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور اُسے کلیاں کرائی جانے لگیں... پانی اُس کے منہ سے سرخ ہو کے واپس آ رہا تھا۔

مستانہ کی آنکھوں کی نشیلی چمک گہری ہو گئی تھی اور اب اُس کی پل... پوری طرح اُوپر اُٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ساتھی کی طرف متوجہ نہیں تھا... مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا، پھر وہ آہستہ قدموں سے میرے پاس آیا... اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک نعرہ لگا کے بے تابانہ میرے... دائیں بازو کو بوسہ دیا اور اپنے گلے سے چنریا اُتار کے میرے گلے میں ڈال د...

☆

وہ جگہ گراؤنڈ فلور کے تین چار فلیٹوں پر مشتمل تھی جہاں مستانہ اپنے...

...دمیوں کی معیت میں مجھے لے گیا، مجھے اُس نے چوکی پر اپنے برابر کی ...ہ دی۔ پھر لڈوؤں کا ایک طشت آ گیا۔ لڈوؤں پر پھولوں کی پتیاں بکھری ...ہوئی تھیں اور درمیان میں ایک بڑی موم بتی جل رہی تھی۔ ایک بڑا گلاس ...اور دودھ کی بالٹی بھی پاس ہی رکھی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے دودھ کا بھرا ...ہوا گلاس مجھے پینے کے لیے دیا۔ ابھی میں نے صرف ایک گھونٹ لیا تھا کہ ...اُس نے گلاس مجھ سے واپس لے لیا۔ پھر وہ گلاس باری باری تمام لوگوں میں ...گھومتا رہا اور سب اُس سے ایک ایک گھونٹ پیتے رہے۔ ساتھ ہی دو دو ...لڈو تقسیم کیے جانے لگے۔ مستانہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ وہ ...بات کم کرتا تھا، اشارے زیادہ کرتا تھا۔ "تارے!" دفعتًا اُس کی آواز گونجی۔ ...سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تارے! کاشی! بادل! دودھ پی لیا؟"

"پی لیا۔" وہ تینوں مرجھائی ہوئی آوازوں میں بولے۔

"پی لیا؟" مستانہ نے اپنی کھنک دار آواز میں دوبارہ پوچھا۔

"پی لیا استاد!" اس بار تینوں بیک وقت بولے۔

"پی لیا؟" مستانہ نے نسبتًا اونچی آواز میں پھر تکرار کی۔

"جی استاد!" اُن تینوں نے پھر سر جھکا لیے۔

مستانہ نے ایک لمبی ہوں کی اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا "بول ...لون ساٹھ کانا چاہیے؟" اُس کی آواز میں لچک اور کھنک تھی جیسے پیتل کا ...برتن بول رہا ہو۔

"یہ تمھاری مرضی پر ہے استاد! میں نے خود کو تمھارے ساتھ باندھ ...لیا ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا "میں اس شہر میں نیا ہوں، بمبئی میں تمھارا ...نام سُنا تھا، سوچا ٹرائی کروں، سو ادھر چلا آیا۔"

"اپن کا ذکر بمبئی میں کیدر نئیں ہے۔ تو نے اچھا کیا، ایدر آ گیا پر تجھے ...سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھا اپن کے پاس آتا۔" مستانہ شرابی ...لہجے میں بولا۔

"میں نے سوچا، جان پہچان میں ٹائم لگے گا۔ پہلے ہی استاد کو کانٹے ...ہلکے بتا دوں تو اچھا ہے۔ یہ شہر بہت ظالم ہے، کئی دن سے میں اِدھر ...پھر رہا ہوں پر شرافت یہاں چھو کے نہیں گئی۔ کوئی ہمارے شہر میں آ کے دیکھے ...ہم سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں، یہاں تو تارا جیسا کھوسٹ نظریں ٹیڑھی کرنے ...لگا تھا۔"

"تارا حرامی ہے۔" مستانہ برہمی سے بولا "تو نے ایدر آ کے دیکھا ہوتا ...مستانے کی آنکھ اُڑتی چڑیا کا تول کر لیتی ہے۔ اپن تو اودر تجھے پہلی نظر دیکھ ...کے ہی ہاتھ اُٹھا دیتے پر اپن نے بھی سوچا، ان سالوں کی تسلی ہو جائے۔ خیر ...بھول جا سب کچھ، اب یہ سب تیرے بھائی ہیں۔"

"اِن نے اسے کچھ نہیں بولا تھا استاد!" ماسٹر تارا نے احتجاج کیا۔

"چپ رہ۔" مستانہ نے اپنی سُرخ آنکھیں ماسٹر تارا پر جما کے لتاڑا۔

"دلّی سے شہزادہ آیا ہے۔ اب اگر زبان کھولی تو قینچی سے کتر لوں گا۔"

نوجوان ماسٹر تارا نے بڑھ کے اُستاد کے پاؤں پکڑ لیے اور مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اُسے پاس ہی بٹھا لیا، پھر سب نے ماسٹر تارا کی تقلید کی۔ ہر شخص پہلے اُستاد کے پاؤں چھوتا پھر مجھ سے مصافحہ کرتا۔ میں نے مستانہ کو اپنا نام سکندر بتایا تھا۔ ماحول میں اجنبیت کا جو غبار چھایا ہوا تھا، وہ رفتہ رفتہ چھٹ رہا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی، مجھے ڈر تھا کہ کہیں راج کرشنا گھر واپس نہ آ گیا ہو۔ جب اُسے پتہ چلے گا کہ میں صرف قمیص پاجامے میں گھر سے نکل گیا ہوں تو وہ میری تلاش میں نکل کھڑا ہو گا۔ میں مستانہ سے کہہ چکا تھا کہ بمبئی میں میرا کوئی تنا سا کوئی گھر نہیں ہے۔ اب اگر میں جانے کی جلدی کرتا تو سب بنی بنائی خاک ہو جاتی لیکن ظاہر تھا کہ وہ کب تک اس طرح بیٹھے رہتے۔ مستانہ نے مجھ سے بائی کلا کا کوئی بھی علاقہ مانگ لینے کی پیش کش کی تھی، مجھے اس سلسلے میں کوئی واقفیت ہی نہیں تھی اور نہ میرا مقصد کوئی علاقہ حاصل کرنا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا کہ پہلے میں سارے علاقے کا جائزہ لوں گا، پھر اُسے بتاؤں گا۔ مستانے کی بھی شاید یہی خواہش تھی کہ میں اُس کے ساتھ رہوں اور علاقے میں اُس کا نمائندہ بن کے آدمیوں کی نگرانی کرتا رہوں۔ وہ ابھی روپے پیسے کا کوئی اعتبار مجھ پر نہیں کرنا چاہتا ہو گا۔ وہ ابھی مجھے اور پرکھنا چاہتا ہو گا۔ میری بات سے وہ خوش ہوا، پھر اُس نے سب کو اپنے اپنے کام پر جانے کا حکم دیا اور مجھ سے دلّی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجھے کلکتے کی جو معلومات تھیں، وہ میں نے دلّی پر منطبق کر دیں۔ میں سات سال جیل میں رہ کے ہر طرح کی بات سے واقف ہو ہی چکا تھا اس لیے مستانہ نے مجھ پر کوئی شک نہیں کیا۔ جس شخص کے میں نے دانت توڑے تھے اور ناک پھوڑی تھی، وہ مرہم پٹی کرا کے آ گیا تھا۔ مستانہ نے باقی دودھ اُسے پلا دیا۔ اُس کا نام دلیرا تھا۔ دلیرا کا چہرہ بجھا ہوا تھا مگر وہ مستانہ کے اشارے پر مجھ سے گلے مل لیا۔

رات کا کھانا میں نے مستانہ اور اُس کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے کے بعد ایک آدمی نے اُسے دوسرے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا، مستانہ فورًا اُٹھ گیا۔ میں نے کچھ دیر اُس کا انتظار کیا پھر باہر چلا آیا اور جو پہلی بس نظر آئی، اُس میں سوار ہو گیا۔ میں نے یہ احتیاط کر لی تھی کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ جب بس خاصی دُور آ گئی اور میرے خیال کے مطابق بائی کلا کا علاقہ دُور رہ گیا تو میں نے اُتر کے نپے تلے قدموں سے فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ یہ جگہ بہت گنجان تھی۔ ایک بڑا میڈیکل اسٹور ابھی تک کُھلا ہوا تھا۔ میں نے اُس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اردگرد کا اچھی طرح جائزہ لے کے فون کرنے کے لیے اسٹور کا رُخ کیا۔ اسٹور کے مالک نے مجھے آسانی سے فون نہیں کرنے دیا لیکن جب میں نے ایک روپیہ اُس کے سامنے رکھا تو ۲ آنے کاٹ کے باقی ۱۴ آنے اُس نے میرے سامنے رکھ دیے۔ یہ میری زندگی کا پہلا ٹیلی فون تھا۔ راج کرشنا نے میری ... سنتے

ہی ڈھیروں سوال شروع کر دیے۔ میں نے سرگوشی میں کہا کہ میں آج رات شاید گھر نہ آسکوں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ راج کرشنا تفصیل پوچھتا، میں نے فون بند کر دیا۔

میں دوسرے دن بھی راج کرشنا کے پاس نہیں جاسکا اور فون بھی نہیں کر سکا۔ مستانہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے میرا اُس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہنا ضروری تھا۔ اس طرح ایک تو میں زیادہ محفوظ تھا کیونکہ ممکن تھا مستانہ کے آدمیوں کے دلوں میں اب بھی کوئی پھانس رہ گئی ہو۔ دوسرے میں اپنے آپ پر جبر کر کے جس کام کے لیے یہاں آیا تھا اُس کی تکمیل جتنی جلدی ہو جاتی اچھا تھا۔ تھل اور موجدار کی طرح مستانہ کے پاس داؤ پیچ سکھانے کے لیے بڑی جگہ نہیں تھی۔ ویسے بھی مستانہ ممبئی کے ایک چھوٹے سے علاقے کا مختار تھا، تھل اور موجدار کے پاس جتنا بڑا علاقہ تھا، یہ اُس کا عشر عشیر نہیں تھا۔ ویسے مستانہ چاقو چلانے میں بہت پھرتیلا تھا۔ یہ مقام اُس نے چاقو بازی ہی کا جوہر دکھا کے حاصل کیا ہوگا۔ دوسرے یہ اُس کا وہ بہروپ تھا جو خواہ مخواہ اُس کے آدمیوں پر دہشت طاری کیے ہوئے تھا۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مستانہ کی آنکھ میں رحم بالکل مفقود تھا۔ وہ کوئی پچاس سال کی عمر کا آدمی ہوگا۔ تیسرے دن صبح جب اُس نے اپنے کئی آدمیوں کے سامنے داؤ پیچ کی مشق کی اور اُن کے چاقو گرا دیے تو میرا جی چاہا کہ میں بھی اُس سے دو دو ہاتھ کروں مگر میں دور ہی کھڑا رہا۔ البتہ میں نے اُس کے آدمیوں سے پنجہ آزمائی اور چاقو بازی ضرور کی اور ہاتھ ذرا دبے دبے رکھے۔ اس کے باوجود مستانہ عش عش کر اٹھا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کی موجودگی میں مجھے اپنے ساتھ چاقو آزمائی کے لیے للکارا۔ اُس کی للکار میں تمسخر تھا، غصہ نہیں تھا۔ میں نے سر جھکا لیا اور پہلی بار مستانہ کا قہقہہ سنا۔ وہ اکھڑا اکھڑا سا قہقہہ جس کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ "دلی کا شہزادہ سکندر رہتا ہے۔" اُس نے سینہ پھلا کے کہا۔ "کہ اُس کے سامنے ایک مستانہ کھڑا ہے۔" یہ کہتے ہوئے مستانہ نے ایک جھرجھری لی، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور نعرہ نما آواز میں بولا۔ "مالک! راجا ہی رکھیو۔" پھر وہ اچانک دیوار سے سر پھوڑنے لگا اور اُس نے اپنا گریبان چاک کر کے "تار تار کر دیا۔ اُس کے آدمیوں نے اُسے پکڑنا چاہا تو اُس نے اُن دونوں کو جھکائی دے کے فرش بوس کر دیا اور کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے گم سم کھڑا رہا۔ پھر اُس نے جیب سے چاقو نکالا اور سامنے کی دیوار پر ایک نظر کی۔ چاقو ٹھیک چھپکلی کے سر پر لگا۔ چھپکلی دو ٹکڑے ہو کے زمین پر گر گئی۔ اُس کے آدمیوں نے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیا۔ میری زبان سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ نشانہ لگانے کا موقع آئے تبھی تو کوئی نشانہ لگا سکتا ہے۔

*

تیسرے دن دوپہر کو مجھے گھر جانے کا موقع مل گیا۔ میں وہاں دیر تک بیٹھا رہا۔ راج کرشنا موجود نہیں تھا۔ مجھے جلد واپس پہنچنا تھا اس لیے میں بجھو کو اپنی حاضری نوٹ کرا کے چلا آیا۔ مستانہ نے مجھے کچھ پیسے دے دیے تھے تاکہ میں نئے کپڑے خرید لوں۔ میں نے انھی لوگوں کے رنگ ڈھنگ کے مطابق کپڑے بنوا لیے اور دن دن بھر بائی کلا کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ دو دن اور گزر گئے۔ اِن دو دنوں میں مجھے مستانہ سے کچھ اور قریب ہونے کا وقت مل گیا۔ خوشامد مستانہ کو بہت پسند تھی مگر میری زبان سے خوشامد کا ایک لفظ بھی نہیں پھوٹتا تھا اس لیے میں زیادہ تر خاموش ہی رہتا تھا۔ اس خاموشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کے آدمی میری عزت کرنے لگے۔ خود مستانہ نے اسے میرے عجز پر محمول کیا۔ مستانہ کی زبان کچھ صاف تھی وہ سی پی کے کسی گاؤں سے ممبئی آیا تھا۔ رات گئے اُس کے پاس بھانت بھانت کی عورتیں آجاتی تھیں جنھیں لے کے وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ کمرے سے رات بھر ناچ گانے، راگ رنگ کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اُس کمرے میں اُس کے دو چار ہی آدمیوں کو اندر آنے کی اجازت تھی اور وہ دروازے کے ارد گرد ہی منڈلاتے رہتے تھے۔ کوئی عورت باہر نکلتی تو وہ اُسے بری طرح دبوچ لیتے۔ وہ بھی اتنی بے غیرت ہوتیں کہ کوئی مزاحمت نہ کرتیں بلکہ اپنی طرف سے کچھ اور چپٹ جاتیں۔ میں آنکھیں پھیر لیتا۔ شام اور صبح دونوں وقت بھنگ گھوٹی جاتی تھی۔ ایک بار انھوں نے میری طرف بھی پیالے بڑھائے۔ میں نے کہا ماں نے قسم دلا دی ہے۔ رات گئے مستانہ نشے میں لڑکھڑاتا کمرے سے باہر نکلتا تو اُس کے آدمی اندر گھس کے عورتوں پر جھپٹ پڑتے اور انھیں اپنے ساتھ کمروں میں لے جاتے۔ اگر کسی کی آج باری نہ آتی وہ دوسرے دن بازی لے جانے کی کوشش کرتا۔

دن بھر تاش کھیلے جاتے اور علاقے کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے لوگ مستانہ کے سامنے جیبیں خالی کر دیتے اور پولیس والوں کی سختی کی شکایت کرتے، کبھی کسی دکان دار کا رونا روتے۔ مستانہ کے خاص خاص آدمی آتے تو مستانہ اٹھ کے دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ وہاں ابھی تک میری پہنچ نہیں ہوئی تھی۔ مستانہ کے اڈے پر باہر کے لوگ بھی ملنے کے لیے آتے۔ میرے آنے سے قبل دو کانسٹیبلوں کا قتل ہو چکا تھا اور مستانہ کے کئی آدمی جیل میں بند ہو گئے تھے مگر کسی نے قبول کر کے نہیں دیا تھا اس لیے بائی کلا میں پولیس کی نفری بڑھا دی گئی تھی اور مستانہ انھیں کچھ دنوں سنبھلے رہنے کی ہدایت دیتا رہتا تھا۔ پولیس کی سختی کی زیادہ شکایتیں سن کے اُس کی آنکھیں شراب کے جام کی طرح سلگنے لگتیں اور وہ پھنکارتا ہوا کہتا۔ "ابھی دو چار اور جائیں گے۔ مالک اس کا دو چار اور اپنے پاس بلانے کی فکر میں ہے، بھیجوں گا مالک! تیرا حکم بھیجنا ہی پڑے گا۔"

مستانہ کو کسی کام سے عار نہیں تھا، کام کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ دوسرے علاقے کے لوگ جب اُس سے ملنے آتے تو وہ اُن کی بڑی خاطر تواضع کرتا اور جب اپنے کسی آدمی کو سزا دینے پہ آتا تو اُس کی انگلی کا کوئی پور کاٹ لیتا یا کان کی نوک کتر لیتا یا کہیں سے ذرا سی کھال اُتار لیتا۔ پھر علاج کی سہولت سے اُس کی کمر میں داغ ڈلے جاتے مگر ایسا کم ہوتا تھا۔

کے آدمی غلطیاں کم ہی کرتے تھے اور کرتے تھے تو سزا میں حتیٰ بھر رعایت بھی نہیں کی جاتی تھی۔

چونکہ بائی کلا میں پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا تھا اور افسروں کا گشت جاری تھا اس لیے میں نے باہر نکلنا اور کم کر دیا تھا۔ راج کرشنا کے کئی ماتحت افسران مجھے اُس کے ساتھ دیکھ چکے تھے۔ مجھے مستانہ کے ہاں اپنے دن گھسیٹتے ہوئے دو ہفتے گزر گئے۔ یہ دو ہفتے میں نے کسی جیل میں گزارے تھے۔ کبھی میرے خون کی گردش اتنی تیز ہو جاتی اور کبھی دماغ اتنا بھک جاتا کہ میرے ہاتھ خود اپنا گلا گھونٹنے لگتے۔ ایک ایک دن گنتا تھا، ایک ایک گھڑی کاٹنا مشکل تھا۔ سولھویں دن ہی میں وہاں سے چلا آتا کیونکہ وہاں مزید ٹھہرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی تھی اور میرا سینہ پک رہا تھا اور ویسے بھی مجھے جلد سے جلد اُن لوگوں سے دور ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اب مستانہ مجھے اپنے خاص آدمی کا سا رتبہ دینے لگا تھا اور کوئی اہم کام سونپنے ہی والا تھا۔ وہ کام کسی کا خون کرنے کا بھی ہو سکتا تھا۔ سولھویں دن دوپہر کے وقت مستانہ نے مجھے اپنے خفیہ کمرے میں بلوایا۔ وہاں دیواروں پر عریاں اور نیم عریاں عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور چھوٹے چھوٹے پایوں کی ایک بڑی چوکی بچھی ہوئی تھی۔ مستانہ کے کچھ خاص آدمی بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ مستانہ نے دروازہ بند کروا دیا اور ہمیں سرگوشیوں میں ہدایت دینے لگا۔ اُس کی ہدایت سن کے میرے ہوش اُڑنے لگے، رگیں پھٹنے لگیں۔ مستانہ نے میری طرف شوخی سے دیکھا اور درشتی سے بولا۔ "کیوں سکندر! تو نے اپن کی بات دھیان سے نہیں سُنی؟"

میں نے بوکھلا کے کہا۔ "سن لی ہے استاد!"

"تو پھر تیرے منہ کو سیل کیوں لگ گئی۔ تیرے لیے یہ کام نیا ہوگا۔" وہ بگڑے ہوئے تیوروں سے بولا۔ "پر تجھے کسی بڑے کام سے تو لگانا ہوگا۔ تو نے اچھا کیا، جلدی نہیں کی، علاقہ نہیں لیا، نہیں تو ٹھوکریں کھاتا رہتا سالا! اب خوش ہو جا، آگے مال ہی مال ہے۔" میری زبان کو سکتہ ہو گیا تھا۔ "سن لیا؟" وہ چیخ کے بولا۔

"سن لیا۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔

میں وہاں سے جلد چلا آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں بار بار برف ہو جاتے تھے اور بار بار اُن میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ شام تک مستانہ نے اس بات کا التزام رکھا کہ کوئی آدمی اُس سے دور نہ رہے حالانکہ بہ ظاہر وہ ہمیں حکم دے کے جیسے بھول گیا تھا۔ جیسے یہ اُس کا معمول ہو۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ مجھے اپنی فہمیدہ یاد آگئی، میری جان، میری بہنو۔ میرا کلیجا ٹوٹنے لگا۔ چراغ جلنے کے خاصی دیر بعد مجھے بھاگ جانے کا ایک موقع ملا لیکن میرے قدم مستانہ کے فلیٹوں کے تنگ راستے میں زمین نے جکڑ لیے۔ اگر مستانہ کو فوراً خبر ہو گئی کہ میں اڈے پر موجود نہیں ہوں تو وہ میری تلاش میں اپنے آدمی دوڑا دے گا اور اگر مجھے وقت پر کوئی سواری نہ ملی تو میں بائی کلا کے علاقے میں کسی بھی جگہ پکڑا جاؤں گا۔ میں چند لمحے راستے ہی میں ٹھہرا ہوا سوچتا رہا اور سوچنے کے نتیجے میں واپس آگیا۔ میرا اندیشہ درست تھا۔ مستانہ کے آدمی دروازے سے باہر آگئے تھے مگر مجھے واپس آتا دیکھ کے لوٹ گئے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا گچھا نہیں کیونکہ میں چند ہی لمحوں میں واپس آگیا تھا۔ مستانہ نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

رات کے بارہ بجے ہم لوگ، ہم آٹھ آدمی دو گاڑیوں میں اڈے سے روانہ ہوئے۔ ایک گاڑی لمبی تھی دوسری چھوٹی۔ میں چھوٹی میں تھا۔ پون گھنٹے بعد ہم اپنے مقررہ مقام پر پہنچے، دونوں گاڑیاں کچھ کچھ فاصلے پر ٹھہرائی گئی تھیں۔ میرا کام باہر ہی کھڑے رہنا تھا۔ مستانہ کے تین آدمی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے آپس میں کچھ اشارے کیے۔ اُس وقت رات کا ایک بجا ہوگا۔ موہوم مدھم سی روشنی تھی۔ یہ بنگلوں کا علاقہ تھا۔ چار آدمی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی کانسٹیبل ادھر نکل آیا تو آپس میں دنگا کر کے اُسے اُلجھا لیا جائے گا۔ میں گاڑی چلانا نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا ہوتا تو چپکے سے گاڑی میں بیٹھ کے فرار ہو جاتا۔ کل گیارہ آدمی تھے۔ گیارہ میں سے ایک کو مار کے یا شور مچا کے بھی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ ہی ایک آدمی اور کھڑا تھا، چار آدمی کچھ فاصلے پر ٹہل رہے تھے، چار آدمی بنگلے کی دیوار کود گئے تھے۔ اُن کے جانے کے چند منٹ بعد بنگلا اندھیرے میں ڈوب گیا۔

کوئی دس منٹ بعد اِدھر اُدھر شی شی، شوں شوں کی آوازیں آنے لگیں۔ تین آدمی بھاگتے ہوئے فٹ پاتھ پر آئے۔ ایک کے کندھے پر چادر میں لپٹی ہوئی بے ہوش لڑکی تھی۔ گاڑیوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لڑکی بجلی کی تیزی سے بڑی گاڑی میں ڈال دی گئی اور دو آدمی پچھلی سیٹ پر کونوں میں اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ اگلی نشست پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی آدمی چھوٹی گاڑی میں ٹھنس گئے۔ اس بار چھوٹی گاڑی آگے تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کچھ فاصلے سے چل رہی تھیں۔ بائی کلا کے علاقے میں چھوٹی گاڑی اڈے کے قریب روک دی گئی اور تمام لوگ باہر اُتر پڑے۔ دو آدمی ایک دوسرے سے اُلجھ گئے اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ شور مچنے لگا۔ دو کانسٹیبل سیٹیاں بجاتے بھاگتے ہوئے آئے اور لڑنے والوں کو ڈنڈے سے دھتکارنے لگے۔ دونوں فسادی ننگی ننگی گالیوں کا آزادانہ تبادلہ کر رہے تھے۔ باقی آدمیوں نے کانسٹیبلوں کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اس اثنا میں بڑی گاڑی یہ احوال دیکھے بغیر آگے نکل گئی اور جب تک وہ اڈے کی گلی سے واپس نہیں چلی گئی، لڑائی جاری رہی اور پھر کچھ تو تو میں میں کے بعد بات صلح صفائی پر آگئی۔ کانسٹیبل دونوں جھگڑالو آدمیوں کو تھانے لے جانے پر مصر تھے مگر اُن کے باقی ساتھیوں نے معافی تلافی کرا لی۔ دو آدمیوں کے سوا باقی گاڑی میں سوار ہوئے بغیر آہستہ آہستہ پیدل ہی اڈے کی طرف

چل پڑے۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو اڈّے پر بھیڑ نہیں تھی ہم لوگوں کو علیحدہ کر کے مستانہ کے ساتھ تین آدمی تھے۔ مستانہ نے سب کے بازوؤں کا بوسہ لیا اور میرا کندھا خاص طور پر تھپ تھپایا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے چھوڑ کے سبھی کو پہلے سے تیار کیے ہوئے بھنگ کے پیالے پیش کیے گئے۔

بھنی ہوئی مرغیاں، تکّے اور کباب تیار تھے۔ مستانہ کی یہ مستانہ روی دیکھ کے کسی نے خوشامدانہ آواز میں کہا: "استاد! ذرا دیدار تو کرا دو۔" اس کی تائید اور لوگوں نے بھی کی۔

"یہ اپن لوگوں کے لیے نہیں ہے اس سے سو بنائی جائیں گی فلو۔ یہ تو کیتش ہے۔" مستانہ معمول سے زیادہ چہک رہا تھا۔ اُس کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"استاد! بس ذرا ایک سیکنڈ درشن۔"

"آؤ۔" مستانہ نے ہاتھ پھیلا کے تلخی سے کہا: "آؤ آؤ سالا! تم بھی کیا یاد کرو گے، مر جائیں گا تو سالا یاد کرو گے، روؤ گے۔" وہ چیخ کے بولا۔

ہم سب اندر کمرے میں پہنچ گئے۔ لڑکی چوکی پر بے سُدھ پڑی تھی۔ اُس کے بدن پر ایک چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ مستانہ ڈگمگاتا ہوا اُس کے پاس گیا: "بتی جلاؤ۔" اُس نے منہ پر انگلی رکھ کے ہولے سے کہا۔ روشن کمرہ مزید روشن ہو گیا۔ مستانہ نے لڑکی کے پہلو میں بیٹھ کے دھیرے دھیرے چادر ہٹانی شروع کی۔ پھر دفعتہً ایک جھٹکے سے اسے کھینچ لیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور حلق میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ وہ گندمی رنگ کی ایک پری رو لڑکی تھی۔ اُس کی عمر ۱۶، ۱۷ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اُس کا چہرہ شائستگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا اور پورا بدن کسی مجسمے کی طرح ترشا ہوا تھا۔ پلکیں لمبی لمبی، آنکھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی، بال سیاہ اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے۔ وہ شب خوابی کا جدید لباس پہنے ہوئے تھی۔ سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اُس کی طرف سب ایک ٹک دیکھتے رہے۔ سب کی آنکھیں گنگ اور زبانیں دنگ تھیں۔ مستانہ نے انگلیوں سے اُس کے رخسار سہلائے اور پھونکوں سے اُس کے گیسو اُڑائے پھر پورے بدن پر سر سے پیر تک احتیاط سے ہاتھ پھیرا۔ اسی اثنا میں کسی نے منہ سے سیٹی بجا دی۔ مستانہ نے پلٹ کے ہم سب کی طرف غصے سے دیکھا اور جھٹ چادر سے لڑکی کا بدن ڈھانپ دیا۔ "ہٹو۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"ماسٹر قسم سے گرینڈ ماسٹر نے چھوکری اپنے ہاتھ سے بنایلا ہے۔" ماسٹر تمی لجلجاتی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا: "ماسٹر! دل گھبرا رہا ہے اِسے اُوپر پہنچا دو ورنہ....."

"چپ رہ۔" مستانہ نے ڈانٹ کر کہا: "بس اسے اُوپر پہنچا دو چھوکری تمھاری ماں کی طرح اُس وقت تک یہاں رہے گی جب تک....." مستانہ بولتے بولتے کہیں گم ہو گیا۔

"استاد چھوکری اپن اُوپر پہنچاؤں گا۔"

"نئیں استاد! یہ لومڑی کا بچہ دس سیر کا بورا بھی نہیں اُٹھا سکتا، چھوکری کو اپن پریم سے اوپر پہنچاؤں گا۔ استاد! ایک چانس دو۔"

"استاد! اپن پہنچاؤں گا، ایک دم فس کلاس....."

"آئیں آئیں۔" مستانہ کی گرج دار آواز سے وہ سب خاموش ہو گئے۔ "لفڑا ہے۔ تم سالا روز چھوکریاں دیکھتا ہے۔ ایک چھوکری بچا نہیں سکتا۔ دھندا کریں گا تم سالا سب کچے ماس کا بنا ہے۔" مستانہ باری باری سب پر غصے کی نگاہیں پھینکنے لگا۔ پھر اُس کی نظر مجھ پر ٹک گئی۔ میں الگ تھلگ خاموش کھڑا تھا: "ادھر آ سکندرا!" اُس کی آواز میرے جسم میں سن سنا گئی۔ میری ہچکچاہٹ پر اُس نے کرخت لہجے میں مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ "اِسے تو اوپر لے جائے گا اور تو..... تو۔" اُس نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے ساتھ جائے گا سلما پہرے پر رہے گا۔ روم نمبر ۶ میں سمجھا! اب تم سب میرے ساتھ آؤ ڈھائی بج رہا ہے اور وہ بچوڑیاں تھک کے مر گئی ہوں گی۔ آج اپن نے تم لوگ کے لیے خاص انتظام کیا ہے۔"

اُس کے اشارے پر میں نے لڑکی کو کندھے پر ڈال لیا۔ سبھوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک لاش اُٹھائے ہوئے ہوں فہمیدہ کی لاش۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا میرے پیر لرز رہے تھے میں نے اپنا چہرہ اُس کے کپڑوں سے خشک کیا۔ اُوپر کا راستہ ایک الماری سے گزر کے جاتا تھا۔ وہ صرف بظاہر الماری تھی اور کمرہ کیا تھا، ایک بڑا مچان تھا چھت نیچی ہونے کے لیے فرش پر بنا ہوا چھوٹا سا سلاخوں والا روشن دان۔ لڑکی اگر چیختی تو اُس کی آواز نچلے کمرے تک نہ جاتی۔ لڑکی سے رابطے کا واحد ذریعہ یہ روشن دان تھا وہاں ایک بستر کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک طرف غسل خانے کا تنگ حصہ تھا سلما باہر کھڑا رہا۔ میں نے لڑکی کو بستر پر لٹا دیا اور اُس کے بازو کی چٹکی لے کے اُسے ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کی۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے اُس کے بال درست کیے، سر کے نیچے تکیہ رکھا اور گردن تک چادر ڈال دی۔ وہ ہوش ہی میں نہیں آئی کہ میں اُس سے کچھ کہہ سکتا۔ میرا ہاتھ خود بخود چاقو پر پہنچ گیا۔ میں اُس کے سینے میں چاقو گھونپ سکتا تھا لیکن یہ بھی نہ کر سکا۔ میرے ساتھ آنے والے آدمی نے دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ ہم نیچے آ گئے۔ سلما نیچے کمرے ہی میں رہ گیا۔ یہ کمرہ چھوٹے سے صحن میں کھلتا تھا اور صحن باہر جانے والے راستے سے دور تھا۔ ایک عقبی راستہ بھی تھا مگر وہ عموماً بند رہتا تھا۔ جس کمرے میں سلما رہ گیا تھا اُس کے بعد بھی کئی کمرے تھے۔

صحن میں شور مچا ہوا تھا، رنڈیوں کی کلکاریاں، مستانہ کے آدمیوں کے قہقہے۔ ہم دونوں جا کے اُن کے درمیان بیٹھ گئے۔ سب کے سامنے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ مستانہ کے پہلو میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ جتنے آدمی تھے اتنی عورتیں نہیں تھیں۔ کوئی تین تین آدمیوں کے درمیان ایک عورت

تھی۔ مستانہ نے مجھے دیکھ کے ایک مستانہ نعرہ لگایا۔ پھر اُس کے حکم پر میں اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیا اور اُس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے اُچک کے میرے گال کا پیار لے لیا۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا میں نے اُسے پرے دھکیل دیا مگر میری اس بات پر سب بے تحاشا ہنسنے لگے: "استاد! اسے تو شانتی کے پاس پہنچا دو۔ وہ اسے ٹھیک کر لے گی۔" اُس نے زنخوں کی طرح نقل اتارتے ہوئے کہا۔ میں یہ سب سنتا اور دیکھتا رہا، وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

چار بجے کے قریب وہ نڈھال ہونے لگے اور عورتوں کو نوچنے کھسوٹنے لگے۔ ایک ایک عورت کے پیچھے تین تین چار چار مرد دوڑے اور واپس نہیں آئے پھر سب چلے گئے مستانہ بھی چلا گیا۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا میرے پاس گھڑی نہیں تھی، اندازاً ساڑھے چار بجے ہوں گے۔ کمرے میں نچوڑی ہوئی ہڈیاں، آدھ کھائی بوٹیاں، چادر پر سالن کے دھبے اور پیالے تتر بتر پڑے ہوئے تھے۔ پھولوں کی کچلی ہوئی پتیاں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ میرا جسم ایک پہاڑ بنا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کسی دوسرے کے اعضا معلوم ہوتے تھے۔ میں اُٹھ کے باہر آیا۔ صحن خالی پڑا تھا۔ سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ میں بے آواز چاپوں سے جنھیں صرف میں سن سکتا تھا، سلما کے کمرے میں گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے گردن ڈالے پڑا تھا۔ میں نے صحن کے ایک اندھیرے گوشے میں چھپ کے ایک بار پھر تمام کمروں کا جائزہ لیا اور وہیں سانس روکے کھڑا رہا۔ پھر جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں باہر جانے والے تنگ راستے میں آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے قریب کٹھریا میں چوکیدار رہتا ہے، راستہ روشن تھا۔ چوکیدار کے کمرے میں ایک رسی تھی۔ وہ رسی کھینچنے سے اندر چند کمروں میں ٹن ٹن گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ یہ گھنٹیاں میری موجودگی میں کبھی نہیں بجی تھیں۔ دروازہ ایک زنجیر سے بند کیا گیا تھا۔ کُنڈے میں لوہے کی بڑی میخ ڈال دی گئی تھی۔ میخ نکالنے اور وزنی کُنڈا کھولنے کی آواز سے پہرے دار جاگ سکتا تھا۔ وہ اگر اندر جاگ رہا تھا اور میں گردن لگے بڑھا کے جھانک کے دیکھتا تو کام بگڑ جاتا چنانچہ میں نے اُسے آواز دی۔ وہ شاید اونگھ رہا تھا سٹ پٹا کے بولا: "کون ہے؟"

پھر اُس نے دروازے سے سر نکالا ہی تھا کہ میں نے اُسے چیخنے کی مہلت نہیں دی۔ میری پہلی ہی ضرب سے وہ اپنے پیروں پر قائم نہیں رہ سکا اور سسکاری بھر کے اندر کمرے میں لڑھک پڑا۔ اِس کے باوجود میں نے دو تین ضربیں اور لگانا مناسب سمجھا۔ پھر میں دروازہ بھیڑ کے سن سن کرتے ہوئے پیروں سے واپس آ گیا۔ خاص دروازے کے کُنڈے کی میخ نکالنے میں مجھے چند منٹ اور لگ گئے حالانکہ یہ کام سیکنڈوں کا بھی نہیں تھا۔ گلی میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ بس کوئی اکّا دکّا گاڑی گزر جاتی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ وہاں کھڑے رہنے سے بہتر تھا کہ آگے بڑھ جاؤں۔ ایک چوراہے پر وکٹوریا اور ٹیکسیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ سب ٹیکسی والے مستانہ کو جانتے ہوں گے مگر میرے پاس چاقو تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کو جگایا۔ "نہیں جائیں گا۔" وہ حقارت سے بولا۔

"جتنا روپیہ کہو گے دوں گا۔" میں نے اُسی کے لہجے میں تیزی سے کہا۔ "باندرے تک جانا ہے۔ ایک ضروری کام ہے۔ ایک شخص بیمار ہے ڈاکٹر کو لانا ہے۔"

اُس نے منہ بنایا: "کتنا روپیہ دے گا؟"

"بیس روپیہ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"بیٹھ بابو!" میں اُس کے برابر کی نشست پر بیٹھ گیا۔ چاقو میں نے ہاتھ ہی میں دبائے رکھا۔ ٹیکسی والے نے راستے میں کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ وہ تیز رفتاری سے مجھے باندرے لے گیا۔ میری جیب میں بیس روپے نہیں تھے اس لیے مجبوراً ٹیکسی راج کرشنا کے بنگلے پر ٹھہرانی پڑی۔ بنگلے کے دو محافظ سپاہی پوری طرح چوکنا تھے۔ انھوں نے بندوقیں کندھوں سے اُتار لیں لیکن جب مجھ پر نظر پڑی تو تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ میں نے اُن کے قریب جا کے سرگوشی کی: "ٹیکسی والا جانے نہ پائے۔" ایک سپاہی احتیاطاً میرے ساتھ آیا، اُسے میری نیت پر بھی شبہ ہو گیا۔ بجلی کی گھنٹی کی ٹرٹر پر راج کرشنا گاؤن پہنے ہوئے اندر سے برآمد ہوا، اُس کے ہاتھ میں تمنچہ تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی اُس نے تمنچہ دُور پھینک دیا اور بے قرار ہو کے میرے سینے سے لپٹ گیا۔

سڑکوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت میں ابھی تیزی نہیں آئی تھی کہ مستانہ کے اڈّے پر جتنے لوگ موجود تھے سب منتقل کر دیے گئے۔ اِدھر سے فون کر کے راج کرشنا روانہ ہوا، اُدھر سے پولیس کی بھاری جمعیت پہنچی۔ پہرے دار ابھی تک بے ہوش پڑا تھا اور دروازہ کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ راج کرشنا نے مجھے اپنے ساتھ ہی لے لیا تھا۔ جب میں دو سپاہیوں کی مدد سے لڑکی کو اپنے کندھے پر ڈال کے لا رہا تھا تو میرے پیر بار بار زمین سے اکھڑ جاتے تھے۔ میں نے کسی کو اُس کا چہرہ نہیں دیکھنے دیا۔ اب وہ ہوش میں آ گئی تھی اور اُس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں، میں نے اُسے تسلی دی کہ "روؤ نہیں، تم اپنے گھر واپس جا رہی ہو۔" پولیس افسران تفتیش کے لیے اُسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر میں نے ضد کی کہ "وہ سیدھی گھر جائے گی، اس سے پہلے کہ پاس پڑوس والوں کو خبر ہو۔" میں نے کسی کو اُسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ نہ اُسے پولیس کی گاڑی میں بٹھایا۔ اُسے گھر پہنچاتے وقت میں اُس کے گھر کے اندر بھی نہیں گیا، مجھ سے اُس کے گھر والوں کے چہرے نہ دیکھے جاتے۔

راج کرشنا کی گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ خود راج کرشنا بائی کلا ہی میں رہ گیا کیونکہ ابھی اُسے وہاں موقع پر مزید گرفتاریاں کرنے اور کئی عمارتیں سیل کرنے کا حکم دینا تھا اور یہ کام خاص طور پر اپنی نگرانی میں انجام دلوانا تھا۔

راج کرشنا جلد سے جلد میرے پاس آنے کے لیے بے تاب ہوگا مگر بائی کلا میں متانہ کے اڈے کے بعد جو کام اُسے کرنا تھا' وہ اس سے زیادہ اضطراب کا تھا اسی لیے وہ وہاں ٹھہر گیا اور مجھے اُس نے گھر روانہ کر دیا۔ گھر آ کے میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے راج کرشنا کے دلوائے ہوئے کپڑے پہنے' کپڑے بدل کے کچھ سکون ہوا' جیسے کپڑے پہنے نہ ہوں بلکہ پی لیے ہوں۔ پھر میں نے کرسی کی پشت سے کمر ذرا لگائی تھی کہ مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔

راج کرشنا شام سے پہلے گھر نہیں آسکا اور جب آیا تو اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ وہ میرے پاس آ کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں اندر ہی اندر دعا کرتا رہا' کاش کرشنا وہ لفظ خود تک محدود رکھے جن کی ادائی کے لیے اُس کے سینے پر بوجھ ہوگا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ نہ اُس نے کچھ بات کی' نہ میں نے۔ ہم دونوں بس ایک دوسرے کی سانسیں سنتے رہے اور میں اپنی انگلیوں سے مختلف چیزوں' مختلف جانوروں کی شکلیں بناتا رہا۔ پھر میں نے ہی ابتدا کی کیونکہ سکوت ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ میں نے بہت ہلکی آواز میں اُس سے پوچھا "سب کام ٹھیک تو ہوا؟"

"ہاں" وہ ایک لمبی آہ بھر کے بولا "سب ٹھیک ہو گیا۔"

"اب.. اب تو کہیں نہیں جانا؟" میں نے شائستگی سے پوچھا۔

"نہیں' اب شاید نہ جانا پڑے یا شاید جانا پڑ جائے۔" اُس نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا پھر چُپ ہو گیا۔

"کپڑے بدل لیجیے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے زیرِ لب کہا۔

"ہونہہ۔" وہ اپنے گال رگڑتے ہوئے بولا "تمھیں تو اب کہیں نہیں جانا؟" اُس کے لہجے میں نہ تلخی تھی' نہ طنز تھا۔ البتہ شکایت تھی۔

"نہیں اب مجھے کہیں نہیں جانا۔" میں نے دبلے دبلے لفظوں میں کہا۔

مجھ پر صبح سے گھبراہٹ طاری تھی کہ وہ گھر آنے کے بعد بہت سی باتیں کرے گا' بہت سی باتیں پوچھے گا اور میں اسے ساری باتیں کس منہ سے بتاؤں گا۔ میں نے تو خود ہی ان باتوں کا دروازہ کھولا ہے' اب اسے بند کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ صبح ساڑھے چار بجے جب میں اچانک وارد ہوا تھا تو میں نے اُسے یہ سب کچھ سرسری انداز میں بتایا تھا۔ اُس وقت' وقت بھی کم تھا' ہمیں روانہ ہونے کی جلدی تھی کیونکہ لمحوں میں اندھیرے کا پردہ چاک ہو جاتا۔ ڈرائیور کی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان صرف رسمی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ اس واقعے کے بعد وہ میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا۔ وہ ایک بااصول شخص تھا۔ پورے سولہ دن اچانک غائب رہنا اور آنا تو اس انداز سے آنا' یہ سب کچھ اُس جیسے ذہین شخص کے سوچنے کے لیے بہت کافی تھا مگر اب کچھ بھی ہو' متانہ کے ہاں خلافِ توقع دیر ہو گئی تھی' مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ واقعات اس طرح پیش آئیں گے'

میں سمجھتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو چار روز میں واپس آ جاؤں گا اور اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔ معاملات کسی اور طرح اُس کے گوش گزار کر دوں گا۔

"آپ نے میری بات کا خیال رکھا۔" میں نے اُس سے نگاہیں... کی ناکام کوشش کی۔ صبح میں نے اُس سے درخواست کی تھی کہ وہ میرا... کہیں استعمال نہ کرے۔

اُس نے بے چینی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر یہ سب کیا ہے" آخر اُس سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ وحشت سے بولا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"میں بہت ڈسٹرب ہوں ڈارلنگ! میں پاگل ہو سکتا ہوں۔" وہ... چیختا ہوا بولا "میری مدد کرو' میرے دماغ پر پانی ڈالو۔"

"دیکھیے۔" میں نے جھجکتے جھجکتے استدعا کی "اب آپ کچھ نہ پوچھیں اور کسی قسم کا تردد نہ کریں تو اچھا ہے' میں آپ سے کیا کہہ سکوں گا۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

"ڈارلنگ! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "جانتے ہو اب تک کیا کچھ ہو چکا ہے؟ آج کے دن پر مجھے... نہیں آتا۔ کسی کو بھی یقین نہیں آتا' وہ حیران ہو ہو کے مجھ سے پوچھتے... کرشنا جی! یہ کیا ہوا؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے ابھی... اور ٹھیرنا چاہیے تھا مگر میں اُن کی نگاہوں سے بچ کے یہاں بھاگ آیا۔ شہر بھر میں ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ وہ سب اندر چلے گئے ہیں اور اُن میں بہت سے ایسے ہیں جو کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ ہم نے تمھارے بتائے... تمام ٹھکانے آزمائے۔ ہم نے کسی کو بھی سنبھلنے اور بھاگنے کی فرصت نہیں... شہر کے معزز ترین لوگ اس میں شامل ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ تم یہاں... سے کیسے بیٹھے ہوئے ہو۔ میرا دماغ معطل ہو چکا ہے' تمھیں اندازہ نہیں... یہ کتنا سنگین معاملہ تھا اور اب کس قدر اہم ہو گیا ہے۔ کتنے ہی لوگوں کا... ہو چکا تھا۔ یقیناً پولیس کا ایک گروہ بھی اُن کی پشت پناہی کرتا ہوگا۔... دولت سازی' زیرِ زمین منشیات کا بہت بڑا ذخیرہ' اُف۔" اُس نے... پکڑ لیا۔ "نہ جانے ابھی اور کیا کیا انکشافات ہوں۔ وہ پھر گورنر نے ذاتی... مجھے مبارک باد دی ہے۔ مجھ سے شکریے کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں کہا... رات ہی پولیس افسروں سے اس معاملے میں میری بات ہو رہی تھی۔... شبہ تھا کہ جعلی کرنسی بائی کلا کے علاقے سے آ رہی ہے مگر کہاں سے... اُس علاقے کی چند ممتاز ہستیوں کے ناموں پر سرخ دائرہ بنا دیا تھا مگر... ناکافی تھے اس لیے اُن پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا' میں اپنے... افسروں سے بار بار جھگڑتا تھا کہ ہمیں کسی کا لحاظ کیے بغیر اچانک چھاپہ... چاہیے مگر وہ ڈرتے تھے۔ مجھے فون پر دھمکیاں دی جا رہی تھیں اور کہا... رہا تھا کہ فوراً بمبئی سے نکل جاؤ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اوپر سے سخت... پڑ رہا تھا۔ یہی معاملے نمٹانے کے لیے بمبئی میں میرے قیام کی مدت بڑھ...

گئی تھی حالانکہ شہر کے کئی پولیس افسر ایک باہر کے آدمی کی مداخلت پر شکی محسوس کرتے تھے مگر اچانک — اچانک صبح تم آ گئے۔ اس سے پہلے شہر کا ایک اور گروہ ختم کرنے میں بھی تم شامل تھے' اب بھی تم ہی تھے۔ میری رہبری کرو۔" وہ ہانپتا ہوا بولا "ورنہ میرا ذہن بھٹکتا رہے گا۔ پولیس والے کا ذہن بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمھارے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا مگر ڈارلنگ! میں عہد شکنی کرتا ہوں' مجھے معاف کر دو۔" اُس نے شدت سے کہا اور میرے ہاتھ تھام لیے۔

"کچھ بھی نہیں' ذرا سی بات ہے۔" میں نے سادگی سے کہا "مجھے دو چار داؤ پیچ آتے تھے' آپ نے ریل میں خود اس کا مظاہرہ دیکھا ہے۔ انھیں ایسے آدمی کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ میں سولہ دن وہیں اُن کے ساتھ رہا اور واپس آ گیا۔ ممکن ہے' میں اُن کے ساتھ دو چار روز اور گزارتا' اگر وہ لڑکی لے کے نہ آ جاتے۔ اس طرح میرا فوراً نکلنا ضروری ہو گیا۔ اُس وقت تک میں آپ کو بتانے کے لیے اُن کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر چکا تھا۔"

"مگر کیوں؟ تم وہاں گئے کیوں؟" وہ جز بز ہو کے بولا۔

"آپ پریشان جو تھے' میں نے فون پر آپ کی گفتگو سن لی تھی۔ اُس دن میٹنگ میں آپ لوگ اس معاملے پر بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا' ایک کوشش کر دیکھوں مگر وہاں دن زیادہ لگ گئے۔ ویسے بھی میں ایک بے کار آدمی تھا۔ خالی بیٹھے رہنے سے کوئی کام کر لینا ہی ٹھیک تھا۔"

"مگر یہ کام!" وہ دہشت سے بولا۔ "تم نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا۔ میں سولہ دن پریشان ہوتا رہا۔ ایک آدھ بار کے بعد تمھاری کوئی اطلاع ہی نہیں ملی۔"

"مجبوری تھی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"مگر تم... تم اتنی جلدی وہاں قبول کیسے کر لیے گئے؟"

"شاید میری صورت ہی ایسی ہے۔" میں نے جھنجلا کے جواب دیا۔ "میں انھیں اپنی ہی برادری کا کوئی آدمی نظر آیا ہوں گا۔ خود میں نے بھی انھیں یہی جتانے کی کوشش کی تھی۔ جب میں نے اُن کے دو چار آدمیوں کو زمین پر بٹھا دیا تو انھیں میری ضرورت کا احساس ہوا لیکن اب میں یہاں آ گیا ہوں۔" راج کرشنا کے لب کچھ کہنے کے لیے پھڑکتے رہ گئے۔ مجھے اُس کے لہجے پر شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا "میں اب کہیں نہیں جاؤں گا' یہیں رہوں گا۔" میرے اصرار پر وہ تھکے ہوئے انداز میں اُٹھ گیا اور نہا دھو کے کسی قدر تر و تازہ نظر آنے لگا' پھر بھی اُس کی بھوؤں کے درمیان کی جگہ سکڑی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد پولیس افسران آ گئے۔ اُن سب کے چہرے تمتما رہے تھے۔ انھوں نے صبح مجھے راج کرشنا کے ساتھ متانہ کے اڈے پر سرگرم دیکھا تھا۔ میں لڑکی کو اُن کے سامنے اُٹھا کے نیچے لایا تھا۔ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی لیکن ہے' متانہ اور اُس کے ساتھیوں نے بازپرس کے دوران میں مجھے بُرا بھلا کہا ہو' ہر چند راج کرشنا نے متانہ اور اُس کے ساتھیوں کو یہ تاثر دینے کی احتیاط کی تھی جیسے میں بھی اُن کے ساتھ پھنس گیا ہوں۔ حوالات میں بھی انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا گیا تھا۔ میری خواہش پر سب سے پہلے لڑکی بازیاب کی گئی تھی تاکہ اُسے کسی قسم کی زک پہنچنے کا احتمال نہ رہے مگر راج کرشنا کی یہ احتیاط بے معنی تھی۔ متانہ اور اُس کے آدمیوں کو جلد یا بدیر اس نتیجے پر پہنچنا ہی تھا کہ وہ بے وفا کون شخص ہو سکتا ہے اور پولیس افسران کو بھی معلوم ہونا تھا کہ راج کرشنا کی معلومات کا ذریعہ کون سا تھا۔ وہ سب میرے ارد گرد بیٹھ گئے۔ اُن کی خواہش راج کرشنا کی توقع سے مختلف نہیں تھی کہ میں انھیں بہت دلچسپ باتیں سناؤں گا۔ مگر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ فون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی اور راج کرشنا کے بنگلے پر رات کو تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ گھر نہیں ہے' کوتوالی ہے۔

ناشتے کی میز پر صبح کے اخبارات رکھے ہوئے تھے۔ تمام کے تمام انگریزی کے تھے۔ میں نے جان بوجھ کے ہاتھ نہیں لگایا۔ راج کرشنا سر جھکائے انھیں پڑھتا رہا' ناشتے کے فوراً بعد وہ جلد آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں نے اخبارات دیکھنے شروع کیے' اخباروں نے جو کہانیاں لکھی تھیں' اُن میں سے بہت سی میرے لیے بھی نئی تھیں۔ اخبارات نے شہر کی اُن شخصیتوں کے نام چھاپنے سے گریز کیا تھا جنھیں آگے پیچھے گرفتار کیا گیا تھا لیکن روداد پوری چھاپی تھی۔ کہاں کہاں کیا کیا ملا۔ سکوں کی ڈھلائی' نوٹوں کی چھپائی' شراب اور دیگر منشیات کا ذخیرہ۔ جہاں جہاں یہ ذکر تھا' وہاں ہر جگہ راج کرشنا کا نام موجود تھا۔ اُس کی تعریف میں بڑی بڑی باتیں لکھی گئی تھیں' اُس نے اب تک کتنے گروہوں کو عریاں کیا اور پولیس میں اُس کی خدمات کا کتنا بڑا ریکارڈ ہے۔ ایک اخبار نے "ایک سچا پولیس مین" کے عنوان سے راج کرشنا پر مختصر مضمون بھی چھاپا تھا۔

اُس کے بارے میں اگلے پچھلے اتنے بہت سے واقعات پڑھ کے مجھے کمرے میں حبس سا محسوس ہوا۔ یہ تو دو واقعات تھے جو میرے سامنے پیش آئے۔ اس سے پہلے راج کرشنا کی پوری زندگی جرم کشی میں گزری تھی۔ مجرموں کے لیے اُس کا نام تازیانہ تھا۔ اگر کسی موقع پر راج کرشنا کو یہ معلوم ہو گیا کہ اُس کے ساتھ رہنے والا آدمی بھی تین قتل کرنے کے الزام میں سات سال جیل میں گزار کے آیا ہے اور یہ سزا کاٹنے کے بعد بھی اُس نے بس نہیں کیا بلکہ بدھ گیا میں ایک شخص کو چھرا مار کے ختم کر دیا' کلکتے میں چاندمیاں اور موجمدار جیسے بدمعاشوں کو چاقو مار کے ہلاک کر دیا اور اُس کا تعلق کلکتے کے مشہور آدمی تجمل سے رہا ہے' اُس کی بہن کوٹھے پر ناچتی تھی اور اُس کے گھر کے باقی آدمیوں کا کچھ اتا پتہ نہیں ہے' وہ سولہ سترہ

سال کی عمر میں ایک کم سن لڑکی کو گھر سے لے کے فرار ہوگیا تھا۔ اگر راج کرشنا کو یہ ساری باتیں یا ان میں سے کوئی ایک بات معلوم ہو جائے تو اُس کے ذہن پہ کیا اثر ہوگا؟ اگر وہ میرا خیال کرے گا تو اُس کے اُصول مجروح ہوں گے۔ اتنی عمر سچائی کی گزارنے کے بعد اُسے جھوٹ بولنا' جھوٹ سہنا پڑے گا۔ میں نے پہلے ٹھیک فیصلہ کیا تھا' مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے' اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے' میں خود وضاحت بھی نہیں کرسکوں گا کہ یہ سب مجھ سے کیوں ہوگیا۔ مجھ سے صرف ایک غلطی ہوئی تھی کہ میں نے آبا جان اور اتی پر شبہ کیا کہ وہ کورا کو کہیں باہر نہ نکال دیں' اس لیے میں کورا کو وہاں سے لے کے چلا آیا تھا۔ اگر میں وہیں بیٹھا اُن سے لڑتا رہتا تو شاید وہ میری بات مان لیتے اور کورا کو گھر میں رکھنے کے لیے آمادہ ہو جاتے مگر وہ کیسے رکھتے اور میں نے کیا غلطی کی۔ جب تک کورا رہی اُسے اُوپر چھت پہ چھپتے ہوئے ایک کمرے میں بند رکھا گیا تھا تا کہ محلّے والے اُسے نہ دیکھ سکیں' اُسے رشتے داروں اور محلّے والوں سے کب تک چُھپا کے رکھا جا سکتا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اُس کا راز فاش ہوتا ہی۔ میں اسے غلطی نہیں کہتا کہ مجھے کورا کا خیال ترک کر دینا چاہیے تھا۔ میں اُسے بمبئی چھوڑ آتا' ابا جان کی خواہش پہ تھانے میں رپورٹ درج کرا دی جاتی' میں مرجاتا مگر مجھ سے یہ کبھی نہ ہوتا۔ سو جو کچھ ہوا' اُس میں میری مرضی کہاں شامل تھی۔

میں نے قلم اُٹھایا اور کاغذ پہ راج کرشنا کے نام خط لکھنا شروع کیا' کوئی لقب سمجھ میں نہیں آیا۔ میں قلم ہاتھ میں رکھے رکھے سوچتا رہا۔ میرے جی میں آیا کہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کے نیچے اپنا نام لکھ دوں مگر کون سا نام؟ بابر لکھوں' ظہیر خاں لکھوں' لاڈلا لکھوں' فقیرا لکھوں' سکندرا لکھوں' شہزادہ لکھوں' کیا لکھوں' اور جاؤں گا کہاں؟ زرّیں کے پاس کہ وہ میرے بارے میں تقریباً سب کچھ جانتی ہے اور میرے لیے دعائیں کر رہی ہوگی۔ میری زرّیں پتہ نہیں وہ اکیلی رہ گئی ہے یا تجمل ابھی تک اُس کے پاس موجود ہے۔ میں زرّیں کے پاس جاکے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو جاؤں گا مگر وہ جب سامنے آتی ہے تو کورا کی یاد آتی ہے اور دل ہولنے لگتا ہے۔ تو جب تک بن رہی ہے' راج کرشنا کے پاس ہی کیوں نہ ٹھہرا رہوں۔ فہمیدہ کے پیر میں گھنگرو دیکھ لیے' اُس کے حسن کے بارے میں تماش بینوں کے تبصرے سُن لیے تو اب راج کرشنا کی آنکھیں دیکھنے اور باتیں سننے سے کیا اثر پڑتا ہے۔

شام کو گھر واپس آکے راج کرشنا اِس کی معذرت کرنے لگا کہ مجھے دن بھر تنہا گھر میں رہنا پڑا اور وہ مجھے خیریت کا فون بھی نہ کرسکا۔ وہ کچھ مطمئن مطمئن خوش خوش لگ رہا تھا۔ میں نے اُس کے خیال سے اپنے چہرے پر جبری خوش حالی طاری کی۔ اُس نے مجھے فی الفور لباس تبدیل کرنے کی ہدایت کی' وہ میرے لیے نئے سوٹ لے کے آیا تھا جس کے ناپ پہلے دن درزی نے لیے تھے۔ میری ٹائی کی گرہ اُس نے خود اپنے ہاتھ سے درست کی۔ جدید وضع کے اِس لباس میں مَیں اپنے آپ کو اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ "ایک دم فرسٹ کلاس"۔

وہ مجھے سرتاپا گھورتے ہوئے بے ساختہ بولا "لے جنٹلمین پر فارنیس" ... میں بار بار انگریزی بولنے لگتا تھا۔ پھر اُسے میرا خیال آ جاتا تو فوراً زبان ...

ہماری گاڑی جس دروازے سے اندر داخل ہوئی' اُس کے ... سبزہ ہی سبزہ تھا۔ خاصی دُور جاکے شاہی محلات کے طرز کی ایک شا... عمارت بنی ہوئی تھی۔ مجھے راج کرشنا کے ساتھ قدم ملانے میں دشوار... وہ ایک ایک قدم ناپ تول کے اُٹھا رہا تھا۔ میں نے بھی اُس کی نق... کی کوشش کی۔ پگڑی والے ایک دربان نے جُھک کے راج کرشنا کو ... مجھے بھی کیا۔ میرے ہاتھ خود بخود مصافحے کے لیے اُٹھ گئے پھر ٹھٹک ... گئے۔ راج کرشنا بے نیازی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ میں بھی تیز قدموں ... کے برابر ہوگیا۔ ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں دھیما دھیما سا شور تھا ... مردوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ راج کرشنا کی آمد پہ ہال میں ایک سنا... پھر کئی لوگ اُس کی طرف دوڑ پڑے اور زور زور سے مصافحے کرنے لگ... اُس کا بازو پکڑا اور کسی نے اُسے گلے لگایا۔ راج کرشنا مہذب انا... سب کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ میں بھی اس ہجوم میں اُس کے ساتھ تھا۔ "میرا ... ظہیر خاں" اُس نے لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول کرائی۔ لوگوں کی آ... حیرت اُبل پڑی۔ "آپ کا بھائی؟" کسی نے تعجب سے پوچھا۔ راج کر... سر اُٹھا کے کہا "ہاں میرا بھائی' میرا دوست' میرا بیٹا" لوگ مسکرا مسکرا ... ہوگئے۔ پھر اچانک کسی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا۔ میرے جسم میں ایک ... گئی۔ میں نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا' رستم جی تھے' جو پہلے دن ریستوراں میں ملے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کی بیٹی بھی تھی۔ "... نورین ہوں" اُس نے شوخی سے کہا۔

"مجھے..... مجھے آپ کا نام معلوم ہے" میں نے سٹ پٹا کے ...

"ہائیں" وہ جھلملاتی ہوئی نظروں سے بولی "میں سمجھی کہ آپ بھول گئے ہوں گے۔ آپ دونوں کو اُس دن کے بعد سے آج دیکھا ..."

"فرصت ہی نہیں ملی" میں نے لفظ چبا چبا کے کہا۔

"پاپا بتا رہے تھے کہ کل آپ لوگوں نے بہت بڑے بڑے ج... ہیں' دیو جیسے۔ مجھے تو کپکپی آگئی۔ پاپا نے مجھے اخبار بھی دیا تھا مگر پڑھا نہیں گیا۔"

"میں نے نہیں' کرشنا جی نے پکڑے ہیں"۔

"ایک ہی بات ہے" وہ بے پروائی سے بولی۔

"دو باتیں ہیں" میں نے تلملا کے کہا۔

"چلیے' دو سہی" اُس کے چھوٹے چھوٹے دانت کھل گئے ... راج کرشنا لوگوں کے درمیان اس قدر گھر چکا تھا کہ میری ... نہیں دے سکا۔ وہاں زیادہ تر انگریزی بولی جا رہی تھی۔ میں وہاں ... طریق سے بالکل ناآشنا تھا۔ جب نورین نے مجھے اپنی میز پہ ... کے لیے میرا ہاتھ تھاما تو میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اتنے بہت سے لوگ...

درمیان کسی اجنبی لڑکی کا ہاتھ تھام کے گھومنا پھرنا میرے لیے عجیب سی بات تھی مگر وہاں مردوں اور عورتوں میں ایسا کوئی تکلف نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اپنی بدتہذیبی کا احساس ہوا۔ میں نے جھٹ اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اُس کے ساتھ جاکے ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ "کچھ کھیلیں گے؟" اُس نے مجھے متجسس نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے"۔

"تو پھر کن چیزوں سے دلچسپی ہے آپ کو؟"

میں اُس کے سوال کا جواب فوراً نہیں دے سکا۔ "کسی چیز سے نہیں"۔

"کسی نہ کسی چیز سے تو ہوگی؟"

"نہیں"۔

"یعنی دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے جس سے آپ کو دلچسپی ہو؟"

"ہاں" میں نے سوچتے ہوئے کہا "کسی چیز سے نہیں"۔

"حیرت ہے" وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

"آپ کو کھانے کون کون سے پسند ہیں؟"

"جو مل جائیں' ویسے مجھے میٹھے چاول بہت پسند ہیں"۔

"میٹھے چاول" وہ ہنس پڑی "اور لباس کون سا؟"

"سبھی" میں نے اُکتا کے کہا "آپ ایسے سوال کیوں کر رہی ہیں؟"

"پھر ہم کیا باتیں کریں؟" وہ چونک کے بولی۔

"میں نہیں جانتا" میں نے بے دلی سے کہا۔

اُس نے اپنے شانے اچکائے "کیا میں اچھی باتیں نہیں کرتی؟"

"نہیں" میں نے تیزی سے کہا "آپ کی آواز بہت اچھی ہے اور آپ باتیں بھی اچھی کرتی ہیں مگر... مگر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے"۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے اپنے ہاتھ سے میری کلائی چھوتے ہوئے کہا "ٹمپریچر تو نارمل ہے۔ اوہ" اُس کے چہرے سے گھبراہٹ دُور ہوئی۔ "آپ کو اپنی زمینیں یاد آ رہی ہوں گی؟ سب کُھلا ہی کُھلا' ہرا بھرا ہی ہرا بھرا۔ ایسا ہی ہے نا؟"

"ہاں" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"اور آپ کو کرشنا جی روکے ہوئے ہوں گے۔ اچھا ہے' مجھ سے ملیں گے تو میں کہوں گی' آپ کو ابھی اور روکیں"۔

"کیوں؟ آپ کو کیا مزہ آئے گا؟"

"پھر آپ بہت دنوں بعد جب اپنے گھر جائیں گے تو آپ کو اپنی پرانی چیزیں نئی معلوم ہوں گی اور آپ پہلے سے زیادہ سکون محسوس کریں گے"۔

"ہاں!" میں نے مایوسی سے کہا۔

"آپ کچھ اُداس اُداس رہتے ہیں"۔

"نہیں تو" میں نے سیدھے ہو کے کہا۔

"باتیں بھی کم کرتے ہیں حالانکہ اُس دن کرشنا جی کہہ رہے تھے کہ آپ جب باتوں پر آتے ہیں تو سب کو خاموش کر دیتے ہیں' آپ کا موڈ بھلا کب ایسا ہوتا ہے؟"

"موڈ کا پتہ کیسے ہوتا ہے"۔

"اگر آپ کا جی گھبرایا کرے تو آپ ہماری طرف آ جایا کیجیے۔ پاپا کی کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں' اُن کے دو جہاز بھی ہیں' جب اِدھر ساحل پر ہوتے ہیں تو ہم چند روز وہیں رہتے ہیں۔ اب جہاز آنے ہی والا ہے' اس بار آپ بھی ساتھ چلیے گا۔ ہم ساحل سے بہت دُور رہیں گے۔ ہیں نا! کیسا پروگرام رہے گا۔"

"بہت اچھا رہے گا" میں نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ راج کرشنا ہماری طرف آگیا۔ اُس نے مجھے نورین کے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کے میرے متعلق کیا خیال کیا ہوگا' یہ سوچ کے مجھے جھینپ آنے لگی۔

"شکریہ نورین کہ تم نے اِن کا خیال رکھا" کرشنا نے کہا۔ اُس کی آواز موسیقی کے شور میں دب گئی۔ ہال کے ایک کونے میں بینڈ باجے والوں نے ساز بجانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سی عورتیں اور مرد ہال کی خالی جگہ اکٹھے ہوگئے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کے ناچنا شروع کر دیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں' میں نے کتابوں میں پڑھا تو تھا کہ لوگ اس انداز سے رقص کرتے ہیں۔ "آئیے' میرے ساتھ رقص کیجیے" نورین نے اشتیاق سے کہا۔

"تم آج کیوں رقص کر رہی ہو؟ رقص تو روز ہوتا ہے اور تم گم سُم بیٹھی دیکھتی رہتی ہو۔ آج کیا بات ہے؟" کرشنا نے شگفتگی سے پوچھا۔

"آج" وہ سوچتے ہوئے بولی "بس آج جی چاہ رہا ہے' آؤ"۔

اُس نے میری جانب ہاتھ پھیلایا۔ میں نے بے چارگی سے راج کرشنا کو دیکھا۔ "میرے ساتھ آؤ" کرشنا نے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر تھرکنے لگے۔ میری آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ وہ یقیناً میرے بارے میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ سازندے دھن بدلتے تو کبھی رقص میں تیزی آ جاتی' کبھی مندی' مرد عورتیں بدل دیتے اور عورتیں مرد بدل دیتیں لیکن وہ سب سنجیدہ تھے' بہت شائستہ۔ کسی نے کسی کے ساتھ کوئی اوچھی بات نہیں کی' نہ کوئی فقرہ کسا' نہ سیٹی بجائی۔ شوخی جان اور شہ پارہ وغیرہ کے رقص کے دوران میں جو باتیں ہوا کرتی تھیں' وہ بھی میں نے سُنی تھیں۔ رقص کے بعد کھانے کی میزوں پہ کھانا چُن دیا گیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی' ایک خوش پوش ادھیڑ عمر شخص نے کھانے سے پہلے انگریزی میں اعلان کیا کہ کلب کے معزز ارکان کی خواہش کے مطابق آج کی رات کلب کے ریکارڈ میں مسٹر راج کرشنا کی رات کے طور پر درج کی جائے گی۔ کلب کے معزز ارکان کی درخواست ہے کہ مسٹر راج کرشنا شہ کرسی پر تشریف لائیں" اعلان کرنے والے نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "مسٹر راج کرشنا نے اس شہر کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں' یہ کلب کی طرف سے

اُن کے اعتراف کا ایک حقیر اظہار ہے۔ اِس سلسلے میں کلب مسٹر راج کرشنا کے اعزاز میں ایک رسمی تقریب منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تقریب کا اعلان جلد ہی کر دیا جائے گا۔ تمام بہترین خواہشات راج کرشنا صاحب کے لیے بمبئی کے معززین انھیں خلوصِ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔" ایک بار پھر ہر طرف تالیاں بجنے لگیں۔

نورین میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ جوشیلے لہجے میں بولی "کلب میں یہ اعزاز بہت دنوں بعد کسی کو ملا ہے۔" راج کرشنا آنکھیں بند کیے، سر جھکائے ہمارے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نورین نے اُسے ٹوکا کہ اُس کے لیے شہہ کرسی خالی پڑی ہے اور سب لوگ منتظر ہیں۔ واقعی سب لوگ منتظر تھے۔ راج کرشنا سے دوبارہ بہ آوازِ بلند درخواست کی گئی۔ راج کرشنا جھجکتا ہوا اُٹھا اور آہستہ قدموں سے شہہ کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ کھڑے ہو کے تالیاں بجاؤں میں کھڑا ہو گیا اور زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ میں اکیلا کھڑا تھا اور پشیمانی سے بیٹھنے ہی والا تھا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ راج کرشنا کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ تالیاں ختم ہوئیں تو وہ کسمساتا ہوا اپنی نشست سے اُٹھا اور چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اُس نے چاروں طرف سر گھمایا، پھر اُس کی نگاہیں مجھ پر ٹک گئیں۔ اُس نے انگریزی میں کہنا شروع کیا۔ "خواتین و حضرات! اس اعزاز کا شکریہ بہت بہت شکریہ۔" اُس کی آواز بہک رہی تھی۔ "یہی باتیں یہی احساسات کام کرنے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں مگر میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے کبھی ستائش کے خیال سے اپنا فرض ادا نہیں کیا ہے بلکہ میں نے اپنی زندگی کا جو مقصد بنایا تھا، مجھے خوشی ہے کہ اُسی پہ کاربند ہوں۔ ایک یہی مقصد، یہی جذبہ میری رہبری کرتا رہا ہے۔ آج کے واقعات کے بارے میں آپ میری زبانی کچھ جاننے کے لیے بے چین ہوں گے مگر یہ ایک مناسب موقع نہیں ہے۔ میں۔ میں۔" اُس کا گلا رُندھنے لگا اور آواز لڑکھڑا گئی۔ "آج کے واقعات کے لیے آپ نے مجھے جس اعزاز سے نوازا ہے، میں اصل میں اُس کا مستحق نہیں ہوں۔" یہ کہہ کے وہ رُک گیا ہال میں بھن بھناہٹ ہوئی۔ سب ٹکٹکی باندھے راج کرشنا کو دیکھ رہے تھے۔ میرے جسم میں خون جم گیا تھا۔ "کل کے واقعے کے تمام اعزاز کا مستحق میرا عزیز ظہیر خاں ہے۔ وہ وجیہہ اور دل کش نوجوان جو پہلی قطار میں منہ چھپائے بیٹھا ہے، یہ سب اُسی کا کرشمہ ہے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتاؤں گا اور نہ آپ براہِ مہربانی تفصیل پوچھنے کے لیے اصرار کریں بس شہہ کرسی پر بیٹھنے کا سزاوار ظہیر خاں ہی ہے، میں اُس کے لیے اپنی نشست خالی کرتا ہوں۔"

پہلے تو ہال میں جیسے سارے لوگ آوازوں سے محروم ہو گئے پھر دفعتہً ایک شور گونجا۔ نورین بے طرح مجھے جھنجھوڑنے لگی مجھے پسینہ آنے لگا۔ سب سے بڑی مشکل مجھے اپنا رویہ متعین کرنے میں پیش آئی عقل جواب دینے لگی کہ اس موقع پر کس تاثر کا اظہار کرنا چاہیے۔ اصولاً راج کرشنا کو یہ تاثر دینا چاہیے تھا کہ اُس نے میرے بارے میں جو کہا ہے، وہ میں نے انگریزی میں ناواقفیت کے سبب نہیں سنا ہے اور اگر میں یونہی بُت بنا بیٹھا رہتا تو اِن پڑھے لکھے معزز لوگوں کے سامنے راج کرشنا کی توہین ہوتی کہ وہ اپنے جس عزیز کو اتنی عزت دے رہا ہے، وہ ایک جاہل شخص ہے میرا دل جھٹکے کھانے لگا اور جسم کی تمام طاقت خاک ہو گئی مجھے ایسا لگا جیسے میں مٹی کا پُتلا ہوں اور ابھی ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ خوش قسمتی سے میری یہ گنگ کیفیت انکسار پر محمول کی گئی ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں پھر راج کرشنا ہی نے میرے اوسان بحال کیے۔ اُس نے اردو میں مجھے آواز دی "ظہیر خاں! اِدھر آؤ اور یہ کرسی سنبھالو۔"

سب لوگوں کی نگاہیں مجھی پر جمی ہوئی تھیں، میری ایک ایک حرکت ایک ایک جنبش پر۔ نورین نے مجھے زبردستی اٹھا دیا اور میں اٹھنے کو تو اُٹھ گیا مگر راج کرشنا تک پہنچنے کا گزوں کا فاصلہ میلوں برابر ہو گیا۔ ہر قدم پر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا لپکتا رہا، بجلی تڑختی رہی ہال سے نکلنے کے کئی دروازے تھے، یک بارگی میرے جی میں آیا کہ بس یہاں سے فوراً بھاگ نکلوں، راج کرشنا کا یہ مذاق بہت ستم ناک ہے مگر کرسی کے قریب راج کرشنا مجھے لینے آ گیا۔ اُس نے جب میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے کسی قدر توانائی محسوس ہوئی لیکن شہہ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جیسے ہی میں اُن سب کے سامنے کھڑا ہوا تو مجھے کسی کی شکل صاف نظر نہیں آئی۔ وہاں ہیولے بیٹھے ہوئے تھے اور سارا ہال لرز رہا تھا۔ دیواریں مجھ پر گری پڑ رہی تھیں اور میں فرش میں دھنسا جا رہا تھا۔ میرے سارے حواس منتشر منتشر ہو گئے تھے۔ راج کرشنا نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود میرے برابر بیٹھ گیا۔

یقیناً لوگ اس بات کے منتظر ہوں گے کہ اب میں اپنی زبان سے کچھ کہوں گا مگر کسی کے منہ میں زبان ہوتی تو وہ کچھ کہتا بھی۔ میری زبان پر تو فالج گر گیا تھا۔ راج کرشنا خود اُٹھ کھڑا ہوا "خواتین و حضرات مجھے اندازہ ہے کہ آپ ظہیر خاں کی زبانی کچھ سننے کے مشتاق ہوں گے۔ میری بھی یہی خواہش ہے مگر میں آپ سے درخواست کروں گا۔" اُس نے شستہ انگریزی میں کہا۔ "کہ یہ ایک موزوں وقت نہیں ہے یہ گفتنی ناگفتنی کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیے۔" اُس نے میرا بازو کھینچ کے مجھے جلدی سے اٹھا لیا "میں اپنی اور ظہیر خاں کی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، آیئے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" راج کرشنا نے سب کے سامنے سر جھکایا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی اور جب اُس نے آخری مرتبہ شکریہ ادا کیا تو میں نے اُس کے ساتھ آواز ملانے کی کوشش بھی کی۔ میری آواز تالیوں میں ڈوب گئی۔ میرے حواس کچھ کچھ درست ہونے لگے تھے اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے مجھے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میرے دل میں کچھ بولنے کی خواہش

[ابھ]ری لیکن ہمت نہیں پڑی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اپنی نشستوں [سے] اُٹھ گئے تھے اور میرے اردگرد اژدہام ہو گیا تھا۔ راج کرشنا پہلے ہی کہہ [چک]ا تھا کہ آج کے واقعے کے بارے میں اُس سے کسی قسم کی تفصیل طلب نہ [کی] جائے چنانچہ لوگ پُراسرار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ نورین کے رخساروں [پر] سرخی دیکھ کے میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ [س]ے کوئی ایسی نمایاں بدتہذیبی سرزد نہیں ہوئی ہے۔ میں شہہ کرسی پر بیٹھنے [س]ے پہلے جو کچھ اپنے اندر، اپنے اوپر محسوس کر رہا تھا شکر ہے کہ اُس کی خبر [لو]گوں کو نہیں ہوئی تھی۔ راج کرشنا نے بہت خوش اسلوبی سے بات [سنب]ھالی تھی اور وہی تھا جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ ایک بُرا وقت ٹل گیا۔

سب لوگ کھانے کی میزوں پر آ گئے۔ لوگوں کی ہمت افزا باتیں [س]ن کے اور تجسس شناس نگاہیں دیکھ کے میری حالت کہیں معمول پر [آ]ئی۔ نورین اب بھی میرے ساتھ بیٹھی تھی اُس بڑی میز کے اطراف بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد اُس ماحول سے میری اجنبیت کسی حد تک مزید دور ہو گئی۔ لوگ مشروبات پی رہے تھے اور پورے ہال میں بے ترتیبی ہو گئی تھی۔

سازندوں نے پھر ساز بجانے شروع کر دیے تھے۔ کئی عورتیں اور کئی مرد پھر ناچنے لگے تھے۔ بہت آہستہ آہستہ جیسے فرش پر رینگ رہے ہوں یا کھڑے کھڑے سو گئے ہوں۔ راج کرشنا نے مجھ سے چپکے سے پوچھا "کہو تو چلتے ہیں؟"

"ہاں" میں نے تیزی سے کہا "چلیے، وقت بھی بہت ہو گیا ہے۔"

اپنے پاس بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں سے راج کرشنا نے مصروفیت کا عذر کر کے جانے کی اجازت چاہی۔ نورین کہنے لگی کہ مجھے وہ یہیں چھوڑ جائے پھر رات کو کسی وقت وہ مجھے گھر پہنچا دے گی۔ راج کرشنا نے اُس کی فرمائش مسترد کر دی۔ نورین کا چہرہ بجھ گیا اور وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آئی۔ جن جن میزوں کے درمیان سے ہم گزرے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے مگر آخری میز سے پہلے والی میز سے گزرتے وقت مجھ سے آگے نہیں بڑھا گیا۔ وہ ۳۰، ۳۵ سال کی ایک صحت مند، خوب صورت اور خوش لباس عورت تھی جو اپنی کرسی سے اُٹھ کے ہمیں وداع کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ پہلے اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کے راج کرشنا کو پرنام کیا پھر مجھے، میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اپنی جانب میری نگاہ کے ارتکاز سے اُس کی پلکیں مرتعش ہو گئیں۔ اُس نے جلدی سے اپنی ساڑی درست کی اور اُس کا بدن سمٹنے لگا مگر میری نگاہ متزلزل نہیں ہوئی۔ راج کرشنا نے بھی میرا یہ انہماک دیکھ لیا تھا۔ اُس نے آگے بڑھنے کے بجائے عورت سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اس طرح عورت راج کرشنا کی جانب متوجہ ہو گئی اور مجھے اُس کی طرف غور سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ جب نورین نے مجھے آگے کی طرف کھینچا تو مجھے اپنی بے خیالی کا احساس ہوا اور میں ندامت سے آگے بڑھ گیا۔ میرے چلتے ہی راج کرشنا نے بھی اُس عورت سے باتیں بند کر دیں اور ہمارے پاس آ گیا۔ دروازے پر ایک بار پھر میں نے گھوم کے اُسے دیکھا، وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی اُس نے نگاہیں جھکا لیں، میں بھی سٹ پٹا گیا۔ نورین نے ہمیں رخصت کرتے وقت بہت سے وعدے لیے، نہ جانے میں نے کیا کیا کہا۔ وہ واپس اندر چلی گئی اور ہم دونوں تنہا رہ گئے تو میں نے سوچا میں راج کرشنا سے اُس عورت کے بارے میں پوچھوں جو آخری میز سے پہلے والی میز پر ملی تھی۔ راج کرشنا جیسے میرے دل میں گھسا بیٹھا تھا، گاڑی کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے مجھ سے پوچھا "کیا تم اُس عورت کو جانتے ہو؟"

"نہیں" میں نے بے قرار لہجے میں جواب دیا "وہ کون ہیں؟"

"وہ ایک ستم رسیدہ عورت ہے، بہت مال دار۔ ابھی ایک سال ہوا اُس کا شوہر ایک حادثے میں مارا گیا مگر تم اُسے اس طرح کیوں گھور رہے تھے؟" اُس نے بے چینی سے پوچھا "کیا تمھیں وہ عورت اچھی لگی؟"

"نہیں" میں نے جھینپ کر کہا "ایسی بات نہیں ہے، بات کچھ اور تھی۔" میں نے ایک بار پھر اپنے گلے میں پڑی ہوئی مالا ٹٹول کے دیکھی۔ "مجھے بتانا پسند کرو گے؟"

"میں ۔ ۔ ۔ ۔ میں" میری زبان ہکلانے لگی "کیا آپ اُس عورت سے کوئی بات پوچھ سکتے ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے کہیں یہ بُری بات تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں" اس نے مسکرا کے کہا۔ "پولیس والے ہر قسم کا سوال کر لیتے ہیں۔" میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکا کہ اُسے بتاؤں یا خاموش رہوں۔ میں نے سوچا یہ ایک باریک بین آدمی ہے، بات سے بات نکال لے گا لیکن تسلی کیے بغیر میرے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی اس لیے میں نے مدھم آواز میں کہا۔ "اُس عورت کے گلے میں جو ہار ہے، میں اُس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"ہار!" وہ حیرت سے بولا "مگر.... مگر وہ کیسا ہار ہے؟"

"کیا آپ اُس سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ اُس نے کہاں سے خریدا ہے؟ بس آپ اتنی بات پوچھ لیجیے۔" میں نے اُس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا "یہ تو بہت معمولی بات ہے میں اُس سے ابھی پوچھے لیتا ہوں لیکن اگر اُس نے کوئی اور سوال کیا؟"

"کیا آپ اُسے علیحدہ کسی کمرے میں نہیں بلا سکتے؟"

"میں اُسے کہیں بھی بلا سکتا ہوں۔"

"تو بلا لیجیے۔"

"اچھا" وہ کچھ دیر ٹھیرا رہا، پھر واپس عمارت کی طرف چل پڑا میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ دروازے پر پہنچ کے وہ کچھ جھجکا اور اُس نے دربان کو

حکم دیا کہ وہ مسز رُوپ پٹیل کو باہر بھیج دے۔ ہم دروازے سے ہٹ کے کھڑے ہو گئے۔" دربان فوراً واپس آ گیا۔ اُس کے ساتھ رُوپ بھی تھی۔ اُس کا چہرہ فق تھا۔ راج کرشنا نے اُس سے اس زحمت کے لیے معافی چاہی تو اُس کا رنگ واپس آ گیا۔ "مسز رُوپ! کیا آپ مجھ سے کچھ سلوک کریں گی؟" راج کرشنا نے شرم سار لہجے میں پوچھا۔

"ضرور، آپ کہیے، میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"میرا دوست ظہیر خاں یہ جاننا چاہتا ہے کہ آپ نے یہ ہار جو آپ کے گلے کی زینت بنا ہوا ہے کس طرح حاصل کیا ہے؟ کس طرح سے مراد یہ ہے" راج کرشنا نے وضاحت کی "کہ کب اور کہاں سے حاصل کیا تھا؟ بےشک آپ جواب دینے سے انکار کر سکتی ہیں۔ یہ ایک بے حد نجی بات ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ہم نے اسے کوئی تین سال ہوئے خریدا تھا۔ یہ چار موتی اور یہ ہیرا، مجھے ان کی قیمت کا تو پتہ نہیں ہے مگر یہ ایک بہت قیمتی ہار ہے اور پٹیل صاحب نے ہماری شادی کی تیسری سال گرہ پر مجھے پہنایا تھا۔ یہ ہار میں نے ہی پسند کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے اسے خرید بھی لیا ہے، سال گرہ آئی تو میں اسے دیکھ کے دنگ رہ گئی۔"

"بہت شکریہ۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے اسے کہاں پسند کیا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔ میں نے بیشتر جواہر نانا بھائی کے ہاں سے خریدے ہیں، یہ ہار اُنھی کے ہاں سے خریدا تھا۔ وہ اسے عام نمائش کے لیے نہیں رکھتے تھے۔"

"کیا انھوں نے اس ہار کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا تھا؟"

"کچھ ایسا یاد پڑتا ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "انھوں نے کہا تھا کہ اس ہیرے کا شمار دُنیا کے چند نادر ہیروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند اسے اُن کے ہاتھ بیچ گیا ہے مگر ایسی باتیں تو تمام جوہری کرتے ہیں۔ مجھے بتائیے کہ کیا اس ہار سے کوئی انوکھی بات وابستہ ہے؟"

"ہو سکتی ہے۔" راج کرشنا نے کہا "مگر نانا بھائی سے تصدیق کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی کوئی انوکھی بات ہوئی تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

"آپ چاہیں تو یہ ہار لے جائیں، اس طرح آپ کا کام اور آسان ہو جائے گا۔ پھر میں آپ سے واپس لے لوں گی۔" رُوپ نے ہار اُتارتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ اِس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اسے آنکھوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔" راج کرشنا نے کہا۔

"کیا آپ ہار مجھے دکھائیں گی؟" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

مسز رُوپ نے ہار میرے سپرد کر دیا۔ میں نے غور سے وہ ہیرا اور موتی دیکھے اور ہار میری انگلیوں میں کانپنے لگا۔ بالکل وہی، یہ وہی موتی تھے جو میری مالا میں پروئے گئے تھے اور یہ ہیرا، میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہی جسامت، وہی نیلا رنگ، وہی چمک دمک، اسے میں نے سب سے پہلے

بدھ گیا میں اُجین کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ جب میں جھونپڑی میں داخل ہوا تھا تو اُس نے اسے مجھ سے چھپا لیا تھا، پھر یہ ہیرا کورا کی اُس پوٹلی میں بھی موجود تھا جسے وہ اُجین کی موت کے بعد بُدھ گیا سے ہمارے گھر لائی تھی۔ جب ابّا جان نے وہ پوٹلی کھول کے دیکھی تھی تو اُس میں دوسرے ہیروں کے ساتھ یہ ہیرا بھی دمک رہا تھا۔ یہ سب سے چھوٹا تھا۔ ان جواہر میں میری مالا کے چند موتی بھی تھے۔ ابّا جان نے پوٹلی فوراً بند کر لی تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد کچھ دنوں تک تو مکان کی رقم سے اُن کا گزارا ہوا ہوگا پھر زمینوں کی رقم سے، پھر ابّا جان کو یہ جواہر بیچنے کی ضرورت پڑ گئی ہوگی۔ انھوں نے یہ قدم سب سے آخر میں مجبوراً اُٹھایا ہوگا۔ شبہے کی بس یہی گنجائش تھی کہ ممکن ہے مسز رُوپ کے ہار میں، یہ ہیرا اُس سے ملتا جلتا کوئی دوسرا ہیرا ہو اور موتی بھی میرے موتیوں سے اس حد تک محض مشابہ ہوں۔ ضروری نہیں کہ دُنیا میں صرف یہی ہیرا اور موتی ہوں۔ اس شکل و صورت کے اور بھی ہو سکتے ہیں مگر یہ شہر، اس شہر میں ابّا جان کا قیام، مولوی اکرم کی زبانی سنے ہوئے اُن کے حالات، اسی شہر میں ہیرے کی فروخت، نانا بھائی کا یہ کہنا کہ اسے ایک ضرورت مند بیچ گیا ہے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنھوں نے میرے سینے میں جلن پیدا کر دی تھی۔ میں نے ہار واپس کر دیا۔ مجھ سے اُس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا جا سکا۔

"کیا آپ کی اس ہار سے کوئی وابستگی ہے؟" مسز رُوپ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "آپ نے مجھے اُلجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے وحشت سے کہا "آپ کا شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں، جب بھی آپ کو اس ہار کی ضرورت ہو بے تکلف مجھ سے مانگ لیجیے گا۔" اُس نے خندہ پیشانی سے کہا "اور کرشنا جی! آپ نے ظہیر خاں صاحب کی اتنی تعریفیں کی ہیں، کبھی انھیں ہمارے گھر لائیے۔"

"ضرور مسز رُوپ!" راج کرشنا نے یہ کہتے ہوئے میری کمر تھپکی۔ "آؤ چلیں۔"

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راج کرشنا تمام راستے خاموش رہا۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ ایک عورت ڈرائنگ رُوم میں شام سے راج کرشنا کی منتظر ہے۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے اندر گئے۔

وہاں چمپا بائی بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

مگر وہاں سفید ساڑی میں ملبوس چمپا بائی ہی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کا بھی وہی حال ہوا، جو میرا تھا۔ وہ بوکھلا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اُس نے میری طرف بڑھنا چاہا۔ میں گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا اور راج کرشنا کی اوٹ میں ہو کر پھرتی سے چاقو جیب سے نکال لیا لیکن مجھے پھلکا دکھانے کی مہلت نہیں ملی۔ چمپا جلد ہی سنبھل گئی۔ اُس نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں راج کرشنا کو سلام کیا۔ "آپ کب آئیں؟" راج کرشنا نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد بے تپاک لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"مجھے آئے ہوئے دیر ہو گئی۔" چمپا نے خفت سے جواب دیا۔

"بیٹھیے، بیٹھیے اور تو سب خیریت ہے؟"

"جی ہاں۔" اُس نے نظریں جھکا کے کہا "میں دوبارہ بمبئی آئی ہوں، آپ سے آنے کا وعدہ کیا تھا، سوچا آج اُسے نبھا دوں۔"

"بہت اچھا کیا!" وہ بولا "مگر آپ ٹھیری کہاں ہیں؟"

"ایک ہوٹل میں!" اُس نے مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل میں کیوں؟" راج کرشنا شکایتی لہجے میں بولا "یہ گھر خالی پڑا ہے، آپ سیدھی اِدھر آ جاتیں، ظہیر بھی میرے ساتھ ہی ہے، کیوں ظہیر؟"

"جی، جی ہاں۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"بس۔" وہ جھینپ کے بولی "ناحق آپ کو زحمت ہوتی، آپ مل گئے اور دو باتیں رواداری کی کر لیں، یہی بہت ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ظہیر بھی یہیں ہوں گے۔"

"تو پھر کیا آپ نہیں آتیں؟" راج کرشنا نے مسکرا کے پوچھا۔

"تو۔ تو میں شاید اور پہلے آ جاتی۔"

راج کرشنا ہنسنے لگا "آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔" وہ تردد سے بولا "ہم لوگ تو کلب میں کھا کے آئے ہیں۔" اُس نے بھکو کو آواز دی۔

"نہیں نہیں، اس تکلف کی ضرورت نہیں، میں کھانا کھا کے آئی ہوں۔" چمپا لجاجت سے بولی "بس چائے پی لوں گی۔"

"غلط، آپ کھانا کھائیں گی، پھر چائے پییں گی اور ہاں اس کے بعد پان بھی کھائیں گی، پھر آرام سے بیٹھ کے باتیں ہوں گی۔ مجھے آپ کے پان اب تک یاد ہیں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو رات کو یہاں قیام بھی کریں۔ مجھے اتنی اجازت دیجیے کہ میں لباس تبدیل کر لوں، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چمپا کا جواب سُنے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں اور چمپا اکیلے رہ گئے۔ میں نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور تیز نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔ میرے حواس خبط ہو گئے تھے، عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اُسے کس لہجے میں مخاطب کروں، وہ یہاں کیوں آئی ہے، جب وہ راج کرشنا سے بات کر رہی تھی، تو اس کے ایک ایک لفظ پر میرا دل ہول جاتا تھا۔ نہ جانے اُس کی زبان سے اب کیا نکل جائے۔ یہ میرا گھر بھی نہیں تھا کہ میں اُسے دھکے دے کے نکال دیتا۔ "تم کیسے ہو؟" اچانک اُس کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تو ٹھیک ہوں مگر تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے چیخ کر کہنا چاہا لیکن میری بلند آواز راج کرشنا کے خوف سے گھُٹ کے رہ گئی۔ "بتاؤ تم واپس کیوں آئی ہو؟"

"میں اب وہاں نہیں رہ سکتی۔"

"کیوں نہیں رہ سکتیں؟" میں نے جھنجلا کے پوچھا۔

"مجھ سے اب وہاں نہیں رہا جاتا۔ تمھاری بات مان کے میں وہاں چلی گئی تھی لیکن میں نے یہ دن کانٹوں پر کاٹے۔"

"کیوں آخر کیوں؟ تم آخر چاہتی کیا ہو؟"

"میں کچھ نہیں چاہتی۔" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی "میں جس حالت میں تمھیں چھوڑ کے گئی تھی، اُس نے مجھے چین لینے نہیں دیا۔ ان دو ہفتوں میں میں نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی، ہر گلی کوچے میں تمھیں ڈھونڈتی رہی۔ دیکھو میرے پاؤں! جب ہر طرف سے مایوس ہو گئی تو کرشنا جی سے مدد لینے کے لیے یہاں آ گئی۔"

"مگر کیوں؟" میں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟"

"کیسی معافی؟" میں نے تلملا کے کہا "کیا وہ واپس آ جائے گی۔"

"وہ تو واپس نہیں آ سکتی۔ کاش یہ میرے بس میں ہوتا لیکن جب تک تم سچے دل سے معاف نہیں کرو گے، مجھے سکون سے موت تک نہیں آئے گی، خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔" وہ رونے لگی۔

"میں نے تمھیں معاف کیا۔" میں نے تیزی سے کہا "یہ اُس کی قسمت تھی۔ اب تم اپنے گھر جاؤ اور دیکھو یہاں اپنی زبان مت کھولنا، کرشنا جی اگر تم سے میری قرابت کے بارے میں کُرید کریں تو کچھ بھی بات بنا دینا مگر کوئی اور بات زبان پر مت لانا، سمجھ گئیں؟"

"سمجھ گئی۔ تم مجھے اتنا بُرا کیوں سمجھتے ہو، مجھے تمھاری عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ تم اگر یہاں نہ ملتے تب بھی میں اُن سے کچھ نہیں کہتی۔ بہرحال اچھا ہوا تم ان کے پاس چلے آئے، خدا تمھیں اپنی امان میں رکھے۔ مجھے کچھ سکون ہوا۔ مگر تم، ...... تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں کیا سوچوں گی۔" وہ سانس بھر کے بولی "میری تو بس ایک ہی آرزو ہے کہ زندگی کے باقی دن تمھاری خدمت کرتے ہوئے گزار دوں یہی سوچ کے بمبئی آئی تھی کہ تمھیں ڈھونڈ کے، جہاں تم رہو گے، وہاں میں بھی کسی کونے میں پڑی رہوں گی، تم مجھے اپنے گھر میں اتنی جگہ تو دے دو گے کہ میں اپنا یہ سیاہ چہرہ چھپا سکوں اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہوں۔ تم مجھے ایک ملازمہ سمجھ کے قبول کر لو گے ...۔ اب اُن لوگوں میں واپس جانا نہیں چاہتی اور نہ تمھیں پریشان کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"تم یہ باتیں پہلے بھی کر چکی ہو اور میں ان کا جواب دے چکا ہوں۔ میں، میں کیا بتا سکتا ہوں، میرا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے چمپا بائی۔ تمھیں میری حالت معلوم ہے۔ میں یہاں خود کرشنا جی کے ہاں ٹھیرا ہوا ہوں۔ میری مانو تم کہیں اور کہیں اور چلی جاؤ۔ دُنیا بہت بڑی ہے۔ اگر تم نے اچھی زندگی گزارنے کا عہد کر لیا ہے تو تمھیں کوئی نہیں روکے گا۔"

"مگر مجھے ہر جگہ تمھارا خیال ستائے گا۔"

"میری بات چھوڑو۔" میری آواز بھرا گئی "میرا کوئی یقین نہیں ہے، جب تک بات چل رہی ہے، چل رہی ہے۔ پتہ نہیں کل میں کہاں ہوں، ہوں بھی یا نہیں۔"

"نہیں، تم ہو گے۔" وہ وحشت سے بولی "اور تمھارے سب بچھڑے ہوئے مل جائیں گے، تم تو اتنی جلدی مایوس ہو گئے۔"

”اتنی جلدی؟“ میں نے تلخی سے کہا: ”تمھیں کیا معلوم؟“
”ہاں مجھے کچھ نہیں معلوم لیکن اتنا تو میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری عمر کیا ہے، خدا نے تمھیں دماغ بھی دیا ہے، حوصلہ بھی، تم ایک مرد ہو۔“
”بس چمپا بائی“ میرے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ راج کرشنا لباس تبدیل کر کے واپس آ گیا۔ میں نے چپ سادھ لی۔ چمپا بھی سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ وہ ہم دونوں کو مسکرا کے دیکھنے لگا لیکن ابھی ٹھیک طرح بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے خیال آیا، بکھو نے اس کی آواز پر کان نہیں دھرے تھے۔ اس نے چمپا سے معذرت کی اور بکھو کو دیکھنے کے لیے خود ہی اٹھ کے اندر جانے لگا۔ ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی جیسے ہی وہ اوجھل ہوا، میں نے چپکے سے کہا: ”میں کل صبح تمھارے پاس آؤں گا، تم اسی ہوٹل میں ٹھیری ہوئی ہو نا؟“
”ہاں!“ اس نے مدھم آواز میں جواب دیا۔
راج کرشنا بکھو پر ناراض ہوتا ہوا فوراً ہی واپس آ گیا اور کچھ دیر کرسی پر بیٹھ کے یوں ہی کسمساتا رہا۔ وہ صرف ایک بار ریل میں سفر کے دوران چمپا سے ملا تھا لیکن ایک دن کی اس ملاقات کا نقش اتنا گہرا تھا کہ راج کرشنا اُسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت سمجھ بوجھ کا آدمی تھا اور سمجھ بوجھ کے آدمی کو بات کرتے ہوئے دیر لگتی ہے۔ چمپا نے مجھے محتاط رہنے کا یقین دلا دیا تھا مگر میرا دل مطمئن نہیں تھا، نجانے راج کرشنا کیا سوال کر بیٹھے اور چمپا سے بات بنائے نہ بنے۔ چمپا کی آمد کے بعد خود میری خاموشی اور سکون آمیز اضطراب سے راج کرشنا کا ذہن کسی طرف بھی جا سکتا تھا۔ ایک بات سے پردہ اُٹھتا تو بہت سے پردے اُٹھنے کا اندیشہ تھا، راج کرشنا پولیس افسر تھا اور افسر بھی ایسا جس کے حواس عام آدمیوں سے کئی گنا تیز تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی آنکھیں بظاہر دیوار کی سمت دیکھ رہی ہیں مگر وہ ہم دونوں کو ٹٹول رہی ہوں گی، چند لمحے سکوت رہا پھر وہ جھجکتا کے بولا ”اور سنائیے، کیسے مزاج ہیں آپ کی صحت تو ٹھیک ہے؟“
”جی“ چمپا سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔
”ظہیر کو یہاں دیکھ کے آپ کو خاصا اچنبھا ہوا ہوگا۔ یہ مجھے ملے تو میں انھیں اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ ایک آپ کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اب آپ یہیں رہیے۔ بمبئی میں میرا گھر ہو اور آپ ہوٹل میں ٹھیریں۔ یہ ایک نہایت نامناسب بات ہے، ویسے بھی یہاں کئی کمرے خالی پڑے ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میری ماں یہاں ہوتی تو مجھے بہت بُرا بھلا کہتی کہ میں آپ جیسے محسنوں کو اسٹیشن ہی سے اپنے ساتھ کیوں نہیں لایا۔ بعد میں میں آپ دونوں کو کئی دنوں تک ڈھونڈتا رہا۔“
”شرمندہ مت کیجیے، میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ چمپا اٹک اٹک کے بولی۔ ”ہاں ظہیر نے بے شک اُس وقت اپنے حواس بجا رکھے تھے، اگر آپ اسے احسان سمجھتے ہیں تو وہ ظہیر خاں نے کیا ہے۔ میں تو ایک تماشبین کی طرح سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔“

”نہیں، آپ بھی میری وجہ سے ایک نازک وقت سے دوچار ہو گئی تھیں۔ آپ نے میرے ساتھ بہت سلوک کیا۔ مجھے سب باتیں ... میں نے ظہیر خاں کو یہاں لا کے کہا تھا کہ یہ احسان کا معاوضہ نہیں ... معاوضہ ادا کیا جائے وہ احسان نہیں ہوتا۔ آپ یہاں ٹھیر کے مجھے ... کریں گی۔ ظہیر بھی اکیلا رہتا ہے۔ جب تک آپ کا جی چاہے آپ رہیے۔ کسی بات کا تکلف مت کیجیے۔“
”شکریہ۔“ چمپا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”میں آپ کو زیادہ زحمت دوں گی، ہوٹل میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔“
”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کل صبح میں ڈرائیور سے کہہ دوں گا وہ ... کا سامان لے آئے گا۔“ راج کرشنا نے افسرانہ انداز میں فیصلہ سنا دیا ... سُنتا اور دیکھتا رہ گیا۔ چمپا بہت جز بز ہوئی۔ دونوں نے میری طرف ... درمیان میں دخل دینے والا کون تھا۔ یہ راج کرشنا کا گھر تھا، وہ اپنے ... کسی کو بھی مہمان رکھے۔ میں نے نگاہیں چرا لیں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہ ... کون ہے، تم ایک پولیس افسر ہو، پہلے ہی تمھارے گھر میں ایک مشتبہ ... ہے۔ اب دوسرے کو دعوت دے رہے ہو۔ اپنے عہدے کا خیال ... بات کھلی تو لوگ کیا کہیں گے۔ ویسے ہی لوگ تمھارے دشمن ہیں۔ ہر جگہ ... پھریں گے کہ راج کرشنا جیسے مشہور پولیس افسر کے ہاں فیض آباد کی ... طوائف چمپا بائی ٹھیری ہوئی ہے اور ایک نوجوان جس نے قتل کے ... سات سال جیل میں گزارے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ راج کرشنا کی ... میں نگاہیں چمپا کے چہرے، اس کی باتوں اور انداز و اطوار کا جائزہ ... نہیں لے رہی ہیں۔ گو چمپا کے چہرے اور لہجے میں بہت سادگی تھی ... بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ ایک طوائف ہو گی مگر وہ تو راج کرشنا ... سڑک پر چلتا ہوا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اسے جاننا چاہیے تھا کہ ایک عو... یکہ و تنہا ہوٹل میں ٹھیری ہوئی ہے۔ وہ رات کو اس وقت یہاں موجو... کوئی عورت کس وجہ سے بار بار اس شہر کا رُخ کرتی ہے اور ہوٹل میں ... ہے۔ راج کرشنا کو یہ بھی محسوس کرنا چاہیے تھا کہ میں نے اس کے ... چمپا سے کوئی بات نہیں کی ہے اور نہ اس کی طرح میرے چہرے ... چھایا ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو اس نے چمپا کے بارے میں پوچھا تھا ... کہاں چلی گئی، میں نے سرسری طور پر اس کا ذکر کیا تھا کہ بس وہ چلی گئی ... کرشنا کو اگر میرا خیال تھا تو یہ باتیں محسوس کرنی چاہیے تھیں۔ شاید وہ ... دوران ہمارے بارے میں اپنے لگائے ہوئے اندازوں پر پشیماں تھا اور ... ہمارے متعلق کوئی غلط بات سوچنے کے لیے اس کا ذہن آمادہ نہیں ... ہوگا، چمپا کی آمد پر میری خاموشی اور گھبراہٹ؟ اس نے میری کسر نفسی ... محمول کی ہو گی مگر میرے پاس خاموش رہنے کے سوا چارہ بھی کیا تھا ... اچانک یہاں دیکھ کے جھوٹ موٹ کی خوشی کا اظہار مجھ سے کبھی نہ ... جاتا اور نہ میں ناراضی کا اظہار ہی کر سکتا تھا کہ چمپا کی برہمی کا اندیشہ بھی ...

... بکھو نے کھانا میز پر لگا دیا تھا۔ چمپا کی وجہ سے ہم دونوں بھی اُس ... ساتھ بیٹھ گئے۔ چمپا چند ہی لقمے منہ میں ڈال سکی۔ اس اثنا میں راج کرشنا ... میں ملا کرنے والے آدمی اور اُس کے گروہ کے متعلق دلچسپ باتیں سُناتا ... چمپا گردن جھکائے سنتی رہی۔ کھانے کے بعد راج کرشنا نے اُسے آرام ... مشورہ دیا۔ وقت بھی کافی ہو چکا تھا، وہ واپس جانے کی درخواست کرتی رہی ... راج کرشنا نے اُس کی ایک نہ سُنی کمرہ کھلوا کے صاف کرا یا اور جب ... چمپا اپنے کمرے میں داخل نہیں ہو گئی، وہ اپنے کمرے میں نہیں گیا۔
میں خاموشی سے اپنے بستر پر چلا آیا۔ اس وقت تو اور باتوں میں وقت ... گیا مگر کل صبح کل دو پہر کل شام، چمپا نہ جانے کب تک ٹھیری رہے۔ اس ... بستر اور کون سا گوشہ اُسے میسر آئے گا۔ میں اپنے بستر پر لوٹتا رہا۔ ٹھیک ... چمپا یہاں رہے اور راج کرشنا اپنی محسنہ کی خاطر داری کرتا رہے۔ میں ... پہلے ہی کہاں رُک رہا تھا، میں کہیں اور نکل جاؤں گا۔ جب تک چمپا سامنے ... رہے گی مجھے نجمی کی یاد آتی رہے گی، اور میں خود یہاں کب تک رہوں گا۔ کلب ... مسز روپ کے گلے میں پڑا ہوا ہار دیکھ کے میرے دل کو قرار نہیں تھا ... ثابت ہو گئی تھی: نانا بھائی جوہری کی دُکان بند ہو گئی ہو گی اور اُس کے ... کا پتہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ ورنہ میں کلب سے سیدھا اُس کی طرف جاتا اور ... سے التجا کرتا، تجھے تیری اولاد، اپنے خدا کی قسم، مجھے صحیح صحیح بتا دے کہ یہ ... تُو نے کہاں سے حاصل کیا تھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ ... ہیرا تھا جو کہ اپنے ساتھ ہمارے گھر لائی تھی۔ اور موتی، میں نے خود اُنھیں ... ہی کے دیکھا تھا۔ وہی موتی تھے جو میری مالا میں پروئے ہوئے تھے۔ انھیں ... ہی موتیوں سے ایک مالا بنا کے مجھے دی تھی یہ لیتے ہیں، مجھے خیال بھی ... تھا کہ راج کرشنا سے اسی وقت نانا بھائی کے ہاں چلنے کی استدعا ... مجھے شاید وہ آسانی سے اُس شخص کا نام نہ بتاتا جس سے اُس نے یہ ہیرا خریدا ... ایسی قیمتی چیزوں کی خرید و فروخت میں تو بڑی رازداری برتی جاتی ... حالات کا نتیجہ لیں بھی مشکل تھی کہ چمپا بائی آ گئی۔
میں صبح جلد ہی اُٹھ کے باہر آ گیا مگر چمپا بائی اور راج کرشنا مجھ ... پہلے بیدار ہو چکے تھے۔ ناشتے کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ... زیادہ تر اخبار بینی میں ڈوبا رہا اور چمپا گھر میں اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ ... میں لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آیا تو راج کرشنا بھی باہر جانے ... لیے تیار کھڑا تھا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔“ میں نے اسے ... دینی مناسب سمجھی۔
اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا: ”میں بھی تمھارے ساتھ ... رہا ہوں۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ جیسے اُسے شبہ ہو گیا ہو کہ اب میں ... نہیں آؤں گا۔ میں نے نہ انکار کیا، نہ اقرار۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ... باہر کرنے لگا، چمپا کیاری سے پھول توڑ رہی تھی۔ اُس نے گلاب کا ... ایک ایک پھول مجھے اور راج کرشنا کو پیش کیا۔ راج کرشنا نے اُسے کوٹ میں لگا کے چمپا کا شکریہ ادا کیا: ”آج دوپہر تو آپ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلائیں گی۔ یہاں گوشت وغیرہ سے پرہیز نہیں کیا جاتا۔ آپ جو بھی تیار کریں گی، بڑے شوق سے کھاؤں گا۔ میں نے ڈرائیور کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ ہوٹل سے آپ کا سامان لے آئے۔“
چمپا نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر راج کرشنا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم ایک معروف بازار سے گزر رہے تھے۔ راج کرشنا اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ ایک جگہ اُس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ سامنے نانا بھائی جوہری کی شاندار دُکان تھی، میرا سر چکرا گیا۔ نہ معلوم نانا بھائی ابا جان کے بارے میں کیا بتائے؟ شاید اُسے اُن کا پتہ بھی معلوم ہو۔ اگر یہ سب باتیں راج کرشنا کے سامنے ہوئیں تو میں اُس سے کیا کہوں گا۔ گاڑی سے اُتر کے میرے لیے اپنے پیروں پر چلنا دوبھر ہو رہا تھا مگر راج کرشنا مجھے گھسیٹتا ہوا دُکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دُکان کے ایک باادب ملازم نے ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ کمرے میں دو اطراف شیشے لگے ہوئے تھے اور ایک تن درست گول مٹول زرد رنگت کا شخص اونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہو گی۔ میرے جسم میں خون تھم گیا تھا۔ نانا بھائی نے متانت سے ہمارا استقبال کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا کہ وہ ہماری کیا خدمت انجام دے سکتا ہے۔
”آپ کو ایک تکلیف دینی ہے۔“ راج کرشنا نے جھجک کے کہا۔
”ضرور، حکم؟“ وہ آنکھیں جھپکا کے بولا۔
”آپ کا وقت تو ضائع ہوگا لیکن کچھ ایسا ہی ضروری کام ہے۔“ راج کرشنا نے آدھی انگریزی اور آدھی شکستہ اُردو میں شائستگی سے کہا: ”آپ مسٹر پٹیل سے تو خوب واقف ہوں گے۔ وہی پٹیل صاحب جن کا ایک حادثے میں گزشتہ سال انتقال ہو گیا تھا۔“
”ہاں ہاں۔“ وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ”وہ بہت مہربان آدمی تھے۔ میرے اچھے دوستوں میں تھے، بہت خوش ذوق لیکن آپ.... آپ....“
راج کرشنا نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ ”اُن کی بیوہ مسز روپ پٹیل کے پاس ایک نادر ہار ہے۔ وہ ہار اُن جہانی پٹیل صاحب نے آپ کے ہاں سے خریدا تھا۔ شاید آپ کو یاد ہو، ضرور یاد ہوگا کیونکہ اُس میں ایک منفرد قسم کا ہیرا اور چار بیش قیمت موتی جڑے ہوئے تھے۔ ہیرا جسامت میں چھوٹا اور نیلے رنگ کا تھا۔“ نانا بھائی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ”مسز روپ پٹیل نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ نے وہ ہار سپرد کرتے وقت اُن سے اُس کے ہیرے کی بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے چند نادر ہیروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند اسے آپ کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ کہیے آپ کو کچھ یاد آیا؟“ نانا بھائی نے متجسس انداز میں گردن ہلائی۔ راج کرشنا نے تیزی سے کہا: ”وہ ایسا ہیرا نہیں تھا جسے آپ کی جوہر شناس نگاہ بھول سکے۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے وہ ہیرا کس ضرورت مند

سے خریدا تھا؟ وہ کون صاحب تھے اور اُن کا پتہ کیا ہے؟"
نانا بھائی نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا، اُس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا، میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ "جناب!" اُس نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ "مسٹر روپ پٹیل نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہ سب سچ ہے۔ بلاشبہ وہ ایک نادر ہیرا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو فروخت کرنے والے کا نام نہیں بتا سکتا۔"
"دو باتیں ہو سکتی ہیں، یا تو آپ بتانا نہیں چاہتے، یا آپ بھول گئے ہیں۔ ہماری یہ درخواست بے جا ضرور ہے مگر معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ براہِ کرم ہماری مدد کیجیے۔ ہم بڑی اُمید سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ آپ کی نیک نامی اور ساکھ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔"
"مگر جناب! یہ بات میرے کاروباری اصول کے خلاف ہے دونوں میں سے کوئی بھی ایک بات سمجھ لیجیے۔ معاف کیجیے، کوئی اور خدمت ہو تو بتائیے۔"
وہ رُکھائی سے بولا۔
"نانا بھائی! ہم مسٹر روپ پٹیل کی سفارش بھی لا سکتے ہیں، آپ چاہیں تو اُنھیں فون کر لیجیے۔" راج کرشنا نے نرمی سے کہا۔ "میری مُراد ہے کہ آپ ہم پر ہر طرح کا اعتماد کر سکتے ہیں۔"
"سفارش اور اعتماد کی بات نہیں ہے جناب! اصول اپنی جگہ ہے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے وہ ہیرا اور موتی خریدے ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں۔ آپ نے خود فرمایا ہے کہ اسے مسٹر پٹیل نے تین سال پہلے مجھ سے خریدا تھا۔ یہاں نہ جانے کتنے ہیرے روز آتے ہیں۔ آپ ذرا سوچیے، کون یاد رکھ سکتا ہے۔"
"وہ ہیرا ایسا نہیں تھا جس کے فروخت کرنے والے کا چہرہ آپ کے ذہن میں محفوظ نہ ہو۔ ایسے سودوں میں ہر طرح کی احتیاط کرنی پڑتی ہے آپ نے اپنی تسلی کے لیے ہر احتیاط کی ہوگی۔ رسید دی ہوگی، اشٹامپ لکھا ہوگا۔ اُس شخص کا نام پتہ آپ کے ریکارڈ میں ضرور موجود ہوگا۔"
"فرض کیجیے، یہ سب محفوظ ہے بھی تو میں بتانے پر آمادہ نہیں ہوں۔"
وہ کبیدہ ہو کے بولا۔ "آپ مجھے مجبور مت کیجیے۔"
"دیکھیے آخر آپ نے قبول کر لیا کہ اُس شخص کا نام آپ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔" راج کرشنا نے اُسے چمکیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم آپ سے یہ کہیں کہ وہ ہیرا چوری کیا گیا تھا تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟"
اُس کے لہجے میں نمایاں طور پر سختی آگئی۔
"میرا جواب آپ کو معلوم ہے لیکن میں ہر شخص کے سامنے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" نانا بھائی بیزاری سے بولا۔ "میرا وقت خاصا قیمتی ہے۔ ابھی صبح ہوئی ہے۔"
راج کرشنا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ اُس کے سامنے پیش کر دیا۔ "یقیناً آپ کو اب کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟ آپ نے اعتراف کر لیا ہے کہ اس ہیرے کی خرید کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا گیا تھا۔"
نانا بھائی نے کارڈ اُٹھا کے اُس پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور چند ثانیوں میں اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ اچانک جھک کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے تیزی سے فرش پر اُتر کے راج کرشنا کے ہاتھ لیے۔ "آپ نے کمال کر دیا۔ آپ پہلے ہی بتا دیتے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔"
اُس کا لہجہ اور طور طریق یکسر بدل گیا۔ اُس نے ملازم کو آواز دے کے کافی کے لیے کہا۔ "حد ہو گئی جناب! اب بتائیے۔ بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے سامنے آپ بیٹھے ہیں۔ دیکھیے نا۔ یہ سودے بڑی راز داری کے ہوتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔" وہ بار بار معذرت کرنے لگا۔ "کل اور آج کے اخبار آپ کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ صبح صبح آپ کے دیدار ہو جائیں گے۔ میں نے توجہ ہی نہیں دی حالانکہ کل آج دونوں دنوں کے اخبارات میں آپ کے فوٹو چھپے ہیں۔ کاش آپ پہلے بتا دیتے۔"
"ہر جگہ یہ حوالہ دیتے ہوئے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا، ہمارے چہرے بھروسے کے قابل ضرور ہیں۔ یہ کارڈ میں مجبوراً استعمال کرتا ہوں۔"
"پتھروں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں بھی پتھر ہو گئی ہیں۔"
"پھر تو اور قیمتی ہو گئی ہوں گی۔" راج کرشنا مسکرانے لگا۔
"آپ اشارہ کر دیتے۔" وہ پشیمانی سے بولا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس کی تلافی کس صورت میں ہو سکتی ہے؟ مجھے آپ کا وقت ضائع کرنے کا افسوس ہے۔"
"تلافی کیا۔" راج کرشنا نے بے پروائی سے کہا۔ "اب آپ اپنی یاد داشت پر زور دے کے ہمیں اُس شخص کے بارے میں بتا دیجیے جس کے لیے ہم نے آپ کو زحمت دی ہے۔"
"زحمت کیسی جناب! میں بتاتا ہوں۔" نانا بھائی نے ندامت سے اپنی پیشانی پکڑ لی۔ "میں نے وہ ہیرا اور موتی ایک نہایت معزز شخص سے خریدے تھے۔" میرے کانوں میں جلن ہونے لگی۔ میں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ "وہ ایک مسلمان تھے۔ مجھے تو کوئی جاگیر دار اور نواب معلوم ہوتے تھے۔ اُن پر بُرا وقت آ گیا تھا۔ ایسے لوگوں کو ہماری ضرورت پڑتی ہی ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے بھی چند موتی اور ایک ہیرا میرے پاس فروخت کیا تھا۔ وہ ہیرا اتنا زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ انھوں نے مجھ سے رازداری کا عہد لیا تھا۔ اگر آپ کے بجائے کوئی اور یہ سوال کرتا تو میں جواب دیتا، زندگی بھر اپنا عہد نبھاتا۔ وہ اِدھر کئی برسوں سے مجھے نظر نہیں آئے۔ بمبئی میں ہوتے تو ضرور آتے۔ میں انھیں اپنے پاس دیر تک بٹھاتا تھا کیونکہ وہ مجھے اچھے آدمی نظر آتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں یہ ہیرا کسی صاحبِ ذوق ہی کو فروخت کروں۔ میں نے مسٹر پٹیل کو منتخب کیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس سودے میں کوئی بہت بڑا منافع نہیں ہوا تھا۔"

"اُن کا نام؟" نانا بھائی سوچتے ہوئے بولا۔ "دلاور خان تھا شاید۔"
"شاید نہیں سوچ کے بتائیے۔"
"جی ہاں کچھ یہی نام تھا۔" وہ جھجک کے بولا۔
راج کرشنا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے پہلی بار درمیان میں [illegible] "اُن کی عمر کیا ہوگی؟ وہ کس حُلیے کے آدمی تھے؟" میں نے اضطراب [illegible] پوچھا۔ میری آواز کپکپا رہی تھی۔
نانا بھائی کے چہرے پر کشمکش کے آثار ہویدا ہوئے۔ "اُن کی [illegible] پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ قد اوسط درجے کا تھا، رنگ کھلتا ہوا تھا، [illegible] نمایاں تھیں۔ بہت چھوٹی سی داڑھی تھی۔ بہت باوقار چہرہ تھا۔ [illegible] شیروانی میں آتے تھے، صاف ستھرے لباس میں، لیکن وہ کچھ اُلجھے [illegible] رہتے تھے۔"
وہ اَبا جان ہی کا حلیہ بیان کر رہا تھا۔ اَبا جان نے اپنا صحیح نام [illegible] بتایا ہوگا اور پھر پتہ بھی غلط لکھوایا ہوگا۔
راج کرشنا مجھے تک رہا تھا۔ میں نے دوسرا سوال نہیں کیا۔ وہ [illegible] لہجے میں نانا بھائی سے مخاطب ہوا۔ "کیا آپ مجھے ریکارڈ دکھا [illegible] ہیں؟"
نانا بھائی نے خندہ پیشانی سے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی پُشت [illegible] دیوار میں نصب الماری کھول کے فائلیں ٹٹولنے لگا۔ اُس نے چند [illegible] کی چھان بین کے بعد کاغذ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ راج کرشنا نے [illegible] نوٹ کر لیا۔ دستخط دلاور خان کے تھے مگر تحریر اَبا جان کی تھی، وہی شکستہ تحریر۔
"شکریہ۔" راج کرشنا نے اُسے کاغذ واپس کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ [illegible] اس پتے کی تصدیق کی تھی؟"
"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مجھے اُن کی بات پر اعتماد تھا۔ [illegible] کی توہین ہوتی کہ میں اُن کے پتے کی تصدیق کرتا۔"
نانا بھائی نے کافی پلائے بغیر ہمیں اپنی دکان سے نہیں جانے دیا۔ [illegible] نے چند گھونٹ لے کے کافی یوں ہی چھوڑ دی۔ نانا بھائی ہمیں گاڑی [illegible] رخصت کرنے آیا اور چلتے چلتے اُس نے اپنے رویے کی کئی بار معافی [illegible] راج کرشنا نے ڈرائیور کو نانا بھائی سے حاصل کیے ہوئے پتے [illegible] کی ہدایت کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنا وقت خراب کر رہا ہے۔ نام [illegible] اَبا جان نے پتہ بھی غلط لکھوایا ہوگا مگر میں نے اُسے منع نہیں کیا۔ [illegible] دیر بعد ہم اُس چار منزلہ عمارت میں داخل ہو رہے تھے جس کا نام [illegible] اپنے پتے میں لکھوایا تھا۔ وہاں بھی وہی نتیجہ نکلا، اس نام کے [illegible] سے کوئی واقف ہی نہیں تھا، راج کرشنا نے حلیہ بیان کیا مگر [illegible] کے پتے والے فلیٹ نمبر میں دس سال سے ایک ہی خاندان رہ [illegible] راج کرشنا مایوس قدموں سے لوٹ آیا۔ مجھے کوئی خاص دُکھ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ کھوئے ہوئے لوگ اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔ اَبا جان نے فہمیدہ کے غائب ہو جانے کے کچھ دنوں بعد ہی بمبئی شہر چھوڑ دیا تھا۔ نانا بھائی کی باتوں سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی تھی وہ عرصے سے اُس کے پاس نہیں آئے تھے۔ اگر بمبئی میں ہوتے تو ضرورت کے وقت کسی اور جوہری کے پاس نہ جاتے۔ اب کسی اور شہر میں کسی نئے جوہری سے دوستی کر لی ہوگی مگر پوٹلی کب تک چلائیں گے۔ پوٹلی خالی ہو جائے گی تو کیا کریں گے، شاید پھر بھیک مانگیں گے۔ ایک لڑکی کو بالا خانے پر بھیج دیا تھا مگر ابھی چار اور باقی ہیں۔ دو بیٹے بھی ہیں۔ جیب تراشی اور نقب زنی کے فن میں ماہر ہو گئے ہوں گے۔ نہ باپ کو اُس کا خزانہ ملے گا، نہ بیٹے کو اس کا۔ دونوں خزانے کی تلاش میں تھے۔ ایک زر و جواہر کے خزانے کی، دوسرا ایک لڑکی کے خزانے کی۔ وہ کاغذات کی سیاہ لکیروں اور لفظوں میں اپنی قسمت ڈھونڈ رہے تھے ادھر بیٹا اندھی گلیوں اور بازاروں کے چکر کاٹ رہا تھا۔
سب بے کار ہے وہ خزانہ ہی کیا، جو آسانی سے مل جائے موٹر سڑکوں پر بھاگ رہی تھی۔ میں شیشے کے پار لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ راج کرشنا کسی سوچ میں گم تھا۔ اَبا جان اگر صحیح نام اور پتہ لکھوا دیتے تب بھی ملتے نہیں مگر وہی بات ہوتی جس کا چمپا کے آنے کے بعد مجھے خوف لاحق ہو گیا تھا۔ راج کرشنا مولوی اکرم کے پاس جاتا اور مولوی اکرم ساری کہانی بتا دیتے۔ موٹر دادر کے اُس ہوٹل کے سامنے ٹھہر گئی۔ جہاں میں اور چمپا ٹھہرے تھے۔ پھر ڈرائیور گیا اور ناکام واپس آ گیا۔ ہوٹل والوں نے اُسے چمپا کا سامان نہیں دیا۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ کہیں راج کرشنا خود نہ اندر چلا جائے۔ ہوٹل والوں کو معلوم ہوگا کہ چمپا کس قماش کی عورت ہے۔ ہوٹل کے کئی بیرے بھی اُسے جانتے تھے۔ راج کرشنا کی زبانی چمپا بائی کا نام سُن کے وہ مسکرائیں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ راج کرشنا صاحب اُس کا سامان ہوٹل سے لے گئے تھے۔ میں نے سوچا، میں اُتر کے جاؤں کیونکہ ہوٹل والے مجھے جانتے ہیں لیکن اگر انھوں نے منع کر دیا تو؟ کسی کو کسی کا سامان سپرد کر دینا ہوٹل کے اصول کے خلاف تھا۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ راج کرشنا ایک دم موٹر سے اُتر کے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اُسے واپس ہونے میں چند ہی منٹ لگے۔ معلوم نہیں ہوٹل والوں نے اُس سے کیا کیا کہا سُنا اور کن نظروں سے دیکھا۔ میں نے اُس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ گھر سے قریب وہ اپنی نشست سے کھسک کے میرے نزدیک آ گیا اور میرا ہاتھ دباتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے۔" میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا کہ وہ کس بات کا افسوس کر رہا ہے۔ "گھبرانے کی بات نہیں۔" اُس نے مضبوط آواز میں کہا۔ "ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اِسی ہمت کا ثبوت دیتے رہو۔"
میں اُس کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے میری گردن سہلانی شروع کر دی۔ گھر آ گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں چمپا موجود تھی۔ راج کرشنا چند قدم چلا اور ٹھٹھک

کے رُک گیا۔ "ظہیر! ہم کسی دوسرے گھر میں تو نہیں آ گئے؟" وہ ہنس کے بولا۔ چمپا نے اتنی سی دیر میں گھر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ ہر چیز ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ کرسیوں، صوفوں کے غلاف اور کھڑکیوں کے پردے بدلے ہوئے تھے۔ راج کرشنا نے ممنونیت کا اظہار کیا تو چمپا دہری ہو گئی اور نظریں نیچی کر کے بدحواسی سے کہنے لگی "ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی کئی لوگ آپ کو پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔"

راج کرشنا کا منہ بن گیا۔ جھنجلاہٹ سے اُس نے فون اُٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ فون پر وہ انگریزی میں کسی سے مخاطب تھا۔ اُسے آج دفتر جانا چاہیے تھا۔ یہ متانہ، اُس کے ساتھیوں اور اُس کے سرپرستوں، بائی کلا کی کئی معزز شخصیتوں کی گرفتاری کا تیسرا دن تھا اور وہ چمپا کا شکریہ ادا کرنے اور میرا حال درست کرنے کی اُلجھن میں پڑا ہوا تھا۔ فون پر اُس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ اور گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں اور شہر کے دوسرے علاقوں میں حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں۔ راج کرشنا کے چہرے پر تشویش کی لکیریں بڑھتی گئیں اور اچانک اُس کی آواز بلند ہو گئی۔ وہ ہاتھ ملنے اور زانو پر گھونسے مارنے لگا۔ "میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔" اُس نے طیش میں کہا۔ "اس کے بجائے میں استعفا دینا زیادہ پسند کروں گا۔ تو پھر مجھے یہاں بلایا کیوں گیا ہے؟ نہیں۔ ایک بھی آدمی نہیں چھوڑا جائے گا۔ متانہ کے آدمیوں کو روم نمبر ۲ میں لے جاؤ اور جلد از جلد کارروائی مکمل کر کے انھیں عدالت میں پیش کر دو۔" کسی نے کچھ کہا ہو گا۔ راج کرشنا کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا اور اس نے چیخ کر انکار کیا پھر فون بند کر کے اُس نے فوراً دوسرا نمبر ملایا اور مخاطب کو ہدایت کی کہ وہ ملزموں کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اُس سے ضرور رابطہ قائم کرے ورنہ وہ سیٹھ سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اُس نے مختلف جگہوں پر یکے بعد دیگرے کئی فون کیے اور وہ بہت تھکا تھکا نظر آنے لگا۔ فون رکھنے کے بعد وہ کئی لمحوں تک سر جھکائے گم سُم بیٹھا رہا۔ "مجھے جانا ہو گا۔" اُس نے بے قرار ہو کے خود سے سرگوشی کی۔ پھر شاید اُسے احساس ہوا کہ کمرے میں وہ تنہا نہیں ہے، ہم دونوں بھی موجود ہیں، اُس نے اضطراری حالت میں ہمیں دیکھا اور اپنے چہرے کا کھنچاؤ دُور کرنے کی کوشش کی۔ "تم نے سُنا ظہیر!" وہ میرے پاس آ کر مسکرا کے بولا۔ "کیا دلچسپ بات ہے پولیس پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اُن معززین کو آزاد کر دے جنھیں برسوں ناجائز کرنسی اور منشیات کے ذخیرے وغیرہ کے سنگین جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ کبھی کبھی تو بادشاہ بننے کو جی چاہتا ہے۔ اگر دباؤ کا یہی سلسلہ جاری رہا تو پولیس کا محکمہ کسی دن عملاً ختم ہو جائے گا یا کوئی دوسری حیثیت اختیار کر لے گا، بالکل اُلٹ کام کرے گا۔ اسے جرائم کی ڈھال اور پردے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

وہ کپڑے بدل کے باہر جانے کے لیے تیار تھا کہ چمپا نے دھیمے لہجے میں اُس سے پوچھا "کیا کھانا یہاں نہ کھائیے گا؟" راج کرشنا نے ارادہ ملتوی کر دیا اور مجھے ہدایت کی کہ کوئی فون آئے تو اب کے میں ریسیور اُٹھاؤں اور صاف منع کر دوں کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ کھانے کے دوران میں اُس کی طبیعت کچھ خوش گوار ہو گئی۔ کھانا بھی بہت خوش ذائقہ تھا۔ چمپا نے اُس کی فرمائش کے مطابق نہایت لذیذ پکوان بنائے تھے۔ "بس مرچیں کسی قدر زیادہ ہیں" وہ سُوں سُوں کرتے ہوئے بولا۔

"آیندہ خیال رکھوں گی۔" چمپا نے محتاط لہجے میں کہا۔

"نہیں، اب کھانا پکانے کی تکلیف آپ نہیں کریں گی۔ باورچی کس لیے ہے، آپ تو آرام کیجیے اور شہر کی سیر کیجیے۔ جس چیز کی ضرورت ہو نوکر سے کہہ دیجیے۔"

"عورت گھر میں موجود ہو اور کھانا باورچی پکائے۔ یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں اِس طرح مصروف بھی رہوں گی۔ کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟"

"ارے نہیں۔" جلدی کی بنا پر نوالہ راج کرشنا کے منہ میں اٹک گیا۔ "بہت زیادہ آیا۔ میں گزشتہ برسوں میں زیادہ تر سفر میں رہا ہوں، گھر کا کھانا کھاتے ہوئے منہ ترس جاتا ہے۔ کھانا باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا ہو یا ہوٹل کا، برابر ہوتا ہے۔ عورت کے ہاتھ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اِس سوچیے اگر آپ نے اِس لذیذ کھانے کا، جو آج آپ نے تیار کیا ہے، ذکر بنا دیا تو پھر کہیں مزہ نہیں آئے گا۔"

چمپا کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں سے جلدی لوٹنے والی ہے اور اب تو اُس کا سامان بھی آ گیا تھا۔ اُس نے پورے گھر کا جائزہ لے انتظامات درست کرنے شروع کر دیے تھے۔ نوکروں کو حکم دے رہی تھی۔ نوکر اُس کے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ راج کرشنا کھانے کے بعد دفتر چلا گیا تھا اور چمپا گھریلو کاموں میں اس طرح مصروف ہو گئی تھی جیسے یہ اُس چمپا کا گھر ہو۔ میں اپنے کمرے میں جا کے چھپ گیا۔ وہ شام کے وقت چائے کی کشتی لے کے کمرے میں آ گئی۔ اُس کے ساتھ زیادہ ضد بحث مناسب نہیں تھی۔ میں نے چپ چاپ چائے پی لی اور منہ پھیر کے لیٹ گیا۔ "کیا طبیعت خراب ہے؟" اُس کا ہاتھ میری کلائی ٹٹولنے لگا۔ میں نے اُس کا ہاتھ لوٹ کے اُس کے منہ پر مارنے کا ارادہ کیا مگر میرا ہاتھ من بھر کا ہو گیا۔

"بس میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کسمسا کے کہا۔

وہ چپ ہو گئی، پھر کچھ وقفے کے بعد بولی "رات تم کہہ رہے تھے کہ میں کل ہوٹل آؤں گا۔ کیا بات کرنا چاہتے تھے؟"

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"مجھے احساس تھا کہ تم بہت خفا ہو گے مگر مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں کیا؟"

"ہاں زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے ہو لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، میرے کان سن رہے ہیں۔ یقین کرو میں چلی جاؤں گی مگر چند دن مجھے اپنے پاس رہنے دو۔"

"میں نے کب منع کیا ہے۔ میں منع کرنے والا ہوتا کون ہوں۔ میرے لیے تم سب کچھ ہو چاہے میں تمھارے لیے کچھ بھی نہیں۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں، تمھیں اپنی مری ہوئی بہن کی قسم۔ تم...."

میں چپ رہ کے اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "خدارا، اب تو اُسے بھول جاؤ۔ بار بار اُس کا ذکر کر کے کیوں مجھے تنگ کرتی ہو۔ میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"میں ہر بات سُننے کے لیے تیار ہوں، جو دل چاہے کہو، مجھے گالیاں دو، بیٹو، میری آنکھیں پھوڑ دو، مجھ پر چھرے چلاؤ مگر میری ایک بات لو، دیکھو یہاں سے میری وجہ سے مت جانا اور ہو سکے تو کبھی مت ... کرشنا جی تمھارا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"لحاظ و مروت کا پتہ اُس وقت چلے گا جب انھیں معلوم ہو گا میں کس بہن کا بھائی ہوں۔ بی بی جی! مجھے مشورے مت دو۔"

"یہ مشورہ نہیں ہے، التجا ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔ "اور کرشنا ... بھوئی آنکھوں اور کچے کانوں کے نہیں ہیں ورنہ پھر خیال رکھنا کیسے ... تے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں لیکن تمھیں اچانک یہاں دیکھ کے ... سب کچھ بھول گئی۔ جیسے جیسے یاد آتی رہیں گی کہتی رہوں گی اگر تم نے کچھ ... کا موقع دیا۔" اُس کی آواز بہت کمزور تھی، اندھی اور لولی آواز۔ میں ... مضطرب ہو گیا۔ وہ مجھ سے اور کیا بات کرنے والی تھی؟ وہ کیا باتیں ہو ... ہیں؟ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ... مجھے اختلاج سا ہونے لگا، جی چاہا کہ اُس کے ساتھ مل کے میں بھی ... اُس کے مرنے سے نقصان تو اُس کا بھی ہوا تھا۔ اُس نے تو فہمیدہ کو ... دام دے کے خریدا تھا، میں نے تو اُس کا کوئی بھی حق ادا نہیں کیا تھا ... اُس سے خدمت لیتا تھا، اُس پر غصّے ہوتا تھا۔ مجھے اپنے رویّے پر ندامت ... نے لگی۔

"تم کیا باتیں کرنا چاہتی تھیں؟" میں نے خفیف لہجے میں پوچھا۔ اُس نے ... سے میری طرف دیکھا اور اُس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ... "پیارے میاں! یقین کرو میرا وہاں دل نہیں لگا۔ تمھارا چہرہ ہر وقت ... کے سامنے رہتا تھا اور وہاں یاد آیا۔" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بولی ... جانے کے تیسرے دن موتیا کے پاس فیض آباد کا استاد جامو آیا تھا۔"

"جامو؟" میں اچھل کے بیٹھ گیا۔

"اُس کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ انھوں نے بالا خانے پر بڑا ہنگامہ کیا ... کو بہت مارا۔ موتیا کو بھی یہی معلوم تھا کہ میں تمھارے ساتھ میسور گئی ہوں ... نے صحیح بتا دیا تھا کہ تم بالا خانے آئے تھے اور مجھے ساتھ لے کے میسور ... گئے ہو مگر اُسے یہی معلوم تھا۔ جامو نے موتیا سے میسور کا پتہ پوچھا مگر اُسے کچھ معلوم ہوتا ... بھی۔ سو انھوں نے اُسے مارتے رہے۔ آگرے کے آدمیوں نے بھی اُن کا ساتھ دیا اور اس طرح بالا خانہ بند ہو گیا۔ پھر میں پہنچی تو وہ آگرے ہی میں تھے اور شاید علاقے کے آدمیوں سے موتیا کی باتوں کی تصدیق کرتے پھر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی بہت مارا۔ میں نے سچ بتا دیا کہ میں تمھارے ساتھ میسور کے بجائے بمبئی گئی تھی۔ بمبئی میں تمھارے گھر والے اپنی لڑکی غائب ہو جانے کے بعد بدنامی کے ڈر سے چپ چاپ کہیں نکل گئے۔ تم نے مجھے آگرے واپس کر دیا اور خود نہ جانے کس طرف چلے گئے۔"

"کیا.... کیا تم نے سب کچھ بتا دیا؟ یہ بھی کہ اب میں بمبئی میں ہوں گا۔ تم نے کرشنا جی کے بارے میں بھی بتا دیا ہو گا؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"نہیں، میں نے انھیں کرشنا جی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اُن کا ذکر میں کس طرح کر سکتی تھی۔ میں جو سچ بتا سکتی تھی، وہ بتا دیا۔ میں نے کہا، میں نے لڑکی کو گلابے اور رلا سے حاصل کیا تھا۔ وہ دونوں جیل میں تھے۔ ابھی تم نے اُن کے ایک ساتھی نور جانی کی منت کی کہ گلابے اور رلا سے جیل میں ملنے کے لیے ... وہ کیا تھا کہ شاید تم خود جیل پہنچ گئے اور وہاں سے لڑکی کا پتہ معلوم کر لیا۔ جب تم واپس آئے تو تم نے مجھے آگرے لوٹنے کا حکم دیا۔ بس اتنی سی بات میں نے بتائی تھی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ اب تم کہاں ہو گے۔ میں نے تمھاری حالت بتائی اور کہا کہ میں نے تمھیں اسٹیشن پر چھوڑا تھا، شاید تم کسی اور شہر کی طرف نکل گئے۔ میں انھیں بتانا نہیں چاہتی تھی کہ تم بمبئی میں ہو کیونکہ میں نے تمھیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ تم اُن کے ساتھ آنے ضرور تھے مگر تم اُن میں سے تھے نہیں۔ اور میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ تم اُن لوگوں میں واپس جاؤ اسی لیے میں خود تمھارے پاس آ گئی۔"

"مگر.... مگر انھیں یہ کیسے پتہ چلا کہ میں تمھارے پاس آگرے آیا ہوں گا یا تم بھاگ کے آگرے گئی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "میں نے تو کسی کو نہیں بتایا تھا۔"

"انھیں کسی نہ کسی طرح ضرور پتہ مل گیا ہو گا اسی لیے وہ سیدھے آگرے آ گئے۔ شاید تم بھول رہے ہو، تم نے کسی کو بتایا ہی ہو گا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "لیکن میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ یہ شہر بڑا ہے اور دُور بھی بہت ہے اور انھیں میری بات کا یقین بھی آ گیا تھا، جبھی تو وہ واپس چلے گئے۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے سردی سی لگنے لگی۔ ایک ایک چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ میرے آنے کے بعد نجّل کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ اُس نے تو طوفان مچا دیا ہو گا۔ ایک ایک کو حاضر ہونے کا حکم دیا ہو گا کہ لاڈلا جہاں ملے اُسے پکڑ کے میرے پاس لاؤ ورنہ۔ جامو اور کپتن کے سر نجّل کے سامنے شرمندگی سے اُٹھتے نہ ہوں گے۔ زرّیں نے تو ضبط کر لیا ہو گا، میری واپسی اور عافیت کے لیے دعائیں کر رہی ہو گی اور نجّل اُسے تسلیاں دے رہا ہو گا کہ مجھے جلد ہی تلاش کر لیا جائے گا۔ ادھر کلکتے میں نجّل کے اڈّے کا کاروبار اُس کی عدم موجودگی میں چوپٹ پڑا ہو گا۔ موجداس کے مرنے کے بعد وہاں اُس کے ہونے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اِدھر اُدھر جہاں جہاں تک اُن کی پہنچ

ہو گی۔ مجھے ڈھونڈتے رہیں گے لیکن ہے نہ بھی ڈھونڈیں، تھک جائیں۔ مجھے یاد آیا میرے غائب ہو جانے کے بعد انھوں نے سیدھے نواب سراج علی کی حویلی کا رُخ کیا ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چمپا باڑی کے پاس پہنچ گئے۔ نہ معلوم اُنھوں نے آگرے میں میرے بارے میں کیا کیا باتیں کی ہوں۔ چمپا کو پھر میرا نام لاڈلا بھی معلوم ہو گا۔ اُنھوں نے لاڈلے کے نام ہی سے مجھے پوچھا ہو گا۔ اگر چمپا کی زبان سے راج کرشنا کے سامنے کسی وقت لاڈلا نکل گیا تو اچھا نہیں ہو گا۔ میرا خون رُک رُک کے گردش کرنے لگا اور رگوں میں مروڑ سی ہونے لگی۔

"میاں!" مجھے مبہوت دیکھ کے اُس نے سہمی ہوئی آواز میں مجھے پکارا۔ میں چونک پڑا۔ وہ کہہ رہی تھی "میں اسی لیے ترنم سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی کہ تمھیں پرانی باتیں یاد آ جائیں گی مگر تمھیں یہ بتانا بھی ضروری تھا تاکہ بے خبر نہ رہو۔ چھاؤں مل گئی ہے تو کہیں پھر دھوپ میں نہ نکل جاؤ۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پیالیاں اُٹھا کے کمرے سے نکل گئی۔ میرا سر پھٹ رہا تھا۔ میں نے سوچا، میں چلا جاؤں۔ بہت دُور چلا جاؤں، جہاں کوئی نہ مجھے جانتا ہو، نہ لاڈلے سے واقف ہو، نہ لُٹی سے۔ نہ اسے یہ معلوم ہو کہ میں نے جیل کاٹی ہے اور نہ کوئی میرے ساتھ وہاں ہمدردی کرے۔ اب کے میں گونگا اور بہرا بن جاؤں گا اور جنگل میں نکل جاؤں گا، جہاں کوئی آدمی نہیں ہو گا اور ہو گا تو میں اُس سے بات ہی نہیں کروں گا۔ اب کوئی نہیں ملے گا۔ کوکو کو ملنا ہو گا تو خود مجھے ڈھونڈتی ہوئی آ جائے گی۔ میں نے بہت ڈھونڈ لیا۔ اب میں کسی سنسان جگہ جا کے بس اُس کے خیال میں گم رہوں گا اور دنیا کا کوئی شخص میری محویت میں رخنہ نہیں ڈالے گا۔ میں اپنی یادداشت سے اُس کا ایک مجسمہ بناؤں گا اور بس اُسے دیکھتا رہوں گا۔ کہیں کوئی آدمی نظر آیا تو میں وہ جگہ چھوڑ کے دوسری جگہ نکل جاؤں گا۔ میں اپنے سامنے کی دیوار پر اُس کی تصویر بناتا رہا۔

کسی نے کمرے کی بتی جلا کے میری آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ راج کرشنا مجھے اُٹھا کے باہر لے آیا۔ اُس نے میرے شانے زور زور سے ہلا کے میری سستی دُور کرنے کی کوشش کی۔ "جب میں تمھاری عمر میں تھا تو خبر ہے کیا کرتا تھا؟" وہ مستعد لہجے میں بولا۔ میں نے پٹ پٹاتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ "میں جاگتا، کھیلتا، گاتا، کھاتا اور دیواروں پر گھونسے مارتا رہتا تھا۔" وہ میری پیٹھ اور سینے پر گھونسے مارتے ہوئے بولا۔ "بالکل سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ اٹین شن! بالکل پولیس والوں کی طرح، سینہ باہر نکالو، ہاں یہ بات! اب ٹھیک ہے۔ ایک جوان اور وجیہہ آدمی۔ پولیس کی وردی تم پر کتنی سجے گی۔" چمپا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "مجھے بہت بھوک لگی ہے چمپا دیوی!" وہ چمپا سے مخاطب ہو کے عاجزی سے بولا۔ چمپا جیسے منتظر کھڑی تھی، اِدھر اُس کے منہ سے بات نکلی، اُدھر وہ باورچی خانے کی طرف لپکی۔ "آج بہت کام کرنا پڑا۔ آخر جیت میری ہی ہوئی۔ میں نے کسی کی ضمانت نہیں ہونے دی۔" وہ انگڑائی لیتا ہوا

کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اور ہاں — آج دفتر میں رستم جی کا فون آیا تھا۔ بلانا چاہتے تھے، کہہ رہے تھے، نورین بہت ضد کر رہی ہے۔ میں نے کہا، ان دنوں مصروفیت ہے، آپ کو پھر کسی دن بلاؤں گا۔ کہہ رہے تھے، آگرے میں ہمارے آنے کے بعد لوگ ہمارا تذکرہ کرتے رہے۔ تمھارے بارے میں سب متجسس تھے۔"

اُس نے اتنی باتیں کہہ ڈالی تھیں مگر میری زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹا تھا۔ مجھے پھر شدت سے وہی احساس ہوا، اپنی بدتمیزی کا۔ اس احساس کی وجہ سے میرا جسم کسی مجرم کی طرح اپنے آپ کو چھپانے لگا۔ میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ پھر میں نے سٹ پٹا کے پوچھا "[illegible] کا کیا ہوا؟"

"مستانہ!" اُس نے اچانک جیسے ایک نعرہ بلند کیا۔ "مستانہ حوالات میں مستی کر رہا ہے، ڈنڈے پر ناچ رہا ہے۔ لمبی سزا ہو گی یا شاید گلے میں ہار پڑ جائے۔ اُس کے گلے میں پڑا ہوا گیندے کا ہار بھی سوکھ گیا ہے۔ بڑے عجیب انکشاف ہو رہے ہیں۔ آج اُسے میرے سامنے لایا گیا تھا۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ بمبئی کی پولیس کا اُسے پہلی بار ذرا اجنبی انداز میں تجربہ [illegible] اس لیے بہت ناراض نظر آتا تھا۔ دیکھو گے اُسے؟"

"نہیں۔ میں نے اُسے بہت دیکھ لیا ہے۔"

"پولیس کے کئی نوجوان افسر جو میری عزت کرتے ہیں، تم سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ میں نے انھیں ٹال دیا ہے۔ سب کو حیرانی ہے، ایک دم اچانک کرشنا جی نے یہ کیا جادو کر دیا۔"

کھانے کے بعد وہ مجھے اور چمپا کو موٹر میں بٹھا کے چوپاٹی لے گیا۔ میں اُس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا، چمپا پچھلی نشست پر۔ ہم سمندر کے کنارے جا کے ریت پر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، لہریں چنگھاڑتی ہوئی ہمارے پاؤں چھوتیں اور سمندر کی پہنائیوں میں گم ہو جاتیں۔ راج کرشنا کہنے لگا "آدمی بھی سمندر کی ایک لہر کے مانند ہے۔ اُٹھتا ہے، گرجتا ہے، کنارے پر آ کے ہانپنے لگتا ہے، زمین کو بوسہ دیتا ہے اور لوٹ جاتا ہے۔ پھر پرانی لہروں کے خمیر سے نئی لہریں اُٹھتی ہیں مگر [illegible] لہر کا یہی ہوتا ہے۔" وہ میرے ساتھ کنارے کنارے دُور تک چلا گیا۔ چمپا [illegible] بیٹھی رہی۔ راستے میں اُس نے پوچھا "ظہیر خاں! تمھاری رائے میں میں کیسا آدمی ہوں؟"

میں اُس کے سوال پر حیران رہ گیا۔ "جی، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔ مجھے ڈر لگا کہ چمپا نے ضرور اُسے کچھ بتا دیا ہے۔

"نہیں، میں تمھاری رائے جاننا چاہتا ہوں، اچھی بُری جو کچھ بھی ہو، میں خفا نہ ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"آ... آپ کا کیا مطلب ہے؟" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"میرا مطلب صاف ہے؟"

"مگر کیوں؟ آپ کو اس کی کیوں ضرورت پڑ گئی؟"

"مجھے اپنے آپ پر شبہ ہونے لگا ہے۔"

"نہیں،" میں نے ہذیانی انداز میں کہا، "شبہ نکال دیجیے۔"

وہ چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ "ظہیر! مجھے تمھارا جواب معلوم ہے، تم مجھے ہمدرد [illegible] آدمی سمجھتے ہو تو پھر مجھ پر بھروسا کرو۔ ممکن ہے تمھاری سمجھ میں کوئی بات نہ آ رہی ہو۔ ایسا ہے تو میری عقل پر انحصار کرو۔ اپنا ہر کام آدمی خود نہیں کر سکتا، اُسے دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں تمھارے لیے اچھا ہی سوچ سکتا ہوں۔ بس تم مجھے ایسا کرنے کا موقع دو۔"

"مگر میں... میں تو آپ کے پاس ہی موجود ہوں۔"

"لیکن کہاں؟" وہ مایوسی سے بولا۔ "تم تو علیحدہ رہتے ہو۔"

"میں ایسا نہیں چاہتا لیکن نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو مجھے معاف کر دیا کیجیے۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔"

"میں جانتا ہوں لیکن جب ایسا ہو تو خود کو دوسروں کے قابو میں دے دینا چاہیے۔ تجربہ کر کے دیکھ لو، اگر کوئی فرق نہ پڑا تو دوسرے خود ندامت سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ پھر وہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"جی،" میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے چمپا تک پہنچ گئے۔ اُس نے بال کھول رکھے تھے۔ سمندر کی ہوا سے اُس کے بال اُڑ رہے تھے۔ جب ہم گھر واپس آئے تو رات ہو چکی تھی۔ میں منع کرتا رہا مگر چمپا میرا سر دباتی رہی۔ میری آنکھ لگ گئی۔

☎

دوسرے دن سہ پہر راج کرشنا دفتر سے واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ اُس کا رنگ صندلیں تھا۔ نقش و نگار سڈول اور [illegible] تھے جیسے انھیں ڈھالا گیا ہو۔ شکل و صورت سے وہ بہت سنجیدہ اور [illegible] نظر آتی تھی حالانکہ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ آنکھیں سیاہ اور روشن، بال بھورے اور بہت لمبے تھے۔ ایک سادہ سی ساڑھی پہنے ہوئی تھی۔ [illegible] طور پر وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔ "یہ مس جولین ہیں۔" اُس نے شائستہ [illegible] کہا۔ "انھوں نے کم عمری ہی میں اچھا خاصا پڑھ لکھ لیا ہے اور اب [illegible] نے انھیں زحمت دی ہے کہ یہ اپنے علم سے کچھ تمھیں بھی فائدہ پہنچائیں۔ [illegible] یہ تمھیں انگریزی پڑھائیں گی۔ مس جولین! یہ ظہیر ہے، مجھے یقین ہے یہ تمھارے لیے ایک اچھا شاگرد ثابت ہو گا۔ بزرگوں کا قول ہے کہ زبان سیکھنی ہو تو عورت سے سیکھی جاتی ہے۔"

"مگر میں... میں" میرے حلق میں لفظ پھنس گئے۔

"مگر کیا؟ یعنی کیا تم پڑھنا نہیں چاہتے؟ علم کے سامنے آدمی کی حیثیت [illegible] بچے جیسی ہوتی ہے اور ایک سعادت مند بچے ہی کی طرح اس سے پیش آنا چاہیے۔"

"علم کے لیے عمر مقرر نہیں ہوتی۔" پہلی بار جولین اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "اگر آپ نے محنت کی تو صرف چند مہینوں میں آپ بہت سے سال کراس کر لیں گے۔"

"بس اب اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہیں۔" راج کرشنا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مس جولین! آپ اپنے شاگرد کو لے کے دائیں جانب کے کمرے میں چلی جائیے۔"

"آئیے۔" جولین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آئیے۔"

"جاؤ۔" راج کرشنا نے میرا تذبذب دیکھ کے مجھے ڈانٹا۔

میں بھاری قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ کہوں اس کی ضرورت نہیں ہے مگر بات زبان تک آ آ کے رہ گئی۔ مس جولین [illegible] کے کمرے میں آ گئی اور ہم دونوں میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ "یہ بتائیے کہ آپ نے پہلے کتنا پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے؟"

"کچھ نہیں، میں نے کچھ نہیں پڑھا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"کچھ نہیں؟" اُس کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ "یعنی آپ نے بالکل نہیں پڑھا؟ کچھ بھی نہیں؟ آپ حروف نہیں پہچانتے؟"

"تھوڑے بہت۔" میں نے تلخی سے کہا۔

اُس نے سکون سے سادہ کاغذ کا ایک پیڈ اُٹھایا اور پنسل آگے کر دی۔ "ذرا اپنا نام لکھیے۔" میں جھجکنے لگا۔ وہ پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔ "گھبرائیے نہیں۔ جیسا کچھ بھی آپ جانتے ہیں، لکھ دیجیے۔ بہت خراب لکھ دیجیے۔" میں نے اُلٹے سیدھے لفظوں میں 'ظہیر خاں' لکھ دیا۔ اُس نے بڑے غور سے میری تحریر کا معائنہ کیا۔ "ہونہہ۔" وہ فکر مندی سے بولی۔ "ابتدا سے کام کرنا پڑے گا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں کل آپ کے لیے کاپیوں اور کتابوں کا سیٹ لے آؤں گی۔ دیکھیے، ساری بات شوق کی ہے۔ شوق نہیں ہو گا تو میں کیا، کوئی بھی آپ کو کچھ نہیں سکھا سکے گا۔ بس اپنے اندر شوق پیدا کیجیے اور یہ خیال دل سے نکال دیجیے کہ آپ اب تک کچھ نہیں پڑھ سکے۔ لوگ پڑھ کے بھی تو بھول جاتے ہیں۔ آپ کو جو بھی پریشانی ہو، مجھ سے فوراً پوچھ لیجیے۔" وہ مجھے سمجھاتی رہی۔ میں منہ لٹکائے سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ راج کرشنا کو کس طرح سمجھاؤں؟ اتنی اچھی لڑکی کو پڑھانے کے لیے مامور کرنے پر اُس نے کتنا روپیہ خرچ کیا ہو گا؟ بالکل فضول۔ مس جولین نہ جانے کہاں رہتی ہو گی، روز آئے گی جائے گی۔ میں نے طے کیا، میں راج کرشنا کو منع کر دوں گا کہ میں پڑھنا ہی نہیں چاہتا۔ میں کچھ نہیں چاہتا مگر پھر وہ بہت ناراض ہو گا۔ میں اسی کش مکش میں تھا کہ جولین نے اپنی شستہ اور مہذب آواز میں مجھے پکارا۔

"مسٹر ظہیر! کیا آپ میری باتیں توجہ سے سن رہے ہیں؟"

"جی،" میں نے بڑبڑا کے کہا۔ "جی سن رہا ہوں۔"

"صرف سننا نہیں، سن کے دماغ میں کھپانا بھی ہے۔"

"جی۔" میں نے چستی سے کہا۔
"آپ صحت مند آدمی ہیں، نوجوان ہیں بس صرف ایک چیز کی کمی ہے آپ میں۔ جب یہ کمی دُور ہو جائے گی تو دیکھیے کیسی تبدیلی آئے گی۔ لوگ ہر جانب سے آپ کے قریب ہونے کی کوشش کیا کریں گے۔ آپ کی بات میں وزن پیدا ہو جائے گا۔ لوگ آپ سے مشورے لیا کریں گے۔ آپ کی عزت میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ بڑے بڑے لوگوں سے آپ کے تعلقات ہوں گے۔ بس یہ سب آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنی یہ کمی کتنی تیزی سے دُور کرتے ہیں۔ میں آپ کے شوق میں ہر لمحے، ہر قدم پر آپ کا ساتھ دیتی رہوں گی۔"

مس جولین اُس دن جلد واپس چلی گئی۔ میں دن بھر راج کرشنا سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ رات کو وہ مجھے گھمانے بھی لے گیا، ممپا بھی ساتھ نہیں تھی مگر راج کرشنا نے اپنی طرف سے جولین کا کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا۔ وہ مجھے دن بھر کی روداد سناتا رہا کہ مستانہ کو جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے اور دو ایک روز میں اُن شہریوں کو بھی منتقل کر دیا جائے گا جو مستانہ کے ساتھ گرفتار کیے گئے تھے، راج کرشنا اس بات پر بہت خوش تھا کہ گزشتہ دو دنوں کے اندر شہر کے جرائم میں حیرت انگیز کمی واقع ہو گئی ہے۔

دوسرے دن جولین کتابوں سے لدی پھندی آئی۔ سب ابتدائی کتابیں تھیں۔ وہ اُس نے میرے سامنے رکھ دیں پھر ایک ایک حرف بہت انہماک سے مجھے شناخت کراتی رہی۔ حرفوں سے لفظ بنانا، لفظوں کے معنی۔ سی اے ٹی کیٹ کیٹ معنی بلی، آر اے ٹی ریٹ ریٹ معنی چوہا۔ مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ ایک مرتبہ جی میں آئی کہ اُسے پوری کتاب سنا کے مطمئن کر دوں تاکہ وہ آرام سے اپنے گھر چلی جائے اور روز روز آنے کی تکلیف سے بچ جائے مگر میں یہ نہ کر سکا۔ سبق پڑھانے کے بعد وہ باتیں کرنے لگی۔ اُس کی باتوں کا انداز بہت دل کش تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اُس کی پلکیں تھرکتی رہتی تھیں اور پتلیاں تیزی سے حرکت کرتی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے دفعتہً وہ پوچھنے لگی "آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ خوابیدہ لہجے میں کہنے لگی "اچھا ہوا کہ آپ نے ہاں کہہ دیا ورنہ میں بہت اداس ہوتی۔ جسے موسیقی کی تمیز نہ ہو وہ مجھے ادھورا آدمی لگتا ہے۔ میں سوچتی ہوں سنگیت نہ ہوتا تو دنیا کیسی ہوتی۔"

"آپ گانا جانتی ہیں؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔
"ہاں تھوڑا بہت آتا ہے، اور آپ کو؟"
"مجھے بالکل نہیں آتا لیکن مجھے بہت اچھا لگتا ہے، میرا ایک دوست تھا شولی۔ وہ ستار خوب بجاتا تھا، اور بھی لوگ تھے۔ میں تو سنتا رہتا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ خود گانے کی بہ نسبت گانا سننا اور لطف اٹھانا زیادہ اچھی بات ہے۔"
"وہ کیسے؟" وہ تجسس سے بولی۔
"وہ ایسے کہ بنیادی طور پر گانا گانے اور سننے والے دونوں میں موسیقی کا جذبہ ہوتا ہے مگر گانا گانے والا آدمی کسی نہ کسی قدر پابند ہو جاتا ہے جب کہ سننے والا اس پابندی سے آزاد ہوتا ہے۔ گانے والے کو ریاض کرنا پڑتی ہے اور گانے کے آداب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اب آپ تو ہی بتائیے کہ کون زیادہ سچا ہو سکتا ہے؟ کان گانے کے آداب سے نابلد ہوتے ہیں اور وہی سننا چاہتے ہیں، جس میں رس ہو۔ گانے والا اسے ادا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور جہاں کوشش اور ارادہ شامل ہو وہاں..." میں فوراً سنبھل کے چپ ہو گیا۔ جولین مجھے تک رہی تھی۔
"کہیے نا۔ بات پوری کیجیے۔" وہ بے چینی سے بولی۔
"بات ختم ہو گئی۔ مجھے خیال آ گیا، میں اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا ہوں۔"
"آپ نے بڑی عجیب بات کہی۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولی "کرشنا جی آپ کے بارے میں سچ کہتے تھے۔"
"وہ کیا کہتے تھے؟" میں نے گھبرا کے پوچھا۔
"وہ کہتے تھے کہ ظہیر تمہارے لیے ایک دل چسپ شاگرد ثابت ہو گا، تم ایک تجربہ کرو گی۔ وہ اپنے دل میں آپ کے لیے بہت ارمان رکھتے ہیں۔ وہ آپ کو ہر لحاظ سے ایک مکمل نوجوان دیکھنا چاہتے ہیں۔"

جولین اُس دن زیادہ دیر تک ٹھہری رہی۔ ممپا نے اُس کی بڑی خاطر کی۔ وہ دونوں بنگلے کے مختصر لان میں بیٹھی ہوئی باتیں کرتی رہیں۔ وہ ابھی گئی نہیں تھی کہ راج کرشنا آ گیا۔ اُس نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ جولین کو اُس کے گھر پہنچا آئے۔ جب وہ کپڑے بدل کے اور چائے پی کے اطمینان سے بیٹھا تو میں نے ہمت کر کے کہا "میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" وہ اچھل سا پڑا اور ایک دم سنجیدہ ہو کے بولا "کہو۔"
"میں مس جولین کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ اُس نے سر ہلایا تو مجھے کچھ اور حوصلہ ہوا "آپ پیسے کیوں ضائع کر رہے ہیں؟"
"کیا مطلب؟" وہ ترشی سے بولا۔
"مطلب یہ کہ" میں نے تیزی سے کہا "میرا دل پڑھنے میں نہیں لگتا۔ اُن کا وقت خراب ہو گا اور آپ کا پیسہ۔ آپ انھیں منع کر دیجیے۔ جب میرا جی چاہے گا، میں آپ سے خود کہہ دوں گا۔"
وہ ہنسنے لگا "پڑھنے میں کس کا جی لگتا ہے۔ جی لگانے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ کوشش کرو مس جولین کی باتیں بھی بہت مفید ہوتی ہیں۔ باتیں کم کرو، سنا زیادہ کرو اور پیسے ویسے کا خوف چھوڑ دو۔ آیندہ ایسی بات منہ سے مت نکالنا۔"
"مگر سب بے سود ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔
"تعلیم کبھی بے سود نہیں ہوتی۔" وہ سخت لہجے میں بولا "میری بات ناگوار سہی مگر تم تھوڑی دیر کے لیے یہ جبر ضرور کر لیا کرو۔ مس جولین بہت اچھی لڑکی ہے۔"
"یہ میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ بُری ہیں۔"
"دیکھو ظہیر! تمھیں اُن سے پڑھنا ہے۔ یہ میرا حکم ہے، بس میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا۔" اُس نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

مس جولین تیسرے دن بھی آئی، چوتھے دن بھی، پانچویں دن بھی اور کتابوں میں کم باتوں میں زیادہ وقت صرف کرتی رہی۔ اُس نے طرح طرح کی باتیں کیں۔ اُس کا لہجہ شیریں اور انداز نفیس تھا۔ روز نیا لباس بدل کے آتی تھی، صاف ستھرا، گو وہ بہت بھڑکیلا اور شوخ نہیں ہوتا تھا، اُس کی باتوں کی طرح نکھرا ہوا، صاف اور اُجلا ہوتا تھا۔ میں نے راج کرشنا کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ جس وقت وہ آتی، میں کمرے میں چلا جاتا اور کتابیں کھول کے بیٹھ جاتا، اُسے کل کا سبق سناتا، کاپی دکھاتا۔ وہ اُس پر گڈ لکھتی، شاباش دیتی اور نیا سبق پڑھاتی۔ یہ تماشا کرتے ہوئے مجھ پر جب اداسی غالب آ جاتی تو وہ باتیں کرنے لگتی۔ میرے کان اُس کی باتوں کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ میری زبان سے کوئی جملہ نکل جاتا تو وہ اسی جملے کے رخ پر گفتگو کرنے لگتی۔ چھٹے دن وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ میں نے پوچھا "مس! کیا بات ہے؟ آج آپ کچھ فکرمند نظر آتی ہیں؟"
کچھ تذبذب کے بعد وہ بولی "ہاں ظہیر! میرے باپ بہت بیمار ہیں۔"
"کیا ہو گیا انھیں؟" میں نے افسردگی سے پوچھا۔
"انھیں دق ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔
"دق ہے؟ سنا ہے یہ تو بہت بُرا مرض ہوتا ہے؟"
"ہاں! بہت بُرا ہوتا ہے اور وہ اپنی بیماری کے آخری درجے میں ہیں، اُن کا سینہ کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اب وہ زندہ نہیں رہیں گے۔"
"کیوں نہیں رہیں گے۔ آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ اُن کا علاج نہیں ہو رہا ہے کیا؟ اور آپ انھیں بیماری میں چھوڑ کے یہاں کیوں آ گئیں؟ آپ کو اُن کی تیمارداری کرنی چاہیے تھی۔"
"میں اُن کی تیمارداری اور علاج کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ شاید ایسی کوئی دوا ہی نہیں بنی جو میرے ڈیڈی کو شفا دے سکے۔" اُس کی آواز پھٹنے لگی۔
"یہ تو آپ نے بہت بری خبر سنائی۔ آپ کہتی تھیں کہ آپ اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی ہیں، آپ کو تو اُن کے پاس رہنا چاہیے۔ کل سے آپ نہ آئیے گا اور میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ میں کرشنا جی سے کہوں گا، وہ کسی بہت بڑے ڈاکٹر کو جانتے ہوں گے۔"
اُس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لرزنے لگے "کرشنا جی سے کہہ کے کیا کیجیے گا۔ میں ہر بڑے ڈاکٹر کو دکھا چکی ہوں اور یہاں آنے میں کُل ڈھائی گھنٹے ہی تو لگتے ہیں، اس طرح کچھ دیر کے لیے مجھے اُس ماحول سے دور رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اچھا اب آپ اپنا کام کیجیے۔" اُس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "آپ نے کتنا یاد کیا؟" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔
میں نے کتاب بند کر دی "نہیں مس! اب پڑھائی نہیں ہو گی۔ اب آپ جا کے اپنے باپ کو دیکھیے۔ ممکن ہے، وہ آپ کو پکار رہے ہوں۔"
"میں اسی لیے آپ سے نہیں کہہ رہی تھی۔ نہیں، میں اپنا وقت پورا کر کے جاؤں گی۔ وہ ٹھیک ہی ہوں گے۔ چلیے آپ شروع کیجیے۔"
وہ نہیں مانی۔ میں نے اُس دن جلدی جلدی سبق پڑھ لیا اور اُس کی کسی بات پر بحث نہیں کی لیکن اُس نے اُسی وقت اُٹھنے کا ارادہ کیا جب شام ہونے لگی۔ میں نے کہا "مس! آپ کے ساتھ میں بھی آپ کے ڈیڈی کو دیکھنے چلتا ہوں۔"
"نہیں، وہاں آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم بھی بہت احتیاط کرتے ہیں، وہ دق کے مریض ہیں۔" میں نے بہت اصرار کیا تو وہ کسی اور دن ساتھ لے چلنے کا کہہ کے چلی گئی۔

رات کو راج کرشنا مجھے کلب لے گیا۔ وہاں بہت سے لوگ ہمارے اِردگرد اکٹھے ہو گئے۔ اُن دنوں اخبارات میں روزانہ کلا کے علاقے میں پڑنے والے چھاپوں کے متعلق کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا تھا اور ہر خبر کے ساتھ راج کرشنا کا نام بھی آتا تھا۔ میں بھی روز بہت توجہ سے اخبار دیکھتا تھا کیونکہ گھر آنے والے فونوں پر راج کرشنا کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بمبئی پولیس کے پُرانے افسر اُس سے خوش نہیں ہیں، وہ تو اخبارات نے حکومت پر زور ڈالا کہ مجرموں کے ساتھ کوئی رعایت کی گئی تو لوگ پولیس کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ معلوم نہیں، اخبار والوں کو کیسے پتہ چل گیا تھا کہ چند بااثر لوگ راج کرشنا کو نرمی اختیار کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ بمبئی کے ایک رئیس گوپال داس نے حوالات میں خودکشی کر لی تھی اور باقی معزز لوگ جیل بھیج دیے گئے تھے۔

اُس رات کلب میں ہر شخص راج کرشنا کے قریب بیٹھنے اور اُس کی زبانی کوئی نہ کوئی بات سننے کی فکر میں تھا۔ نورین بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ تھوڑی دیر بعد آ گئی اور مجھے دیکھ کے تقریباً بھاگتی ہوئی سیدھی میرے پاس آئی۔ اُس نے نیلی اسکرٹ پہن رکھی تھی "ارے آپ؟ آج آپ کیسے آ گئے؟" وہ حیرت سے بولی۔
"جیسے آپ آ گئیں" میرے منہ سے نکل گیا۔
"ہم تو روز آتے ہیں۔ میں روزانہ سوچتی تھی کہ شاید آپ آج آ جائیں، آج آ جائیں۔ مجھے آپ سے شکایت ہے۔" وہ ناراضی سے بولی "آپ نے ہم لوگوں کو اپنے گھر نہیں آنے دیا۔"
"کرشنا جی کہہ رہے تھے کہ وہ کسی دن آپ کو بلائیں گے۔"
"دیکھیے، وہ دن کب آتا ہے، اچھا یہ بتائیے۔ ابھی آپ نے اپنے گھر جانے کا پروگرام تو نہیں بنایا؟" وہ میز پر جھکتی ہوئی بولی۔
"ابھی تو ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔"
"پھر ٹھیک ہے، ہمارا جہاز آنے ہی والا ہے، اب کے ہم نے سوچا ہے کہ بہت سے لوگوں کے ساتھ بہت دُور سمندر میں نکل جائیں گے اور کئی دن بعد واپس آئیں گے۔ آپ ہوں گے تو اور مزہ رہے گا۔ جہاز بھی ایک طرح کا کلب بن جائے گا۔ ہم عرشے پر بیٹھ کے خوب باتیں کریں گے۔ اتنا

بڑا وقت پڑا ہوگا۔ چلیں گے نا؟"

"جی، مگر کرشنا جی۔۔۔۔"

"کرشنا جی کیسے نہیں جائیں گے، اُن کے ہاتھوں میں ہم ہتھکڑی ڈال کے لے جائیں گے۔ وہ دوسروں کو بہت ہتھکڑیاں لگاتے ہیں۔ وہ بھلا اتنی اچھی سیر نہیں کریں گے؟ اتنا کام کرنے کے بعد انھیں کچھ آرام ملنا چاہیے۔"

ہم جب تک کلب میں موجود رہے، وہ میرے ہی پاس بیٹھی رہی اور مجھے مس جولین کا خیال آتا رہا۔ کاش اُس کا باپ ٹھیک ہو۔ راج کرشنا لوگوں کے درمیان گھرا رہا۔ پھر جب ناچ شروع ہوا تو وہ مسز روپ پٹیل کے ساتھ ناچنے لگا اور نورین ناچ کی دُھن پر اپنے پاؤں تھرکاتی رہی اور مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں بھی اُس کے ساتھ راج کرشنا اور دوسرے لوگوں کی طرح ناچوں۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ "مجھے ناچ نہیں آتا۔"

"میں آپ کو ناچ سکھاؤں گی۔" وہ مچلتی ہوئی بولی۔ "دیکھ لیجیے، پھر آپ کو ایک عجیب لُطف آئے گا، آپ بے خود ہو جائیں گے، جیسے آپ نے کوئی نشیلی چیز پی لی ہو۔"

نورین اور میں تنہا ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں کئی لڑکیاں اور عورتیں بھی آ کے وہاں بیٹھ گئیں۔ مجھے حبس محسوس ہونے لگا۔ میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر نورین نے میز کے نیچے میرے گھٹنے پر ٹھوکا مارا اور اپنا پیر میرے پیر پر رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُن کے آنے کے بعد اس طرح اچانک اُٹھنا بد تہذیبی ہے۔ اُن سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں اور وہ سب مسکرا رہی تھیں۔ مجھے ان کی مسکراہٹ زہر لگی۔ اسی اثنا میں ناچ ختم ہو گیا اور راج کرشنا مسز روپ پٹیل کے ساتھ ہماری میز پر آ گیا۔ سب کھڑے ہو گئے اور اس افرا تفری میں مجھے راج کرشنا کے قریب پہنچنے کا موقع مل گیا۔ پھر میں، نورین، راج کرشنا اور مسز روپ، چاروں ایک دوسری میز پر بیٹھ گئے۔ مسز روپ کے گلے میں وہی ہار لٹک رہا تھا۔ کورا کی امانت جس کا ابّا جان نے خیال نہیں کیا۔ میری نظریں اُس کے گلے سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اِس دوران میں نورین نے جو باتیں کیں، وہ میں نے نہیں سُنیں۔ میں اس فکر میں تھا کہ مسز روپ پٹیل کے گلے سے یہ ہار کس طرح چھینوں، کہ اسی وقت راج کرشنا میرے کان میں چپکے سے بولا۔ "چلیں؟"

"ہاں چلیں۔" میں نے دفعتہً اُٹھتے ہوئے کہا۔

سب ہمیں روکتے رہے۔ نورین پہلے کی طرح کلب کی عمارت کے خاص دروازے تک ہمیں پہنچانے آئی۔ اس بار اُس کے ساتھ کلب کے بہت سے مرد تھے اور عورتیں تھیں۔ راج کرشنا نے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ سب واپس ہو گئے مگر نورین واپس نہیں گئی۔ وہ ہمارے ساتھ دروازے سے باہر آ گئی اور اُس نے اُس وقت تک راج کرشنا کو آگے نہیں بڑھنے دیا جب تک اپنے گھر آنے کا وعدہ نہ لے لیا۔

عمارت سے باہر نکل کے ہم کلب کے وسیع سبزہ زار میں آ گئے۔ دُور لان اور درختوں کے پرلی طرف پختہ فرش پر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جسے کلب سے جانا ہوتا، وہ دربان کے ذریعے موٹر پورٹیکو میں طلب کر لیتا۔ ہم نے دربان کو یہ زحمت نہیں دی کیونکہ ہمارے ساتھ ڈرائیور ہی نہیں تھا۔ باہر آ کے میں نے گہری گہری سانسیں لیں۔ سبزے پر چاندنی سو رہی تھی۔ ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اُونچے اور گھنے درختوں کے نیچے کہیں کہیں گہرا اندھیرا تھا، ہوا نرم اور ٹھنڈی تھی۔ سوئمنگ پول کا پانی دُور سے چمک رہا تھا۔ اتنا اچھا موسم اور منظر چھوڑ کے یہ لوگ عمارت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا جی چاہا، میں یہیں سبزے پر لیٹ جاؤں۔ ہم آہستہ قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی ہم درمیان ہی میں تھے اور ایک درخت کے سائے میں گویا بے تھے کہ مجھے کچھ آہٹ ہوئی، میں نے چونک کے اِدھر اُدھر نظر ڈالی مگر چونکنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ ایک سایہ بجلی کی طرح درخت کی اوٹ سے نکلا اور راج کرشنا پر جھپٹا۔ میں نے اچانک راج کرشنا کو زور سے دھکا دے دیا۔ وہ شخص جھونک میں کچھ آگے بڑھا مگر ایک لمحے میں پلٹ کے مجھ پر لپکا۔ میں اچھل کے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور کسی نو مشق کی طرح اِدھر اُدھر تھرکنا شروع کر دیا۔ اُس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر مجھ پر حملہ کر دیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو چاقو اُس کے شانے اور سینے پر کئی انچ کی لکیر کھینچتا ہوا گزر جاتا مگر اُس کا ہاتھ جیسے ہی اُٹھا، میں نے پھرتی سے بائیں جانب سمٹ کے اُسے اپنے پنجے کے قبضے میں لے لیا۔ یہ لمحہ ایسا ہی تھا کہ وہ مجھے چاقو بازی سے نابلد کوئی شخص سمجھے اور سیدھا براہِ راست وار کرے۔ میرا تاثر کامیاب رہا اور اُس نے کسی تردد کے بغیر پوری توقع سے حملہ کیا، اُدھر اُسے راج کرشنا کے اُٹھ جانے اور شور مچانے کا خطرہ ہوگا، اِدھر وہ میری غیر متوقع مزاحمت سے بوکھلا گیا ہوگا۔ جو کچھ اُسے کرنا تھا، جلدی کرنا تھا۔ اس کے نتیجے میں اُس کی کلائی میرے پنجے کی گرفت میں تھی اور وہ اسے آزاد کرانے کے لیے پوری جدوجہد کر رہا تھا۔ اُس نے کئی پینترے بدلے۔ میں نے اپنا دوسرا ہاتھ آزاد کر رکھا تھا اور اُس کے پیٹ پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے میرے چہرے پر مُکّے مارکے میرا ارتکاز ختم کرنے اور مجھے بدحواس کرنے کی فکر میں تھا تاکہ چاقو چلا سکے۔ اُس نے میرے چہرے پر لگا ہی دیے۔ شاید میری بھوں پھٹ گئی مگر میں نے اُس کا پیٹ اُدھیڑ ڈالنے کی کوشش جاری رکھی۔ اُس نے اپنا جسم کسی قدر پیچھے کر لیا تھا چنانچہ میری ضربیں پھسلتی ہوئی پڑ رہی تھیں۔ اِدھر میں نے راج کرشنا کو اُٹھ کے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا، میں نے چیخ کر اُسے دُور رہنے کی ہدایت کی۔ اب میری توجہ چاقو والے ہاتھ پر بالکل نہیں تھی کیونکہ وہ پوری طرح میرے پنجے کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ حملہ آور خاصا پھرتیلا شخص تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ایک بار ہاتھ میں آئی ہوئی کلائی چھوٹ جائے تو حملہ آور کا غضب سوا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نئے عزم سے حملہ کرتا ہے۔ راج کرشنا نے میری ہدایت پر عمل کیا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے اُس کے پیٹ پر ضربیں لگانے کے بجائے اُس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اُسے چھڑانے کے لیے کچھ آگے بڑھا، میرا گھٹنا پہلے ہی اُٹھا ہوا تھا لیکن اُسے بلبلانے کا موقع نہیں ملا۔ اُس نے اچانک اپنے چاقو والے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور چاقو اس طرح چھوڑا کہ وہ دُور جا کے گرے۔ میں نے اپنا ارادہ ترک کر کے اُس کے دونوں ہاتھ آزاد کر دیے۔ اُس نے چاقو کی طرف جست لگانے کا ارادہ کیا مگر وہ مجھے دھوکا دے رہا تھا، وہ پینترا بدل کے ایک طرف بھاگ پڑا۔ میں نے اُس کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی۔ وہ آناً فاناً کلب کی باؤنڈری پھلانگ گیا۔ میں بھی باؤنڈری پکڑ کے اُسے عبور کرنے کے لیے جست لگانے والا ہی تھا کہ راج کرشنا کی چیختی ہوئی آواز نے میری ہمت پست کر دی۔

اُس نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے مجھے پکڑ لیا اور میرے گلے میں جھول گیا۔ اُس کی چیخ پکار پہ دربان اور گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ لان میں اِدھر اُدھر منتشر ہوئے اور ہم تک پہنچ گئے۔ راج کرشنا اپنے رومال سے میری بھوں صاف کر رہا تھا۔ خون نے پورا چہرہ بھگو دیا تھا۔ "ڈاکٹر ملہوترا اندر ہیں صاحب!" ایک دربان نے مشورہ دیا۔

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے دہاڑ کے کہا۔ "چلیے، ایک ذرا بھوں پھٹ گئی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ انھیں یہاں سے دُور کیجیے۔"

راج کرشنا نے ڈرائیوروں اور دربانوں کو اپنی اپنی جگہ واپس ہونے کا حکم دیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا گاڑی تک لانے لگا۔ میں راستے میں حملہ آور کا چاقو اُٹھانا نہیں بھولا۔ میں نے کرشنا کا رومال بھوں پر رکھ کے خون روک لیا تھا۔ راج کرشنا کی بھی خواہش نہیں تھی کہ کلب کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں تک بات پہنچے۔ اُس نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی تیز رفتاری سے بھگاتا ہوا گھر لے آیا۔ چمپا نے میرے چہرے پر جما ہوا خون صاف کیا۔ زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی۔ ایسے نشانات تو عام ہوتے ہیں مگر چمپا اور راج کرشنا اس طرح برتاؤ کر رہے تھے جیسے میری جان نکل گئی ہو۔ میں نے کوئی دوا نہیں لگائی۔ خون راستے ہی میں رُک گیا تھا۔

وہ میرے پہلو میں بیٹھا مجھے حیرت سے گھور رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ مجھے خوشی تھی کہ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچی۔ اگر ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو اس وقت نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ بھاگ گیا۔ اگر راج کرشنا نے گڑبڑ نہ کی ہوتی تو میں اُسے ضرور ڈھونڈ لیتا۔ اُس نے بروقت فیصلہ کر لیا تاکہ کہیں بھاگنے کا وقت بھی نہ نکل جائے۔ اس پورے معاملے میں صرف چند منٹ صرف ہوئے ہوں گے، شاید تین چار منٹ۔ وہ ذرا سی ہٹ کر لیتا تو جن لوگوں نے اُسے بھیجا تھا، انھیں نصیحت ہو جاتی۔ "مجھے اس کا پہلے سے خطرہ تھا۔" راج کرشنا نے مجھ سے کہا۔ "لیکن یہ تو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کلب میں آدمی بھیج دیں گے۔ کیا یہاں کسی نے فون کر کے پوچھا تھا کہ میں کہاں گیا ہوں؟" اُس نے چمپا سے پوچھا۔

"ہاں آپ کے جانے کے بعد کئی فون آئے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ کلب گئے ہیں، دیر سے واپس آئیں گے۔" چمپا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب آئندہ آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے راج کرشنا کو مشورہ دیا۔ "وہ آپ کو اس شہر میں دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"لیکن ظہیر! میں خود نہیں جاؤں گا۔ مجھے موت کا خوف نہیں ہے۔" اُس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "میں نے پستول نکال لیا تھا ظہیر! لیکن اندیشہ تھا کہ نشانہ چوک نہ جائے۔ بہرحال تم نے حیرت انگیز پھرتی کا ثبوت دیا ۔۔۔۔ یہ دوسری بار ہے جب تم نے ایک ماں کو اُس کا بیٹا واپس کر کے اُس کی زندگی کا عرصہ بڑھا دیا ہے۔ تم نے دو جانیں بچائی ہیں۔"

"آپ اس بارے میں کچھ نہ کہیے۔" میں نے شکایت کی۔

"کیسے نہ کہوں کہ میں جو اس وقت تم سے بات کر رہا ہوں، یہ ایک عجوبہ ہے۔" وہ منتشر لہجے میں بولا۔ "تم کلب میں کتنے بور تھے مگر جیسے ہی وقت آیا، تمھارے اندر گویا بجلی بھر گئی۔ تم نے ایک لمحے کی بھی چوک نہیں کی۔" اُس نے زور سے مجھے بھینچ لیا۔

"بس یہی تو سیکھا ہے۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

چمپا اور وہ آدھی رات تک میرے پاس بیٹھے رہے۔ چمپا بار بار چائے بنا بنا کے لاتی رہی اور بار بار میری بھوں ٹٹولتی رہی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ فون آنے لگے۔ کلب کے دربانوں اور ڈرائیوروں نے لوگوں کو بتا دیا ہوگا کہ راج کرشنا صاحب لان میں بھاگ رہے تھے اور اُن کا ساتھی خون آلود چہرے کے ساتھ باؤنڈری کے پاس کھڑا تھا۔ نورین کا فون بھی آیا۔ راج کرشنا نے ریسیو کیا، نورین نے تشویش سے میری خیریت دریافت کی۔ راج کرشنا نے اُسے اطمینان دلایا مگر نورین نے راج کرشنا کی بات پر یقین نہیں کیا۔ مجھے خود فون پر بُلایا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس کا یہ ثبوت کافی ہے کہ میں اُس سے بات کر رہا ہوں۔ راج کرشنا فون کا تار بھی نہیں نکال سکتا تھا کیونکہ وہ ایک پولیس افسر کے گھر کا فون تھا۔ کسی وقت بھی کوئی اہم فون آ سکتا تھا۔

یہ سلسلہ صبح ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ جواب دیتے دیتے، وضاحت کرتے کرتے اوسان بولا گئے تھے۔ پھر صبح ہی صبح نورین اپنے باپ کے ساتھ بنگلے پر موجود تھی۔ "کیا ہوا تھا؟" اُس نے آتے ہی اضطراب سے پوچھا۔ میں نے اُسے سرسری طور پر پورا واقعہ سنایا۔ "تو گویا یہ کلب بھی اب محفوظ جگہ نہیں رہی۔" وہ تشویش سے بولی۔ "کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" اُس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔

نورین دیر تک ٹھیری رہنا چاہتی تھی مگر پولیس افسروں اور کلب کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا اس لیے وہ جلد ہی واپس چلی گئی۔ اُس دن کرشنا دفتر نہیں جا سکا۔ میں نورین کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ یہ راج کرشنا ہی کی ہمت تھی کہ وہ اتنے لوگوں کو جواب دے رہا تھا۔ کبھی

فون پر کبھی بالمشافہ۔ اُسے دوپہر کا کھانا کھانے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ ڈرائنگ روم سہ پہر تک پولیس کے اور دوسرے محکموں کے افسروں اور بمبئی کے شہریوں سے بھرا رہا۔ بنگلے کے باہر موٹروں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ پولیس کے اعلا حکام کے حکم سے بنگلے پر پہرے داروں کی تعداد میں فوراً اضافہ کر دیا گیا تھا۔ کل رات اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ راج کرشنا درمیان میں کود پڑے گا تو مجھے چیخنا نہ پڑتا اور یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ راج کرشنا کو باؤنڈری عبور کرنے سے روکنے کے لیے مجھے آوازیں لگانی پڑی تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو چند منٹ کی بات تھی کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔

سہ پہر کو مجھے جولین کا انتظار ہی رہا۔ وہ وقت کی بڑی پابند تھی مگر وقت گزر رہا تھا اور جولین نہیں آئی تھی۔ یقیناً اُس کے باپ کی حالت زیادہ خراب ہوگئی ہوگی۔ میرے دل میں ہزار وسوسے اُٹھنے لگے۔ میں نے بنگلے کے باہر گلی میں جا کے بھی دیکھا۔ اُس کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی اور وہ نہیں آئی۔ مجھ سے ایک جگہ نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ جب اُس کے آنے کی اُمید بالکل ختم ہوگئی تو میں نے راج کرشنا سے پوچھا کہ اُسے کہیں جانا تو نہیں ہے؟ اُس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا میں کچھ دیر کے لیے موٹر لیے جا رہا ہوں۔ وہ بگڑنے لگا کہ تم پوچھ کیوں رہے ہو؟

ڈرائیور کو جولین کے گھر کا پتہ معلوم تھا۔ میں نے اُسے ساتھ لیا۔ موٹر شہر کی وسیع سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک گنجان اور تنگ و تاریک علاقے میں داخل ہوگئی۔ یعنی جولین اس قدر دُور سے روز مجھے پڑھانے آتی تھی۔ ڈرائیور نے کار ایک نسبتہً کشادہ جگہ کھڑی کر دی اور مجھے ساتھ لیے ہوئے تنگ گلی میں داخل ہوگیا۔ دونوں اطراف چھوٹی بڑی بلڈنگیں کھڑی ہوئی تھیں کائی لگی اور سر پر گرتی ہوئی عمارتیں، یہ آبادی اینگلو انڈین لوگوں پر مشتمل تھی۔ نچلی منزلوں کے کمروں میں سامان کم تھا، صفائی زیادہ نظر آتی تھی۔ اسکرٹ پہنے ہوئے بوڑھی رنگ برنگی عورتیں ہاتھوں میں کنڈیاں لٹکائے گلی میں متحرک تھیں۔ فلیٹوں کے باہر بوڑھے کرسی بچھائے اخبار بینی میں مصروف تھے۔ گلی میں زرد روشنیاں جلنے لگی تھیں۔ میں نے حیرانی کے ساتھ ڈرائیور سے پوچھا کہ کہیں وہ پتہ تو نہیں بھول گیا؟ اُس نے انکار میں سر ہلایا اور بڑی گلی سے دائیں جانب کی ایک اور تنگ گلی میں مڑ گیا۔ ہمارے سامنے لکڑی کی بالکونیوں سے بنی ہوئی ایک تین منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے وہیں رُک کے ایک فلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا مس جولین یہیں رہتی ہیں؟" میں نے مشتبہ انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں! وہ تیسرے ملے کے کونے والے فلیٹ میں رہتی ہیں۔"

مجھے عمارت میں قدم رکھتے ہوئے جھجک ہوئی۔ میں کئی لمحوں تک کشمکش میں گھرا رہا پھر ایک ارادے سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ڈرائیور گلی میں رہ گیا۔ سب سے اُوپر والی منزل پر پہنچ کے میں نے اندازے کے مطابق دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ جولین ہی نے کھولا۔ "آپ!" اُس کی پتلیاں لرز کے ساکت ہوگئیں اور وہ پتھر کی سی بن گئی۔

"آپ کے ڈیڈی کیسے ہیں؟" میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں [illegible]

اُس نے ایک گہری سانس لی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ "وہ پہلے سے بہتر ہیں لیکن انھیں اپنی سدھ بدھ نہیں" اُس نے نقاہت سے کہا۔

"میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر... مگر آپ کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔"

"میں پروا نہیں کرتا۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔

اُس نے سراسیمہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "ٹھہریے۔" یہ کہہ کے اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوئی۔ "آئیے۔" اُس نے سرگوشی میں کہا۔ وہ مجھے ایک مختصر کمرے میں لے گئی۔ وہاں چارپائی پر ایک بوڑھا منہ کھولے پڑا تھا۔ اُس کے جسم کا گوشت سوکھ گیا تھا، بس ہڈیوں کا [illegible] جس میں سانس باقی تھی۔ کمرے میں دواؤں کی بُو بسی ہوئی تھی اور میز پر شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمرہ صاف ستھرا اور روشن تھا مگر جا بجا چیزوں سے پٹا ہوا تھا۔ پرانی میزیں کرسیاں الماریاں۔ در و دیوار پر عجیب اُداسی طاری تھی۔ میں فوراً کھڑا ہوگیا۔ جولین مجھے دوسرے کمرے میں [illegible] اس بڑے کمرے میں بستر بھی تھا، کرسیاں بھی تھیں۔ ایک کونے میں [illegible] سی گول ڈائننگ ٹیبل بھی تھی۔ ایک کونے میں موٹی موٹی کتابوں کا انبار لگا [illegible] ایک طرف صندوق کے اوپر صندوق رکھے ہوئے تھے۔ فرش صاف تھا [illegible] پر شیشے کے فریموں میں مختلف مناظر کی رنگین تصویریں لگی ہوئی تھیں [illegible] جانب ستار رکھا ہوا تھا، درمیان میں دیوار پر لکڑی کی ایک بڑی صلیب نصب تھی۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جولین بھی میرے پاس [illegible] گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں آ کے غلطی کی ہے لیکن اب [illegible] کا کوئی سوال نہیں تھا۔ "کرشنا جی اور چمپا دیدی کے کیا حال ہیں؟" اُس نے [illegible]

"سب ٹھیک ہیں اور آپ کی ممی کدھر ہیں؟"

"وہ ابھی آتی ہیں۔" جولین نے آہستہ سے جواب دیا۔ "یہ گھر بہت [illegible] ہے۔ جب ڈیڈی بیمار ہوئے تو ہم یہاں آ گئے۔ پہلے ہم باندرے میں [illegible] تھے۔ یہاں ڈیڈی کے کئی پرانے دوست ہیں، آتے رہتے ہیں، اس [illegible] اُن کی طبیعت بہلی رہتی ہے۔"

"گھر مختصر ہے مگر آپ نے اسے بڑے سلیقے سے سجا رکھا ہے [illegible] آپ ہی آپ نظر آتی ہیں۔ آج آپ نہیں آ سکی تھیں اس لیے مجھے الجھن [illegible] لگی اور میں یہاں چلا آیا۔"

"مجھے فون کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس گھر میں کسی کو بلاتے [illegible] اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" وہ کمزور آواز میں بولی۔ "ڈیڈی کی بیماری سے [illegible] کچھ تلپٹ ہوگیا ہے۔"

"میں تو آپ کے ڈیڈی کو دیکھنے اور آپ سے ملنے آیا ہوں [illegible]

[illegible] نہیں آیا۔ گھر تو مکینوں سے ہوتے ہیں۔"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ ایک اُجلی زرد [illegible] ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں بوجھل تھیں۔ [illegible] صرف ایک دن میں وہ کچھ اور لمبی ہوگئی تھی۔ میں نے پہلی بار اُسے اس [illegible] شکل میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے پہلے سے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ میری نظریں بار بار [illegible] اُس کی جانب اُٹھتی تھیں اور گھبرا کے جھک جاتی تھیں۔ "آپ گھبرائیے نہیں۔" [illegible] میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

"حوصلہ رکھیے۔" مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔ "میں... میرے [illegible] لائق کوئی کام ہو تو بتائیے۔ دوائی وغیرہ لانی ہو یا ڈاکٹر کے پاس جانا ہو تو بتائیے [illegible] میرے جسم میں بہت خون ہے اگر خون کی ضرورت پڑے تو میں... میں۔" [illegible] ہسک پڑی۔ میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی اب میں اس سے [illegible] کہوں؟ اُسے کس طرح چپ کراؤں؟ "میں آپ کے بہت کام آ سکتا ہوں [illegible] اب مجھے دُنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میرے پاس [illegible] بہت ہی وقت ہے۔ اگر آپ نے مجھے کوئی کام سونپا تو میرا جی خوش ہوگا۔"

وہ اور سسکنے لگی۔ "نہیں۔" اُس نے وحشت سے کہا۔ "آپ کا یہی احسان [illegible] بہت ہے کہ آپ میرے ڈیڈی کو دیکھنے آ گئے۔ بس اُن کے لیے دعا کیجیے۔"

"میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں مس!" میں نے مایوسی سے کہا۔ "میں آپ کے ڈیڈی کے لیے کوئی دعا نہیں کروں گا۔"

وہ سر اُٹھا کے مجھے لرزتی ہوئی پلکوں سے دیکھنے لگی۔ "آپ چلے جائیے [illegible] آپ چلے جائیے۔ یہ گھر آفت زدہ ہے، یہاں کی ہوا خراب ہے، یہ گھر بہت خراب ہے اور آپ کے لیے نہیں ہے۔ آپ چلے جائیے۔"

"میرے لیے۔" میری آواز بھاری ہوگئی۔ "یہاں آپ اور آپ کی ممی [illegible] تو رہتی ہیں۔ پڑوس کے فلیٹ میں بھی لوگ رہتے ہیں اور آپ کو کیا [illegible] معلوم کہ میں کس گھر میں رہتا تھا۔" میں نے سوچا، میں اُسے جیل کا حال بتا دوں۔ [illegible] مجھے تو کرشنا جی اپنے پاس لے آئے تھے ورنہ میرے پاس تو سر کے [illegible] اوپر چھت نہیں ہے۔ آپ یہ خراب اور اچھے کی بات کیا لے بیٹھیں۔"

اُس کی آنکھیں بجھنے اور چمکنے لگیں، شاید اُسے میری بات کا یقین نہیں [illegible] آیا تھا۔ "آپ..... آپ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ اندر دروازے سے ایک لمبی [illegible] دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت برآمد ہوئی۔ اُس نے آہستگی سے چائے کا سامان میز پر [illegible] رکھا۔ میں نے اُٹھ کے اُسے سلام کیا۔ اُس نے مجھے انگریزی میں دعائیں دیں [illegible] پھر جلد ہی اُردو میں بات کرنے لگی۔ چائے کے دوران میں وہ اپنے شوہر کا [illegible] حال بیان کرتی رہی۔ وہ ایک خوش گفتار اور سنجیدہ عورت تھی۔ میں وہاں [illegible] زیادہ دیر نہیں رُکا۔ میں نے جولین سے اصرار کیا کہ وہ کچھ دنوں تک مجھے [illegible] پڑھانے نہ آئے۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چلتے وقت اُس نے مسکرا [illegible] کے مجھ سے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ کرشنا جی اور چمپا دیدی کو میرا سلام [illegible] کہیے گا۔" میں زینے پر اُترتے اُترتے رُک گیا۔ وہ بھی لکڑی کے جنگلے پر جھک کر [illegible] گئی۔ "کیا... کیا آپ کچھ بھول گئے ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "مس جولین! آپ کو کوئی بھی پریشانی ہو تو جھجکیے گا نہیں، مجھ سے ضرور کہیے گا۔ آپ نہیں کہیں گی تو میرے دل پر بوجھ رہے گا۔" میں نے اُسے مڑ کے نہیں دیکھا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

رات کو میری آنکھیں کھلی رہیں۔ راج کرشنا نے سیر کے لیے پوچھا مگر میں نے منع کر دیا۔ مس جولین کے فلیٹ میں بسی ہوئی دواؤں کی بُو رات بھر میرے دماغ پر چھائی رہی۔ اسی طرح صبح ہوگئی۔ راج کرشنا دفتر چلا گیا اور چمپا گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ اب وہ اپنے کام میں گم رہتی تھی۔ تمام ملازم اُس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ اُس نے وعدے کے مطابق اپنی زبان پر تالا ڈال لیا تھا۔ راج کرشنا نے اُس سے یا مجھ سے اُس کے ماضی کے متعلق کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اُس کے ساتھ اس طرح پیش آتا تھا جیسے دونوں برسوں کے شناسا ہوں اور جیسے چمپا اُس کی بہن ہو یا ماں ہو۔ وہ ہر وقت اُس کا مزاج پوچھتا رہتا تھا اور چمپا نیچی نظروں سے جی اور اچھا کہتی رہتی تھی۔ وہ میرے کپڑے نکال کے دیتی، دن میں کئی بار مجھے کبھی لیموں کا شربت، کبھی بادام کا اور کبھی گرم دودھ پلاتی تھی۔ چمپا نے مجھ سے جانماز منگوا کے نماز بھی شروع کر دی تھی۔ وہ سب سے پہلے جاگ جاتی اور جب ہم لوگ اُٹھتے تو ہمیں مصلے پر بیٹھی ہوئی ملتی۔ صرف چند دنوں میں چمپا کا چہرہ بدل گیا تھا۔ وہ باہر بہت کم نکلتی تھی۔ بس ایک یا دو بار ڈرائیور کے ہمراہ گھر کی چند چیزیں خریدنے گئی تھی۔

صبح ہوئی، دوپہر ہوئی۔ میں بنگلے کے مختلف کمروں میں گھومتا رہا، اخبار پڑھتا رہا یا راج کرشنا کی کتابیں اُلٹ پلٹ کرتا رہا۔ جولین کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں بار بار گھڑی دیکھنے لگا حالانکہ آج مجھے اُس کے آنے کی اُمید نہیں تھی کیونکہ میں خود اُسے منع کر آیا تھا مگر جولین عین وقت پر مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ بہت تازہ نظر آ رہی تھی، اپنے اُسی نکھرے ہوئے لباس میں۔ "آپ پھر آ گئیں؟" میں نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔

"ڈیڈی کی طبیعت رات سے کچھ بہتر ہوگئی ہے۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "اُنھوں نے آنکھیں کھولیں اور بات بھی کی۔ میں اطمینان کر کے آئی ہوں۔ آئیے، اپنا کام شروع کریں۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ کا حرج ہوگا۔"

چمپا سے چند باتیں کر کے وہ کمرے میں آ گئی اور کتابیں کھول کے بیٹھ گئی، پھر رُک رُک کے کہنے لگی۔ "کل آپ کے جانے کے بعد ممی کُڑھتی رہیں کہ وہ آپ کی کچھ خاطر نہیں کر سکیں۔ آپ ممی کو بہت پسند آئے۔"

"مجھے بھی وہ بہت اچھی لگیں۔"

"اور میں آپ کو دیکھ کے بہت حیران ہوئی تھی۔ دیر تک تو مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ آپ آئے ہیں یا آپ آ سکتے ہیں۔ پھر بعد میں مجھے یہ

احساس ہوا کہ آپ کو میری کوئی بات گراں نہ گزری ہو؟"

"یہ احساس مجھے بھی رہا۔ ویسے بھی میں اطلاع کے بغیر پہنچ گیا تھا۔ ایسے موقعوں پہ بات کس طرح کی جاتی ہے یہ بھی مجھے نہیں معلوم تھا۔"

"آپ نے بہت عجیب باتیں کیں۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "میں تمام وقت یہی سوچتی رہی کہ آپ کی باتوں میں کوئی ایسی بات کیوں ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے شاید آپ کو بتایا ہو کرشنا جی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ سے آپ کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں اور میں اس ہدایت پر پوری طرح کاربند ہوں مگر کیا آپ خود کچھ نہیں بتائیں گے؟"

"کیا بتاؤں۔" میں نے اضطراری آواز میں کہا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو کچھ بھی۔"

"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر رہنے دیجیے کسی اور وقت سہی، یہ بتائیے کہ آپ نے کام کتنا کیا؟ کل کی غیر حاضری کا مجھے افسوس ہے بہرحال ہم کل کی کسر آج پوری کر لیں گے۔"

"آج پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اچھا!" اُس نے تعجب سے کہا۔ "مگر کیوں؟"

"بس آپ باتیں کیجیے۔"

اُس کی پتلیاں پارہ بن گئیں۔ "کیا باتیں کریں؟" وہ کچھ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی مگر فوراً اُس کی آواز پُرسکون ہو گئی۔ "آئیے میں آپ کو بڑے لوگوں کے اقوال سناؤں، یہ اقوال زندگی میں بہت کام آتے ہیں۔"

"خاک کام آتے ہیں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔ آپ ہی بتائیے، کیا آپ کے ڈیڈی کسی قول سے ٹھیک ہو جائیں گے؟"

"ہاں۔" وہ آہ بھر کے بولی۔

وہ اچھی خاصی آئی تھی مگر میری باتوں سے اُداس ہو گئی اور پڑھانا لکھانا بھول گئی، کہیں کھو سی گئی، ساڑی کا پلّو اُس کے کندھے سے ڈھلک گیا لیکن اُسے خیال ہی نہیں رہا۔ مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے اُسے خوش کرنے کے لیے کہا۔ "مس! آپ نے کرشنا جی کے ریکارڈ سُنے ہیں؟ آئیے، میں آپ کو سُنواؤں۔"

وہ ہچکچائی مگر میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے اُٹھا لیا۔ "آئیے مس!"

"سنیے۔ آپ مجھے مس نہ کہا کیجیے۔" اُس نے کرب سے کہا۔

"کیوں مس؟" میری زبان سے نکل گیا۔ "پھر کیا کہوں؟"

"جولین کہا کیجیے۔ گھر میں سب مجھے جولین کہتے ہیں۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ راج کرشنا نے میرے کمرے میں گراموفون اور ریکارڈ رکھ دیے تھے مگر میں نے گراموفون کبھی نہیں بجایا تھا جب وہ آتا تھا تو خود کوئی نہ کوئی ریکارڈ لگا دیتا تھا۔ اُسے صرف دھنوں کا شوق تھا۔ ہلکی مدھم دھنیں جیسے چشمہ بہتا ہو۔ میں نے گراموفون پر اُس کا پسندیدہ ریکارڈ رکھ دیا۔ کمرے میں موسیقی گھُل گئی۔ پھر جولین خود ریکارڈ منتخب کر کے سننے لگی۔ اس طرح اُس کی طبیعت کچھ بہل گئی۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے چاہا اُسے اور روکوں مگر شام ہو رہی تھی، راج کرشنا ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ اُس کی موٹر ہوتی تو میں ڈرائیور سے کہہ کے جولین کو اُس کے گھر پہنچوا دیتا۔ گیٹ سے باہر میں نے دبے لہجے میں کہا۔ "میں چلوں آپ کے ساتھ؟"

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ روز ہی جاتی ہوں؟"

"میں چلتا ہوں۔" میں نے ضد کی۔

"واپسی میں رات ہو جائے گی۔"

"تو کیا ہوا، میں آ جاؤں گا۔"

وہ منع کرتی رہی مگر میں اُس کے ساتھ ساتھ بس اسٹینڈ تک گیا۔ ہم دونوں ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ بس نے ہمیں اُس کے گھر کے قریب اُتار دیا۔ آگے جانے سے پہلے میں نے اُسے ایک جگہ روک لیا۔ سامنے پھل والے کی دکان تھی، میری جیب میں راج کرشنا روز کچھ روپے ڈال دیتا تھا۔ میں نے بہت سے پھل خریدے۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ آپ کے ڈیڈی کے لیے ہیں، میری طرف سے۔"

"اوہ نہیں، یہ بہت زیادتی ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"کیوں؟ کیا میں انھیں کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا؟"

وہ کسمسا کے چپ ہو گئی۔ میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر پہنچا۔ اُس کے باپ کی طبیعت میں کوئی فرق نظر نہیں آیا، مس جولین سے جھوٹ بولا تھا۔ میں چند منٹ بیٹھ کے واپس آ گیا۔

جولین کے باپ کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا مگر وہ پڑھانے آتی رہی اور میں روز اُس کے ساتھ اُس کے گھر جاتا رہا اور ایک ڈاکٹر کو بھی لے گیا۔ ڈاکٹر نے کوئی خاص اُمید ظاہر نہیں کی، چند دوائیں لکھ کے دے دیں، میں نے نسخہ جولین کو نہیں دیا بلکہ خود دوائیں خرید کر لایا مگر بوڑھے نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اُس کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ میں چونکہ جولین کے ساتھ روز شام کو وہاں جانے لگا تھا اس لیے گلی کے آدمی ہماری جانب نگاہیں اُٹھانے لگے تھے، ہمارے گزرتے وقت اُن کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ اُبھر آتی تھی۔ میں نے اُن کی پروا نہیں کی۔ ہوٹل پر لڑکے ہمیشہ آگے کی طرف بیٹھے رہتے تھے، انھوں نے سیٹیاں بجانا شروع کر دی تھیں۔ پھر کھانس کھنکار ہونے لگی، ایک دوسرے سے اشارے ہونے لگے، جولین بھی یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور سہم جاتی تھی۔ آخر ایک روز اُس نے مجھ سے کہہ ہی دیا کہ "یہ بہت بُرے لوگ ہیں، بہتر ہے کہ آپ نہ آیا کریں۔ ان کی یہی عادت ہے۔"

"ہونے دیجیے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"مگر مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔"

"اُن کی طرف توجہ ہی مت دیا کیجیے۔"

"مگر آپ کو پتہ نہیں ہے اُن سے پورا محلہ نالاں ہے، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، ہمیں احتیاط رکھنی چاہیے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتی ہوں یہ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔"

"ایسے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں، ان کا بس ایک ہی علاج ہے کہ ان کی طرف دیکھا ہی نہ جائے۔ نظر چُرانا بھی توجہ دینا ہے یا پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی جائیں۔"

"یہ ہمیشہ چاقو رکھتے ہیں اور محلّے میں آئے دن لڑتے رہتے ہیں۔"

جولین روز صبح ایک اسکول میں پڑھانے جاتی تھی اور سہ پہر کو مجھے پڑھانے آتی تھی پھر شام کو تھکی ہاری گھر پہنچتی تھی۔ میں نے راج کرشنا کی نظر میں اُس کی وقعت بڑھانے کے لیے انگریزی کی پہلی کتاب صرف پندرہ دن میں ختم کر لی۔ راج کرشنا نے خوش ہو کے اُسے کافی کا ایک سیٹ پیش کیا۔ یہ گیارھویں یا بارھویں روز کی بات تھی۔ مجھے اُس کے ساتھ جاتے ہوئے گیارہ بارہ ہی دن ہوئے ہوں گے۔ گیارھویں بارھویں دن حسبِ معمول شام کو میں اُس کے ہمراہ جانے کے لیے بس اسٹینڈ پر گیا تو اُس نے مجھے بس میں نہیں بیٹھنے دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے خوف زدہ لہجے میں بتایا کہ صبح اسکول جاتے ہوئے لڑکوں نے مجھ پہ جملے کسے تھے کہ شام کو آپ میرے ساتھ اُس علاقے میں نہ آئیں ورنہ بُرا ہو گا۔ انھوں نے اور بھی بہت گندی گندی باتیں کی تھیں۔ بس آئی تو وہ مجھے چھوڑ کے جلدی سے چڑھنے لگی مگر میں نے اُس کی بات نہیں مانی۔ میں بھی بس میں سوار ہو گیا۔ وہ راستے بھر واپس ہونے کے لیے میری منت کرتی رہی اور سہمی رہی۔ میں نے اُسے ہمت دلائی کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ اگر آج نہ گیا تو پھر کبھی اُس کے گھر نہیں آ سکوں گا۔

بس سے اُترنے کے بعد میں نے پھل خریدے۔ پھلوں کا ایک تھیلا اُس نے سنبھال لیا، ایک میں نے، پھر ہم گلی میں داخل ہو گئے۔

نکڑ کے ہوٹل پر لڑکے شاید ہمارے انتظار میں تھے۔ ایک دم سیٹیاں بجنے لگیں۔ "اوئے نڈے!" ایک لڑکے نے آواز بلند کی۔ "چھوکری بُرجھوکرے کے ساتھ آ رہی ہے۔"

"سالا صبح اپن نے کیا بوم مارا تھا کہ اب ایدر یار نہیں آئیں گا۔" ہوٹل کے سامنے ایک صحت مند لڑکا تیزی سے باہر نکلا۔ "ماسٹر! سالا ایدر اپن کی نگری میں کیا سب لوگ مر گیا ہے؟ سب نامرد ہو گیا ہے؟" ایک اور اُسی لہجے میں بولا۔

جولین نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "چلو چلو، ان کی بات مت سنو، سیدھے چلو۔" میں نے جھٹکا دے کے اُس سے اپنا بازو چھڑایا اور وہیں جم کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے پھلوں کا تھیلا جولین کے سپرد کیا اور اُن پانچوں لڑکوں کو گھورنے لگا۔

"ماسٹر! دیکھتا ہے؟" ایک لڑکے نے ہنس کے کہا۔ "سالا آنکھیں دکھاتا ہے، ابھی بہت ہو گیا ماسٹر! اسٹارٹ ایک دم اوپننگ۔"

ماسٹر ہوٹل سے اُتر کے گلی میں آ گیا، اُس کے پیچھے پیچھے باقی لڑکے بھی کسل مندی سے اُترے۔ راہ گیر یہ منظر دیکھتے ہوئے چپ چاپ گزر گئے۔ جولین نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں کہتی ہوں یہاں سے چلو۔" اُس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

"ابھی یہ ایدر سے نئیں جائیں گا۔ اپن نے تم کو پہلے ایڈوائز کر دیا تھا کہ ہم ایدر اس کو گلی میں دُور دُور تک دیکھنا نہیں مانگتا۔ سالا تمھارے لیے ایدر چھوکرا لوگ کی کمی ہے؟ اپن کے جوڑی میں کیا ڈیفیکٹ ہے؟ ایک دم پرفیکٹ ہے۔ کوئن! اپن ایک چانس اور دے گا۔ اس کو بولو، ابھی فنش ہو جائے۔" وہ براہِ راست جولین سے مخاطب ہوا۔ جولین اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرا شانہ کھینچنے لگی۔

"تم چپ ہونے کا کیا لے گا؟" میں نے تحمل سے کہا۔

"تم سالا کیا دیں گا بیٹی! یہ کیا بوم مارتا ہے۔"

"ماسٹر چھوکری کے سامنے تگڑم کرتا ہے۔ سالا کو پانی کر دو۔"

"ماسٹر! ابھی سچ بتا دو کہ ایدر کا لوگ بھی سالا دل رکھتا ہے۔ کوئن کو نٹری کا گنگ ہی لے جائیں گا۔"

"کوئن! تم نے بولا نہیں اپن کون ہے؟"

"بولا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس نے ہمیں بولا کہ تم کون ہے۔ تم بالکل جانور ہے اور جب تک تمھاری زبان نہیں کاٹی جائے گی تمھیں آدمیوں میں رہنے کی تمیز نہیں آئے گی۔ میں ادھر روز آؤں گا، تم سب سن لو، تم نے اگر آیندہ مس جولین کو کچھ کہا یا ادھر گلی سے گزرتے ہوئے ہمارے کان میں تمھاری کوئی آواز پڑی تو تم سب یہاں نظر نہیں آؤ گے، سمجھا؟ جا کے سیدھی طرح ہوٹل میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنی آواز پُرسکون ہی رکھی۔

اُن سب نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر اچانک اُن کے منہ سے ایسی ہنسی پھوٹ پڑی جیسے ٹائر پھٹ جائے۔ "یہ ماسٹر! چھوکرا تھوڑا بہت جان رکھتا ہے۔ اپن کی کوئن نے ایلسیشن کے گلے میں پٹا باندھا ہے۔ بھونکتا ٹیون میں ہے۔"

"او سا اپن سالا جو ایدر بلڈاگ پڑا ہے۔" ماسٹر تیور سے بولا۔ "اے چھوکرا! ایدر تم نیا نیا ہے، ایدر تم جانتا نئیں کیا ہوتا ہے۔ اپن بولتا ہے فنش ہو جاؤ۔ کوئن۔" وہ دونوں ہاتھ جھٹک کے گرجا۔ "اپن کا کوئن باہر نئیں جائیں گا۔"

جولین نے مجھے دھکا دے کے بھاگ جانے کی تلقین کی مگر میں نے گلی میں جولین کے مکان کی جانب عمداً قدم بڑھائے۔ میری توقع کے مطابق ماسٹر نے میرے گریبان پر جھپٹا مارنے کے انداز میں ہاتھ ڈال دیا۔ "ادھر کا راستہ بند ہے۔" وہ میرا راستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ "ایدر جاؤ، ادھر سے جونی جا سکتا ہے۔ کوئن! ماننڈ چینج کر دو۔ اپن ایدر تمھارے لیے نئیں ہے۔"

بٹ جوفی از نمبرون۔ اِف یو۔۔۔“
میں نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی، جس ہاتھ سے اُس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا، میں نے اُس پر ترچھے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ ماسٹر کا ہاتھ نیچے جھول گیا۔ میں کئی دن سے انھیں دیکھ رہا تھا اور اس لیے اُلجھنے سے گریزاں تھا کیونکہ وہ مجھے زیادہ ضرر رساں نظر نہیں آتے تھے۔ وہ شہدے تھے، اُچکے۔ ماسٹر کی گردن پر جب دوسرا ہاتھ پڑا تو وہ نیچے بیٹھ گیا۔
”کیوں ماسٹر!“ میں نے ہاتھ روک لیا، ”یہ ٹھیک ہے؟“
اس سے پہلے کہ ماسٹر جواب دیتا، اُن میں سے ایک نے دائیں جانب سے میرے شانے کو دھکا دیا۔ اُس کا نام پتّی تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ماسٹر کے زیر ہونے کے بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے اس لیے اس سے پیشتر کہ پتّی کے ساتھ کوئی دوسرا مجھ پر لپکے اور خواہ مخواہ معاملہ مزید اُلجھے، میں نے مشتعل انداز میں اُلٹے ہاتھ سے ایک سوچی سمجھی ضرب لگائی۔ پتّی ہوٹل کے چبوترے سے جا ٹکرایا۔ اُس کا ماتھا کھل گیا۔ یہ سب چشم زدن میں ہو گیا۔ اس طرح باقی تین سورماؤں کو سوچنے کا موقع مل گیا۔ میں نے دانستہ اُن کی طرف دعوتی نگاہ سے دیکھا۔ اُدھر ماسٹر نے چاقو نکال لیا تھا۔ جولین بے تحاشا چیخنے لگی۔ ”نو، نو۔“ اُس نے ماسٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ماسٹر نے اُسے دُور دھکیل دیا اور چاقو ہاتھ میں لیے ہوئے میرے سامنے ناچنے لگا جب کہ میں ایک جگہ جما کھڑا تھا لیکن میری آنکھیں جمی ہوئی نہیں تھیں، ماسٹر کے ہاتھ میں چاقو کی گرفت اور اس کا انداز دیکھ کے مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ میں نے آواز لگائی۔ ”جولی! پیچھے ہٹو۔“ ماسٹر نے غیر اختیاری طور پر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا چاقو والا ہاتھ میرے قبضے میں تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ ماسٹر کی آنکھیں پھٹ گئیں، دوسری ضرب پر چاقو پر اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور تیسری ضرب پر وہ نیچے گر گیا، فرش پر گرتے ہی میں نے اُلٹے ہاتھ سے چاقو اُٹھا لیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں آتے ہی اُس کے ساتھی دُور ہو گئے۔ وہ ماسٹر کا انجام دیکھنے کے لیے پہلے ہی سے تکے کھڑے تھے اور پتّی کے انجام سے محتاط ہو گئے تھے۔ میں نے پھل کالہراتے ہوئے اُن سب پر نظر ڈالی اور آہستہ سے اُسے بند کر کے ماسٹر کی طرف اُچھال دیا۔ ماسٹر سکتے میں پڑ گیا۔ میں نے جولین کے ہاتھ سے تھیلا لیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھ گیا۔ ابھی میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ میں جولین کا بازو زور سے پکڑے ہوئے اچانک پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ اُچکّے ماسٹر سے ایسا اوچھا پن بعید نہیں ہے۔ میرے کان اور آنکھیں پیچھے کی طرف لگی ہوئی تھیں جیسے ہی ماسٹر کے چاقو کھولنے کی آہٹ اور اُس کے اُٹھنے کی سرسراہٹ ہوئی، میں اُس کے نشانے سے ہٹ گیا۔ ماسٹر غضب میں آگے نکل گیا۔ میں نے جولین کو چھوڑ کے اُس کی پشت پر جست لگائی۔ ماسٹر چند ثانیے بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ میں نے اتنی شدت سے مروڑا کہ اُس کی دردناک کراہیں گلی میں ہر سمت گونجنے لگیں۔ چاقو گرنے کے بعد بھی میں نے اُسے چھوڑا نہیں۔ مجھ سے مَنْبنی ضربیں لگ سکتی تھیں، میں نے اُس پر لگائیں اور جتنی وہ برداشت کر سکتا تھا، اُس نے برداشت کیں۔ میں اُسے بالوں، بازوؤں اور گدّی سے پکڑ پکڑ کے اُٹھاتا اور فرش پر پھینکتا رہا۔ اُس کا جسم جگہ جگہ سے کھل گیا۔ درمیان میں اُس کے ایک ساتھی نے پیچھے سے اچک کے میری گردن میں ہاتھ ڈالا اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے اٹھا کے پُلّوٹ دیا۔ پھر اُس کا کوئی ساتھی نہیں پلٹا۔ یا تو وہ کہیں چھپ گئے ہوں گے یا دوسروں کو خبر کرنے کے لیے دوڑ پڑے ہوں گے۔ جولین نے میرے بازو سے لپٹ کے مجھے روک لیا۔ ماسٹر زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے جولین کی منت پر اُسے دوبارہ نہیں اُٹھایا۔ ماسٹر کا چاقو اُس کے پاس ہی زمین پر پڑا تھا مگر اُس میں اُسے اُٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ گلی میں سناٹا طاری تھا، کھڑکیوں اور بالکونیوں میں کھڑے ہوئے لوگ، عورتیں اور مرد اب گلی میں نکل آئے تھے۔ میں جولین کو لے کے اُس کے گھر کی جانب چلنے لگا۔ فلیٹ پر پہنچ کے میں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

♥

یہ معاملہ شروع ہونے سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بات اتنی آگے بڑھ جائے گی۔ وہ ایک تنگ گلی تھی، اُس کے نکڑ سے ذرا اندر ہوٹل تھا، گلی آڑی کاٹ کے دوسری گلی سے مل جاتی تھی، میں محلِ وقوع کا جائزہ لے کے ہوٹل سے چند قدم اِدھر اندر کو گلی میں کھسک آیا تھا اور میری خواہش تھی کہ سب سے پہلے ماسٹر آگے بڑھے تاکہ فیصلہ فوراً ہو جائے، اسی لیے میں نے ماسٹر کو کسا تھا۔ میری خواہش کے مطابق ماسٹر ہی نے پہل کی مگر اُسے پہلے ہی مرحلے پر خاموش ہو جانا چاہیے تھا۔ شہدے عام طور پر اُسی وقت علاقے کے مکینوں کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں جب انھیں اپنی طاقت پر اعتماد ہو، بصورتِ دیگر معاملہ ٹال جاتے ہیں۔ میں نے ماسٹر کو یہ موقع دیا تھا مگر اُس نے توجہ نہیں دی۔ یہ اُس کی گلی تھی اور یہاں کے مکین اس منظر کے گواہ تھے، اُسے کچھ خیال تو کرنا چاہیے تھا مگر خیال تو اُسے ہوتا جسے کسی نے یہ باتیں ذہن میں رکھنے کی تربیت دی ہوتی۔ اُسے تو چاقو پکڑنا تک نہیں آتا تھا۔ نتیجتاً جس بات سے میں بچنا چاہتا تھا، وہی ہوئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ لوگ فضول حجت کریں گے۔ ماسٹر کے بعد پتّی کا آنا اور پتّی کے بعد ایک دوسرے شخص کا میری گردن میں ہاتھ ڈالنا بہت چھچھورے پن کی بات تھی۔ بٹھل ہوتا تو مجھ پر بہت ناراض ہوتا کہ اس موقع پر تیرا ہاتھ اُٹھا ہی کیوں؟ تیری بات ہی نے انھیں کیوں نہ روکے رکھا مگر میں نے انھیں باز رکھنے کی پوری کوشش کی تھی، اُن کی سمجھ میں نہیں پڑی تو میں کیا کرتا۔
جولین بہت حواس باختہ تھی، اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ مجھے اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اب وہ بالکل مطمئن رہے، اطمینان سے گلی میں نکلا کرے، اب کسی جانب سے کوئی

... آوازہ اُس کے کان زخمی نہیں کرے گا مگر جولین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی ... تھیں۔ وہ مجھے کمرے میں بٹھا کے دوسرے کمرے میں چلی گئی، شاید اُسے ... کی ضرورت تھی۔ اُس کی ماں نے مجھے سنگترے کا عرق پلایا اور آگے دن ... کے غنڈوں کے کرتوت سنانے لگی۔ جولین جب کمرے میں آئی تو اُس کے ... چہرے پر پہلے جیسا اضطراب نہیں تھا۔ میں نے اُس کی طرف سے مطمئن ہو کے ... جانا چاہا لیکن جولین نے مجھے روک لیا۔ اُس کی آنکھیں ہانپ رہی تھیں، ... نتھنے پھڑک رہے تھے اور نچلا ہونٹ کبھی اُبھر آتا تھا، کبھی چھپ جاتا تھا، گال ... دھوپ چھاؤں سے تھے۔ سُرخ اور سفید رنگ جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ ”آپ ابھی ... سوچ رہی ہیں؟“ میں نے مسکرا کے کہا۔
”میں سوچ رہی ہوں یہ میں نے کیا دیکھا تھا؟“ وہ سراسیمگی سے بولی۔
”بھول جائیے جیسے۔۔۔۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔“
”اور اگر۔۔۔ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا؟“
”تو کیا ہوتا! میرا رونے والا کون ہے۔“
اُسی لمحے جولین کی ممی دہشت زدہ انداز سے کمرے میں داخل ہوئی ... اُس نے گلی میں پولیس کی آمد کی خبر سنائی۔ یہ بالکل غیر متوقع خبر تھی۔ میرا ماتھا ... ٹھنکا اور میں نے کرسی چھوڑ دی۔ جولین نے مجھے روکا اور خود بالکونی سے ... جھانک کے دیکھا۔ وہ بدحواسی سے واپس آئی۔ ”نیچے پولیس موجود ہے۔“
”مجھے نیچے جا کے دیکھنا چاہیے۔“
”نہیں نہیں، ابھی ٹھیریے۔ کرشنا جی آتے ہی ہوں گے۔“
”کرشنا جی؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔
”ہاں۔“ اُس نے کہا۔ ”مجھے اندیشہ تھا کہ بات اور نہ بگڑ جائے۔ آپ کو ... واپس اُسی راستے سے گزرنا ہے۔ آپ نے دیکھ ہی لیا، پولیس آگئی۔ ابھی کچھ دیر ... پہلے میں نے نچلے مالے کی ایک لڑکی مارتھا سے کہا تھا کہ وہ کہیں سے فون پر ... کرشنا جی کو مطلع کر دے۔ بس وہ آ رہی رہے ہوں گے۔“
”اوہ! آپ نے یہ کیا کیا؟“ میں نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔
دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ جولین نے مجھے منع کیا۔ ... اُس نے آگے بڑھ کے کُنڈی کھول دی۔ ایک انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ ... وہاں موجود تھا۔ ”مس جولین کا فلیٹ یہی ہے؟“ اُس نے نیم گرم نیم نرم لہجے ... میں پوچھا۔
میں نے اثبات میں سر ہلایا اور درشتی سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“
انسپکٹر نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ اُسے شاید میرا لہجہ ناگوار گزرا ... تھا، پھر یکایک زینے میں کھلبلی سی مچی، انسپکٹر نے پیچھے مُڑ کے دیکھا اور اکڑ ... کے کھڑا ہو گیا۔ راج کرشنا کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اُس نے آتے ہی میرا ... بازو پکڑ لیا۔ ”کیا ہوا؟“ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔
میں نے کچھ نہیں کہا، بس جولین کی طرف ناراضی سے دیکھا۔ وہ راج ... کرشنا کو روداد سنانے لگی۔ انسپکٹر باہر ہی کھڑا رہا۔ جولین جب تک راج کرشنا کو روداد سناتی رہی، میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کے اُس کے ڈیڈی کو دیکھنے گیا۔ اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں بالکونی میں کھڑا ہو گیا۔ گلی میں سپاہی منتشر تھے اور دروازوں، چھتوں، بالکونیوں پر ہر طرف لوگ موجود تھے۔ پولیس سے کچھ دُور ایک بڑا ہجوم دائرہ بنائے کھڑا تھا، سب کی نظریں جولین کی بلڈنگ پر مرکوز تھیں۔ میں بالکونی میں نمودار ہوا تو سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میں وہاں سے ہٹ آیا۔ راج کرشنا جولین کو تسلی دے رہا تھا۔ نیچے اُترنے سے پہلے میں اُسے جولین کے بیمار باپ کے کمرے میں لے گیا۔ وہ اُس کی حالت دیکھ کے گُنگ رہ گیا۔
ہمارے ساتھ جولین بھی نیچے اُتری۔ سپاہیوں نے بوٹوں کی گرج کے ساتھ راج کرشنا کو سیلوٹ کیا۔ گلی میں چند لمحوں کے لیے ایسا سکوت چھا گیا تھا جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ ہر طرف پتھر کے آدمی نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر اور سپاہی مؤدبانہ راج کرشنا کے نزدیک کھڑے تھے۔ راج کرشنا نے جولین کی کمر تھپتھپائی اور انسپکٹر سے آہستہ لہجے میں کچھ کہا اور میرا ہاتھ تھام کے واپس ہونے لگا۔ گلی کے موڑ پر میں نے پلٹ کے دیکھا، جولین کا اُٹھا ہوا ہاتھ یکبارگی ہلا تھا۔ راج کرشنا نے مسکرا کے جواباً ہاتھ ہلایا۔ ہم اُس گلی میں آ گئے اور اُس ہوٹل کے پاس پہنچ گئے جہاں ماسٹر نے میرا گریبان پکڑا تھا۔ نہ جانے وہاں کے لوگوں کو کیا ہوا؟ ہمارے گزرتے وقت تالیاں بجانے لگے۔ ایک ستر اسّی سالہ خمیدہ کمر، شونڈ بونڈ بوڑھا اچانک ہمارے راستے میں مزاحم ہو گیا۔ ”ٹھیرو، ٹھیرو۔“ وہ انگریزی میں بولا۔ اُس نے میری کلائی پکڑ کے کھینچا، میں آگے جھک گیا تو اُس نے میرے بال پکڑ لیے، میں نے سر جھکا دیا۔ اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ جہاں جہاں لوگ کھڑے تھے، دوبارہ تالیاں بجانے لگے۔ پولیس کا دستہ موٹر میں بیٹھنے تک ہمارے ساتھ رہا۔
راج کرشنا کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماسٹر اور اُس کے ساتھیوں کا دوبارہ ہوٹل میں بیٹھنا اور گلی میں دندنانا ممکن ہی نہیں تھا۔ جولین نے خواہ مخواہ ایک تماشا بنا دیا۔ بہرحال اُس کی تشفّی ہو گئی اور محلے کے لوگوں کی ہمت بھی بندھی کیونکہ پولیس کا محکمہ ایسے ہی موقعوں اور ایسے ہی لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے اور کچھ نہ سہی، راج کرشنا کے سامنے جولین کا وقار ہی بڑھ گیا۔
راج کرشنا نے دوسرے دن جولین کے باپ کو سینٹی مُریم میں داخل کرا دیا۔ جب وہ مقررہ وقت پر مجھے پڑھانے آئی تو ایک بدلی ہوئی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہماری واپسی کے بعد گلی میں ہونے والے چرچے سنانے لگی۔ محلے کی عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم اُس کے گھر اُمڈ پڑا تھا جیسے ماسٹر کے ہاتھ سے چاقو اُسی نے چھینا ہو۔ باتیں کرتے وقت جولین کو خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اپنے شاگرد کے سامنے گفتگو کر رہی ہے۔ وہ سارا وقار بھول گئی تھی اور کسی الھڑ لڑکی کی طرح آنکھیں پٹ پٹا کے تیز تیز باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اُسے ٹوکا۔ ”آج آپ پڑھائیں گی نہیں؟“
وہ شرما کے دُہری ہو گئی۔ ”اوہ ہاں، میں ڈیوٹی پر ہوں۔“

"یہ کیسی بات کی آپ نے؟" میں نے تشکا یتاً کہا۔
"اچھا جی! معاف کر دیجیے، غلطی ہو گئی۔"
"کوئی استاد اپنے شاگرد سے معافی مانگتا ہے؟"
"اچھا استاد وہی ہے جو اپنی غلطی کا اقرار کرلے۔ لوگ لوگوں کو چھپا رستم کہتے ہیں، میں آپ کو کہوں گی کہ آپ چھُپے استاد ہیں اور آپ سے درخواست کروں گی کہ مجھے شاگردی میں لے لیجیے۔"
"مجھے آتا ہی کیا ہے۔"
"آپ کو"۔ وہ جھرجھری لے کے بولی۔ "آپ کو وہ آتا ہے جو کسی کو نہیں آتا۔ بتائیے آپ مجھے شاگرد بنائیں گے؟"
"کس بات کی شاگرد؟"
"کتابوں نے مجھے ڈرپوک بنا دیا ہے، آپ مجھے حوصلے کی تعلیم دیجیے۔"
"حوصلہ"۔ مجھے ہنسی آگئی۔ "لوگ تو خود مجھے بار بار حوصلے کی تلقین کرتے ہیں، احساس دلاتے ہیں کہ تم ایک مرد ہو۔"
"کون لوگ ہیں وہ؟"
"بہت سے لوگ ہیں۔"
"تعجب ہے۔"
"ہاں مجھے خود تعجب ہے۔" میں نے اُداسی سے کہا۔ "میرا خیال ہے زندہ رہنا ہی ایک حوصلہ ہے۔ حوصلہ کہیں بے غیرتی کو تو نہیں کہتے؟"
"ہاں"۔ وہ بھی افسردہ ہو گئی۔ اُس کی پلکیں سمٹ گئیں۔ کورا کی بھی یہی کیفیت ہوتی تھی، کورا۔ جولین کی پلکیں کورا کی پلکوں سے بہت مشابہ تھیں، اُنھی کی طرح گھنی اور کھنچی ہوئی۔ اب تو اور گھنی ہو گئی ہوں گی۔ میری آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ پھر جولین نے بے وقت موسیقی سننے کا اشتیاق ظاہر کر دیا۔ گو اُس نے کتاب کھول کے مجھے پڑھانا شروع کر دیا تھا لیکن آج اُس کے پڑھانے میں ہمیشہ والی روانی اور سنجیدگی نہیں تھی۔ میں نے اُس کی فرمائش پوری کر دی۔ وہ ریکارڈ سنتی رہی اور مجھے دیکھتی رہی پھر معمول کے مطابق میں اُسے پہنچانے کے لیے اُس کے گھر گیا حالانکہ اُس کے ڈیڈی سینی ٹوریم میں داخل ہو گئے تھے۔ ہوٹل سنسان پڑا تھا۔ گلی میں مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میرا استقبال کیا گیا۔ لوگ مجھے اور جولین کو ساتھ دیکھ کے اشارے کرنے لگے لیکن یہ اشارے ویسے نہیں تھے جیسے ماسٹر اور اُس کے ساتھی کرتے تھے۔

راج کرشنا نے ایک ہفتے کے اندر جولین کے لیے اپنے علاقے ہی میں ایک مختصر اور ستھرا مکان کرائے پر لے کے اُسے منتقل کر دیا۔ جولین اس پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ اِس کی صورت راج کرشنا نے یہ نکالی کہ اپنے اثر سے جولین کی موجودہ ملازمت چھُڑوا کے اُسے انگریزوں کے اسکول میں ملازمت دلوا دی، جہاں سینئر کیمبرج تک تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں پہلے سے دُگنی تنخواہ تھی۔ جولین قریب آگئی تو اُس نے میری پڑھائی کے لیے زیادہ وقت دینا شروع کر دیا۔ ہم جب سیر کے لیے جاتے تو جولین کو ساتھ لے لیتے۔ چمپا کی اُس سے بہت گھٹتی تھی۔ سینی ٹوریم میں اُس کے باپ کی حالت نسبتاً بہتر ہو گئی تھی۔

لیکن وہ نہیں ملی جس کی مجھے تلاش تھی۔ جب میری طبیعت بہت گھبراتی تو میں سڑکوں پر نکل جاتا اور ایک ایک چہرہ گھور کے دیکھتا رہتا اور ایک ایک آدمی کا جائزہ لیتا رہتا۔ میں گھنٹوں کسی چوراہے پر کھڑا رہتا اور راہ گیروں کی شکلیں تکتا رہتا۔ کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ ہر آدمی کا چہرہ مختلف تھا۔ نہ مولوی صاحب جیسی شکل کا کوئی آدمی ملا، نہ کورا جیسی شکل کی کوئی لڑکی دکھائی دی۔ نہ ابا جان نظر آئے، نہ گھر کا کوئی دوسرا فرد۔ رات کو کمرے میں بند ہو کے میں اپنی مالا کے دانے چہرے پر بکھیر لیتا تھا۔ اس سے بہت بے قراری ہوتی تھی مگر یہ بے قراری ہی تو میرا سکون تھی۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میں نے کورا کو ایک خط لکھ دیا ہے اور بس اب اُس کا جواب آتا ہی ہوگا۔ مالا کے دانے میری آنکھوں سے مَس ہوتے تو مجھ پر غنودگی طاری ہو جاتی۔

راج کرشنا کی مصروفیت بڑھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ رات گئے گھر واپس آتا۔ چمپا اُس کا انتظار کرتی رہتی۔ جب تک وہ نہ آجاتا ہم دونوں میں سے کوئی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ وہ آکے ہمیں ڈانٹتا تھا۔ راج کرشنا کے تبادلے کی بہت سی کوششیں ہوئیں مگر کوئی کوشش بار آور نہیں ہوئی کیونکہ مرکزی حکومت نے اُسے بمبئی شہر کی ناگفتہ بہ صورتِ حال کے سدِباب کے لیے خاص طور پر یہاں بھیجا تھا۔ مستانہ کے کئی آدمی ایک ڈیڑھ مہینے کی جیل کے بعد چھوٹ گئے تھے۔ اُن کا تعلق اندرونی گروہ سے نہیں تھا۔ مستانہ کا مقدمہ چل رہا تھا اور شہر کے رئیسوں کے مقدمات بند کمروں میں جاری تھے۔ اخبارات راج کرشنا کے ساتھ تھے۔ وہ جہاں جاتا اُسے عزت دی جاتی، لوگ اُس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے۔ پولیس کے پُرانے اعلا حکام اُس کے اچانک فیصلوں سے خاصے ناراض ہوتے تھے مگر جب اُن پر عمل درآمد کے بعد کامیابی ہو جاتی تو راج کرشنا کو مبارک باد دینے کے لیے گھر آتے تھے۔ بعض اہم چھاپوں اور کارروائیوں میں راج کرشنا بذاتِ خود شریک ہوتا تھا، وہ ایک بے باک اور صاف گو شخص تھا۔ چمپا کی وجہ سے گھر پر ہونے والی میٹنگوں میں کمی ہو گئی تھی لیکن پولیس افسر اُس سے مشورے کرنے کے لیے روز آتے تھے۔

مجھے اُس کے ساتھ رہتے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ اِن چار مہینوں میں کئی بار میں نے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا مگر راج کرشنا کے خیال سے میرے قدم خود بخود مجھے اُس کے گھر واپس لے گئے۔ میں نے اُسے زیادہ پریشان نہیں کیا یا ایسا تھا کہ وہ میری پریشانی کا عادی ہو گیا تھا۔ کئی مرتبہ میرے جی میں آئی کہ میں زرین کو اپنی خیریت کا خط لکھ دوں، وہ مطمئن ہو جائے گی کہ میں زندہ ہوں، بھٹّل کو بھی قرار آجائے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک بے پتہ خط لکھوں گا مگر میں نے کوئی خط نہیں لکھا کیونکہ اس طرح وہ اور پریشان ہو سکتی تھی۔ راج کرشنا کہتا تھا کہ زندگی میں مایوسی زندگی کی عملی موت ہے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ تو میں ہوں ہی نہیں، یہ تو کوئی اور شخص ہے جو راج کرشنا کے پاس رہتا ہے، اِسے دُنیا کا کوئی کام نہیں ہے۔ اگر راج کرشنا اس شخص

سے خوش ہوتا ہے تو میرا کیا حرج ہے۔ مجھے اور کہاں جانا ہے؟ کس کے پاس جاؤں گا؟ ہر جگہ یکساں ہے۔ کسی بھی جگہ چلا جاؤں، وہاں کورا تو نہیں ہوگی۔

زرین کئی بار گھر آئی اور دیر تک بیٹھی رہی۔ اُس نے مجھے رقص سکھانے کی کوشش بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر ایک دن ہم اُس کے گھر گئے۔ چمپا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ رستم جی نے انواع و اقسام کے تکلفات میز پر چن دیے تھے۔ ایک دن مسز روپ پٹیل نے بھی ہمیں مدعو کیا۔ اُس کا گھر کیا تھا، ایک محل تھا۔ مسز روپ نے پھر وہی ہار پہنا۔ شاید وہ مجھے چڑانا چاہتی تھی۔ مجھ سے وہاں کچھ کھایا نہیں گیا۔ میں گھر آکے دوسرے دن تک کمرے میں بند رہا۔ جولین نے مجھے بستر سے اُٹھایا۔ جولین کی آنکھوں میں ایک عجیب بات آگئی تھی۔ پہلے ایسی بات نہیں تھی۔ اب وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتی تو مجھ پر لرزہ سا طاری ہو جاتا۔ اُس کی آنکھوں پر مجھے اپنی کورا کی آنکھوں کا گمان ہوتا جیسے جولین کی آنکھیں بدل رہی ہوں۔ گھبرا کے میں نے اُس کی طرف دیکھنا ہی کم کر دیا۔

ایک دن شام کی بات ہے۔ جولین مجھے پڑھا کے واپس جا چکی تھی۔ دو باوردی پولیس افسر راج کرشنا سے ملنے کے لیے بنگلے آئے۔ میں اُن میں سے ایک کو خوب جانتا تھا۔ وہ بھی مجھے جانتا تھا۔ اُس کا نام جسونت راؤ تھا۔ میں نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کے اُن کے لیے ناشتہ پانی منگوایا اور خود ذرا دُور اُن کے سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ انگریزی میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ گفتگو کا موضوع وہی تھا، شہر کے جرائم۔ نئے پولیس افسر نے جسونت راؤ سے سرگوشی میں میرے متعلق پوچھا۔ جسونت راؤ نے انگریزی میں اُسے طنزیہ جواب دیا کہ "یہ راج کرشنا صاحب کی چیز ہے، پتہ نہیں کون شخص ہے۔ راج کرشنا اس کا بڑا خیال رکھتا ہے، مشہور ہے کہ مستانہ کیس میں اِسی نے اُس کے اڈّے میں گھس کے راج کرشنا کے لیے مخبری کی تھی۔ اس نے ایک موقع پر اُس کی جان بھی بچائی تھی۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں"۔ سب کی طرح جسونت راؤ بھی یہ سمجھتا تھا کہ میں انگریزی سے نابلد ہوں اس لیے وہ اطمینان سے بات کرتا رہا۔ وہ راج کرشنا سے ملنے آیا تھا اور اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا پھر بھی راج کرشنا کے متعلق اُس کا لہجہ بہت گستاخانہ اور طنز آمیز تھا۔ میں ضبط کرتا رہا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ دونوں راج کرشنا کو ایک پاگل پولیس افسر کا خطاب دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کسی دن اُس کے متعلق کوئی بہت بُری خبر آسکتی ہے کیونکہ مقامی پولیس کے تمام بڑے افسر اُس کی یہاں موجودگی اپنی توہین سمجھتے ہیں اور راج کرشنا نے بارہا اُن کی توہین کی بھی ہے۔ میں بُت بنا بیٹھا رہا۔ میں نے کسی طور یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اُن کی گفتگو مجھ تک منتقل ہو رہی ہے۔ اُنھیں یقین تھا کہ اگر راج کرشنا کا فوراً ہی تبادلہ نہ کیا گیا تو ہمیں جلد ہی اُس کا سوگ منانا پڑے گا۔ "شمبھو گروپ بہت ناراض ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "اور شمبھو گروپ کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ ایک حملہ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے! مجھے شبہ ہے کہ وہ راج کرشنا کو زندہ مدراس واپس جانے دیں گے۔ بمبئی کی پولیس کا ایک بڑا سرکٹ بھی سکون کی سانس لے گا۔ یہ نہ تو مدراس ہے، نہ ہندوستان کا کوئی اور شہر ہے، یہ بمبئی ہے، راج کرشنا اسے ایک معمولی شہر کی طرح برتتا ہے۔"

جسونت کا لہجہ مخاصمانہ تھا۔ اُس کے دل میں راج کرشنا کے متعلق بڑا کینہ بھرا ہوا تھا۔ بدخواہ ہی اس انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ راج کرشنا کے سامنے وہ بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ اُن کی باتیں سُن کے میرے جسم میں انگارے سے بھر گئے۔ اتنی وحشت ہوئی کہ مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس کینے کو راج کرشنا سے برطرف ضرور کراؤں گا۔ مجھے اُس کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ خاصی دیر سے آیا مگر جسونت اُس کے انتظار میں بیٹھا رہا تھا۔ راج کرشنا کے سامنے وہ گرگٹ کی طرح بدل گیا، مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کھانا بھی میں نے یونہی سرسری کھایا۔ جیسے ہی چمپا مجھے دودھ کا گلاس پلا کے اپنے کمرے میں گئی، میں نے راج کرشنا کے دروازے پر دستک دی، وہ طمنچہ تانے برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کے اُس نے طمنچہ جیب میں رکھ لیا۔ "کیا بات ہے ظہیر؟" وہ بے تابی سے بولا۔
"آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"
"آؤ، آؤ، اندر آؤ، مگر دیکھو اچھی بات کرنا۔"
"آپ بمبئی چھوڑ دیں، اپنا تبادلہ کرالیں۔"
"کیوں؟" وہ چونک کے بولا۔ "کیا تمھیں یہ شہر پسند نہیں آیا؟"
"میرے لیے ہر شہر یکساں ہے۔ میں آپ کے لیے کہہ رہا ہوں، آپ مدراس چلے جائیے یا کسی اور شہر میں تبادلہ کرا لیجیے، یہاں مت رہیے۔"
"مگر کیوں، ایسی بھی کیا بات ہے۔" وہ میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔
"میں اپنا تبادلہ کبھی خود نہیں کراتا، اوپر سے حکم آتا ہے تو میں اُسے بدلوانے کی کوشش بھی نہیں کرتا مگر تم بتاؤ تم آخر کس سبب سے یہ مشورہ دے رہے ہو۔"
"بس میری بات مان لیجیے۔"
"ضرور مانوں گا، یقیناً کوئی خطرناک قسم کا فون آگیا ہوگا۔" وہ میری بات سنجیدگی سے نہیں سُن رہا تھا۔ ہنس کے کہنے لگا۔ "پولیس کی ملازمت میں ایسی دھمکیاں اور کوششیں عام ہوتی ہیں۔"
"لیکن آپ انھیں محض دھمکیاں کہہ کے نہیں ٹال سکتے، ابھی کچھ دن ہوئے اُس دھمکی کو حقیقت میں بدلنے کے لیے پورا زور لگایا گیا تھا، آپ کو کلب کا واقعہ یاد نہیں رہا۔"
"میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا اور تم جانتے ہو میں پہلے سے خاصا محتاط ہو گیا ہوں، ضروری کاموں کے سوا باقی تمام مصروفیات میں نے تقریباً ختم کر دی ہیں ظہیر، بگڑی ہوئی چیزیں درست کرنا، اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پولیس والے اگر ان دھمکیوں سے متاثر ہونے لگے تو پولیس نے کاروبار کر لیا۔ میری زندگی کئی مرتبہ بال بال بچی ہے تو کیا مجھے پولیس کی ملازمت ترک کر دینی چاہیے؟"
"مگر میں ملازمت چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا ہوں، میں تبادلے کے لیے

کر رہا ہوں اور شہروں میں بھی بہت سے بگڑے ہوئے معاملے ہیں آپ وہاں جا کے کام کیجیے جہاں کام کی قدر ہو جہاں آستین میں سانپ نہ پلتے ہوں جہاں اپنے ہی لوگ جڑ کاٹنے کی فکر میں لگے ہوں، وہاں سے دست برداری ہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔"

"اپنے ہی لوگ!" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں وہی یہی آپ کے ساتھی۔"

"اوہ" وہ جیسے میری ساری بات سمجھ گیا ہنس کے بولا۔ "ظہیر ہر جگہ ایسا ہوتا ہے کوئی ادارہ اس برائی سے بچا ہوا نہیں ہے۔ انھی لوگوں میں کام کرنا پڑتا ہے تم نے ضرور کہیں میری برائی سن لی ہے۔"

"برائی ہوتی تو ٹھیک تھا مگر آپ سمجھ نہیں رہے ہیں کہ لوگ آپ کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتے، وہ آپ سے نفرت کرتے ہیں" میں نے جھلا کے کہا۔

"بے تُک۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے اس کا احساس ہے لیکن مجھے انھی لوگوں سے کام لینا ہے انھیں نظر انداز کر کے کام کرتے رہنا چاہیے۔"

"بہر حال میں نے بات آپ کے گوش گزار کر دی ہے۔"

"اوہ نہیں" اُس نے اپنا بازو میری گردن میں ڈال دیا۔ "میں احتیاط برتوں گا۔ کچھ ایسے ضروری کام نمٹانے ہیں کہ میری موجودی لازم ہے۔ تم آخر اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟ آخر تم نے کیا دیکھ لیا۔"

"ابھی ابھی جو لوگ آئے تھے آپ سے ملنے" میں نے جھجک کے کہا۔ "وہ آپ کے سامنے تو بہت ایرو ڈرک رہے تھے لیکن وہ آپ سے خوش نہیں ہیں، خوش کیا، وہ بہت برے لوگ ہیں، اُن میں ایک، جسونت تو بہت کینہ ہے۔"

"کیا انھوں نے تم سے کچھ کہا؟" وہ برہمی سے بولا۔

"کاش وہ مجھ سے کچھ کہہ دیتے۔"

"پھر ۔۔؟"

"وہ آپ ہی کے متعلق باتیں کرتے رہے" میں نے اُسے وہ تمام باتیں بتا دیں جو جسونت اور اس کے ساتھ آنے والے افسر کے درمیان ہوئی تھیں۔

راج کرشنا کا چہرہ بجھ گیا۔ "مگر، مگر کیا وہ یہیں یہ سب کہہ رہے تھے؟" وہ تمتماتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں!"

"تمھارے سامنے؟"

"ہاں میرے سامنے" میں نے تندی سے کہا۔ میں نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اپنی ہی بات سے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

"مگر، مگر یہ کیسے ممکن ہے!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

ایک لمحے کے لیے میرا سارا وجود سرد پڑ گیا۔ اُسے کیا بتاؤں کہوں کہ وہ بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اتنے بیوقوف تھے کہ ہمارے گھر اور ہم لوگوں کی موجودی میں تند و مد سے ہماری برائیاں کر رہے تھے وہ گویا پاگل ہو گئے تھے۔ ہر چند میں نے اُسے چمپا والی بات بتانے سے گریز کی تھی جسونت کو معلوم تھا کہ چمپا ایک طوائف ہے جسے راج کرشنا نے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ راج کرشنا کی بے احتیاطی کا یہی انجام ہونا تھا۔ میں پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ بلاواسطہ اس کا ایرانی جو کر کے ہوٹل میں چمپا کا سامان لینے کے لیے جانا مناسب نہیں ہے مگر میں نے جسونت سے سنی ہوئی باقی تمام باتیں اُسے بتا دی تھیں اور اُس کا یہ سوال کرنا بالکل جائز تھا کہ جسونت کو میری موجودی میں اس ہرزہ سرائی کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ میری زبان پتھر ہو گئی کہ میں اسے کیا بتاؤں۔ کوئی معمولی بات ہوتی تو میں کچھ بھی بہانہ کر دیتا لیکن اس کا تعلق راج کرشنا کی زندگی سے تھا، اُسے یقین آنا چاہیے تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے کانوں کا بھیانک خواب نہیں ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں اور مجھے جسونت سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے دل کڑا کیا۔ "وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔"

"انگریزی میں!" وہ سٹ پٹا کے بولا۔

"میں نے آپ سے چھپایا تھا، میں انگریزی جانتا ہوں۔"

"کیا ۔۔؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ اچھل کے بولا۔

"میں اسی لیے آپ سے کہتا تھا کہ آپ مس جولین پر پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ بس وہ باتیں کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

اُس نے مجھے دبوچ لیا۔ "ظہیر! کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں" میں نے گردن جھکا کے کہا۔

"اوہ! تم نے دو متضاد خبریں سنائی ہیں" اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "میں بتا نہیں سکتا" وہ بہکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم نے مجھے کتنا چونکایا ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں میں نے آپ سے بہت چھپایا۔"

"مجھے حیرت تھی کہ تم کتابوں کے بغیر اتنی عجیب باتیں کیسے کر لیتے ہو۔ تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"بی ایم اے کیا ہے۔"

"اور یقیناً فرسٹ کلاس لی ہو گی؟" میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ "اوہ میری جان" اُس نے کھڑے ہو کے مجھے گلے لگا لیا۔ "تم نے مجھ پہ اعتبار کیا، مجھے بتا دیا۔"

"اب آپ کچھ اور مت پوچھیے۔"

"بالکل نہیں، بالکل نہیں، میں کچھ نہیں پوچھوں گا، میں تمھیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گا، مجھے یقین ہے ایک دن تم سب کچھ مجھے بتا دو گے اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر آپ تبادلہ کرا لیجیے، میں نے اچھی باتیں نہیں سُنی ہیں۔"

"میں اپنا کام جلد سے جلد نمٹانے کی کوشش کروں گا، بے فکر رہو۔

ابھی میں کچھ اور زندہ رہوں گا، ابھی مجھے تمھارے ساتھ بہت سی سیر کرنی ہے۔"

میں اُس کی اور بہت سی باتوں سے بچنے کے لیے کمرے سے نکل آیا۔ وہ مجھے روکتا رہ گیا۔ میں نے غلطی کی تھی اس کا احساس مجھے فوراً ہی ہو گیا۔ میں نے ظہیر خاں کے نام سے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔ ڈگری بھی ابھی جیل میں پڑی تھی، راج کرشنا کے لیے ہندوستان کی گنتی کی چند یونیورسٹیوں سے یہ پتہ چلا لینا کون سا مشکل تھا کہ ظہیر خاں نامی طالب علم نے کب ایم اے کیا ہے اور جب اُسے پتہ چلتا کہ میں نے جیل سے امتحان دیا تھا اور میں قتل کے الزام میں سات سال کی سزا کاٹ رہا تھا اور مجھل نامی شخص میرا کفیل تھا مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ راج کرشنا کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے گناہ کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے اپنی مالا گلے سے اُتار کے جہرے پر ڈال لی، تب کہیں مجھے کچھ سکون ہوا۔

صبح میں اُس سے آنکھیں ملانے سے گریز کرتا رہا۔ ناشتے کی میز پر وہ بہت خوش تھا جیسے میرے امتحان کا نتیجہ آج ہی نکلا ہے۔ وہ انگریزی میں مجھے یقین دلا رہا تھا کہ وہ آج سے اپنی رپورٹ تیار کرنے میں زیادہ وقت صرف کرے گا۔ "میں ایک لمبی چھٹی کی درخواست دوں گا اور ہم گھومتے رہیں گے۔" چمپا بھی حیران تھی کہ آج وہ مجھ سے دوسری زبان میں کیوں مخاطب ہے۔ میں کوئی جواب دیے بغیر ناشتے کی میز سے جلد ہی اُٹھ آیا۔ پاکس کی ہنسی نے کمرے تک میرا تعاقب کیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے چمپا سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ باورچی خانے میں موجود تھی۔ میں نے سوچا وہ باہر آ جائے تو اُس سے کہوں کہ وہ کہیں اور چلی جائے کیونکہ اس کی موجودی راج کرشنا کی رسوائی کا سبب بن رہی ہے۔ وہ باہر آ کے کمرے کی صفائی کرنے لگی۔ اُس نے پہلے غلاف بدلے، چادریں تبدیل کیں، ڈرائنگ روم کی میز پر تازہ پھول سجائے، راج کرشنا کے کمرے میں جا کر اُس کا بستر درست کیا، میں سوچتا ہی رہا اور بنگلے سے باہر چلا آیا۔ شہر کی سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ آج بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ جب میں گھر آیا تو خلافِ معمول جولین موجود تھی۔ ہری ساڑی میں اُس کا رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میرے ساتھ سینی ٹوریم چلو۔ میں نے کہا، چلو مجھے کیا کام ہے۔ واپس آ کے بھی وہ دیر تک رُکی رہی اور کہیں رات کو واپس گئی۔

رات بہت ہو گئی، راج کرشنا گھر نہیں آیا۔ ہم لوگوں نے اُس کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ رات کو کوئی ایک بجے کے قریب موٹر رکنے کی آواز آئی، میں بھاگا ہوا گیا مگر وہ راج کرشنا کی موٹر نہیں تھی۔ ایک پولیس افسر تیزی سے اُترا، میں اُسے جانتا تھا، وہ ایس پی شکلا تھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" اُس نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آؤ، کرشنا جی کے پاس۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"ڈاکٹر سچین اسپتال میں ہیں، زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے، جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" وہ مجھے موٹر میں دھکیلتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے، آپ مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"کرشنا جی زخمی ہو گئے ہیں۔"

"زخمی! کہاں، کیسے؟" میری آواز دہل گئی۔

"ان پر حملہ کیا گیا ہے۔" شکلا نے مختصر جواب دیا۔

میرا سینہ بند ہونے لگا۔ اسپتال میں پولیس افسروں کا ہجوم تھا۔ مجھے فوراً ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سامنے راج کرشنا پڑا تھا، اُس کے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے چکر آنے لگا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور راج کرشنا کی آنکھیں کھول کے دیکھنے لگا۔ پھر مجھے اپنے پاس بُلایا، میں بے جان قدموں سے اُس کے پاس گیا اور راج کرشنا کے جسم سے لپٹ گیا۔ میری آہ و بکا سے اُس کے جسم میں جنبش ہوئی۔ اُس نے کراہ کے میرا نام لیا، اپنی لرزتی ہوئی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور اکھڑی ہوئی ڈوبی ہوئی آواز میں بولا: "وقت کم ہے لاڈلے۔ تم، تم سچ کہتے تھے، مجھے افسوس ہے میں تمھارے کام نہ آ سکا۔ میں نے اپنا بیان لکھوا دیا ہے، میں نے تمھارے بابا صفدر زماں خاں کو تلاش کرنے کے لیے ہر جگہ سرکلر بھیج دیا ہے۔ میں خود تمھیں اُن کے پاس کبھی لے چلتا مگر ۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، ہمت رکھنا لاڈلے!" اُس کی آواز بیٹھنے لگی۔

وہ مجھے لاڈلے کے نام سے پکار رہا تھا لیکن مجھے ذرا حیرت نہیں ہوئی۔ راج کرشنا کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ میں اُس کے سینے سے لپٹ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میں نے چیخ کر کہا: "مجھے بتائیے وہ کون تھے؟ کون لوگ تھے وہ؟" لیکن اُس نے مجھ سے پھر بات نہیں کی۔ اُس پر غفلت طاری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بہ جبر مجھے اُس کے پاس سے ہٹا دیا۔ میں بکتا رہا مگر انھوں نے میری ایک نہیں سنی۔ کمرے سے باہر پولیس افسران نے مجھے گھیر لیا۔ وہ مجھ سے راج کرشنا کا حال دریافت کر رہے تھے مگر مجھ میں انھیں کچھ بتانے کی طاقت نہیں تھی۔ آخر میری حالت دیکھ کے وہ خود خاموش ہو گئے۔ ایس پی شکلا میری کمر تھپکنے لگا۔ اُس نے مجھے دوبارہ ایک گوشے میں لے جا کے کھڑا کر دیا اور تسلی تشفی دینے لگا۔ میں نے راج کرشنا کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میری نظریں اُس کے کمرے کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر تیزی سے اندر جا رہے تھے اور باہر آ رہے تھے۔ اُن میں سے کسی کے چہرے پر اطمینان کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اسپتال کی راہ داری پولیس افسروں کی سرگوشیوں سے بھن بھنا رہی تھی۔ سب کی نگاہیں بار بار میری جانب اُٹھ رہی تھیں۔ وہ مجھے گھور گھور کے مزید خوف زدہ کر رہے تھے۔

"اُمید نہیں توڑنی چاہیے ظہیر خاں!" ایس پی شکلا نے رُندھے ہوئے لہجے میں پھر مجھے صبر کی تلقین کی۔

"یہ سب کیسے ہوا شکلا جی؟" میری سسکیاں نکل گئیں۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ بچ کے کہاں جائیں گے۔"

"مجھے بتائیے؟ وہ کون کمینے تھے؟ مجھ سے مت چھپائیے۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "شکلا جی! مجھے بتائیے یہ سب کیسے ہوا؟" میں نے اُس کا شانہ جھنجوڑ ڈالا۔

"اطمینان رکھو ظہیر خاں! سب کُھل کے سامنے آجائے گا۔ اس وقت تو تمھیں دعا کرنی چاہیے کہ کرشنا جی ٹھیک ہو جائیں۔" وہ تنبیہی انداز میں آہستگی سے بولا۔

مجھے احساس ہوا کہ راہ داری میں میری آواز دُور دُور تک پہنچ رہی ہوگی۔ سب لوگ میری طرف متوجہ تھے۔ شکلا سچ کہتا تھا، مجھے کرشنا جی کے لیے دعا کرنی چاہیے تھی۔ وہ وقت دعا ہی کا تھا مگر میری دعاؤں میں اثر کہاں تھا۔ میں نے بہت سی دعائیں کر کے دیکھ لی تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا تاہم میں نے اپنے دل میں دعا کی "اے خدا؟ کرشنا جی کو بچا لے چاہے اُن کے بدلے میری جان لے لے ویسے بھی میں فالتو ہوں۔" شکلا میرے پاس خاموش کھڑا رہا۔ کچھ پولیس افسر اسپتال سے چلے گئے، کچھ اور آ گئے۔ پھر شہر کے معززین آنے لگے۔ راج کرشنا کے کمرے سے کوئی خبر نہیں آئی۔ میں رات بھر ڈاکٹروں سے پوچھتا رہا مگر انھوں نے مایوسی سے سر ہلانے کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

صبح ہونے والی تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ بھتو کے ہمراہ چمپا بوکھلائی ہوئی راہ داری میں آتی دکھائی دی۔ جیسے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ میری طرف لپکی۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ بھتو کی آنکھیں بھی سُرخ تھیں۔ وہ دونوں میرے پاس آ کے چپ چاپ کھڑے ہو گئے اور میرا چہرہ دیکھنے لگے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں مگر مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ چمپا نے مجھے گلے لگا لیا اور خود بھی سسکنے لگی۔ پوری رات گزر گئی تھی، راہ داری میں لوگ بے چینی سے ٹہلتے رہے تھے۔ نرسیں دوڑتی بھاگتی رہی تھیں۔ راہ داری کے آس پاس سنگین بردار سپاہیوں کا پہرا تھا۔ صبح ہوتے ہی راج کرشنا کا پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم اسٹریچر پر اُس کے کمرے سے باہر نکالا گیا اور فوراً آپریشن تھیٹر میں منتقل کر دیا گیا۔ آدھا گھنٹا گزرا، ایک گھنٹا گزرا، پھر کچھ اور وقت گزر گیا لیکن آپریشن ختم نہیں ہوا، کوئی دو گھنٹے بعد راج کرشنا کو دوبارہ اُس کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اب بھی کچھ نہیں بتاتے تھے۔ کسی کو اُس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے بہت منتیں کیں مگر ڈاکٹروں نے مجھے اُسے دوبارہ دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔ معلوم ہوا کہ اُسے نلکیوں سے آکسیجن دی جا رہی ہے۔ چمپا ساڑی کے پلّو سے سر ڈھانپ کے ایک کونے میں سمٹی ہوئی دعائیں کر رہی تھی۔ ایس پی شکلا نے مجھے گھر جانے، ناشتہ کرنے اور لباس تبدیل کر کے اسپتال واپس آنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اُس کی بات نہیں مانی۔ ایک ایک پل بتانا دوبھر ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ڈاکٹر کیا کانا پھوسیاں کر رہے ہیں، نہ کسی سے کچھ بولتے ہیں، نہ کسی کی سُنتے ہیں، بس اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔ راج کرشنا کے کمرے سے کوئی باہر نکلتا تو میرا دل ہَولنے لگتا۔

راج کرشنا، میری نحوست اُسے بھی لگ گئی۔ مجھے اُس کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ سانحہ ہی ہوا جس کے خوف سے کلیجا کٹنے لگتا تھا۔ صبح کوئی گیارہ بجے اسپتال کا بڑا انگریز ڈاکٹر راج کرشنا کے کمرے سے برآمد ہوا تو اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ میں اُس کی طرف دوڑ پڑا۔ اُس نے میرا ہاتھ دبا کے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا اور اُسے ایک طرف دھکیل کے راج کرشنا کے کمرے میں گھس گیا۔ اُس کے منہ پر چادر پڑی ہوئی تھی اور اُس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ میں ٹھٹک کے رُک گیا۔ اُس کے سرہانے کھڑی ہوئی نرس نے چادر اُٹھا کے مجھے اُس کا چہرہ دکھایا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں اپنی جگہ منجمد کھڑا رہ گیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے تھام کے باہر پہنچایا۔ دروازے کے پاس چمپا موجود تھی۔ وہ میرا بازو اپنے کندھے پر رکھ کے اور میری کمر پکڑ کے مجھے ہجوم سے دُور لے گئی۔

راج کرشنا کی ارتھی اُٹھنے سے پہلے اُس کی ماں کا انتظار ہوتا رہا۔ بنگلے پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ میرا جی کرتا تھا کہ میں کسی کمرے میں بند ہو جاؤں کیونکہ جو شخص بھی آتا تھا، مجھے رُلاتا تھا۔ دوپہر کو جولین بھی آ گئی تھی۔ اُس کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں۔ چمپا نے اُسے سنبھالا اور وہ دونوں تعزیت کرنے والوں کی پزیرائی میں مصروف ہو گئیں۔ میں کرشنا جی کی پائنتی پکڑ کے بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے دن سویرے سویرے راج کرشنا کی دھان پان بوڑھی ماں گھر میں داخل ہوئی تو اُسے اپنے بیٹے کی لاش کے پاس پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر وہ یوں ہی گُنگ کھڑی رہی، نہ روئی، نہ چلّائی پھر اُس کے منہ سے ایک گُھٹی ہوئی آہ نکلی، وہ دھڑام سے راج کرشنا کے مُردہ جسم پر گر گئی اور دیر ہو گئی مگر وہ نہیں اُٹھی۔ لوگوں نے اُسے اٹھانے کی کوشش کی تو انھیں پتہ چلا کہ وہ کب کی اپنے بیٹے کے پاس پہنچ چکی ہے۔

میں نہیں مرا، اُس کی ماں مجھ سے زیادہ اُس سے محبت کرتی تھی۔

میں بے غیرت تو فہمیدہ کی موت پر بھی زندہ رہا تھا۔ میں نے تو اماں کی موت کی خبر ہضم کر لی تھی، میں کورا کے بغیر اب تک زندہ تھا۔ دونوں ارتھیاں ایک ساتھ اُٹھیں۔ ممبئی میں کرشنا جی کا کوئی عزیز نہیں تھا مگر گھر میں کہرام مچ گیا۔ ایس پی شکلا اور دوسرے پولیس افسر لواروں سے لگے ہوئے سسکتے رہے۔ جولین میرے سینے سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی۔ رستم جی بھی لورین کے ساتھ آ گئے تھے۔ مسز روپ بھی موجود تھیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا، میں

تو اب رو بھی نہیں رہا تھا اور وہ سب میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ نورین بار بار میرا بازو پکڑ لیتی تھی۔ جولین آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی اور منہ بسورتی رہی۔ سڑک پر تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ شمشان گھاٹ میں بھی بہت بڑا ہجوم تھا۔ اُن میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عام لوگ، سڑک پر چلتے ہوئے لوگ، غریب غربا، وہ جنھیں راج کرشنا نے بدمعاشوں کے مظالم سے بچایا تھا۔ دونوں ارتھیاں پورے اعزاز کے ساتھ خشک لکڑیوں کے سپرد کر دی گئیں اور آگ لگا دی گئی۔ کرشنا جی اور اُن کی ماں جلنے لگے اور دیکھتے دیکھتے دھواں بن گئے۔ سہ پہر کے قریب ہم واپس ہوئے تو گھر پر ویرانی مسلط تھی۔ جولین اور چمپا سرخ آنکھوں کے ساتھ واپس آنے والوں کی منتظر تھیں۔ میں نے کمرے میں بند ہو کے اندر سے کُنڈی لگا لی۔ میرا سارا جسم دُکھ رہا تھا۔ جولین اور چمپا دروازہ کھٹ کھٹاتی رہیں مگر میں نے نہیں کھولا اور نہ مجھ میں دروازے تک جانے کی ہمت تھی۔ میری آنکھوں میں کمرہ گردش کر رہا تھا۔

راج کرشنا کا قاتل گرفتار نہیں ہوا، نہ اُس کے گرفتار ہونے کی کوئی اُمید تھی۔ وہ ممبئی پولیس کے ایک بہت بڑے افسر لکشمی کمار کے گھر سے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کر کے واپس آ رہا تھا کہ باندرے کے قریب ایک سنسان مقام پر اُس کی گاڑی روک لی گئی۔ اُس رات ڈرائیور بھی اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ انھوں نے چاقوؤں سے اُس کا جسم چھلنی کر دیا اور ہجوم جمع ہونے سے پہلے بھاگ گئے۔ راج کرشنا سڑک پر تڑپتا رہا۔ جب راہ گیر اُدھر سے گزرے تو انھوں نے گشتی پولیس والوں کو ڈھونڈ کے اس حادثے کی خبر دی۔ ایک دن پہلے ہی میں نے اُسے پولیس افسر جسونت کی باتیں بتا کے متنبہ کیا تھا اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے کام جلد نمٹانے کی کوشش کرے گا، کام نمٹ گیا۔ جسونت کے بقول شمبھو گروپ نے اُسے زندہ مدراس واپس نہیں جانے دیا۔ اخبارات راج کرشنا کی موت کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ بڑے لوگوں کے تعزیتی بیانات چھپ رہے تھے، ممبئی پولیس کو کُھلی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ کسی بھی مشکوک شخص کو پکڑ سکتی ہے۔ بائی کلا کے لوگوں کا ایک گروہ تھانے کے آگے دھرنا دے کے بیٹھ گیا تھا کہ جب تک قاتل نہیں پکڑے جائیں گے، وہ وہاں سے ہٹیں گے نہیں۔ پولیس نے چند آدمی گرفتار بھی کیے تھے مگر ظاہر ہے اُن میں سے کوئی بھی قاتل نہیں ہوگا۔

جولین اپنے گھر واپس نہیں گئی۔ اُسے بھی چپ لگ گئی تھی۔ ذرا ذرا سی دیر میں آنکھیں بھگو لیتی تھی۔ تین دن تک گھر میں صرف رات کو ہم تنہا رہے۔ ورنہ روزانہ دن بھر لوگ آتے رہے اور خواہ مخواہ کی باتیں کر کے ہمیں تنگ کرتے رہے۔ نورین بھی روز گھنٹوں میرے پاس خاموش بیٹھ کے چلی جاتی تھی۔ ایس پی شکلا اور دوسرے افسر زیادہ تر گھر ہی میں رہے جب بھی کوئی آتا تھا، راج کرشنا کی تعریف کرتا تھا مگر مرے ہوئے آدمی کی تعریف کرنے سے کیا حاصل۔ اس طرح لوگ مرنے والے کے عزیزوں کو ڈنک مارنے کا کام کرتے ہیں اور انھیں اُن کے بچھڑنے والے آدمی کے نقصان کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ وہ شاید چھیڑنے یا طنز کرنے آتے ہیں، میرا بس چلتا تو میں گھر کے دروازے بند کر لیتا۔ کیسا تماشا ہو رہا تھا۔ ابھی میں نے مجھے جسونت بھی نظر آیا اور وہ شخص بھی جو اُس کے ساتھ راج کرشنا سے ملنے گھر آیا تھا۔ دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کے میرے لیے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

قاتلوں کو معلوم تھا کہ اُس رات راج کرشنا کہاں گیا ہے اور کس وقت لکشمی کمار کے گھر سے واپس ہوگا اور کس راستے سے آ سکتا ہے۔ انھیں سب باتیں معلوم تھیں مگر کون پوچھ سکتا تھا کہ انھیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا۔ شمبھو گروپ کے نام سے مجھے وحشت ہونے لگتی تھی۔ میں نے کئی بار گھر سے نکلنے کا خیال کیا مگر میں کس کا گریبان پکڑتا اور کہاں جاتا۔ اتنے بہت سے لوگ میری صورت آشنا ہو چکے تھے۔ ستانہ کے اڈے کی بات اور تھی، اُس وقت مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ تین دن گزرنے کے بعد گھر میں لوگوں کی آمد و رفت بڑی حد تک کم ہو گئی۔ جولین روز صبح میرے بستر پر اخبار ڈال دیتی تھی۔ راج کرشنا کی خبروں کا زور اب کم ہو گیا تھا۔ اخبارات نے مجرموں کی گرفتاری میں پولیس کی ناکامی پر مایوسی ظاہر کی تھی اور لکھا تھا کہ راج کرشنا کی موت کسی بڑی سازش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، اگر اس سانحے پر توجہ نہ دی گئی تو پھر کسی پولیس افسر کی زندگی محفوظ نہیں رہے گی اور یہاں غنڈوں بدمعاشوں کا راج ہوگا۔ اخبارات سے معلوم ہوتا تھا کہ راج کرشنا کی موت کا چرچا پورے شہر میں ہو رہا ہے اور پولیس اپنی ناکامی پر پشیمان ہے۔ لکشمی کمار کا بیان بھی چھپا تھا کہ پولیس اپنے تمام وسائل بروئے کار لا رہی ہے لیکن پانچ دن گزر گئے تھے اور قاتلوں کی کوئی سن گن نہیں ملی تھی۔ بائی کلا کے تھانے پر بیٹھا ہوا گروہ بھی پولیس افسروں کے وعدوں پر منتشر ہو گیا تھا۔

پانچویں دن ایس پی شکلا نے تین چار پولیس افسروں کے ہمراہ آ کے مجھے حکومت کے احکام سنائے۔ ہمیں مزید تین مہینے تک اس مکان میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ یہ مدت ہماری درخواست پر بڑھائی بھی جا سکتی تھی۔ محکمۂ پولیس نے راج کرشنا کی خدمات کے عوض پچیس ہزار روپے کی رقم کا اعلان کیا تھا اور مجھے پیش کش کی تھی کہ میں جب چاہوں، مجھے پولیس کی ملازمت میں لیا جا سکتا ہے۔ گورنر کی طرف سے دس ہزار روپے کی ایک خصوصی رقم بھی راج کرشنا کے پس ماندگان کے لیے مختص کی گئی تھی۔ راج کرشنا کے پس ماندگان میں صرف میں رہ گیا تھا۔ ایس پی شکلا نے ایک دستاویز میرے سپرد کی تھی۔ اُس کی رُو سے میں مدراس میں راج کرشنا کی تمام جائداد اور نقدی کا تنہا وارث قرار دیا گیا تھا۔ میں یہ سُن کر دنگ رہ

گیا کہ راج کرشنا نے اسپتال میں میرے پہنچنے سے پہلے مجسٹریٹ کو بُلا کے وصیت کردی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے اپنا بیان لکھوا دیا ہے مگر میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ اُس نے حادثے کے متعلق کوئی بیان لکھوایا ہوگا۔ میں تو تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اُس آخری وقت میں مجھے اس قدر یاد رکھے گا جب کہ اُس کی سانس اُکھڑ رہی تھی۔ شکلا یہ نوشتہ سنا رہا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ایک جائداد کا وارث مجھے زرّیں نے بنایا تھا، ایک جائداد کا وارث مجھے راج کرشنا نے بنا دیا تھا، وہ شاید فہمیدہ کی موت کا معاوضہ تھا، یہ راج کرشنا کی موت کا۔ میں نے تمام دستاویزات شکلا کو واپس کر دیں۔ "شکلا جی! مذاق مت کیجیے۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "مجھے کسی جائداد کی ضرورت نہیں ہے، یہ روپے پیسے میرے لیے بے کار ہیں۔ آپ حکومت کی عطا کی ہوئی رقم بھی لوٹا دیجیے اور کرشنا جی کی جائداد کا کوئی اور مناسب انتظام کر دیجیے۔"

"کرشنا جی کی آتما تمھارے فیصلے سے ناخوش ہوگی۔" شکلا گلوگیر آواز میں بولا "اور میں تمھیں مشورہ نہیں دوں گا کہ تم حکومت کی طرف سے دی ہوئی رقمیں واپس کرو، تم اس کا جو چاہے استعمال کرو مگر انھیں واپس مت کرو، یہ تمھیں نہیں، کرشنا جی کو اُن کی شاندار خدمات کے عوض دی گئی ہیں، یہ بہت کم ہے۔ سُنا ہے حکومت کرشنا جی جیسے دیانت دار اور فرض شناس پولیس افسر کی یادگار قائم کرنے کے لیے اور اُن کی زندگی پولیس افسروں کے لیے ایک مثال بنانے کے بارے میں بہت کچھ سوچ رہی ہے۔ تم نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ گورنر نے انھیں کتنا زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔"

"مگر لوگوں نے انھیں مار دیا، اب خراجِ تحسین پیش کرنے سے کیا ہوتا ہے، اِن انعامات کا اعلان سُن کے کیا وہ واپس آجائیں گے۔ یہ رقم واپس کر دیجیے، میں اِس کا مستحق نہیں ہوں۔"

"تمھی اِس کے مستحق ہو کیونکہ تمھی کو کرشنا جی نے اپنا وارث مقرر کیا ہے۔ سب کو موت آنی ہے ظہیر خاں! سب مر جائیں گے، آدمی کے پاس دوسرے آدمی کو یاد کرنے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ جو قاتل ہیں کیا وہ زندہ رہیں گے، وہ بھی مر جائیں گے مگر اُن کے مرنے پر کوئی انھیں یاد نہیں کرے گا۔ کرشنا جی مجھ سے تمھاری بہت سی باتیں کرتے تھے، وہ تمھاری بڑی عزت کرتے تھے۔ آخری دن وہ بہت دیر تک تمھارے بارے میں باتیں کرتے رہے۔"

"وہ کیا کہ رہے تھے؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔

"وہ تم سے بہت متاثر تھے۔ کہتے تھے کہ میری یہ زندگی ظہیر خاں کے سبب سے ہے۔ اُس نے دو بار مجھے بچایا ہے، وہ ایک ہمت والا اور ذہین نوجوان ہے۔"

"لیکن وہ چلے گئے اور میں دیکھتا رہ گیا۔"

"اب تمھارا فرض ہے کہ تم اُن کی کمائی ہوئی رقم صحیح طریقے سے استعمال کرو۔ اگر تم نے اس کے ساتھ غیروں کا سا سلوک کیا تو یہ اچھی بات نہیں ہوگی، دیکھو ظہیر! تم نے غور نہیں کیا، جسے کوئی اپنا سمجھتا ہے، اُسی کے لیے ایسا کر سکتا ہے ورنہ کون کسی کا اتنا خیال رکھتا ہے۔ کیا تم اُن کی خواہش کی بجا آوری سے انکار کرو گے؟" شکلا نے نرمی سے کہا۔

"شکلا جی! یوں تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر یہ اچھا نہیں لگتا۔ کرشنا جی کی خواہش سر آنکھوں پر، وہ مجھ سے جان بھی طلب کرتے تو میں انکار نہ کرتا مگر یہ سب کچھ....." میں نے دوبارہ ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"شکلا جی! کرشنا جی کی روح کا اگر آپ کو اتنا ہی لحاظ ہے تو اُن کے قاتلوں کو بھی پکڑنے کی کوشش کیجیے یا مجھے صرف ایک بار بتا دیجیے وہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو کرشنا جی کی قسم!"

"پوری کوشش کی جا رہی ہے۔" شکلا افسردگی سے بولا "انھوں نے بہت منظم منصوبہ بنایا تھا، بہرحال ہم اُن تک پہنچ ہی جائیں گے اور یقین کرو کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔"

"رعایت کرنے کا معاملہ تو بعد میں آتا ہے، پہلے آپ وہاں تک پہنچ تو جائیں، آپ کبھی اُن کا سراغ نہیں لگا سکتے اس لیے کہ آپ......"

شکلا نے میری بات کاٹ دی اور اپنے ساتھی پولیس افسروں کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا "میں تمھارے احساسات کا اندازہ کر سکتا ہوں ظہیر خاں! بھروسا رکھو کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو کے رہے گا۔" وہ ترشی سے بولا۔ غالباً اسے اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں میرے منہ سے کوئی ناروا بات نکل جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ اُس نے کاغذات وہیں چھوڑ دیے اور جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

میں نے سوچا، چلتے چلتے ایس پی شکلا کے کانوں میں ایک بات ڈال دوں، اُس سے کہہ دوں کہ تم بھی کسی دن کرشنا جی کی طرح کسی سڑک پر تڑپتے ہوئے نظر آؤ گے کیونکہ تم میں بھی وہی خامیاں ہیں جو کرشنا جی میں تھیں۔ کرشنا جی کی موت کے بعد کسی پولیس افسر نے ہمارا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا شکلا نے کیا۔ اُس نے اپنا بیشتر وقت ہمارے ساتھ گھر پر ہی گزارا۔ وہ موجود ہوتا تو وہی آنے جانے والوں سے ڈھنگ کی بات کرتا، میرا تو کسی سے ملنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب بھی کرشنا جی کا نام احترام سے لیتا تھا جیسے کرشنا جی اُس کے قریب بیٹھے ہوں۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ مجھے، جولین اور چمپا کو مار مار کے کھانا کھلائے، جب بھی آتا تھا، صبر و ضبط کی تلقین کرتا رہتا تھا۔

راج کرشنا کی وصیت کی خبر اخبارات کو بھی ہو گئی۔ کئی فوٹو گرافر اور نمائندے میرا فوٹو لینے اور مجھ سے بات کرنے کے لیے گھر آئے، میں اُن سے نہیں ملا۔ یقیناً شہر میں اس خبر پر حیرت کا اظہار کیا جا رہا ہوگا کہ آخر راج کرشنا نے ظہیر خاں نامی ایک اجنبی نوجوان کو اپنی کُل جائداد کا وارث کیوں بنایا۔ میں نے کاغذات میز کی دراز میں ڈال دیے تھے، مجھ سے اُن کی تفصیلات بھی نہیں دیکھی گئیں۔ کچھ دن تک بارسوخ شہر کے مختلف علاقوں اور تھانوں میں راج کرشنا کی موت پر تعزیتی جلسے ہوتے رہے۔ اُن میں مجھے بھی

بلایا جاتا تھا۔ میں کسی جلسے میں شریک نہیں ہوا۔ ایک دن نورین نے مجھے فون کر کے اصرار کیا کہ کلب کی جانب سے کرشنا جی کی موت پر ایک ماتمی شام منائی جا رہی ہے جس میں میری شرکت ضروری ہے۔ میں وہاں بھی نہیں گیا۔ آخر لوگ خود ہی تھک گئے۔ دس دن بعد لوگوں کی آمد و رفت میں بے حد کمی ہو گئی۔ ایس پی شکلا اور دو ایک افسروں کے سوا تقریباً سبھی نے آنا بند کر دیا۔

❁

دس روز سے اُوپر ہو گئے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی گھر آجائیں گے، وہ دوسرے کمرے میں موجود ہیں اور ابھی مجھ کو بُرا بھلا کہتے ہوئے باہر نکلیں گے، سڑک پر کسی گاڑی کا ہارن بجتا تو میں اپنی جگہ سے اُچھل پڑتا تھا کہ کرشنا جی آ رہے ہیں اور کھانے کی میز خالی پڑی ہے، چمپا نے ابھی تک کھانے کا انتظام نہیں کیا ہے، ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے، شاید کوئی کرشنا جی کو پوچھے کہ وہ گھر میں موجود ہیں یا کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں اُن کی تصویر لگی ہوئی تھی، ہر وقت ایسا لگتا تھا جیسے کرشنا جی کہ رہے ہوں، ظہیر! تم مجھے بھول تو نہیں گئے، میں انھیں کیسے بھول سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں، انھیں کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں؟ جولین نے ابھی تک اپنے گھر کا رُخ نہیں کیا تھا، دس دنوں تک تو مجھے کوئی احساس ہی نہیں ہوا کہ اُسے اپنے گھر بھی جانا چاہیے۔ اس عرصے میں ایک بار بھی سینی ٹوریم میں وہ اپنے باپ کو دیکھنے نہیں گئی تھی، خود میں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ گھر کی تمام دیکھ بھال جولین اور چمپا ہی کرتی رہی تھیں، میں تو زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہا تھا۔ جولین کی ماں پورے گھر میں تنہا تھی اور اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لیے خود ہی وہاں آجاتی تھی۔ کرشنا جی کو گئے ہوئے شاید بارھواں روز تھا کہ میں نے جولین سے کہا کہ وہ اب اپنے اسکول جائے اور اپنے گھر میں جا کے رہے، وہ کب تک یہاں رہے گی۔ "میرا کیا ہے، میں تو ان باتوں کا عادی ہو چکا ہوں، ایک بات اور سہی، حکومت نے تین مہینے تک اس مکان میں رہنے کی اجازت دی ہے مگر کرشنا جی کے بغیر یہاں ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا ہے، در و دیوار پر اُن کی پرچھائیاں لرزتی رہتی ہیں، ہر گوشے میں اُن کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جب سے وہ گئے ہیں، اُن کا کمرہ بند پڑا ہے، وہاں جاتے ہوئے اور اُن کی چیزیں چھوتے ہوئے ہول آتا ہے۔ اب کسی نہ کسی دن یہاں سے جانا ہی ہے۔ حکومت قیام کی مدت میں کچھ اور توسیع کر دے تو بھی کیا فرق پڑتا ہے، بہتر ہے کہ ہم اس سے پہلے ہی چلے جائیں۔" میری بات سُن کے جولین کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔ چمپا، جس نے اب تک بہت ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا، اُس کا بند بھی ٹوٹ گیا۔

"مگر تم نے کیا سوچا ہے؟" جولین نے اضطراب سے پوچھا۔

"میں کسی بھی جگہ چلا جاؤں گا۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"میرا کیا ہے... میں تو پہلے ہی کہیں چلا جاتا، کرشنا جی نے پیروں میں بیڑی ڈال رکھی تھی۔" پھر میں نے چمپا سے مخاطب ہو کے کہا "اب تمھیں بھی اپنا کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لینا چاہیے۔" مجھے بعد میں خیال آیا کہ جولین کے سامنے مجھے چمپا سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی لیکن بات منہ سے نکل گئی، چمپا کوئی جواب دینے کے بجائے سَر جھکائے روتی رہی۔

جولین نے ہم دونوں کو حیرت سے دیکھا اور تذبذب سے بولی "میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے، کیوں نہ ہم سب ایک ساتھ رہیں۔ کرشنا جی نے مجھے جو مکان دلایا تھا، اُس میں خاصی گنجائش ہے۔ وہ ہمیں پہلے ہی ضرورت سے بڑا معلوم ہوتا تھا، ہم سب وہاں رہ سکتے ہیں، اگر تنگی محسوس ہوئی تو ہم کوئی دوسرا مکان لے لیں گے۔"

"نہیں جولین۔" ان دنوں ساتھ رہنے کے بعد وہ مجھے آپ کہنا بھول گئی تھی اور میں نے بھی۔ ہمارے درمیان شاگرد اور اُستاد کے رشتے کا حجاب ختم ہو چکا تھا۔ پہلے بھی وہ کتنا رہ گیا تھا، وہ اس گھر میں گھر کے ایک فرد کی طرح رہی تھی۔ میں نے انکار کیا تو اُس کی آنکھوں میں اداسی اور حیرانی سمٹ آئی "مجھے جانا ہے، مجھے بہت دُور جانا ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ میں نے جولین کو اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے اُس نے کبھی چمپا سے کرید کی ہو اور چمپا نے راج کرشنا کی طرح اُسے بھی کچھ بتا دیا ہو، خیر چمپا سے مجھے بعد میں پوچھنا تھا کہ اُس نے وعدہ خلافی کیوں کی۔

"میں تم سے کچھ کہہ تو نہیں سکتی۔" جولین نے مایوسی سے کہا "لیکن اگر تم مجھے اجازت دو تو میں ابھی کچھ دن یہاں ٹھیرنے کی درخواست کروں گی، مجھے اُمید ہے تم میری بات ضرور مان لو گے۔"

"لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا؟" میں نے جھنجلاہٹ سے کہا۔

"تو پھر تم میرے گھر چلو، تمھارا دل بھی بہل جائے گا، ہم دونوں ماں بیٹی اکیلے ہیں، تم تو سب کچھ جانتے ہو، ہمارے پاس دھن دولت بھی نہیں اور پھر تم بھول گئے، یاد کرو، کرشنا جی کی کیا خواہش تھی، وہ چاہتے تھے کہ تم بہت پڑھ لکھ جاؤ، وہ تمھارے لیے اپنے دل میں بڑی آرزوئیں رکھتے تھے، تم میرے ساتھ رہو گے تو میں تمھیں اُن کی خواہش کے مطابق خوب پڑھاؤں گی، تمھیں ہمارے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، وہ گھر بھی تمھارا ہوگا۔"

"مجھ سے اصرار مت کرو جولین۔" میں نے عاجزی سے کہا "میں اب اِس شہر میں رہنا نہیں چاہتا، میں کسی گھر میں رہنا نہیں چاہتا، تم بھی ایک دن مجھ سے تنگ آجاؤ گی۔ تم.... تم نہیں جانتیں کہ میں کہیں ٹِک کے نہیں رہ سکتا۔" میں وہاں سے اُٹھ گیا۔ بہتر یہی تھا کہ میں یہ گفتگو ہی نہ کروں۔ مجھے اندازہ تھا، جولین اسی طرح ضد کرتی رہے گی۔ وہ ایک بہت نفیس لڑکی تھی، کرشنا جی بھی اُس سے بہت محبت کرتے تھے۔ مجھے بھی

وہ بہت اچھی لگتی تھی لیکن کرشنا جی کی بات اور تھی، وہ تو اس طرح بات کرتے تھے کہ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر ہر مرتبہ جیسے انھیں پتہ چل جاتا تھا اور وہ ایسی بات کرتے تھے کہ ندامت کے سوا کچھ بن نہیں پڑتا تھا۔

جولین نہیں گئی۔ اس کی ماں روز آتی رہی اور میرے سر پہ کرشنا جی کاغذات کا جو بوجھ ڈال گئے تھے، وہ بتدریج بڑھتا گیا۔ ایس پی شکلا مشورہ دیتا تھا کہ مجھے مدراس جاکے کرشنا جی کی جائداد کا کوئی مناسب انتظام کرنا چاہیے۔ اسے اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے، اس گھر میں بھی ان کا خاصا سامان تھا۔ میں یہ سب کہاں رکھتا اور کس کے سپرد کرتا؟ حکومت کی طرف سے دونوں چیک بھی آگئے تھے۔ مجھے کرشنا جی نے عجب الجھن میں مبتلا کردیا تھا۔ مدراس جاکے ان کی جائداد کی دیکھ بھال کروں، مجھے یہ سب کچھ ایک ناٹک نظر آتا تھا اور یوں ہی سب کچھ چھوڑ کے چلاؤں جیسے کرشنا جی چلے گئے تھے، اس کا حوصلہ بھی نہیں ہوتا تھا، ان کے خفا ہونے کا اندیشہ رہتا تھا، انھیں معلوم تھا کہ مجھے ان چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوسکتا، وہ سب جان گئے تھے پھر بھی انھوں نے احتیاط نہیں کی۔ وہ چپکے چپکے ابا جان اور گھر والوں کا پتہ چلا رہے تھے۔ اتنی راز داری سے کہ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ نہ جانے انھیں کب میرے بارے میں اتنی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ان کے طرز عمل میں ایک بال کا بھی فرق نہیں آیا تھا، وہ جانتے تھے کہ میں یہ سب نہیں کرسکوں گا۔ میں تو ان کے سامنے بھی کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ دن بھر گھر بیٹھا رہتا تھا یا بازاروں میں گشت کرتا رہتا تھا۔ شاید انھوں نے مجھے ایک کھونٹے سے باندھنے کے لیے یہ ذمے داری سونپ دی ہو، انھوں نے برا کیا۔ کاش وہ یہ وصیت میرے سامنے کرتے تو میں ان کے پیر پکڑ کے معذرت کرلیتا مگر انھوں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ چمپا نے انھیں اتنا ہی بتایا ہوگا کہ مجھ سے ابا جان اور گھر والے بچھڑ گئے ہیں ممکن ہے اس نے فہمیدہ والی بات بھی بتادی ہو اور انھیں میرے حال پر ترس آگیا ہو۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ گھر والوں کو تو میں نے خود چھوڑا تھا، سات سال جیل میں رہنے کے بعد میں نے پلٹ کے گھر کی خبر نہیں لی تھی۔ میں جیل سے چھوٹ کے سیدھا اس کی تلاش میں نکلا تھا جو نہ جانے کس تہ خانے میں روپوش ہوگئی تھی۔ کرشنا جی ایک صرف گھر والوں کی گم شدگی سے واقف تھے۔

میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ میں نے ان کے متعلق بدگمانی کیوں کی۔ ان کا جذبہ ترس پر محمول کیا۔ ترس کیسا؟ چمپا کے آنے سے پہلے جب وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے تب بھی وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ چمپا تو بہت بعد میں آئی تھی اور آنے کے بعد اس نے فوراً تمام باتیں نہیں بتادی ہوں گی۔ میں نے تو ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی، وہ بات کرنا چاہتے تھے تو میں ان سے چھپا چھپا رہتا تھا۔ اب وہ مجھ سے چھپ گئے۔ میرے دماغ میں کوئی معقول بات نہیں آرہی تھی۔ اگر میں مدراس جاکے ان کی جائداد بیچ کے نقدی وصول کرلیتا ہوں تو میں اس کا کیا کروں گا، میں گھر بناؤں گا؟ سامان اکٹھا کروں گا اور پھر لوگ میرے گھر آیا کریں گے؟ وہاں کھانے پکا کریں گے؟ اگر یہی کرنا تھا تو پھر زرین اور بتھل کے پاس رہنے میں کیا حرج تھا۔ زرین نے بھی اپنی تمام جائداد میرے نام کردی تھی۔ نیا گھر بساؤں گا۔ نہیں! مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ کرلا کو بھلادوں گا اور اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں مقید کرلوں گا کیونکہ روپیہ پیسہ اکٹھا کرنا مشکل ہوتا ہے، اتفاق سے ہاتھ لگ گیا ہے تو مجھے کوڑی کی قیمت سمجھ کے اسے استعمال کرنا چاہیے۔

میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا تو چمپا اور جولین نے بھی کچھ نہیں کیا جب کہ میں نے صاف طور پر ان سے کہہ دیا تھا کہ چمپا اپنا کوٹی اور ٹھکانا ڈھونڈلے اور جولین اپنے گھر چلی جائے۔ وہ دونوں سائے کی طرح میرے پیچھے لگی رہتی تھیں۔ میں سامنے نہیں ہوتا تھا تو مجھے ان کی نگاہیں تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، کبھی جولین میرے سامنے کھانا لاکر رکھ دیتی، کبھی چمپا اور وہ دونوں عموماً چپ ہی رہتیں، جب سے میں نے جولین سے انکار کیا تھا وہ ہر وقت نڈھال نڈھال سی رہتی تھی۔ وہ اپنے کپڑوں کی طرف سے بھی بے فکر ہوگئی تھی، میں جانتا تھا کہ وہ میرے انکار سے ناخوش ہے مگر کیا میں اس سے اقرار کرلیتا؟ ان دونوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے میں نے گھر سے باہر رہنا شروع کردیا تھا۔ میں روز صبح ہوتے ہی گھر سے نکل جاتا اور رات کو گھوم پھر کے واپس آتا تو وہ دونوں ڈبڈبائی آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں سے مجھے دروازے کے قریب لان میں ٹہلتی ہوئی ملتیں۔ میں کہہ دیتا کہ بھوک نہیں ہے تو پھر وہ بھی کچھ نہیں کھاتیں، پھر میں نے ان کی وجہ سے یہ کہنا ہی بند کردیا۔ کھانے کی میز پر بھی خاموشی طاری رہتی تھی، بتھو کی تیزی وطراری بھی کرشنا جی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

پولیس نے بہت سے لوگوں کو پکڑا اور چھوڑ دیا۔ راج کرشنا کے مجرم محفوظ رہے۔ اخبارات بھی چپ ہوگئے تھے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے ان کے قاتلوں کو عبرت ناک سزائیں دلوانے کے لیے جلسے اور مظاہرے کیے تھے لیکن میرے ذہن میں ابھی تک پولیس افسر جسونت کی باتیں محفوظ تھیں۔ شمبھو گروپ! جب بھی کوئی کرشنا جی کا ذکر کرتا یا میں ان کی تصویر دیکھتا، شمبھو گروپ کا نام میرے دماغ میں چبھنے لگتا۔ میں نے ایک دن اتفاقاً ایس پی شکلا کے سامنے یہ نام لیا تھا تو وہ چونک پڑا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ شمبھو تو اس بمبئی کا ایک بہت بڑا آدمی ہے، اس کے کئی کارخانے ہیں۔ اور بھی کئی قسم کے کاروبار ہیں۔ اس کی جائداد کا کوئی شمار ہی نہیں، وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں شمبھو سیٹھ کے بارے میں اتنا متجسس کیوں ہوں۔ میں نے اسے جسونت کی زبانی سنی ہوئی باتیں نہیں بتائیں اور کہا یونہی میں نے اس کا ذکر بہت سنا ہے۔ ایس پی شکلا میرے جواب سے

مطمئن نہیں ہوا اور اس نے چلتے چلتے شمبھو سیٹھ، اس کی امارت اور اثر و رسوخ کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا۔ میں سنتا رہا۔ ایس پی شکلا کے جانے کے بعد میں نے بہت غور کیا مگر کوئی مناسب صورت ذہن میں نہیں آئی۔ شمبھو گروپ کے لوگ مجھ سے ضرور واقف ہوں گے کہ میں کرشنا جی کے ساتھ رہتا تھا۔ مستانہ کا بھی ان سے تعلق ہوسکتا ہے۔ کرشنا جی پر وار کرنے سے پہلے انھوں نے ان کے متعلق ہر بات جان لی ہوگی کہ وہ کہاں رہتے ہیں، ان کی مصروفیات کیا ہیں اور ان کے ساتھ کون کون رہتا ہے اور یہ بات بھی ان سے چھپی نہ رہی ہوگی کہ کرشنا جی مجھی کو کلب لے گئے تھے۔ کلب میں ان پر ہونے والا حملہ ناکام بنانے والا بھی میں تھا۔ کاش وہ کرشنا جی کے بجائے مجھے نشانہ بنا دیتے کیونکہ میری اس دنیا میں کوئی ضرورت نہیں تھی اور میری موت کے بعد ممکن تھا، کرشنا جی سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتے یا میرے کہنے کے مطابق یہ شہر ہی چھوڑ دیتے۔ کرشنا جی کی ابھی دنیا کو بہت ضرورت تھی۔ ان کی پوری زندگی ہی لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے گزری تھی، زندہ رہتے تو لوگوں کے کام ہی آتے۔ کرشنا جی میرے واسطے صرف جائداد ہی نہیں چھوڑ گئے تھے، ایک اور بار بھی ڈال گئے تھے۔ میں سوچتا تھا اگر ان کے قاتلوں کو درگزر کرکے بمبئی سے چلا گیا تو مجھے کہیں چین نہیں ملے گا اور کرشنا جی کی روح بھی مجھ سے شاکی رہے گی۔ بتھل سنے گا تو طمانچے مارے گا لیکن اگر مجھے کوئی بتادیتا کہ وہ فلاں شخص ہے تو میں کبھی کا اس کے سینے میں چاقو اتار چکا ہوتا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ سیٹھ شمبھو کے وہ کون سے آدمی تھے جو اس حملے میں شامل تھے۔ مستانہ کے بھی کئی آدمی آزاد ہوگئے تھے۔ وہ بھی میری طرف سے اپنے دل میں خار لیے پھر رہے ہوں گے۔ کرشنا جی کی وجہ سے پولیس کے کئی افسر میری صورت آشنا ہوچکے تھے۔ ایسی صورت میں اچھی طرح پہلے ادھر ادھر کا جائزہ لے لینا چاہیے تھا۔ جس طرح انھوں نے موقع محل کا خیال رکھا، مجھے بھی کرشنا جی کی طرف سے اسی نظم وضبط کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ مستانہ کے اڈے کی طرح یوں ہی گھستا چلا جاتا تو بعد میں میرے حوالے سے کرشنا جی ہی کی رسوائی ہوتی۔

مجھے اس تاخیر سے بہت گھٹن ہورہی تھی لیکن ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے سے تھے۔ میں نے انتظار کیا، شاید پولیس ہی کوئی کارنامہ انجام دے ڈالے۔ اب اتنی دیر گزر جانے کے بعد پولیس سے توقع رکھنا بے کار تھا۔ میں نے بہت سوچا اور سوچتے سوچتے میرا ذہن شمبھو سیٹھ کے نام پہ جاکے ٹھہر گیا۔ اسی شخص کی ایما پر سب کچھ ہوا ہوگا۔ اس کی اجازت کے بغیر اس کے آدمی کرشنا جی جیسے بڑے پولیس افسر کو ختم کرنے کی جرات نہیں کرسکتے تھے۔ مجھے کسی طرح اسے تلاش کرنا چاہیے تھا لیکن شمبھو سیٹھ تک رسائی آسان بات نہیں ہوگی۔ اس تک پہنچنے میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں اور درمیان میں بات خراب ہوسکتی ہے۔ بہتر یہی نظر آتا تھا کہ مناسب وقت کا انتظار کیا جائے جب تک لوگ کرشنا جی کا واقعہ بھول نہ جائیں اور میری صورت لوگوں کی نظروں سے معدوم نہ ہوجائے۔

دیر ہورہی تھی۔ کرشنا جی کی موت کو ایک مہینے سے زیادہ گزر چکا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کرسکا تھا۔ تمام کاغذات جوں کے توں پڑے ہوئے تھے۔ جولین نے اسکول جانا شروع کردیا تھا مگر وہ رہتی ہمارے ساتھ ہی تھی۔ وہ کچھ دبلی اور زرد ہوگئی تھی۔ ایک دن اس نے بہت دنوں بعد اپنا خوب صورت لباس پہنا اور مجھے اصرار کرکے اپنے ہمراہ سینی ٹوریم لے گئی۔ اس کے باپ کی حالت پھر خراب ہوچلی تھی۔ واپسی کے راستے میں جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ بس میں برابر بیٹھے ہوئے تھے، اس نے خواہش ظاہر کی کہ کسی ریستوراں میں چل کے چائے پینی چاہیے۔ ہم درمیان میں اتر گئے اور ایک بہت اونچے قسم کے ریستوراں کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ ریستوراں کا ماحول پرسکون تھا۔ کرشنا جی بھی ایک بار مجھے ایسے ہی ایک ریستوراں میں لے گئے تھے۔ میں گم سم بیٹھا تھا، جولین نے میرا ہاتھ دبا کے سرگوشی کی: "ہمیں بھی کچھ بولنا چاہیے۔"

"ہاں۔" میں نے گھبرا کے کہا "مگر تمھی باتیں کرو، میں سنتا رہوں گا۔"

"ظہیر!" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی "تم سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ بے شک تمھیں کرشنا جی کی موت کا بہت صدمہ ہوگا مگر اس سے کچھ کم مجھے بھی ہوگا۔ میں نے ان کی موت قبول کرلی ہے کیونکہ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اسے قبول ہی کرنا پڑتا ہے۔ تمھیں بھی ایسا کرنا چاہیے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ تم زندگی سے کب تک اتنے بے گانہ رہوگے۔ اگر تم مجھے اپنا ایک ہم درد سمجھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ میں تمھارے متعلق اچھی باتیں سوچ سکتی ہوں تو مجھے کچھ بتاؤ، آخر تم اتنے روٹھے ہوئے کیوں ہو؟"

میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں کہا "یہ سوال مجھ سے بہت لوگ کرتے ہیں اور مجھ سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ ایک کرشنا جی جدا نہیں ہوئے جولین!" میری آواز بھرا گئی "مت پوچھو۔"

"مجھے کچھ کچھ معلوم ہوا ہے اور اتنا تو میں خود اندازہ کرسکتی ہوں کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے تم جیسے آدمی کو گھن لگا دیا ہے۔ اب تو خیر اسے کرشنا جی کی موت کا سبب کہا جاسکتا ہے مگر میں نے دیکھا ہے کہ تم ان کی موجودگی میں کس طرح رہتے تھے۔ تم سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی اور کرشنا جی نے بھی تاکید کردی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے بتانے سے کچھ نہیں ہوگا ورنہ تم بتا دیتے اور ظاہر ہے، میری حیثیت ہی کیا ہے۔ میں تمھارے کسی کام نہیں آسکتی لیکن میں تمھارا دکھ ضرور بانٹ سکتی ہوں۔ مجھ پہ اتنے اعتماد کا اظہار ضرور کرو۔"

"اعتماد کی بات نہیں ہے جولین!" میں نے بیزاری سے کہا "مجھے تم پر پورا اعتماد ہے لیکن میں تمھیں کیا بتاؤں۔ شاید تم سے چمپا نے کچھ کہا ہو۔"

"چمپا دیدی نے صرف اتنی بات بتائی ہے کہ تم سے تمھارے کچھ عزیز

بچھڑ گئے ہیں مگر اتنی بات تو تم سے قریب رہنے والا کوئی بھی شخص جان سکتا ہے تم نے خود بھی کئی بار اس قسم کی باتیں کی ہیں کہ تمہارا کوئی گھر نہیں ہے تمہارے پاس وقت کی کمی نہیں ہے تم پڑھنا نہیں چاہتے دوسرے نوجوانوں کی طرح تمہاری کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے بمبئی جیسے شہر میں رہتے ہوئے تم گھر میں گھسے رہتے ہو، تم اپنی اس عمر میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ کرشنا جی کے اور تمہارے ناموں کا فرق اتنا واضح ہے کہ کوئی بھی تمہارے بارے میں آسانی سے چند رائیں قائم کرسکتا ہے تمہیں اس حالت میں دیکھ کے جی بہت کڑھتا ہے بہت رونا آتا ہے۔" اس نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا اور خاموش ہوگئی۔

"میرے متعلق اتنا مت سوچو جولین! تمہاری اپنی پریشانیاں کچھ کم نہیں ہیں تمہارے باپ بیمار ہیں ماں اکیلی رہتی ہیں اب تمہیں ان کے پاس چلی جانا چاہیے۔"

"تمہیں اس طرح چھوڑ کے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے اور نہ مجھے کچھ ہوگا۔ میری فکر مت کرو مجھے آسانی سے موت نہیں آئے گی یہ تو میری زندگی کا معمول ہے میں اسی طرح لوگوں کو ستاتا رہوں گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تم ٹھیک نہیں ہو۔" اس نے اتنی زور سے کہا کہ قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ اسے احساس ہوا تو وہ سٹ پٹا سی گئی اور سر جھکا کے ندامت سے بولی "مجھے افسوس ہے لیکن ظہیر تمہیں اپنے متعلق سوچنا چاہیے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو مان جاؤ ظہیر میرے ساتھ گھر چلو میں تمہارے کسی معاملے میں حائل نہیں ہوں گی مجھے تم سے کچھ درکار نہیں ہے میری صرف اتنی آرزو ہے کہ تمہارے کچھ دکھ کم ہوجائیں، شاید تم تسلیم کرتے ہو کہ میں ایک بُری لڑکی نہیں ہوں میرے ساتھ رہ کے تمہیں کچھ بُرا محسوس نہیں ہوگا۔"

میرا سر بھن بھنانے لگا اور میں نے اپنی آنکھیں زور سے بند کرلیں میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ بیرے نے میز پہ چائے لا کے رکھ دی تھی، جولین چائے بنانے لگی پھر جب اس نے چائے کی پیالی آگے کر کے مجھے ہولے سے آواز دی تو میں نے سر اٹھایا۔ اس کا تمتماتا ہوا چہرہ میرے سامنے تھا اور اس کی بڑی بڑی اور گہری آنکھیں مجھی پہ ٹکی ہوئی تھیں اس کی ان آنکھوں سے میرا جسم لرزنے لگتا تھا۔ وہ کورا کی آنکھوں سے کسی قدر مشابہ ضرور تھیں، پہلے البتہ ایسی نہیں لگتی تھیں، میں نے بوکھلا کے ادھر ادھر دیکھا۔ ریستوراں میں بیٹھے ہوئے بیشتر لوگوں کی نظریں جولین پر مرکوز تھیں اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میرے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی ہے جو حسن و جمال میں ہزاروں میں ایک ہے اور آج اس نے جو لباس پہنا ہے حالانکہ سادہ ہے مگر وہ اس میں اور بھی اچھی لگنے لگی ہے۔ میں نے جلدی جلدی چائے حلق۔ میں

انڈیلی اور اس سے کہا "اب چلو" وہ کچھ دیر متذبذب رہی مگر دوسرے لمحے اس نے ایک گہری سانس لے کے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کردیا۔ بل ادا کرتے ہی ہم اٹھ گئے۔ میں نے غیر ارادی طور پر پلٹ کے دیکھا، سب ہماری طرف متوجہ تھے۔ ریستوراں سے باہر نکل کے ہم کچھ دور تک پیدل چلتے رہے سڑکوں پر اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ اس نے ایک دکان کے قریب رک کے اچانک مجھ سے پوچھا "تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں" میں نے حیرانی سے کہا "مجھے کس چیز کی ضرورت ہوگی۔"

"کسی بھی چیز کی۔ آدمی کی سینکڑوں ضروریات ہوتی ہیں۔"

"ہاں ہوتی تو ہیں مگر.... مگر مجھے کوئی چیز یاد نہیں آرہی ہے" میں نے جھجک کے کہا "تمہیں تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؟ مجھے معاف کرنا، میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں۔"

وہ مسکرانے لگی "چلو تمہیں کچھ خیال تو آیا۔"

"بتاؤ، تم کیا خریدنا چاہتی ہو؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں" وہ سوچتے ہوئے بولی "پھر کبھی آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے اس سے ضد نہیں کی۔ ہم دونوں بس میں سوار ہونے کے بجائے پیدل ہی راستہ طے کرتے رہے، بازاروں میں گھومتے ہوئے میری نظریں ہمیشہ بھٹکی رہتی تھیں۔ میں آنے جانے والوں کے چہرے دیکھتا رہتا تھا، شاید کسی دن تقدیر پھر جائے اور وہ کہیں مل جائے۔ سنا تھا آدمی کی قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہماری رفتار تیز نہیں تھی۔ ایک جگہ کچھ آگے فٹ پاتھ پر زیادہ بھیڑ تھی ہم آگے بڑھے تو ہمیں چیخ پکار سنائی دی۔ غالباً کوئی جھگڑا وغیرہ ہوگیا تھا۔ ہم نے راستہ بدلنے کا ارادہ کیا مگر دفعتہ سامنے سے آدمیوں کا ایک ریلا ہماری جانب بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے جولین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے تیزی سے کھینچ کے اپنے پیچھے کرلیا۔ وہ سہم کے میری کمر سے چپک گئی پھر بھاگتے ہوئے لوگ ہمارے پاس سے گزر گئے تو جولین نے مجھے ٹہوکا مارا، میں نے مڑ کے دیکھا۔ ایک نوجوان کچھ دور جا کے رک گیا تھا اور ہمیں حیرت بھری نظروں سے گھور رہا تھا، مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے جولین کی گلی میں میرا داخلہ بند کرنے کی کوشش کی تھی، مجھے اس کا نام یاد نہیں تھا۔ اس کے ساتھی اسے ماسٹر کہہ کے پکارتے تھے۔ میں نے اس کی نیت بھانپنے کا تحمل کیا، اس کے ارادے بُرے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہا۔ ادھر مجمع بھی چھٹ گیا تھا۔ پولیس آگئی تھی۔ ہمارے چلنے سے پہلے ماسٹر نے جھجکتے ہوئے مجھے سلام کیا۔ میں نے منہ پھیر لیا لیکن ماسٹر تیزی سے میرے پاس آگیا اور میرے آگے گردن جھکا کے خاموش کھڑا ہوگیا "کیا مرضی ہے ماسٹر؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ماسٹر اپن نہیں ہے ماسٹر تم ہے اپن تو ڈنکی ہے۔" اس نے میری

پنڈلیاں پکڑ لیں اور عاجزی سے بولا "اپن کو ایکس کیوز کردو ماسٹر! سالا اس دن اپن کا مغز پھر گیا تھا۔"

"میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"اپن کو معلوم ہے یو آر گریٹ مین۔ اپن نے اس سالا فنٹاسٹک سٹی میں بہت سے فنٹوشوں کو لوم مارتے دیکھا پر اپن نے تمہارا جیسا ہاتھ نہیں دیکھا۔ اب بھی اپن کی کمر میں کبھی کبھی پین اٹھتا ہے۔" پھر وہ جولین سے مخاطب ہو کے تیزی سے بولا "اپن کو تم سے بھی ایکس کیوز کرتا ہے۔ کون اپن کا سسٹر ہے۔ اپن کو معلوم ہوا تھا کون ادھر سے چلا گیا ہے ماں قسم اپن پھر اُدھر نہیں گیا۔"

"ٹھیک ہے، ہمیں اب تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، ہم نے اس دن حساب صاف کردیا تھا حساب صاف کرنے کے بعد ہم کچھ یاد نہیں رکھتے" میں نے سرسری انداز سے کہا "آگے سنبھل کے رہنا۔"

اس نے سر ہلا کے اقرار کیا "اپن پرامس کرتا ہے ماسٹر! اس دن کے بعد سے اپن نے تم کو بہت کھوج کیا، آج اتنے دن بعد تم دکھائی دیا ہے۔ اپن کا لک ہے کہ کون بھی تمہارے ساتھ ہے۔ اپن پہ ہار ٹبیٹ کا نگری چولیشن۔ وہ جوانی سالا ایک دم ڈفر ہے اپن پہلے ہی ڈیکلیر کردیا تھا کہ کون کو کوئی کنگ ہی لے جاسکتا ہے۔ کون از سپرب۔ بہت سا چھوکری لوگ اُدھر رہتا ہے پر کون جیسا چھوکری بائی چانس پیدا ہوتا ہے۔ کون سب ڈفرینٹ تھا اور سب سے ڈفرینٹ آدمی کے پاس گیا۔"

"زیادہ بات مت کرو۔" میں نے غصے سے کہا۔

"آئی ایم ساری ماسٹر!" وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگا۔

"ابھی تم کو اپنی زبان ٹھیک کرنی چاہیے۔"

"ویری ٹرو ماسٹر! یہ سالا زبان بہت چلتا ہے ماسٹر! لو اسے اپنے ہاتھ سے کاٹ دو نہ سالا یہ ہوگا، نہ چلے گا۔ اپن کا تو ہاتھ سے زیادہ زبان چلتا ہے۔"

"ٹھکانے پہ بیٹھنا ہے تو پہلے ہاتھ چلانا سیکھو پھر زبان چلتی ہوئی بھی اچھی معلوم ہوتی ہے ورنہ چھری لگاؤ۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ماسٹر! اس لیے تو سالے سٹی میں تمہارا کھوج لگاتا پھرتا تھا۔ آج تم مل گیا ہے تو اپن تم سے ایک ریکویسٹ کرے گا۔ ماسٹر! انکار مت کرنا۔"

"کیا بات ہے؟"

"بات کچھ نہیں ماسٹر!" وہ لجاجت سے بولا "پر اپن کا لائف بن جائے گا۔ اپن کو اپنی سروس میں لے لو ماسٹر! اپن بالکل چینج ہوجائے گا، جیسا تم بولے گا، ویسا کرے گا، اپن ڈے اینڈ نائٹ تمہارا چمچی کرے گا۔ ہاتھ چلانا سکھا دو ماسٹر!" اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ "آدمی بنا دو ماسٹر!"

جولین نے میرا بازو نوچ کے چلنے کے لیے کہا لیکن ماسٹر بُری طرح عمل رہا تھا "تم پہچاننے میں غلطی کر رہے ہو ماسٹر! میرا کوئی اڈہ نہیں ہے اور نہ میں استادی شاگردی کا کام کرتا ہوں لیکن میں تمہیں رائے دوں گا کہ تم کوئی اور دھندا کرو تو بہتر ہے۔ ان کاموں میں کچھ نہیں رکھا اور یہ تمہارے بس کا روگ بھی نہیں معلوم ہوتا۔"

"ماسٹر! اپن کو ماسٹر مت بولو، اپن کو جنگلی بولو، اُلو کا پٹھا بولو۔ اپن کا نام مارٹن ہے ایدر سب لوگ باگ مارٹی بولتا ہے، مارٹی اس ٹائم پہچاننے کا مسٹیک نہیں کر رہا۔ مارٹی نے تمہارے پیچھے بہت دھکا کھایا۔ اپن جانتا ہے ایدر تمہارا کوئی اڈا نہیں، ایدر سٹی میں اپن سارا لوگوں کو جانتا ہے پر تم استاد ہے ایک دم ٹرو استاد۔ اپن اڈا نہیں استاد مانگتا ہے۔ تم نے اڈا کھول لیا تو ایدر سالا بمبئی میں سب کا اڈا فنش ہوجائے گا، سب کا بزنس ٹھپ ہو جائے گا۔ اپن بولتا ہے ماسٹر! ایدر بمبئی میں بہت سالا گڑبڑ ہے اپن کا۔"

وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "بہت جلتا ہے، پر یہ بودم کیا کرسکتا ہے ایک بار ٹرائی کرنے دو ماسٹر! نہیں چلا تو مارٹی یہ دھندا چھوڑ دے گا، سالا پان بیڑی سگریٹ بیچا کرے گا یا اس سٹی سے خلاص ہوجائے گا۔ ماسٹر! مارٹی کا ریکویسٹ ایکسپٹ کرو، مارٹی کے گلے میں اپنا پٹا ڈال دو ماسٹر!"

میں سوچنے لگا کہ اس سے کس طرح جان چھڑائی جائے۔ انکار کی صورت میں یہ اور راستہ کھوٹا کرتا رہے گا۔ جولین بار بار مجھے اشارے کر رہی تھی اور ماسٹر کبھی میری پنڈلیاں پکڑتا تھا، کبھی میرے ہاتھوں کو پیار کرتا تھا، اسے اتنا بھی خیال نہیں تھا کہ یہ ایک سڑک ہے اور میرے ساتھ ایک نوجوان لڑکی ہے۔ اتنا مجھے ضرور یقین ہوگیا تھا کہ اب اس کے دل میں کوئی کینہ نہیں ہے۔ میں نے اسے نرمی گرمی سے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا "تم کہاں رہتے ہو؟" کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے مجھے اپنا پتہ بتایا اور میرا پتہ پوچھنے لگا۔ میں نے نہیں بتایا۔ اس نے بھی ضد نہیں کی "میں کسی وقت خود تمہارے پاس آؤں گا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"آنے کی بات مت کرو ماسٹر! اپن کو ابھی ساتھ لے چلو، اپنے ڈور پہ باندھ دینا۔" وہ بے تابی سے بولا "اپن بہت خوار ہوگیا ہے ٹرسٹ کرو ماسٹر! ملٹی ایک دم ڈاگ کے مافک پہرہ کرے گا۔"

میں نے اسے ترشی سے سمجھایا تو وہ کسمسا کے مان گیا۔ اس نے جولین سے ایک بار پھر معافی مانگی اور مجھ سے کہنے لگا کہ وہ میرا انتظار کرتا رہے گا اور میں نے آنے میں دیر کی یا نہ آیا تو وہ میری تلاش میں سڑکوں پر نکل آئے گا اور جب تک میں اسے ساتھ لے نہیں جاؤں گا، وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ چاہے میری ناراضی کی صورت میں اسے جان کا خطرہ مول لینا پڑے۔ مجھے اس کے دیوانے پن پر بہت تعجب ہوا مگر وہ بے حد سنجیدہ تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے رگ پٹھوں میں ابھی تک میری کوئی ضرب اٹکی ہوئی تھی۔ وہ پریشان

پریشان بھی نظر آرہا تھا۔ آخر جب تک اُس نے مجھ سے وعدہ نہیں لے لیا، میرے سامنے سے نہیں ٹلا۔ پھر ہم آگے بڑھ گئے۔ جولین نے پیچھے مڑ کے یہ اطمینان کیا کہ وہ ہمارا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ اُس کے چہرے کی شگفتگی بحال ہوئی، وہ کچھ دیر تک چپ چاپ چلتی رہی پھر اُس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا: "یہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"تم اُس سے اتنی کیوں ڈر رہی تھیں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں پھر چاقو نہ نکال لے' اُس کا کیا بھروسا' میں اُس دن کا منظر کبھی نہیں بھول سکتی۔" وہ جھرجھری لے کے بولی۔

"چاقو نکالنا ایسا آسان نہیں ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب اُس کی طرف سے کوئی اندیشہ دل میں مت لانا۔"

"یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ وہ ایک نمبر لفنگا ہے۔ اُس سے کچھ بعید نہیں ہے۔ اُس کا دل کالا ہے۔" پھر وہ خود اپنی بات کی تردید کرنے لگی: "مگر...... مگر وہ کیا کہہ رہا تھا؟ یہ میں کیا سُن رہی تھی؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ آج ماری مجھے بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔"

"ہاں وہ خاصا بدل گیا ہے۔"

"مگر تم نے اُس سے وعدہ کیوں کیا کہ تم دوبارہ اُس کے پاس جاؤ گے؟ ایسے لوگوں سے دُور ہی رہنا ٹھیک ہے۔ تم اُس کے پاس مت جانا۔"

"دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو اُس سے نجات مل گئی۔"

"اُس کا ذکر ہی چھوڑ دو۔ مجھے اُس کے تصور سے متلی ہونے لگتی ہے۔ ہم نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔" وہ اُلجھتی ہوئی بولی: "تمھیں کچھ یاد آرہا ہے؟"

"نہیں، مجھے تو کچھ یاد نہیں آرہا۔"

"کچھ بھی نہیں؟" وہ شکایتی انداز میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

اِس کے بعد اُس نے کوئی بات نہیں کی، ہم ایک مختصر فاصلہ طے کر کے گھر جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ وہ میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ بس جھکولے کھاتی ہوئی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ جولین تمام راستے نظریں نیچی کیے خاموش بیٹھی رہی۔ بہت دیر ہوگئی، نہ اُس نے میری طرف دیکھا، نہ بات کی۔ آخر میں نے ہلکی آواز میں پوچھا: "کیا تم میری کسی بات سے ناراض ہوگئیں؟"

اُس نے چونک کے پہلو بدلا اور بجھی ہوئی آنکھوں سے میرا چہرہ تکنے لگی: "کیا مجھے تم سے ناراض ہونے کا حق حاصل ہے؟" اُس نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں، میری کوئی بات تمھیں بُری لگ سکتی ہے لیکن تم مجھے معاف کر دیا کرو۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے اسی لیے میں لوگوں کے ساتھ رہتے اور اُن سے بات کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

"اوہ نہیں۔" اُس نے بے قرار ہو کے کہا: "تم ایسی باتیں مت کرو۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ کوئی تم سے ناراض نہیں ہوتا بلکہ بات اس کے برعکس ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ شاید تم مجھ سے خفا ہو، شاید میرے ساتھ رہنے پر، شاید میرے زیادہ عمل دخل دینے پر یا کسی اور بات پر۔ تمھیں اس طرح گم سُم دیکھ کے عجیب عجیب خیال آتے ہیں۔"

"اور میں یہ سوچتا ہوں کہ میری وجہ سے تمھیں دُکھ ہو رہا ہے۔ تم نہ جانے کیا سمجھ رہی ہو گی۔ تم میرے ساتھ رہتی ہو، میرا خیال کرتی ہو اور میں کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ مجھے یہ احساس اور پریشان کر دیتا ہے۔"

"تم اپنے دل میں ایسا گمان کبھی مت کرنا۔ ضروری نہیں ہے کہ آدمی تبادلے میں ایک دوسرے کا خیال رکھے۔ کچھ چیزوں میں یہ سماجی تبادلہ نہیں ہوتا۔ ہر گھر دکان نہیں ہوتا اور اُس کے مکین سوداگر نہیں ہوتے، بتاؤ کیا ماں کا حق ادا ہوتا ہے؟ ماں اپنے بیٹے کی پرورش میں بہت دُکھ جھیلتی ہے مگر کیا ماں کو اس انداز سے سوچنا چاہیے کہ اُس کا بیٹا اُس کی شفقت کا معاوضہ ادا نہیں کر رہا ہے؟ کچھ لوگ اب بھی اس بری دُنیا میں ایسے ہیں جو ان باتوں سے بلند ہو کے سوچتے ہیں۔"

"تم بہت اچھی ہو۔ بہت اچھی باتیں کرتی ہو۔"

"تم بھی کچھ کم اچھے نہیں ہو۔ بعض اوقات تو مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ میں تمھاری طرح کیوں نہیں ہوں۔" وہ مسکرا پڑی اور ہونٹ بھینچ کے بولی۔

"ظہیر! خوش رہنے کی کوشش کیا کرو۔ دُکھوں کا علاج یہ نہیں ہے کہ آدمی خوشیوں سے کنارہ کر کے اپنے دُکھ اور بڑھا لے۔ ہمت سے کام لینا چاہیے۔ پتہ نہیں۔" وہ اٹک اٹک کے بولی: "میں تم سے یہ باتیں کرتے ہوئے کیسی لگ رہی ہوں۔"

"تم اچھی لگ رہی ہو۔"

ایک اسٹاپ پر کچھ اور مسافر بس میں سوار ہو گئے۔ بس کھچا کھچ بھر گئی۔ ہم نے باتیں بند کر دیں اس لیے کہ ہمارے نزدیک بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے تھے اور ہم پر گرے جا رہے تھے۔ جب بھی میں بس میں بیٹھتا تھا میرا ذہن بھی بس کے ساتھ ساتھ سفر کرتا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ بس متعینہ راستے پر چلتی تھی اور میرے خیالوں کا کوئی راستہ طے نہیں تھا۔ بس سڑک پر چلتی تھی اور میرا ذہن ہوائی جہازوں کی طرح آسمانوں میں اُڑتا تھا۔ میں خواب دیکھتا رہتا تھا کہ اگلے اسٹاپ پر اُتروں گا تو مجھے کرن نظر آجائے گی، میں اُسے دیکھوں گا تو میرا کیا حال ہوگا؟ اُس کا کیا حال ہوگا؟ وہ مجھے پہچانے گی بھی یا نہیں؟ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اُس میں اور مجھ میں بہت فرق آگیا ہوگا۔ شاید مجھ سے زمین پر کھڑا نہ رہا جائے۔ میں تو بے ہوش ہو جاؤں گا۔ بس میں سفر کرتے ہوئے مجھے بہت سکون ملتا تھا کیونکہ میں اُسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور جب کنڈکٹر سفر ختم ہونے کا اعلان کرتا تو میرے خوابوں کا شیرازہ بکھر جاتا تھا۔

اسٹاپ آنے سے پہلے جولین نے مجھے بیدار کیا۔ میں اُس کے لیے بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا نیچے اُترا۔ چمپا گھر میں اکیلی نہیں تھی، ایس پی شکلا بھی موجود تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو مسکرا کے بولا: "کہاں سیر ہو رہی ہے ظہیر خاں!"

مجھے نہ جانے کیوں جھینپ آگئی: "کہیں نہیں۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"آج تو کچھ مزاج ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"آپ نے کیا کیا؟" میں نے بات بدلنے کی کوشش کی: "کوئی سراغ ملا یا ابھی تک آپ آنکھ مچولی ہی کھیل رہے ہیں۔"

"دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے ظہیر خاں!" وہ شکستگی سے بولا: "اب شاید کبھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ جو لوگ کرشنا جی سے لگاؤ رکھتے تھے اور انھیں کرشنا جی اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی طرح مشورے دیتے تھے' وہ شاید ہمیشہ شرمندہ رہیں گے۔ فیڈرل گورنمنٹ کی طرف سے سختی کے ساتھ احکام آرہے ہیں کہ مجرم جلد از جلد گرفتار کیے جائیں مگر ایک دن فیڈرل گورنمنٹ بھی تھک کے خاموش ہو جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہونا چاہیے شکلا جی! ایسا نہیں ہوگا۔" میری آواز کانپنے لگی۔ شکلا میرے پاس آ کے میری کمر تھپ تھپانے لگا: "تم نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تم مدراس بھی نہیں گئے۔ وہاں سے کرشنا جی کے منیم کا خط آیا تھا۔ تمھیں اس طرف توجہ دینی چاہیے۔"

"مگر میں کیا کر سکتا ہوں' مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ہائیں۔" وہ حیرت سے بولا: "تمھیں کرشنا جی کے معاملوں سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا شکلا جی کہ میں کیا کروں۔"

"تمھیں وہاں جانا چاہیے۔ اگر تم کہو تو تمھارے ساتھ میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کرشنا جی نے ایک بڑی جائداد چھوڑی ہے' ہمارے اندازے سے زیادہ۔ وہ مدراس کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس کی ملازمت تو انھوں نے شوق اور لوگوں کی خدمت کے لیے اختیار کی تھی، تم چاہو تو چمپا دیدی اور مس جولین کو بھی ساتھ لے لو۔"

"یہاں کون رہے گا؟" چمپا نے جلدی سے کہا: "جولین کو لے جاؤ۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے ظہیر کے لیے شکلا جی کا ساتھ کافی ہے' میں گئی تو یہاں چمپا دیدی اکیلی رہ جائیں گی۔ کام نمٹا کے آپ لوگ جلدی آجائیے گا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میرا جانا مناسب ہوتا مگر اس موقع پر جانا...." جولین چپ ہو گئی۔

میں سُنتا رہا۔ شکلا نے دوسرے دن مجھے مدراس چلنے کا حکم سُنا دیا۔ میں نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ ظاہر ہے کرشنا جی مجھے جس اُلجھن میں ڈال گئے تھے' اُس سے کسی نہ کسی صورت تو نکلنا تھا۔

دوسرے دن شکلا مقررہ وقت پر آگیا۔ چمپا اور جولین نے میرا سامان تیار کر دیا تھا۔ چمپا نے میرے بازو میں امام ضامن باندھا اور جولین نے اپنے ہاتھ سے سینڈوچ بنا کے دیے، وہ بہت لذیذ سینڈوچ بناتی تھی۔ میں نے تمام کاغذات شکلا جی کو دے دیے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ہر سفر سے پہلے ایسا ہی ہوتا تھا۔ ریل میں بیٹھ کے میں راستے بھر کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا جاگتا رہا۔ ہر اسٹیشن پر اُتر کے میں پلیٹ فارم کا ایک چکر لگا کے واپس آجاتا۔ اسٹیشن پہ اسٹیشن گزرتے رہے اور مدراس آگیا۔ کرشنا جی کا منیم اور دوسرے کارندے ہمیں اسٹیشن پر لینے کے لیے آئے۔ جب شکلا نے اُن سے میرا تعارف کرایا تو اُن کی آنکھوں میں بے چینی ہویدا ہوئی۔ منیم نے فوراً میرے ہاتھ چومے اور گلے لگ کے میری ٹھوڑی کو بوسہ دیا اور باقی کارندوں نے پیر چھوئے۔ وہ ہمیں کرشنا جی کے گھر لے گئے۔ کرشنا جی کا سامان اُن کی تصویریں اور عمارت کے آنگن میں تیج چمن دیکھ کے میری طبیعت بوجھل ہو گئی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد منیم نے جائداد کی تمام تفصیلات ہمیں بتانی شروع کیں۔ شہر میں کرشنا جی کے کئی اور مکانات بھی تھے اور نواح میں چند زمینیں تھیں جن کی دیکھ بھال اُن کی ماں کرتی تھیں۔ منیم نے کرشنا جی کے متعلق ہمیں بہت سی باتیں بتائیں کہ وہ اپنے باپ کے اکلوتے لڑکے تھے۔ اُن کی ایک بہن نوجوانی میں مر گئی تھی۔ یہ ساری جائداد اُن کے باپ کی تھی جو کرشنا جی کی شادی کی آرزو میں مر گئے۔ منیم کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے خاندان والوں سے بالکل مختلف تھے۔ باہر رہتے تو کبھی گھر سے ایک پیسہ نہیں منگاتے تھے۔ گھر آتے تو ایک ایک آدمی سے اُس کا حال پوچھتے، بچوں کی خیریت دریافت کرتے اور ہر بار اُس کی کوئی نہ کوئی مدد کرتے۔

بوڑھا منیم کرشنا جی کے واقعات بتاتے ہوئے زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ اُن کی عادات' پسند' مشاغل اور اُن کی ایک ایک بات بتاتا تھا اور آہیں بھرتا تھا۔ کہتا تھا کہ کرشنا جی نے ولایت جا کے تعلیم حاصل کی تھی اور ہمیشہ کتابوں میں گم رہتے تھے۔ موٹا جھوٹا لیکن صاف ستھرا پہنتے تھے۔ اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتے تھے۔ سادہ اور اچھا کھانا کھاتے تھے۔ تمام ملازم اُن کے مدراس واپس آنے کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ اپنی ماں سے محبت تھی اور ماں کو اُن سے۔ ابھی تک گھر پر سوگ طاری تھا۔ جو ملازمہ کرشنا جی کی ماں کے ساتھ بمبئی گئی تھی وہ تیجے کے فوراً بعد واپس آگئی تھی۔ اُس نے دونوں ماں بیٹوں کی موت کی تفصیلات سنائیں تو کئی روز تک کارندوں کے گھروں میں چولھا نہیں جلا' ہم دونوں سر جھکائے اُن کی باتیں سنتے رہے پھر شکلا اور میں منیم کے ساتھ جائداد کا جائزہ لینے کے لیے شہر کے مختلف علاقوں اور نواح میں پھرتے رہے۔ دوسرے دن کہیں شام کو ہم اس کام سے فارغ ہوئے۔ میری حیثیت تو ایک تماشبین کی سی تھی۔ شکلا ہر جگہ رُک کے منیم سے سوالات کرتا اور کاغذ پر کچھ لکھتا جاتا، پھر میرا چہرہ دیکھتا اور میری رائے پوچھتا۔ میں اُسے کیا رائے دیتا، کرشنا جی نے نہ جانے کیا سمجھ کے یہ سب کچھ میرے نام کیا تھا۔ رات کو منیم وغیرہ ہمیں کمرے میں چھوڑ کے چلے گئے تو شکلا میرے سرہانے آگیا۔ اُس نے متوحش لہجے میں مجھ سے پوچھا: "تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"کس بات کا ارادہ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم نے کل اور آج تمام جائداد دیکھ لی ہے۔ یہ ایک خاصا بڑا کام ہے۔ یقیناً تمھارے ذہن میں کوئی تدبیر ہو گی۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے شکلا جی! میں تو حیران ہوں کہ کرشنا

ہم نے یہ کیا کیا۔ میں تو انھیں پریشان کرتا رہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ نہ مجھے ان کاموں کا تجربہ ہے نہ ان سے دلچسپی ہے۔ آپ ہی بتائیے کیا کیا جائے؟"

"ظہیر خاں! یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ تم سرسری گزر جاؤ۔ اب تمھیں بہر حال اِس سے نمٹنا ہے۔ کرشنا جی نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی تمھیں اس کا وارث مقرر کیا ہے، وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی تھے۔"

"لیکن انھوں نے کوئی اچھا فیصلہ نہیں کیا، انھوں نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا۔ اب میں کیا کروں گا؟ کیا میں حساب کتاب رکھتا پھروں گا؟" میں نے تلملا کے کہا۔

"حساب کتاب تمھارا اپنا ہوگا ظہیر خاں کسی اور کا نہیں، اس طرح مت سوچو۔ یہ دیکھو کہ ایک شخص نے تمھیں کس قدر عزیز سمجھا، آہ وہ جب بھی تمھارا تذکرہ کرتے تھے۔ مجھے حیرت ہوتی تھی، میں سمجھتا تھا کہ کرشنا جی مبالغے سے کام لے رہے ہیں لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے آخری کرب ناک لمحوں میں بھی ایک برمحل اور موزوں فیصلہ کیا ہے۔"

"آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں ظہیر خاں! میں سچ کہہ رہا ہوں میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا بہر حال انھوں نے غلط کیا یا اچھا کیا، مسئلہ یہ نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ اب اُن کی خواہش کی تکمیل کس طرح کی جائے۔"

"میرا خیال ہے یہ سب جائداد غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔"

"یہ کام تو خود کرشنا جی بھی کر سکتے تھے۔ بے شک اب تم اس کے مالک ہو مگر جب انھوں نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا ہوگا تو تمھاری خوش حالی اور تمھاری ایک اچھی زندگی ان کے مدِ نظر ہوگی۔ موت کے روز وہ تم سے بہت خوش تھے، کہہ رہے تھے، میں ظہیر کو مدراس لے جاؤں گا وہاں ماں جی بھی اکیلی رہتی ہیں اور بہت بوڑھی ہو گئی ہیں کرشنا جی جب موڈ میں ہوتے تھے تو مجھ سے بہت سی باتیں کرتے تھے، میں تمھارے انکار اور دکھ کی کچھ کچھ وجہ جانتا ہوں۔ فکر مت کرو ظہیر! سب چیزیں درست ہو جائیں گی۔ کرشنا جی نے جو سرکلر روانہ کیے ہیں، ممکن ہے اُن کا جواب آ جائے اور تمھاری پریشانیاں ختم ہو جائیں۔"

"سرکلر؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے ایسا کوئی سرکلر روانہ کیا تھا؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا۔ ابھی تک کسی جگہ سے کوئی جواب نہیں آیا ہے۔ آئے گا تو سب سے پہلے مجھے معلوم ہوگا۔" شکلا نے تاسف سے کہا۔

"اور انھوں نے آپ کو میرے بارے میں کیا کیا بتایا تھا؟" میں نے مضطرب ہو کے پوچھا۔ "مجھے ایک ایک بات بتائیے۔"

"اور کچھ نہیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ یہ خط وہ کس سلسلے میں لکھ رہے ہیں۔ کرشنا جی کی موت کے بعد جب تم سے قریب ہونے کا موقع ملا تو مجھے یہ قیاس کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اتنی شدید اور ذاتی دلچسپی وہ صرف ایک شخص میں لے سکتے ہیں، گو وہ ہر کیس میں پورے انہماک سے کام کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ پولیس کے ریکارڈ میں کوئی ایسا کیس بھی نہیں تھا۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ "آپ کا اندازہ درست ہے، وہ خط کرشنا جی نے میرے کھوئے ہوئے عزیزوں کے سلسلے میں لکھا تھا اور انھوں نے مجھے بھی آخری لمحوں میں بتایا تھا مگر شکلا جی!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "یہ بات آپ ہی تک محدود رہے تو مجھ پر آپ کا احسان ہوگا۔"

"نہیں ظہیر خاں! یہ راز میرے سینے میں امانت کے طور پر محفوظ رہے گا اور میں کوشش کروں گا کہ محکمے میں کسی اور کو اس کی ہوا بھی نہ لگے، یہ ڈاک کرشنا جی کے نام پر آئے گی، اُن کے تمام امور اُن سے قریب ہونے کے باعث میرے سپرد تھے، اب بھی مجھی کو اُن کا نگراں بنایا گیا ہے لیکن ظہیر خاں! کیا اس سلسلے میں تم مجھے کچھ بتانا پسند کرو گے؟"

"پھر سہی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"خیر پھر سہی میری دلی تمنا ہے کہ تمھاری تمام الجھنیں دور ہو جائیں۔"

"ہاں شکلا جی! تمنا تو سبھی کی ہوتی ہے لیکن بر نہیں آتی۔"

"اُمید رکھو۔" اس کے سوا وہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا، شکلا بھی یہی کہہ رہا تھا۔ کرشنا جی، بجھن، زرین، چمپا اور جولین سب یہی کہتے تھے مگر اُمید بر آنے کا وقت کوئی نہیں بتاتا تھا۔ سب جھوٹ بولتے تھے، مجھے بچہ سمجھ کے بہلاتے تھے۔ جب کوئی اُمید کی بات کرتا تھا تو مجھے اور گھٹن ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد شکلا پھر جائداد کے موضوع پر بات کرنے لگا۔

"کیا تم مدراس میں رہ سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں شکلا جی! میرے لیے یہ بہت مشکل ہے، آپ جائداد کا کوئی اور انتظام کر دیجیے۔ آپ ہی کوئی بہتر تدبیر سوچیے، میرا دماغ کام نہیں کرتا۔"

"ایک صورت میرے ذہن میں آ رہی ہے بشرطیکہ تم اس پر آمادہ ہو جاؤ۔" شکلا نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "میں بھی اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ اِن حالات میں تم مناسب طور پر فرائض انجام نہیں دے سکو گے۔"

"مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"ایسے نہیں، سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ ممکن ہے میں اپنی جگہ ٹھیک نہ ہوں۔ میری رائے ہے کہ تم یہ جائداد بیچ دو اور ساری رقم بینک میں محفوظ کرا دو، جب حالات کسی قدر درست ہو جائیں تو اس رقم سے تم کسی وقت بھی نئی جائداد خرید سکتے ہو اور کوئی بھی کام شروع کر سکتے ہو، میرے اندازے کے مطابق لاکھوں روپے سے کم یہ اثاثہ کیا ہوگا۔"

"لاکھوں روپے؟"

"ہاں لاکھوں روپے۔" وہ تشویش سے بولا۔ "کئی لاکھ روپے تم نے آج اور کل پھر کیا دیکھا؟ اِن کی فروخت میں مہینوں دیر لگ سکتی ہے مگر اچھا ہے کہ ہم یہ کام نمٹا کے ہی واپس چلیں۔"

مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کسی مکان کی کیا قیمت ہو سکتی ہے شکلا اپنی نوٹ بک نکال کے مجھے تفصیل بتانے لگا۔ وہ بہت سنجیدہ تھا اور گھبرا گھبرا کے سرگوشیوں میں باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی سُن نہ رہا ہو۔ اُس کی آواز میں حیرت کا عنصر بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے زرین یاد آنے لگی۔ اُس کی جائداد کی مالیت بھی کم و بیش اتنی ہی ہوگی۔ اُدھر فیض آباد میں بھی میرے نام ایک بڑی حویلی، دوسرے مکانات، باغات اور زمینیں تھیں۔ اِدھر کرشنا جی مدراس میں یہ انتظامات کر گئے تھے۔ شکلا کہہ رہا تھا۔ "تم اس دولت سے ایک بہترین زندگی شروع کر سکتے ہو، دُنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہو۔" میں نے سوچا کہوں وہ دولت کس کام کی جس سے میں ایک شخص کو واپس نہیں لا سکتا، اُسے خرید نہیں سکتا۔ میں نے شکلا سے کچھ نہیں کہا۔ اُس کی رائے ٹھیک ہی معلوم ہوتی تھی میں نے حامی بھر دی لیکن شکلا اُس کے مختلف پہلوؤں پر تبصرے کرتا رہا۔ کرشنا جی کی آبائی جائداد بیچنے کے فیصلے سے وہ بھی نامطمئن نظر آ رہا تھا اور مجھے بھی اس فیصلے سے خوشی نہیں تھی، ہم دونوں دیر تک متذبذب رہے۔ پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہے۔ مُنیم ہمارا یہ فیصلہ سُن کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی کہ میں کرشنا جی کی ماں کی طرح وہاں بیٹھ کے آمدنی کا حساب کتاب رکھوں ورنہ پھر میں نے زرین کو کیوں رُلایا تھا۔ وہ تو اب تک مایوس نہیں ہوئی ہوگی۔

باقی دنوں میں شکلا بے حد مصروف رہا۔ کچہری، وکیل، گاہک، اس مکان کے کاغذات، اُس زمین کی دستاویزات۔ ہمیں مدراس آئے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ گزر گئے تھے۔ شکلا پیش کشیں قبول کرتا اور رد کرتا رہا۔ ہر وقت بنگلے میں لوگوں کی بھیڑ رہنے لگی۔ اس درمیان ایک دن جولین کا خط آیا۔ اُس نے لکھا تھا کہ تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟ خیریت کی کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔ بہت تشویش ہے، اور لکھا تھا کہ یہاں ہر وقت تمھارا تذکرہ رہتا ہے، تمھاری بڑی فکر رہتی ہے، اپنی صحت کا خیال رکھنا، مدراسی کھانے زیادہ مت کھانا۔ کپڑے روز بدلتے رہنا، چمپا دیدی تمھیں بہت دعائیں دے رہی ہیں۔ مدراس سے ہمارے لیے کیا لاؤ گے؟ دوسا تو لا نہیں سکتے، آتے آتے خراب ہو جائے گا، پھر اُس نے اپنے باپ کے بارے میں لکھا تھا کہ اُس کی حالت روز بہ روز گرتی جا رہی ہے۔ اُس نے یہ مختصر خط انگریزی میں لکھا تھا۔ میں نے اُسے کئی بار پڑھا اور جواب دینے کا ارادہ کیا لیکن سوچتا ہی رہ گیا کہ کیا لکھوں۔ کیا یہ لکھوں کہ کرشنا جی کا چھوڑا ہوا خزانہ سمیٹ رہا ہوں۔ اسی کام سے فرصت نہیں ہے، کسی اور طرف کیا دھیان دوں، یہاں ایک دُکان پر بیٹھا ہوں، ہر طرف سے گاہک آ رہے ہیں اور مول تول ہو رہا ہے۔ پھر جلد ہی جولین کا دوسرا خط آ گیا۔ اُس نے میرے جواب نہ دینے کی شکایت کی تھی اور لکھا تھا۔ مجھے جلد سے جلد آنے کا پروگرام بنانا چاہیے۔ ماسٹر مارٹی نے گھر دیکھ لیا ہے۔ وہ تمھارا پتہ جاننے کے لیے مضطرب ہے، میں نے اُسے بتایا کہ تم مدراس میں ہو، اُسے یقین نہیں آیا۔ وہ صبح و شام کئی بار گھر آتا ہے اور میری خوشامد کرتا رہتا ہے۔ ایک دن اسکول سے واپسی پر راستے میں اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا، مجھے خبر بھی نہیں ہوئی اور وہ میرا پیچھا کرتا ہوا گھر تک پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے تنگ بالکل نہیں کیا ہے لیکن تم نہیں ہوتے ہو تو مجھے اُس سے بہت ڈر لگتا ہے، بتاؤ میں اُس سے کیا کہوں؟

خط کے آخر میں اُس نے پچھلے خط کے مانند باتیں لکھی تھیں اور درخواست کی تھی کہ میں اس بار اُس کے خط کا جواب ضرور دوں۔ میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ میں نے شکلا سے اصرار کیا کہ وہ مجھے بمبئی جانے کی اجازت دے دے یا یہ معاملات جلدی جلدی ختم کرے۔ شکلا مجھ پر ناراض ہونے لگا کہ وہ تو صبح و شام اسی کام میں مصروف ہے۔ میری موجودگی ضروری ہے کیونکہ تمام کاغذات پر دستخط مجھی کو کرنے ہیں۔ میں نے کہا، میں مختار نامہ لکھے دیتا ہوں، آپ جو مناسب سمجھیں کرتے رہیے گا۔ شکلا نے انکار کر دیا، پھر مجھے اپنی بات سے خود شرمندگی ہوئی۔ شکلا بیچارہ اپنے گھر اور دفتر سے چھٹی لے کے محض کرشنا جی کی محبت میں یہ تمام کام کر رہا تھا۔ اُسے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نے اُس سے اپنے رویے کی فوراً معافی مانگ لی اور گزارش کی کہ وہ جولین کو تسلی کے دو لفظ لکھ دے۔ شکلا نے اس پر تعجب ظاہر کیا کہ میں وہ دو لفظ خود کیوں نہیں لکھتا۔ میں نے کہا، مجھے خط لکھنے کی عادت نہیں ہے، میں نے آج تک کسی کو خط نہیں لکھا۔ اس جواز پر شکلا نے میری طرف سے جولین کو جواب دے دیا۔ جولین سمجھی ہوگی کہ ابھی میں نے اتنا کہاں پڑھا ہے کہ کسی کو خط لکھ سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ ماسٹر مارٹی جولین کو زیادہ پریشان نہیں کرے گا اور یہاں کام سمٹ ہی رہا ہے۔ میں جلد وہاں پہنچ جاؤں گا اور مارٹی کو سمجھا بجھا دوں گا کہ بمبئی میں ایک سے ایک اُستاد پڑا ہے، وہ کوئی اور در دیکھے۔

ڈیڑھ مہینے کی مدت میں شکلا، کرشنا جی کی تمام جائداد اُس کے بقول مناسب قیمت پر فروخت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تمام روپیہ میرے دستخطوں سے بینک میں جمع ہوتا رہا۔ کرشنا جی کی تصویریں، اسناد، خطوط، کتابیں اور ذاتی سامان وغیرہ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہم نے صندوقوں میں بند کر دیا اور باقی سارا سامان بیچ دیا۔ بینک میں کرشنا جی کی ایک بڑی رقم جمع تھی اور گھر کی تجوری میں بھی۔ جس بنگلے میں ہم مقیم تھے، اُس کا بھی سودا ہو گیا۔ ہم آخری کارروائیوں کی تکمیل کے لیے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ اس عرصے میں جب بھی موقع ملا، میں مدراس کی گلی گلی چھانتا رہا۔ مسلمانوں کی ہر سرائے اور ہر ہوٹل کے باہر دیر تک کھڑا ہو کے میں مسافروں کو دیکھتا رہتا کہ شاید بھولے بھٹکے کوئی نظر آ جائے۔ یہ بے کار کی محنت تھی میرے کانوں کے پردے وہ آوازیں سننے کی صلاحیت کھو چکے تھے یا میری پتلیاں وہ چہرے دیکھنے کی صلاحیت کھو چکی تھیں ہر آدمی نظر آتا تھا، بس وہی لوگ نظر نہیں آتے تھے۔

آخر مدراس سے کوچ کا دن آ پہنچا۔ آخری رات تھکا ماندہ شکلا رات گئے تک حساب کتاب کرتا رہا۔ میں بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا کچھ دیر بعد شکلا میری مسہری پر آ گیا۔ گمبھیر آواز میں اُس نے مجھے پکارا۔ "ظہیر خاں!" میں تو جاگ ہی رہا تھا۔ اُس کی پکار پر اُٹھ بیٹھا۔ "میں نے تمام فائلیں مکمل کر دی ہیں۔ اُس

کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "اب تم انھیں سمجھ لو اور سنبھال لو۔"

"شکلا جی! ایسی بھی کیا جلدی ہے اب ہم مل ہی تو رہے ہیں۔ میں یہاں ان فائلوں کا کیا کروں گا۔" میں نے کسی قدر ترشی سے کہا۔

"تم انھیں جتنی جلدی اپنی تحویل میں لے لوگے، میرا بوجھ کم ہو جائے گا۔ وہاں شاید فرصت نہ ہو اور موقع نہ ملے۔ یہاں صرف ہم موجود ہیں۔ بہتر ہے کہ تم تمام فائلیں خوب سمجھ لو اور جو بات بھی مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو، پوچھ لو اس وقت میرے ذہن میں سب کچھ تازہ ہے۔"

"میں کیا پوچھوں گا، آپ نے سب کچھ دیکھ لیا ہے تو ٹھیک ہے۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"آپ مجھ سے یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ نادم کر رہے ہیں۔"

"بات بہت بڑی رقم کی ہے ظہیر خاں! ایسے معاملات یوں بے پروائی سے نہیں برتے جاتے۔ تمام جزئیات سے تمھارا واقف ہونا ضروری ہے، تمھیں کچھ پتہ بھی ہے کہ کتنی رقم بینک میں جمع کرائی گئی ہے؟" اُس نے رازدارانہ انداز سے پوچھا۔

"کتنی ہی بڑی رقم ہو، میں نے اس کی خواہش تو کی نہیں تھی۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "اور نہ مجھے کچھ جاننے کی جستجو ہے، یہ فائلیں آپ اپنے ہی پاس رکھیے، میں گھر چل کے انھیں آپ سے لے لوں گا۔"

"ظہیر خاں!" شکلا نے ایک لمبی سانس لی اور تھکاوٹ کے انداز میں مسہری کے سرہانے سے اپنا سر ٹکا لیا۔ "خاصی معقول رقم کی بات ہے۔ تمھارے نام سے بینک میں ساڑھے آٹھ لاکھ روپے جمع کرائے گئے ہیں۔ سمجھے؟ ساڑھے آٹھ لاکھ روپے۔"

"جی!" میرے ہونٹ لرزنے لگے۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ میں شکلا جی کی تیز سانسیں صاف سن سکتا تھا۔ "مگر میں اس کا کیا کروں گا؟" میں نے منتشر آواز میں کہا۔

"اب سب کچھ تمھاری لیاقت اور ظرف پر منحصر ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اس کے استعمال میں محتاط رہوگے اور کرشنا جی کی توقعات پر پورے اترو گے۔" شکلا اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا، میرے کانوں میں جلن ہونے لگی۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ شکلا مجھے چپ دیکھ کے اپنے بستر پر چلا گیا۔ یک بارگی میرے جی میں آئی کہ میں تمام فائلیں اُس کے سر پر دے ماروں یا اُس کے سامنے جلا دوں۔ وہ میرے ظرف کی بات کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ میں اُس کی نظر میں ایک عمدہ محاسب ثابت ہو سکوں اور کورا کی نظر میں خود کو گرا لوں۔ کرشنا جی نے مجھے سونے کی زنجیر میں جکڑنے کی کوشش کی تھی۔ انھیں اپنی باریک بین نگاہ سے یہ نظر نہیں آیا تھا کہ میرا تو رواں رواں بندھا ہوا ہے۔ وہ یہ جتانا چاہتے تھے کہ اگر وہ کسی کو عزیز سمجھتے ہیں تو اُس کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں مگر وہ یہ حقیقت نظرانداز کر گئے کہ اُن کی طرح دوسرا بھی کسی [illegible] سکتا ہے اور اُس کے لیے اُن سے بھی زیادہ سوچ سکتا ہے۔

اُنھوں نے اپنی محبت میں مجھ پر سکے نچھاور کیے تھے تاکہ میں دنیا کی بلاؤں سے محفوظ رہوں حالانکہ وہ خود کہتے تھے کہ سکے دکھوں کی تلافی نہیں کرتے وہ خود بھی سکوں سے دُور رہتے تھے، پھر کرشنا جی نے ایسا کیوں کیا؟ مجھ بے ہنر آدمی پر سونے کے پتھر کیوں پھینکے؟ کیا اس لیے کہ میں خود تو کچھ کروں گا نہیں، میرے تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ چکے ہیں، اُن کا یہ سوچنا بھی ٹھیک ہی تھا۔ میرے ہاتھ پیروں پر واقعی فالج گر گیا تھا۔ جب سے کورا جُدا ہوئی تھی، میں نے اپنے ہاتھ پیروں کا کتنے دن کھایا تھا، پہلے جیل میں کھاتا رہا، پھر اِدھر اُدھر لوگ مجھے بھیک دیتے رہے۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ پکنے لگا۔

صبح ہوتے ہی شکلا نے تیاری شروع کر دی۔ کرشنا جی کے تمام کارندے ہمیں رخصت کرنے کے لیے ہوٹل میں جمع ہو گئے تھے۔ ہوٹل چھوڑنے سے پہلے شکلا نے مجھے ایک گوشے میں علیحدہ لے جا کے کہا کہ کرشنا جی کے ملازموں کے لیے مجھے کچھ رقم کا اعلان کرنا چاہیے۔ میں نے کہا، جو آپ مناسب سمجھیں کر دیں۔ شکلا کے ذہن میں اس بات کا خیال شاید پہلے سے تھا، اُس نے مجموعی طور پر ۳۰ ہزار روپے کارندوں میں چیکوں کے ذریعے تقسیم کیے۔ کارندے ہاتھ پھیلا پھیلا کے دعائیں دینے لگے اور ہچکیوں سے رونے لگے، مجھے بھی رونا آ گیا۔ میں نے شکلا جی سے کہا کہ انھیں اور رقم دے دی جائے مگر انھوں نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔

ہماری گاڑی گھر کے دروازے پر رُکی۔ جولین اور چمپا بھاگی ہوئی آئیں، دونوں ہمیں دیکھ کے دنگ رہ گئیں اور میرے بازوؤں سے لپٹ گئیں۔ چمپا نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور بڑے کمرے میں داخل ہوتے سے پہلے کوئی آیت پڑھ کے میرے سر اور سینے پر پھونکی۔ کرشنا جی کا سامان اُن کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ شکلا نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ اُس نے چمپا اور جولین کے لیے مدراس سے کپڑے خریدے ہیں۔ بچھو ملازم بھی ڈرائنگ روم میں ناچتا پھر رہا تھا۔ چمپا اور جولین صوفے پر میرے آزو باز و بیٹھی ہوئی تھیں اور شکلا سامنے کے صوفے پر بیٹھا تھا۔ جولین شکایت کرنے لگی کہ ہم نے اپنے پہنچنے کی پیشگی اطلاع کیوں نہیں دی، انھوں نے ہمیں لینے کے لیے اسٹیشن آنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ گھر آ کے چمپا اور جولین کو دیکھ کے مجھے کچھ سکون ہوا۔ کچھ دیر ٹھیرنے کے بعد شکلا نے ہم سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ مجھے شکلا کے ساتھ رہنے کی بہت عادت ہوگئی تھی اس لیے میں سمجھ رہا تھا کہ اب وہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ میں نے اُس سے چند منٹ اور ٹھیرنے کی درخواست کی۔ کرشنا جی کے کسی ملازم کو ابھی تک علیحدہ نہیں کیا گیا تھا۔ گھر میں ہمارے آنے سے ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ سب اِدھر اُدھر دوڑتے دوڑتے پھر رہے تھے، کوئی میز صاف کرتا تھا، کوئی مجھے سلام کرنے کا منتظر تھا۔ شکلا، چمپا اور جولین سے معذرت کر کے مجھے میرے کمرے میں لے آیا اور تمام فائلیں میرے

[کر]تے ہوئے اُن کی تفصیل سمجھانے لگا۔ یہ بینک کے کاغذات ہیں، یہ [...]ولات کی رسیدیں ہیں، یہ مکانوں اور زمینوں کے بیع ناموں کی نقلیں ہیں [...] متفرق پرزے ہیں، وصیت کا فائل یہ ہے۔ میں نے سب کچھ دراز [میں] ڈال دیا اور شکلا سے معافی مانگی کہ سفر کے دوران میں میرے منہ سے [...] باتیں نکل گئی ہوں گی، شکلا نے مجھے خوب زور سے بھینچ لیا اور سسک[...] اُس کا سارا چہرہ بھیگ گیا۔ "تمھیں جب بھی میری ضرورت پڑے، مجھے [کر]شنا جی کا خادم سمجھ کے بُلا لینا۔" اُس نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا اور چند [...] بعد رخصت ہو گیا۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا تو میرے دل میں آیا [...] اُسے روک کے کہوں، کرشنا جی کی رقم میں سے آپ بھی کچھ لے [...] مگر اچھا ہوا کہ یہ بات میری زبان سے ادا نہیں ہوئی ورنہ وہ بہت سُبکی [محسو]س کرتا۔ اُس کی نظروں میں میری کیا وقعت رہ جاتی کہ میں اُسے گھر سے [...] کر کے رخصت کر رہا ہوں جب کہ میری دلی خواہش تھی کہ وہ اس رقم [...]سے جس قدر چاہے کسی گریز کے بغیر لے لے، میرے لیے اُس کے بغیر [...]اس جانا اور یہ کام بھگتانا ناممکن تھا۔ شکلا چلا گیا اور جولین، چمپا میرا [سا]مان کھولنے لگیں۔ انھوں نے میری عدم موجودگی میں میرے بہت سے [...] بنوا لیے تھے۔ میرا کمرہ بھی آئینہ بنا ہوا تھا، نہا دھو کے اور کپڑے بدل [کے م]یں ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ دونوں مجھ سے باتیں کرنے کے لیے منتظر تھیں۔ [میں] نے جولین سے اُس کے باپ کی خیریت دریافت کی۔ اُس کی حالت [...] بہت گر جاتی تھی، کبھی سنبھل جاتی تھی۔ جولین اُداس ہو گئی۔ چمپا نے فوراً [موض]وع بدل دیا اور مجھ سے مدراس میں کرشنا جی کے خاندان والوں اور ملازموں [کا ح]ال پوچھنے لگی۔ اُس نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم نے اُن کی جائداد کا معاملہ کس [طرح نم]ٹا لیا، نہ میں نے اُسے بتایا کہ میرے پاس ساڑھے آٹھ لاکھ روپے [...] موجود ہے اور اب میں ایک لکھ پتی آدمی ہوں۔ لکھ پتی تو خیر میں [پہ]لے بھی تھا مگر اب میرے پاس نقد رقم موجود تھی اور کوئی پوچھنے والا [نہی]ں تھا کہ یہ رقم کس طرح صرف کر رہا ہوں، وہاں شرمندہ کرنے کے لیے [...] موجود تھی، مجھے ہر وقت احساس رہتا کہ یہ دولت اُس کی عطا کی [ہو]ئی ہے۔ کرشنا جی ایسے گئے تھے کہ اب اُن کی واپسی کا قطعی امکان [نہی]ں تھا۔ میں نے سرسری طور پر چمپا اور جولین کو کرشنا جی کے گھر کا حال [سنا]یا۔ انھوں نے پھر بھی نہیں پوچھا کہ مجھے جائداد سے کتنی رقم حاصل ہوئی۔ [...] نے بھی اِس کا ذکر نہیں کیا۔ جولین کو دیکھ کے سب سے پہلے میرے ذہن [میں] ماسٹر مارٹی کا خیال آیا تھا لیکن ابھی تک جولین نے اُس کا تذکرہ نہیں کیا۔ [...] بتا رہی تھی کہ نورین اور رستم جی میری عدم موجودگی میں دو تین بار گھر [آئے] تھے اور نورین فون کر کے بار بار یہ پوچھتی تھی کہ میں کب واپس آ رہا [ہو]ں اور جیسے ہی میں آؤں، اُسے مطلع کر دیا جائے۔ وہ نورین اور رستم جی کی [تع]ریف کر رہی تھی، انھوں نے کئی بار پوچھا کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔

"اور وہ ماسٹر مارٹی؟ تم نے اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ "اُس نے تمھیں پریشان تو نہیں کیا؟"

"نہیں ادھر تین چار دن سے تو وہ بالکل نہیں آ رہا ہے، اُسے شاید کسی طرح پتہ چل گیا ہے کہ تم شہر میں نہیں ہو حالانکہ میں نے ہر ملازم کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ تمھارے بارے میں اُن سے کچھ پوچھے تو لاعلمی ظاہر کریں۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ مجھے خط میں اُس کے بارے میں تمھیں کچھ نہیں لکھنا چاہیے تھا، تم وہاں پریشان ہو جاؤ گے۔ اب جیسے ہی اُسے معلوم ہوگا کہ تم آ گئے ہو، وہ پھر آ جائے گا۔ وہ عجیب آدمی ہے، کچھ کہتا نہیں، بس دروازے پر بیٹھا رہتا ہے مجھے بلواتا ہے اور منتیں کرتا ہے، کبھی کبھی تو مجھے اُس پر بڑا ترس آیا۔ میں اُسے بُرا بھلا کہتی ہوں، کبھی منع کرا دیتی ہوں کہ گھر میں موجود نہیں ہوں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ عجب قسم کا آدمی ہے۔ میں تو اُسے پہلے سے دیکھ رہی ہوں، پہلے تو وہ ایسا نہیں تھا۔ اب اُس کا حال بہت خستہ ہے۔"

"میں اُس کے پاس ہو آؤں گا۔"

"تم وہاں مت جانا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا، کچھ وقت گھر میں جولین اور چمپا کی باتیں سُنتے ہوئے گزر گیا لیکن جیسے ہی رات آئی، مجھے بے چینی ہونے لگی۔ چمپا اور جولین اس گھر میں موجود تھیں اور وہ مجھے اس طرح برت رہی تھیں جیسے میں اسی گھر کا ایک فرد ہوں اور میں بھی یہاں آنے کے بعد دو پہر سے اس طرح کی باتیں کر رہا تھا جیسے اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ مجھے ایسا لگا جیسے تجمل اور زریں کمرے میں آ گئے ہوں اور کہہ رہے ہوں کہ میں نے انھیں کس یاداشت میں بھلا دیا، انھوں نے کیا بُرائی کی تھی۔ وہ بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔ تجمل تو یہاں تک کہتا تھا کہ مجھے مستقل طور پر فیض آباد میں زریں کے پاس رہنا چاہیے کیونکہ وہ اکیلی ہے اور اُس کا خالو اُس کا دشمن ہے مگر میں وہاں سے چلا آیا کیونکہ زریں اور تجمل بھی کورا کی طرح میرا خیال رکھتے تھے اور مجھے گویا بالواسطہ طور پر مجبور کرتے تھے کہ میرا رویہ بھی اُن سے کورا کی طرح ہونا چاہیے مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ کورا تو نہیں تھے۔ اگر میرے نصیب سے کورا ملتی تو کیا کہتی کہ میں تو اُس کے بغیر بڑا مگن ہوں، مجھے اُس کی غیر موجودگی میں اتنے دوست بنانے کی فرصت کیسے مل گئی؟ مگر کورا ایسی نہیں ہے، اُس کے احساسات بہت صاف و شفاف ہیں، جیسا اُس کا چہرہ ہے، اُس کا دل بھی ویسا ہے۔ وہ میرے متعلق کسی بدگمانی کے ایک ذرّے سے بھی اپنا دل میلا نہیں کرے گی۔ اُسے احساس ہوگا کہ میں صرف اُسی کے لیے زندہ رہا اور زندہ رہنے کے لیے آدمیوں کے درمیان رہنا پڑتا ہے، آدمیوں کے درمیان ہی رہ کے میں اُسے ڈھونڈ سکتا تھا۔ اب اگر راستے میں کوئی تجمل، کوئی زریں، کوئی راج کرشنا، کوئی جولین اور کوئی چمپا مل جائے اور مجھے روٹی کھلا دے، پانی پلا دے اور میرے کپڑے بدلوا دے تو کورا کو اُس کا شکرگزار ہونا چاہیے کیونکہ انھوں نے اُس کی عدم موجودگی میں میرا خیال رکھا۔ میں نے اُس کی مالا گردن سے اُتار لی اور اُس کا ایک ایک دانہ چومتا رہا۔

ناشتے کے بعد چمپا گھر میں اکیلی تھی، جولین اسکول چلی گئی تھی، میں

اخبار میں کرشنا جی کی کوئی خبر تلاش کر رہا تھا کہ چمپا نے آہستگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "پیارے میاں! تین مہینے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اب ہمیں یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔"

"ہاں!" میں نے نرمی سے کہا۔ "چھوڑنا تو پڑے گا۔ تم نے کیا انتظام کیا ہے؟" اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے سر اُٹھا کے اُسے دیکھا، وہ بُت بنی بیٹھی تھی۔ "تمھیں کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہوگا۔ اب کرشنا جی نہیں ہیں۔" میں نے ہچکچا کے کہا۔

"یہی تو میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"لیکن مجھے کسی گھر کی ضرورت نہیں ہے۔ بات وہی ہے جو پہلے تھی۔ تم اپنا کوئی انتظام کرلو۔ میں اس شہر میں شاید زیادہ دنوں تک نہ رہوں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" اُس نے وحشت سے پوچھا۔

"کہیں بھی۔"

"میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔"

"پھر وہی ضد۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "میرے ساتھ کہاں ماری ماری پھرو گی۔ اپنی ضد چھوڑ دو۔" میں نے التجا کی۔ "مجھے معلوم ہے کہ اب تمھارے لیے آگرے یا فیض آباد جانا ممکن نہیں ہے۔ تم نے وہ زندگی ترک کر دی ہے لیکن تم کہیں بھی جا سکتی ہو۔ تمھیں روپوں کی ضرورت ہو تو میں فراہم کرسکتا ہوں۔"

"روپے پیسے کا میں کیا کروں گی۔ تمھارے سوا میرا اور کون ہے۔"

مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ چمپا سے التجا کرنا، اُس کے ساتھ مغز مارنا فضول ہے۔ وہ ماننے کی نہیں۔ مجھے خود اس کا کوئی نہ کوئی انتظام کرنا پڑے گا۔ اُس نے پہلے کی طرح آنسو بہانا شروع کر دیا تھا۔ "میں تمھارے لیے کیا کروں؟ کون سی ایسی دعا ہے جو میں نے نہیں کی۔ خدا نے بھی مجھ گنہ گار کو معاف نہیں کیا ہے مگر وہ میری سنے گا ضرور۔" وہ بین کرنے لگی۔ "آہ ایک کرشنا جی کا آسرا ہوگیا تھا، وہ بھی چلے گئے۔ وہ رہتے تو شاید تم اتنے مایوس نہ ہوتے۔"

"اور ہاں! تم نے تمام باتیں کرشنا جی کو بتا دیں۔" میں نے تنک کے کہا۔ مجھے اُس کی بات سے خیال آیا کہ یہ وہی تھی جس نے کرشنا جی کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ "تمھیں کچھ احساس نہیں ہوا کہ وہ مجھے کتنا عزیز سمجھتے تھے اور میں نے اُن سے ہر بات چھپائی تھی؟ میں نے تمھیں تاکید کر دی تھی کہ اپنی زبان مت کھولنا اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا مگر تم اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکیں۔ نہ جانے تم نے اُن سے کیا کیا کہا ہوگا۔"

"میں نے کرشنا جی کو فہمیدہ کی بات نہیں بتائی تھی۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "مانتا میں نے انھیں اس بابت کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر کرشنا جی مجھے قسمیں نہ دلاتے اور تمھارا واسطہ نہ دیتے تو میں اپنی زبان ہرگز نہ کھولتی۔ انھوں نے خدا کا واسطہ دیا تھا۔ تب میری زبان سے اتنا نکلا کہ تمھارے گھر والے تم سے بچھڑ گئے ہیں۔ انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں تمھارے ابا جان کا نام بتاؤں، وہ انھیں اپنے ذرائع سے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ بات میری سمجھ میں آگئی، وہ تمھارے لیے بے حد فکر مند رہتے تھے اس لیے مجھے بتانا پڑا کہ تمھارے ابا جان پہلے بمبئی کے کسی محلے میں رہتے تھے۔ جب میں دوبارہ بمبئی آئی تھی تو نور جہاں کو بُلا کے میں نے تمھارے ابا جان کا پتہ پوچھ لیا تھا، وہ مجل میں بُولا کی منت سماجت کرکے پتہ پوچھ آیا تھا، میں وہاں گئی کہ شاید آس پڑوسیوں سے کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے۔ میں مولوی اکرم سے بھی ملی تھی۔ میں نے کرشنا جی کو بتا دیا۔ وہ وہاں گئے اور انھوں نے مولوی اکرم کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ وہ تمھارے ابا جان کا سامان دکھانے پر تیار ہوگئے۔ ممکن ہے کرشنا جی کو سامان میں کوئی ایسی کام کی چیز نظر آگئی ہو کہ جب وہ گھر واپس آئے تو مطمئن تھے۔ کہتے تھے کہ میں انھیں ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ انھوں نے کبھی میرے بارے میں نہیں پوچھا۔ پوچھتے تو مجھے جھوٹ بولنا پڑتا۔ انھوں نے مجھے جھوٹ بولنے سے بچا لیا۔ پیارے میاں! اب وہ موجود نہیں ہیں لیکن یقین کرو میں نے اُن سے فہمیدہ کے سلسلے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ اور ایک بات بتا دوں۔ مجھے بہت سے مردوں سے واسطہ پڑا ہے، طرح طرح کے مردوں سے جتنا میں انھیں سمجھ سکتی ہوں، تم نہیں سمجھ سکتے۔ کرشنا جی ایسے آدمی نہیں تھے کہ انھیں فہمیدہ والا حادثہ معلوم ہوتا تو وہ تم سے نفرت کرنے لگتے۔ اُن کی طبیعت تو سب سے جدا تھی۔ آہ۔" وہ پھوٹ پڑی۔ "وہ کیوں چلے گئے۔ خدا نے مجھے کیوں نہیں اُٹھا لیا۔"

چمپا نے کچھ اس انداز میں کرشنا جی کا ذکر کیا کہ میرا سینہ بھی اُمڈنے لگا۔ آنکھوں کا بند ٹوٹ پڑا اور میں چمپا سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ دوپہر کو شکلا کا فون آیا۔ میرا دل ہولنے لگا۔ شکلا بہت دنوں بعد فون کر رہا تھا۔ ممکن ہے کہیں سے کرشنا جی کے بھیجے ہوئے خطوط کا جواب آگیا ہو اور ابا جان کا پتہ چل گیا ہو لیکن شکلا میرا حال پوچھتا رہا۔ اس قسم کا اُس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ پتہ نہیں مجھے کیوں تسلی سی ہوئی۔ شاید مجھے شکلا کی زبانی ابا جان کا پتہ جاننا پسند نہیں تھا۔ میری سانسیں قابو میں آئیں تو میں نے اُس سے کرشنا جی کے معاملے کی تفتیش کے متعلق معلوم کیا۔ شکلا کے جواب کا مجھے پہلے سے علم تھا۔ تفتیش کرنے والی ٹیم نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرکے فائل حکومت کو بھیج دی تھی۔ صبح کے اخبار میں بھی کرشنا جی کی کوئی خبر نہیں تھی جیسے وہ اس شہر میں لوگوں کے درمیان کبھی موجود نہ رہے ہوں۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ اچانک فون کا سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن مجھے اس انقطاع کی اُس وقت خبر ہوئی جب شکلا کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں اُس سے کہہ رہا تھا کہ کسی طرح مجھے کوئی اتا پتہ بتا دو، کوئی اشارہ دے دو۔ میں خود انھیں تلاش کرکے حکومت کے حوالے کر دوں گا یا اپنے آپ اُن سے نمٹ لوں گا۔

میں نے طے کیا کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وقت خاصا گزر گیا ہے اس لیے اب مجھے باہر نکلنا چاہیے اور خود کوئی صورت نکالنی چاہیے ورنہ اپنے آپ سے ہمیشہ شکوہ رہے گا۔ دل میں ایک چور رہے گا اور کرشنا جی کے نام پر ندامت سی محسوس ہوگی۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے

...کرشنا جی کا پوچھنے والا بھی کوئی موجود ہے۔ میں اس اُدھیڑ بن میں گم تھا ...جولین سکول سے واپس آگئی اور آتے ہی چہکنے لگی کہ آج اُسے پرنسپل نے ...کے اُس کی کارکردگی پر شاباشی دی ہے۔ چمپا نے اُسے اپنے سینے سے ...لگا لیا۔ شام ہونے سے پہلے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ پہلے کسی طور مکان کا مسئلہ حل ...ہونا چاہیے۔ حکومت کی طرف سے کسی وقت بھی نوٹس آسکتا ہے۔ مرے ہوئے ...لوگوں کو کون اتنا یاد رکھتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ایسا کوئی حکم آنے سے پہلے اپنا ...انتظام کر لیا جائے۔ جولین تو اپنے گھر جا سکتی تھی مگر چمپا؟ چمپا کسی صورت باز ...نہیں آ رہی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ میں کرشنا جی کی رقم میں سے کچھ ...رقم نکال کے ایک مناسب مکان خرید کے جولین اور چمپا کو اُس میں بسا دوں۔ ...مجھے اس شہر میں کچھ عرصے اور رہنا پڑے گا۔ پھر شاید نئے مکان اور نئے ...ماحول میں چمپا اپنا ارادہ بدل دے۔ میں یہ رقم کرشنا جی کی رقم میں سے ...قرض کے طور پر نکالوں گا اور جب کبھی توفیق ہوئی، واپس رکھ دوں گا حالانکہ ...یہ بھی میرے ذہن کا ایک دلاسا ہے۔ میں یہ رقم خرچ نہ کروں تب بھی ...اس کا بوجھ میرے سینے پر رہے گا اور میرے سوا اسے کون ہاتھ لگائے گا۔ ...ہم جی آمادہ نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ فی الحال جولین کے مکان میں منتقل ہو ...جانا چاہیے۔ اُس کی اور چمپا کی چھنتی بھی بہت ہے، جولین کی موجودی میں ...چمپا کا اور چمپا کی موجودی میں جولین کا دل بہلا رہے گا۔ میں نے جولین سے ...اسی وقت کہہ دیا کہ وہ سامان منتقل کرانے کے لیے بچھو سے کہہ دے، کچھ ملازموں ...کو برطرف کر دے کیونکہ ہم زیادہ اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جولین ...کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگی اور پھر نہ جانے اُسے ...کیا ہوا، میری طرف لپکی اور میرے دونوں بازو پکڑ کے کپکپانے لگی۔ مجھے عجیب سا ...لگا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سُن ہوگیا۔ جولین کی جھلملاتی ہوئی آنکھیں میری ...آنکھوں سے بہت قریب تھیں۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟" وہ متجسس آواز میں بولی۔

میں نے تیزی سے اثبات میں گردن ہلائی اور لڑکھڑاتی ہوئی ...زبان میں کہا۔ "ہاں۔" وہ میرے بازو چھوڑ کے فوراً چمپا کی طرف بھاگی اور اُس سے ...لپٹ گئی۔ اُس کے چہرے پر اچانک خون ہی خون سمٹ آیا تھا، وہ ...بار بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے فوراً بچھو کو بلایا اور کرشنا جی ...کے کمرے کا سامان بہت حفاظت سے پیک کرنے کا حکم دیا۔ شاید اُسے ڈر تھا ...کہ میرا ارادہ نہ بدل جائے۔ اُسے خوش دیکھ کے مجھے اطمینان ہوا اور میرا دل باہر ...نکلنے کو چاہا۔ میں اُن دونوں سے کہے بغیر سڑک پر آگیا اور سوچنے لگا کہ کس طرف ...جاؤں؟ میرے ذہن میں دیر سے ماسٹر مارٹی کا نام گونج رہا تھا۔ مجھے اُس ...کا پتہ یاد تھا۔ میں بس میں بیٹھ گیا اور پوچھتا پاچھتا اُس کے فلیٹ تک پہنچنے ...میں کامیاب ہوگیا۔ میری دستک پر ایک تنا سا پستہ قد نوجوان برآمد ہوا۔ ...اُس کا نام غالباً ممّا تھا۔ ممّا میری شکل دیکھتے ہی اُچھل پڑا اور دروازے ہی ...سے چلّایا۔ "ماسٹر! ماسٹر! اکم ہیر کم ہیر! دیکھ اندر کون آیلا ہے۔"

اندر سے ایک کراہتی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"ادھر آ اُدھر اپنا کوئی والا استاد آیا ہے۔" ممّا نے زور سے صدا لگائی اور مجھ سے خفیف لہجے میں کہنے لگا۔ "ماسٹر اِن جرڈ ہے۔"

"اِن جرڈ ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "اُسے کیا ہوا؟"

"ابھی اپن کیا بولیں۔" وہ اپنا ماتھا پکڑ کے بولا۔ "ماسٹر ایک دم فل اسٹاپ ہو گیا ہے۔ اُدھر اس دن تم نے ہاتھ کیا دکھایا، ماسٹر کا مائنڈ اُلٹا ہوگیا ہے۔"

ممّا نے اُس کی گردن پکڑ کے اُسے دروازے سے ہٹایا اور اندر داخل ہوگیا۔ یہ ایک تنگ و تاریک فلیٹ تھا۔ درمیان میں ایک مختصر روشنی کا بلب ٹمٹما رہا تھا۔ ماسٹر مارٹی ڈگمگاتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اُس کا ہاتھ گردن میں لٹکی ہوئی پٹی میں ڈلا ہوا تھا اور سر پہ بھی پٹی بندھی تھی۔ اُس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی گئی تھیں۔ "اوہ لو! دی کنگ!" اُس نے پھٹی ہوئی آواز میں نعرہ لگایا۔ "اپن کوئی ڈریم دیکھ رہا ہے۔"

میں نے اُس کا شانہ پکڑ لیا۔ "مارٹی! یہ کیا ہوگیا؟"

مارٹی کی گردن جھک گئی۔ میں نے اُسے جھنجوڑا تو وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "بس گرینڈ ماسٹر! اپن کا اسٹارس بیڈ لک ہوگیا ہے۔" وہ اپنے ایک ہاتھ سے میری پنڈلی چھونے لگا۔ "پر تم کہاں تھا! اپن ڈیلی راؤنڈ لگاتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں شہر میں نہیں تھا۔"

"اپن کو ڈاوٹ تھا کہ تم اپدرسٹی میں نہیں ہو۔"

"پر یہ کیا ہوا؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

"ایکس کیوز می استاد! اِٹز او نلی آف لو۔ اپن اُدھر اسٹریٹ میں بوم مارتا پھرتا تھا، پر ٹھیک تھا۔ جب سے اپن کنٹری سے آؤٹ آف باؤنڈ ہوا، اپن کا ماتھا ایک دم ڈل ہوگیا۔ اپن نے تم کو ساری بات پہلے بول دیا تھا۔ بس اندر اپن تمھارا ویٹ کرتا تھا یا اُدھر کوئن کے پاس راؤنڈ لگاتا تھا۔ اپن نے وِسی جن لے لیا تھا کہ جب تک ....."

"بات ختم کرو۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"اوہ ماسٹر! آئی ایم ساری۔" وہ جھینپ کے بولا۔ "اپن چریا ہے ایک دم ....." اُس نے اپنے آپ کو گالی دی اور دفعتہً میری چھاتی سے اپنا سر رگڑنا شروع کر دیا۔ "ماسٹر! ماسٹر!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "تم سامنے آیا تو اپن بیانڈ کنٹرول ہوگیا۔ اپن کا بہت انسلٹ ہوگیا ہے ماسٹر! ان ہاتھوں کو کاٹ دو یا ان میں جان ڈال دو۔ ریکوئسٹ ایکسیپٹ کرو ماسٹر! اپن تمھارا سلیو ہے اُوپر سے نیچے تک نوکر۔ کانفی ڈینس کرو ماسٹر! یہ ممّا بھی اور اُدھر کنٹری کا سارا چھوکرا تمھارا نوکر ہے۔"

"تم کیا باتیں کر رہے ہو۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "ہاتھ دکھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو کیا بمبئی بھر میں تمھیں کوئی دوسرا نہیں ملتا؟"

"ملتا ہے بہت ملتا ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "پر اپن کا ہرٹ نہیں مانتا۔ اپن اُدھر کنٹری میں آزاد رہتا تھا اور کسی چکرم کو اندر گھسنے نہیں دیتا تھا، سالا استاد لوگ بھی کچھ سوچ کے دُور دُور رہتا تھا۔ اُدھر ٹوپُر علاقے میں

کسی کا مغز پھرا تھا کہ ٹائم کل کرتا۔ سٹی میں ایک سے ایک فنٹوش علاقہ پڑا ہے۔ اپن اُودر کا کنگ تھا ماسٹر! ابھی اپن اُودر کیسے جائے۔ اپن باہر آگیا۔ اپن نے اُسی مومینٹ ڈیسائڈ کرلیا تھا کہ یا تو تمھارا سلیوری کرے گا یا پھر سر نئیں اٹھائے گا اور اپن کو بائی چانس اُس دن تم مل گیا۔ تم مل گیا تو اپن کا ڈیڈ باڈی میں پھر سے جان آیا....“ وہ بولتا رہا اور میں نے اُسے بولنے دیا۔ مارٹی پہلے سے زیادہ عاجزی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ اپنے عہد پر مکمل طور پر قائم رہا تھا اور اُس کی جو حالت اب ہو گئی وہ اس جگہ سے ظاہر تھی۔ اس کا حال پہلے سے بہت ابتر تھا۔ فلیٹ میں بڑی بے ترتیبی تھی۔ سیاہ برتن ایک طرف منتشر پڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانے سے فلیٹ میں پُتائی نہیں ہوئی ہے۔ پلاسٹر اُدھڑا ہوا تھا اور جگہ جگہ جالے تنے ہوئے تھے۔ جس کمرے سے مارٹی کراہتا ہوا نکلا تھا، وہ بھی کسی محبس سے کم نہیں تھا۔

”مگر یہ کیا کرلیا؟“ میں نے اُس کے زخموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ضرور پھر زبان چلائی ہوگی۔ یہ کیا حال کرلیا؟“

”بس آڑی ہوگیا، ایدر علاقے کا چند لوگ اپن کو جانتا تھا اور ایدر اپن کا گھومنا پھرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ سالا گھورتا رہتا تھا۔ اپن نے اُن سے کوئی چھیڑ نئیں کیا تھا، پر ایک دن جیب بالکل سوکھ گیا۔ سالا سارا چھوکرا لوگ پہلے ہی ایک ایک کرکے بھاگ گیا تھا اور تم بھی نہیں ملا تو اپن نیچے اُترا۔ اپن نئیں، اپن کا پیٹ نیچے اُترا اور اپن نے ایک شاپ کیپر سے بھتا مانگا۔ شاپ کیپر نے اپن کی بات مان لی پر بعد میں علاقے کے آدمی لوگ سے کمپلینٹ کردی۔ وہ سالا گالیاں بکتا ہوا ایدر آگیا اور اپن سے سارا پیسہ مانگا۔ اپن سب پیسہ خلاص کرچکا تھا۔ انھوں نے اپن کو باہر نکال لیا اور . . . . باقی اپن کیا بولیں، اپن کا یہ بینڈیج بول رہا ہے۔ پھر علاقے کا آدمی ایدر آیا اور تڑی مارا کہ اپن کو علاقے کے اُستاد چھنگا اُستاد کے پاس جا کے معافی مانگنی چاہیے۔ اپن نے ریجیکٹ کردیا۔ سالا سب اینگری ینگ مین ہوگیا اور علاقے سے دفع ہونے کا آرڈر دیا۔ اپن نے ریکوئسٹ کی کہ اپن دو دیک کے اندر اندر چلا جائے گا پھر ایدر نئیں آئے گا۔ سالا تھوڑا آدمی کا بچہ تھا، مان گیا۔“

”مارٹی کو بہت مارا اُستاد!“ ٹڈا پہلی بار درمیان میں بولا۔ ”ابھی تو کچھ ٹھیک ہے۔ سالا دو دن تک تو فلیٹ پڑا رہا۔ اپن تو سمجھا مارٹی کلٹی ہوگیا۔ تم کو یہ بہت یاد کرتا تھا۔“

ٹڈے نے مجھے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ میرے جواب دینے پر وہ دونوں ہی چپ ہوگئے۔ ”یہ اُستاد چھنگا کون ہے؟“ کچھ توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

”یہاں کا دادا ہے سالا اولڈ مین!“ ٹڈے نے نفرت سے کہا

سب سے اس طرف ہے؟“

”بہت دنوں سے اپن نے جب سے آنکھ کان کھولا ہے تب سے ایدر دیکھتا سنتا ہے۔ سالا بوڑھا ہوگیا ہے پر ابھی بہت جان ہے۔ ایک دم بکار کے مالک ہے۔“

”یہاں بمبئی میں تم اور کتنے اُستادوں کو جانتے ہو؟“

”اپن کو زیادہ میل جول رکھنے کا ٹائم نہیں ملتا تھا۔ سٹی بہت بڑا ہے اُستاد! کچھ کو پرسنلی جانتا ہے، کچھ کا نام سنا ہے۔ اپن جو بھی تھا، چھوٹا بڑا، بس اپنے کنٹری کا کنگ تھا۔ اپن کو وہیں سے ٹائم نہیں ملتا تھا۔“ مارٹی نے تکرار کی۔

”تمھارے باقی چھوکرا لوگ کدھر ہیں؟“

”تھی بولو، وہ کب تک مارٹی کا ساتھ دیتا۔ بھوکا مارٹی۔“ مارٹی زمین پر تھوکتے ہوئے بولا۔ ”سب ایدر اُودر خوار ہو رہا ہے۔ مارٹی کیا کرسکتا تھا۔ آئی سیڈ دیم، گو آن، یس فنش۔ ابھی ایدر اونلی ٹڈا رہ گیا ہے۔“

”کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ میرے ساتھ چل سکو؟“ میں نے ایک طویل خاموشی کے بعد کہا۔

”تم اپن کو ہیل میں لے چلو۔“ وہ مچل کے بولا۔

”میرے ساتھ نیچے آؤ۔“

مارٹی کی آنکھیں پھڑکنے لگیں۔ ٹڈا میرے بازو سے چپک گیا۔ وہ دونوں میرے پیچھے لڑھکتے پھڑکتے سیڑھیوں سے اُترے اور بازار میں آگئے۔ یہ کوئی فیشن ایبل علاقہ نہیں تھا۔ تاہم آبادی گنجان تھی۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ اور اُس کے دونوں طرف کئی منزلہ سکونتی عمارتیں کھڑی تھیں۔ مارٹی زخمی ہونے کے باوجود سینہ پھلا کے میرے دائیں طرف اور ٹڈا بائیں طرف چل رہا تھا۔ کچھ آگے چل کے ٹڈے نے مجھے کہنی ماری۔ میں نے بائیں سمت دیکھا۔ دو آدمی فٹ پاتھ پر ایک کھمبے سے لگے ہوئے ہمیں گھور رہے تھے۔ میں نے ٹڈے سے پوچھا نہیں کہ یہ کون ہیں؟ اُن کے چہروں بشروں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہوسکتے ہیں۔ میں اُجلے اور معقول کپڑوں میں تھا۔ ہم اُن دونوں آدمیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ سڑک آگے جا کے مڑ جاتی تھی۔ اِدھر اُدھر تنگ گلیاں تھیں۔ گلیوں میں بڑی بھیڑ تھی۔ ہم دوسری سڑک پر آئے تو ٹڈے نے پھر کہنی ماری۔ میں نے نگاہ اُٹھا کے دیکھا۔ تین آدمی ایک جنرل اسٹور کے پاس کھڑے ہماری جانب اشارہ کر رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی وہ ایک دوسرے سے اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے ہم سے غافل ہوں۔ ہم مختلف سڑکوں سے گزرتے رہے اور کبھی ٹڈا کبھی مارٹی مجھے کہنیاں مارتا، کھنکارتا اور آنکھیں چلاتا رہا۔ ہم کہیں ٹھیرے نہیں۔ جب سڑکیں پوری طرح روشنیوں سے جگمگا گئی تھیں تو ہم علاقے کے بڑے حصے سے گزر چکے تھے اور راستے میں ہمیں مختلف لوگ مل چکے تھے۔ اکا دکا پولیس والے بھی گشت کرتے ہوئے نظر آئے تھے۔ مجھے مارٹی کے زخموں کا خیال تھا۔ اِس حالت میں اُسے زیادہ نہیں چلنا چاہیے تھا لیکن میں نے پورا علاقہ گھوم لینا مناسب سمجھا۔ شاید ۹ بجے ہوں گے۔ بڑی سڑکیں ہم نے تقریباً تمام طے کرلی تھیں۔ ہم چوک میں واپس آگئے۔ اُس وقت ٹڈے نے اچک کے میرے کان میں سرگوشی کی کہ ہمارے آگے پیچھے کئی آدمی

چل رہے ہیں۔ ٹڈے کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری نظریں خود ہر طرف دیکھ رہی تھیں۔ ”وہ اُودر گلی میں چھنگا اُستاد کا پاڑا ہے۔“ مارٹی نے ہلکی اور کسی قدر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم چوک میں واپس آ کے ایک گلی میں داخل ہوگئے۔ گلی میں زیادہ تر گل فروشوں کی دکانیں تھیں، اُن سے تین چار دکانوں کے بعد پان والے کی سجی ہوئی دکان تھی اور اُس سے ایک چھوٹا سا ہوٹل ملحق تھا۔ میں وہیں ٹھیر گیا۔ میں نے ٹڈے کو پیسے دے کے پان لانے کے لیے کہا۔ مارٹی اپنا اضطراب چھپائے ہوئے تھا۔ ”اُستاد! دیکھ رہے ہو؟“ اُس نے میری طرف منہ کیے بغیر چپکے سے کہا۔ میں خاموش رہا۔ سات آٹھ آدمی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہم اُن کی نگاہوں کے احاطے میں تھے۔ ٹڈا اُچھلتا کودتا ہوا پان لے آیا۔ ایک میں نے کھایا، ایک مارٹی کو دیا۔ پان چباتا ہوا میں کئی منٹ تک کھڑے کھڑے سوچتا رہا۔ وہ لوگ میرے نزدیک نہیں آئے لیکن وہ سب مستعد کھڑے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا پھر چوک میں آگیا۔ وہ لوگ بھی آگے پیچھے چوک میں اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ جس گلی کی طرف مارٹی نے اشارہ کیا تھا کہ وہاں چھنگا اُستاد کا پاڑا ہے، وہ چوک سے قریب ہی تھی۔ ہم آہستہ قدموں سے اُسی گلی کے دہانے پر پہنچ گئے لیکن اندر جانے کے بجائے نکڑ پر کھڑے رہے۔ میں نے دیکھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والے آدمی بھی اِرد گرد پھیل گئے ہیں۔ چھنگا کے پاڑے والی گلی زیادہ روشن نہیں تھی اور گنجان بھی کم تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے چاقو ٹٹولا، پھر میں نے مارٹی کو دیکھا۔ وہ اُن آدمیوں کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھا۔ میں نے ٹڈے کو دیکھا۔ اُس کی پھرتی ختم ہوگئی تھی۔ وہ بالکل ساکت میرے پہلو میں دبکا کھڑا تھا۔ میں نے اچانک ہاتھ اُٹھا کے اپنے نزدیک ترین کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ کچھ نہیں سمجھا۔ میں نے پھر اشارہ کیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف بے تابی سے نظر کی اور سینے پر ہاتھ رکھ کے اشارے سے تائید چاہی کہ میں اُسی کو بلا رہا ہوں یا کسی اور کو۔ وہ آتے ہوئے ہچکچایا مگر اُس کے ساتھیوں نے گردن ہلا کے اُسے حرکت کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ میرے پاس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ دائیں اور بائیں سے دو آدمی پھرتی کے ساتھ آ کے اُس کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ ”مجھے چھنگا اُستاد کے پاس لے چلو۔“

”چھنگا اُستاد!“ انھوں نے تذبذب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”تم کون ہے؟“

”میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے نرم آواز میں کہا۔

”تم کون ہے؟“ ایک نے سختی سے پوچھا۔

”میں تمھیں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ میں ایک پردیسی ہوں، میں نے چھنگا اُستاد کی بہت شہرت سنی ہے۔ وہ مجھے نہیں جانتا۔ میں اُس سے ملنے آیا ہوں۔“

وہ میری بات سے مطمئن نہیں ہوئے اور اُن میں سے ایک نے بگڑے ہوئے تیور سے کہا۔ ”مگر تم کیوں اُس سے ملنا چاہتا ہے؟“

”میں اُسے دیکھنا اور اُس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ میرے بجائے مارٹی سے مخاطب ہوا۔ ”کیا لفڑا ہے؟ تم سالا باز نہیں آیا۔“ پھر مجھ سے بولا۔ ”اے بابو! جاؤ ابھی بات اپن نے خلاص کردی ہے۔ مارٹی سے کہہ دیا ہے کہ وہ لونڈا پن نہ کرے۔“

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں، مجھے چھنگا اُستاد کے پاس لے چلو۔“ میں نے تند لہجے میں کہا۔

”چھنگا اُستاد اس ٹیم پر کسی سے نہیں ملتا۔ سویرے ایدر آؤ، اپن تم کو چھنگا کے پاس لے چلے گا۔ پر بات مارٹی کی ہے تو تمھارا اُودر جانا بے کار ہوگا۔ بات نہ بڑھاؤ، مارٹی سے کہو کہ وہ آگے یہ حرامی پن نہ کرے۔“

”زبان سنبھال کے بات کرو۔“ میں نے تحمل سے کہا۔ ”مجھے چھنگا اُستاد سے مارٹی کی بات بھی کرنی ہے اور اپنی بھی۔ سویرا کس نے دیکھا ہے، تم ضمانت دے سکتے ہو کہ سویرے تک چھنگا اُستاد زندہ رہے گا یا میں زندہ رہوں گا۔ تم اُسے جا کے بتاؤ، ایک پردیسی اُس سے ملنا چاہتا ہے۔“

”مارٹی کی بات کرنا ہے بابو تو اپن سے کرو۔ چھنگا اُستاد سے ملنا ہے تو سویرے آؤ۔ اُستاد سالا کوئی زنانہ نہیں ہے کہ پردے میں چھپا بیٹھا ہے، تم اُس سے ضرور ملنا اور وہ بھی تم سے ضرور ملے گا۔“

میں سمجھ گیا تھا کہ اُن کی یہ تھوڑی بہت گریز میری سفید پوشی کے سبب سے ہے۔ وہ مجھے دیکھ کے سادہ لباس والے کے شک میں مبتلا ہوسکتے ہیں۔ اس کے باوجود میں پوری طرح ہوش میں تھا۔ چاقو میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اتنے میں اُن کے دوسرے ساتھی تماش بینوں کی طرح ہمارے پاس آگئے تھے۔ ”میں اُستاد سے صرف چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ سویرے کی بات مت کرو۔ اُستاد سے جا کے کہو کہ ایک پردیسی آیا ہے۔ وہ منع کردے گا تو میں واپس چلا جاؤں گا لیکن اُس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میرے ساتھ ایک زخمی آدمی ہے، ایک آدھا آدمی ہے اور ایک میں ہوں اور میں اُس سے تنہائی میں بات کرنا نہیں چاہتا۔“

میری بات سن کے اُن سب نے تلملا کے ایک دوسرے پر دوبارہ نظر کی۔ میں نے اُن کے اشاروں کنایوں کی طرف سے عمداً منہ موڑ لیا۔ ”کیوں مارٹی!“ جو آدمی سب سے آگے تھا، اُس نے مارٹی سے بدلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا چکر ہے؟“

”مارٹی سے کچھ مت پوچھو، کوئی چکر نہیں ہے۔ دو اور دو چار کی بات ہے۔ تم دیر لگا رہے ہو اور میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔“ میں نے سرد آواز میں کہا۔

”دیکھو بابو! ابھی چھنگا اُستاد نے مارٹی کو بخش دیا ہے۔ اُستاد اس علاقے کا راجا ہے، وہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اُس کے علاقے کے باسیوں کو تنگ کرے۔ مارٹی نے جو کچھ کیا، اُس کی سزا اُسے مل گئی۔“

"میں اس کا جواب تمھیں چھنگا اُستاد کے سامنے دوں گا۔ تم خیال نہیں کر رہے ہو کہ میں چھنگا اُستاد سے ملنے کی اجازت چاہ رہا ہوں۔ تم خود باتیں نہ بناؤ، اپنا آدمی اُس کے پاس بھیجو۔ اگر وہ اجازت نہیں دے گا تو میں زبردستی اُس کے پاس نہیں چلا جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ چھنگا اُستاد منع نہیں کرے گا۔" میں نے جان بوجھ کے اپنا مطالبہ دُہرایا۔

"تم کوئی لاٹ صاحب ہو کہ چھنگا اِسی وقت تم سے ملے؟"

"اس کا فیصلہ بھی چھنگا ہی کرے گا۔"

"فیصلہ اُس کے ساتھی بھی کر سکتے ہیں۔" پیچھے کھڑے ہوئے کسی آدمی نے درشتی سے کہا "جاؤ، جاؤ بابو! سویرے آنا۔ اِن کا بھیجا بلپلی کر دو اِن۔۔۔"

ابھی اُس نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک آدمی گلی سے لپکتا ہوا ہمارے پاس آیا اور ہانپتے ہوئے بولا "استاد بُلا رہا ہے۔"

"بلا رہا ہے!" کئی حیرت بھری آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

میں نے مارٹی اور ٹڈے کے بال پکڑ کے انھیں آگے کی طرف دھکیلا۔ چھنگا کے آدمی ہمارے آگے پیچھے چلنے لگے۔ ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ چھنگا کا باڑا کوئی سو قدم پر تھا۔ باڑے کے پاس پختہ اور نیم پختہ عمارتیں تھیں۔ جس عمارت میں ہم داخل ہوئے وہ اوسط درجے کی دومنزلہ پختہ عمارت تھی۔ باہر کی روشنیاں مدھم تھیں لیکن اندر خاصی روشنی تھی۔ دروازہ مضبوط تھا۔ ایک ڈیوڑھی جیسی جگہ سے گزر کے ہم ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ یہ ایک ویران سا بڑا کمرہ تھا۔ صرف دو چار پائیاں دیوار سے لگی ہوئی تھیں اور کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ عمارت کا کوئی دوسرا راستہ بھی ضرور ہوگا۔ ہماری رفتار تیز نہیں تھی۔ ٹڈے کا چہرہ فق پڑا تھا۔ مارٹی بالکل خاموش تھا۔ ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا۔ بڑے بڑے قمقمے جل رہے تھے۔ آدھے کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی اور سامنے فرش سے کچھ اُونچی پختہ جگہ پر چوکی جیسا ایک بڑا چبوترا تھا۔ چبوترے پر بیک وقت کئی آدمی بیٹھ سکتے تھے اور بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ دری پر تھے۔ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ دیوار پر چھت کے قریب چند روشن دان تھے اور اطراف میں کئی دروازے تھے مگر وہ کھلے ہوئے نہیں تھے۔ چبوترے پر فربہ جسم کا ایک سانولا سا شخص مختلف عمروں کے آدمیوں کے درمیان سب سے نمایاں تھا۔ اُس کی داڑھی صاف تھی اور باریک نوک دار مونچھیں اُوپر کی طرف چلی گئی تھیں۔ بال کڑھے ہوئے، پیشانی چوڑی، ناک بیٹھی ہوئی اور چہرے پر چاقو کے کئی نشان اور ناک پر ایک کالا مسا تھا۔ عمر پینتالیس سے کچھ اُوپر ہوگی لیکن جسم اور چہرے سے وہ زیادہ عمر کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا قد درمیانہ لگتا تھا۔ آنکھوں میں تیز چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہمیں اُسے دیکھ کر اُس کے سوا سب چونکے، وہ ساکت بیٹھا رہا۔ میں مارٹی اور ٹڈا آدھے کمرے تک چل کے رک گئے۔ ہمارے اردگرد اُس کے آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ چھنگا نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور انگلی کی خفیف سی جنبش سے انھیں ہمارے پاس سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں اور ہاتھ پر بھی دو ایک گہرے نشانات تھے۔ میں نے اُس کے بولنے کا انتظار کیا مگر وہ اپنی زبان بند کیے ہوئے مجھے گھورتا رہا۔

"چھنگا اُستاد!" میں نے معتدل لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔ اُس نے منہ کھولے بغیر اقرار میں گردن ہلائی۔ میں چاہتا تھا کہ زبان وہ کھولے۔ تجمل نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ زبان بھی سن لی جائے تو بہتر ہے کیونکہ کبھی کبھی زبان آدمی کا جسم ہوتی ہے۔ "میں اس شہر کا آدمی نہیں ہوں چھنگا اُستاد!" میں نے اپنی آواز اُونچی کر کے کہا "سنا تھا بمبئی میں ایک چھنگا اُستاد ہے، ایک علاقے پر بہت دنوں سے راج کرتا ہے، پرانا آدمی ہے، بات سمجھتا ہے، یہ مقام اُس نے اپنے بل پر حاصل کیا ہے، چاقو چلانا اُسے خوب آتا ہے اور وہ اپنے علاقے تک محدود رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔"

اُس کی باچھیں سکڑیں، پھر پھیل گئیں اور تپلیاں متحرک ہو گئیں۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے تجسس سے پوچھا۔ اُس کی آواز بھاری تھی، کسی قدر غیر متوازن مگر اُس میں ایک گرج ضرور تھی۔

"میں تمھارے پاس تمھاری شہرت سن کے آیا ہوں اور تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" میری آواز میرے قابو میں تھی۔

"بولو، بولو۔" وہ پہلو بدل کے بولا "کیا کام ہے؟"

"چھنگا اُستاد! ابھی تمھارے ایک آدمی نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میں اس سوال کا جواب چھنگا استاد کے سامنے دوں گا۔ میں اُسے ضرور جواب دوں گا لیکن اُستاد! میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ تم ان لوگوں کے درمیان اس اُونچی جگہ کیوں بیٹھے ہو؟"

"کام کیا ہے؟" وہ بگڑ کے بولا "مخول مت کرو۔"

"مخول نہیں چھنگا استاد! میری بات کا جواب دو۔" میں نے بلند آواز میں کہا "چلو، تمھاری طرف سے میں جواب دے دیتا ہوں۔ تم ان سب کے بیچ اپنی قوت سے اور اپنے بل پر بیٹھے ہو۔ تم نے کئی بار ان پر ثابت کیا ہے کہ تم ان سب سے برتر ہو۔ جسم کے طور پر بھی، دماغ کے طور پر بھی۔ کیا یہی بات نہیں ہے؟"

اُس کی گردن آگے نکل آئی تھی "کام کی بات کرو۔" اُس نے گرج کے کہا "صاف صاف بولو، بوم مت مارو۔"

"میں کام ہی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے اپنے لہجے کی شستگی برقرار رکھی اور اُس پر نظریں جمائے ہوئے کہا "آج میں بہت کام کی بات کرنے آیا ہوں۔"

"آگے بولو۔"

"تمھاری پشت پر، تمھارے سامنے اور تمھارے آزو بازو جو آدمی بیٹھے ہیں، یہ سب جانتے ہیں کہ تم ان کا جوڑ نہیں ہو۔ اگر تمھارے کسی آدمی کو کبھی یہ احساس ہو جائے کہ اُستاد کی انگلیوں میں دم نہیں رہا، اُس کا ہاتھ کپکپانے لگا ہے، اُس کے جسم میں پہلے جیسی پھرتی اور اُس کے دماغ میں پہلے جیسی

ری نہیں رہی تو یہ تمھیں چبوترے سے نیچے اُتار دیں گے اور جب تم خود یہ وس کرنے لگو گے تو تمھارے لیے عزت اسی میں ہوگی کہ تم ان کے درمیان ہ اُٹھ جاؤ۔"

چھنگا کے تمام آدمی بے کلی سے کبھی مجھے کبھی اُسے دیکھنے لگے۔ چھنگا کی یں چوڑی ہو گئی تھیں۔ ٹڈے نے میری پتلون پکڑ لی تھی۔ مارٹی کھسک کے ے کچھ اور قریب ہو گیا۔ چند لمحوں تک سکوت طاری رہا، پھر چھنگا کی کڑکتی ی آواز گونجی "تمھارا کوئی چول ضرور ہلا ہوا ہے۔ ابھی پہلے اِن تم کو دھکے دے باہر نکالنے کو بولے تم ادھر سے ایک دم کلٹی ہو جاؤ۔ اے! یہ تم کس کو پکڑ لایا؟" پنے ساتھیوں پر ناراض ہونے لگا۔

تمام آدمیوں میں بھن بھناہٹ ہوئی لیکن میری اُونچی آواز سب پر ب آ گئی "چھنگا استاد! مارٹی میرا آدمی ہے۔ تمھارے آدمیوں نے میرے ی کو اکیلا سمجھ کے مارا۔"

"مارٹی نے جاسوسی کی تھی۔" وہ طیش میں بولا۔

"اور تمھارے آدمیوں نے اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ مارٹی انھی جیسا ایک ی ہے۔ اسے بھی بھوک لگ سکتی ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"مارٹی نے بے اصولی کیا۔"

"میں اُسی بے اصولی کی بات تم سے کرنے آیا ہوں، سب سے بڑے ول تم ہو کہ تم اب علاقہ سنبھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے پھر بھی یہاں ریا دبے بیٹھے ہو۔" چھنگا یک لخت چبوترے سے اُٹھ گیا۔ اُس کے تمام بھی کھڑے ہو گئے۔ "چھنگا! تمھارے آدمیوں کی طرح مارٹی کا بھی ایک اُستاد اور اب وہ اس علاقے میں آ گیا ہے۔ اصولی اور بے اصولی کا پتہ تمھیں ل جائے گا۔ تم چبوترے سے نیچے اُتر آؤ۔ میں تم پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ے دن چلے گئے۔ اگر تم عزت کے ساتھ اُترنا نہیں چاہتے تو تمھاری مرضی۔" نے چاقو اُچھالتے ہوئے کہا "میں آ گیا ہوں اور مجھے تم سے یہ علاقہ حاصل نا آتا ہے۔"

ایک ساتھ کئی چاقو ہوا میں لہرا گئے۔ کچھ لوگ میری طرف جھپٹے۔ میں ں جگہ کھڑا رہا "چھنگا! منظور ہے؟" میں نے چاقو کی دھار پر انگلی پھیری۔ ایک سیاہ شکل کے چوڑے چکلے آدمی نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ دوسروں نے فوراً اُس کی تقلید کی۔ میں اپنے قدم مضبوطی سے زمین ا چکا تھا۔ میں نے اپنا گریبان اور بازو آزاد کرانے کی بھی کوشش نہیں یری توقع کے مطابق اُسی لمحے چھنگا کی آواز تڑخی "ہٹ جاؤ۔" اُس کے ں کو اُس کا حکم ماننے میں تامل ہوا۔ چھنگا نے دوبارہ دہاڑ کے کہا "ہٹ جاؤ۔"

تمام آدمی کسمساتے ہوئے مجھ سے الگ ہو گئے لیکن وہ میرے گرد اڑا لے کھڑے تھے۔ چھنگا نے پھنکار کے پھر انھیں دھتکارا۔ انھوں ں گیر توڑ دیا اور کمرے کی دیواروں تک ہٹ گئے۔ یہ حکم دینے کے بعد چھنگا ے کھڑا ہو گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مجھے گھورنے لگا۔

اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے "چھوکرا! ابھی چانس ہے، تم ادھر سے چلے جاؤ۔" اُس نے اپنی آواز پر ضبط کیا "جوانی سنبھالو۔ یہ لال بندر مکھڑا سفید ہو جائے گا اور یہ سفید کپڑا لال ہو جائے گا۔"

"ابھی جاؤ، چھوکری لوگ کو بازو دکھانا۔ ہم پہچانو چھوکرا! تمھارا ٹیم اِسک آسکی (عشق و عاشقی) کا ہے، ابھی تم ادھر کہاں سے آ گیا۔ چھنگا نہیں چاہتا کہ وہ تم پر ہاتھ اُٹھائے۔"

"چھنگا!" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "ابھی تمھاری کوئی آخری خواہش ہو تو بولو۔ چھوکرا اپنے بڑے کو ضرور عزت دے گا۔"

چھنگا گہری سانسیں بھرنے لگا "تم نہیں مانیں گا۔" اُس نے ایک سمت منہ اُٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے ایک چاقو اُچھلتا ہوا چھنگا کے ہاتھ میں آ گیا۔ اُس نے اُسے بڑی چابک دستی سے پکڑا تھا۔ چاقو ہاتھ میں آنے کے بعد چھنگا نے اُس کی دھار کا جائزہ لیا اور تمسخرانہ انداز میں بولا "چھوکرا! اپنے اوپر ترس کھاؤ۔"

"تم بہت حکم چلا چکے چھنگا! اب تم بوڑھے ہو چکے ہو، مجھے تمھاری عمر کا خیال آتا ہے۔ تمھیں ایک سمجھ دار اور تجربہ کار آدمی کی طرح میرے حق میں دست بردار ہو جانا چاہیے۔ یہ جتنے آدمی کھڑے ہیں، میں انھیں تم سے اچھی طرح استعمال کر سکتا ہوں، جتنا زیادہ میں ان کا خیال کر سکتا ہوں، تم نہیں کر سکتے۔ اچھا ہے کہ یہ سب لوگ سامنے موجود ہیں۔ میرا دل بھی تم پر ہاتھ اُٹھانے کو نہیں چاہتا لیکن تم خود اپنی عزت کے پیچھے پڑے ہوئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ سوچ لو۔"

"ہڑاؤ او۔۔۔" چھنگا نے غضب میں پھنکار ماری۔ اُس کا بدن تیزی سے گردش کرنے لگا تھا اور جسم میں جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ اور پیر پھیلا لیے اور شاید اس بات کا منتظر رہا کہ پہلے میں کوئی جنبش کروں۔ میں نے مہلت نہیں دی اور اُس نے توقف نہیں کیا۔ وہ مجھ پر ناراض بلی کی طرح جھپٹا۔ میں نے اُسے اپنی طرف بڑھنے دیا اور پلک جھپکنے کی مہلت میں دائیں طرف ہٹ گیا۔ چھنگا فوراً پلٹ پڑا اور اپنی جگہ ایک لمحے ٹھہر کے اور تاک کے دوبارہ حملہ آور ہوا مگر اس بار بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں نے اُچھل کے پھر جگہ بدل لی اور جب تک چھنگا دوبارہ مجھ تک پہنچا، میں پھرتی سے گھومتا ہوا کمرے کے درمیان آ گیا۔ چھنگا مجھ پر نگاہ رکھتا ہوا ایک فاصلے پر ٹھہر گیا اور چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد سنبھلے قدموں سے آگے بڑھا۔ پھر ایک دم اُس کا جسم تڑپا۔ اس بار اُس نے سامنے سے آنے کے بجائے اچانک بائیں سمت گھوم کے وار کرنے کے لیے پینترا بدلا۔ مجھے اُس کی زد سے بچنے کے لیے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ اُس نے حرکت کرنے کے لیے مجھے معقول وقت دے دیا تھا۔ چھنگا نے پے در پے مختلف زاویے بدلے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اُس کے چاقو اور میرے جسم میں ایک پور کا فاصلہ رہ گیا۔

کمرے میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں نے اب تک چھنگا پہ

کوئی وار نہیں کیا تھا۔ درمیان میں کئی موقعے ایسے آئے کہ میں اُس کی کلائی پہ ہاتھ ڈال سکتا تھا مگر نہ میں نے اپنے چاقو سے تاک لگائی، نہ اُس کے حملے کا جواب حملے سے دیا۔ میں اِدھر اُدھر اُس کے واروں، جستوں اور جھپٹوں سے بچتا ہی رہا حالانکہ کئی موقعوں پر یہ ممکن تھا کہ جب وہ پلٹ کے وار کرنے کے مرحلے میں ہو تو میں درمیان میں حملہ کر کے اُسے گرا بٹھا دوں۔ میں نے یہ گریز اس لیے کی کہ چھنگا کے آدمی پیش آنے والا کوئی سانحہ اتفاق نہ سمجھیں اور ہر بات کے شاہد ہیں انھیں یہ یقین بتدریج ہی آ سکتا تھا۔ کوئی اچانک سانحہ اُن کے لیے ناقابلِ قبول ہوتا۔ میں نے یہ گریز اس لیے بھی کی کہ جلدی میں خواہ مخواہ کام نہ بگڑ جائے۔ مناسب ہوگا کہ چھنگا کو میرے بارے میں رائے ملنے اور مغالطے ہونے کا موقع مل جائے۔ اُس کی یہ احتیاط اس کے پائے ثبات میں لرزش اور غضب میں تنزلزل کا سبب بن سکتی تھی۔ ہر آن پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا۔ بہرحال یہ موجمدار جیسا معاملہ نہیں تھا۔ موجمدار کے وقت مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس وقت میں اپنے حواس میں تھا اور چھنگا کی ایک ایک جنبش میری نگاہ کے دائرے میں تھی۔

شروع شروع میں چھنگا اُستاد نے جس چستی کا مظاہرہ کیا تھا وہ اب بھی موجود تھی مگر اب اُس میں ایک ہوشمندی شامل ہوگئی تھی اور وہ غالباً اس نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ قوت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اُسے محفوظ رکھا جائے۔ مجھے اندازہ تھا کہ چھنگا چند واروں میں فیصلے کا خواہش مند ہوگا کیونکہ وہ اسی طرح اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنی مشاقی اور برتری ثابت کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس میرے لیے طوالت مناسب تھی۔ میں طوالت ہی سے اُس کے ساتھیوں کے سامنے اپنی اہلیت ثابت کر سکتا تھا اور وہ میرے بارے میں کوئی مستقل رائے قائم کر سکتے تھے۔ یہ میرے لیے میرے ہاتھ کی آزمائش کا وقت تھا اور اُس کے لیے اُس کی بقا کا۔ اس لیے میں نے معاملے کو طول دیا۔ میں سارے کمرے میں تھرکتا رہا اور چھنگا چاقو لیے میرے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔ کئی منٹ اسی آنکھ مچولی میں گزر گئے۔ ننگے چاقوؤں کی موجودگی میں یہ آنکھ مچولی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتی اور ایسی صورت میں چند منٹ گزارنا ایک طویل مدت کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں دوبارہ جیل میں آ گیا ہوں اور قریب ہی تجمل کھڑا ہوا مجھ پہ نگاہ رکھے ہوئے ہے اور میرے مقابل کو اکسا رہا ہے کہ وہ اس طرح وار کرے اور پھر مجھ سے کہہ رہا ہے "لاڈلے! اس وار سے بچ کے دکھا" چھنگا نے داؤ پہ داؤ آزمانے میں طرح دیتا اور درگزر کرتا رہا۔ وہ پینترے بدلتا رہا۔ اُس میں موجمدار جیسی ہنرمندی نہیں تھی تاہم وہ اپنی صلاحیتیں خوب آزما رہا تھا کیونکہ وہاں جتنے لوگ موجود تھے، وہ اُن سب میں ممتاز تھا۔ فربہی کے باوجود اُس کے جسم میں بلا کی تیزی اور چمک تھی مگر شاید اُس کی نگاہ پر چربی چڑھ گئی تھی۔ جو بات میں نے اس کے اندر دیکھی تھی اور اپنے رویے میں ترمیم کر لی تھی، وہ میرے اندر اُس نے دیکھنا گوارا نہیں کی۔ یہ غرور بہت دنوں بعد پیدا ہوتا ہے۔

تجمل کا کہنا تھا کہ ہمیشہ یہ غرور، یہ نشہ جھٹک کے میدان میں اُترنا چاہیے اگر نگاہ پہلے بہک گئی یا دھوکا کھا گئی یا اُس نے وہ توجہ نہیں دی جو اُسے دینی چاہیے تو بعد میں نگاہ کا فیصلہ بدلنے کا وقت نہیں ملتا۔ تجمل کا کہنا تھا کہ نگاہ کا فیصلہ بدلنے کے لیے ذہن کھلا رکھنا چاہیے۔ جب خاصی دیر ہوگئی تو میں نے چیخ کر کہا۔ "چھنگا! اب بھی موقع ہے، تم کہو تو میں چاقو پھینک دیتا ہوں۔ مناسب ہے کہ اب کسی کوٹھری میں بند ہو کے پرانے دن یاد کیا کرو۔ ہم بھی تمھاری خدمت کریں گے۔"

جیسا کہ مجھے یقین تھا، چھنگا کے غیظ و غضب کا پارہ انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ کسی پاگل کی طرح مجنونانہ میری طرف بڑھا۔ میں اس بار بھاگا نہیں بلکہ میں نے پہلی مرتبہ ہاتھ بڑھا کے اچانک اپنا چاقو اُس پہ تان لیا۔ اس طرح کہ اگر وہ اپنی جھونک میں آگے آتا تو چاقو آر پار ہوتا مگر اُس نے یہ ماجرا دیکھ کے عین وقت پہ پینترا بدل دیا اور چونکہ بہت قریب آ کے اُس نے رکنے اور مڑنے کی کوشش کی تھی اس لیے وہ کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ اگر وہ اُسی لمحے زمین پہ جھک جاتا تو میرا وار بے اثر جاتا۔ اُس نے میرے چاقو والے ہاتھ کے نشانے سے بچنے کی کوشش میں رُخ بدلا تو میری اُٹھی ہوئی ٹانگ ٹھیک اُس کی پسلی میں لگی۔ وہ ڈگمگا گیا اور کہیں ایک ثانیے کے بعد اُسے ہوش آیا کہ اُسے فرش پر لڑھکتے ہوئے دور ہو جانا چاہیے۔ چاقو کے سامنے ایسے مرحلے بار بار آتے ہیں۔ گردن جھکنے، زمیں بوس ہونے اور دستبردار ہونے سے عزت نہیں گھٹتی۔ بعد میں اُس نے ایسا ہی کیا۔ وہ دو زمین لڑھکنیاں کھاتا ہوا میری توقع کے خلاف فرش سے حیرت انگیز طور پہ اُٹھ گیا۔ اُس لمحے مجھ سے اندازے کی ایک معمولی چوک ہوگئی۔ جب وہ فرش سے اُٹھ کے کھڑا ہوا تھا تب مجھے اُس کی طرف جھپٹنا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اپنی جگہ رُک کے اُس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ وہ نسبتاً گنجائش کی جگہ پہ تھا۔ میں بڑھا تو وہ بجلی کی طرح اپنی جگہ سے حرکت کر گیا اور جو داؤ میں نے اُس پہ صرف کیا تھا، اُس نے اسی کا ہدف مجھے بنایا۔ البتہ میں اُس کی ٹھوکر کی ضرب کھانے سے پہلے فرش پر جھکتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔ میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ مجھے اُس کے جسم کو اسی حد تک نشانہ بنانا تھا جس حد تک وہ برداشت کر سکے۔ اُس کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ یہ اُس کا پالا تھا اور اُس کے آدمی منٹوں میں میری لاش ٹھکانے لگا سکتے تھے۔

تجمل نے مجھے ایک اور بات بتائی تھی کہ بالکل اچانک بہت قریب جا کے ہی ارادہ بدلنا چاہیے۔ ظاہر کچھ کرتے اور عمل کچھ کرنے کا مظاہرہ سبھی کرتے ہیں۔ بات اتنی ہی ہوتی ہے کہ ارادہ کس لمحے بدلا جائے۔ اگر پہلے بدل دیا تو عموماً بے اثر ہو جاتا ہے۔ اگر سر پہ پہنچ کے بدلا تو مقابل کے پاس گڑبڑانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا مگر میں تجمل کے اس مشورے پہ اُسی وقت عمل کرتا جب مجھے فیصلہ کرنے کی جلدی ہوتی۔ جب ہم دونوں پھر سامنے آئے تو میں نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے موقع دیا کہ وہ میرا ہاتھ آسانی سے پکڑ لے۔ اُس نے یہ موقع جانے نہیں دیا۔ جب اُس نے میرا چاقو والا پنجہ پکڑا تو تماش بینوں میں کھلبلی مچی۔ میں نے مجمعے کی ایک چیخ سنی۔ کسی نے اُس کے سر پہ زور سے دھپ لگا کے اُسے زمین پہ بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ چھنگا دوسرے ہاتھ سے میرے جسم پر چاقو مارنا چاہتا تھا۔ میں گتھم گتھا ہونے کے بجائے جھٹکے سے اُس کی مخالف سمت کھنچ گیا اور ایک پل میں یہ صورت ہوگئی کہ وہ اُس طرف، میں اس طرف اور ہم دونوں کے کھنچے ہوئے، بندھے ہوئے ہاتھ درمیان کے فاصلے پہ حاوی آ گئے۔ میں نے اُس کے پنجے سے ہاتھ چھڑانے کی ضد نہیں کی بلکہ گھومنے لگا۔ نتیجے میں اُسے بھی میرے ساتھ گھومنے پہ مجبور ہونا پڑا اور اُس کی میرے قریب آنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ میں نے اُسے پانچ چھ تیز چکر دلائے۔ ہم دونوں جیسے اسکول کے بچوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اور اپنے جسم ہاتھوں کی درازی کے برابر دوری پر رکھے ہوئے فرش پر اچھل کود رہے تھے اور بھاگتے ہوئے چکر کاٹ رہے تھے۔ چھٹا چکر تھا کہ بالکل اچانک ایک جھٹکا دے کے میں اُس کے قریب ہوگیا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ اُٹھا مگر میں اپنا سر اُس کے سینے پر مار چکا تھا۔ اس کے پنجے سے میرا ہاتھ تو چھوٹنا ہی تھا، اُس کے قدم اس ضرب سے لڑکھڑا گئے لیکن میں نے اُس کے بہکے ہوئے قدموں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ اُسے سنبھلنے کی مہلت دی۔ وہ تیزی سے اوسان بحال کر کے میری طرف بڑھا اور اُس نے میرے شانے، گال اور شانے پر وار کرنے کے لیے کئی داؤ آزمائے۔ میں سمٹتا اور پہلو بچاتا رہا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھا اور جھنجلایا ہوا تھا۔ اسی عالم میں میں نے اُس کی چھاتی پر ایک بھرپور ہاتھ مار کے اُسے دور دھکیل دیا۔

جب ہم دونوں پھر آمنے سامنے ہوئے تو میں نے اُس کی پیشانی بھیگی ہوئی دیکھی۔ تیز روشنی میں اُس کا پسینہ چمک رہا تھا۔ میرے خون کی گردش تیز ہوگئی، اب خاصی دیر ہوگئی تھی۔ میں نے بے تحاشا ہاتھ چلانا شروع کر دیا۔ وہ اِدھر اُدھر مٹکتا تھرکتا رہا۔ میں نے اُسے ایک پل چین نہیں لینے دیا۔ کئی بار ایسے اسباب ہوئے کہ میں اُس کا جسم لہولہان کر سکتا تھا لیکن میں نے مجبوراً اپنے ہاتھ کھینچے رکھے جب کہ وہ میرا جسم اُدھیڑ ڈالنے کی فکر میں تھا۔ ممکن ہے اُس کے ساتھیوں نے میری گریز میرے کسی اندرونی خوف پر محمول کی ہو یا وہ میری حماقت پر حیران ہوں مگر میرا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ سب جان کا روگ تھے۔ اپنے نشانے اپنے وار سہو کرنا بہت اذیت ناک کام تھا۔ جب میں نے اچھی طرح اُس کی حالت کا جائزہ لے لیا تو پہلی مرتبہ میں نے اُس کا بایاں بازو تاک کے وار کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ سمجھ گیا۔ اُس نے جھٹ اپنا زاویہ بدل لیا لیکن چشم زدن میں چاقو میرے دوسرے ہاتھ میں تھا اور میں نے اُس کے دائیں بازو پہ ایک لکیر کھینچ دی جو اُس کا کرتا پھاڑتی ہوئی کہنی تک چلی گئی۔ کرتے پہ خون کی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ وہ اچھلا اور گھبرا کے پیچھے ہٹا۔ میں نے کسی قدر بے خیالی ظاہر کی جیسے میں اُس کی حالت پر متعجب ہوں۔ میرا چاقو والا ہاتھ گرا ہوا تھا اور میں مجہول انداز میں کھڑا تھا۔ چھنگا میرے لٹکے ہوئے چاقو والے ہاتھ ہی پہ جھپٹا۔ میں نے اُسے فوراً بلند کر لیا۔ چھنگا کا ہاتھ میری بغل سے گزر گیا لیکن واپس نہیں آیا۔ میں نے اپنا بازو تیزی سے نیچے کر کے اُسے دبا لیا تھا۔ اُسی لمحے میں نے اپنا چاقو اچھالا اور اُسے مارٹی کی طرف پھینک دیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے چھنگا کا ہاتھ دبائے دبائے اُس کی گردن پر ضرب لگائی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے میری گردن پکڑ رکھی تھی۔ ضرب معمولی نہیں تھی۔ چھنگا کی سسکی نکل گئی۔ اُس نے بوکھلاہٹ میں میری گردن چھوڑ دی۔ میں اسی امر کا منتظر تھا۔ میں نے پیچھے ہو کے دفعتاً اپنی پوری طاقت سے اُس کے جسم پر ٹکر ماری۔ میری بغل میں دبا ہوا اس کا پنجہ کھنچ گیا تھا، اُس کی ایک کربناک چیخ بلند ہوئی۔ فرش پہ چاقو گرنے کی آواز آئی۔ میں نے اُس کا پنجہ آزاد کر دیا اور اُس سے علیحدہ ہو کے اُس کی پسلیوں پر تین چار شدید ضربیں لگائیں۔ چھنگا فرش پر ڈھے گیا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ پھر میں نے اُس کا چاقو فرش سے اُٹھا لیا اور اُس کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے نظریں جھکا لیں۔ ٹنڈا، مارٹی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا اور مارٹی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ تیز سانسوں اور چھنگا کی کراہوں کے سوا کوئی اور آواز کمرے میں نہیں تھی۔ میں چاقو تانے ہوئے چھنگا کے پاس آیا۔ وہ فرش سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے اُسے کھڑا کیا اور اُس کا چاقو اُس کے آگے کر دیا۔ چھنگا نے مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ اُس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے اور اُس نے وحشیانہ طور پر میرے گلے میں اپنے بازو ڈال دیے۔ کمرے میں جیسے کسی نے شور کا بٹن دبا دیا۔ مارٹی اور ٹنڈا میری کمر سے چمٹ گئے۔ چھنگا کے آدمیوں نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا۔

ﷲ

مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ جولین اور چمپا دروازے پر کھڑی ہوئی میرا انتظار کر رہی ہوں گی اور انھوں نے بچھو کو میری تلاش میں روانہ کر دیا ہوگا لیکن یہاں سے جلدی نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ میرے اشارے پر چھنگا کے خون آلود کپڑے فوراً بدلوا دیے گئے۔ اُس کے زخمی بازو پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور اُس کے پنجے پہ مالش کی جا رہی تھی۔ میں خود چھنگا کو چبوترے پہ لے آیا تھا اور وہ میری گردن میں ہاتھ ڈالے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر میں چھنگا کے آدمی قریبی چوک کے گل فروشوں کے ہاں سے ہاروں اور پھولوں کے ٹوکرے لے کے آ گئے اور چھنگا نے اپنے ہاتھ سے میری گردن ہاروں سے بھر دی۔ میں نے آدھے ہار اُتار کے چھنگا کے گلے میں ڈال دیے۔ اُس نے انھیں فوراً اُتار دیا۔ پھر وہاں جتنے آدمی موجود تھے، وہ ایک ایک کر کے آتے اور میرے گلے میں ہار ڈالتے رہے۔ میں قریب رکھی ہوئی سینی سے ایک ایک رس گلا اُن کے منہ میں ڈالتا رہا۔ مارٹی میرے دائیں طرف اور چھنگا بائیں طرف بیٹھا تھا اور ٹنڈا میری کمر سے چپکا ہوا تھا۔ کوئی دو بجے تک یہ ہنگامہ ہوتا رہا۔ پھر میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ چھنگا نے مجھے روک لیا اور گمبھیر آواز میں بولا۔ "کہاں جاتا ہے؟ اب اس جگہ تُو ہی بیٹھے گا۔ اپن سویرے چلا جائے گا۔"

"نہیں چھنگا! تم وہیں رہو گے، اسی چبوترے پر بیٹھے رہو گے،

میں اب چلتا ہوں۔ تم بے شک اس علاقے کے راجا ہو۔ تمھارے ہاتھ میں بجلی بھری ہوئی ہے۔ تم جوان ہو اور کئی جوانوں پر بھاری ہو۔ تم حوصلے کے آدمی ہو۔"

"نئیں راجا! راجا تو تم ہو۔ اپن کو اتنا مت گراؤ، اپن اب یہاں نئیں رہے گا۔ یہ جگہ تمھارا ہے۔ تمی اِس کا مالک ہے اور یہ سب تمھاری پر جلے ہے۔ اپن دو ایک دن میں اپنے گاؤں چلا جائے گا؟"

میں نے اُس سے بہت اصرار کیا، چھنگا نہیں مانا۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ وہ میرا نائب بن کے علاقے میں موجود رہے مگر وہ کسی بات پر آمادہ نہیں ہوا۔ وہ ایک دو دن ٹھہرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوا، مجھے فوراً دوسرا انتظام کرنا تھا۔ ملٹی میرے پاس ہی بیٹھا تھا لیکن یہ موقع اُس کا نام لینے کا نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر گھمائی اور ایک دراز قد، بُردبار اور توانا آدمی کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا، یہ وہی آدمی تھا جس نے پاڑے کی گلی کے نکڑ پر مجھ سے کہا تھا کہ فیصلہ چھنگا کے ساتھی بھی کر سکتے ہیں۔ وہ میرے پاس آگیا۔ میں نے بلند آواز میں کہا "یہ علاقہ تم دیکھو گے جب تک میں مستقل طور پر یہیں نہ آجاؤں۔" پھر میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے پوچھا "کیا کسی کو اعتراض ہے؟"

مارٹی اور منڈا مجھے گھر تک پہنچانے آئے۔ رات بہت گزر چکی تھی۔ جولین اور چمپا و... کے قریب ہی گیلے لان پر بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کے دونوں دیوانہ وار میری طرف دوڑیں۔ میں نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی معذرت کر لی۔ میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ چھنگا کے خون سے میری قمیص سرخ ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے وہیں ایک آدمی سے اُسے بدل لیا تھا۔ میرے بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ جب تک جولین اور چمپا نے میرے ہاتھ پاؤں ٹٹول کے نہ دیکھ لیے، اُن کی وحشت کم نہیں ہوئی۔ میں نے مارٹی اور منڈے کو بھی اندر بلا لیا۔ اُن کا اتنی رات گئے واپس جانا ٹھیک نہیں تھا، دونوں جھجکتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور دونوں نے چمپا کے پیر چھوئے، جولین کو سلام کیا۔ جولین اور چمپا نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھوک نہیں لگ رہی تھی مگر اُن کے خیال سے میں میز پر بیٹھ گیا۔ سارا گھر اُجڑا ہوا تھا۔ اتنے مختصر وقت میں تقریباً تمام کا تمام سامان باندھ دیا گیا تھا۔ مارٹی اور منڈا سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ میں نے جولین سے اپنے کپڑے منگوا کے مارٹی کو پہننے کے لیے دیے۔ پھر میں نے اُس کے زخم کھول کے دیکھے۔ زخم معمولی تھے۔ چمپا نے اُس کی پٹی بدل دی۔ مارٹی کی آنکھیں برسنے لگیں اور وہ بیٹھے بیٹھے سسکیاں بھرنے لگا۔ میں نے اُن دونوں کو اپنے کمرے میں سُلا دیا اور خود ڈرائنگ روم میں آ کے لیٹ گیا۔ چمپا میرے سرہانے آ کے بیٹھ گئی اور مجھ سے پوچھے بغیر میرا سر دبانے لگی۔

صبح دس بجے تک ہم نے مکان بدل لیا۔ حکومت کی طرف سے جو ملازم وہاں تعینات تھے، وہ وہیں رہ گئے۔ بجھو کو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ جولین نے فون پر شکلا کو مکان چھوڑنے کی اطلاع دے دی تھی۔ منڈا اور مارٹی سامان اُٹھاتے رہے۔ جولین کا گھر کرشنا جی کے سرکاری مکان سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ جیسے ہی ہم اس کام سے فارغ ہوئے، میں منڈا اور مارٹی کو لے کے وہاں سے روانہ ہو گیا اور چھنگا کے علاقے میں پہنچ گیا۔ علاقے میں گشت کرنے والے آدمی سڑک ہی پر مل گئے اور ہمیں اپنی معیت میں پاڑے لے گئے۔ چھنگا وہاں سے جا چکا تھا اور چبوترے پر وہ آدمی موجود تھا جسے میں نے گزشتہ رات چھنگا کی جگہ مقرر کیا تھا۔ اُس کا نام زورا تھا۔ میرے پہنچتے ہی زورا چبوترے سے اُتر گیا۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ علاقے کے تمام آدمیوں کو پاڑے میں بلایا جائے۔ پھر میں اس وقفے میں زورا سے علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ دوپہر تک پاڑے کے بڑے کمرے میں علاقے کے تمام آدمی جمع ہو گئے۔ اُن میں سے بیشتر نے رات کا واقعہ نہیں دیکھا تھا مگر اپنے ساتھیوں سے تمام روداد سُن لی ہوگی۔ میں نے کوئی زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں کی۔ میں نے کہا کہ مجھے دو باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ ایک تو لڑکیوں کا اغوا، دوسرے طوائف بازی۔ جتنی دربردہ نوچیاں ہیں، اُن سے کہہ دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے علاقے میں چلی جائیں یا اُنھیں گزر بسر کے لیے اُس وقت تک بھتّے سے پیسے پہنچائے جائیں جب تک وہ کسی کام دام پر نہ لگ جائیں۔ علاقے سے کوئی لڑکی اغوا نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے اعلان کیا کہ آیندہ سے وصول ہونے والا بھتا مراتب کے اعتبار سے تمام آدمیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ استاد کا کوئی بھتا نہیں ہوگا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے علاقے میں زیادہ دنوں تک نہیں رہنا ہے۔ جب ہم ان میں سے کوئی آدمی میری یا چھنگا استاد کی جگہ لینے کے قابل ہوگا، علاقہ اُسے سونپ دیا جائے گا۔ جب بھی کوئی آدمی یہ سمجھے کہ وہ موجودہ استاد سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے، اُسے کسی تامّل کے بغیر اُستاد کو چیلنج کر دینا چاہیے۔ پاڑے میں باقاعدہ ورزشیں ہوا کریں گی اور ہر قسم کے ہُنر کی مشق کی جائے گی۔ آپس میں کوئی اختلاف ہو تو اُسے اُستاد کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

میں دن بھر وہیں رہا تھا۔ پھر میں نے مارٹی اور منڈے کو پاڑے میں چھوڑ دیا تھا۔ اُس رات بھی مجھے گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی، چمپا اور جولین نے کہا کچھ نہیں مگر اُن کا نہ کہنا بھی سب کچھ کہنا تھا۔ اسی طرح کوئی بیس پچیس دن گزر گئے۔ مارٹی کے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ میں نے پاڑے ہی میں اُسے چاقو بازی، لو... بازی، پٹے بازی، بانے بازی اور مختلف قسم کے داؤ پیچ بتانے شروع کر دیے تھے اور یہ سلسلہ صرف مارٹی تک محدود نہیں تھا، دوسرے بھی اس میں شامل ہو گئے تھے، پاڑے کی عمارت میں رنگ و روغن کرا دیا گیا تھا۔ صرف ایک مہینے میں علاقے کے سارے آدمی چھنگا کا نام بھول چکے تھے، وہ میرے اِرد گرد جمع رہتے تھے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن علاقے کا گشت کرتا تھا اور واپس آ کے اپنے آدمیوں کو مختلف ہدایتیں دیتا تھا۔ شہر کے دوسرے اڈّوں کی سرگرمیاں مجھے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جولین اور چمپا نے اپنا رویّہ نہیں بدلا۔ رات گئے جب میں گھر واپس لوٹتا تو وہ مجھے جاگتی اور تملاتی ہوئی ملتیں حالانکہ میں نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرا انتظار نہ کیا کریں۔ ویسے اب انھیں مجھ سے بات چیت کا وقت ہی نصیب نہیں ہوتا تھا، آتے ہی میں لیٹ جاتا یا

...رے میں بند ہو جاتا اور اپنی مالا کے دانے منہ پر پھیر لیتا۔ کوا چپکے سے میری آنکھوں میں آ کے بیٹھ جاتی۔ میں اُسے اپنی آنکھوں میں بند کیے سو جاتا اور صبح ہوتے ہی ناشتے کے بغیر گھر سے نکل جاتا۔ پھر ایک رات ایسا ہوا کہ مجھے پاڑے میں رہنا پڑا۔ اُس رات علاقے کے ایک آدمی بسنتا کا پڑوسی علاقے کے ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا، چنانچہ مجھے پہلی بار استاد بالم خاں کے پاڑے میں داخل ہونا پڑا۔ بالم خاں نے میرا ذکر خاصا سُنا ہوگا۔ مارٹی نے مجھے بتایا تھا کہ علاقے کے آدمی میرے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ میں پولیس کا آدمی ہوں، کبھی کہتے ہیں کہ میں اُن میں سے نہیں ہوں، مجھ پر کسی بھوت یا جن کا سایہ ہے، کبھی کہتے ہیں کہ میں نے اُستاد مستانہ کے اڈّے میں گھس کے پولیس کو رپورٹ کر دی تھی اور سارے اڈّے کو پکڑوا دیا تھا اور میری ایک بڑے پولیس افسر سے دوستی تھی۔ مارٹی اپنے طور پر اُن کی تردید کرتا رہتا تھا۔ میں نے اُسے ہدایت کی کہ وہ کسی تردید یا تائید میں اپنا وقت ضائع نہ کرے، لوگ جو کہتے ہیں اُنھیں کہنے دے۔ اگر لوگ زیادہ تنگ کریں تو اُن سے کہہ دے کہ مستانہ نے ایک نوجوان لڑکی اغوا کی تھی، وہ غنڈا نہیں تھا اس لیے پولیس کو رپورٹ کر دی تھی۔ ان طرح طرح کی افواہوں اور کہانیوں کے باوجود میرے علاقے کے لوگ چھنگا کے مقابلے میں میری کہیں زیادہ عزت کرتے تھے، میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے قریب رہنا چاہتے تھے۔

اُس رات جب زخمی بسنتا پاڑے میں واپس آیا تو مجھے بالم خاں کے پاس جانا پڑا۔ بالم خاں میری شکل دیکھتے ہی میرا مذاق اُڑانے لگا اور مجھ پر ناقابلِ برداشت فقرے کسنے لگا حالانکہ اُس کے آدمیوں نے اُس کی زبان روکنے کی بھی کوشش کی مگر بالم خاں، جو گندمی رنگ کا ایک لمبا چوڑا آدمی تھا اور جس کی آواز میں کھنک تھی، اُس نے میری بات پر کان نہیں دھرے، نتیجتہً بات بڑھ گئی اور اتنی بڑھی کہ بالم خاں چاقو تان کے کمربستہ ہو گیا، میں نے درگزر کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے دل میں میرے لیے کوئی بڑی نفرت لیے بیٹھا تھا۔ مختصر یہ کہ مجھے اُس سے مقابلہ کرنا پڑا اور اُس رات بالم خاں کا علاقہ بھی میرے علاقے میں شامل ہو گیا۔ بالم خاں زخمی ہونے کے بعد علاقہ چھوڑ کے بھاگ گیا۔

بالم خاں کا علاقہ بہت چھوٹا تھا۔ وہ صرف چند گلیوں اور ایک لمبی سڑک پر مشتمل تھا، آمدنی بھی معمولی تھی، شاید وہ چھنگا کے علاقے پر مدّت سے تاک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے سامنے دیکھا تو اُسے اپنا پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا مگر بالم خاں صرف دیکھنے کا آدمی تھا، محض تین چار داؤں میں گہرے زخم لگوا لیے اور چلتا بنا، میں اُس رات گھر نہیں جا سکا۔

دوسرے دن کوئی بارہ بجے مارٹی ہانپتا کانپتا ہوا پاڑے میں آیا اور اُس نے خوف زدہ آواز میں میرے کانوں میں سرگوشی کی کہ کوئن علاقے میں آئی ہوئی ہے۔

"کوئن!" میں اچھل پڑا۔ "جولین؟"

"ہاں راجا ڈارلنگ!" اُس نے گھبرا کے کہا۔ "وہاں میرا نام خود بخود راجا پڑ گیا تھا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"اپن نے اُسے پاڑے سے دُور ہی رکھا ہے۔ وہ اپن کا ایڈریس پوچھتی ہوئی پُرانے فلیٹ گئی تھی جید رتم فرسٹ ٹائم آیا تھا۔ اُو دو لوگوں نے ایڈریس بھیج دیا، اب اپن کو علاقے کا سارا لوگ جانتا ہے۔ اپن لے نون پر بن بلا جا!"

"اُسے تمھارا پتہ کیسے معلوم ہوا؟" مگر فوراً مجھے یاد آیا کہ جب مارٹی مجھے اپنا پتہ بتا رہا تھا، وہ میرے ساتھ تھی۔ میں مارٹی کے ساتھ بھاگا بھاگا علاقے کے چوک میں پہنچا۔ اُسے منڈے نے ایک جگہ روک رکھا تھا۔ میں اُسے اُسی وقت علاقے سے باہر لے گیا۔ گھر آ کے میں نے اُسے تنبیہ کی کہ وہ وہاں کیوں گئی۔ وہ کچھ نہیں بولی بس منہ چھپا کے رونے لگی۔ رات کو چونکہ میں گھر نہیں آیا تھا اس لیے وہ میری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ میں اُس دن گھر ہی رہا کیونکہ جولین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن دوسرے دن وہاں نہیں رُک سکتا تھا۔ اب وہ لمحہ قریب آ رہا تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں نے جولین کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ آیندہ بھی کسی رات گھر سے غائب رہ سکتا ہوں۔ وہ کام کی نوعیت پوچھنے لگی، میں اُسے کام کی نوعیت کیسے بتا سکتا تھا۔ خود میرا دل علاقے میں کہاں لگتا تھا، میں تو وہاں مجبوراً ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں مجھے ایک تو دن بھر ہر لمحے چوکنا رہنا پڑتا تھا، دوسرے گھر آتے ہی چمپا اور جولین کی آنکھیں سہنی پڑتی تھیں۔ چمپا ابھی تک چپ تھی مگر ایک رات جب میں دوسرے ناغے کے بعد واپس آیا تو وہ بھی تنبیہ کرنے لگی کہ میں پھر بُرے لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا ہوں اور کرشنا جی کو بھول چکا ہوں۔ "بُرے کام کا بُرا انجام ہوتا ہے پیارے میاں!" وہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے التجا کرنے لگی کہ میں منڈے اور مارٹی کا ساتھ چھوڑ دوں۔ مجھے اپنے عزیزوں کو تلاش کرنا چاہیے۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں جلد ہی باقاعدگی سے گھر آنا شروع کر دوں گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔

بعد کے دنوں میں میری مصروفیت اور بڑھ گئی۔ اب میں تین تین چار چار دن بعد گھر واپس آتا۔ میرے کپڑے میلے ہوتے اور میں اپنی صورت دکھا کے یا ایک رات سو کے صبح صبح واپس چلا جاتا، جولین کے گھر فون نہیں تھا مگر چمپا مجھے بتاتی رہتی تھی کہ شکلا جی آئے تھے، مجھے پوچھ رہے تھے۔ میں نے شکلا کو کہیں سے فون نہیں کیا کہ کرشنا جی کے لکھے ہوئے خطوط کا کہیں سے کوئی جواب آیا یا نہیں۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ کسی جانب سے کوئی جواب آسکتا ہے۔ اگر آتا تو شکلا مجھ سے ملنے کے لیے ضرور بے چین ہوتا۔ میں مسلسل دو مہینے چھنگا کے پاڑے میں خود کو تماشا بناتا رہا۔ پھر بمبئی کے کئی استاد مجھ سے ملنے کے لیے آئے لیکن میں زیادہ تر اپنے ہی علاقے میں محدود رہتا، بہت کم کسی سے ملتا جلتا تھا۔ زورا، چھیدا، مارٹی اور منڈا ہر وقت مجھے خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ بالم خاں کا علاقہ شامل ہونے کے بعد یہ علاقہ خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود زورا اور مارٹی کی خواہش تھی کہ اسے اور وسیع کیا جائے کیونکہ یہ بمبئی کے اور بہت سے علاقوں کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ میں نے اُن کی بات پر توجہ

نہیں دی تو وہ چاروں مجھ سے قریب رہنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔
تین مہینے گزر گئے۔ ممبئی کا شاید ہی کوئی اڈا ایسا ہو جس کے بارے میں مجھے تمام تفصیلات معلوم نہ ہوں۔ آخر وہ لمحہ آ گیا جب میں نے زورا اور مارٹی کو بلا کے اپنی ایک خواہش ظاہر کی۔ میں نے انھی کے ذریعے تمام معلومات اکٹھی کی تھیں اور یہ کام اُس وقت تک ناممکن نظر آتا تھا جب تک میرے ساتھ کچھ اور لوگ شریک نہ ہوں۔ میں پوری طرح اصل چہروں سے واقف نہ ہو جاؤں۔ غیر متعلق لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور متعلق لوگوں کی نشان دہی کے لیے خاص قسم کے لوگوں کا ساتھ ضروری تھا۔ میرا بھتا علاقے کے لوگوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ انھیں پاڑے میں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ وہاں بسنری بھی گھوٹی جاتی تھی اور روز طرح طرح کے گانوں کی محفل جمتی تھی۔ جھنگا کے دَور میں ہر دوسرے تیسرے روز مجرا ہوتا تھا، چنانچہ مجھے بھی مجبوراً پاڑے میں گانا سننے کے لیے طوائفیں لانے کی اجازت دینی پڑی۔ جس رات رقص و سرود کا یہ ہنگامہ گرم ہوتا، میں وہاں نہیں رہتا تھا۔ مارٹی اور ٹنڈے کے سوا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کسی میں جرأت بھی نہیں تھی کہ وہ میرا تعاقب کر سکے۔ میں نے زورا، مارٹی، چھیدا اور دوسرے قریبی آدمیوں کو اشارہ کر دیا کہ وہ زیادہ آمدنی والے علاقوں پر نظر رکھیں اور معلوم کریں کہ کون سا علاقہ کن لوگوں سے متعلق ہے۔ یہ کام اُن کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ممبئی کے دوسرے علاقوں میں ہر ایک کے اپنے شناسا اور ہم پیشہ آدمی موجود تھے اور ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ مارٹی، زورا اور ٹنڈے کی زبانی ہر چھوٹی موٹی بات میرے کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ وہ مجھے بتاتے تھے کہ کس علاقے میں میرے متعلق کیا باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ پھر میں نے انھیں تیواڑی دادا کے علاقے کے آدمیوں سے رابطہ بڑھانے کی ہدایت کی۔ وہ تیواڑی کے چند آدمیوں کو اپنے ہاں لے بھی آئے تھے اور انھیں رات بھر حیدرآباد سے آئی ہوئی طوائف گل فام کا گانا سنواتے اور انگریزی شراب پلاتے رہے۔ میں اُس محفل میں موجود نہیں تھا لیکن تھا پاڑے ہی میں۔
میں نے زورا اور مارٹی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو صرف چند لمحوں کے لیے اُن پر سکتہ طاری ہوا، پھر انھوں نے میرے ہاتھ چوم کے کہا: "راجا جی! تم بولو تو اپن سر کاٹ دے۔"
تیسرے دن شام کو سات بجے وہ علیحدہ علیحدہ پاڑے سے روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے وہ کئی بار محلِ وقوع کا جائزہ لے آئے تھے۔ زورا اور مارٹی کے ہاتھوں میں اب خاصی پھرتی آ گئی تھی۔ ٹنڈا اور چھیدا بھی اُن کے ساتھ تھے۔ رات ہوتے ہوتے وہ امیروں کی اُس سبزہ زار آبادی میں مختلف مقامات پر چھپ گئے تھے، ٹنڈا کوڑے کے ڈرم میں گھس گیا تھا۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے وہ یکے بعد دیگرے اپنی اپنی جگہوں سے نکلے اور ایک متعینہ مقام پر ایک دوسرے سے مل گئے۔ چھیدا اور زورا کے کندھوں پر چڑھ کے سب سے پہلے مارٹی نے باؤنڈری عبور کی۔ وہ اپنے ساتھ ضروری سامان بھی لے گئے تھے۔ ٹنڈا باہر ہی رہ گیا۔ زورا، چھیدا اور مارٹی نے باؤنڈری اُتر کے سب سے پہلے دروازے کا رُخ کیا اور لپٹ سے چوکی دار کے سر پر پہنچ کے اُسے کچھ دیر کے لیے حرکت اور آواز سے معذور کر دیا۔ پھر وہ کوٹھی کی طرف بڑھے۔
صبح کے اخباروں میں خبر آنا ممکن نہیں تھا لیکن دوپہر تک سیٹھ شمبھو ناس اور اُس کے داماد گردھاری لال کے قتل کی خبر شہر میں پھیل چکی تھی۔ میں گھر سے چار دنوں سے غائب تھا، اُس دن سرِ شام ہی گھر پہنچ گیا۔ جولین بیمار تھی۔ میں چمپا کے ساتھ اُس کے کمرے میں گیا تو اُس نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔ میں نے بے اختیار اُس کی پیشانی چوم لی۔ وہ اُٹھ کے بیٹھ گئی اور میرے ہاتھوں پر اپنا سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں حیران رہ گیا۔ چمپا نے مجھے بتایا کہ تین دن پہلے اُس کا باپ مر چکا ہے۔ میرا سر چٹخنے لگا۔ جولین نے میرے ہاتھ بھگو دیے تھے، پتہ نہیں کس وقت چمپا مجھے اُٹھا کے میرے کمرے میں لے گئی۔ مجھے رات بھر کوئی سدھ بدھ نہ رہی۔ صبح ہوئی تو چمپا نے مجھے جگایا۔ دھوپ چڑھ آئی تھی۔ مجھے فوراً پاڑے جانے کا خیال آیا۔ ابھی شمبھو گروپ کا پروردہ تیواڑی دادا موجود تھا۔ میرا پاڑے جانا ضروری تھا۔ چمپا نے میرا تذبذب دیکھ کے جھجکتے ہوئے کہا: "ایک آدمی باہر بیٹھا ہوا تمھارا انتظار کر رہا ہے۔"
"میرا انتظار! کون ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔
"باہر آ کے دیکھ لو۔" چمپا ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔
میں نے چادر ایک طرف پھینک دی اور بستر سے اُچھل کے نیچے آیا۔ جب میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچا تو میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ بھجل میری طرف دیکھ رہا تھا۔
میں ... یہ فریبِ نظر ہے، میں ابھی تک سو رہا ہوں مگر اُس کا دیو قامت سراپا میری آنکھوں سے دُور نہیں ہوا۔ وہ وہیں کمرے کے وسط میں صلیب کے نیچے کرسی پر جما ہوا بیٹھا تھا اور سرخ نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ چوکھٹ پر میرے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔ اُس کی پیشانی پر بے شمار لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ مجھ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکا۔ میں دروازے ہی پر ٹھٹکا ہوا آنکھیں پٹ پٹاتا رہا۔ پھر مجھے اُس وقت خبر ہوئی جب میں اُس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے زور سے جکڑ رکھا تھا۔ ہم دیر تک ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوئے۔ میں نے اپنی آنکھیں بھینچ لی تھیں مگر آنسو پھوٹ پڑے اور میرا سر اُس کے کندھے پر تڑپنے لگا۔ بھجل نے یک لخت مجھے اپنی چھاتی سے ہٹا دیا اور میرے بازو پکڑ کے مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کی نظروں سے بچنے کے لیے میں نے دوبارہ اُس کے سینے میں سر چھپانا چاہا مگر اچانک ایک دھماکا سا ہوا، قدم زمین سے اُکھڑ گئے اور میں ایک طرف جھک گیا۔ بھجل نے اُلٹے ہاتھ سے میرے گال پر طمانچہ رسید کیا تھا۔ میں ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اُس نے دوسرا طمانچہ لگا دیا۔ میں نے مضبوطی سے اپنے پیر زمین پر جمانے کی کوشش کی تاکہ اُسے نشانہ

لگانے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں روکا۔ وہ خود ہی تھم کے ہانپنے لگا اور اُس نے ایک جھٹکے سے مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔
"لاڈلے جانی!" اُس کی کراہتی ہوئی آواز اُبھری۔ "روتا بھی ہے، رُلاتا بھی ہے۔"
"ہاتھ کیوں روک لیے بھجل بھائی!" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔
"تُو نے ہاتھ پیر پھیلا دیے۔" وہ منہ پھیر کے بولا۔
میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ "ہاتھ مت روکو۔ مارو، خوب مارو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میری سانس نکال دو۔"
"ہاتھوں میں جان ہوتی تو اتنی دیر نہ لگتی لاڈلے!" وہ میرے شانے جھنجوڑتے ہوئے مضطرب لہجے میں بولا۔ "تیرا دل پتھر کا بنا ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے اُسے نوچ کے پھینک دوں۔"
"تو نوچ لو نا۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "دیر کیوں کرتے ہو۔ ایک ذرا سی ہمت کر لو، پھر یہ آزار ہی ختم ہو جائے گا۔ مجھ سے بھی اب یہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں اپنا یہی گندہ سینہ چھپانے کے لیے لوگوں سے دُور رہتا ہوں۔"
"چپ ..." [illegible] آواز میں چلایا۔ "دُنیا میں آدمی اکیلا نہیں ہوتا لاڈلے!" اُس کی آواز ڈوبنے لگی۔ "سب کچھ تجھ پر نہیں ہے کہ تُو کیا چاہتا ہے، دوسروں پر بھی ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں، تُو نے کیا پڑھا لکھا ہے۔ کتابوں میں تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔"
"میں نے کچھ نہیں پڑھا لکھا، میں بالکل جاہل ہوں، جنگلی ہوں، کُتا ہوں۔ ہاں! مجھے اس دُنیا میں نہیں رہنا چاہیے۔"
بھجل کے طمانچوں اور آواز کی گرج سُن کے بیمار جولین بھی چادر اوڑھے ہوئے بستر سے اُٹھ آئی تھی اور چمپا کے پہلو میں سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ "اگر آپ لوگ بیٹھ جائیں۔" اُس نے لرزیدہ آواز میں ہمیں ٹوکا۔
بھجل چونک کے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے میرے بازو چھوڑ دیے اور میری گردن میں بانہیں ڈال کے گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ "تُو نے پلٹ کے خبر بھی نہیں لی بادشاہ!" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ منٹ گزر گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو اُبل رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ "تم یہاں کیسے آ گئے؟" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں نرمی سے پوچھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ بھجل اُس گھر میں آیا ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ یہ میرا گھر تو نہیں مگر بھجل نہ جانے کتنی دُور سے چل کے میرے پاس آیا ہے۔ اُسے دیکھ کے میری زبان گنگ ہو گئی تھی اور اس کے بعد اُس نے مجھے کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔
"آ گیا۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آخر پہنچ ہی گیا۔"
"لیکن تم ... تم کیوں آ گئے؟"
"چلا جاؤں گا لاڈلے!"
"نہیں، نہیں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "میرا مطلب ..."
"تیرا مطلب کچھ بھی ہو۔" وہ میری بات کاٹ کے پژمردگی سے بولا۔ "میں تجھے دیکھنے آیا ہوں، خود کو تجھے دکھانے نہیں آیا۔ تُو کہے تو چلا جاؤں گا۔"
"نہیں بھجل بھائی!" میں نے اضطراب سے کہا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ تم غلط سمجھے۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا، میرا مطلب یہ تھا کہ تم اپنی پریشانیاں بڑھانے یہاں کیوں آ گئے؟ میں نے پہلے ہی تمھیں کون سا خوش رکھا تھا۔"
"جانے دے۔" وہ ہاتھ جھٹک کے بولا۔ "طعنہ مت دے۔ تُو تو بالکل نہیں بدلا۔" اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا۔ "تُو تو وہی ہے، وہی لاڈلا راجا۔ کیا تُو یہ سمجھتا تھا کہ تیرے آنے کے بعد وہاں موجود نہیں ہوگا۔ تُو تو ہر وقت وہیں تھا۔ تیری پرچھائیں تو وہیں رہ گئی تھی کتوڑے! اُسے بھی ساتھ لیتا آتا۔" وہ میرے بال کھینچنے لگا۔ "تُو مجھ سے کہہ کے بھی آ سکتا تھا، میں نے تیری کون سی بات ٹالی تھی۔ برس ہونے کو آ رہا ہے۔"
"مجھے جانا تھا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔
"جانا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھے جانا ہے ... تیرے پیروں میں زنجیر پڑی ہے۔ پر تُو کچھ دیر بعد جا سکتا تھا اور جا کے واپس آ سکتا تھا۔ تجھے صرف اپنے پیروں کی زنجیر کیوں دکھائی دیتی ہے۔ تُو نے تو ..." چمپا کو سامنے کھڑا دیکھ کے اُس کی زبان لڑکھڑاتے ہوئے سرد پڑ گئی۔ چمپا کے پیچھے جولین دبکی کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔
"آئیے، ناشتہ کر لیجیے۔" چمپا نے جھجکتے ہوئے مداخلت کی۔
"ناشتہ۔" بھجل سٹ پٹا کے بولا۔ "نہیں، نہیں۔ ہم ہوٹل سے نمٹ کے آئے ہیں، ناشتہ نہیں۔ پر ہاں، لاڈلا تو ناشتہ کرے گا۔ چل اُٹھ۔" وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "کچھ کھا لے۔"
"مگر آپ ... آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ سیدھے اسٹیشن سے یہاں آ رہے ہیں۔" چمپا نے ہلکی آواز میں کہا۔ "آئیے۔"
"کھانے پینے کا کسے ہوش ہے مائی! اپنا ناشتہ تو اسے دیکھ کے ہی ہو گیا۔" وہ میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اس سے پوچھو، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ کھاتا پیتا ہی نہیں ہے۔ کیسا دُبلا ہو گیا ہے۔"
"باہر جو لوگ کھڑے ہیں، انھیں بھی اندر بلا لیجیے۔" جولین نے جھکتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔ "یہ گھر ظہیر ہی کا ہے۔" جولین کی سانس ٹھیری ہوئی تھی۔
"باہر کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"وہ ... وہ تیرے دو ایک جاننے والے ہیں۔" بھجل بے پروائی سے بولا۔ "انھیں باہر ہی رہنے دے۔ یہ گھر ہے، پاڑا نہیں ہے۔"
"کون کون ہے؟" میں نے تیزی سے اُٹھتے ہوئے کہا اور بھجل کے جواب دینے سے پہلے دروازے کی جانب بھاگا۔ مکان کے باہر کرسیاں ڈالے

گردن جھکائے فیض آباد کے اُستاد جامو اور کانتے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے مجھے دیکھا دونوں مجھ پہ جھپٹ پڑے۔ جامو نے مجھے اُوپر اُٹھا لیا۔ کانتے اپنا سر میرے سینے پہ مارنے لگا۔ انھوں نے راہ گیروں کی پروا بھی نہیں کی۔ "چلو چلو اندر چلو۔" میں نے انھیں کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ جھجکے مگر میں انھیں اندر جولین کے گھر کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہ دونوں تجمل کے پاس مبارک باد کا شور مچاتے ہوئے آئے۔ انھوں نے مجھے پاس ہی بٹھا لیا۔ وہ کبھی مجھے گھونسے مارتے، کبھی سر ٹکراتے۔ یہ دیکھ کے جولین کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ وہ ہم سب کو جھل ملاتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اب کوئی پردہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ جولین نے بہت کچھ سن لیا تھا۔ تجمل، جامو اور کانتے کے چہرے ایسے نہیں تھے جنھیں اتنی عمر کی لڑکی نہ پہچانتی ہو۔ اُسے میرا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ تاہم وہ بہت خوش خوش نظر آ رہی تھی جیسے اُس کے عزیز رشتے دار آ گئے ہوں اور وہ اپنے باپ کے مرنے کا غم بھول گئی ہو۔ وہ بار بار اندر جاتی تھی اور چند لمحے بھی نہیں گزرتے تھے کہ واپس آ جاتی تھی۔ اندر اُس کی ماں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اُس کے اصرار پر ہم سب گول میز کے گرد بیٹھ گئے۔ یہ میز وہ اپنے پُرانے گھر سے ساتھ لائی تھی اور چار ہی آدمی اس کے اطراف بیٹھ سکتے تھے۔ میز پر بہت اہتمام تھا۔ اتنی سی دیر میں یہ سب چیزیں تیار ہو گئی تھیں۔ بھاجی بھی تھی، پوریاں بھی تھیں، مٹھائی بھی تھی، بسکٹ، ٹوسٹ اور مکھن سبھی کچھ موجود تھا۔ جب چمپا چائے دانی لے کے آئی تو جامو نے آہستگی سے پوچھا۔ "کیسی ہو چمپا بائی ؟"

"ٹھیک ہوں۔" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تم تو بالکل بدل گئی ہو۔" وہ اُسے گھورتے ہوئے بولا۔

"چپ رہ جامو!" تجمل نے تلخی سے کہا۔ "فضول باتیں مت کر۔"

جامو نے تلملا کے گردن جھکا لی۔ ناشتے کے دوران میں خاموشی رہی کسی نے کچھ کھایا نہیں۔ انھوں نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ انڈیلے اور ڈرائنگ روم میں میرے گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے۔ تجمل نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا تھا۔ میرے آنسو تھم گئے تھے لیکن حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر تجمل کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں بمبئی میں ہوں اور اس جگہ رہ رہا ہوں؟ اسے میرا پتہ کس نے بتایا؟ مجھے اندازہ تھا کہ اب کیا ہو گا۔ تجمل میری انگلیاں ٹٹول رہا تھا اور بار بار مجھے دبوچ لیتا تھا۔ جامو اور کانتے نے کچھ بولنا چاہا تو تجمل نے پھر انھیں جھڑک دیا۔ "استاد نے تو زبان پہ تالا لگا لیا ہے۔ تُو ہی کچھ بول لاڈلے! تجھ پہ کیا بیتی؟ تُو اتنے دنوں کہاں رہا؟"

"کانتے!" تجمل نے مشتعل ہو کے کہا۔ "لاڈلے کو پریشان نہ کر۔ میں جانتا ہوں یہ تجھے کچھ نہیں بتائے گا۔ یہ بڑا کنجوس ہے، سب کچھ اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔ اسے مت چھیڑ۔"

لیکن یہ زبان بندی کتنی دیر کی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُن کے ذہنوں میں بے شمار سوال اُٹھ رہے ہوں گے۔ یہ فیض آباد کی چمپا بائی ہے جس کے کوٹھے پر میری بہن ناچتی تھی اور جو میرے خوف سے فیض آباد سے بھاگ کے اپنی بہن موتیا بائی کے پاس آگرے چلی گئی تھی۔ میں اسی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ اور یہ خوب صورت لڑکی کون ہے جو اتنی بے تابی سے ان لوگوں کو دیکھ رہی ہے۔ یہ گھر کیسا ہے جہاں میں بیٹھا ہوں اور اگر مجھے گھر ہی بنانا تھا تو تجمل اور زریں نے کیا بگاڑا تھا۔ جلد یا بدیر مجھے بہت سے سوالوں کے جواب دینے تھے۔ مجھے بتانا تھا کہ میں نے زریں کے ہاں سے آنے کے بعد کیا حاصل کیا اور جب میں نے کچھ حاصل نہیں کیا تو واپس کیوں نہیں آیا؟ وہی سوال و جواب، وہی کیوں اور کیسے۔ میرے پاس اُن کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ مجھ سے تو آئینے کے سامنے بھی نہیں جایا جاتا۔ میں اُن کے سامنے اپنے زندہ رہنے کی کیا وضاحتیں پیش کر سکوں گا، میں انھیں کیا بتاؤں گا کہ جو کچھ ہوتا رہا، وہ میرے ارادے کے بغیر ہوتا رہا۔ گاڑی میں کرشنا جی مل گئے حالانکہ ساری گاڑی آدمیوں سے بھری ہوئی تھی اور اب جب اس شہر سے نکلنے میں چند ہی روز یا چند ہی ہفتے کا کام باقی رہ گیا تھا تو وہ آ گئے۔ مجھے یہاں کون سا ہمیشہ رہنا تھا۔ مجھے تو آگے جانا تھا کیونکہ جب بھی میں کہیں کچھ دیر کے لیے ٹھیرتا، جی گھبرانے لگتا تھا۔ اسی لیے میں نے عہد کر لیا تھا کہ اب کوئی کرشنا جی ملے یا کوئی زریں یا کوئی جولین نظر آئی تو میں فوراً راستہ بدل دوں گا لیکن اب وہ آ چکے تھے۔ تجمل آ گیا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں میں زنجیریں پہنانے آ گیا تھا۔

"آپ لوگ بتائیں تو... آپ کا سامان کدھر ہے؟" جولین نے تذبذب آمیز شائستگی سے پوچھا۔

تجمل نے سر اُٹھا کے شاید پہلی بار جولین کو غور سے دیکھا۔ وہ دُہری ہو گئی۔ "یہ کون ہے رے؟" وہ سرگوشی میں بولا۔

"یہ جولین ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"جولین!" اُس نے تجسس سے دُہرایا۔

"ہنھ۔" وہ بڑبڑا کے رہ گیا اور جولین سے مخاطب ہو کے نرمی سے بولا۔ "ہمارے پاس کوئی سامان وامان نہیں ہے تم ہماری فکر مت کرو، اپنے گھر کا کام کرو۔"

"مگر آپ یہیں رہیں گے۔" وہ نیچی نظروں سے بولی۔

تجمل چپ رہا۔ جولین اُس کے جواب کی منتظر تھی کہ معاً دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ مارٹی اور ڈنڈا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت اُن کا آنا بے سبب نہیں تھا۔ سیٹھ شمبھوناس اور اُس کے داماد گردھاری کے قتل کی خبر صبح کے اخباروں میں شائع ہو چکی ہو گی۔ ایک ساتھ بہت سے وسوسوں نے میرے دماغ پہ یورش کی۔ میں نے تجمل کے ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑائی اور اُچھل کے

دروازے پہ جا پہنچا۔ وہ مارٹی اور ڈنڈا ہی تھے۔ دونوں حواس باختہ تھے۔ انھیں اندر آنے سے روکنے کے لیے میں خود باہر چلا گیا۔ "راجا ڈارلنگ! علاقے میں پولیس لیفٹ رائٹ کر رہا ہے۔ وہ اپن کے اڈّے کا کئی جنٹلمین پکڑ کے لے گیا ہے۔" ڈنڈا خوف زدہ آواز میں بولا۔

"زورا اور چھیدا کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں ابھی باہر ہے۔" مارٹی نے آنکھ دباتے ہوئے جواب دیا۔ "پر اُو دوسرے اڈّے کا بھی کئی لوگ پکڑا گیا ہے۔ راجا جی۔ ابی جی ایٹلی پاڑے پر چلو۔ زورا اور چھیدا بولتا ہے کہ اس ٹائم استاد کو پاڑے پر ہی ہونا مانگتا۔"

"مگر میں۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "میں ابھی نہیں جا سکتا مارٹی! میرے ہاں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ چھیدا اور زورا سے بولو کہ وہ اڈّے ہی پر رہیں، باہر نہ نکلیں۔ جیسے ہی موقع ملا، میں اُدھر آتا ہوں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے مارٹی!"

"گیسٹ سے کام کا کہہ کے تھوڑا ٹائم کے لیے اُدھر چلو راجا! پکڑے کا آدمی چھڑانے کا انتظام بھی کرنا ہے۔"

"مجبوری ہے مارٹی! وہ ایسے مہمان نہیں ہیں۔"

"کون لوگ آگیا؟" وہ حیرت سے بولا۔

"کچھ پُرانے لوگ آ گئے ہیں۔ میں نے اسی لیے آج تمھیں اندر نہیں بلایا۔" میں نے دروازے کی جانب دیکھ کے کہا۔ "مارٹی! تم اس وقت چلے جاؤ۔ میں زیادہ دیر تمھارے پاس ٹھیر گیا تو اُن میں سے کوئی بھی باہر آ سکتا ہے۔"

"تم آج کیسا بات بولتا ہے راجا ڈارلنگ!" مارٹی نے تجسس سے پوچھا۔ "ایسا کون لوگ ہے؟ ابھی تم سمجھا کرو راجا! وہ سالا تیواڑی لوگ کا اکھا دھندا چوپٹ ہو گیا ہے۔ شک پڑا تو وہ اِدھر آ کے گڑبڑ کر سکتا ہے۔ وہ سالا ہر علاقے میں جا کے ٹٹولے گا کہ کون مائی کا لال نے اُن کا گرینڈ فادر کو فنش کر دیا۔ ابھی تمھارا ہونا اُو ورکپل سری ہے۔ تم شام سے چلا گیا تھا راجا اور بول نائٹ غائب رہا۔ اب تم اُو ورزمیں جائیں گا تو زورا اور چھیدا بھی....."

مارٹی نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ دفعتہً کسی نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ میں کھڑے کھڑے ڈگمگا گیا۔ ڈنڈا اچھل پڑا، مارٹی کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ تجمل باہر آ گیا تھا۔ "کیا بات ہے لاڈلے؟" وہ اُونچی آواز سے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے جھینپ کے کہا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ ماسٹر مارٹی اور ڈنڈا ہیں۔"

"کیا چکر ہے؟" وہ ترشی سے بولا۔

"کوئی چکر نہیں ہے۔" میں نے ناگواری سے جواب دیا۔

اُس نے مارٹی کی گردن دبوچ لی۔ "کیا ڈراما ہے ماسٹر؟"

مارٹی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "راجا استاد!" اُس کی گھٹی ہوئی آواز نکلی۔ اُس کا سارا جسم پھڑکنے لگا تھا۔

"راجا استاد!" تجمل نے برگشتگی سے دُہرایا اور مجھ سے پوچھا۔ "لاڈلے! یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ اڈّے کے لوگ ہیں۔"

"کون سے اڈّے کے؟ تیرا ان سے کیا ناتا ہے؟ یہ تجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟" تجمل کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اُس نے ہماری کچھ باتیں ضرور سن لی ہیں۔

"اڈّے پر۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے، تم اندر چل کے بیٹھو، اس بیچ میں دخل نہ دو۔"

"لاڈلے!" وہ یکایک گرج کے بولا۔ "زبان سنبھال کے بات کر۔"

"کوئی بات نہیں ہے تم تو خواہ مخواہ..." میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "یہ میرے ساتھی ہیں۔ انھوں نے میرا ساتھ دیا ہے۔ تمھیں کچھ معلوم نہیں ہے تو تم کیوں..."

"میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" وہ بلند آواز سے بولا۔

"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ معمولی بات ہے۔ میں ابھی تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم اندر جاؤ۔"

"کدھر ہے تیرا یارا؟" تجمل نے مارٹی کے گلے پر گرفت سخت کرتے ہوئے پوچھا۔ مارٹی چیخنے چلانے لگا۔ "راجا جی! راجا استاد! ابھی اپن کیا بولے۔"

ڈنڈا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ "اسے چھوڑ دو تجمل بھائی!" میں نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی پوری کوشش کی۔ "اسے چھوڑ دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"قصور کس کا ہے یہ تو میں تجھے بعد میں بتاؤں گا جب تیری انگلیاں پھونک دوں گا۔" وہ طیش میں بولا۔ "میں نے سنا تھا تو مجھے یقین نہیں آیا تھا، بتا یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "تم نے کیا سُنا تھا؟"

"میں اگر کچھ اور سُنتا تو تیرے پاس کبھی نہ آتا مگر میں... میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"تمھیں پوری بات معلوم نہیں ہے۔"

"وہی تو میں تجھ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ تمھیں ہر بات بتا دوں گا۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "انھیں جانے دو، انھیں کیوں روکتے ہو۔"

"تجھے ان کے سامنے منہ کھولتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے؟"

"کچھ نہیں واطا! اپن کا راجا بہت اچھا ہے۔ راجا ایک فرشتہ ہے واطا!" مارٹی تڑپتے ہوئے بولا۔ "تم اس کے بارے میں بُری بات مت سوچو۔"

تجھل نے غضب ناک انداز میں مارٹی کے منہ پر پنجہ مارا۔ وہ بلبلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ تجھل کا مقصد کیا ہے۔ وہ مارٹی اور ٹنڈے کو اس لیے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ انھی کی موجودگی میں اُسے اصل بات کا پتہ چل سکتا تھا۔ اُسے شبہ تھا کہ ان کے جانے کے بعد میں اُسے ٹالنے کی کوشش کروں گا۔ تجھل کی تشویش ظاہر کرتی تھی کہ اُس نے میرے بارے میں پہلے سے بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ مارٹی اور ٹنڈے سے بات چیت کے دوران میں اُس کا اچانک آجانا اور یوں مشتعل ہو جانا کسی سبب ہی سے ممکن تھا۔ میرے خلاف کسی نے اُس کے کان ضرور بھرے تھے۔ اگر اُس نے دروازے کی آڑ میں میری اور مارٹی کی باتیں سُن لی تھیں تو وہ ایسی نہیں تھیں کہ تجھل انھیں درگزر کر دیتا۔ میں اُسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میرے نام سے ایک اٹھا شہر میں موجود ہے۔ مارٹی اور ٹنڈا اس وقت نہ آتے تو شاید بات اتنی نہ بڑھتی مگر انھیں بھی اسی وقت آنا رہ گیا تھا۔ اب اُسے کھل کے سب کچھ بتائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ "میرا پاڑے میں جانا ضروری ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"کس کا پاڑا؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"ہم لوگوں کا۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "یہ لوگ مجھے بلانے آئے ہیں۔ پاڑے کے کئی آدمی گرفتار ہو گئے ہیں علاقے میں پولیس گشت کر رہی ہے۔ میری وہاں موجودگی ضروری ہے۔ علاقے میں کشیدگی کا اندیشہ ہے۔"

"تو ایک پاڑا بھی چلاتا ہے؟" اُس نے وحشت سے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کی ضرورت تھی۔"

"مگر کس لیے؟" وہ بے قراری سے بولا۔

"یہ میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے لُو اسی سے کہا۔ "تم یہاں ٹھیرو۔ میں کچھ دیر بعد واپس آجاؤں گا۔ جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں! وہاں تمھارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں ٹھیک نہیں ہے؟" اُس کی آواز ڈھلک گئی۔

"بس تم وہاں مت جاؤ، اچھا نہیں لگتا۔"

"بھلا کیوں لاڈلے!" اُس کا ماتھا سکڑ گیا۔ "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تُو نے اتنی چھوٹی عمر میں کتنی ترقی کی ہے۔ میں یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے وہاں نہیں جاؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا؟" مجھے ایسا لگا جیسے اُس نے چاقو سے میرے کان چیر دیے ہوں۔ پھر میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ اُس نے جامو اور کانتے کو آواز دے کے باہر بلا لیا۔ جامو اور کانتے کے پیچھے پیچھے جولین اور چمپا بھی گھر سے باہر نکل آئی تھیں۔

جولین کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تجھل نے اُن سے کیا کہا۔ میں ایک طرف چل پڑا۔ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم بس کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔۔۔ ہم سب ڈنڈا پکڑ کے کھڑے ہو گئے۔ بس تیز رفتاری سے سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ تجھل آگے چلا گیا تھا۔ جامو اور کانتے میرے پاس ہی تھے مگر میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہو رہی تھی کہ جیسے میرے کانوں میں گھسا بیٹھا تھا۔ وہ چپکے چپکے مجھے بتا رہا تھا کہ میری وجہ سے کتنا پریشان تھا۔ کلکتے میں اڈّے کا بھی وہ حال نہیں رہا۔ فخرو نے غداری کی اور موجدار کے اڈّے کا مالک بن بیٹھا۔ تجھل چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اُس نے شولی کو نہیں چھیڑا بلکہ کسی نے شولی کے منہ لگنے کی کوشش بھی کی تو تجھل نے اُس کی ہمت نہیں بڑھائی۔ میرے جانے کے بعد اڈّے کے کاموں سے تجھل کی دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی۔ "اُستاد کی وہ بات ہی نہیں رہی لاڈلے!" کانتے کہہ رہا تھا۔ "اُستاد بہت چڑچڑا اور سرکھنا ہو گیا ہے۔ کبھی ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتا ہے اور کبھی بہت بڑی بات بھی ہو جائے تو خاموش رہتا ہے۔ اُس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات پر خفا ہو گا، کس بات پر خوش۔ کئی سو کے بچے شولی سے مل گئے۔ بولتے ہیں اُستاد تجھل بوڑھا ہو گیا ہے۔ قسم سے لاڈلے! یہ سن کے خون کھول جاتا ہے۔ اُستاد کے خیال سے ہاتھ نہیں اُٹھتا ورنہ۔۔۔" کانتے کا منہ لال ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں اپنا زیادہ ٹیم اُستاد کے ساتھ ہی بتاتا ہوں۔ اپنا دھندا بھی سالا آدھا رہ گیا ہے۔ ہر جتن کر کے دیکھ لیا۔ اُستاد واپس نہیں آیا۔ جب اُس کا جی بہت گھبراتا تھا تو فیض آباد میں زرّیں بی بی کے پاس چلا جاتا تھا۔ ادھر اڈّے کی آمدنی بھی گھٹ گئی ہے۔"

کانتے میرے کان ڈس رہا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ میں بھاگتی ہوئی بس سے چھلانگ لگا دوں۔ سب کی پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔ تجھل کو بھی قرار آجائے گا کہ میں مر گیا ہوں۔ کبھی کبھی زندہ آدمی مرے ہوئے آدمی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی موت بھی دوسروں کے سکھ کا باعث ہوتی ہے۔ میری زندگی خود مجھے بھی کون سا سکھ پہنچاتی تھی۔ کانتے اور جامو نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ میں نے کچھ سُنا، کچھ نہیں سُنا۔ ادھر تجھل کو بھنک پڑ گئی۔ اُس نے بھری بس میں انھیں لتاڑ دیا۔ پھر وہ دونوں نہیں بولے۔

بس چلتی رہی۔ مسافر کن انکھیوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ شاید ہمارے چہرے ان سب کے چہروں سے مختلف تھے۔ وہی کٹے پھٹے، تنے ہوئے، کھنچے ہوئے چہرے۔ اُلجھا ہوا لباس اور گٹھے ہوئے جسم۔ ٹنڈا اور مارٹی بھی پیچھے دبکے کھڑے تھے۔ کوئی مسافر راستے میں اُترا تو ٹنڈا اُچھلتا ہوا تجھل کے پاس پہنچا اور گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دادا۔۔۔ دادا! اُدور کا سیٹ خالی پڑا ہے۔"

تجھل بپھر گیا جیسے ٹنڈے نے اُسے چٹکی بھر لی ہو۔ اُسے ٹنڈے کی بات اتنی بُری لگی کہ اُس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُمڈ پڑا۔ نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اُچک اُچک کے اُسے دیکھنے لگے۔ تجھل کی آواز کے سوا بس میں کوئی آواز نہیں تھی۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ جامو نے جب آگے بڑھ کے زور سے تجھل کا کندھا پکڑا تب کہیں اُس کی زبان بند ہوئی۔ نشستیں اور پُر ہوتی رہیں، پھر کسی نے تجھل کو بیٹھ جانے کی پیش کش نہیں کی۔ نہ ہی ہم میں سے کوئی کسی خالی سیٹ پر بیٹھا۔

ابھی پاڑا آنے میں کچھ دیر تھی کہ ایک خوش پوش مسافر بس میں داخل ہوا اور میرے قریب کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اخبار کھولا تو غیر اختیاری طور پر میری نظر سرخیوں میں بھٹکنے لگی اور اخبار کی شہ سرخی پر جم کے رہ گئی۔ شمبھو لال اور اُس کے داماد کے قتل کی خبر سب سے نمایاں تھی۔ اخبار نے لکھا تھا کہ راج کرشنا کی موت کے بعد یہ بمبئی کا دوسرا سنگین حادثہ ہے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ پتہ نہیں اخبار نے سیٹھ شمبھو کی خبر چھاپتے وقت کرشنا جی کی موت کا ذکر کیوں ضروری سمجھا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا یا اخبار والے کو بھی شبہ تھا کہ شمبھو گروپ ہی راج کرشنا کی ہلاکت کا سبب ہے۔ اخبار والوں سے زیادہ باخبر کون ہو گا۔ یقیناً خبر پڑھنے کے لیے میں نشست پر جھک گیا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ رہا کہ یہ بدتہذیبی ہے۔ میں اس طرح دوسروں کی چیزیں نہیں دیکھتا۔ میرا جی چاہا کہ میں اُس شخص سے اخبار چھین لوں۔ میرے دماغ میں بھن بھناہٹ سی ہونے لگی اور کچھ دیر کے لیے میں تجھل کی آمد سے بے خبر ہو گیا مگر مجھے مزید خبر پڑھنے کی فرصت نہیں ملی۔ ہماری منزل آچکی تھی۔ مارٹی نے دبلے دبلے لہجے میں صدا لگائی۔ ہم پاڑے سے کچھ دُور مین روڈ پر اُتر گئے۔ مارٹی کی اطلاع درست تھی۔ علاقے میں پولیس والوں کی تعداد عام دنوں سے زیادہ تھی۔ اس کی یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ پولیس کو شمبھو گروپ کے مشتعل لوگوں سے کسی گڑبڑ کا اندیشہ تھا۔ پولیس شمبھو گروپ کے اثر و رسوخ اور طاقت سے خوب واقف تھی اور آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ کسی مخالف گروہ ہی نے سیٹھ شمبھو لال کو ختم کیا ہے اور اس مخالف گروہ کے سراغ کے لیے شمبھو گروپ کے لوگ مختلف علاقوں کی گلی گلی چھان ماریں گے۔ وہ پولیس پر انحصار نہیں کریں گے اور خود فیصلہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

علاقے میں زندگی معمول پر تھی۔ اب بہت سے لوگ مجھے جان گئے تھے چنانچہ میں جس طرف سے گزرا اور مجھ پر جس کی نظر پڑی، اُس نے مجھے سلام کیا۔ کسی نے راستہ روک کے مجھ سے پاڑے کے کسی آدمی کی شکایت کی تو کسی نے آواز دے کے میری خاطر کرنی چاہی۔ پاڑے کے بہت سے آدمی علاقے میں بکھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے اور میرے ساتھ تین اجنبیوں کو دیکھا تو متجسس نگاہوں سے میرے اطراف چلنے لگے۔ میں نے انھیں دُور رہنے کا اشارہ کر دیا پھر بھی اُن کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ میری رفتار تیز تھی۔ میرا بس چلتا تو میں بس پاڑے کے قریب ہی رُکواتا۔ اگر ہم ٹیکسی میں آتے تو بہتر تھا۔ راستے میں ملنے والے لوگوں سے نجات مل جاتی۔ میں نظریں نیچی کیے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ کم سے کم لوگوں سے سامنا ہو مگر لوگ خود مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیتے تھے۔ کانتے نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ تجھل خاموشی سے میرے برابر چل رہا تھا۔ جامو ہمارے پیچھے تھا۔ ٹنڈا اور مارٹی نہ جانے کون سی گلیوں سے نکلتے ہوئے ہم سے پہلے پاڑے پہنچ گئے تھے۔ زورا، چھیدا اور پاڑے کے بہت سے لوگ عمارت سے باہر گلی میں ہمارے منتظر تھے۔ جیسے ہی ہم گلی میں داخل ہوئے، اُن سب نے ہمارے لیے راستہ چھوڑ دیا اور جھجکتے ہوئے ہمیں سلام کیا۔ میں نے نگاہوں نگاہوں میں انھیں پُرسکون رہنے کی تلقین کی اور پاڑے کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ چھنگا کے جانے کے بعد عمارت پر رنگ و روغن کر دیا گیا تھا اور اس کی شکل نکل آئی تھی۔ سب حیرت زدہ اور سہمے ہوئے تھے۔ ہم اندر جا کے بیٹھک کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ پھر میں نے ہی زبان کھولی۔ "یہی پاڑا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ تجھل نے اپنا بھاری چہرہ ہلایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے منہ پر ورم چڑھ گیا ہو۔ "اور یہ زورا ہے، یہ چھیدا ہے، یہ کاسو ہے۔۔۔" میں نے اُسے وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کے نام بتلانے شروع کیے۔ تجھل بُت بنا بیٹھا رہا۔

"تم نے اپن کے نام تو بول دیے راجا جی! پر دادا کون ہے؟" زورا نے اٹک اٹک کے پوچھا۔

"اپن کو بھی تو دادا کے بارے میں کچھ بولو۔"

"یہ اُستاد تجھل ہیں۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"اُستاد تجھل!" اُن سب نے حیرت اور تذبذب سے دہرایا۔

"یہ میرے۔۔۔ میرے سب کچھ ہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "اور یہ اُستاد جامو ہیں اور یہ کانتے ہے۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ "آپ لوگ بمبئی کب آئے؟" کسی نے پوچھا۔

"آج سویرے۔" میرے بجائے جامو نے جواب دیا۔

"تم لوگوں کے بارے میں راجا جی کبھی کچھ بولا نہیں۔ اپن کو خبر ہوتی تو سب اسٹیشن چلتے۔" زورا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کے بولا۔

"ہمارا آنا اچانک ہوا۔" جامو نے نرمی سے کہا۔

"سب بھلا تو ہے؟" کاسو نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں سب خیر ہے۔" جامو نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اپن کے لیے کوئی کام ہو تو بولو۔ تم راجا جی کا مہمان ہو تو اکھا پاڑے کا مہمان ہو، اکھا علاقے کا مہمان ہو، اکھا بستی کا مہمان ہو۔ راجا جی کے لیے اپن کا جان حاضر ہے۔" چھیدا جوشیلے لہجے میں بولا۔

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔" جامو نے کسی قدر تندی سے کہا۔ "ہم اپنے راجا بہادر کو دیکھنے آئے ہیں۔"

"راجا جی کا کیا بولو! اُستاد چھنگا کو اس نے ایسا ناچ کرایا کہ اپن دیکھتا

رہ گیا۔ اپن نے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا۔ لو دودہ سالا بالم خان بھی بہت تڑی مارتا تھا اپن کا راجا کے دو چار ہاتھوں میں کلٹی ہو گیا۔ راجا تو راجا ہے جاموکستاد! جب سے اپن پاڑے میں بیٹھلا ہے، ملاتے کا سبھی لوگ مین کا مرلی بجاتا ہے اور آجو باجو کوئی نہیں جو راجا کی آنکھ سے آنکھ لڑا سکے۔ راجا تو... " چھیدا روانی میں بکے جا رہا تھا۔

"بس۔" میں نے ترشی سے کہا "بس "

" ابھی اپن نے کچھ بھی نہیں بولا راجا... "

"بولتے رہو" یک بارگی تجمل کی گونجتی ہوئی آواز ابھری۔ ٹما اچھل کے زورا کی کرسی کے پیچھے چلا گیا۔ چھیدا پلکیں جھپکانے لگا۔ "بولتے رہو" تجمل نے دوبارہ تیز آواز میں کہا۔

"دادا!۔ دادا!" چھیدا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "اپن کو نئیں مالوم کہ تمھارے حکم کا کیا مطلب ہے۔ اپن نے جو بولا ہے سچ بولا ہے۔ ماں قسم ادھر بمبئی میں اڑی کرتے ہوئے بال پر چاندی بننے لگا پر اپن نے راجا جیسا کوئی استاد نئیں دیکھا۔ اپن سو بار بولا کہ راجا آگے بڑھو، تم تو آکھا سٹی کا راجا بنیں گا۔ پر راجا اپنے پاڑے سے باہر نہیں نکلا۔ اس سالا بالم کا برا ٹیم آ گیا تھا تبھی راجا کا آدمی چھیڑ دیا۔ دادا! راجا وہ پہلا پاڑا ماسٹر ہے جس نے پاٹے کا ایک پیسہ کو ہاتھ نئیں لگایا۔ ایک بات ہو تو بولوں — باتوں کا ڈھیر ہے "

چھیدا باتیں کر رہا تھا تو سبھی کی نگاہیں تجمل کی جانب مرکوز تھیں مگر تجمل کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ آنکھیں میچے چھیدا کی باتیں سنتا رہا۔ چھیدا خاموش ہوا تو تجمل نے اپنی غنودہ آنکھیں کھولیں، اُن میں سرخی دوڑ رہی تھی۔ اُس نے چھیدے سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ اسی اثنا میں پاڑے کے کئی آدمی تھیلوں اور ٹوکروں سے لدے پھندے اندر داخل ہوئے۔ درمیان کے چبوترے پر پہلے جہاں کبھی جھنگا بیٹھتا تھا اور اب میں بیٹھنے لگا تھا اور میری عدم موجودی میں زورا یا چھیدا بیٹھتے تھے۔ اُسی چبوترے پر دیکھتے دیکھتے تمام چیزیں بکھیر دی گئیں۔ ٹما چبوترے پر پھدکتا پھر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پاڑے کے لوگ کھانے پینے کی ہر دکان سے کوئی نہ کوئی چیز اُٹھا لائے ہیں۔ چبوترے پر بیٹھنے کی جگہ بھی مشکل سے رہی تھی۔ زورا نے تجمل کو چبوترے پر چلنے کے لیے کہا۔ اُس نے انکار نہیں کیا۔ یہ سامان پوری ایک بلٹن کے لیے کافی تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی چھیدا کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی۔ میں اور تجمل بس اُن کا ساتھ دینے کے لیے ٹونگتے رہے۔ جامو اور کانتے نے خوب سیر ہو کے کھایا۔ اُن کے چہروں پر بشاشت نمایاں تھی۔

میرا دماغ خالی خالی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے یا غلط؟ تجمل کی غیر متوقع آمد پر اور کیا ہونا چاہیے تھا۔ یہ دوپہر کا کھانا تو نہیں تھا مگر اس کے بعد کھانے کی گنجائش نہیں رہ جاتی

تھی۔ عمارت میں باقاعدہ سکونتی کمرے موجود تھے۔ اُن میں پاڑے کے بعض آدمی مستقل قیام کرتے تھے۔ کھانے کے بعد سفر کی تھکن دور کرنے کے لیے تجمل سے کمرے میں چلنے کو کہا گیا مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ البتہ جامو اور کانتے اُس کی اجازت سے مارٹی اور ٹنڈے کے ساتھ باہر چلے گئے۔ پاڑے کے باقی لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ صرف زورا اور چھیدا رہ گئے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی چلے جائیں تاکہ میں تجمل سے کوئی بات کر سکوں اور اُسے بتا سکوں کہ جو کچھ اُس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، یہ محض اس کے وقت سے پہلے یا بعد میں آنے کا اتفاق ہے۔ میں نے ابھی زورا اور چھیدا کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ نہیں کیا تھا کہ پاڑے کا نوجوان لڑکا نتھے بوکھلایا ہوا اندر آیا۔ اُس نے تجمل کو دیکھا تو ٹھٹک کے زورا کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ زورا اُس کے پاس پہنچا۔ نتھے نے اُس کے کان میں کوئی اہم بات کہی۔ زورا کا چہرہ اچانک تمتمانے لگا۔ نتھے کا انداز بتا رہا تھا کہ بات کی نوعیت معمولی نہیں ہے۔ زورا فوراً چھیدا کے پاس گیا اور چھیدا میرے پاس آیا۔ تجمل کے سامنے یہ کانا پھوسی مجھے معیوب لگی لیکن نہ جانے وہ کیا بات تھی جس سے زورا اور چھیدا مضطرب ہو گئے تھے۔

میں نے چھیدا کی سرگوشی بظاہر پورے تحمل سے سنی تھی مگر اب مجھ سے ایک پہلو نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ زورا اور چھیدا فوراً باہر جانا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں روک لیا اور نتھے کو ہدایت کی کہ وہ پاڑے کے تمام آدمیوں سے فرداً فرداً کہہ دے کہ کسی غیر ضروری جھگڑے سے پرہیز کیا جائے۔ نتھے چلا گیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ "کیا نقشہ ہے لاڈلے؟" تجمل کی تیکھی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"کوئی خاص بات نئیں ہے دادا" چھیدا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیا ہے لاڈلے! تو ہی بتا "

"پرسوں یہاں ایک سیٹھ شمبھو ناس اور اُس کے داماد گردھاری کا قتل ہو گیا ہے " میں نے سرسری انداز میں کہا "شمبھو سیٹھ بہت مال دار تھا۔ بمبئی میں ہر جگہ اُس کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ شمبھو کا کام تیواڑی دادا کرتا تھا۔ تیواڑی دادا نے دھمکی بھیجی ہے کہ سیٹھ شمبھو کے خون کے بدلے کے لیے تیار رہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دھمکی اُس نے دوسرے اڈّوں کو بھی بھیجی ہو۔ سنا ہے کہ تیواڑی کا اچھا خاصا بڑا اڈّا ہے اور وہاں کسی بات میں کوئی مار نہیں ہے۔ تیواڑی دادا شاید یہ جاننا چاہتا ہے کہ تنکا کس کی داڑھی میں نکلتا ہے "

"اور سیٹھ شمبھو کو اپنے راستے سے ہٹایا کس نے ہے؟" تجمل نے ہم تینوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"ہم نے " میں نے سکون سے کہا۔

"راجا!" زورا اور چھیدا نے ایک ساتھ احتجاج کیا۔

"ہاں تنکا تو تم سب کی داڑھیوں میں نظر آ رہا ہے "

"راجا نے نئیں دلوا! شمبھو کو اپن نے ختم کیا ہے "

"پر راجا کے بولنے پر۔" تجمل آہستگی سے بولا۔

"ہاں! میری ہدایت پر " زورا اور چھیدا کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے
...ں کے کہا "میں نے ہی ان سے کہا تھا "

"مگر دادا! کام بہت صاف ہوا ہے گھبرانے کی بات نہیں ہے۔
...پولیس کا باپ بھی اپن تک نئیں پہنچ سکتا "

"مگر تیواڑی پہنچ چکا ہے " تجمل نے زہر خند سے کہا۔

چھیدا اور زورا جز بز ہونے لگے۔ اُن کے پاس اس کا کوئی جواب
...ں تھا، جواب صرف میرے پاس تھا۔ تیواڑی کی دھمکی خاص طور پر اس
...تے کے استاد کو دی گئی تھی۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ تیواڑی اپنے
...ھ کے قتل کے متعلق کوئی رائے قائم کر چکا ہے تو اسے یہ بھی معلوم ہو
...میں ہی وہ شخص ہوں جو کرشنا جی کے ساتھ رہتا تھا اور جس نے ایک
...زین میں دوسری بار کلب میں اُن کی جان بچائی تھی۔ چونکہ میں نے
...ڑی سے اُلجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اس لیے اُس نے بھی مجھ پر
...دینا مناسب نہیں سمجھا ہو گا مگر اب.... اب کوئی خفیف سا شبہ ہی
...کے قدم روک رہا ہو گا۔ وہ کسی وقت بھی اس طرف آ سکتے تھے۔ جب
...کا شبہ یقین میں بدل جائے گا یا علاقے پر پولیس کا دباؤ کم پڑ جائے گا۔
...رہ کوئی اور صورت اختیار کر سکتے ہیں " تم پہلے جا کے سیٹھ نو بھائی
...لو کہ وہ علاقے کے گرفتار شدہ آدمیوں کو اپنی ضمانت پر رہا کرانے کا انتظام
...ے" میں نے چھیدا کو ہدایت دی "اور زورا تم تھانے جا کے اپنے آدمیوں
...کو خبر کرو۔ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو پہنچاؤ "

زورا اور چھیدا کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس وقت یہاں سے
...ہو جائیں۔ تجمل کے سامنے اُن سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جاتی تو خواہ مخواہ
...ن پیدا ہوتی۔ مجھے زورا اور چھیدا پر اعتماد تھا اور یہ اندیشہ نہیں تھا کہ
...ماری کے بعد پولیس کی مار انھیں کمزور کر دے گی اسی لیے پاڑے کے
...ت سے آدمیوں میں سے میں نے انھیں منتخب کیا تھا لیکن اُن کے
...ول پر زیادہ زور نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ یہ تاکید مجھے تجمل ہی نے کی تھی۔
...ب میں اور تجمل تنہا رہ گئے تو میں نے اُس سے بات کرنے میں خود
...ل کرنی چاہی مگر لفظ میرے حلق میں پھنس کے رہ گئے۔ وہ لگاتار میرا
...رنک رہا تھا۔ مجھ سے کوئی بات نہیں ہو سکی۔ مجبوراً میں نے اُسے
...کرنے کا مشورہ دیا۔ تجمل کا چہرہ کھنچ گیا اور وہ انگلیاں مروڑنے لگا "لاڈلے
...یہ سب کیا ہے؟ " وہ اُبلتی ہوئی آواز میں بولا۔

"جو تم دیکھ رہے ہو" میری زبان بہکنے لگی۔

"مگر میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں " وہ ہیجانی لہجے میں بولا "لاڈلے!
...ا جان! میں یہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا "

"میں خود بھی نہیں چاہتا تھا " میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"پھر یہ کیوں ہے؟" اُس کی آواز پھٹنے لگی "تیرے پاس تو بڑی

دولت تھی۔ تو نے آزاد پنچھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ تو ہر امتحان میں اوّل نمبر آتا رہا مگر تجھے کیا ہو گیا لاڈلے! تجھے کیا ہو گیا شہزادے! اگر یہی بات تھی تو کلکتے کا اڈّا کیا کم تھا۔ تو مجھ سے کہتا تو میں وہاں سے ہٹ جاتا "

مجھے معلوم تھا کہ تم یہی باتیں کرو گے تمھیں یہی باتیں کرنی بھی چاہئیں لیکن تمھیں نہیں معلوم کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ ممکن ہے تم مجھ سے اتفاق نہ کرو مگر مجھے اس کی فکر نہیں ہے کیونکہ میں نے وہی کیا ہے جو میرے دل اور دماغ نے کہا تھا۔ میں تمھارے پاس سے چلا آیا تھا اور اس لیے چلا آیا تھا کہ مجھے چمپا بائی سے اپنے گھر والوں کا پتہ پوچھنا تھا۔ ویسے تم اور جامو بھی کچھ تاخیر سے سہی، چمپا بائی کو ڈھونڈ کے اُن کا پتہ چلا سکتے تھے لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ نمی اور میرے گھر والوں کی نشان دہی کسی اور کو ہو۔ مجھے اندیشہ تھا کہ چمپا بائی ملے گی تو نہ جانے کیا کیا باتیں کھلیں گی۔ جامو اور کبن خان اور دوسرے لوگ اُس سے نہ جانے کس کس طرح اور کیا کیا اگلواتے۔ نمی کے پیروں میں گھنگرو دیکھنے سے پہلے گھر والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا اور نہ میں اُن سے دوبارہ کوئی رابطہ پیدا کرنا چاہتا تھا "

میری آواز بھرا گئی۔ تجمل کی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ اُس نے میرا ہاتھ زور سے دبا رکھا تھا "مختصر یہ کہ میں چمپا بائی کو ڈھونڈتا ہوا آگرے پہنچ گیا۔ چمپا بائی نے بتایا کہ اُس نے نمی کو بمبئی سے حاصل کیا تھا میں اُسے جبراً اپنے ساتھ بمبئی لے آیا اور... " میں نے ٹرین میں کرشنا جی کے ملنے، بمبئی میں ابا جان کی تلاش میں ناکامی، چمپا کی واپسی کی ساری روداد تفصیل سے اُسے سنا دی۔

"پھر تو واپس کیوں نہیں آ گیا؟" وہ بلے چینی سے بولا ...ے "

"پھر میں نے سوچا کہ اب کہاں جاؤں ... لگتی ہے "

کو پریشان کروں گا۔ ابھی تو وہ نہیں ملی تھی کہ ابا جان بھی ... اُس کا کیا میرا جی کسی جگہ نہیں لگتا تھا۔ میں اسی شہر میں پڑا رہا۔ ایک دن اتفاقاً جوہو کے ساحل پر کرشنا جی نے مجھے پہچان لیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور مجھے مسلسل نادم کرتے رہے۔ انھوں نے میرے کپڑے بنوائے، مجھے بڑے لوگوں کے کلب میں لے گئے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے، بالکل اپنا بھائی، اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن ہر بار کرشنا جی کے خیال نے قدم روک لیے۔ میں نے انھیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ انھوں نے پوچھنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی تو انھوں نے یہ ذکر ہی چھوڑ دیا۔ ابھی مجھے وہاں رہتے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ کرشنا جی کچھ پریشان پریشان نظر آنے لگے۔ میں ایک دن اُن سے کہے بغیر گھر سے نکل گیا اور بائی کلا کے علاقے میں پہنچ گیا " میں نے مستانہ کا سارا واقعہ، چھاپے، گرفتاریاں، لڑکی کی واپسی، اخبارات کے تذکرے، کرشنا جی کی شہرت اور شہر میں اُن کے چرچوں کا حال اُسے سنایا "اس واقعے کے بعد کرشنا جی مجھے اور عزیز رکھنے

لگے۔ پھر ایک مرتبہ اُن پر کلب میں حملہ ہوا۔ اتفاق سے میری نظر پڑ گئی ورنہ ملنے والوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اُن کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی تھی۔ میں نے کئی بار انھیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا مگر انھیں اپنا کام اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ ہر وقت فائلوں میں گھرے رہتے تھے۔ کلب کے حملے کے بعد ہم گھر لوٹے تو چمپا بائی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ میں نے اُس پر بہت زور دیا کہ وہ واپس چلی جائے۔ چمپا بائی تو تیار ہو گئی تھی مگر کرشنا جی نے اُسے روک لیا۔ چمپا نے اپنی روش بدل لی تھی۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کرشنا جی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ جب کرشنا جی ہی اُسے گھر رکھنے پر آمادہ تھے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ویسے بھی کسی نہ کسی دن مجھے وہاں سے جانا ہی تھا۔ بس میں تمھیں کیا بتاؤں کہ کیا کیا ہوتا رہا۔ میں روز نکلنے کی تدبیر کرتا تھا اور روز ارادہ بدل دیتا تھا۔ میں ہر وقت یہی سوچتا تھا کہ اب کس طرف جاؤں۔ پھر ایک دن کرشنا جی میرے لیے جولین کو لے آئے۔ میں انھیں کیسے بتا سکتا تھا کہ مجھے پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میں انھیں سچی بات بتا دیتا تو وہ سوالات کرتے کرتے جیل تک پہنچ جاتے مگر میں کرشنا جی کو غلط سمجھا تھا۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ جولین نے مجھے پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ہے۔ اُس کا باپ بیمار تھا۔ میں روز اُسے گھر چھوڑنے جانے لگا۔ گلی کے لڑکے ہم پر آوازے کسنے لگے چنانچہ ایک روز مجھے اُن سے بات کرنے کے لیے رُکنا پڑا۔۔۔۔"

بھل سنتا رہا۔ چھیدا خاموش ... میرے اور قریب کھسک آیا تھا۔ میں نے اس سے کچھ چھپانے ... سُرخی دوڑ رہی تھی۔ اگر ... بھل نے درمیان میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، نہ بھل ... رہے نے اُس کی طرف دیکھا۔ میں تو جیسے اپنے آپ سے باتیں ... میں پڑے ... ہوتے ... تھا۔ بس مجھے اُس کی گہری سانسیں سنائی دیتی رہیں۔ "میں نے کرشنا جی کو بتا دیا تھا کہ پولیس افسر جسونت اپنے ایک ساتھی سے اُن کے متعلق کیا باتیں کر رہا تھا۔ وہ بولے تم نے یہ سب کیسے سن لیا؟ میں نے انھیں یقین دلانے کے لیے بتا دیا کہ میں انگریزی سمجھتا ہوں۔ اس پر وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے لے کے کمرے میں ناچنے لگے اور وہ بات بھول گئے جو میں نے اُن سے کہی تھی۔ میں نے دوبارہ اُن کی توجہ جسونت کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنا کام جلد سے جلد نمٹا کے یہاں سے اپنے گھر مدراس چلے جائیں گے مگر دوسرے ہی دن وہ سڑک پر تڑپتے ہوئے پائے گئے۔ اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں آئے۔"

"میں نے اپنے کانوں سے سُنا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو کرشنا جی کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ کرشنا جی ایک فرض شناس اور دیانت دار پولیس افسر ہیں۔ انھیں بچانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ میں نے بہت دعا کی: اے خدا! اُن کے بجائے میری جان لے لے۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ جن لوگوں نے کرشنا جی کو مارا ہے، اُن ... میں ضرور سمجھوں گا۔ میں نے کرشنا جی کا پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم دیکھا ... اُن کی آواز۔۔۔ مرتے وقت اُن کی آواز میں نے سُنی تھی۔" میرا سینہ پھٹنے لگا۔ میں بلک بلک کے رونے لگا۔ بھل نے مجھے گلے لگا لیا۔ مجھ ... اور رونا آ گیا۔

"لاڈلے! لاڈلے! اے لاڈلے!" وہ مجھے تسلی دے رہا تھا مگر خود اُس کی آواز بھرّانے لگی تھی۔

"کرشنا جی چلے گئے۔" میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔

"لاڈلے! لاڈلے جانی!" اُس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اپنے دامن سے میرا چہرہ خشک کرنے لگا۔ "لاڈلے! جانا سبھی کو ہے۔ بڑا سکندر بھی چلا گیا، رستم پہلوان بھی مر گیا، اُس کا بیٹا سہراب بھی خاک ہو گیا۔ بڑا بڑا بادشاہ مر گیا۔ بڑا بڑا پھنّے باز خاں مر گیا۔ تُو بھی ایک دن مر جائے گا، میں تجھ سے پہلے چلا جاؤں گا۔ کچھ آنسو اور لوگوں کے لیے بھی روک رکھ۔ آدمی کو تمام آنسو ایک ہی ٹائم برباد نہیں کرنے چاہییں۔ ان کی بار بار ضرورت پڑتی ہے۔"

"مگر کرشنا جی بہت اچھے آدمی تھے بھل بھائی!"

"پیر پیمبر اُٹھ گئے لاڈلے! یہ تو دنیا ہے پیارے جانی!"

"وہ بہت اچھے تھے تم نے انھیں نہیں دیکھا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں نے تیری آنکھوں میں اُسے دیکھ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے لاڈلے! وہ بہت اچھا آدمی ہو گا، تیری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔"

"میری آنکھیں دھوکا کھا گئیں۔ میں نے انھیں نہیں پہچانا۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "میں اُن سے اپنے آپ کو چھپاتا رہا۔ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ چمپا نے وعدہ خلافی کی تھی اور انھیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ چپکے چپکے ابا جان کو تلاش کرتے رہے۔ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ چلتے وقت انھوں نے مجھے بتایا۔۔۔۔ انھوں نے مجھے لاڈلے کے نام سے پکارا تھا، کہا تھا۔ لاڈلے! مجھے افسوس ہے۔۔۔۔"

"آگے بات کر لاڈلے!" بھل اضطراری لہجے میں بولا۔

"آگے پھر کیا تھا۔ جسے جانا تھا، وہ چلا گیا۔ سارا گھر اُجڑ گیا۔ اُن کی ایک ماں تھی۔ اُس نے ارتھی سے سر ٹکایا تو پھر اُٹھایا نہیں۔ دونوں کو ایک ساتھ جلا دیا گیا۔ شروع شروع میں بڑا چرچا رہا۔ اخبار بھی لکھتے رہے، جلسے ہوتے رہے، مظاہرے ہوتے مگر اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ایس پی شکلا کرشنا جی کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ روز گھر آتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ کرشنا جی اپنی تمام جائداد میرے نام کر گئے ہیں۔ وہ مجھے مدراس لے گیا۔ ابا جان اُدھر خزانے کی تلاش میں نہ جانے کہاں مارے مارے پھر رہے ہیں اور بیٹے پر دولت کی بارش ہو رہی ہے۔ کرشنا جی کی تمام جائداد بیچ کے ساڑھے آٹھ لاکھ روپے میرے بینک میں جمع کر دیے گئے۔"

"لاڈلے!" بھل نے حیرت سے کہا۔

"میں نے یہ دن ضائع نہیں کیے بھل بھائی!" میں نے رُندھی ... ئی آواز میں کہا۔ "میں نے دولت بنائی ہے۔ میں لکھ پتی آدمی ہوں۔ ... ہر زمین کی حویلی اور جاگیروں کا بھی میں ہی مالک ہوں۔ تم بھی اپنا تمام ... یہ میرے نام کر دو۔"

"لاڈلے! تُو نے ایسی باتیں کہاں سے سیکھ لیں۔ کلیجا چھلنی کیے ... جا رہا ہے، بس کر۔ میں نے تو تجھے نہیں سکھائی تھیں یہ باتیں۔ تُو تو مجھ سے ... اچھا تو باز نکلا، تیرا چاقو تو نظر بھی نہیں آتا۔"

"تم جو چاہے کہہ لو۔ میں نے تم سے تقریباً ہر بات کہہ دی ہے۔ ... یقین کرو میں نے کرشنا جی کی ارتھی پر عہد کیا تھا کہ میں اُن کے گنہ گاروں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وصیت کا تو مجھے بعد میں پتہ چلا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ مجھ سے صفائی مت کر۔"

"میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ شہر میں میرا ایسا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ شمبھو بہت اثر و رسوخ کا آدمی تھا اور مجھے بہت سے لوگوں نے کرشنا جی کے ساتھ رہتے ہوئے اور اُن کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے خاصا وقت گزارا تاکہ انھیں کرشنا جی سے میرا تعلق بھولنے کا وقت مل جائے۔ پھر مجھے انھیں تلاش بھی کرنا تھا کہ وہ کون ہیں جو شمبھو کے آلۂ کار تھے۔ میں کس سے پوچھتا۔ بتاؤ، میں کس سے پوچھتا کہ کرشنا جی کا قاتل کون ہے۔ اس کے لیے مجھے کسی باڑے میں آنے کی ضرورت تھی، آدمیوں کی ضرورت تھی۔ سو مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ میں نے شمبھو کو مار دیا ہے بھل بھائی! تیواڑی ابھی باقی رہ گیا ہے۔ جب تک میں اُس کا خون نہیں دیکھ لوں گا، کرشنا جی کی روح مجھ سے شکایت کرتی رہے گی۔ میں نے شمبھو کو پہلے اس لیے مارا کہ وہی بنیاد تھا۔ میں نے سوچا، پہلے اُن کی بنیاد اکھاڑ دوں۔ سمجھے تم؟ مجھے ان کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تو دُنیا ہی سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"لاڈلے!" اُس نے میری گردن اپنے بازو میں جکڑ لی۔ "میرے لاڈلے! تو مجھے بھی تو بلا سکتا تھا۔ تُو اکیلا کیوں رہا؟ کیا میں مر گیا تھا؟ کیا ہم سب مر گئے تھے؟"

"مگر تمھارے ساتھ بھی وہی مسئلہ رہتا۔ پہلے تو یہ بات طے کرنی تھی کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اور یہ پہچان کسی اڈّے کے بغیر ممکن نہیں تھی اور تم تو یہاں موجود ہی تھے۔"

"میں ۔۔!" وہ چیخ کر بولا۔

"ہاں تم ۔۔! یہ سب کچھ تمھی نے تو مجھے دیا تھا۔"

"گالی دے رہا ہے لاڈلے!"

"تم مجھ سے ایسی اُمید رکھتے ہو۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"نہیں لاڈلے! نہیں، میرا دماغ جل جائے اگر میں ایسا سوچوں پر لاڈلے! میں نے تجھے اور بہت سی باتیں بھی تو بتائی تھیں۔ میں نے کہا تھا، چاقو ہر جگہ نہیں چلتا اور دوسرے کی کمینگی ہمیشہ سامنے رکھنا۔"

"میں کوئی بات نہیں بھولا، مجھے سب یاد ہے۔ تم نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ کبھی کبھی چاقو سے اپنی انگلی بھی کاٹ لینی چاہیے اور تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ چاقو اُن لوگوں کو نہیں اُٹھانا چاہیے جو زمین کے اُوپری حصّے سے محبت کرتے ہوں۔"

"ہاں! میں نے کہا تھا۔" وہ کرب سے بولا۔ "پر لاڈلے! تُو مجھے ایک اشارہ کر دیتا، تجھے میرا خیال کیوں نہیں آیا۔ اگر چمپا جامو کو خط نہ لکھتی تو میں تیری صورت دیکھنے ہی کی آرزو میں مر جاتا۔"

"چمپا نے جامو کو خط لکھا تھا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ تیری طرف سے نااُمید ہو گئی تھی۔ تُو روز روز گھر سے غائب رہنے لگا تھا اور کچھ بتاتا بھی نہیں تھا اور وہ دونوں لونڈے تیرے پاس گھر آیا کرتے تھے۔ وہ کبھی خط نہ لکھتی مگر جب مجبور ہو گئی تو اُسے جامو کو لکھنا پڑا۔"

"چمپا نے تمھیں بھی تنگ کیا۔ وہ ایسی ہی ہے، پہلے ممّی کو کسے تھے پر بٹھایا۔ پھر میرے پیچھے پڑ گئی اور کرشنا جی کو سب کچھ بتا دیا اور اب تمھیں۔۔۔۔۔"

"غصّہ مت کر۔ جو معافی مانگ لے اُس کے لیے دل بڑا کر لینا چاہیے۔ وہ عورت کیا کر سکتی تھی۔ اُس نے تیرے بھلے ہی کے لیے جامو کو لکھا تھا۔ چمپا کو معاف کر دے لاڈلے! یہ سارا گورکھ دھندا ہے۔ تُو کس کس کا گریبان پکڑے گا اور کہاں کہاں چاقو نچائے گا۔ ہو سکے تو اس دُنیا کو آگ لگا دے۔"

"وہ سامنے رہتی ہے تو مجھے ممّی یاد آنے لگتی ہے۔"

"اتنی بڑی معافی کوئی نہیں مانگتا۔ ذرا یہ تو سوچ لے کہ اُس کا کیا قصور تھا۔ جانے دے لاڈلے! میری خاطر، ممّی کی خاطر اور اُس کی خاطر جس کے لیے تُو نے اپنا یہ حال کر رکھا ہے۔ جانے دے۔ کوئی اور بات کر۔ یہ بتا کہ تُو نے تیواڑی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"ابھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"اب تُو بے فکر ہو جا، میں آ گیا ہوں، تیرا عہد پورا ہونا چاہیے، وہ ضرور پورا ہو گا چاہے مجھے باقی عمر جیل ہی میں گزارنی پڑے۔"

"تو پھر بات ہی کیا ہوئی، یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"تُو تو بڑا شیر ہے، شیرِ ببر۔ مگر تجھے کیا ضرورت پڑی ہے، میں جو موجود ہوں۔ تُو کہے تو میں ابھی اُس کا سر کاٹ کے لے آؤں۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"دیکھ لاڈلے! شمبھو کو مارنے کے بعد تُو نے تیواڑی کو ویسے بھی آدھا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لونڈا گیری پہ اُتر آیا ہے۔ ذرا صبر کر لے پھر سب کچھ تیرے سامنے آ جائے گا۔ ویسے جو تُو چاہے، وہی ہو سکتا ہے۔"

"میں کرشناجی کے قاتل کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔"
"ٹھیک ہے لاڈلے! ٹھیک ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔
"اب کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ مجھے جانا ہے۔"
اُس نے شاید میری بات نہیں سُنی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک کھلی آنکھوں سے جیسے سو گیا۔ پھر ایک دم چوکے[1] سے اُٹھ بیٹھا اور میری گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے پاڑے میں گھومتا رہا۔ اُس نے پاڑے کا وہ حصّہ بھی دیکھا جہاں زور ہوتا تھا۔ اُس وقت بھی وہاں چند آدمی زور آزمائی میں مصروف تھے۔ بتّھل وہاں چند ہی لمحے ٹھیرا اور پاڑے سے باہر آ کے گلی کے نکڑ تک چلا آیا۔ حسبِ معمول نکڑ پر پاڑے کے تین چار آدمی موجود تھے۔ اُدھر سے جامو اور کانتے واپس آ رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں دُور سے دیکھ لیا اور لپکتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ کانتے نے آنکھیں مسلنی شروع کر دی تھیں۔ جامو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ منّا کانتے کی ٹانگوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ مارتی جامو اور کانتے پیچھے کھڑے تھے۔ بتّھل نے مارتی کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ مارتی نظریں جھکائے جھکتا ہوا اُس کے رُو بہ رُو پہنچا تو بتّھل نے نرم آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ "مارتا! میرے لیے حقّے کا انتظام کر۔"
"دادا!" مارتی نے سنسنی سے اُسے پکارا اور اُس کی پنڈلیاں پکڑ لیں۔ بتّھل نے مارتی کے بال پکڑ کے سر جھنجھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کے منّا بھی اُچھلتا ہوا بتّھل کی ایک ٹانگ سے لپٹ کے رونے لگا۔ بتّھل نے اُس کی گردن میں پنجہ ڈال کے اُسے اُٹھایا اور زمین پر چھوڑ دیا۔ منّا قلابازیاں کھاتا، اُچھلتا کُودتا ہوا مارتی کے ساتھ چوک کی طرف بھاگنے لگا۔

✿ شام کو بتّھل درمیان میں گاؤ تکیے کے سہارے چوکے پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں جامو اور کانتے تھے۔ پاڑے کے پُرانے لوگ بھی چوکے پر اُس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بتّھل کے آگے ہاروں اور پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چوکے کے نیچے بھی پاڑے کے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ علاقے سے اچھی خبریں نہیں آ ئی تھیں۔ سہ پہر کو بتّھل میرے ساتھ بالم خان سے حاصل کیا ہوا اڈّا بھی دیکھ آیا تھا۔ علاقے میں پولیس موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ تیواڑی کے کئی آدمیوں نے علاقے میں گڑبڑ کرنے اور خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش کی مگر پولیس موجود تھی اس لیے بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ میں نے اپنے آدمیوں کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ جہاں تک ہو سکے، برداشت کریں۔ پاڑے کے گرفتار لوگوں کی ضمانت کل تک کے لیے ملتوی ہو گئی تھی۔ بتّھل کو دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس پاڑے میں اور اس کے آدمیوں کے درمیان عرصے سے رہ رہا ہو۔ رات ہوئی تو اُس نے مجھے حکم دیا کہ میں کانتے کو اپنے ساتھ لے کے گھر چلا جاؤں۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلے مگر وہ وہیں ٹک گیا۔ میں آج رات وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ دن بھر تیواڑی کے آدمیوں کی جلو سبلے جا دھمکیاں کانوں میں پڑتی رہی تھیں۔ بتّھل نے سختی کے ساتھ مجھے گھر واپس جانے کا حکم دے دیا۔ پاڑے کے لوگ بھی میری طرف سے کچھ بے نیاز سے ہو گئے تھے اور بتّھل کے گرد مجمع لگائے بیٹھے تھے۔ مجبوراً مجھے کانتے کو لے کے گھر آنا پڑا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بتّھل زیادہ مشتعل نہ ہو جائے۔ وہ یہاں بمبئی میں اجنبی ہے۔ میں نے تیواڑی کی بابت اُسے ہر بات بتا دی تھی۔ پھر بھی بتّھل سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کیا کر بیٹھے۔ پاڑے کے لوگ بھی اُسے برانگیختہ کر سکتے تھے۔ میں وہاں سے چلا تو آیا لیکن میرا دل وہیں اٹکا رہا۔
انھوں نے ہماری آہٹ ہی سُن کے دروازہ کھول دیا۔ جولین نے اپنے سینے پر فوراً صلیب کا نشان بنایا۔ چمپا کے ہونٹ بُدبُدانے لگے۔ دونوں بہت بے چین تھیں۔ "وہ کہاں ہیں؟" جولین نے سراسیمگی سے پوچھا۔
"وہ کہیں اور ٹھیر گئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔
"سب خیریت تو ہے۔"
"ہاں مگر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"
"بس کیا بتاؤں۔" وہ بے تابی سے بولی۔
"تمھارے لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"
"کیسے نہیں ہے۔" وہ ترشی سے بولی۔
کانتے میرے ساتھ تھا، چمپا بھی موجود تھی۔ میں نے اُس سے زیادہ ضد بحث نہیں کی۔ جولین کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی وہ اتنی دبلی اور کمزور ہو گئی تھی جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ میں کانتے کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ہمارا کھانا بھی وہیں آ گیا۔ کانتے میرے برابر کے بستر پر لیٹ گیا اور فیض آباد سے میرے جانے کے بعد کا تمام حال سنانے لگا۔
"زرّیں کیسی ہے؟" میں نے چُپکے سے پوچھا۔
"بی بی تو تاج بی بی ہے لاڈلے! میں نے ایسی اچھی لڑکی نہیں دیکھی۔ اُستاد کے ساتھ میں اُسی کی حویلی میں ٹھیرتا تھا۔ کیا مجال جو آنکھ اُٹھا کے دیکھ لے۔ ہمیشہ نظریں نیچی رہتی ہیں اور دوپٹا سر پر۔ مجھے بھائی کہتی ہے کانتے بھائی۔ جب وہ مجھے بھائی کہتی ہے لاڈلے تو میرا جی چاہتا ہے اپنی چھاتی میں چاقو مار لوں۔ اُس پر ساری دُنیا کی دولت لٹا دینے کو جی چاہتا ہے۔ پر میں اپنی جان ہی اُس پر نچھاور کر سکتا ہوں۔ جب سے تو نکلا ہے بی بی نے کبھی تیرا نام نہیں لیا۔ کبھی اُستاد سے تیرا نہیں پوچھا۔ وہ اُستاد کے آنے سے اتنی خوش ہوتی ہے کہ بس بتایا نہیں جا سکتا۔ اُستاد نے جب بھی تیرا ذکر اُس کے سامنے کیا، وہ اُٹھ کے چلی گئی۔ نوکرانی بتاتی تھی کہ وہ چُپکے چُپکے روتی رہتی ہے۔ لاڈلے! کیا تجھے بھی وہ یاد آتی ہے؟"

[1] چوکی نما پختہ چبوترے کو یہاں چوکے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

"آتی ہے۔" میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔
"آتی ہوگی ضرور آتی ہوگی۔" وہ مچل کے بولا۔ "وہ یاد آنے کی چیز ہے۔ پر لاڈلے تُو نے اُسے ایک خط ہی لکھ دیا ہوتا۔"
"کانتے! ایسی باتیں مت کر۔" میں نے بیزاری سے کہا۔
"کیوں لاڈلے! کیا تیری اُس سے لڑائی ہو گئی تھی؟"
"نہیں۔"
"تو پھر کیا بات ہے؟"
"پتہ نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "کچھ اور بات کر۔ آ پاڑے واپس چلتے ہیں ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی ہے۔"
"اُستاد نے حکم دیا ہے کہ رات گھر ہی گزاری جائے۔"
مجھ سے ایک پل بھی نہیں کاٹا جا رہا تھا۔ کانتے باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ اُس پر طویل سفر کی تھکن سوار تھی۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر تک میں یوں ہی بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر باہر آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے اندر جھانک کے دیکھا تو جولین ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں خاموش بیٹھی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں اُس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کرسی پر گردن ڈھلکی ہوئی تھی۔ میں دیر تک وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی زرد ساڑی کا پلو کرسی کے بازو پر گرا ہوا تھا۔ روشنی میں اُس کی ٹھوڑی اور ہونٹ چمک رہے تھے۔ میں دبے قدموں سے اُس کے پاس پہنچا۔ اُس کی طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی۔ چار ہی دن پہلے اس گھر میں موت ہوئی تھی اور مجھے اُس کے باپ کے جنازے میں شریک ہونے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ میری آہٹ سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا گئی۔ "کیسی طبیعت ہے تمھاری؟" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں پوچھا۔
"ٹھیک ہوں۔" وہ جلدی سے انگریزی میں بولی اور اپنی ساڑی کا پلو درست کرنے لگی۔ "تم سوئے نہیں؟"
"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔
"کیا سر میں درد ہو رہا ہے؟ دبا دوں؟"
"نہیں۔ درد نہیں ہے۔"
"بیٹھ جاؤ۔"
میں اُس کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تم کیوں نہیں سوئیں؟"
"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"
"تو میں دبا دوں؟" میرے منہ سے نکل گیا۔
"تم!" اُس کی آواز کانپ گئی۔ "نہیں، نہیں۔"
"کیوں؟"
"بس نہیں۔" وہ کسمساتی ہوئی بولی۔
میں نے تکرار نہیں کی۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "تم کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ نا۔ صبح میرے ساتھ چلنا۔"
"ہاں۔" وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولی۔
"اور تم کسی بات کی فکر مت کرو۔"
"ہُوں۔" اُس نے ساڑی کا پلو دانتوں میں دبا لیا۔
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔ مجھے احساس ہوا کہ لوگ مجھ سے بھی اسی طرح کہتے ہوں گے۔ کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے مگر ایک آدمی دوسرے سے اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتا ہے۔ وہ اگر اتنا بھی نہ کہے تو کیا کہے میں جولین کے باپ کو مرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے فوراً بات بدل دی۔ جولین کے لیے اُس کے باپ کا ذکر تکلیف دہ ہوگا۔ میں نے کہا۔ "تم کہتی تھیں کہ تم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسکول چھوڑ دو اور باقاعدہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لو۔ اب تمھیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے تمھارا دل بھی بہل جائے گا اور تم بہت عالم فاضل بھی ہو جاؤ گی۔"
"کیا تمھاری یہی خواہش ہے؟" اُس نے جھن جھناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"
"اور تم۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "تم نے مجھ سے یہ کیوں چھپایا تھا کہ تم پڑھے لکھے ہو۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا۔ اب سوچتی ہوں تو...."
میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ صبح بتّھل کی تمام باتیں اُس نے سُن لی ہوں گی۔ "میں کرشناجی کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔"
"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"اب تو سب کچھ بھول گیا ہوں۔"
"اب بھی چھپاؤ گے؟"
"ہاں اب چھپانے کے لیے کیا رہ گیا ہے"۔
"بتاؤ نا۔ اچھا ابھی نہیں، ٹھیرو۔ میں تمھارے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں۔" وہ کرسی سے اُٹھ گئی۔ میں اُسے روکتا رہا مگر وہ رُکی نہیں۔ اُس نے منٹوں میں چائے بنا لی اور آ کے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ اُسے خوش دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کسی کو خوش دیکھ کے مجھے رشک آتا تھا کہ آدمی کتنی جلدی خوش ہو جاتے ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اُسے سب کچھ بتا دوں گا اور کرا کو رُسوا کر دوں گا تاکہ وہ ملے تو اُس کے سامنے میرا سر نہ اُٹھ سکے کہ میں نِلقا، میں نِٹھّر دلا، میں چھچھورا ساری دنیا سے فریاد کرتا رہتا تھا، سب سے اُس کی شکایت کرتا پھرتا تھا۔ جولین کی ضد پر اپنی تعلیم کے سوا میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ ظاہر ہے، چمپا کا پیٹ بہت ہلکا تھا۔ رہی سہی کسر بتّھل نے آ کے پوری کر دی۔ اچھا ہوا کہ کرشناجی کا ذکر چل نکلا۔ اُن کا ذکر ہمیشہ نیا معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھے

اُن کی ایسی دلچسپ باتیں بتلانے لگی جن کا خود میں نے بھی مشاہدہ نہیں کیا تھا۔اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جولین کی نظر کتنی گہری ہے اور کیسی کیسی جزئیات پر جاتی ہے۔

جب رات بہت ہوگئی تو میں نے اُسے ہدایت کی وہ اپنے کمرے میں جا کے سو جائے۔گلی میں کتے بھونک رہے تھے۔چوکی دار کی آواز ایک دم گونجتی تھی اور دیر تک اُس کی چاپ سنائی دیتی تھی۔جولین بچر مچر کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔میں ڈرائنگ روم کی روشنی گل کر کے واپس اپنے کمرے چلا آیا۔کانتے گہری نیند سو رہا تھا۔اُس کی موجودگی میں مجھے اپنی مالا گلے سے اُتارتے ہوئے اچھا نہیں لگا۔گریبان میں ہاتھ ڈال کے میں اُس کے دانوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔کہیں صبح کے آخری وقت میری آنکھ لگ گئی۔

میرا ارادہ تھا کہ ہم صبح سویرے پاڑے کی طرف روانہ ہو جائیں گے لیکن کانتے کے اُٹھنے نہانے اور لباس تبدیل کرنے میں دیر ہو گئی۔ میں نے اُسے اپنے کپڑے پہننے کو دے دیے تھے۔سفید کُرتے اور پاجامے میں اُس کا رنگ روپ نکل آیا تھا۔

جولین کو دیکھ کے مجھے یاد آیا کہ میں نے رات اُس سے کیا کہا تھا۔وہ بہت ہشاش بشاش تھی۔کہنے لگی، اب طبیعت ٹھیک ہے، ڈاکٹر کے پاس پھر کسی وقت چلیں گے۔مجھے بھی پاڑے پہنچنے کی جلدی تھی۔ابھی ہم دروازے سے نکلے ہی تھے کہ ایک پولیس گاڑی آ کے رُکی۔کانتے نے میرا بازو پکڑ لیا مگر وہ ایس پی شکلا تھا۔شکلا گاڑی سے اُترتے ہی میرے گلے سے لگ گیا۔"کہاں ہو تم؟ —" وہ کبیدہ لہجے میں بولا۔ "میں نے اتنے پھیرے کیے مگر تم آج ملے۔"

"میں تو یہیں تھا شکلا جی!" میں نے بشاشت سے کہا۔

"کہاں تھے ——— چمپا دیدی اور جولین سے پوچھو۔میں کتنی بار آیا ہوں، انھوں نے تمھیں کچھ نہیں بتایا؟"

"بس اتفاق ہے کہ میں آپ کو نہیں مل سکا۔"

"اور تم نے بھی میری طرف آنے کی کوشش نہیں کی۔خیر، یہ بتاؤ، اب تم کیسے ہو۔کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔"آیئے اندر بیٹھیے۔"

"نہیں، میں پھر آؤں گا۔وہی قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ظہیر خاں! تم کسی وقت ملو تو میں تمھیں بڑی دلچسپ باتیں بتاؤں۔" اُس نے کانتے کی طرف دیکھ کے پوچھا۔"یہ کون ہیں؟"

"یہ میرے دوست ہیں کانتے۔"

"کانتے۔" اُس نے کانتے کو نمسکار کیا۔کانتے شرمانے لگا۔

"اندر بیٹھیے نا۔"

"مگر چند منٹ۔اور کوئی تکلف نہیں ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔جیسا آپ حکم کریں گے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ہم ڈرائنگ روم میں آ کے بیٹھ گئے۔شکلا نے منع کیا مگر چمپا چائے لے آئی۔

"تم نے سنا،" شکلا میرے کان میں رازدارانہ انداز سے بولا۔ "سیٹھ شمبھو قتل ہو گیا ہے۔"

"ہاں سنا تو ہے۔"

"بس اب کچھ دنوں میں، میں تمھیں ایک خوش خبری ضرور سناؤں گا۔"

"وہ کیا — ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ دن اور انتظار کرو۔"

"کچھ بتایئے نا۔" میں نے اصرار کیا۔

"مگر اپنے تک رکھنا۔" وہ اِدھر اُدھر نظریں گھما کے بولا۔کانتے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔میں نے وعدہ کیا تو شکلا نے سرگوشی کی۔"کرشنا جی کے قاتلوں کا اب جلد ہی پتہ چل جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"بس کیسے ویسے مت پوچھو۔"

"کون لوگ تھے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

"سامنے آ جائیں گے، سامنے آ جائیں گے ظہیر خاں!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "شمبھو کے مرنے کے بعد صورتِ حال خاصی بدل گئی ہے۔"

"وہ شمبھو ہی تھا نا؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن . . ." وہ فکرمندی سے بولا۔"مگر پولیس کے جو افسران کرشنا جی کی بہت عزت کرتے تھے، وہ اب خاصے مطمئن نظر آتے ہیں۔"

"صرف مطمئن؟" میں نے زہرخند سے کہا

"کسی حد تک شیور۔" وہ جوش میں بولا۔

"تو وہ کون تھے؟ مجھے ذرا اشارہ کر دیجیے۔"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔چند دن اور انتظار کرو۔بڑے بڑے انکشافات کی توقع ہے۔مرکزی حکومت کے دل میں بھی تمھاری طرح کرشنا جی کی موت کی پھانس پھنسی ہوئی ہے۔"

"پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کرشنا جی کی موت اتنی آسانی سے ہضم کر لی گئی تو پولیس کی ملازمت چھوڑ دوں گا لیکن اب شاید مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑے۔میں اپنے طور پر کام کر رہا تھا ظہیر خاں! میں نے مرکزی حکومت کو چوری چھپے بہت سے خط لکھے ہیں۔"

"تو کیا شمبھو کا قتل مرکزی حکومت نے کرا دیا۔"

"نہیں۔بالکل نہیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے ہوا۔میں سمجھتا ہوں شمبھو کے لوگ ہی اُس سے ناراض ہو گئے ہوں گے یا شمبھو کے مخالف گروپ نے ایسا کرایا ہوگا لیکن اس سے وہ رکاوٹ ضرور دور ہو گئی جو اُس کی زندگی میں ہر قدم پر آڑے آتی تھی۔"

"آپ تو تمام راز فاش کیے دے رہے ہیں۔"

"اوہ۔" وہ گھبرا کے بولا۔"مگر یہ صرف ایک قیاس ہے۔"

"ٹھیک ہے شکلا جی! آپ اپنا کام کیے جایئے میں . . . ."
میں نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔"میں آپ کا منتظر رہوں گا۔"

"اب میں آتا رہوں گا بشرطیکہ تم ملے اور ہاں ایک خاص بات۔" وہ جھک کے بولا۔

"دو جگہ سے میرے ریمائنڈر کے جواب آئے ہیں۔"

"کیا — ؟" میں کھڑا ہو گیا۔

"یہ جواب آیا ہے کہ تمھارے ابا جان جیسی شکل و صورت کے ایک آدمی دیکھے گئے تھے لیکن اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ایک خط سورت سے آیا ہے ایک بھوپال سے۔گویا وہ بھوپال اور سورت میں بھی رہے ہیں۔" وہ تاسف سے بولا۔

"اور کیا لکھا تھا؟" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔یہ بھی اس لیے ہوا کہ میں نے ایک دن اُن تمام پتوں پر پھر ریمائنڈر ڈالے جن پر کرشنا جی نے سرکلر بھیجے تھے۔دو جگہ سے جواب آ گیا۔مجھے اُمید ہے کہ جلد ہی تم کوئی اچھی خبر سن لو گے۔"

"آپ نے بھوپال اور سورت بتایا نا؟"

"سورت کے خط میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔صرف اتنا لکھا ہے کہ کبھی ایک صاحب اس شکل و صورت کے سورت کے ایک محلے میں رہتے تھے مگر برسوں گزر گئے، اب وہ وہاں نہیں ہیں۔"

"اور بھوپال میں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"بھوپال کے خط میں ذرا وضاحت ہے۔لکھا ہے کہ یہ صاحب اپنے خاندان کے ساتھ یہاں آئے تھے۔محلے والوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔شاذ و نادر ہی باہر نکلتے تھے۔پھر ایک دن اپنے خاندان سمیت اچانک کہیں چلے گئے۔کسی کو اُن کا پتہ معلوم نہیں ہے کیونکہ وہ کسی کو بتا کے نہیں گئے تھے۔جواب آئے ہوئے تو تین چار روز ہو گئے۔میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آ سکا اور سوچا تھا کہ یہ جواب بتا کے میں تمھیں اور پریشان کروں گا۔اس وقت بات منہ سے نکل گئی۔مجھے معاف کرنا، تمھیں دُکھ ہوا ہوگا۔"

"نہیں شکلا جی! کس کس بات کا دُکھ کیا جائے۔مجھے معلوم ہے کہ وہ مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔وہ یہاں نہیں ہیں مگر کسی نہ کسی شہر میں تو ضرور ہوں گے۔"

"مگر ایسا کیوں ہے؟" وہ اُداسی سے بولا۔

"ایسا یوں ہے کہ اُس خاندان میں ایک میں پیدا ہو گیا تھا۔" جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں شکلا کے سامنے یہ کیا کہہ رہا ہوں۔"شکلا جی! کہیں سے کوئی اور خط آئے تو مجھے ضرور بتایئے گا۔"

ہماری گفتگو یہیں تک محدود تھی۔کسی اور نے اُسے نہیں سنا۔البتہ کانتے بے چین ہو رہا تھا۔شکلا کو ہم سے زیادہ عجلت تھی۔اُس کے جاتے ہی ہم گھر سے نکل گئے۔کانتے مجھ سے پوچھتا رہا کہ ایس پی شکلا مجھ سے کیا باتیں کر رہا تھا۔میں نے اُسے ٹال دیا لیکن میں خود کو نہیں ٹال سکا۔شکلا نے ابا جان کا ذکر کر کے میرے اوسان چھین لیے تھے۔اتفاق سے ہمیں ٹیکسی مل گئی۔علاقے میں آج پولیس کل سے زیادہ تھی۔بڑے چوراہے پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔میں نے ٹیکسی رکوا کے اُترنا چاہا مگر کانتے نے مجھے روک لیا اور سیدھے پاڑے چلنے پر زور دیا۔پاڑے کی گلی کے نکڑ پر بھی پولیس موجود تھی۔عمارت کے باہر بھی معمول سے زیادہ سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔کانتے نے ٹیکسی عمارت کے سامنے ہی رکوائی۔ابھی میں اندر داخل نہیں ہوا تھا کہ معلوم ہوا، رات کسی وقت تیواڑی کے آدمیوں نے علاقے میں گھس کے بلوا کرنے کی کوشش کی تھی۔لڑائی میں تنتو مارا گیا اور رتن زخمی ہو گیا۔صبح سے پولیس کے کئی افسر پاڑے آ چکے تھے۔استاد مجھل نے سب کو منع کر دیا تھا کہ وہ تیواڑی کے آدمیوں کا نام نہ لیں، کہہ دیں کہ حملہ آور پہچانے نہیں گئے۔پولیس میں یہی بیان لکھوا دیا گیا تھا۔رتن اسپتال میں پڑا تھا اور تنتو کی لاش آنے والی تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو مجھل حقہ پی رہا تھا۔زورا اُس کے بائیں بازو بیٹھا ہوا تھا۔منگا اُس کے پیر دبا رہا تھا اور جامو ایک طرف گاؤ تکیے سے لگا سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"لو لاڈلا آ گیا۔" مجھل نے مجھے دیکھتے ہی صدا لگائی۔"جامو ذرا دیکھنا۔ یہ اس کے ساتھ کون نواب کا بچہ حرام زادہ آ رہا ہے۔"

جامو کی نظر جیسے ہی کانتے پر پڑی، وہ اپنی نشست سے اُچھل پڑا۔"یہ تو کچھ کانتے دکھائی پڑتا ہے۔" اُس نے دیدے نچا کے کہا۔

میں تیزی سے چوکے پر چڑھ گیا۔"یہ دروازے میں لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔"کیا ہوا؟"

"سانس سنبھال۔" مجھل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔"آنے میں دیر کر دی شہزادے؟" وہ تیکھی آواز میں بولا۔

"نکلتے نکلتے دیر ہو گئی مگر . . . مگر . . ."

"جو تو نے سنا ہے ٹھیک ہے۔" وہ سکون سے بولا۔"پر تو نے کوئی غلط بات تو نہیں سنی ہے اور نہ یہ کوئی نئی بات ہے۔سپاہی میدان میں مارا گیا۔تیراک پانی ہی میں ڈوبتا ہے۔"

"مگر یہ ہوا کیا؟" میں نے غصے سے کہا۔

"ہوتا کیا۔تنتو کا وقت آ گیا تھا۔"

"اوہ نہیں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "آج یہ ہوا ہے کل کچھ اور ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ہمارے علاقے میں گھس کے ہمارے آدمی کو مار دیا۔ وہ کیسے لوگ ہیں۔"

"اور کیا وہ اپنے علاقے میں لے جا کے مارتے۔" وہ مسکرا کے بولا۔ "راستے کھلے تھے، پولیس اونگھ رہی تھی۔ وہ آ گئے۔ کیا تیرا پاڑا کوئی قلعہ ہے رے؟"

"مگر یہ ناقابلِ برداشت ہے۔" غصے سے میری آواز لرزنے لگی۔

"ہے تو۔ ! تو اطمینان سے تو بیٹھ۔"

"تم... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔ "تندو کی موت کا مجھے بھی دکھ ہے۔"

"پھر؟" میں نے وحشت سے کہا۔

اس نے میرا زانو دبایا اور آنکھیں بند کر کے مجھے تحمل کی تلقین کی۔ میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ تجھل نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے دوبارہ مجھے تھپکی دے کے خاموش کر دیا۔ "وہ آیا نہیں۔" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں زورا سے پوچھا۔

"بس آتا ہی ہوگا دادا!" زورا نے تردد سے جواب دیا۔

"کون؟" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

"چھیدا۔" تجھل نے آہستگی سے کہا۔ "اسے ذرا کام سے بھیجا ہے۔"

میں نے کام کی نوعیت نہیں پوچھی اس لیے کہ مجھے تجھل سے کسی اطمینان بخش جواب کی توقع نہیں تھی۔ "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" موقع دیکھ کے میں نے چپکے سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پہلی بار توجہ دی۔

"یہاں مناسب نہیں ہے۔" لیکن وہاں سے اٹھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے اس کے کان میں بات ڈال دی۔ "صبح ایس پی آنکلا آیا تھا۔"

"اچھا۔" وہ میرے نزدیک کھسک آیا۔ "کیا کہتا تھا؟"

"کہتا تھا کہ اب کرشنا جی کے قاتلوں کو پکڑنے میں کچھ ہی دیر باقی ہے۔ اس نے نام تو نہیں لیا لیکن اس کا اشارہ اسی طرف تھا۔"

"پھر؟" وہ کسمسا کے بولا۔

"اس سے پہلے کہ وہ اس کا انجام طے کرنے کے لیے طویل وقت گزاریں اور ہزار باتیں سامنے آئیں، ہمیں کچھ سوچ لینا چاہیے۔ اس کے اندر جانے کے بعد دونوں باتیں ممکن ہیں۔ وہ واپس بھی آ سکتا ہے اور ہم ایک لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے۔"

"میں تیری بات سمجھ گیا۔" وہ ہاتھ اٹھا کے بولا اور چند لمحے سوچنے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا۔ "کچھ دیر صبر کر۔"

معلوم ہوا کہ تندو کی لاش لینے کے لیے پاڑے کے کئی آدمی اسپتال گئے ہوئے ہیں۔ تندو اسی علاقے میں رہتا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں اس کے ساتھ تھی۔ تندو کی شادی ہو گئی تھی لیکن اس کی بیوی پہلے بچے کی پیدائش پر ہی مر گئی تھی پھر تندو نے شادی نہیں کی۔ وہ بہت جی دار شخص تھا۔ اس کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔

جب چھیدا پاڑے میں داخل ہوا تو تجھل چوکی سے اٹھ گیا اور اس نے چھیدا کو درمیان ہی میں روک لیا۔ چھیدا نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے کچھ بتایا۔ تجھل کا نچلا ہونٹ باہر نکل آیا۔ وہ چھیدا کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے چند قدم خاموشی سے ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اور جامو کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ کالتے بھی ہمارے ساتھ اٹھنے لگا۔ تجھل نے اسے وہیں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور زورا سے آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا۔ ہم چاروں پاڑے سے نکل کے گلی میں آ گئے۔ تجھل کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ چوراہے پر چھیدا نے ایک ٹیکسی روک لی۔ ٹیکسی والا اسے جانتا تھا۔ تجھل، جامو اور میں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ چھیدا ٹیکسی والے کو ہدایت دیتا رہا اور ٹیکسی مختلف راستوں سے گزرتی رہی۔ مجھ سے خاموشی برداشت نہیں ہوئی۔ آخر میں نے جامو سے پوچھ ہی لیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم استاد پیرو کے پاس جا رہے ہیں۔" جامو کے بجائے تجھل نے جواب دیا۔

استاد پیرو کا نام سن کے میرے کانوں میں پٹاخا سا چھوٹا۔ میں حیرت سے تجھل کا منہ تکنے لگا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ پیرو بمبئی کا ایک مشہور استاد تھا۔ تیواڑی کے بعد اگر بمبئی میں کسی کا نمبر آتا تھا تو پیرو کا۔ تجھل سے پیرو کا کیا تعلق ہو سکتا تھا، ممکن ہے وہ اس کا واقف کار ہو۔ ایک ساتھ بے شمار سوال میرے ذہن میں سرسرانے لگے مگر بمبئی میں تجھل کا کوئی شناسا موجود ہوتا تو وہ سب سے پہلے اسے میرے متعلق لکھتا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر تجھل اور پیرو کا کوئی تعلق میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں ٹیکسی والے کی موجودگی میں نہ حیرت کا اظہار کر سکتا تھا، نہ وہاں جانے کا مقصد پوچھ سکتا تھا۔ میں گھٹ کے رہ گیا۔ چھیدا کا انتظار کرنا اور اس کے آنے پر تجھل کا چبوترے سے اٹھ جانا۔ پھر اچانک پیرو کی طرف جانے کا ارادہ کر لینا، یہ سب بڑی انوکھی باتیں تھیں لیکن میں تجھل کی عادت سے واقف تھا۔ وہ اپنے فیصلوں پر رائے زنی پسند نہیں کرتا تھا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ ٹیکسی ماہم کے علاقے میں داخل ہو گئی اور گلیوں سے گزرتی ہوئی گیروے رنگ کی ایک دو منزلہ مضبوط عمارت کے سامنے ٹھہر گئی۔ تیسری منزل آدھی بنی ہوئی تھی۔ گلی چوڑی تھی اور زیادہ گنجان نہیں تھی۔ یہ عمارت گلی کے آخری سرے پر واقع تھی۔ اس طرح اس کے دروازے تین اطراف کھلتے تھے۔ اونچی دیوار عمارت کا احاطہ کرتی تھی۔ چھیدا سب سے پہلے اترا اور اس نے دیوار کے سائے میں اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کچھ کہا۔ وہ پیرو ہی کے اڈے کے آدمی تھے۔ اندر سے جب تک آدمی واپس نہیں آیا، ہم ٹیکسی ہی میں بیٹھے رہے۔ آدمی اکیلا واپس نہیں آیا تھا، اس کے ساتھ گٹھے ہوئے جسم کے تین ادھیڑ عمر آدمی بھی تھے۔ وہ ٹیکسی کی جانب لپکے۔ ہم تینوں ٹیکسی سے اتر آئے۔

ان کی معیت میں ہمیں اندر لے جایا گیا۔ ایک بڑے کمرے کے دروازے پر درمیانے قد، جھکے ہوئے اور متناسب اعضا کا ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی۔ رنگ صاف تھا۔ "پیرو دادا! کلکتے والا استاد تجھل۔" چھیدا کی آواز میں لکنت آ گئی۔

"آؤ، آؤ استاد! اندر آؤ۔" اس نے تجھل کا بازو پکڑتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا۔ "آؤ آؤ راجو! مہاراجو! ادھر بیٹھو۔" وہ ہمیں ایک چوکی پر لے گیا۔ اس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ چوکی پر بیٹھنے سے پہلے اس نے ہمیں گلے لگایا۔ وہ ایک سلجھا ہوا، صاف اور تیز آدمی معلوم ہوتا تھا۔

"کلکتے سے کب آنا ہوا؟"

"کل سویرے۔" تجھل نے سکون سے جواب دیا۔ "پیرو دادا! مجھے تم سے کچھ خاص بات کرنی ہے۔ چھیدا نے میرے بارے میں تمھیں بتایا ہوگا۔"

"باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے یہ بتاؤ استاد کہ پیو گے کیا؟ ولایتی، دیسی، سبزی یا کوئی اور چیز!" اس کے بڑے بڑے دانت چمکنے لگے۔

"کچھ نہیں کھائیں گے پئیں گے بعد میں، اس وقت تمھارے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔ کھانے پینے کے لیے تو بہت وقت پڑا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ تم ادھر بمبئی میں اپن کا مہمان ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "جو اپن کے بس میں ہوگا، اپن اپنے مہمان کے لیے کریں گا۔"

"بات بڑی ہے پیرو دادا!" تجھل نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "لیکن تمھارے سامنے کلکتے کا استاد تجھل بیٹھا ہے۔ یہ فیض آباد کا استاد جامو ہے اور یہ تمھارا راجا ہے جس نے چھنگا سے پاڑا لیا ہے۔"

"یہ راجا ہے۔" وہ تعجب سے بولا۔ "اپن نے اس کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اپن راجا کو دیکھنے کا تڑپ رکھتا تھا۔"

"پیرو دادا! مجھے یقین ہے کہ تم نے ادھر بمبئی میں جو نام بنایا ہے، وہ اپنی بہادری اور سوجھ بوجھ سے بنایا ہے۔"

"استاد! بولو، بولو۔ کام بولو۔"

"دادا! ہم بہت صاف بات کرنے آئے ہیں، بات عجیب ہے لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے تم ٹھنڈے دل سے سوچ لینا۔"

"بولو دادا! بولو۔ اپن وعدہ کرتا ہے کہ اپن سوچ سمجھ کے جواب دے گا۔ اپن کو کام بولو۔ ادھر ادھر کی بات مت کرو۔"

"پیرو دادا! ہم تم سے کچھ دنوں کے لیے تمھارا اڈا چاہتے ہیں۔"

"کیا۔ ؟ تم کیا بولتا ہے استاد تجھل!" وہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ دادا! بیٹھ جاؤ۔ میری بات غور سے سنو، ہم کچھ دنوں کے لیے تمھارا اڈا چاہتے ہیں۔ اس کے بدلے میں تم چاہو تو ہم تمھیں راجا کا پاڑا، کلکتے کا اڈا اور فیض آباد کا اڈا، تینوں کی ایک ساتھ پرچی لکھ کے دے سکتے ہیں۔"

"پر یہ تم کیا بولتا ہے استاد تجھل!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ کمرے کی دیواروں سے لگے ہوئے اس کے تینوں آدمی چوکنے ہو گئے۔ "ایسے کیسے ہوتا ہے استاد تجھل!"

"ایسا ہو سکتا ہے پیرو دادا! تم چاہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔" تجھل آہستگی سے بولا۔ "یہ اڈا تمھارا ہے اور ہم تم سے اسے سدا کے لیے نہیں مانگ رہے ہیں۔ ہم کو اس اڈے کی آمدنی سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ سب تمھاری اور تمھارے آدمیوں کی۔ ہم تو صرف تھوڑے دنوں کے لیے یہ اڈا لینا چاہتے ہیں۔ تم سوچ لو۔"

"سوچنا کیسا استاد!" وہ ترشی سے بولا۔ "کیا تم یہی بولنے آیا ہے؟"

"ہاں!" تجھل نے شائستگی سے کہا۔ "ہم اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔"

"تم کلکتے کا استاد تجھل ہے۔" وہ بلند آواز سے بولا۔ "اپن نہیں سمجھتا کہ استاد ہو کے ایسا بات بولتا ہے۔"

"اگر اسے سودے کے طور پہ دیکھا جائے، تب بھی یہ سودا برا نہیں ہے۔" تجھل کے لہجے میں کسی قدر تندی آ گئی۔ "لیکن ہم سودے بازی کرنے کے لیے نہیں آئے۔ ہم تو تم سے اور ہی بات کہہ رہے ہیں۔ پیرو دادا! ہم یہ اڈا تمھارا حق سمجھتے ہیں۔ یہ تمھارا ہے اور تمھارا رہے گا۔ ہم کو معلوم ہے کہ تم نے اسے کیسے حاصل کیا ہوگا اور تمھیں اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے کتنے جتن کرنے پڑتے ہوں گے۔ ہر استاد کو یہی کرنا پڑتا ہے۔" مجھے حیرت ہوئی، اسی قسم کی باتیں میں نے چھنگا سے کہی تھیں لیکن تجھل کا انداز بالکل مختلف تھا۔

"اپن کا مگج پھر جائے گا۔" وہ سر پکڑتے ہوئے بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بات بڑی ہے اور نئی بھی ہے۔ پر تم اپنا دل اور سر کھول دو تو ایسا کر سکتے ہو۔ ہماری بات کا اعتبار کرو دادا! اڈے پر تمھارے ہی آدمی رہیں گے، بس حکم ہمارا ہوگا۔ ہم اپنے آدمی یہاں نہیں لائیں گے۔ ہماری بات مان لو، ایسا کر کے دیکھو۔"

"تم... تم استاد تجھل ہو۔" وہ قہقہے لگانے لگا۔

اس کے قہقہے رکے تو تجھل نے سنجیدگی سے کہا۔ "پیرو دادا! ہم تم سے یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ اب تم یہ اڈا چلانے کے لائق نہیں ہو، نہ ہم تم سے یہ کہہ رہے ہیں کہ استادوں کی طرح پنجہ آزما کے یہ اڈا چھوڑ دو۔ ویسے اگر تم چاہو تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ استاد جامو، راجا اور مجھ میں سے تم جسے چاہو، اپنے لیے چن سکتے ہو۔"

"ہو۔ ہو۔" وہ پھنکارنے لگا۔ اس نے چوکی پر زور سے گھونسا مارا مگر تجھل کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پیرو چند لمحوں تک تلملاتا رہا۔ اس کے آدمی چوکی کے نزدیک آ گئے تھے۔ اچانک وہ بے حس و حرکت ہو کے ہمیں گھورنے لگا۔

"کوئی استاد دو ہی باتوں سے اڈا چھوڑتا ہے، یا تو وہ مر جائے یا کوئی دوسرا اس سے اڈا چھین لے مگر ایک تیسری بات بھی ہو سکتی ہے

"پیرو دادا!" بجھل نے نرمی سے کہا "وہ یہ کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تم اُس پر عمل کرو۔ یہ کوئی حکم نہیں ہے ہم تم سے منت کر رہے ہیں۔"

اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "اپن کو شک ہے کہ تمھی استاد بجھل ہو، تم کلکتے کا راجا ہو۔ نہیں... نہیں.... ابھی تمھارا بھیجہ فریلا ہو گیا ہے۔"

"اتنی بے عزتی مت کرو پیرو دادا!" بجھل نے آنکھیں چڑھا کے کہا "کوئی اور تمھارے پاس اس طرح نہیں آ سکتا تھا۔"

"پر.... پر تم اڈا کیوں لینا چاہتے ہو؟"

"یہ بعد کی بات ہے پہلے تم اڈا میرے حوالے کرنے کی بات کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس حالت میں تم اسے دوگے، میں اُسی حالت میں اسے واپس کر دوں گا۔ ہمارے تمھارے درمیان صرف بات کی بات ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"استاد بجھل! اڈا اپن نے بازو سے حاصل کیا ہے" اُس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "اور کوئی اسے بازو ہی سے لے سکتا ہے لیکن تم.... تم بڑی مسخری کی بات بولتے ہو۔ اپن کو یہ کیسے پتہ چلے کہ تمھی استاد بجھل ہو۔ اگر تم بجھل ہو تو اپن نے نام ضرور سنا ہے، پر اپن اس طرح کیسے تم سے آگے بات کرے۔"

"میں نہیں چاہتا کہ میں اور تم آمنے سامنے آئیں لیکن تمھاری تسلی کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے کسی آدمی کو اشارہ کرو۔ تم کو ابھی پتہ چل جائے گا۔" بجھل نے ناگواری سے کہا۔

پیرو دادا کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد اُس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ آدمی بار بار چاقو اُچھال رہا تھا اور ہمیں سُرخ سُرخ نظروں سے مسلسل گھور رہا تھا۔ وہ بہت پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی۔ وہ قد کا لمبا اور جسم کا مضبوط تھا۔ بجھل نے اُسے نہیں دیکھا "معاف کرنا استاد بجھل!" بجھل نے چونک کے دیکھا۔

"یہ ماچھی ہے اسے اپنے چاقو پر بڑا مان ہے۔ اس سے چاقو چھین لو۔"

بجھل کی آنکھوں میں خون اُبلنے لگا "پیرو دادا! ماچھی کا مان مت توڑو۔ ابھی اسے بہت کچھ کرنا ہے۔ تم بات کرو۔"

"ماچھی کے بعد میں تم سے مزید بات کروں گا۔"

"استاد بجھل نہیں اُٹھے گا۔ ماچھی کو میں دیکھوں گا" جامو نے پہلی بار زبان کھولی "استاد بجھل کی بے عزتی مت کرو پیرو دادا!"

"تم میں سے کوئی بھی ہو۔ اپن کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اسے میں دیکھتا ہوں" میں نے اُٹھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

جامو نے مجھے دھکا دے کے بٹھا دیا اور پھرتی کے ساتھ چوکی سے اُتر گیا۔ اُس نے نہ جانے کس لمحے اپنا چاقو کھول لیا تھا "استاد بجھل! اجازت ہے؟" وہ چاقو لہراتے ہوئے بولا۔

بجھل نے گردن ہلائی۔ جامو بجلی کی طرح تڑپ کے پلٹ پڑا۔ اُس کے ہاتھ میں بڑی لپک تھی۔ جامو نے انتظار کیا۔ ماچھی اُس پر حملہ کرنے کے لیے فرش پر تھرکنے لگا۔ اُس کے برعکس جامو ایک جگہ جما کھڑا تھا۔ جامو نے دو تین مرتبہ اُسے متزلزل کرنے کے لیے مختلف زاویوں سے اپنے جسم سے جھکیاں دیں۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتا اور اپنا قدم پھر پیچھے ہٹا لیتا۔ اُس کی گردن آگے نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں ماچھی کے چاقو کی نوک پر جمی ہوئی تھیں۔ جھکیوں سے ماچھی کو غصہ آ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جامو صرف چند لمحوں میں فیصلہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ شاید اس بات کے انتظار میں تھا کہ ماچھی حملے میں پہل کرے۔ ماچھی بھی پوری طرح مستعد تھا۔ اُس کا جسم رواں تھا اور اُسے چاقو پکڑنا آتا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ جامو مجھ سے پہلے چلا گیا۔ پیرو نے غور نہیں کیا حالانکہ بجھل نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ فیض آباد کا استاد جامو ہے مگر پیرو کا مطلب بھی کچھ اور تھا۔ جامو اور ماچھی ایک دوسرے کو تولتے رہے۔

ماچھی نے حملہ کرنے میں پہل نہیں کی۔ جامو اپنا چاقو پھینکتا ہوا چیتے کی طرح اچھل کے چشم زدن میں اُس کے سر پہ پہنچا۔ چاقو گرنے کی آواز ماچھی نے بھی سُنی ہو گی۔ اُس نے اس طرف دیکھا ہی تھا کہ دوسرے لمحے اُس کا چاقو والا ہاتھ جامو کے پنجے میں تھا۔ جامو نے اِدھر ماچھی کا ہاتھ پکڑا اور دیکھتے دیکھتے اُسے اپنے کندھے پہ رکھ کے اس کا بھاری جثہ ایک جھٹکے سے فرش پہ پٹخ دیا۔ ماچھی نے پھر بھی چاقو سنبھالے رکھا لیکن جامو نے اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ جامو اُس پر پوری طرح حاوی آ چکا تھا۔ اُس نے اُس کے گلے پہ جوتا رکھ کے ہاتھ مروڑا۔ ماچھی کی انگلیوں سے چاقو دبایا نہیں جا سکا۔ چاقو گرتے ہی جامو نے ماچھی کو چھوڑ دیا اور اپنے بال درست کرتا ہوا چوکی پر آ کے بیٹھ گیا۔ جامو نے کوئی نیا داؤ نہیں آزمایا تھا۔ اُس نے ساری توجہ تیزی اور پھرتی کی طرف دی تھی کیونکہ فیصلہ چند ہی لمحوں میں ہونا چاہیے تھا۔ پیرو نے چوکی پہ کھڑے ہو کے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ جامو دوبارہ اُٹھ کے اُس کے گلے سے لگ گیا "سنا تھا، پر صرف سنا تھا" وہ اُسے زور سے لپٹاتے ہوئے بولا "کہ اُودر دلّی پار بڑا بڑا بانکا پڑا ہے۔ استاد بجھل! معاف کرنا۔ اپن کو معاف کرنا۔"

"تمھاری تسلی ہو گئی پیرو دادا! اب کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات کیا کرے تم نے اپن کا سر جھکا دیا ہے۔"

"نہیں پیرو دادا! یہ اڈا تمھارا ہے۔ اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ تمھارا مال تمھارے پاس رہے۔ ہمیں واپس اپنے اپنے شہر جانا ہے۔ ہم ادھر بمبئی میں نہیں رہنا چاہتے۔"

"اپن کو اب تمھاری ہر بات کا اعتبار ہے" وہ جوش میں بولا۔

"آج سے یہ اڈا تمھارا ہے۔ اور بولو اپن کے پاس کیا ہے۔"

بجھل نے آگے بڑھ کے اُسے بھینچ لیا "پیرو دادا! بس یہی بہت ہے۔ تم یہاں کے بادشاہ ہو۔ تم یہیں رہو گے۔ آؤ اندر آؤ۔ مجھے تم سے

کچھ بات کرنی ہے۔"

"چلو، چلو" وہ بے قابو آواز میں بولا۔ بجھل اُس کے ساتھ اندر کسی کمرے میں جانے لگا۔ پیرو جاتے جاتے پلٹ پڑا اور اپنے آدمیوں پر برسا۔ "بائیں ابھی چوکی خالی پڑا ہے۔ استاد بجھل آیا ہے۔ سالا تم لوگ کھڑا کھڑا کیا دیکھتا ہے" وہ دہاڑتا ہوا بولا "مہمان کے لیے کچھ لاؤ۔ کمرہ بھر دو۔"

بجھل اُسے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ اُن کے جاتے ہی چھیدا جامو کے گال چومنے لگا۔ پیرو کے آدمی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ماچھی بھی فرش سے اُٹھ کے جامو سے لپٹ گیا تھا۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہے تھے لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ بجھل کی بات اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ چوکی پر کھانے پینے کے سامان کا انبار لگا دیا گیا۔ سب نے بجھل اور پیرو کی واپسی کا انتظار کیا۔ وہ دونوں بہت دیر میں باہر نکلے لیکن دونوں ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ پیرو بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ میں اندازے ہی لگا سکتا تھا کہ انھوں نے اندر کیا بات کی ہو گی۔ پیرو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ فلاں فلاں آدمی کو فوراً پاڑے پر بلا لائیں۔

جتنی دیر میں لوگوں نے آنا شروع کیا اتنی دیر میں ہم سب کھانا کھاتے رہے۔ پیرو بجھل کے قریب بیٹھا اُس کی خاطریں کر رہا تھا۔ کمرے میں کسی دعوت کا منظر نظر آتا تھا۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد پیرو بجھل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے بولا "سالا لوگ! ذرا اپن کی بات سنو۔ یہ اپن کا دوست استاد بجھل ہے اور یہ استاد جامو ہے اور یہ راجا ہے۔ اپن آج سے پاڑے کا سارا انتظام بجھل استاد کو دیتا ہے۔ تم سالا کسی کو کوئی ٹوک ہو تو اپن کو ابھی بولو۔"

سب حیرانی سے پیرو کو دیکھنے لگے۔ مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ لوگ کسمسانے اور ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے "آج سے تم لوگ استاد بجھل اور استاد جامو اور استاد راجا کی بات سُنے گا۔ جو یہ بولیں گا کرے گا۔ یہ پاڑا اب پیرو دادا کی جگہ استاد راجا کا پاڑا سمجھے گا۔ اپن کا یہ فیصلہ دُور دُور جا کے بول دو۔ راجا کا پرانا پاڑا 'بالم خاں کا پاڑا' بھی اسی پاڑے میں مل گیا ہے۔ سمجھا" وہ چیخ کر بولا "جس سالا کو پیرو کی مرضی پسند نہیں ہے، وہ علاقے سے کلٹی ہو جائے۔ اپن بھی ادھر ہی رہے گا۔ پر استاد بجھل کے دوست کا مانک۔ اپن کچھ نہیں بولیں گا اور اپن آگے کچھ بولے تو اپن کی بات سننے سے انکاری کر دو، سمجھا" وہ دوبارہ چلایا۔ وہ سب گنگ ہو گئے تھے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہر شخص کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں مگر پیرو کی باتوں میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ پیرو چپ ہوا تو بجھل نے اونچی آواز سے کہا۔ "سب کچھ اسی طرح رہے گا، کسی کام میں فرق نہیں آئے گا لیکن بات ہماری چلے گی۔"

بجھل نے جامو اور چھیدا کو وہیں چھوڑا۔ پھر مجھے اور پیرو دادا کو اپنے ساتھ لے کے چل پڑا۔ باہر کئی ٹیکسیاں تیار کھڑی تھیں۔ ایک ٹیکسی میں ہم تینوں بیٹھے، دوسری اور تیسری میں پیرو دادا کے اڈے کے آدمی بیٹھ گئے۔ جب ہم اپنے پاڑے پہنچے تو ہمارے ساتھ پیرو اور اُس کے ساتھیوں کو دیکھ کے لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پاڑے میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا۔ بجھل نے پیرو کو عزت کے ساتھ چوکی پہ اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ تندو کی لاش آ گئی تھی لیکن ہماری وجہ سے اُسے روک لیا گیا تھا۔ پیرو کا خیال تھا کہ تندو کے جنازے میں تینوں پاڑوں کے لوگ شریک ہوں اور اُسے دھوم دھام سے اٹھایا جائے مگر بجھل نے اُس کی رائے مسترد کر دی۔ تندو کے مُردہ جسم پہ پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ پیرو نے اُس کی ماں کے لیے فوراً تین ہزار روپے نقد اور پچاس روپے ماہانہ وظیفے کا اعلان کیا۔ میں نے اپنا اعلان منہ ہی میں دبائے رکھا۔

تندو کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اُس کی بائیں آنکھ کٹ گئی تھی۔ آخری رسوم کے لیے اُس کی لاش اُٹھائی گئی تو پاڑے کے بہت سے لوگ بری طرح رونے لگے۔ زورا نے بتایا کہ رتن کی حالت اب کسی قدر بہتر ہے اور اُسے ہوش آ گیا ہے، اُسے ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے بیان میں تیواڑی کے آدمیوں کا نام نہ لے۔ مجھے ابھی تک اسپتال جانے کا وقت نہیں ملا تھا۔ کچھ دیر پاڑے میں ٹھہر کے بجھل، پیرو، کالتے اور میں علاقے میں گشت کے لیے نکلے۔ تندو کی موت کی وجہ سے علاقے بھر میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ ہمیں موجود پا کے لوگوں کے چہروں پر اطمینان نمایاں ہوا۔ ہمارے پیچھے پیچھے بہت سے آدمی چل رہے تھے۔ مارتی اور ٹنڈا بھی اُن میں موجود تھے۔ مارتی مجھ سے بات کرنے کے لیے بہت بے تاب تھا۔ پیرو نے یہاں بھی اپنا اعلان دہرایا تھا۔ سب متحیر تھے کہ اُس نے اپنا پاڑا میری نگرانی میں دے دیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ساتھ موجود ہے۔

تندو شام کو سادگی سے دفن کر دیا گیا۔ پاڑے کے چند ہی لوگ جنازے میں شریک ہوئے اُس کے محلے کے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پیرو واپس چلا گیا مگر اُس کے کئی آدمی ہمارے پاڑے میں رہ گئے۔ رات ہوئی تو میں نے بجھل کے کہنے سے پہلے پیش بندی کر دی کہ میں آج رات گھر نہیں جاؤں گا۔ اُس نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ اُس رات وہ خود مجھے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ مارتی اور ٹنڈا بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ بجھل رات بھر آرام کرے گا لیکن ٹیکسی باہر کھڑی رہی اور وہ جولین اور چمپا سے چند باتیں کر کے واپس چلا گیا۔ ٹنڈے کو میرے پاس ہی چھوڑ دیا گیا۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ان حالات میں وہ مجھے گھر میں آرام کرنے کے لیے کہتا تھا۔ میں نے رات گئے گھر سے نکلنے کی ٹھانی مگر گلی میں چند قدم چل کے واپس آ گیا۔

شہر کے دور دراز علاقوں تک پیرو کی بیک وقتی اور اُس کے اڈّے پر بیرے اور بجھل کے قبضے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ تین دن گزر گئے۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں یہ سب کچھ ایک تماشے کی طرح دیکھتا رہا۔ علاقے میں پھر کوئی واردات نہیں ہوئی۔ دوسرے ہی دن تیواڑی کے چند آدمی ٹوٹ کے پیرو کے پاڑے میں شامل ہو گئے یعنی اُس پاڑے میں جو اب تیرے نام سے موسوم تھا۔ اُن کا بہت احتیاط سے خیر مقدم کیا گیا۔ تیسرے دن علاقے سے پولیس بھی ہٹ گئی۔ اب بجھل کا زیادہ وقت پیرو کے اڈّے پر گزرتا تھا۔ کانتے اور جامو کبھی اِدھر کبھی اُدھر دونوں جگہ آتے جاتے رہے۔ میں نے کئی بار اُن سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر انھوں نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ بجھل جب کوئی بات بتانا پسند نہیں کرتا تھا تو پھر کوئی بھی اُس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ پیرو کے اڈّے میں بیٹھا ہوا ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کا پُرانا آدمی ہو اور کلکتے کا اڈّا بمبئی میں منتقل ہو گیا ہو۔ پیرو نے اُس کے لیے یہاں بھی حقّے کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ عموماً اُس کے ساتھ ہی رہتا تھا مگر بجھل کی کسی بات پر زبان نہیں کھولتا تھا۔ بس مسکراتا رہتا تھا اور بجھل کو احکام دیتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ تیسرا دن ہی تھا کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کچھ تنہائی ملی تو میں نے تلخی کے ساتھ بجھل سے پوچھا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"جو تُو چاہتا ہے۔" وہ ہنس کے بولا۔

"لیکن تم یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے ناراضی سے کہا۔

"کیا تیری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے؟" وہ نرمی سے بولا۔

"تم نے قلعہ ضرور بنا لیا ہے مگر۔ ۔ ۔"

"پہلے قلعہ بنا لینا اچھا ہوتا ہے لاڈلے! تُو ہی تو کہتا تھا کہ تیواڑی بہت بڑا استاد ہے۔ آدھی بمبئی اُس کے پاس ہے۔ ہر طرف اُس کے آدمی پھیلے ہوئے ہیں اور اُسے کسی بات میں کوئی لاج نہیں ہے۔ تُو نے اُس کے متعلق بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ بڑے استاد کے لیے انتظام بھی بڑا کرنا پڑتا ہے۔ کام مناسب طریقے سے ہونا چاہیے نا۔ اپنی بھی عزت کی بات ہے لاڈلے! اور پھر مجھے جلدی بھی ہے۔ میرا بھی اس شہر میں دم گھٹ رہا ہے۔"

"میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"ابھی میں تجھے کیا جواب دوں لے!"

"کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"سب کچھ تیرے سامنے ہے۔"

وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ آخر میں نے تنگ آ کے اُس سے بات کرنا ہی بند کر دیا۔ جامو اور پیرو بھی وہاں آ گئے تھے۔ ہوتے ہوتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ بجھل اور جامو پیرو کے علاقے میں صبح و شام گشت کرتے تھے۔ علاقہ بڑا تھا لیکن وہ میلوں پیدل نکل جاتے۔ کبھی پیرو اُن کے ساتھ ہوتا، کبھی وہ تنہا ہوتے۔ سرات گئے بجھل مجھے گھر واپس بھیج دیتا۔ تینوں پاڑوں میں غیر معمولی سرگرمی پائی جاتی تھی۔ عجب عجب کہانیاں مشہور ہو گئی تھیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ کہتا تھا۔ بجھل شاید ہی کسی وقت آرام کرتا ہو۔ میں صبح آتا تو اُس کی آنکھیں سرخ دیکھتا۔ وہ یقیناً رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ اُس سے کہوں، تم اپنی صحت کا خیال رکھو اور پھر تم ایک اجنبی جگہ بیٹھے ہوئے ہو۔ کسی وقت بھی کوئی سرپھرا ناراض ہو سکتا ہے مگر مجھے اُس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تینوں پاڑوں کے آدمی اُس کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ ہر وقت چاقو بازی اور زور آزمائی کی مشقیں جاری رہتی تھیں۔ چاقو میں کانتے کا ہاتھ بہت رواں تھا۔ وہ پیرو کے اڈّے کے زور آوروں سے زور آزمائی کرتا رہتا تھا اور سب کو دنگ کر دیتا تھا۔ بجھل موجود ہوتا تو وہ کانتے کے سامنے تنہا کھڑا ہو جاتا۔ کانتے اُس پر چاقو لے کے جھپٹتا اور مختلف داؤ آزماتا، بجھل خود کو بچاتا رہتا اور آخر کانتے کے ہاتھوں سے چاقو چھین لیتا۔ پیرو کا خاص آدمی ماچھی اب بجھل کے گرد بیٹھا رہتا اور جب بھی موقع ملتا اُس کے پاؤں دبانے لگتا۔ پاڑے کے دوسرے لوگوں کا حال بھی یہی تھا۔

دسویں دن رات کو خلافِ توقع بجھل نے مجھ سے گھر جانے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ جامو اور کانتے دیر سے غائب تھے۔ اڈّے پر سکون چھایا ہوا تھا۔ پیرو کچھ بے چین نظر آ رہا تھا لیکن بجھل کے چہرے پر تشویش کی کوئی علامت نہیں تھی۔ "اب تم کلکتے کا ارادہ کب کرو گے پیرو دادا؟" بجھل کی آواز گونجی۔

"بجھل بھائی! جیسے ہی ٹیم ملا، اپن اُودر بھاگیں گا۔" پیرو مچل کے بولا۔ "پر اپن ابھی تم کو جانے نہیں دیں گا۔"

"مجھے بہت دیر ہو گئی ہے پیرو دادا! تم نے ہماری بات رکھ لی۔ میں سدا اسے یاد رکھوں گا۔" بجھل نے ملائمت سے کہا۔

"شرمندہ مت کرو بجھل بھائی!" پیرو نے بجھل کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "کبھی کسی بات کی ضرورت ہو تو ہم کو لکھنا۔"

"اپن کا جی کرتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کے تمھارے ساتھ چلے۔"

"نہیں پیرو دادا! ابھی تم کو بمبئی میں بہت کام کرنا ہے۔"

میں حیرانی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بجھل کچھ ہی دیر بعد روانہ ہونے والا ہے۔ اُس کی آواز تھکی ہوئی تھی اور آنکھیں بھاری تھیں۔ وہ باتیں پیرو سے کر رہا تھا اور زور زور سے بال میرے نوچ رہا تھا۔ گھنٹوں گزر گئے۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ کچھ مجھے بھی اندازہ ہو چلا تھا۔ میری رگوں میں خون کا دوران تیز ہو گیا تھا۔

"دیر ہو گئی۔" اچانک پیرو نے اضطراب سے کہا۔

بجھل نے منہ بنایا۔ "راستے میں ہوں گے۔"

ابھی اُس نے ایک گہری سانس ہی لی تھی کہ باہر گاڑیوں کا شور اُبھرا۔ پیرو نے بے قراری سے بجھل کو دیکھا۔ بجھل نے گردن ہلائی اور چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں، تیز تیز چاپیں۔ سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ دفعتہً کئی چہرے دروازے پر نمودار ہوئے۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ میں جھٹ اُچھل کے دروازے کی جانب بھاگا۔ کانتے اور جامو خون میں لت پت تھے۔ اُن کے کپڑے لال ہو گئے تھے لیکن وہ دونوں اپنے قدموں سے فرش پر کھڑے تھے۔ کانتے کی پیشانی اور کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ جامو کا سارا بازو سُرخ ہو گیا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان اونچے قد اور کسے ہوئے جسم کا ایک زخمی شخص موجود تھا۔ وہ نہایت بپھرا ہوا اور سخت مشتعل نظر آ رہا تھا۔ میں اُسے نہیں پہچانتا۔ جامو اور کانتے اسے لیے لیے آگے آ گئے۔ اُن تینوں کے پیچھے ایک ہجوم تھا۔ کئی آدمی زخمی تھے۔ زورا بھی تھا، چھیدا بھی تھا، ماسٹی بھی تھا۔ بالم خاں کے پاڑے کے بھی کچھ لوگ تھے۔ ماچھی بھی تھا اور پیرو کے پاڑے کے کئی آدمی بھی تھے۔

"بجھل بھائی! اوپر والے نے لاج رکھ لی۔" جامو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اسے زندہ لے آیا ہوں۔"

"جامو! مجھے یقین تھا کہ تو خالی ہاتھ واپس نہیں آئے گا۔" بجھل نے آگے بڑھ کے اُسے گلے سے لگا لیا۔

میں نے کانتے کو زور سے پکڑ لیا۔ "کانتے! یہ کیا ہے؟" میں نے دہشت سے کہا۔ "تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ہم تیواڑی کو لینے گئے تھے لاڈلے راجا!" اُس نے مسکرا کے میری ٹھوڑی پکڑ لی۔ "سالے کا پاڑہ چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ایک آدمی کو بھی اُس کی گلی سے ملنے نہیں دیا۔ سڑک پر لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ پر ہم اسے لے آئے ہیں۔ بڑا زور کیا حرام کے جنے نے۔" کانتے نے زمین پر تھوک دیا۔ اُس کے تھوک میں خون ملا ہوا تھا۔

بجھل غور سے تیواڑی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ تیواڑی بھی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ بجھل پیرو کا بازو پکڑ کے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ "لاڈلے!" اُس نے بلند آواز میں مجھے پکارا۔ "اسے سنبھال۔" اُس نے تیواڑی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے چاقو نکال لیا۔ میری نظروں میں کرشنا جی کا پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم گھوم گیا۔ میں اُس کی بوٹی بوٹی کر دینے کے لیے آگے بڑھا۔ بجھل نے ہاتھ بلند کر کے مجھے روک لیا۔ "تیواڑی! کوئی آخری خواہش ہو تو بیان کر دے۔" بجھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"ایک ہی آخری خواہش ہے دادا! اپن کو ایک چاقو دے دو۔ اپن ایسے نہیں مرنا چاہتا۔ تم اپن کو چاقو کے بغیر مار دو گے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہو گی۔" تیواڑی نے بھاری لہجے میں کہا۔

"چاقو کی موت تو عزت کی موت ہوتی ہے تیواڑی! میں تجھے لڑتے ہوئے مرنے کی عزت نہیں دینا چاہتا۔ یہاں تیرا آنا ہی تیری موت کے برابر ہے۔ استاد جامو سے کہا گیا تھا کہ وہ تجھے زندہ پکڑ کے لائے۔ تُو تو دیر ہوئی مر چکا ہے۔" بجھل کی آواز بھی جیسے اُس کی آنکھوں کی طرح سُرخ تھی۔

"اپن نے تم سے اپنی آخری خواہش بول دی ہے اور اپن تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگ رہا ہے۔" تیواڑی نے گرج کے کہا۔

جامو نے اُس کی طرف چاقو اُچھال دیا۔ "بجھل بھائی! اسے اپنی حسرت نکال لینے دو۔ اسے چاقو سے مارا نہیں جائے گا۔"

"تیری مرضی جامو!" بجھل نے اپنا چاقو لہراتے ہوئے کہا۔

"نہیں بجھل بھائی! تم نہیں۔" جامو بجھل کے سامنے مزاحم ہو گیا۔ اُدھر کانتے تیواڑی کی طرف چاقو لے کے بڑھنے لگا۔

"تم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تیواڑی کو میں دیکھوں گا۔ تم ہٹ جاؤ۔"

"لاڈلے!" بجھل دہاڑنے لگا۔

"مجھے منع مت کرو بجھل بھائی!" میں نے تلملا کے کہا۔

"تیرا کام چاقو چلانا نہیں ہے۔" بجھل غضب ناک آواز میں بولا۔

"مجھے مت روکو۔" میں ایک جست لگا کے تیواڑی کے سامنے پہنچ گیا۔ کانتے نے پھر آڑے آنے کی کوشش کی، میں نے اُسے دھکا دے دیا۔

اِرد گرد کھڑے ہوئے لوگ پیچھے ہٹ گئے اور کمرے میں ہمارے لیے ایک دائرہ بن گیا۔ چاقو میرے ہاتھ سے نکلا نکلا جا رہا تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑی ہوئی تھی۔ مجھے تیواڑی کے مقابل دیکھ کے بجھل چپ ہو گیا۔ کمرے میں ہر آواز معدوم ہو گئی تھی۔ میں اُس کے حملے کا انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ کوئی داؤ آزمانے کی خواہش رکھتا تھا لیکن اُسی لمحے مجھے بجھل کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے جیل میں مجھے نصیحت کی تھی کہ لڑتے وقت دماغ ٹھنڈا اور جسم گرم رکھو۔ میں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم بہ جبر روک لیے ورنہ میں نے تو اپنا چاقو بھی پھینک دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ جامو کا جو چاقو تیواڑی کے ہاتھ میں تھا، اُسے اُسی سے لہولہان ہونا چاہیے تھا۔ تیواڑی اپنی زندگی کی آخری لڑائی لڑ رہا تھا۔ زخمی ہو جانے کے باوجود اُس کے جسم میں طوفان کی لپک تھی۔ اگر وہ زیادہ زخمی ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی اُس کے خلاف چاقو اُٹھانے پر آمادہ نہ ہوتا مگر معلوم ہوتا تھا کہ جامو نے اُس کے گال اور سینے پر خون کی لکیریں بہت احتیاط سے کھینچی ہیں۔ یہ لکیریں کھینچنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ اُسی وقت کھینچی جاتی ہیں جب رعایت کا کوئی گوشہ ذہن میں موجود ہو ورنہ ہاتھ ذرا سا بہک جائے تو گوشت نکل آتا ہے۔ بجھل کہتا تھا کہ لکیر کھینچو تو ایسی کہ ناخن کا گمان ہو اور خون کی بوندیں

پسینے کی طرح پھوٹیں۔

تیواڑی نے بندر کی طرح آگے پیچھے اُچھلتے کودتے ہوئے سب سے پہلے میرے کولھے کو نشانہ بنانا چاہا۔ مجھے اب مجمع کا کوئی ہوش نہیں تھا اور نہ دنیا کی خبر تھی میرے سامنے تو بس تیواڑی تھا۔ میں اُس کی پھرتی تولتا رہا۔ اس پھرتی میں ایک تحمل بھی تھا حالانکہ یہ تحمل کا موقع نہیں تھا۔ وہ نپے تلے انداز میں وار کر رہا تھا اور میں نپے تلے انداز میں بچ رہا تھا۔ دو ایک بار میں بھی اُسے اپنے چاقو کی زد پر لایا مگر وہ اپنا جسم صاف بچا گیا۔ اگر نگاہ مخالف کے چاقو کی پابند کر دی جائے کہ جدھر چاقو جائے اُدھر نگاہ بھی اُس کے ہمراہ جائے تو مخالف کا وار عموماً ناکام ہو جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جسم بھی نگاہ کا پابند ہو۔

تیواڑی نے دوسرا شدید وار میرے سینے پر کیا۔ وار اتنا غیر متوقع اور بے ساختہ تھا کہ میرے پاس اپنی جگہ سے ہلنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ اگر میں برق رفتاری سے اُس کا بڑھا ہوا چاقو اپنے چاقو پہ نہ روکتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے اُسے روکا، میرے ذہن میں فوراً ایک خیال شعلے کے مانند لپکا۔ میں نے چاقو پر زور برقرار رکھتے ہوئے اپنا جسم کسی قدر پیچھے کر کے ایک جھٹکے سے ہاتھ نیچے گرایا۔ اُس جھٹکے سے میرا چاقو نیچے گر گیا تھا۔ میں نے اُسے دانستہ گرایا تھا۔ تیواڑی سمجھا کہ میں حواس باختہ ہو گیا ہوں مگر اب تیواڑی کی کلائی میرے پنجے کی گرفت میں تھی۔ یہ ایک خطرناک قدم تھا۔ میرے ہاتھ سے چاقو گرنے کی وجہ سے تیواڑی سخت برہم ہو گیا تھا۔ اُس نے میری گرفت سے کلائی چھڑانے کے لیے پے در پے کئی جھٹکے دیے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ یہی کرے گا لیکن میں اپنا جسم ڈھیلا کر کے اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے نیچے جھول گیا تھا۔ کچھ اس طرح کہ میرے جسم کا سارا وزن تیواڑی کے ہاتھ پر آ گیا تھا۔ یہ دباؤ برداشت کرنا اُس کے لیے سخت اذیت ناک ہوگا۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ ظاہر ہے، اُس کے توازن کے ساتھ اُس کی سوچ بھی بگڑ گئی۔ وہ مجھ سے اس داؤ کی توقع نہیں کرتا ہوگا۔ بجھل سچ کہتا تھا کہ بہت سے داؤ موقع پر خود بخود تخلیق ہو جاتے ہیں۔ تیواڑی اب میری گردن اور منہ پر بھی ضربیں لگا سکتا تھا۔ میں اپنے گھٹنوں کے بل فرش پہ تقریباً بیٹھ گیا تھا۔ میں نیچے جھکا تو اُسے بھی جھکنے پہ مجبور ہونا پڑا اور بر بنائے احتیاط اُسے کوئی مناسب ضرب لگانے کے لیے کچھ سوچنا پڑتا۔ اُس نے اچھا کیا۔ میں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ اُس کا جھکاؤ لازماً اُسی ہاتھ کی سمت ہو سکتا تھا جس ہاتھ سے میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ میرے بائیں شانے تک جھک آیا۔ اِن چند لمحوں میں مَیں نے اپنا جسم اور اپنے پیر پوری طرح قابو میں کر لیے تھے۔ جیسے ہی اُس کا جسم میرے شانے سے ٹکرایا۔ میں نے پھرتی سے اپنے جسم کو جنبش دی اور تمام تر طاقت سے شانہ کسی قدر اُوپر کر کے اُس کا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ میرے شانے سے گزرتا ہوا فرش پر چت گر گیا۔

اس جھونک میں چاقو اُس کے ہاتھ میں قائم رہتا تو مجھے اُس کی تمام خطائیں معاف کر دینی چاہییے تھیں۔ میری توقع کے مطابق چاقو اُچھل کے نیچے گرا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی۔ وہ درد سے کراہا۔ میں نے اُسے چھوڑ کے اُس کا چاقو اُٹھا لیا۔ ابھی میرا ہاتھ اُٹھا ہی تھا کہ بجھل چیخنے لگا۔ ”نہیں لاڈلے! نہیں۔ ذرا ٹھہر۔“ میرا ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا۔ ”اِسے اتنی آسان موت دیتا ہے رے، پگلے۔“ اُس نے چاقو میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ ”چل ہٹ۔“ اُس نے مجھے دُور دھکیل دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے تیواڑی پر جھپٹا۔ تیواڑی کی کرب ناک چیخ سے کمرہ لرز گیا۔ صرف ایک لمحے میں بجھل اُس کے جسم سے ہٹ گیا۔ اُس نے اپنی بند مٹھی میرے آگے کر دی۔ میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ میرے ہاتھ میں تیواڑی کی کٹی ہوئی ناک تھی۔

میں نے پلٹ کے حیران آنکھوں سے تیواڑی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ہوئے فرش پر تڑپ رہا تھا۔ اُس کی کٹی ہوئی ناک میری ہتھیلی پہ رکھی تھی اور بجھل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے چکّر سا آنے لگا اور میں بے اختیار اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔ کمرے میں تیواڑی کی کراہوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی مگر پھر اچانک کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے دوڑ کے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ سب سے آگے پیرو تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ اپنے بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کی۔ بجھل نے مجھے چھوڑ کے اُسے گلے لگا لیا۔ جامو اور کانتے نے مجھے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا اور میرے گال چومنے لگے۔ ہر شخص ایک دوسرے کو دھکیلتا اور کھینچتا ہوا آگے آتا اور ہم سے لپٹ جاتا۔ کسی نے بجھل کا شانہ، کسی نے اُس کا کُرتا، کسی نے اُس کی پنڈلیاں پکڑ رکھی تھیں۔ پیرو دادا بجھل کی گردن میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا اور بُری طرح دہاڑ رہا تھا لیکن لوگ ہمارے اطراف سے نہیں ہٹے، پیرو چیختا، گرجتا رہا۔

جامو، کانتے، زورا، چھیدا، مارٹی، ماجھی اور دوسرے لوگوں میں سے بیشتر کے کپڑے خون اور پسینے سے تربتر تھے جیسے وہ کہیں سے ہولی کھیل کے آ رہے ہوں۔ چند لمحوں تک لوگ اسی طرح شور کرتے، ایک دوسرے پر ٹوٹتے اور آپس میں گتھم گتھا ہوتے رہے پھر جب بجھل نے اپنا ہاتھ بلند کر کے انھیں خاموش ہو جانے اور دور ہٹنے کی تلقین کی تو کمرے کا شور کسی قدر کم ہوا۔ بجھل اُونچی آواز میں ماجھی کو پکار رہا تھا۔ ماجھی بھیڑ کاٹتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ بجھل نے مضطرب لہجے میں اُس سے پوچھا۔ ”گنتی کر لی ہے رے؟“

ماجھی کو جواب دینے میں تامّل ہوا۔ شاید بجھل کی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ”سب ٹھیک ہے بجھل بھائی!“ ماجھی کے بجائے جامو نے آہستگی سے جواب دیا۔

”کسی کو بھول تو نہیں آئے؟“

”اپن کا اکّھا آدمی موجود ہے۔“ ماجھی ہانپتے ہوئے بولا۔

”سویرا ہونے کو ہے۔“ بجھل نے ناگواری سے کہا۔ ”کیا اُن کے سامنے اس طرح آؤ گے؟“ بجھل کا اشارہ واضح طور پر پولیس کی جانب تھا۔ کمرے میں بھن بھناہٹ سی ہونے لگی۔ ”وہ ماسٹر مارٹی کا بچہ کدھر ہے؟“ بجھل نے بھڑکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ مارٹی میری پیٹھ سے چمٹا ہوا تھا۔ بجھل کی آواز پر وہ اُچھل کے سامنے آیا اور سر جھکا کے اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس کا بایاں بازو خون میں نہایا ہوا تھا۔ بجھل نے آگے بڑھ کے اُس کا ہاتھ اُوپر اُٹھا کے چھوڑ دیا۔ مارٹی کی سسکی نکل گئی۔ جیسے ہی بجھل نے اُس کی کمر پر تھپکی دی۔ مارٹی اپنا سر اُس کی چھاتی سے رگڑنے لگا۔ ”جا، پیچھے جا کے مرہم پٹی کرا۔“ بجھل نے اُس کا سر پکڑ کے گال پہ ایک چپت رسید کیا۔ مارٹی پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ وہ بجھل کے پیروں پر گر گیا۔ بجھل کے اشارے پر زورا نے اُسے اُٹھایا اور مارٹی کا نڈھال جسم کندھے پر لاد کے باہر نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے بجھل نے سب کو منتشر ہونے، مرہم پٹی کرانے اور کپڑے بدلنے کا حکم دیا۔ جن لوگوں کے زخم گہرے تھے، اُنھیں پہلے ہی تہہ خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ پیرو کے اڈّے کی یہ عمارت خاصی بڑی تھی۔ یہاں بہت سے آدمی مستقل رہتے تھے اور ہر قسم کا انتظام موجود تھا۔ پیرو کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ زخمیوں سے نمٹنے کے لیے پہلے ہی تمام تیاری کر لی گئی تھی۔ یہاں تک کہ پچاس ساٹھ آدمیوں کے کپڑے بدلنے کا خیال بھی رکھا گیا تھا۔ جن آدمیوں کے زخم بھرنے میں دیر لگتی اُنھیں منتقل کرنے کے لیے ملاقے کی خفیہ جگہوں کا تعین بھی کر لیا گیا تھا۔ پیرو روانی سے ماجھی اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو حکم پہ حکم دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں پیرو، بجھل، جامو، کانتے اور چھیدا کے علاوہ اور میرے سوا تمام کمرہ خالی ہو گیا لیکن ہمارے علاوہ وہاں ایک اور آدمی بھی موجود تھا، تیواڑی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا لیے تھے۔ اُس کا چہرہ لہولہان تھا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے استاد؟“ پیرو نے تیواڑی کو گھورتے ہوئے وحشت سے پوچھا۔

”اس کا کیا کرنا ہوتا۔ اس کا فیصلہ تو ہو چکا ہے۔“

”پر... پر استاد! بجھل بھائی!“ پیرو تذبذب سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اچانک تیواڑی کی ٹوٹی ہوئی آواز کمرے میں اُبھری۔ ”اپن کو ایک چاقو دے دو۔“ وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

”تجھے چاقو تو دے دیا گیا تھا، پر تو نے اُسے کھو دیا۔ اب پھر تجھے چاقو دیا جائے تو تو پھر اُس کا غلط استعمال کرے گا۔ چاقو تو دوسروں پر اُٹھتے ہوئے اچھا لگتا ہے تیواڑی! اپنے آپ پہ اُٹھاتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔ شیشے میں ایک بار اپنی شکل تو دیکھ لے۔“

”نہیں نہیں۔“ تیواڑی درد و کرب سے چیخنے لگا۔

”کیوں لاڈلے! ٹھیک ہے نا؟“ وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”اب اسے جانے دیا جائے، کیوں پیرو دادا؟“

”مگر...... مگر بجھل! بجھل بھائی!“ پیرو نے اٹک اٹک کے کہا۔

”تم اسے کچھ دن اپنے پاس رکھنا چاہو تو رکھ لو۔ اس کا زخم بھر جائے تو اسے چھوڑ دینا۔ اب پیٹے کا خرچہ بھی بچ جائے گا۔ جامو! اسے سامنے سے اُٹھا لے اور تو بھی اپنا حلیہ ذرا ٹھیک کر کے آ۔ جلدی کر۔“ بجھل جھنجلا کے بولا۔

جامو نے بڑھ کے تیواڑی کو ایک جھٹکے سے کھڑا کیا مگر وہ اُس پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ تیواڑی نے زمین پر پڑا ہوا میرا چاقو تاک لیا تھا۔ اُس نے اُسے اُٹھا تو لیا مگر وہ اپنے سینے میں پیوست نہیں کر پایا کیونکہ کانتے نے بجلی کی طرح لپک کے اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ درمیان ہی میں پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے جبڑے پر مکّا مارا۔ تیواڑی اپنے اوسان کھو چکا تھا اور اب وہ کسی ایک آدمی کے بس کا نہیں رہا تھا اس لیے جامو کو پھر اُس کے نزدیک جانا پڑا۔ اُس نے اُس کی گردن میں اپنے بازو ڈال کے اُسے دوبارہ قابو میں کیا۔ اس اثنا میں کانتے اُس سے چاقو چھین کے میری طرف اُچھال چکا تھا۔ جامو اور کانتے تیواڑی کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے مگر بجھل کی آواز نے اُن کے قدم روک لیے۔ ”جامو استاد!“ بجھل نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”اس حرام کی اولاد کو ہوش آئے تو بول دینا کہ چاقو کے ساتھ ساتھ آنکھ کی دھار بھی تیز رکھنا پڑتی ہے اور بول دینا کہ غنڈے کی آنکھ کھل ہو جائے تو چاقو بھی نہیں چلتا اور اس... اس سور کے بچے کو یہ بھی بول دینا کہ اچھا آدمی کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔ بس اب اسے لے جا۔ لے جا۔“ پیرو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُس کی زبان بند کی۔

اُن کے جانے کے بعد کچھ دیر کے لیے کمرے پر سکوت چھا گیا۔ فرش پر خون کے دھبّے پڑے ہوئے تھے۔ میری مٹھی میں ابھی تک تیواڑی کی ناک دبی ہوئی تھی۔ پیرو دادا ہم دونوں کے ہاتھ تھامے بُدبُداتا ہوا ہمیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔

ہم کوئی آدھے گھنٹے بعد منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑے بدل کے اڈّے کے سب سے بڑے ہال جیسے کمرے میں آئے۔ یہاں پہلے سے کئی آدمی موجود تھے۔ درمیان میں سماوار رکھا ہوا تھا اور چائے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم تینوں کو گلاسوں میں بغیر دودھ کی چائے پیش کی گئی۔ اس دوران میں وہاں کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ ہماری طرح سب نے اپنے حلیے درست کر لیے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد جامو اور کانتے ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ بجھل نے انھیں اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ جامو نے ایک ڈھیلا ڈھالا کُرتا پہن رکھا تھا۔ کُرتے کی ایک آستین جھول رہی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ آستین کے نیچے کلائی پٹیوں سے لپٹی ہوئی ہے۔ کانتے کی پیشانی اور کانوں پر روئی چپکی ہوئی تھی۔ روئی کا رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اُس کے سر کے درمیانی

حصے سے ٹھوڑی تک بھی ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دونوں کے چہروں پر بشاشت نمایاں تھی۔ پٹی کے باہر کانتے کے بال سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ تنگ لباس میں اُس کا چوڑا سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا تھا۔ پیرو دادا جھّل کے کان میں کچھ کہہ کے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ جاموا اور کانتے نے چائے ختم ہی کی تھی کہ جھّل نے مجھے ٹہوکا مارا اور نرم آواز میں ہدایت کی کہ میں جاموا اور کانتے کو ساتھ لے کے جلد از جلد گھر روانہ ہو جاؤں۔ وہ دونوں جز بز ہونے لگے۔ میں سمجھتا تھا، وہ انکار کر دیں گے کیونکہ یہ موقع گھر جانے کا نہیں تھا لیکن وہ دونوں کسمسا کے رہ گئے۔ میں نے مارٹی اور دوسرے لوگوں کو دیکھنے کا بہانہ کرنا چاہا مگر جھّل نے میرا منہ بند کر دیا۔ اُس نے مجھے تاکید کی کہ میں جاموا اور کانتے کو گھر ہی روک کے رکھوں۔ اس تاکید کے بعد حیل و حجت کی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے جھّل کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ ابھی اندھیرا تھا اور ہم روشنی پھیلنے سے پہلے گھر پہنچ سکتے تھے۔

"اور تم — ؟" میں نے منتشر لہجے میں جھّل سے پوچھا۔

"میں پیرو دادا کے ساتھ رہوں گا۔" وہ درشتی سے بولا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی جاموا اور کانتے اُٹھ گئے۔ نتیجتہً مجھے بھی اُن کے ساتھ اُٹھنا پڑا۔ باہر موٹر تیار کھڑی تھی۔ ہم تینوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ کانتے نے اپنا سر میرے کندھے پر ڈھلکا دیا تھا۔ میرا دماغ جل رہا تھا۔ ڈرائیور کی موجودی میں اُن سے کچھ پوچھنا نازیبا تھا۔ سارے راستے خاموشی رہی پھر گھر سے خاصے فاصلے پر میں نے گاڑی رکوا دی۔ مجھے اس احتیاط کا اچانک خیال آگیا تھا۔ ہم دبے دبے قدموں سے اندھیرے میں گزرتے ہوئے چند منٹ میں گھر پہنچ گئے۔ دروازہ پہلی ہی دستک پر کھول دیا گیا۔ جولین سامنے کھڑی تھی۔ ہم تینوں تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ ڈرائنگ روم میں ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ ایک کتاب فرش پر گری ہوئی تھی، باقی کتابیں صوفے پر بکھری ہوئی تھیں۔ جولین نے جلدی جلدی اپنا لباس درست کیا۔ وہ سراسیمگی سے ایک کونے میں سمٹ گئی تھی "تم اب تک جاگ رہی ہو؟" میں نے اُس کی حیرت اور پریشانی کم کرنے کے لیے نرمی سے پوچھا۔

اُس کی پلکیں پٹ پٹانے لگیں اور اُس نے تیزی سے گردن ہلائی۔

"جاموا اور کانتے بھائی آرام کریں گے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہمارے لیے کوئی تکلیف مت کرنا۔" کانتے درمیان میں بولا۔

"یہ کیا ہو گیا؟" وہ کانتے کی پٹیوں کی طرف انگلی اُٹھا کے دہشت سے بولی۔ "جھّل بھائی کہاں ہیں؟"

"وہ بھی جلدی آجائیں گے، ذرا معمولی سا جھگڑا ہو گیا تھا۔ کانتے اور جامو بھائی کو کچھ چوٹیں آئی ہیں۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ دودھ ہو تو گرم کر کے انھیں پلا دو۔"

"دودھ والا بس آتا ہی ہو گا۔" اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں بازار سے دودھ لے آتا ہوں، تم ان کے لیے بستروں کا انتظام کر دو۔" جاموا اور کانتے نے منع کیا لیکن جولین بھاگی ہوئی باورچی خانے سے دودھ کا برتن لے آئی۔ میں اُن دونوں کو وہیں چھوڑ کے گلی میں آگیا۔ دودھ کی دکان پر جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دودھ والا راستے ہی میں مل گیا۔ جب میں واپس آیا تو جاموا اور کانتے میرے کمرے میں جا چکے تھے۔

جولین نے اتنی دیر میں دونوں کے لیے بستروں کا انتظام کر دیا تھا۔ نیپا بھی جاگ گئی تھی۔ میں نے کانتے کا لباس بدلوا دیا اور اُس کے پاس بیٹھ کے اُس کا سر دباتا رہا۔ صبح کی روشنی اُجاگر ہو رہی تھی۔ جامو نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ جولین کی آہٹ پر وہ دونوں پھر اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ جولین دودھ کے ساتھ مکھن اور بسکٹوں سے بھری ہوئی کشتی ساتھ لائی تھی۔ دودھ پیتے ہی جامو نے مجھے بھی اپنے ساتھ سو جانے کا مشورہ دیا۔ میں تھوڑی دیر بعد آنے کا بہانہ کر کے باہر آگیا۔ میرے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا اور نہ میری آنکھیں اُن کی طرح بوجھل تھیں۔ ڈرائنگ روم میں جولین مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگی۔ میں نے تیواڑی کی ناک کاغذ میں لپیٹ کے جیب میں رکھ لی تھی۔ سوچا تھا، اُسے دکھاؤں گا تو وہ ڈر جائے گی اور جب اُسے معلوم ہو گا کہ یہ کس کی ناک ہے تو اُس کی حالت قابلِ دید ہو گی۔ وہ کرشنا جی کو اپنے باپ سے زیادہ یاد کرتی تھی۔ یہ مکان بھی اُسے کرشنا جی ہی نے دلایا تھا۔ اُس نے ہر کمرے میں اُن کی تصویر سجا رکھی تھی۔ تیواڑی کی ناک میری جیب میں پڑی رہی اور میں اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہلاتا رہا لیکن خود میری زبان بہک رہی تھی اور میرے منہ سے اوندھے سیدھے لفظ نکل رہے تھے۔ میں نے اُسے جاموا اور کانتے کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ اُن کا کمرہ بند رہے اور پڑوسیوں کی نظریں اُن پر نہ پڑیں تو بہتر ہے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں ایسی باتیں کر کے خود اپنی کہی ہوئی تسلی آمیز باتوں کی نفی کر رہا ہوں۔ اُس کی آنکھوں کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ میں نے اپنے ہونٹ بند کرنے کی کوشش کی تو میری خاموشی سے وہ اور پریشان ہو گئی حالانکہ اندیشے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جھّل نے انھیں محض احتیاطاً گھر بھیج دیا تھا کہ وہ آرام بھی کر لیں گے اور اڈے پر پولیس کے آنے کے بعد کوئی الجھن بھی پیدا نہیں ہو گی۔ دوسرے زخمی لوگوں کی طرح جھّل انھیں کسی اور جگہ بھی بھیج سکتا تھا اور اگر زیادہ تشویش کی بات ہوتی تو وہ انھیں کسی بھی گاڑی سے روانہ کر سکتا تھا۔ جتنی دیر میں پولیس تفتیش شروع کرتی، وہ کسی اور شہر میں گھوم رہے ہوتے۔

کانتے کا سر دباتے ہوئے مجھے اُس سے چند ہی باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُن کے ساتھ ستر کے قریب منتخب آدمی تھے۔ وہ آدھی رات گزرنے کے بعد تیواڑی کے اڈے کے اطراف پھیل گئے تھے۔ انھوں نے اپنے راستے میں مزاحم ہونے والے ہر آدمی کو خاموش کر دیا تھا۔ موٹروں نے انھیں مختلف مقامات پر اُتارا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے اور تیواڑی کے آدمیوں کو پہلے ہی ہلّے میں ختم کرتے ہوئے اُس گلی میں داخل ہو گئے جہاں تیواڑی کا اڈا تھا۔ چند روز ہوئے تیواڑی اپنا پرانا اڈا بدل کے یہاں آگیا تھا۔ کچھ لوگ باہر پہرا دیتے رہے اور ان کی ایک بڑی تعداد عمارت میں داخل ہو گئی۔ جو باتیں جولین کی آمد کے باعث کانتے مجھے نہیں بتا سکا تھا، اُن کا میں خود اندازہ کر سکتا تھا۔ عمارت میں داخلے کے وقت انھیں کسی قدر دشواری پیش آئی ہو گی لیکن وہ سب کے سب واپس آگئے۔ کانتے کہتا تھا کہ تیواڑی کے باڑے میں اور اُس کے اردگرد لاشیں بکھری پڑی ہیں، کاش وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ میری آنکھوں پر تو انھوں نے پردہ ڈال دیا تھا۔ رات پیرو دادا اور جھّل کی باتوں ہی سے میں کھٹک گیا تھا کہ آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ پیرو کے اڈے کی خاموشی گراں گزر رہی تھی۔ تیواڑی نے اپنی حفاظت کے تمام انتظامات کر رکھے ہوں گے اسی لیے اُس نے اڈا بھی بدل دیا تھا مگر اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ اتنی تعداد میں اور اس طرح باڑے میں اچانک آجائیں گے۔ رات کو کچھ اتنا محسوس نہیں ہوا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، میری حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔

اب صبح ہو چکی تھی۔ پولیس نے تمام علاقہ گھیرے میں لے لیا ہو گا، انھیں صرف تیواڑی کے آدمیوں کی لاشیں نظر آئیں گی۔ ممکن ہے، تیواڑی کے چند آدمی بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہوں اور بھاگتے بھاگتے انھوں نے کسی آدمی کو پہچان لیا ہو مگر ایسی مخبری کا امکان نہیں تھا۔ تیواڑی کا پورا اڈا تاراج ہو چکا تھا۔ مخبری کرنے والے اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہوں گے کہ تیواڑی کے بعد اُس کے دشمن ہی اُس کا اڈا سنبھالیں گے اور اُن کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی کہ فلاں آدمی نے پولیس میں مخبری کی ہے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پولیس کو کچھ بتانے سے پہلے وہ بدلے ہوئے حالات کا جائزہ لیں گے۔ اگر تیواڑی کے کسی وفادار ساتھی نے اپنی جان پر کھیل کے پولیس کی توجہ پیرو دادا اور جھّل کی جانب مبذول کرانی چاہی تو اُس کی شہادت کی تصدیق کے لیے پولیس کو بہت سر کھپانا پڑے گا۔ اوّل تو کسی آدمی کے بچ نکلنے کا امکان نہیں تھا۔ انھوں نے پوری طرح احتیاط برتی ہو گی اور تمام شہادتیں مٹا کے آئے ہوں گے۔ کانتے کو افسوس تھا کہ اُسے تیواڑی کے باڑے کو آگ دکھانے کا وقت نہیں ملا۔ اِدھر تیواڑی اور اُس کے قریبی ساتھیوں کی گم شدگی پولیس کے لیے ایک معمّا ہو گی۔ تیواڑی ایسے موقع پر غائب تھا جب ایس پی تسکلا کے بقول اُس کے خلاف کرشنا جی کے معاملے میں ازسرِ نو تفتیش ہو رہی تھی۔ اس سے بھی پولیس بہت سے نتیجے اخذ کر سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو، شہر کے مختلف باڑوں کی جانب پولیس کا رجوع ہونا لازم تھا۔ وہ گرفتاریاں بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ میں تو اپنے طور پر ہی سوچ سکتا تھا۔ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں صرف اندازے لگائے جا سکتے تھے۔ یہ امکان بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ واقعات بالکل مختلف نوعیت سے پیش آئیں اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ میں جلد سے جلد جھّل کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ چاہے مجھے دیکھ کے وہ کتنا ہی ناراض ہو۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر جھّل پر کوئی حرف آیا تو میں ساری ذمّے داری اپنے سر لے لوں گا۔ میرے آگے پیچھے دُنیا میں ہے بھی کون۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ جاموا اور کانتے گہری نیند سو چکے ہوں گے تو میں نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ میں آہستہ آہستہ کمرے میں گیا اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر میں نے الماری سے اپنے کپڑے نکال لیے۔ وہ دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ غسل خانے میں آ کے میں نے جیسے تیسے لباس تبدیل کیا۔ جو کپڑے رات پیرو کے اڈے پر پہنائے گئے تھے، وہ موزوں نہیں تھے۔ جیبیں ٹٹولتے وقت میرے ہاتھ میں پھر تیواڑی کی ناک آگئی۔ میں اُسے نالی میں پھینکتے پھینکتے رہ گیا۔ نالی میں پھر بھی کسی قدر صاف پانی تھا۔

جولین اور چپا کو ایک بار پھر جاموا اور کانتے کے بارے میں خیال رکھنے کا کہہ کے میں گھر سے نکل آیا لیکن کچھ دُور پہنچ کے مجھے اپنی خالی جیبوں کا احساس ہوا۔ میری جیب میں چند ہی سکّے تھے۔ دوبارہ گھر واپس آ کے میں نے جولین سے چند روپے لیے اور ایک لمحہ بھی گھر میں ضائع نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں پیرو کے علاقے میں تھا۔ ٹیکسی راستے ہی میں چھوڑ کے تیز قدموں سے میں باڑے کی طرف بڑھنے لگا۔ علاقے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی تھی۔ تقریباً ساری دُکانیں کُھل گئی تھیں، آگے مجھے پیرو کے باڑے کے دو ایک آدمی گشت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے اُن سے نگاہ چرانے کی کوشش کی مگر مجھے دیکھ کے وہ خود ہی بھاگتے ہوئے میری جانب لپکے۔ "کیا حال ہے؟" میں نے پُرسکون لہجے میں اُن سے پوچھا۔

"اچھا خیر ہے راجا جی!" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اور اُس طرف؟" میں نے نگاہوں نگاہوں میں پوچھا۔

اُن میں سے ایک نے آنکھ ماری، دوسرے نے منہ پر ہاتھ رکھ کے بانسری بنائی اور سیٹی بجانے لگا۔ میں اُن کے شانے دباتا ہوا آگے نکل گیا۔ علاقے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پیرو کے آدمی موجود تھے۔ یہ احتیاط بے سبب نہیں ہو گی۔ آگے میں کہیں نہیں ٹھہرا۔ دُور ہی دُور سے انھیں اشارے کرتا ہوا باڑے پہنچ گیا۔ عمارت میں قدم رکھ کے مجھے اپنا وزن کچھ ہلکا محسوس ہوا۔ وہاں معمول کے مطابق چہل پہل تھی۔ وہ سب مجھے روک کے بات کرنا چاہتے تھے مگر میں سیدھا بڑے کمرے میں آگیا۔ پیرو سامنے کی چوکی پر بیٹھا ہوا پیر دبوا رہا تھا۔ وہ صرف ایک

جانگیا پہنے ہوئے تھا۔ ایک آدمی اُس کے کھنچے ہوئے سڈول جسم کی مالش کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پیرو نے اُن دونوں کو ہاتھ مار کے بھگا دیا اور ریچوکی سے اُٹھ گیا۔ "کیا ہے لاڈلے؟" وہ تشویش سے بولا۔ "تم اتنی جلدی کیسے واپس آگیا؟"

"تجمل بھائی کہاں ہیں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اپن نے بڑی مشکل سے اُسے کمرے میں بند کیا ہے۔ تجمل بھائی کئی دن سے جگائی کر رہا ہے لاڈلا! ابھی اپن نے بولا کہ تم اندر نہیں جائیں گا تو اپن تم سے کبھی بات نہیں بولیں گا" پیرو ہنسنے لگا۔ "استاد مان گیا۔"

"مارتی اور دوسرے لوگ کدھر ہیں؟"

"سب سالا اپنے اپنے ٹھکانوں پر پارسل کر دیا گیا ہے کوئی بات نہیں لاڈلا جانی! اسب فٹ فاٹ ہے۔ تم ادھر بیٹھو، بولو کیا پیئں گا؟ کیا کھائیں گا؟" وہ میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ "ایسا جلدی کیسے آگیا؟"

"بس آگیا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"تو ادھر بیٹھو۔ بیٹھو راجا! ابھی تم سے بات کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملا، سالا رات بھر کائیں کائیں ہوتا رہا۔ رات اپن نے پہلی بار تیرا کھیل دیکھا راجا! وہ سالا تیواڑی کا پلا، اکھا شہر میں کاٹتا بھونکتا پھرتا تھا۔ جب تُو نے چاقو پھینکا تھا تو اپن کا مغز بھی فریلا ہو گیا تھا۔ اپن نے تجمل بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیران تھا کہ سالا کیا داؤ تیرے بھیجے میں آیلا ہے کہ تُو نے یوں کھٹاک چاقو پھینک دیا۔ پھر اُدھر تجمل بھائی نے تو سالا سب کی آنکھ فیر دیا۔ اپن نے ایسا جادو کبھی نہیں دیکھا۔ ایک پل میں بھاگ کے اُس کے پاس پہنچا اور دیکھتے دیکھتے ناک کاٹ لایا۔ نہ اُس کالا بیل تیواڑی کو ملنے کا ٹائم دیا نہ جھکنے کا۔ ایسا جان پڑتا ہے جیسے تیواڑی ناک آگے کیے سالا تیار بیٹھا تھا کہ آؤ استاد تجمل! اپن کا ناک کاٹ لو۔ پتہ نہیں تجمل بھائی کب گیا، کب واپس آیا، سالا لوگ بائیگ سویرے سے ہمارا مغز کھاتا ہے کہ دادا! رات کو اپن لوگوں نے کیا دیکھا تھا، ہم بولا جلوہ دیکھا تھا، سپنا دیکھا تھا سالا!"

میں چپ بیٹھا سنتا رہا، وہ میرے جاہو، کانتے اور تجمل کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ میرے کچھ اور قریب کھسک آیا اور سرگوشی میں اصرار کرنے لگا کہ میں تجمل سے کہہ کے بمبئی میں اُس کا قیام چند دن کے لیے اور بڑھوا دوں۔ میں نے کہا "یہ سب تجمل کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کب یہاں سے جانے کا ارادہ کرتا ہے۔" وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا اور کہنے لگا کم از کم پھر میں ہی اس شہر میں رُک جاؤں کیونکہ تیواڑی کا پاڑا آجانے کے بعد اتنا بڑا علاقہ سنبھالنا اُس کے لیے دشوار ہو گا۔ میں نے کہا کہ مجھے پاڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے تو ایک مجبوری کے سبب چھنگا استاد سے پاڑا لیا تھا ورنہ مجھے تو کب کا بمبئی سے چلا جانا چاہیے تھا۔

"اپن کا سب کچھ تیرا ہے لاڈلا! اپن ایک بار ہاں کہہ دے۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"تو اگر پاڑا چلانے کا کام کرنا نہیں چاہتا تو مت چلانا۔ تُو راجا بن کے رہنا اور کبھی پاڑے میں مت آنا۔ اپن تجھ کو تجمل کی طرح سمجھے گا راجا!"

"پیرو دادا!" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "مجھے جانا ہے۔"

"اپن کو پتہ ہے، تجھے جانا ہے۔ تجمل نے اپن کو کچھ کچھ تیرے بارے میں بولا ہے۔ پر بہت زیادہ نہیں۔ اپن پوچھتا رہ گیا، بولا پیرو دادا! الا اپنے آپ کو بند کرتا ہے تو مجھ سے اُس کو مت کھلواؤ۔ بول لاڈلے! اپن تیرے لیے کیا کر سکتا ہے؟"

"تمہارا بہت بہت شکریہ پیرو دادا! تم نے تیواڑی کے معاملے میں ہماری مدد کی۔ یہی بہت ہے۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔"

"اپن نے کچھ بھی نہیں کیا لاڈلا! اپن تو بیٹھا سالا دیکھتا رہا۔" وہ اضطراب سے بولا۔ "لاڈلا! اپن نے تیرے لیے ایک بات سوچا ہے ذرا تسلی سے سننا۔" میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "لاڈلا! اپن چاہتا ہے کہ ابھی تجمل بھائی سے ایسا رشتہ بنا لے کہ کبھی نہ ٹوٹے۔ اپن نے تجمل بھائی سے کوئی بات نہیں بولا ہے۔ اپن نے سوچا، پہلے تجھ سے بات کرے گا۔"

وہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "کچھ اور مت سمجھنا۔ خیال کر لینا کہ تیرے سامنے پیرو دادا بول رہا ہے جس کا کوئی عزت ہے۔ اپن تجھے ایک راز کی بات کھول رہا ہے۔ تجمل بھائی کی طرح اپن کا بھی ایک اولاد ہے۔ وہ اپن کا بیٹا بھی ہے، بیٹی بھی۔ اپن نے اُسے پاڑے کی زندگی سے جدا رکھا ہے۔ اس کی ماں بڑے گھرانے کی عورت ہے۔ اپن اُسے لے آیا تھا۔ یہ ایک لمبا کہانی ہے۔ بس اتنا جان لے کہ اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں گیا اور اپن بھی اُسے ادھر نہیں لایا۔ اپن نے اکھا زندگی اُسے بنا کھیل تماشہ دیکھنے کے لیے بتا دیا ہے۔ جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی اُسی کے لیے ہے۔ اپن اُس کے ماتھے پر ایک لکیر دیکھنا نہیں مانگتا تھا۔ جو کچھ اپن سے ہو سکا، اُس کے لیے کیا۔ یہ پاڑا، یہ سالا اکھا دھندا اُسی کے لیے ہے سن جانی! اپن کی رانی کا ایک بیٹی ہے، ابھی اپن اپنے منہ سے اپنی بیٹی کے بارے میں کیا بولے۔ وہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ اپن تجھے اُس کو دینا چاہتا ہے۔ اپن پیرو دادا ہے لاڈلا! کوئی باپ اپنی بیٹی کے بارے میں ایسا نہیں بولتا۔ پر اپن نے تجھ سے کوئی شرم نہیں کیا ہے کیونکہ اپن کا من صاف ہے اور اپن صاف بات مانگتا ہے۔ تو اُسے لے لے۔"

میرے کان سن سنانے لگے۔ "پیرو دادا!" میں نے دہشت سے کہا۔ "...ں کرو، ایسی باتیں مت کرو جن کا جواب سنتے ہوئے تمہیں دُکھ ہو۔ تم ...ے اس لائق سمجھتے ہو، یہ تمہارا بہت احسان ہے، بہت شکریہ۔" میری ...از گھٹ گئی۔ "مگر میں ...... میں کسی لائق نہیں ہوں۔ مجھے نہ تو تجمل ...ائی کے پاس رہنا ہے، نہ کہیں اور۔ زبان بند کر لو پیرو دادا! بھول جاؤ ...م نے ...... تم نے ابھی مجھ سے یہ باتیں کی ہیں۔ مجھے اپنی نظروں ...ہت گراؤ۔ مجھے اتنا نادم مت کرو۔"

"اپن کا کوئی زور نہیں ہے، اپن جانتا ہے۔"

"اس سے آگے کوئی بات مت کرنا، پیرو دادا!"

"لاڈلا! اپن تجھ سے منت نہیں کرتا، سوچنے کو بولتا ہے۔ اپن ...نتا ہے۔ یہ باتیں زور دینے کی نہیں ہوتیں۔ یہ سب تیرے جی پر ہے۔ ...نے تیرے سامنے ایک بات رکھی ہے۔ تُو چاہے تو اُسے ایک بار ...ھ لے۔ تیرے لیے اپن یہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ بہت اچھا بیٹی ہے۔ ایک دم ایک نمبر ہے۔"

"وہ ضرور اچھی ہو گی لیکن میں بہت بُرا ہوں پیرو دادا! کچھ اور ...ت کہو۔ میرے لیے سر اُٹھانے کی گنجائش باقی رکھو۔"

"تُو سوچ لے۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "اچھی طرح سوچ لے۔ اپن ...تجمل بھائی کے مافک نہیں چاہتا کہ تُو چاقو اُٹھائے۔ اپن تجھ کو وہی ...ں دیکھنا مانگتا ہے جو تجمل دیکھنا مانگتا ہے اور جیسا تُو خود ہے۔"

میں نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ "سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہے ...دادا!" میری آواز بھرّانے لگی۔ "اپنے لفظ واپس لے لو پیرو دادا!"

وہ کسی بُت کی طرح ساکت ہو گیا۔ مجھے اپنے سارے جسم پر اُس ...نظریں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میرا جی گھبرانے لگا۔ جی میں آیا، اُٹھ ...بھاگ جاؤں لیکن پیرو جھرجھری لیتا ہوا خود سنبھل کے بیٹھ گیا۔ اُس ...میرے ہاتھ اپنے پیروں سے ہٹائے اور انھیں اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ...بڑبڑانے لگا پھر اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں لفظ ہی ڈھونڈتا ...کہ اُسے کس طرح بتاؤں۔ کیا کہوں۔ وہ اب کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن ...کی خاموشی بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پیرو میرا ہاتھ ...ے جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ اُسی وقت ایک آدمی بھاگتا ہوا اندر داخل ...اور پیرو کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ پیرو کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"...نے دو۔" وہ گرج کے بولا۔ "آنے دو۔"

"کون ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"پولیس کا آدمی۔" وہ تلملا کے بولا۔ "لاڈلا! تم اندر جاؤ۔ میں اس ...بات کرتا ہوں۔ جاؤ تم اندر جاؤ۔" وہ مجھے دھکا دینے لگا۔

"میرے یہاں بیٹھنے میں کیا حرج ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"نہیں لاڈلا! تم بات سمجھا کرو۔ وہ علاقے کی پولیس کا آدمی ہے ...کوئی خاص بات بولنا چاہتا ہوگا۔ ابھی اپن نے بھی اپنا کئی آدمی اُدھر بھرتی کرایا ہے۔ تم ادھر سویرے سویرے کیسے واپس آگیا؟ تم کو تجمل بھائی نے گھر بھیجا تھا۔ تم اُن دونوں کو چھوڑ کے ادھر کیوں آگیا؟ ابھی تم اندر بھی مت جاؤ بلکہ پاڑے سے باہر جا کے ٹیکسی پکڑو اور سیدھا گھر جاؤ۔ کوئی بات ہو گا تو اپن آدمی بھیج دیں گا۔"

"میں تو گھر سے یہاں آیا ہوں اور تم واپس جانے کو کہتے ہو؟ جامو اور کانتے گھر میں سو رہے ہیں۔ جس طرح تم اور تجمل بھائی یہاں ہو، میں بھی ہو سکتا ہوں۔"

"تم بھی ہو سکتا ہے پر تم کو تجمل بھائی نے کیا بولا تھا۔ تم سامنے مت آؤ تو اچھا ہے۔ ابھی ہم سالا ادھر کیا مکھی مار رہا ہے۔"

"مجھے یہیں رہنے دو۔ آخر تم مجھے کیوں واپس کرنا چاہتے ہو؟"

"لاڈلا! بچہ مت بنو۔" وہ جھنجلا کے بولا۔ "اپن بولتا ہے تم جاؤ۔ وہ علاقے کا آدمی ہے۔ تم کو ادھر نہیں دیکھے تو ٹھیک ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی اور بھی نیا آدمی ہو سکتا ہے۔ اپن ادھر موجود ہے، تم کیوں فکر کرتا ہے۔"

"اگر انھوں نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہوئیں گا، پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی اپن نے اپنا جیسا سوچا ہے، سالا دن کا رات ہوتے ہوتے کیا دیر لگتا ہے۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ اڈّا اب میرے نام سے چلتا ہے۔ کیا علاقے کی پولیس اس بات سے بے خبر ہو گی؟ میں یہاں نہیں ہوں گا تو وہ اور مشکوک ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ پوچھیں گے نہیں کہ راجا کون ہے اور کدھر ہے، پھر تم کیا جواب دو گے؟ ہم سب کو اُن کا سامنا کرنا چاہیے۔ جو زخمی ہیں، اُن کی حد تک تو بات ٹھیک ہے لیکن میرے جسم پر کوئی نشان نہیں ہے۔ میں بھی تمہاری طرح اُن کے سامنے آ سکتا ہوں اور اُن سے بات کر سکتا ہوں۔"

"لاڈلا! یہ اڈّا تیرے نام سے ضرور ہے اور تیرا ہی ہے۔ پر تُو نے آج تک علاقے کا پولیس کا آدمی سے بات نہیں کیا۔ اب بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپن زیادہ بات نہیں بولتا۔ وہ اب آتا ہی ہو گا۔ جا پچھلے دروازے سے نکل جا۔ وہ کوئی بھی ارادہ دل میں لے کے آ سکتا ہے۔ وہ اپن سب کو چوڑیاں بھی پہنا سکتا ہے۔ لاڈلا! سالا واردات بھی تو دیکھ۔ پولیس سالا پبلک کو اور بڑا افسر کو کیا منہ دکھائیں گا۔ کچھ نہ کچھ اُسے کرنا ہوئیں گا۔ پولیس والا یہ نہیں سمجھیں گا کہ تیواڑی کے اڈّے پہ جگہ جگہ یہ پان کا پیک کس نے تھوکا ہے۔ کس پاڑے والا آدمی نے ایسا کیا ہو گا۔ وہ ہر طرف آئے گا۔ ادھر بھی آئے گا اور ادھر پہلے آئے گا کہ اپن کا اور تیواڑی کا بہت پہلے سے لگتا تھا۔ اپن سالا تیواڑی سے سدا ہار گیا کہ اپن وہ دھندا نہیں کر سکتا تھا جو تیواڑی کرتا تھا۔ وہ سالا تو آدمی نہیں کُتا تھا۔"

"اگر تم پکڑے گئے تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

"لاڈلا! دھتا مت لگاؤ۔" وہ ناراضی سے بولا۔ "تم کو یہ سب نئیں کرنا تو تم ایسا کیوں سوچتا ہے۔ جو اپن بولتا ہے، وہ کرو۔ تم کیوں جائیں گا جب اپن ایدھر بیٹھا ہے۔ زیادہ آدمی جانا ٹھیک ہے یا کم آدمی؟"

"تمھارے اور تجمل بھائی کے بدلے میں چلا جاؤں گا۔"

"اور اپن تجھے جانے دیں گا؟" وہ طیش میں بولا۔ دروازے سے ایک اور آدمی بھاگ کے آیا۔ پیرو نے مجھے سخت لفظوں میں خفیہ دروازے سے باہر نکلنے کی تلقین کی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میری کوئی بات اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ میں نے جیل میں سات سال گزارے ہیں اور ان پولیس والوں سے میرا واسطہ کچھ کم نہیں رہا ہے۔ وہاں سے ایک لمحے کے لیے ہٹنے کو میرا بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے حالات کی نزاکت کا پوری طرح احساس تھا۔ تجمل اندر موجود تھا۔ جو اس کا حشر ہوتا، وہی میرا بھی ہوتا مگر پیرو کا اصرار اتنا شدید تھا کہ مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔ پولیس اندر آئی تو ایک آدمی نے مجھے اشارہ کیا اور پاڑے کے خفیہ دروازے سے باہر نکال دیا۔ یہ دروازہ سڑک پر کھلنے کے بجائے برابر کی عمارت کے ایک فلیٹ میں نکلتا تھا۔ فلیٹ میں پیرو کے ایک آدمی کا کنبہ رہتا تھا۔ اُس آدمی نے مجھے فلیٹ میں روکنا چاہا مگر میں سیڑھیاں اترتا ہوا گلی میں آگیا۔ علاقے میں ہر طرف پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ میں پاڑے سے کچھ دُور ہوٹل میں جا کے بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں پاڑے کا پھاٹک بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ چائے کے دوران میں میری نظریں اُسی دروازے پر مرکوز تھیں۔ ہوٹل میں پاڑے کے کچھ اور آدمی بھی تھے لیکن وہ مجھ سے لے نیاز بیٹھے رہے۔

مجھے متلی سی ہو رہی تھی۔ میں نے دو تین گھونٹوں میں چائے ختم کر لی۔ ہوٹل میں بہت شور تھا۔ زور زور سے گراموفون بج رہا تھا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور میز پر کہنیاں ٹیک کے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا، ہوٹل میں آنے والے کے لیے گانا سننا شرط ہے۔ پیرو کے جو آدمی ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے، اُن سب کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ انھیں بھی معلوم ہوگا کہ پاڑے میں پولیس موجود ہے اور وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اُسی کے خوف سے یہاں آ کے بیٹھ گیا ہوں۔ جب خود میرا یہ حال ہے تو اُن پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ میں نے سوچا۔ واپس پاڑے چلا جاؤں۔ اس سے بہتر تھا کہ میں اس ہوٹل ہی میں رہتا بلکہ کہیں اور نکل جاتا لیکن یہاں آنے کے بعد اچانک اٹھ جانا اُن کے لیے اور تشویش کا سبب ہوتا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ یہ ایک موزوں ترین جگہ تھی۔ یہاں سے میں پاڑے کی عمارت میں آنے جانے والے ہر شخص کو دیکھ سکتا تھا۔ خاصی دیر ہو گئی۔ اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہونے لگی کہ میں نے پیرو کی بات رد کیوں نہیں کر دی۔ یہاں تماشائی کی طرح آ کے کیوں بیٹھ گیا۔ پھر سویرے سویرے میرے گھر سے واپس آنے کا کیا مقصد تھا۔

میرے ذہن میں کوئی بات واضح نہیں تھی۔ سر میں بھڑکی سی چل رہی تھی۔ پولیس والے ابھی واپس نہیں ہوئے تھے۔ بہت ممکن کہ جب وہ باہر نکلیں تو تجمل، پیرو اور پاڑے کے بہت سے آدمی اُن کے ہمراہ ہوں۔ اگر نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ رات کو تیواڑی کے پاڑے میں گھس کے چاقوؤں کی دھار آزمائی جائے اور اُسے کسی نہ کسی طرح کھلی آنکھوں اور ملتے ہوئے جسم کے ساتھ پکڑ کے میرے سپرد کر دیا جائے اور صبح اس واردات کے الزام میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے تو یہ خوب لطیفہ تھا۔ یہ نتیجہ بھگتتے ہوئے پیرو اور تجمل مجھے شریک نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ نتائج کی ساری ذمے داری انھی پر آنی چاہیے۔ جیسے تیواڑی سے تو انھی کا معاملہ تھا نا، میں تو ایک باہر کا آدمی تھا اور میں نے تو انھیں اس کام کا ٹھیکا دیا تھا۔ نہ میں اُن کی سوچ میں شریک تھا۔ نہ میں نے عملی طور پر اُن کا ساتھ دیا تھا۔ وہ چلے جائیں اور میں دیکھتا رہوں خوب۔ نہ جانے وہ کیا سمجھتے تھے۔

اگر تجمل کو یہ اندیشہ تھا کہ کرشنا جی کی وجہ سے بہت سے پولیس افسر میرے صورت آشنا ہیں، میں یہاں موجود ہوں گا تو اُن میں سے کوئی بھی مجھے پہچان سکتا ہے۔ مجھے خود بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ مرنے کے بعد کرشنا جی کے نام پر کسی قسم کا داغ آئے۔ مجھے پہچان لیا جاتا تو اخبارات اور شہر بھر میں قسم قسم کی افواہیں جنم لینے لگتیں۔ ممتاز واقعہ دہرایا جاتا اور کہا جاتا کہ راج کرشنا ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ رکھتا تھا جس کا تعلق شہر کے مشہور داداؤں سے ہے مگر وہ تو میں کسی وقت بھی پہچانا جا سکتا تھا۔ کرشنا جی کے ہاں بڑے افسر آتے تھے۔ اُن کا تعلق پولیس ہیڈ کوارٹر سے تھا یا ہیڈ آفس سے۔ علاقوں کے چھوٹے افسروں سے اُن کا رابطہ کم رہتا تھا۔ اس لیے علاقوں کے پولیس والے مجھ سے واقف نہیں تھے۔ اُدھر میں نے اپنے آپ کو محدود رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مجھے اس بات کا بہت پہلے سے خیال تھا۔ پاڑے کے تمام معاملات زیادہ تر چھیدا ہی پولیس سے طے کرتے تھے۔ رات کو میں عموماً پاڑے میں نہیں ہوتا تھا۔ پھر کرشنا جی کی موت کو کئی مہینے گزر گئے تھے۔ جب میں نے جھنگا استاد کے پاڑے میں قدم رکھا تھا اور پاڑا لینے کے بعد کرشنا جی کے اصل مجرموں کی تلاش ہی میں بھی خاصا وقت لگ گیا۔ یوں سڑک پر کوئی جاننے والا افسر کبھی دیکھ لیتا تو اُسے کیسے پتہ چلتا کہ جھنگا سے پاڑا چھیننے والا شخص میں ہی ہوں۔ جھنگا کے پاڑے میں خود بخود میرا نام راجا پڑ گیا تھا لیکن کسی اڈے اور پاڑے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو میں کسی جاننے والے کی نظر میں آ سکتا تھا۔ میری شناخت کرشنا جی کی رسوائی تھی مگر اُن کے قاتل آزادانہ گھومتے رہیں، یہ بے شرمی اُس رسوائی سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ کرشنا کے سامنے میری سبکی نہیں ہوئی۔ جب بھی اُن کی تصویر پر نظر پڑتی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کی آنکھیں مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ تاہم مجھے اس بات کا قلق تھا کہ یہ سب کچھ اُن کے مرنے کے بعد ہوا۔ مرنے سے پہلے ہوتا تو وہ مجھے لپٹا کے خوب پیار کرتے، اُن کا بہت نام ہوتا اور وہ زندہ رہ جاتے۔

میری شناخت اب بھی اُن کے لیے ایک نازیبا بات تھی حالانکہ اب صورت بالکل بدلی ہوئی تھی لیکن اب تجمل موجود تھا۔ تیواڑی کے عوض اگر تجمل کے اندر جانے کا امکان تھا تو بات ایک ہی تھی۔ مجھے کیا، کسی کو بھی یہ سودا منظور نہیں ہو سکتا تھا۔ تجمل نے کرشنا جی کی روح کے سامنے مجھے نہال کرنے کے لیے اپنے ذہن میں یہ مفاہمت کر لی تھی تو اُس نے یہ کیوں سمجھ لیا تھا کہ میں بھی اسے قبول کر لوں گا۔ کرشنا جی کی رسوائی کی قیمت تجمل کو نہیں چکانی چاہیے تھی۔ کرشنا جی موجود ہوتے تو وہ ہرگز اپنی یہ قیمت مقرر نہ کرتے۔ میرا سینہ اندر دھنس رہا تھا اور سر بیٹھا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا، کیا ہونے والا تھا۔ کیا سوچ کے تجمل نے اتنے لوگ اکٹھے کیے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کچا نکل سکتا تھا۔ اُس نے اتنا شور کیوں مچایا۔ ہر جگہ یہ منادی کیوں کرائی کہ اب پیرو کا اڈا راجا کے نام سے چلے گا اور تینوں پاڑے ایک ہو گئے ہیں۔ مشکوک ہونے کی تو یہی بات تھی کہ پیرو نے کسی تامل کے بغیر اپنا اڈا اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا ہے۔ شک کی دعوت تو خود تجمل نے دی تھی۔ روز اکھاڑا جمانا، زور کرانا، چوکی پر بیٹھ کے حکم چلانا اور پیرو کا خاموش بیٹھے رہنا۔ یہ ایسی باتیں نہیں تھیں جو دوسرے پاڑوں میں نہ پہنچی ہوں۔ اگر یہ سب تیواڑی کے لیے تھا کہ وہ ایک بہت بڑے اڈے کا مالک ہے، چھوٹے موٹے پاڑے شامل کر کے تقریباً آدھا شہر اُس کے زیرِ اثر آ جاتا تھا اور اُس کے پاس آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ بہت بڑا کنبہ تھا اور تجمل نے یہ سب کچھ دیکھ کے اپنے دماغ میں اُس کے لیے موت سے بدتر سزا تجویز کر رکھی تھی تو اُسے اور باتوں پر بھی توجہ دینی چاہیے تھی۔ ممکن ہے اُسے ہم یہ سزا نہ دے پاتا لیکن میں رفتہ رفتہ اُس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ شمبھو ناس کی موت کے بعد وہ آدھا رہ گیا تھا۔ باقی آدھا بھی کسی نہ کسی صورت سے مجھے ہی ختم کرنا تھا مگر اس طرح نہیں ہوتا۔ شمبھو ناس کی طرح پولیس کھوج لگاتی رہتی۔ پیرو نے ابھی ابھی جس لہجے میں بات کی تھی، اُس میں خوف کا نمک شامل تھا۔ گویا اُس کا یقین بھی متزلزل ہو گیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اور ہو چکا ہے، اُس میں اُس کا دامن صاف رہے گا۔ اُس نے مجھے پاڑے سے نکال دیا تھا کیونکہ اسے حالات بگڑ جانے کا اتنا ہی خدشہ تھا جتنا مجھے۔ شاید یہی کوئی چھپا ہوا خوف تھا کہ اُس نے اپنی بیٹی کا ذکر مجھ سے کر دیا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے اپنی بیٹی اور بیوی کے لیے جو کچھ ہو سکا ہے، فراہم کیا ہے۔ تیواڑی کے بعد شہر میں دوسرا بڑا پاڑا پیرو کا تھا۔ شہر میں دوسری بڑی آمدنی کا پاڑا۔

مجھے آنے والے دنوں پر اعتبار نہیں ہوگا جبھی وہ مجھ سے کہتا تھا کہ اب یہ سب کچھ میں سنبھال لوں یعنی وہ بھی اب اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ تجمل کے اندازے غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ تجمل کے خیال سے وہ کھل کے اپنے تذبذب کا اظہار نہیں کر رہا تھا مگر وہ متردد ضرور تھا۔

تجمل اندر سو رہا تھا۔ جامو اور کانتے اُدھر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پیرو جاگ رہا تھا اور میں جاگ رہا تھا۔ کسی آدمی نے اشارہ کیا ہوگا، بیرے نے میرے سامنے ایک اور چائے لا کے رکھ دی۔ میں بڑبڑا گیا اور میں نے اپنے دماغ کی دھول جھاڑنے کے لیے بے اختیار کئی بار سر جھٹکا۔ اُسی لمحے پاڑے کے پھاٹک کی کھڑکی کھلی۔ میں نے اپنی کرسی سیدھی کر لی۔ میری نگاہ وہیں ٹکی ہوئی تھی۔ پاڑے کے دو تین آدمی کھڑکی سے باہر نکلے۔ پھر ایک باوردی شخص برآمد ہوا۔ اُس کے ساتھ تین سپاہی تھے۔ میں انتظار کرتا رہا مگر اندر سے کوئی اور نہیں نکلا۔ پاڑے کے آدمیوں نے چند قدم تک پولیس والوں کا ساتھ دیا پھر واپس ہو گئے۔ میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ پولیس والے ہوٹل کے قریب آ گئے۔ وہ علاقے کے تھانے کا کوئی چھوٹا افسر تھا۔ میں نے اُس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ فکر زدہ تھا۔ جب وہ ہوٹل سے گزر گئے تو میں نے اُٹھنے میں دو تین منٹ کا توقف کیا۔ ہوٹل والے نے مجھ سے چائے کے پیسے نہیں لیے۔ پیرو کے آدمیوں نے منع کر دیا ہوگا۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ پاڑے کی عمارت کے باہر اسٹول پر بیٹھے ہوئے لوگ میرے وہاں پہنچنے پر کھڑے ہو گئے۔ "کیا بات ہے؟" میں نے اپنا تجسس چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"بیلارام آیا تھا۔" ایک نے بے پروائی سے کہا۔ "اپن کا ہی کبوتر ہے۔ دادا کو بولنے آیا تھا کہ ذرا نرم گرم ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

"ابھی سُنا ہے کہ سالا کچھ فنکشنوں کا اُدور خاطری کرے گا۔ بھلے کر لے۔" وہ ناک چڑھا کے بولا۔ "استاد کو بولتا تھا کہ ایک ڈزن آدمی اندر لے جائے گا۔ ابھی اپن نے استاد کو بولا کہ اپن کو بھیج دو۔ چھٹی کیے بہت دن ہو گیا۔ کچھ کمر دم نکالے گا۔"

اُس کی باتوں پر اُس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ میں نے اُن کا ساتھ دینے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ میرے لبوں پہ ٹھہرا کے رہ گئی۔ عمارت میں جانے کے بجائے میں وہاں سے آگے چل دیا۔ کچھ آگے جا کے میں نے ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ میرے پرانے علاقے میں بھی پولیس گشت کر رہی تھی بلکہ ٹیکسی جہاں جہاں سے گزری، چوراہوں پر ٹولیوں میں پولیس موجود تھی۔ ٹیکسی والا راستے بھر مجھ سے رات کے واقعے پر باتیں کرتا رہا کہ اُدھر آنے جانے پر سخت پابندی ہے۔ پولیس نے تیواڑی دادا کا پاڑا صبح سے اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ گاڑی بھر بھر کے پولیس آتی ہے اور علاقے میں بکھر جاتی ہے۔ تیواڑی کے پاڑے کے قریب کا سارا بازار بند پڑا ہے اور

لوگ فلیٹوں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ اِرد گرد کی سڑکیں سنسان پڑی ہیں۔

میرے علاقے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں اندر پہنچا تو زورا لپے تابانہ اُٹھ کے میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا۔ یہاں آ کے مجھے کچھ سکون ملا۔ یہاں منّا بھی موجود تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اُچھلنے لگا۔ زورا نے مجھے بتایا کہ مارتی کو سیٹھ دینا کے گودام میں رکھا گیا ہے۔ اُس کے ساتھ دو تین آدمی اور ہیں، مارتی کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ خون بہت نکل گیا ہے، پیرو کے خاص ڈاکٹر نے بازو میں کئی ٹانکے لگائے ہیں۔ سیٹھ دینا کا گودام پیرو کے علاقے میں تھا۔ زورا نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ جگہ نہایت محفوظ ہے۔ میرے علاقے سے چند لوگ پکڑ لیے گئے تھے۔ زورا اس پر فکرمند نہیں تھا۔ اُسے توقع تھی کہ جلد یا بدیر پولیس افسران اُسے بھی تھانے بلائیں گے یا خود یہاں آئیں گے۔ واپس آتے ہوئے میں نے بالم خان کے اڈّے کا بھی ایک چکر لگایا۔ پولیس نے وہاں سے بھی چند آدمی گرفتار کر لیے تھے۔

پیرو کے علاقے میں واپس پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی۔ میں باڑے نہیں گیا۔ علاقے میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ وہیں مجھے باڑے کے کئی آدمی مل گئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ تجمل اور پیرو عمارت میں موجود ہیں، کچھ دیر ہوئی تجمل سو کے اُٹھا ہے اور اُس نے حوکی سنبھال کے پیرو کو آرام کے لیے اندر بھیج دیا ہے، صبح سے دو مرتبہ پولیس آ چکی ہے اور کوئی پندرہ بیس آدمی حوالات میں بند کر دیے گئے ہیں، پیرو تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا تھا اور علاقے کے ایک مختصر گشت کے بعد واپس چلا آیا۔ پھر جب اُنھوں نے تیواڑی کے باڑے میں پولیس کو ملنے والی لاشوں کے بارے میں بتایا تو مجھے یقین نہیں آیا۔ میں گنگ رہ گیا۔ وہ اُن کی تعداد ۲۷ بتا رہے تھے۔ میں نے اُن سے دوبارہ تصدیق کی اور مجھے ایسا گمان ہوا جیسے اونچا سننے لگا ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پولیس کو کوئی بھی زخمی نہیں ملا، خود تیواڑی کے بہت سے آدمیوں کو پولیس نے پکڑ لیا ہے، اُس کے ماتحت دوسرے باڑوں کے کئی داداؤں کو بھی حوالات میں داخل کر دیا گیا ہے، اُن میں شعلہ استاد بھی شامل ہے۔ میں نے اُن کے سامنے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چپ چاپ ایک طرف بڑھ گیا۔ میرے قدم بوجھل ہو گئے تھے اور جسم اچانک ٹوٹنے لگا تھا۔ شاید یہ پہلا دن تھا کہ میں نے راہ گیروں کو غور سے نہیں دیکھا۔ شام ہو گئی اور روشنیاں آنکھوں میں کھُبنے لگیں تو مجھے گرد و پیش کی خبر ہوئی۔ میں نہ جانے کہاں نکل آیا تھا۔ یہ شہر کا کوئی ایسا علاقہ تھا جہاں میں اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔ پیرو کے علاقے سے یہاں تک ہزاروں لوگ سڑکوں پر گزرے ہوں گے۔ ممکن ہے اُن میں کورا بھی گزری ہو۔ مجھے اپنی اس بے خبری سے وحشت ہونے لگی اور کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اِدھر سے ضرور گزری ہے، میں نے اُسے پھر کھو دیا ہے۔ اُس نے مجھے گم دیکھا ہوگا تو منہ پھیر لیا ہوگا کہ جب مجھے اس کا کچھ ہوش ہی نہیں ہے تو وہ مجھے کیوں آواز دے۔ میں نے اپنا ہاتھ دانتوں سے کاٹ لیا اور میرے دل میں آیا کہ میں ابھی اسی لمحے شہر سے نکل جاؤں، جو تجمل کا حشر ہوگا، اُسے میں نہیں روک سکتا۔ میں نے اُسے نہیں بلایا تھا اور میں نے اُس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کرے۔ مجھے تو کورا کی تلاش میں آگے جانا ہے۔ میں یہاں رہوں گا تو پھر کوئی نہ کوئی بات ہو جائے گی، پھر کوئی زنجیر میرے پیروں میں پڑ جائے گی، کورا تک پہنچنے میں اور دیر ہو جائے گی، میں دیر سے اُس کے پاس پہنچوں گا تو وہ کہے گی، اب بھی کیا ضرورت تھی آنے کی، ابھی اور دو چار کام نمٹا کے آتے۔ میں قریب کے اسٹیشن جانے والی ایک بس میں بیٹھ گیا۔ راستے میں میں نے اپنے ذہن میں کوئی اور خیال نہیں آنے دیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جو بھی گاڑی نظر آئی، اُسی میں بیٹھ جاؤں گا لیکن اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی میرا ارادہ منتشر ہو گیا۔ میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا تنگ ہونے لگی اور اُس کے دانے چبھنے سے لگے۔ ایسا لگا جیسے کورا شکایت کر رہی ہو کہ میں اُس سے ملوں گا تو وہ مجھ سے نہیں بولے گی۔ کہے گی کہ میں تجمل کو چھوڑ کے کیوں چلا آیا۔

وہ اتنی ہی اچھی تھی، اُس کا دل اتنا ہی نرم و نازک اور صاف و شفاف تھا۔ وہ ایسا ہی کہتی۔ وہ مجھے کسی کی نظروں میں کم نہیں دیکھنا چاہے گی۔ چاہے وہ خود تکلیف برداشت کر لے۔ اسٹیشن سے پیرو کا علاقہ کچھ نزدیک ہو گیا تھا۔ میں ایک عزم کے ساتھ بس میں بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا تھا، تجمل کے سامنے جاتے ہی اعتراف کر لوں گا کہ اس موقع پر اُسے چھوڑنے کا خیال میرے دل میں آیا تھا۔ جب میں رات کو اپنی مالا دیکھوں گا اور کورا میری بند آنکھوں میں کہیں سے اُتر آئے گی تب مجھے اُس کے سامنے ندامت نہیں ہوگی۔

علاقے میں صبح جیسی بات نہیں تھی۔ پولیس کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن سنبھالے رکھی۔ تجمل سے اگر کوئی لغزش ہو گئی تھی تو ایسا ہونا ممکن تھا۔ کسی سے بھی ایسا ہو سکتا تھا۔ بڑے بڑے اندازے غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ تجمل پہلے بھی کئی بار جیل جا چکا تھا۔ ایسی واردات کے بعد علاقے میں پولیس کا آنا، تفتیش کرنا اور گرفتاریاں کرنا کوئی توقع کے خلاف بات نہیں تھی۔ توقع کے خلاف بات یہ تھی کہ وہ اتنی آسانی سے تجمل اور اُس کے ساتھیوں تک پہنچ جائیں اور کسی اور طرف سوچنے اور منتشر ہونے کے بجائے اسی جانب اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیں۔ توقع کے خلاف بات یہ تھی کہ خود تجمل نے پیچیدہ طریقۂ کار اختیار کر کے اُن کے لیے راستہ آسان کر دیا تھا مگر تجمل نے ایسا کیوں کیا؟ باڑے جانے سے پہلے مجھے معلوم ہو گیا کہ ابھی تک پیرو اور تجمل باڑے ہی میں ہیں، دن بھر پولیس کے کارندے آتے جاتے رہے ہیں لیکن انھیں اہتمام کے ساتھ رسمی تفتیش کے لیے تھانے نہیں بلایا گیا ہے۔ تجمل نے ضرور تمام پہلوؤں پر غور کیا ہوگا۔ میری بے یقینی کی وجہ شاید کورا ہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو مجھے پھر دیر ہو جائے گی۔ وہ تجمل کو تھانے بلا لیں، جیل میں بند کر دیں مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انھوں نے تجمل پر فردِ جرم عائد کر دی۔ تجمل نے اپنے دفاع کی ہر تدبیر ذہن میں محفوظ اور ملحوظ رکھی ہوگی۔ اس کے باوجود کوئی حادثہ رونما ہو جائے، کوئی روزن کھُل جائے تو تجمل کیا کر سکتا ہے۔ پھر تو آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور کرشنا جی کو ختم کرنے کے بعد تیواڑی سر اُٹھا کے چلتا رہے اور سمجھو لوگ اُسے سونے کی دیوار میں چھپا لے۔ تجمل نے یقیناً ہر امکان نظر میں رکھا ہوگا۔

پیرو کے آدمیوں نے مجھے باڑے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ پھاٹک کے سامنے پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پتہ چلا کہ اندر علاقے کے تھانے کے بڑے افسر کے ساتھ وہ افسران بھی موجود ہیں جنھیں تیواڑی کے باڑے کی واردات کے سلسلے میں متعین کیا گیا ہے اور انھیں آئے ہوئے خاصا وقت گزر گیا ہے۔ میں دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو راستے سے ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ تجمل کے ہونٹوں میں حقّے کی نے دبی ہوئی تھی۔ پیرو اُس کے بازو میں بیٹھا تھا۔ چوکی پر پولیس کے چار افسر موجود تھے۔ تین سپاہی دور دیوار سے لگے ہوئے کھڑے تھے۔ افسروں کے سامنے لیمن کی بوتلیں کھُلی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے تجمل نے مجھے دیکھا۔ اُس کی بھویں سکڑ گئیں۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چند لمحوں بعد دوبارہ کھولیں تو اُن میں تاسف اور پریشانی کے اثرات تھے جیسے وہ مجھے دروازے سے لوٹ جانے کی تلقین کر رہا ہو۔ میں کشمکش میں دروازے پر ٹھٹکا کھڑا رہا لیکن واپس جانا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ میں تیزی سے چوکی کے پاس پہنچ گیا۔ دروازے کی طرف جن افسروں کی پشت تھی وہ اب میرے سامنے تھے۔ میری آنکھیں سُن ہو گئیں۔ اُن میں میرا ایک شناسا تھا۔ مجھے اپنے حواس بحال رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ اُس کا بھی یہی حال ہوا۔ میرے ہاتھ سلام کے لیے اُٹھتے اُٹھتے رہ گئے۔ اُس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ وہ مجھے حیران نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں نہیں جھکائیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ تجمل کی آواز پر وہ چونکا۔ ”بتاؤ، تسکلا جی!“ تجمل نے بیزار لہجے میں کہا۔ ”کوئی اور بات پوچھنی ہو تو جھجک نہ کریں۔ جو کچھ ہم جانتے اور سمجھتے تھے، ہم نے آپ کو بتا دیا ہے۔ آگے بھی جب آپ کا جی چاہے، اِدھر آئیں۔ جو خاطر ہم سے ہو سکی، کریں گے۔ اگر ہمارے اندر جانے سے آپ کا بھلا ہو سکتا ہے تو ہم آپ کے لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں۔“

تسکلا خاموش رہا۔ اُس کی نظریں مجھی پر مرکوز تھیں۔ اُس کے بجائے ایک دوسرے افسر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تجمل دادا! واردات بہت سنگین ہے۔“

”ہے تو۔“ تجمل سر ہلا کے بولا اور حقّہ گڑگڑانے لگا۔

”اور اپن کیا بول سکتا ہے۔“ پیرو نے تیزی سے کہا۔

”اور ہم کسی کوشش سے گریز نہیں کریں گے۔“

”ایسا ہونا بھی چاہیے۔“ تجمل نے نرم آواز میں کہا۔ ”یہ کام کسی باڑے کے آدمیوں ہی نے کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے، انھوں نے کسی کے بولنے پر ایسا کیا ہو، کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ پولیس والے ہیں، یہ باتیں اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ باڑے کے آدمیوں کو باڑے کے آدمیوں سے بیر ہوگا۔ بستی والوں کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ آپ بولتے ہیں کہ گلی کا چوکی دار بھی محفوظ رہا۔ یہ تو کوئی دشمنی کی بات لگتی ہے صاحب لوگو!“

”اور تیواڑی کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟“

”وہ اپنا دشمن خود ہو سکتا ہے اور لوگ باگ بھی ہو سکتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ہم بھی اُس کے دشمن ہیں۔“ تجمل نے کہا۔ ”ہمیں تو یہ جان کے خوشی ہوئی ہے۔ تیواڑی کا ریکارڈ تو آپ کے پاس ہوگا۔ ممکن ہے، کسی نے اُسے چھپا دیا ہو۔ نہ ملے تو ہم سے پوچھ لیں۔ ویسے علاقے کی پولیس علاقے کے باسیوں، لونجیوں اور بھٹّی والوں کو اب اُس کا اتنا خیال نہیں ہوگا۔ ابھی اُس کے اڈّے کے بہت سے آدمی زندہ ہیں، آپ زور دیں تو شاید بے وفائی کر لیں۔ پولیس چپ ہے تو ہم بھی چپ ہیں۔ آپ پوچھتے ہو تو زبان کھول لیں۔ پر آپ بابو لوگ سب جانتے ہوں گے۔“

”تم تو کلکتے سے آئے ہو، تمھیں تیواڑی کے بارے میں اتنی باتیں کیسے معلوم ہیں؟“ ایک افسر نے تندی سے کہا۔ وہ سب سے زیادہ معمر تھا۔

”بڑے صاحب!“ تجمل غنودہ لہجے میں بولا۔ ”پیرو تو اِدھر رہتا ہے اور بھی اپنی جان یہاں رہتا ہے۔ اسے اڈّا بولتے ہیں اور اڈّے پر رہ کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ دیکھنے اور سننے کے سارے کل پرزے چوکس رکھنے پڑتے ہیں۔ ناک الگ رکھنی پڑتی ہے۔“

”اور ہم لوگ اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔“

”آپ بھی کمال کرتے ہو جناب!“ پیرو نے کسی قدر ترشی سے کہا۔ ”ذرا دم تو لینے دو۔ ابھی سالا اپن کو خود اُس مائی کا لال کا کھوج ہے جو اُدھر اُس شان سے پہنچا۔ کل وہ اُدھر جا سکتا ہے تو آج اِدھر بھی آ سکتا ہے۔ ابھی اپن بھی آپ کا مافک.....“

تجمل نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ اپنا ہاتھ بڑھا کے وہ مجھ سے بولا۔ ”بیٹھ جا راجا! کھڑا کیوں ہے۔ آ اِدھر آ۔“ ایس پی تسکلا نے ہم دونوں کو دیکھ کے سر جھکا لیا۔

”دیکھو پیرو دادا! کسی کو معاف نہیں کیا جائے گا۔“ تسکلا کے برابر بیٹھے ہوئے افسر کے لہجے میں غصہ شامل تھا۔ ”ہم انھیں نہیں چھوڑیں گے۔ چاہے وہ ہمارا باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ لاقانونیت برداشت نہیں کی جائے گی۔ اگر تمھیں کچھ پتہ ہے تو ہمارا ساتھ دو۔ تعاون کی صورت میں رعایت ضرور ہو سکتی ہے، ورنہ.....“

”ورنہ۔“ وہ جھجک کے بولا۔ ”بات

بہت خراب ہو سکتی ہے۔ ہم بولے دیتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اُن کی گردنوں تک پہنچیں اور رعایت کی کوئی گنجائش نہ رہے، وہ خود کو ہمارے حوالے کر دیں تو اچھا ہے۔ اس مرتبہ پولیس کے وہ لوگ سامنے نہیں ہیں جو پہلے تھے۔"

"اب وہ لوگ کیوں سامنے ہوں گے۔ تیواڑی کا معاملہ ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے۔ ممبئی کے جنگل کا شیر ہے۔ اب تو سب کچھ بدل جائے گا۔" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بڑے آدمی کے لیے قانون بھی بڑا ہونا چاہیے۔ زیادہ سخت لوگوں کی ضرورت پڑے گی۔ زیادہ بڑے قانون داں، محقق داں افسر لوگوں کی۔ جناب! صاف صاف بات کرو۔ ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ چلو پیرو دادا! اب تمہارے ہاں سے اپنا دانہ پانی شاید اُٹھ ہی گیا ہے۔"

"اور اُن پولیس والوں کو بھی ہمارے ساتھ لیتے چلیے جن کی جگہ آپ آئے ہیں اور جنھیں بدلنے کی آپ نے اب ضرورت سمجھی۔" میں نے شکلا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تو چپ رہ، بڑے آدمیوں کے بیچ میں بولتا ہے۔"

"یہ کون ہے؟" معمر افسر نے پوچھا۔

"یہ اپن کا راجا ہے۔" پیرو میری کمر پہ دھپ مارتے ہوئے بولا۔ تجمل نے میرے بال کھینچ لیے۔ "اسے معاف کر دینا صاب! یہ نہیں، اِس کی عمر بول رہی ہے۔ ابھی افسروں میں اُٹھا بیٹھا نہیں ہے۔"

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہی ہے؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"نہیں، غلط نہیں، بے موقع بات کہی ہے اور بے موقع بات بھی غلط بات کے برابر ہے۔" تجمل آہستگی سے بولا۔ پھر اُس کی آواز بتدریج اونچی ہوتی گئی۔ "ہر بات کہنے کے لیے ایک وقت اور موقع ہوتا ہے۔ قانون کی کتاب اندھا بھی پڑھ سکتا ہے پگلے! یہ عدالت، وکیل منصف، ایک حاکم کے اُوپر دوسرا حاکم۔ یہ سب گورکھ دھندا کس لیے ہے۔ موقع آئے گا تو منہ سے نکلی ہوئی بات اچھی بھی لگے گی۔"

"تجمل دادا! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں صاب!" میں راجا کو سمجھا رہا تھا۔ اس کی زبان اس کے ہاتھ اور سر کی طرح اس کے بس میں نہیں ہے۔ آپ بولیں، آپ نے پورے پاڑے کی تلاشی لے لی ہے۔ سب کچھ جان بوجھ لیا ہے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اس سے زیادہ کیا بولیں۔ کچھ اور لیمن وغیرہ منگوائیں؟ رات کے کھانے کا ٹائم بھی ہو گیا ہے۔ یہ جگہ آپ لوگوں کی شان کے مطابق نہیں اور ٹائم بھی ایسا نہیں کہ آپ سے کھانے کے لیے بولا جائے۔" تجمل حقہ گڑگڑانے لگا۔

ایس پی شکلا کے سوا اُن سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔

"ہم تمھیں ایک موقع اور دیتے ہیں، ہم پھر آئیں گے۔"

"ضرور آئیں۔ آپ کو دروازہ ہر وقت کھلا ملے گا۔ مجھے جانا تھا۔ پیرو کی وجہ سے رُک گیا تھا۔ اب آپ لوگوں کی وجہ سے رُکنا پڑے گا۔"

ایس پی شکلا اچانک کھڑا ہو گیا۔ اُس کی دیکھا دیکھی دوسرے افسروں نے بھی چوکی چھوڑ دی۔ تجمل اور پیرو بھی فرش پر آ گئے۔ "ابھی اپن ایک بات بولیں۔" پیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بولو۔" معمر افسر نے پلٹ کے پوچھا۔

"اپن سمجھتا ہے کہ پہلے آپ ادھر ٹائم خراب کرنے کے بجائے کسی اور طرف جاؤ۔ اور شاید تم کو کچھ مل جائے۔ ادھر تو اپن ہر ٹائم پر موجود ہے۔ جب بولے گا، چلا جائے گا۔ اپن کا تجمل بھائی بولتا ہے کہ ہر دادا کا دو گھر ہوتا ہے۔ کبھی اِس گھر میں، کبھی اُس گھر میں۔ اور بولتا ہے کہ مرنے سے پہلے بیس بار موت کا مزہ چکھنا چاہیے، انیس بار ہوا تو دادا سالا انیس نمبر ہے۔" اُس کی بھڑکتی ہوئی آواز جلد ہی ماند پڑ گئی۔ "ابھی اپن کے منہ سے کوئی جاستی بات نکل گیا ہو تو معاف کرنا۔ اپن سے بولنا نئیں آتا۔ سالا سارا ٹائم چاقو میں لگ گیا۔ کوئی اور کام ہو تو بولو۔"

معمر افسر کے ہونٹوں پر سوکھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اُس کی گردن معنی خیز انداز میں ہلتی رہی۔ باری باری اُس نے ہم تینوں پر نظر ڈالی۔ پھر در و دیوار پر، اور قدم بڑھا دیے۔ ہم تینوں انھیں پھاٹک تک پہنچانے گئے۔ ایس پی شکلا اُن سب سے آگے تھا۔ موٹر میں بیٹھنے کے بعد اُس نے سر اُٹھایا۔ میں سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں کچھ چھوٹی ہو گئی تھیں اور مجھی پر مرکوز تھیں مگر موٹر فوراً چل پڑی۔ ہم چند منٹ تک جاتی ہوئی موٹریں دیکھتے رہے۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئیں، اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے آدمی لپک کے ہمارے پاس آ گئے۔ "کیا ہو رہا ہے دادا؟" ماچھی کی آواز چہکی۔

"واپس چلا گیا ہے۔" پیرو نے بوجھل لہجے میں جواب دیا۔

"کیا بولتا تھا؟"

"پریشان تھا۔"

"ٹھیک تو رہا؟" ماچھی نے آنکھ دبا کے پوچھا۔

"ہاں۔" تجمل اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ اور میری کمر پکڑتا ہوا اندر چلا آیا۔ "تو پھر آ گیا رے؟" وہ جماہی لیتا ہوا مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تجمل بھائی! میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔ یہ کیا... یہ سب کیا ہے؟" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں ہے؟"

وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ "لاڈلے! کیا یہ تیری آواز ہے؟"

"یہ کیسی باتیں ہو رہی تھیں؟"

"تو تو بہت دیر سے آیا۔ اس سے پہلے بہت سی باتیں ہو چکی تھیں، ابھی اور ہو سکتی ہیں۔ یہ آنا جانا، سننا سنانا تو لگا رہتا ہے۔" وہ ستائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مگر یہ کس طرح کی باتیں تھیں؟"

"یہ تیری سمجھ میں ابھی نہیں آئیں گی۔ بالوں کا رنگ بدلتا ہے، تب یہ نرم گرم سمجھ میں آتی ہے۔" وہ چوکی پر بیٹھ کے چلم کی آگ کریدنے لگا۔

"یہ تو بہت بے معنی، کچی، مشکوک اور فرسودہ باتیں تھیں۔"

"اسی طرح ہوتا ہے لاڈلے! کبھی اونچی، کبھی نیچی، کبھی سرد، کبھی گرم، جان بوجھ کے کچی پکی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ چلے گئے نا؟"

"ہاں چلے تو گئے لیکن پھر واپس آ سکتے ہیں۔"

"پھر چلے جائیں گے، پر اب انھیں آنے میں دیر لگ سکتی ہے۔"

"مجھے کہنے دو کہ تم نے یہ قدم اُٹھاتے ہوئے کچھ جلدی کی، زیادہ نہیں سوچا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "مجھے آثار اچھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"لاڈلے! میں نے تجھے اسی لیے گھر بھیج دیا تھا تاکہ تو اپنے دماغ پہ بوجھ نہ ڈالے مگر تو کانتے اور جامو کو چھوڑ کے یہاں آ گیا۔"

"میں اس لیے آ گیا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔"

"تو کیوں گھبراتا ہے رے! کچھ اور بات کر، بول جامو اور کانتے کا کیا حال ہے اور وہ گڑیا کیسی ہے؟ کیا نام ہے اُس کا؟...."

"میں صبح سے گھر نہیں گیا۔" میں نے تنک کے کہا۔

"پھر تو دن بھر کہاں رہا؟"

"یوں ہی گھومتا رہا۔"

"اب تو گھر جا کے سوجا، جب تک میں نہ آؤں اِدھر مت آنا۔ اب چلنے کی تیاری کرنا ہے۔ میرا خیال ہے، میں جلد ہی تیرے پاس آ جاؤں گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تمھیں بس ایک دو دن ہی میں چل دینا ہے۔ مجھے تو اب یہاں سے نکلنا ہی مشکل معلوم ہو رہا ہے۔"

"لاڈلے! ضرور چلیں گے۔ دل چھوٹا مت کر۔"

"اور ہاں!" میں نے بوکھلا کے کہا۔ "یہی ایس پی شکلا تھا۔" تجمل چپ رہا۔ "اُس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا ہو گا۔"

"جو تو سوچ رہا ہے، یہی وہ بھی سوچ رہا ہو گا۔ تو نے بات اُلٹی دل میں رکھی ہے، اُس نے تجھے نہیں دیکھا۔ تو نے اُسے اپنے آپ کو دکھا دیا۔"

"مگر وہ اس سے پہلے بھی تو مجھے دیکھ سکتا تھا اور میں بھلا اس موقع پر گھر کیسے رہ سکتا تھا۔ میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔"

"میں تیرے کہنے پر گھر میں بیٹھا رہتا۔"

"بالکل نہیں، تم تو گھر جاتے ہی نہیں۔"

"اب جانے دے، کون کیا کرتا، کیا نہ کرتا۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہر آدمی اپنی جگہ ہوتا ہے لاڈلے! آدمی ایک دوسرے کی جگہ بدل لیا کرے تو پھر یہ دنیا بڑی ہلکی ہو جائے۔"

"تم خفا ہو گئے۔ یقین کرو، میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔"

"لاڈلے! میری جان!" اُس نے مجھے دبوچ لیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تو کیا سوچ رہا ہے، پر تو اتنا مت سوچ میرے بلبل! یہ وقت تو گزرنا ہی تھا۔ تو دیکھنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھ پر اتنا شک کر، میری بات مان لے، گھر چلا جا۔ وہاں جامو اور کانتے بھی اکیلے ہوں گے۔ یہاں میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ شکلا تجھے نہ دیکھتا تو اچھا تھا۔ پر اُس نے تجھے اب دیکھ لیا ہے تو دیکھنے دے، سنڈلو، سے زیادہ یہی سمجھے گا کہ تو پاگل ہو گیا ہے۔"

"کچھ اور بھی سمجھ سکتا ہے۔ مجھے اب خیال آ رہا ہے کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

"اب خیال آنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ تیرے آتے ہی اُس کی زبان پہ تالا لگ گیا تھا۔ اس سے پہلے اُس نے ہم لوگوں کو بہت تنگ کیا تھا۔ تو سچ کہتا تھا، وہ اچھا اور سچا آدمی ہے۔"

"تمھیں یاد ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ شکلا نے مجھ سے اشارۃً تیواڑی کا ذکر کیا تھا۔ اُس نے نام تو نہیں لیا تھا لیکن وہ سلسلہ ملا سکتا ہے۔"

"ملا لے، کچھ اور وقت لگ جائے گا۔ میرے سر میں پہلے ہی یہ بات تھی لیکن اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم اتنے مطمئن کیوں ہو؟" میں نے جھلا کے کہا۔

"کیا تجھے میرا اطمینان بُرا لگتا ہے؟" وہ مسکرانے لگا۔

"نہیں، کچھ عجیب لگتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگا، مجھے اُس کی ہنسی بہت بُری لگی۔ اتنے میں پیرو آ گیا اور تجمل سے کچھ پوچھے بغیر اُس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ "کیا ہے تجمل بھائی! ابھی سالا کھانے دانے کا بھی کچھ ہونا چاہیے۔" وہ تجمل کے ہاتھ سے حقے کی نے لے کر کش لینے لگا۔ پھر بے تحاشا کھانسنے اور ہنسنے لگا۔

"تمھارے بس کا نہیں ہے پیرو۔" تجمل نے اُس کے منہ سے نے ہٹالی۔ "تمھارے لیے وہ سالی پری چھم چھاپ ہی ٹھیک ہے۔"

وہ دونوں آپس میں فضول باتیں کرتے رہے۔ جب کھانا آیا تو بہت سے لوگ آ گئے۔ سب کھانے پر ایسے پلے جیسے کئی دنوں کے فاقے سے ہوں۔ میں بھی لو نگتا رہا۔ صبح سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے دوران میں پیرو کے آدمی تجمل سے اصرار کرنے لگے کہ گوا یا رے چندنیا بائی آئی ہوئی ہے۔ آج رات اُسے بلا لیا جائے۔ تجمل نے جز بز ہو کے اجازت دے دی۔ پاڑے میں شور مچنے لگا۔ چمپی اور ماچھی فوراً چندنیا کو لینے چلے گئے۔ فرش پر سفید چاندنی بچھا دی گئی۔ میں نے تجمل سے مانی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے منع کر دیا اور مجھے تسلی دی کہ مانی کی پوری دیکھ بھال کی جا رہی ہے، اُس کی حالت صبح سے اچھی ہے۔

چندنیا جیسے تیار ہی بیٹھی تھی۔ وہ اُسے ایک گھنٹے کے اندر لے آئے۔ وہ بوٹے قد اور گندمی رنگ کی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ جُوڑا بندھا ہوا تھا اور کانوں میں پھولوں کی بالیاں لٹک رہی تھیں۔ ماچی اور اڈے کے دوسرے آدمیوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر بجھل نے مجھے ٹھہرنے نہیں دیا۔ میں خود بھی اب وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ گانا شروع ہونے سے پہلے میں وہاں سے چلا آیا۔ علاقے میں پولیس کا زور تھا۔ میں کچھ دُور تو گلیوں گلیوں راستہ طے کرتا رہا۔ پھر مین روڈ پر آکے بس میں بیٹھ گیا۔

گیارہ بجے سے پہلے میں گھر پہنچ گیا۔ جامو اور کانتے ڈرائنگ روم میں تیتپی کھیل رہے تھے۔ جولین، چمپا اور جولین کی ماں آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے انتظار میں کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جامو اور کانتے نے کھیل بند کر دیا اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے اشاروں میں انھیں بتایا کہ ابھی سنانے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن میرے اشاروں سے اُن کا اضطراب بڑھ گیا۔ جولین، چمپا اور جولین کی ماں نے بھی محسوس کر لیا کہ ہم لوگ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ یکے بعد دیگرے کھسک گئیں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ انھیں ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤں گا۔ پھر ارادہ بدل دیا اور دن بھر کی روداد جستہ جستہ سنائی۔ اُن پر کچھ اثر ہی نہیں ہوا۔ میرا جی چاہا کہ میں اُن کے منہ نوچ لوں۔ میں نے برگشتہ ہو کے تمام خطرے اُن کے کان میں ڈالے۔ جامو سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھا سنتا رہا۔ مجھے کچھ قرار آیا لیکن اُس کی سنجیدگی چند لمحے برقرار رہی۔ اُس نے منہ بنا کے زور سے سر جھٹکا اور جیسے میری تمام باتیں دوسرے کان سے اڑا دیں۔ میں نے اُسے پھر متنبہ کرنا چاہا تو وہ بھڑک گیا۔ بھڑک کے کہنے لگا "لاڈلے! ابے تُو نے بجھل بھائی کو کیا اُلّو کا پٹھا سمجھ لیا ہے۔ اپنی یاری اُس سے ایک سال سے اُوپر کی نہیں ہے۔ تُو نے تو اُس کے ساتھ ایک وقت گزارا ہے۔ پھر ایسی بے ازار بد باتیں کیوں کرتا ہے۔ کیس دیکھ لاڈلے!"

وہ تلملا کے بولا "پولیس گھن چکر بنی ہوئی ہے۔ سالا ہم ایک ایک آدمی چن چن کے انتظام کر آئے ہیں اور تیواڑی کی لاش بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ اُس کے دو تین آدمی بھی غائب ہیں۔ تین چار روز میں اپنے کچھ زخمی اچھے ہو جائیں گے اور اپنے اپنے اڈے پر واپس آ جائیں گے۔ باقی لوگ تو موجود ہی ہیں۔ پولیس کی ابھی نگاہ بھی نہیں جا سکتی کہ کون موجود نہیں ہے۔"

"اور اُن میں سے اگر کوئی اوچھا نکل گیا؟"

"ابے اُن میں ایک ساتھ دس اوچھے نکلیں تب بات بنے گی۔ ایک دو تو سالے سکوٹ کرتے رہ جائیں گے۔ اُن کو یقین ہے کہ ہم کو جانا ہے۔ پھر سارا حسن انھی پر برسے گا۔ وجہ بھی لاڈلے! ہم نے اتنے لوگوں کو اس لیے اکٹھا کیا کہ ایک تو تیواڑی کے اڈے پر زیادہ لوگوں کی وجہ سے کوئی حرامی بچ کے نہیں جائے گا اور تیواڑی کو زندہ پکڑنے میں بھی آسانی ہوگی، دوسرے اتنے بہت سے لوگ شامل ہوں گے تو کینہ پن کرتے ہوئے ساروں کی میا مرے گی۔ واردات بھی اپنی جگہ انیا ٹاک ہو گی اور پولیس بھی منہ دیکھتی رہ جائے گی۔ اس کیس میں ہر بات کا خیال رکھا تھا۔ اب دیکھ پولیس ناچ رہی ہے۔ وہ بجھل بھائی اور ہیرو پر ہاتھ ڈال کے دیکھیں، خوار ہوں گے۔ بس بابا اپنا مغز مت پلپلا کر۔ اس کے سوا کچھ ہوا تو سالی ہونی کو کون روک سکتا ہے، ہو جائے۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو گیا پیارے! وہ لوٹ نہیں سکتا۔ اب تھوڑے بہائیں کیا۔ جولی بہن!" اُس نے آواز لگائی "کھانا نکالو۔"

جامو نے کچھ کہنے کے لیے چھوڑا ہی نہیں تھا۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ اُس کی ایک یہی بات دل کو لگی کہ گزرے ہوئے وقت پر سر کھپانا فضول ہے۔ اُس نے یہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی تھی مگر وہ اور کہتا گیا۔ وہ یہ بات پریشانی سے بھی کہتا تو ایک ہی مطلب تھا۔ جامو کو بہت سی باتیں معلوم نہیں تھیں۔ وہ ایس پی شکلا کو نہیں جانتا تھا لیکن اگر اُسے تمام واقعات اور تمام سلسلے معلوم بھی ہوتے تو یہی کہتا۔ ہم ہیرو کو تنہا چھوڑ کے فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمیں یہیں رہنا تھا اور جو ہونا تھا، اُسے قبول کرنا تھا۔ اب کچھ بھی ہو جائے۔

میز پر کھانا لگاتے ہی جولین نے ہم سب کو بلا لیا۔ میں نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ میں تھوڑا بہت کھا کے آیا ہوں۔ میں بھی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میز پر بہت اہتمام تھا۔ جولین نے بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوش خوش تھی۔ صرف ایک دن میں وہ سب اتنے گھل مل گئے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ چمپا کو جولین نے ہمارے ساتھ ہی بٹھا دیا تھا۔ مجھے چمپا پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ سب اُسی کا کیا دھرا تھا۔ نہ وہ بجھل کو خط لکھتی، نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ کچھ دنوں بعد خط لکھ دیتی۔ بارہ بج چکے تھے لیکن وہ سب دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے۔ جولین کانتے کے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور کانتے اُس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اُسے گٹ پٹ سکھا دے۔ جولین میری طرف دیکھ کے کہنے لگی کہ ایک کو سکھایا تھا، بعد میں بہت شرمندگی ہوئی۔ کانتے مچلنے اور ضد کرنے لگا۔ آخر جولین کو وعدہ کرنا پڑا کہ وہ اُسے ضرور انگریزی سکھائے گی۔

"اور میں اپنی پیاری بہن کو سونے میں لاد دوں گا۔" کانتے جوش میں بولا "پھر میں بنگلا اور ہندی میں بات نہیں کروں گا۔ میں تو جولین کی طرح ایک میم لاؤں گا اور اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے گردن اٹھا کے لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ چلوں گا۔ دھاٹ یو ویل ترام پی تنا..."

جولین کی ہنسی کمرے میں کھنکنے لگی۔ وہ اتنے زور سے ہنسی جیسے اوپر سے کسی نے ڈھیر سی چوڑیاں زمین پر گرا دی ہوں۔ جامو نے اُلٹے ہاتھ سے کانتے کو طمانچہ رسید کیا۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ آنے والا کل جیسے انھوں نے خرید لیا ہو۔ وہ ٹھاٹ سے پاؤں پسارے چائے پی رہے تھے۔

جولین نے بہ اصرار انھیں اُن کے کمرے میں بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ مجھے بھی سلانا چاہتے تھے مگر میں ڈرائنگ روم کے صوفے پر لیٹ گیا۔ جولین کچھ دیر تک تو بیٹھی رہی۔ پھر جب میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی تو اُٹھ کے اندر چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا اور اپنی مالا گردن سے اُتار لی۔ میں نے اُس کے ایک ایک دانے کو خوب پیار کیا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

***

سویرے سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی سے مالا گردن میں ڈالی اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی۔ میں صوفے پر کروٹیں بدلتا رہا اور مجھے ایس پی شکلا کا خیال ستانے لگا۔ وہ نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ ممکن ہے وہ یہ سوچ رہا ہو کہ میں نے کرشنا جی کی دولت اِدھر اُدھر لٹانی شروع کر دی ہے۔ اُس کے ذہن میں یہ بات بھی آ سکتی ہے کہ تیواڑی کو ختم کرانے کے لیے میں نے کرشنا جی کی دولت سے آدمی خریدے ہوں گے۔ سب سے پہلا خیال اُس کے دل میں یہی آئے گا کہ ہیرو کے باپ سے میرے رابطے کا سبب یہی ہو سکتا ہے اور جب یہ بات اُس کے دل میں گھر کرے گی تو وہ کھوج لگاتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ اُسے سرا مل جائے گا تو کھوج لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میں نے طے کیا کہ وہ آئے گا تو میں اُسے بینک کے سارے کاغذات دکھا دوں گا کہ میں نے ایک پیسہ بھی بینک سے نہیں نکالا ہے۔ ابھی ہم نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہوئی۔ جولین نے آدھا کواڑ کھولا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جامو اور کانتے فوراً اُٹھ کے میرے کمرے میں چلے گئے۔ دروازہ کھلنے میں ذرا سی دیر ہوئی۔ ایس پی شکلا عام لباس میں اندر داخل ہوا۔ میں اپنی نشست سے اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ شکلا کی آنکھیں سُرخ تھیں اور چہرہ بجھا ہوا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ جولین اور چمپا اُس سے اُس کے گھر والوں کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔ وہ انھیں سرسری جواب دے رہا تھا اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُن دونوں نے بھی اندازہ کر لیا کہ شکلا آج پریشان پریشان ہے اور شاید اسی خیال سے وہ ہٹ گئیں کہ صبح صبح اُس کے آنے کا کوئی خاص ہی مقصد ہو سکتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ وہ بیٹھی رہیں۔ پھر مجھے جامو کی بات یاد آ گئی کہ ایک آدمی، دوسرے آدمی کو زیادہ سے زیادہ کیا سزا سنا سکتا ہے۔ میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "کیا تم وہی ہو جسے میں نے کل رات دیکھا تھا؟" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

کچھ اور کہنے سے پہلے وہ میری صورت دیکھنے لگا۔ اُس کی پلکیں لرز رہی تھیں "یہ کیا... کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"آپ کو پورا اختیار ہے شکلا جی!" میں نے مایوسی سے کہا۔

"عہدے کا اختیار یا اپنا؟"

"دونوں لیکن اس وقت آپ گھر آئے ہیں۔"

"میں تمھیں کس نام سے پکاروں؟"

"کسی بھی نام سے جو آپ کو اچھا لگے۔"

"یہ میں نے کیا دیکھا تھا؟" وہ کرب سے بولا۔

"آپ نے راجا کو دیکھا تھا۔ ظہیر خاں عرف راجا عرف......"

میں نے اپنی زبان منہ میں دبا لی۔ "شکلا جی! آپ نے راجا کو دیکھا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" اُس کی آواز کہیں دُور سے آئی۔

"میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

"ظہیر خاں!" اُس کی آنکھیں کسمسانے لگیں "تم وہاں کب پہنچ گئے؟"

"بہت دن ہوئے۔"

"مگر کیوں؟" اُس کی گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔

"بس یوں ہی۔ مجھے تھوڑا بہت چاقو چلانا آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے دھندے کے طور پر کیوں نہ اختیار کیا جائے۔"

"غلط! تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تمھیں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے مدراس میں تمھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں تو اپنے گھر اور ملاقاتیوں میں تمھارا حوالہ دیتا تھا۔"

"اب مت دیجیے گا۔ تردید کر دیجیے گا کہ جو کچھ آپ نے میرے بارے میں کہا تھا، سب غلط تھا۔"

"نہیں، نہیں۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا لیکن میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم سے کسی ایسی جگہ ملاقات ہو جائے گی۔"

"شکلا جی! مجھے اندازہ تھا کہ آپ پہلی فرصت میں میرے پاس آئیں گے اور مجھ سے ایسی باتیں کریں گے لیکن میرے پاس آپ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے یا یوں سمجھیے کہ میں آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتا۔"

"مجھے احساس ہے کہ میں کرشنا جی نہیں ہوں لیکن میں اُن کا ایک خادم تھا۔ میں تمھارے بارے میں اُن کی طرح نہیں سوچ سکتا لیکن یقین کرو کہ میں رات بھر نہیں سویا۔ مجھے بار بار اپنی آنکھوں پر دھوکا ہوتا رہا۔"

"کیوں شکلا جی! کیا وہ لوگ آدمی نہیں ہیں؟"

"وہ لوگ آدمی ضرور ہیں مگر کرشنا جی ہوتے تو اُن کے درمیان تمھیں دیکھ کے اُن کا سینہ بھی جلنے لگتا۔ تم تو بہت اچھے لڑکے ہو ظہیر خاں! کرشنا جی اپنے دل میں تمھارے لیے کیا کیا اُمیدیں رکھتے تھے۔ میں پوچھتا ہوں تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ تمھارے پاس کمی کس چیز کی تھی؟ تمھیں ایسی کون سی ضرورت وہاں کھینچ لے گئی؟ اگر مجھے یہ سوال کرنے کا حق پہنچتا ہے تو تم جواب دو۔ میں وجہ جاننا چاہتا ہوں؟" میں اُسے کیا وجہ بتا سکتا تھا، وجہ شاید وہ خود بھی جانتا ہوگا۔ پھر میرے ہی منہ سے سننے کی اذیت کا خواہش مند کیوں تھا۔ "بولو ظہیر خاں! بولو۔ تم چپ کیوں ہو۔ مجھے جواب دو۔" میں سوچتا ہی رہا کہ اُسے کیا جواب دوں۔

"سنو ظہیر!" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔ "میں آج سے طویل رخصت پر جا رہا ہوں۔ یہ کاغذ ہے۔ چاہو تو اسے پڑھ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے گھبراہٹ سے کہا۔

"یہ چھٹی کی درخواست ہے۔ اس کے بعد شاید میں پولیس میں واپس بھی نہ آؤں۔ مجھے اپنے بارے میں اب کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔"

"مگر آپ یہ کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ تم غور کرو تو اس کی وجہ تمھاری سمجھ میں آ جائے۔ اب میری تم سے ایک درخواست ہے۔ تم اسے حکم بھی سمجھ سکتے ہو اور منت بھی۔ تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ بہت دُور چلے جاؤ۔"

"کیوں شکلا جی؟" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس ظہیر خاں!" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "میری بات مان لو۔ میں کرشنا جی کی آتما سے معذرت کر لوں گا کہ جو کچھ انھوں نے مجھے سکھایا تھا، میں اُس کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ شاید اس سبب سے کہ مجھے اُن کے ساتھ رہنے کا کم ہی وقت ملا۔ ظہیر خاں! یہاں سے چلے جاؤ۔"

"مگر شکلا جی! کیوں؟"

"اس لیے ظہیر کہ کرشنا جی نے تمھارے بارے میں جو خواب دیکھا تھا، میں اُس کی تعبیر اُلٹی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں تمھیں کرشنا جی کا واسطہ دیتا ہوں۔ میں تو جا ہی رہا ہوں لیکن تم بھی ان لوگوں کو چھوڑ کے کہیں نکل جاؤ اور سب کچھ بھلا دینے کی کوشش کرو۔ پھر کبھی اُس طرف کا رُخ مت کرنا۔ جب اُنگلیاں ٹھیک کام کرتی ہوں تو چاقو اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اُنگلیوں سے قلم بھی چلایا جا سکتا ہے۔ اُنگلیوں سے بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں۔ ظہیر خاں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کس طرح بات کروں۔ تم نے رات کی گفتگو سُن لی ہو گی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ حالات کیا رُخ اختیار کریں لیکن میں تمھارے حوالے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ حالات بہت بگڑ بھی سکتے ہیں۔ راستے مسدود بھی ہو سکتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو؟"

"شکلا جی!" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "آپ نہ چھٹی کی درخواست دیجیے، نہ ملازمت ترک کرنے کا خیال کیجیے۔ اپنا کام کرتے رہیے۔ رہا میرا سوال تو میں یہاں سے بہت جلد چلا جاؤں گا بشرطیکہ حالات نے اجازت دی مگر ابھی نہیں جا سکتا۔"

"کیوں نہیں جا سکتے؟"

"میرے ساتھ کچھ مجبوریاں ہیں۔ انھیں مجبوریاں میں آپ کے خیال سے کہہ رہا ہوں حالانکہ مجھے ذمے داریاں کہنا چاہیے۔"

"کیسی ذمے داریاں؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

"کچھ ایسی ہی باتیں ہیں۔"

"ظہیر خاں! تم آگ میں بیٹھے ہوئے ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے سانس کھینچ کے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ شکلا جی کے علاوہ آپ کی ایک اور حیثیت بھی ہے اور بدقسمتی سے میری بھی۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی سخت مرحلے سے دوچار ہوں۔ ہم اپنی دوسری حیثیتیں یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے۔ آپ بھی میری مجبوری سمجھیں۔ آپ بھی صاف بات کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں اور میں بھی کوئی ایسی بات کرنا نہیں چاہتا جس میں آپ سے اپنے تعلق کی بنا پر کسی رعایت طلبی کا پہلو نکلتا ہو۔"

"تم کیسی سمجھ بوجھ کی باتیں کر رہے ہو۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "تم ایسے نہیں ہو سکتے۔ میں رات کو بھی تمھارے پاس آ سکتا تھا لیکن جب میں یہ کاغذ لکھنے میں کامیاب ہو گیا تب میں نے تمھارے پاس آنے کا فیصلہ کیا۔"

"آپ اپنے کام پر جائیے شکلا جی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے کبھی کوئی سوال نہیں کروں گا۔ میں کنٹرول توڑ کے آپ کے سامنے آؤں گا۔"

"نہیں ظہیر! نہیں۔ میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔ تم میرے لیے کرشنا جی کا ورثہ ہو۔ کرشنا جی میرے بہت محترم تھے، وہ مجھے بہت عزیز تھے۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے تمھارے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔" شکلا نے آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ "ظہیر! میں اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہا ہوں۔ میں کام نہیں کر سکتا۔"

"پھر آپ مجھے کمزور کر دیں گے۔"

"مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر لگی ہے اور تمھاری باتیں سُن کے اب اس فیصلے کی توثیق بھی ہو گئی ہے۔"

"میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس میں آپ کے فیصلے کی توثیق کا کوئی مفہوم پوشیدہ ہو۔" میں نے تندی سے کہا۔ "میں تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اپنا فیصلہ بدل دیجیے۔ بھول جائیے کہ آپ نے مجھے وہاں دیکھا تھا۔ آپ کی دست برداری اور خاموشی غلط ہے۔"

"لیکن بڑی بُرائی سے چھوٹی بُرائی بہتر ہوتی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے، آپ نے اپنے ذہن میں کوئی حتمی رائے قائم کر لی ہے اور وہی آپ کی اُلجھن کا سبب ہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کی رائے درست نہ ہو۔"

"میں نے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی ہے۔ میں وردی پہن کے نہیں آیا ہوں، نہ میں نے تم سے یہ پوچھا ہے کہ کیا درست ہے اور کیا نادرست لیکن اگر یہ صحیح ہوا تو۔۔۔۔ تو؟"

"تو آپ اسے غلط ثابت کرنے کی مشکل میں نہ پڑیے گا۔ آپ کوئی لحاظ مت کیجیے گا۔" میں نے شکستگی سے کہا۔

"شاید یہ میں نہ کر سکوں۔" وہ آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے میں اپنی بات دُہرا رہا ہوں۔ میں یہ پُرزہ لے کے ہیڈ آفس جا رہا ہوں۔ تم۔۔۔۔ تم بھی ہو سکے تو اُدھر مت جانا۔ میں تم سے یہی کہہ سکتا ہوں۔ سوچ لینا ظہیر اور ہو سکے تو مان لینا۔"

یہ کہتے ہی وہ اُٹھ گیا۔ مجھ میں اُسے روکنے کی ہمت نہیں تھی۔ اُس نے چمپا اور جولین کا انتظار بھی نہیں کیا۔ تیزی سے دروازہ کھول کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ موٹر چلنے کی آواز آئی تو میں بھاگ کے گلی میں پہنچا۔ اُس کی موٹر نکل چکی تھی۔

میرے خون کی گردش رُک گئی تھی۔

اُدھر وہ گیا اِدھر جامو اور کانتے نے مجھے آ کے گھیر لیا اور کریدنے لگے کہ ایس پی شکلا کیا کہنے آیا تھا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ وہ کچھ کہتے نہیں، کچھ سنانے آیا تھا۔ بیان لینے نہیں، بیان دینے آیا تھا۔ میری خاموشی پر وہ ناراض سے ہونے لگے تو میں نے انھیں ساری بات بتا دی کیونکہ ان باتوں کا تعلق اُن سے بھی تھا۔ وہ کچھ سوچنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری طرح اُن کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے سر اُٹھا کے اُن کی طرف دیکھا۔ جامو کا سر جھک گیا تھا۔ کانتے بھی اپنی آنکھیں مسل رہا تھا۔ جولین نے اُن کے سامنے چائے لا کے رکھ دی۔ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔ وہ خاصی دیر اسی طرح گُم سُم بیٹھے رہے۔ پھر جامو نے سر اُٹھایا اور بوجھل آواز میں بولا۔ "لاڈلے! مجھے بتا تو کس نتیجے پر پہنچا ہے؟"

"یہ تم نے عجیب بات کہی جامو بھائی!" میں نے زہرخند سے کہا۔

"دیکھ لاڈلے! اور باتوں کے سوا ہم کو اس وقت پہلے نتیجہ دیکھنا ہے۔ تیری باتوں سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلے سُن لینا۔ چرا چری بعد میں کرنا۔ پہلی بات تو یہ ہے، شکلا کو پتہ چل گیا ہے کہ پرسوں رات واردات سالی کس نے کی تھی۔ اب وہ تجھ کو جتانے اور مشورہ دینے آیا تھا کہ ابھی وقت ہے تو اُڑن چھو ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔ اب ذرا تصویر اُلٹ کے دیکھ۔ اُدھر کورا کاغذ ہے۔ بالکل چٹیل میدان، کوئی گھاس پھوس نہیں، کچھ نہیں لکھا، کوئی لکیر نہیں پڑی۔ ایس پی نے کل رات تجھے ہیرو کے اڈے پر دیکھا تو تصویر کے کوری طرف اُسے کچھ دکھائی دینے لگا۔ اپنا آدمی بیچ میں نظر پڑ جائے تو سالا ایسا اپنے آپ ہونے لگتا ہے۔ شکلا کے سر میں شک بھر گیا۔ شک کیا، خوف بھر گیا کہ کہیں تو تو ان لوگوں میں شریک نہیں ہے۔ اس کو پتہ ہے کہ تیواڑی اور اُس کے آدمیوں نے کرشنا جی کو ختم کیا ہے۔ اس لیے اُس کے شک کو اور ہوا لگی اور وہ شک کی حالت میں تیرے پاس آیا کہ تجھے ہوشیار کر دے۔ مطلب یہ کہ وہ دو حالتوں میں سے ایک میں تیرے پاس آیا۔ شک کی یا یقین کی۔ دونوں میں اُس کے لیے مرن ہی مرن تھا۔ سو اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اب ہم کو یہ جانچنا ہے کہ وہ کس حالت میں تیرے پاس آیا۔ لاڈلے! یقین کی بات ہوتی تو ایک تو اُس کی باتوں کا رنگ دوسرا ہوتا، دوسرے واردات کے بارے میں جو میں نے تجھ سے مغزماری کی تھی، اب بھی وہی کہتا ہوں۔ تو کہتا ہے کہ تو نے مجھل بھائی کو شکلا کے بارے میں بول دیا تھا۔ مجھل بھائی کے سر میں ایس پی شکلا کا دھیان ضرور ہو گا۔"

وہ خاموش ہو گیا اور اُس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے انڈیل لی۔ میں حیرانی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں خود سے باتیں کر رہا ہوں۔ "تم نے تمام۔۔۔۔"

"ابھی نہیں۔" اُس نے مجھے بات نہیں کرنے دی۔ "ابھی میری بات ادھوری ہے۔" وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا۔ "تو نے شکلا سے ہٹ کی کہ وہ عرضی واپس لے لے۔ اُس نے منع کر دیا۔ ہم شکلا سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہمی تھے اور ہمیں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ یہ جاننے کے بعد بھی اپنی جگہ کام کرنا نہیں چاہتا۔ سمجھا لاڈلے! اب اپنی طرف آ جا۔ ہم تو جیل جانے کے بعد جیل سے نکلنے کا ہر جتن کرتے رہیں گے اور شکلا بھی سامنے آیا تو گردن ہلاتے رہیں گے۔" جامو زور زور سے نفی میں گردن ہلانے لگا۔ "ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تو تو پڑھا لکھا ہے۔ اگر تجھے کچھ دکھائی دے رہا ہے تو مجھے بتا دے۔ شکلا کو اتنا خیال تو ہو گا اور ہونا چاہیے کہ ہم نے یہ سب کیوں کیا ہے۔ اب تو کچھ بولنا چاہے تو بے دھڑک بول۔ میں نے اپنی بات ختم کر دی ہے۔"

میں نے جامو کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

اُس دن میں دن بھر گھر ہی رہا۔ رات کو تھوڑی دیر کے لیے مجھل کے پاس گیا تو وہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ کل والی طوائف نہیں تھی، کوئی دوسری لڑکی تھی، دُبلی پتلی۔ اُس کی آواز سُریلی تھی۔ سب گُم تھے اور وہ چوکی کے سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی تھی ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

میرا جی چاہا کہ میں وہیں بیٹھ کے سُنتا رہوں مگر جب اُس کے گھنگرو بجے تو مجھے نمی یاد آنے لگی۔ میں مجھل کو ایس پی شکلا کی بابت کچھ نہ بتا سکا۔ صرف چند باتیں ہو سکیں۔ جب میں چلنے لگا تو دروازے کے پاس ہیرو نے میرے سر پہ نوٹوں کی گڈی رکھ کے مجھے روک لیا۔ مجھل نے اُسے آواز دی مگر ہیرو مگن تھا۔ لڑکی ناچتی گاتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اُس کی پیشانی اور گالوں پر ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے آنکھیں میچ لیں اور کھڑے کھڑے ہانپنے لگا۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ لڑکی گاتی رہی۔ جیسے ہی اُس نے میرے بال پکڑ کے سر سے نوٹوں کی گڈی اُٹھائی، میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکرا رہی تھی اور ہیرو قہقہے لگا رہا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔ دُور تک اُن کے قہقہے سنائی دیتے رہے۔

پاڑے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے باہر کھڑے ہوئے لوگوں سے احتیاطاً پوچھ لیا تھا کہ اندر پولیس تو موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ

پولیس آج سارا دن نہیں آئی البتہ علاقے میں اُس کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ جب میں گھر پہنچا تو رات زیادہ ہو گئی تھی۔ جولین ڈرائنگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ میں دن میں دیکھ چکا تھا کہ پرسوں رات کی واردات کے بارے میں کیا کیا خبریں چھپی ہیں۔ جولین کے خیال سے میں نے اخبار صوفے کے نیچے پھینک دیا تھا لیکن وہ اُس کے ہاتھ لگ گیا۔ آج کی خبروں میں سب سے نمایاں جبراسی واردات کی تھی۔ اخبار نے مرنے والوں کے نام اور اُن کی روداد شائع کی تھی کہ اُن میں کون کتنی بار کس کس جرم میں جیل گیا۔ اُس نے اسے اپنی نوعیت کی سب سے منفرد اور سنگین واردات قرار دیا تھا اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی تھیں۔ ایک جگہ سرسری طور پر کرشنا جی کا ذکر بھی تھا۔ لکھا تھا کہ اس موقع پر وہ بہت یاد آرہے ہیں۔ اخبار میں چھپنے کے بعد ہر بات الوکھی اور حیرت انگیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ واقعہ بھی اخبار نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تھا اور توقع ظاہر کی تھی کہ جلد ہی اہم انکشافات ہونے والے ہیں۔ اخبار میں ایک اور تازیانہ کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں پولیس کی ناکامیوں پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا۔ جولین کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اُس نے خبر ضرور پڑھ لی ہے۔ جامو اور کانتے زخمی حالت میں اُس کے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ صبح ایس پی شکلا آیا تھا پھر جامو اور کانتے دن بھر آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے تھے۔ تجمل غائب تھا۔ جب میں واردات والی صبح منہ اندھیرے واپس آیا تھا تو میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ سوچنے کے لیے جولین کے پاس بہت کچھ تھا۔ میں نے اُس سے رسمی بات کی اور جلد ہی سے اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ دونوں ابھی جاگ رہے تھے۔ میں کانتے کے پاس ہی لیٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ جب دروازہ بند ہونے کی آواز آئے گی تو ڈرائنگ روم میں جا کے سو جاؤں گا۔ میں نے دیکھا تھا، اُس کی آنکھیں آئی ہوئی تھیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اُس کے سارے آنسو نچوڑ لیتا۔ وہ ہنستی ہوئی بالکل پھول کے مانند کھل جاتی تھی۔ اُس کی ہنسی چھلکتی تھی۔ جی چاہتا تھا وہ ہمیشہ ہنستی رہے۔ ہنستے ہوئے اُس کے دانت اس طرح جگمگاتے تھے جیسے اُس کے منہ میں دودھیا روشنی بھر گئی ہو۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اُس کے پاس جاؤں اور کہوں کہ تم کیوں روتی ہو۔ دو دو ہمت مگر میں سوچتا ہی رہ گیا۔ بہت دیر بعد آہٹ ہوئی۔ میں دبے قدموں وہاں پہنچا۔ پہلے میں نے جھانک کے اطمینان کر لینا چاہا۔ وہ ابھی تک موجود تھی۔ اُس کا آدھا بدن چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، چہرہ اُوپر اٹھا ہوا تھا۔ میں دیکھتا رہا اور رینگتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ پھر دوبارہ آہٹ ہوئی لیکن میں پلنگ پر پڑے پڑے اندھیرا گھورتا رہا۔

پانچویں دن وہ زخمی اپنے باڑے واپس آگئے جن کے زخم معمولی تھے اور جن کی حالت ابھی ٹھیک نہیں تھی، وہ ابھی تک چھپے ہوئے تھے۔ مارٹی کا حال پہلے سے اچھا تھا۔ اُس کا زخم خشک ہو رہا تھا۔ میں اُسے دیکھنے گیا تو وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ مارٹی کے ساتھ دو ایک زخمی اور تھے۔ اُن کے قریب پھلوں کا انبار تھا۔ ایک آدمی اُن کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ پیرو کے علاقے کا خاص ڈاکٹر روز رات کو انھیں دیکھنے آتا تھا۔ اس اثنا میں پولیس افسروں کا زور کچھ بڑھ گیا۔ میں نے اپنا زیادہ وقت گھر پر ہی گزارا۔ جولین جامو اور کانتے کی ڈریسنگ کرتی تھی۔ کانتے کی پیشانی اور کان کا زخم بھر گیا تھا۔ البتہ تھوڑی خشک ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔ جامو کے بازو میں چاقو لگا تھا۔ وہ دیسی دواؤں سے اپنا علاج خود کر رہا تھا۔ جولین کی ماں بازار سے سودا لینے جاتی تھی تو اُن کی دوائیں بھی لے آتی تھی۔ اخباروں میں روز خبریں چھپ رہی تھیں۔ ہر طرف تیواڑی کی تلاش جاری تھی۔ اب خبروں کا رجحان تیواڑی کی گم شدگی یا فرار کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اُس کے باقی آدمی بھی بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ بہت سوں نے پیرو کے باڑے میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ پیرو نے کہہ دیا کہ وہ کچھ عرصے بعد ادھر کا رُخ کریں۔ تیواڑی کا علاقہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ پولیس کی موجودگی کے باوجود علاقے میں لوٹ مار کے واقعات ہونے لگے تھے۔ پولیس نے ہر طرف گرفتاریاں کی تھیں، چند ہی آدمیوں کو چھوڑا تھا۔ وہ پیرو کے باڑے کے کچھ اور آدمی پکڑ کے لے گئے تھے۔ شعلا استاد ابھی جیل میں تھا۔

ایس پی شکلا اس کے بعد گھر نہیں آیا، نہ ہی وہ اُن افسروں میں شامل تھا جو بار بار پیرو کے باڑے آتے تھے اور ہر بار نئے نئے سوال اُٹھاتے تھے۔ میں نے جولین کو اسکول جانے سے روک لیا تھا۔ جس دن سے اُس نے خبر پڑھی تھی، اُس دن سے وہ گُم سُم ہو گئی تھی۔ کانتے اُسے ہنسانے کی کوشش کرتا تو وہ دبی دبی کھنچی کھنچی ہنسی ہنستی تھی۔ چمپا بھی چپ چپ رہتی تھی۔ یا تو نماز پڑھتی رہتی یا مصلّے پر بیٹھی تسبیح گھماتی رہتی۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ اب تنہائی کے چند لمحے بھی مشکل سے نصیب ہوتے تھے۔ رات کو وہ لوگ دیر تک جاگتے رہتے تھے۔ آدمی مر جائے تو اُس کے پاس جانا آسان ہوتا ہے۔ زندہ لوگوں کے پاس جانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ نہیں ملتی تھی لیکن میں اپنے کمرے میں بند ہو کے کسی نہ کسی طرح اُسے بلا لیتا تھا۔ اُس کی پرچھائیاں وہاں آجاتی تھیں۔ میں اُس کی مالا کے دانوں میں اُس کی خوشبو سونگھ لیتا تھا۔ اب تو گردن سے مالا نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ لوگ ہر وقت سامنے رہتے تھے۔ دل ہر وقت اُڑا اُڑا رہتا تھا۔ کسی سے بات کرنے کو طبیعت نہیں کرتی تھی اور سب سے بات کرنی پڑتی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ دن کب ختم ہوں گے اور وہ کون سا دن ہوگا جب کوئی دیوار سامنے نہیں رہے گی۔

رات کے وقت میں روز باڑے جاتا تھا اور جلد ہی واپس آجاتا تھا۔ چھٹے دن رات کو میں تجمل کے پاس خاموش بیٹھا تھا کہ تِڈا اور لکھے بھاگتے اور ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ "دادا! — دادا!" تِڈے نے آتے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "دادا! — وہ ..... وہ اپن کا زورا کو اریسٹ کر کے لے گیا۔" تِڈے نے بدحواسی سے کہا۔ "پولیس کا لوگ راجا جی کو بولتا تھا، زورا بولا، راجا نے پارٹا اپن کو دے دیا ہے۔ راجا اس ٹائم نئیں ہے۔ جب بولو اُودر چلا چلے گا۔ ابھی کوئی اس باڑے کا بات کرنا ہو تو اپن سے کرو۔ وہ سالا زورا کو لے گیا دادا!"

تجمل کے ہاتھ میں بھری ہوئی چلم تھی۔ دفعتہً تِڈے کی ہولناک چیخ کمرے میں گونجی۔ تجمل نے چلم اُس کے منہ پر کھینچ ماری تھی۔ فرش پر چنگاریاں بکھر گئیں۔ تِڈا اپنا منہ کھسوٹنے اور بری طرح چلانے لگا۔ "ماچھی!" تجمل کی گرج دار آواز پر ماچھی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ماچھی! اس کتے کے پلّے کو اُلٹا لٹکا دے۔ سویرے تک اس کو بات کرنا آجائے گا۔" تِڈا چیختا چلّاتا رہا لیکن ماچھی اُسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ہر سُو سکوت مسلط ہو گیا تھا۔ چند لمحوں بعد تجمل کی بپھری ہوئی آواز نے یہ خاموشی توڑی۔ وہ لکھے سے مخاطب تھا۔ "لکھے! اچھا ہوا کہ تُو نے زبان نہیں کھولی۔ سالو! تم اپنی سسرال والوں سے گھبراتے ہو۔ پیرو! یہ گدھے کے بچے بدمعاش بنتے ہیں۔ ان لفنگوں کو اتنا نہیں معلوم کہ ہتھکڑی چاقو والے کا زیور ہے اور جیل خانہ" وہ بلند آواز سے بولا۔ "جیل خانہ سسرال ہے۔ جن کو یہ رشتے بھی نہیں معلوم وہ حرام کے تخم زنشہ بن جاتے ہیں۔"

"تجمل بھائی! غصہ تھوک دو۔" پیرو دھیمے لہجے میں بولا۔ "یہ سب سالا ایک دم ٹٹو کا دم ہے۔ یہ بمبئی ہے۔ سالا ہر اونگا بونگا دادا بننے کے شوق میں ایدر آجاتا ہے۔ جیسے سالا دادا نئیں ہوا، پچڑی مار ہو گیا۔ سرکس کا جوکر ہو گیا۔" وہ تھوک کے بولا۔

تجمل نے اُسی وقت پیرو کے خاص آدمی گُلیا کو ہدایت کی کہ وہ لکھے کے ساتھ زورا کے باڑے میں جا کے کہہ دے کہ زورا گیا، سارا باڑا چلا جائے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ہم لوگ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جاتے جاتے اُس نے لکھے کو آواز دی۔ "لکھے! چھیدا سے بول دینا کہ حوالات میں زورا سے جا کے مل لے اور بتا دے کہ خبر ہو گئی ہے۔"

لکھے سراپا لرز رہا تھا۔ اُس نے سر جھکایا اور گُلیا کے ساتھ فوراً باہر نکل گیا۔ تجمل کے کہنے سے پہلے ہی میں بھی وہاں سے چل دیا۔ دوسرے دن دوپہر کو پولیس نے پیرو کو گرفتار کر لیا۔ رات کو جب میں حسب معمول علاقے پہنچا تو باڑے سے کچھ دُور ہی مجھے یہ اطلاع مل گئی۔ میرے پیر زمین سے اکھڑنے لگے۔ سنبھل سنبھل کے میں نے عمارت میں قدم رکھا۔ تجمل کو جلد سے جلد دیکھنے کی خواہش میرے سینے میں آندھی کی طرح اٹھی تھی مگر

میں سب سے پہلے میری نظر اُسی پر پڑی۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے چوکی کے درمیان میں بیٹھا تھا۔ اِردگرد لوگ جمع تھے۔ خلافِ توقع وہ بہت خوش خوش نظر آرہا تھا اور کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ جیسے ہی میں اُسے دکھائی دیا، اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ اُس کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ پرے ہٹ گئے۔ میں نے اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ اُس نے کھینچ کے مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ "سب خیریت ہے؟" میں نے مضطربانہ پوچھا۔

"ہاں" وہ سرسری انداز میں بولا۔

"کوئی نئی بات؟"

"وہ تُو نے باہر سُن ہی لی ہوگی۔"

"کیا؟" میں نے جان بوجھ کر تعجب کا اظہار کیا۔ میں پیرو کی خبر اُسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ میری صورت دیکھ کے وہ انگڑائی لینے لگا۔

"تیری یہی مرضی ہے کہ میرے منہ سے سُنے تو سُن۔ پیرو چلا گیا ہے۔" وہ تیزی سے انگلیاں کھولنے اور بند کرنے کی مشق کرتے ہوئے بولا۔

"پھر—؟" میں نے تجسس سے کہا۔

"پھر کیا، پھر" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اب چلنے کی تیاری کر۔ انداز ذرا سا ٹیڑھا ہو گیا۔ دیر زیادہ ہو گئی۔ اب کوئی کام رہ گیا ہو تو جلدی سے نمٹا لے۔"

"تم..... تم ہوش میں ہو؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ہوش میں ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بولا۔ "اب کیا یہیں بیٹھا رہے گا رے! چلنا نہیں ہے کیا؟"

"مگر ہم کیسے جا سکتے ہیں۔"

"اب دیر کیا رہ گئی ہے۔ تھوڑا سا کام اور ہے۔"

"ابھی پیرو بند ہے۔" میں نے تلملا کے کہا۔

"وہ بھی آجائے گا۔ منہ کا مزہ بدلنے گیا ہے۔ کبھی کبھی یہ کسرت ہوتی رہنی چاہیے۔ مجھے بھی دن بہت ہو گئے۔" وہ کسمساتے ہوئے بولا۔

میں نے نہیں پوچھا کہ پیرو کب اور کیسے آجائے گا۔ وہ کسی بنیاد ہی پر یہ بات کہہ رہا ہوگا۔ میں نے اُس سے ضد بحث بند کر دی تھی جو وہ کہتا تھا، میں سُن لیتا تھا کیونکہ اُس سے کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ کوئی اور بات نہ ہو جائے۔ جو وہ کہہ رہا ہے، سچ ثابت ہو جائے۔ مجھے اپنی دعاؤں سے ڈر لگتا تھا اس لیے میں نے دعا نہیں مانگی۔ میری زبان ہی کالی تھی۔ بمبئی چھوڑنے کے خیال سے میری رگوں میں خون اچھلنے لگا۔ رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔

"ہم کب تک چل سکیں گے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"اب دن اور وقت کی بابت تو میں تجھے نہیں بول سکتا۔ پر جلد ہی لاڈلے! مجھے پتہ ہے کہ تُو یہاں سے نکلنے کے لیے کتنا بے چین

ہوگا۔ بس کچھ دن اور ٹھیر جاؤ۔"

"تمھیں اندازہ ہے کہ میں کس طرح . . . ."

"ہاں ہاں" اُس نے مجھے ٹوک دیا۔ "انتظار کرلا ڈلے!"

"اور کیا ہو رہا ہے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"زندگانی انتظار ہی انتظار ہے۔ اچھے دن، اچھی رُت کا انتظار، بچھڑے ہوؤں کا انتظار، بچپن سے جوانی کا، جوانی سے بڑھاپے کا انتظار اور موت کا انتظار۔" وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔

جامو اس قابل تھا کہ باڑے جا سکے۔ دوسرے دن میں پہلی بار اُس کے ساتھ وہاں پہنچا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پیرو وہاں بیٹھا تھا۔ کمرے میں پیرو کے تمام خاص خاص آدمی موجود تھے۔ زورا اور چھیدا بھی تھے۔ جامو کو دیکھ کے سب اُس کی طرف دوڑ پڑے اور اُس سے گلے ملنے لگے۔ بجھل بھی اپنی نشست سے اُٹھ کے آگیا اور جامو کو لے کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ پیرو جامو کو دیکھے ہوئے تھا اور اُس سے وہی بات کہہ رہا تھا جو ایک بار اُس نے مجھ سے کہی تھی۔ جامو بجھل کی طرف دیکھ کے مسکرانے لگا۔ بجھل نے پھر معذرت چاہی۔ "آئیں گے پیرو دادا! پھر آئیں گے۔ اب جانے دو۔ اب ہم لوگ کے اِدھر رُکنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اگر ایسا سمجھتے ہو تو کہہ دو۔"

"نئیں بجھل بھائی؟" پیرو اضطراب سے بولا۔ "ابھی اپن سالا سب سنبھال لے گا۔ اس بار تمھارے رُکنے کو نئیں بولتا۔ اپن کا مطلب کچھ اور ہے۔ اُکھا دن تو سالا اُٹھک بیٹھک میں خلاص ہوگیا۔ اپن نہ تم سے ٹھیک بول سکا، نہ تمھارے پاس بیٹھ سکا۔ ابھی کچھ ٹائم دو تاکہ پیرو اپنے بجھل بھائی کو سیٹی کا جلوہ شلوہ دکھاتے۔"

"وہ بعد میں ہو جائے گا پیرو دادا! ہم کو بہت کام پڑا ہے۔"

"کام سالا ہوتا رہے گا۔" پیرو مچل کے بولا۔ "تم کوئی روز روز ادھر آتا ہے۔ اپن کی بات پہ نامت بولو۔ بولو ہاں، ہاں، ہاں۔" اُس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔

"ہاں کیسے بول دے پیرو!" بجھل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور پیرو کو سمجھانے لگا مگر سامنے بیٹھے ہوئے آدمی بھی پیرو کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اُن کی باتیں میرے پلّے بالکل نہیں پڑ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ مجھے سُنانے کے لیے کہہ رہے ہوں اور مجھے چھیڑ رہے ہوں یا بہلا رہے ہوں۔ ممکن ہے بجھل نے پہلے سے کہہ رکھا ہو کہ جب میں آؤں تو وہ میرے سامنے اس قسم کی باتیں کرنے لگیں۔ اس طرح کچھ وقت اور نکل جائے گا۔ پرسوں رات زورا، کل دوپہر پیرو بکڑ گیا۔ اُن کی واپسی اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ اب کچھ باقی نہیں رہا۔ پیرو کے اصرار اور بجھل کے انکار کا سلسلہ دیر تک جاری رہا

تا آں کہ درمیان میں جامو کو دخل دینا پڑا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ ہم چند دن اور ٹھیر جائیں گے۔ جامو کی یقین دہانی پر وہ سب نعرے لگانے لگے اور پیرو نے جامو کے گالوں کی چُٹکی لے لی۔

کمرے میں شور مچا ہوا تھا۔ ہر شخص زور زور سے بول رہا تھا، گالیاں دے رہا تھا اور ایک دوسرے کو گھونسے مار رہا تھا اور گلے مل رہا تھا۔ مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ سب دل سے یہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ میری حیرت اُس وقت کچھ اور سوا ہو گئی جب کمرے میں بجھل کی آواز پر سکوت طاری ہو گیا۔ اُس کے مخاطب سبھی لوگ تھے اور وہ باڑوں کے انتظام اور تقسیم پر کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارے آنے سے پہلے اُن کے درمیان کچھ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تیواڑی کے باڑوں پر ہاتھ ڈالنے کا وقت نہیں آیا ہے لیکن کچھ عرصے بعد یہ سب پیرو کے پاس آ جائیں گے۔ راجا کے دونوں باڑے بھی اب پیرو کے باڑے میں شمار ہوں گے۔ بجھل، جامو، کانتے اور راجا تیواڑی سے ملنے والے باڑوں میں سے کسی کے دعوے دار نہیں ہیں۔ یہ سب پیرو کے ہیں اور پیرو کو اختیار ہے کہ وہ کسے کون سا باڑا دے۔

اس موقع پر پیرو اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تیواڑی کا باڑا تمھارا ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔ "یہ بھی تمھارا ہے۔ سب تمھارا ہے بجھل بھائی! تم اِدھر رُک کے بولو۔"

بجھل نے پیرو کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اُس کا بازو پکڑ کے بولا۔ "تم میں سے بہت سے آدمی باڑا سنبھالنے کی جان کاری رکھتے ہیں لیکن اصل جان کاری کیا ہے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ جس کا ہاتھ صاف ہے اور جس کا سر صاف ہے، وہی جان کار ہے۔ ہم کو خوشی ہوگی، اگر تم یہ سب اپنے پاس ہی رکھو۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ تم میں یہ کتنا سماتا ہے۔ تم سالا اُتھلے برتن نکلتے ہو یا کنواں بن جاتے ہو۔ بس ہم کو اتنا کہنا تھا۔"

یہ کہہ کے بجھل چُپ ہو گیا۔ پھر ایک دم پیرو اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی اپن کو بھی بولنے دو۔ سالا بجھل بھائی کے آنے کے بعد اپن کا کھوپڑی جھلی ہو گیا ہے۔ اپن بولتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے ہم سب لوگوں کا ہے۔ پیرو سالا تمھارے بغیر کچھ نہیں اور تم سالا ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہیں۔ ابھی اپن کے دل میں بلبلہ سا اُٹھتا ہے۔ پیرو اپنا باڑا چھوڑتا ہے۔ اپن یہ تم کو دینے کو بولتا ہے، بولو منظور ہے؟"

سب حیرت سے اُسے گھورنے لگے۔ کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر یہ سناٹا بھن بھناہٹ میں بدل گیا اور شور ہونے لگا۔ "نامنظور ہے۔" ماچھی نے پہل کی۔ سب نے چلّا کے اُس کی تائید کی۔

"پیرو بیں رہے گا۔" جامو نے ترشی سے کہا۔ "پیرو کو تمھاری ضرورت ہے اور تمھیں پیرو کی۔ تم نے پیرو کو کھو دیا تو تم نے سالا سب کھو دیا۔ اس

کو پکڑے رکھنا۔ اپنی بات یاد رکھو۔"

"ابھی جامو بھائی مسخری کرتا ہے۔" پیرو ہنسنے لگا۔

پھر اُن میں سے ہر آدمی بڑھ چڑھ کے مشورے دینے لگا کہ باڑوں کا انتظام کس طرح کیا جائے کہ آپس میں جھگڑے فساد کا امکان کم سے کم ہو جائے۔ ہر آدمی اپنی اپنی بولی بولنے لگا۔ ہم تینوں چُپ چاپ سنتے رہے۔ انھوں نے طے کیا کہ پیرو جسے چاہے گا، اپنی مرضی سے باڑے پر بٹھائے گا۔ اب چونکہ شہر کا بڑا حصہ ان باڑوں پر مشتمل ہو گا اس لیے مختلف آدمیوں کو باڑے تفویض کیے جائیں گے اور اُن کی مدت مقرر نہیں ہو گی۔ ہر باڑا اپنے دادا کے نام سے پکارا جائے گا لیکن ان کا نگراں پیرو ہو گا اور یہ بات پولیس سے پوشیدہ رکھی جائے گی۔ ہر باڑے سے آمدنی کا دسواں حصہ پیرو کے پاس آئے گا۔ پیرو اپنے پاس صرف ایک باڑا رکھے گا۔ ہر مہینے کی کسی ایک تاریخ کو تمام باڑوں کے دادا پیرو کے باڑے میں جمع ہوں گے اور کوئی پریشانی یا شکایت ہو گی تو پیرو کے سامنے رکھ دیں گے۔ پیرو کے پاس تمام باڑوں سے لیے ہوئے آدمیوں کا ایک خاص گروہ ہو گا جو کسی باڑے کے دادا کی مخالفت پہ اُس کے سر پہ پہنچ جائے گا۔ اُن میں سے ہر آدمی کی حیثیت دادا کے برابر ہو گی۔ کسی باڑے کی آمدنی کم ہے تو دسواں حصہ اُسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے بلکہ اپنی طرف سے اُس کی مدد کی جا سکتی ہے۔ ضرورت پڑنے پہ پیرو کی منشا کے مطابق داداؤں کا تبادلہ بھی ہوتا رہے گا۔ ہر باڑے میں چاقو زنی، اکھاڑے وغیرہ کا باقاعدہ انتظام ہو گا۔ آپس میں مقابلے ہوتے رہیں گے۔ اگر کوئی آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ دادا بننے کا اہل ہے تو اُسے سیدھے پیرو کے پاس آنا پڑے گا۔ پیرو اُس کے مقابلے کا انتظام کرے گا۔ جیتنے کی صورت میں آزمائشی طور پر پہلے اُسے کوئی چھوٹا باڑا دے دیا جائے گا، اگر اُس نے ٹھیک طرح باڑا چلایا تو اُسے کسی بڑے باڑے پر منتقل کر دیا جائے گا۔ ہر باڑا اپنے اپنے علاقے میں آزاد ہو گا۔ پیرو کی طرف سے محض مجبوری کے عالم میں دخل اندازی کی جائے گی۔ کوئی ایسی بات نہیں کی جائے گی جو داداؤں کی آزادی میں حائل ہو، جس سے اُن میں بددلی پیدا ہو، اُن کی ہمت شکنی ہو۔ وہ خود کو پیرو کا غلام سمجھیں۔ پیرو کے خاص آدمیوں کے گروہ کا کوئی آدمی پیرو کی اجازت کے بغیر کسی باڑے کے معاملات میں دخل نہیں ہو گا۔ اس انتظام کی بنیاد یہ تھی کہ باڑوں کے درمیان میل جول قائم رہے اور جو حاصل کیا گیا ہے، وہ آپس کے انتشار میں کھو نہ دیا جائے۔ چھیدا نے تجویز پیش کی کہ علاقے میں پھیلے ہوئے آدمیوں کے کام بھی طے کر دیے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ طاقت کے زعم میں بے لگام ہو جائیں اور جو کچھ اب تک نہیں ہوا ہے، وہ ہونے لگے اور تیواڑی کی طرح انھیں کسی بات کا خیال نہ رہے۔

وہ بار بار ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ بجھل گردن جھکائے حقہ پینے میں مصروف تھا۔ جامو کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا اور میرے سینے میں بلبلے اُٹھ رہے تھے۔

جب وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں تو یقیناً انھیں تیواڑی کے معاملے میں اب کسی بڑی الجھن کا اندیشہ نہیں ہے اور بجھل کی بات سچ ہے کہ اب جانے کا وقت آگیا ہے۔ اب میری آنکھیں میرے پاس ہوں گی اور میں انھیں اُسی کے لیے وقف کر دوں گا۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اب اگر راستے میں کوئی کرشناجی نظر آئے تو میں نظریں چرا لوں گا، راستہ ہی بدل دوں گا۔

جب بہت دیر ہو گئی تو پیرو بھڑک اُٹھا اور چیخ کر بولا۔ "بس، سب ٹھیک ہے۔ جیسا تم بولتے ہو، وہی ہوئے گا۔ اگر اس مافک کام ٹھیک نئیں چلا تو تین مہینے بعد اپن سب لوٹ دے گا، سمجھا۔ اب اپنے منہ پہ تالا لگاؤ اور سالا یہ سوچو کہ بجھل بھائی جانے والا ہے۔ وہ جا کے اُودر کیا بولے گا کہ تم لوگوں نے اُس کے ساتھ کیا کیا۔ بوم مارا۔ ناٹک کرتا رہا۔"

پیرو انھیں بُرا بھلا کہنے اور گالیاں دینے لگا۔ اُس نے حکم دیا کہ فوراً ایک بڑے جشن کا انتظام کیا جائے۔ سارے شہر سے طوائفیں لائی جائیں اور تین دن تک ناچ رنگ کیا جائے۔ دوسرے علاقوں کے استادوں کو بھی مدعو کیا جائے اور دیگیں چڑھا دی جائیں۔

مگر بجھل اس جشن کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ اُس نے سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ یہ موقع جشن منانے کا نہیں ہے۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ بجھل کے انکار سے اُن کے چہرے لٹک گئے۔ پیرو ناراض ہو کے بیٹھ گیا۔ بجھل نے اُسے سمجھایا کہ جشن کے اور بہت سے موقعے آئیں گے۔ بجھل نے جیسے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میری خواہش بھی یہی تھی کہ وہ انکار کر دے۔ وہ نہ بولتا تو میں منع کر دیتا لیکن میرے کچھ کہنے کی نوبت نہیں آئی۔

جب میں اور جامو باڑے سے باہر نکلے تو رات بہت گزر گئی تھی۔ میرے پیر زمین پر ٹِک رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی اور ہلکی ہلکی پھوار نے اُسے گیلا کر دیا تھا۔ پولیس موجود تھی۔ ابھی ہم کچھ دُور گئے ہوں گے کہ ایک آدمی بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ وہ چھیمی تھا۔ اُس نے بتایا کہ پیرو نے مجھے کل دوپہر باڑے آنے کی ہدایت کی ہے۔ میں اُس سے وجہ پوچھنا چاہتا تھا مگر جامو میرا ہاتھ کھینچ کے آگے بڑھ گیا۔ میں ہر روز رات کو باڑے جاتا ہی تھا، پھر دوپہر کو خاص طور پر بلانے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ میں راستے بھر اُلجھا رہا۔ خاصی تگ و دو کے بعد ہمیں ٹیکسی ملی۔ برسات کی وجہ سے ٹیکسی والے بھی سڑکوں سے بھاگ گئے تھے۔ جامو کا زخم ابھی ہرا تھا۔ پانی پڑنے سے بگڑ سکتا تھا۔ تاہم گھر سے کچھ فاصلے پر ہمیں ٹیکسی چھوڑنی پڑی۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ میں نے جامو کا بازو اپنی اوٹ میں لے لیا لیکن چلنے کے دوران میں یہ ایک مشکل کام تھا۔ جیسے تیسے بھاگتے ہوئے ہم گھر پہنچ گئے۔ جولین نے فوراً دروازہ کھول

دیا۔ ڈرائنگ روم روشن تھا لیکن جولین کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ ہمیں بھیگا ہوا دیکھ کے وہ جلدی سے تولیا لے آئی اور مجھے اُس نے ایک چادر دے دی۔

"ارے جولی بہن! تم اب تک جاگ رہی ہو؟" جامو نے حیرت سے کہا۔ ڈرائنگ روم بے ترتیب پڑا تھا۔ جولین بھی کچھ بے ترتیب سی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اُسے ساڑی کا ہوش نہیں تھا۔ جامو کے ٹوکنے پر اُسے خیال آیا۔ اُس نے حواس باختگی سے اپنی ساڑی درست کی اور نظریں نیچی کر لیں۔ "ہم نے تو کہہ دیا تھا کہ ہمیں دیر ہو سکتی ہے۔" جامو نے ندامت سے کہا۔ "بس اب تمھیں کچھ دنوں کی تکلیف اور ہے۔ ہم جلد ہی چلے جائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے تو نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ منتشر لہجے میں بولی۔ "آپ کپڑے بدل لیجیے جامو بھائی! بہت بھیگ گئے ہیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں۔"

"اب تم سو جاؤ۔ میں اس وقت چائے نہیں پیوں گا۔" جامو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں چند لمحوں تک وہیں ٹھیرا ہوا جولین کو دیکھتا رہا پھر میں بھی چلا آیا۔ کپڑے بدل کے میں کانپنے کے ساتھ بستر پر لیٹنے کے بجائے کرسی پر بیٹھ گیا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اتنی دیر میں جولین کی آواز آئی۔ وہ مجھے باہر بُلا رہی تھی۔ جامو نے فوراً چادر اوڑھ لی کیونکہ اُس نے قمیص اتار دی تھی۔ میں باہر گیا تو جولین چائے لیے کھڑی تھی۔ میں نے اُسے گھور کے دیکھا۔ ٹرے اُس کے ہاتھ میں لرز رہی تھی اور پیالیاں بج رہی تھیں۔ ٹرے لے کے میں اندر آ گیا۔ جب بھی یہاں سے جانے کی کوئی اُمید پیدا ہوتی تھی، مجھے جولین کا خیال آنے لگتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے جانے کا سُنے گی تو کتنی اداس ہو جائے گی۔ اب تو اُس کا باپ بھی نہیں تھا اور نہ ہی کرشنا جی۔ ایک بوڑھی ماں تھی۔ دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ دُور کے چند رشتے دار ہوں گے تو وہ اُس ماحول میں واپس جانا نہیں چاہتی تھی، نہ ہی اُس کا وہاں جانا مناسب تھا کیونکہ وہ ایک علیحدہ لڑکی تھی۔ جولین اس اکیلی زندگی سے بہت گھبرائے گی، ویسے بھی ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہے۔ اُس کا دل بہت کمزور ہے۔ وہ مارٹی سے کتنا ڈرتی تھی۔ میں نے اُس کے لیے مارٹی سے لڑائی مول لی، کرشنا جی نے اُسے نئے مکان میں منتقل کر دیا اور اچھی ملازمت دلوا دی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ خوش رہے، ہنستی رہے لیکن وہ روز بہ روز اداس ہوتی جاتی تھی۔ اُس کا خیال میرے دماغ سے چمٹا ہوا تھا۔ کرشنا جی نے میرے لیے بڑی دولت چھوڑی تھی مگر جولین اُس سے بھی بڑی دولت تھی۔ اُس کی خوبصورتی صرف چہرے تک محدود نہیں تھی۔ رات دن، صبح و شام، وہ ہر وقت کرشنا جی کی طرح مجھے آرام پہنچانے کی جستجو میں لگی رہتی تھی۔ اب جانے کی کوئی صورت بندھی تو اُسے اطلاع دینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی حالانکہ میں اُس سے بارہا کہہ چکا تھا کہ مجھے یہاں ٹھیرنا نہیں ہے۔ اسی لیے میں اُس کے ساتھ گھر میں بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے بہت پہلے سے احساس تھا کہ اُس کے ساتھ رہوں گا تو اُسے اور پریشان کروں گا۔ میں نے اُس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک مارٹی کے آزار سے نجات دلانا کون سی بڑی بات تھی اور مارٹی بھی اُس کے ساتھ مجھے دیکھ کے زیادہ تنگ کرنے لگا تھا ورنہ وہ اس سے پہلے بھی وہیں رہتی تھی۔ میں نے اُس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں کسی کے لیے کر بھی کیا سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پیر تو ٹوٹے ہوئے تھے۔ میرا کام اُن لوگوں کو دکھ پہنچانا رہ گیا تھا جو میرا خیال کرتے تھے۔

چائے پی کے جامو جلد ہی سو گیا۔ میں کرسی پر بیٹھا جاگتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ابھی تک جاگ رہی ہوگی۔ جامو نے میرے سامنے اُس سے کہا تھا کہ وہ چند دن کا مہمان ہے۔ اُس نے میری اور بھّل کی تمام گفتگو سُنی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ سوچتی ہوگی کہ مجھے روکنے کا اُسے کیا حق پہنچتا ہے۔ وہ بہت سی باتیں سوچ رہی ہوگی مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ جو میرے بس میں نہیں ہے، وہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ کیا میں جولین جیسی بے سہارا لڑکی کو سہارا دینے کے لیے بمبئی میں ٹھیر جاؤں؟ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ ہم دونوں بہت سکھ سے رہیں گے۔ بمبئی میں جی نہ لگا تو کہیں اور چلے جائیں گے مگر پھر جولین تو میرے ساتھ رہے گی مگر میں خود کس کے ساتھ رہوں گا؟ میں اُس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اُس کے ساتھ نہیں ہوں گا ورنہ پھر میں زرین کے پاس سے کیوں چلا آیا تھا؟ میں نے بھّل سے کیوں فرار اختیار کیا اور جیل سے نکلنے کے بعد اُس کی تلاش میں کیوں نکل کھڑا ہوا؟

بہتر ہے کہ میں اُسے جا کے بتا دوں۔ جولی! اچھی جولی! مجھے بہت کام ہے۔ تم خود اپنے بارے میں کچھ سوچو۔ کسی نہ کسی دن تو مجھے اُس سے یہ بات کرنی ہی ہے۔ فرض کرو، میں نہ ہوتا اور اُس کا باپ بھی مر گیا ہوتا اور کرشنا جی بھی نہ ہوتے تو وہ کیا کرتی۔ دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ بے سہارا ہیں اور میں کس شمار و قطار میں ہوں۔ میں کرسی سے اُٹھ گیا اور ہلکی چالوں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ جولین صوفے پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میری آہٹ پر وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے ساڑی کے پلو سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ خشک کیا اور پٹ پٹاتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ "تم رو رہی ہو۔" میں نے بہ مشکل تمام کہا۔ اُس کے بدن میں ارتعاش سا ہوا مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی گردن کچھ اور جھک گئی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ "جولین!" چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے اُسے پکارا۔ اُس نے کسمسا کے ایک ثانیے کے لیے نگاہیں اُٹھائیں اور اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے اُس سے بات کرنے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا۔ اُس وقت

نہ تو مجھ سے کوئی بات ہو رہی تھی اور نہ شاید وہ کچھ سننا چاہتی تھی چنانچہ میں نے سکوت اختیار کر لیا مگر یہ خاموشی نہ بولنے سے زیادہ بُری تھی۔ "جولین!" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں اُسے پھر مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا تاکہ کہیں میری زبان نہ اٹک جائے۔ "مجھے اب چند دنوں میں یہاں سے جانا ہے۔" اُس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمھیں اس اطلاع سے دُکھ ہوگا۔" میری آواز بھرّانے لگی۔

"میں نے تمھارے بارے میں بہت سوچا ہے مگر میری عقل کام نہیں کرتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ جولین! میں رُک نہیں سکتا اور نہ تمھیں اس طرح تنہا چھوڑ کے جانے کو جی چاہتا ہے۔ تمھی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟"

وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ "مت رو، مت رو۔" میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم بہت اچھی ہو جولین! یقین کرو، میں تمھاری وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ تمھیں خوش دیکھ سکوں اور تمھارے لیے خوشی مہیا کر سکوں مگر جو چیز خود میرے پاس نہیں ہے، وہ میں کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔ شاید تمھیں میرے متعلق چمپا سے کچھ معلوم ہو گیا ہو یا جامو اور کانتے نے تمھیں باتوں باتوں میں کچھ بتا دیا ہو لیکن جو کچھ انھوں نے تمھیں بتایا ہوگا یا تم نے خود اندازہ کیا ہوگا، وہ بہت کم ہے۔ مجھ سے کچھ پوچھنا مت۔ بس میں تم سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے جانا ہے اور مجھے نہ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔ تم ایک ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے کہ میں تمھیں وہاں لے جاؤں اور پھر تمھارے سامنے ایک بڑی زندگی پڑی ہے۔ فیض آباد میں ایک لڑکی زرین رہتی ہے۔ مجھے خیال آیا تھا کہ میں تمھیں وہیں پہنچا دوں۔ وہ بھی تمھاری طرح بہت اچھی اور تنہا ہے۔ تمھاری تو ماں بھی ہے، اُس کا کوئی نہیں ہے۔ ایک بڑی حویلی میں رہتی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے سے ملتیں تو بہت خوش ہوتیں۔ تم وہاں ملازمت بھی کر سکتی ہو اور تعلیم بھی جاری رکھ سکتی ہو مگر جب میں نے سوچا تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اس طرح کوئی کسی کے گھر میں نہیں رہ سکتا۔ شاید تم بھی اسے پسند نہ کرو۔ جولین! کرشنا جی نے میرے نام بہت بڑی رقم چھوڑی ہے۔ وہ رقم میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ تم اس رقم میں سے جو چاہو لے لو یا سب اپنے پاس رکھو۔ پھر تم ایک بہت اچھا گھر بنا سکتی ہو، ملازم رکھ سکتی ہو اور ملازمت چھوڑ کے اعلا تعلیم حاصل کر سکتی ہو۔ تم چاہو تو اپنی ماں کا کہیں انتظام کر کے ہوسٹل میں بھی رہ سکتی ہو، ولایت بھی جا سکتی ہو۔ اُس رقم سے تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ خبر ہے، کتنی رقم ہے؟" میں نے اُس کی طرف دیکھ کے پوچھا۔ اُس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے۔

میں گھبرا گیا۔ "ساڑھے آٹھ لاکھ کے قریب۔"

اُس نے اپنی بھیگی لرزتی ہوئی پلکیں اُٹھائیں اور اپنا منہ چھپا لیا۔

"تم نے سُنا، کرشنا جی مجھے کیا سمجھتے تھے۔" میری آواز پھٹنے لگی۔ "میں نے تمھیں نہیں بتایا تھا اس لیے کہ مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ وہ روپیہ بینک میں محفوظ ہے۔ میں نے اُس میں سے ایک پائی کو بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ کرشنا جی نے نہ جانے کیوں اُسے میرے نام کر دیا تھا۔ تم اس قدر رو کیوں رہی ہو؟ جولین! میری باتوں کا جواب دو۔" میں نے وحشت سے کہا۔ "رونا بند کرو۔ مجھے بھی رونا آ رہا ہے۔" میں نے اُس کے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا دیے۔ وہ نڈھال ہو کے میرے سینے پر گر پڑی۔ میری سانس بند ہونے لگی اور جسم سُن ہو گیا۔ میرے ہاتھ پتھر کے ہو گئے۔ جولین میرے سینے پر سسک رہی تھی۔ میں دیر تک گُنگ بیٹھا رہا، پھر میری سانس پھولنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ اُسے خوب زور سے گلے لگا لوں، خوب پیار کروں اور کہہ دوں کہ میں نہیں جاتا، میں یہیں رہوں گا لیکن میری زبان اور ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو گیا تھا۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کس طرح دوسرے لمحے جولین کے بازو میرے ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ میں نے اُسے جھنجھوڑ دیا۔ "مت رو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ میری بلند آواز سے گھر میں کوئی بھی جاگ سکتا ہے۔ جولین خود ہی سنبھل گئی۔ "میری بات سنو جولین! میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ مت سمجھنا کہ مجھے تمھاری فکر نہیں ہے لیکن تم... تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمھیں کون روک سکتا ہے۔" وہ بلکتی ہوئی بولی۔

"اس طرح مت کہو۔ میں رُک جاؤں گا تو تمھیں پریشان ہی کرتا رہوں گا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "نہ خود چین سے بیٹھوں گا، نہ تمھیں چین لینے دوں گا۔ میں ہر لمحہ تمھیں رُلاتا رہوں گا۔ اب تک تو میں نے یہی کیا ہے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ یہاں رہ کے میں نے تمھیں کیا دیا۔ آنسو۔ ویسے میرے پاس اور ہے بھی کیا۔ میں تو کب کا چلا جاتا۔ ایک کام نے روک کے رکھا لیکن اب میں ایک طرف سے مطمئن ہو گیا ہوں۔ سمجھ لو، کرشنا جی نے مجھے کچھ کام سونپا تھا۔ وہ اب نمٹ چکا ہے۔" وہ چونک کے سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی۔

"لیکن میں تمھاری جانب سے فکرمند ہوں جولین! میں نے تمھارے سامنے کئی باتیں رکھی ہیں۔ تم اپنے لیے جو بات مناسب سمجھو، مجھے بتا دو۔ میرا خیال ہے تم ایک نیا مکان لے لو، یہ پیسے آخر کس کام آئیں گے۔"

"مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

"کیوں نہیں چاہئیں؟" کرشنا جی تمھیں بھی اتنا ہی عزیز رکھتے تھے جتنا مجھے۔ "اُن کے پیسوں پر تمھارا بھی حق ہے اور اب تو یہ میرے پیسے ہیں۔ میں تمھیں دے رہا ہوں۔ تمھارے دل میں کچھ اور خیال آ رہا ہے

کیا؟ نہیں.... نہیں! اسے دل سے نکال دو۔ میں یہ بات تم پر ترس کھا کے تمھیں مزید متند سمجھ کے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تم خوش رہو۔ سمجھیں؟"

"تم چلے جاؤ" وہ سسکتی ہوئی بولی۔

"مگر تمھارا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں، میں زندہ رہ لوں گی" اس کی زبان ڈگمگا رہی تھی۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کچھ نہ کچھ تو سوچنا پڑے گا" اس کی ٹھٹھری ہوئی آواز ابھری۔ "زندہ رہنا ہے"

"ہاں جولین! میری اچھی جولین! کچھ نہ کچھ ضرور سوچو۔ میں تمھیں اپنے ساتھ لے چلتا مگر میری کوئی منزل، کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اگر خدا نے میری بات سن لی تو میں کبھی ضرور واپس آؤں گا۔ یہاں میں مارٹی سے کہہ دوں گا۔ وہ میری عدم موجودی میں تمھارا خیال رکھے گا اور میں تمھیں چند ایسے نام بتا کے جاؤں گا کہ جب بھی میرا نام لے کے تم ان سے ملو گی اور تمھیں کوئی پریشانی ہوگی تو وہ فوراً حاضر ہو جائیں گے۔ وہ میرے نام کا اتنا پاس ضرور رکھیں گے۔ وقت پڑا تو وہ تمھارے لیے جان بھی لڑا سکتے ہیں۔ جولین! تم یہ بھی تو سمجھ سکتی ہو کہ میں مر گیا ہوں۔ کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ کرشنا جی کو جو جا تو لگے، اگر وہ مجھے لگ جاتے؟"

جولین بت بنی بیٹھی تھی۔ وہ زیریں طرف دیکھ رہی تھی منہ رو رہی تھی۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ گیلے رخساروں پر لیمپ کی پیلی روشنی دمک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بار بار تھرتھرانے لگتے تھے۔

"تم بولتیں کیوں نہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کچھ تو ضرور سوچ رہی ہوگی؟"

"وہ گم صم بیٹھی رہی۔" میں بھی سر جھکا کے خاموش ہو گیا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پرنالے گرنے کا شور اندر تک گونج رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی کبھی مدھم پڑ جاتی تھی، کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ شاید بجلی جانے والی تھی۔ جب دیر ہو گئی اور اس کے بدن کی کوئی آہٹ نہیں ابھری تو میں نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔ جولین کا بدن ساکت تھا۔ صرف سینہ متحرک تھا۔ صبح تک میں یوں ہی بیٹھا رہا۔ وہ بھی بیٹھی رہی۔ صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی۔ دودھ والے نے آواز لگائی تو وہ چونک پڑی۔ گھبرا کے اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف لپکی۔

نماز کے لیے جمپا کے اٹھنے سے پہلے میں اندر چلا آیا۔

صبح بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ میں اپنے کمرے ہی میں پڑا رہا۔ جمپا آئی تو میں نے منع کر دیا کہ میرا جی ناشتے کو نہیں کر رہا ہے۔ پھر کانتے اصرار کر کے مجھے ناشتے کی میز پر لے آیا۔ میری نظریں جولین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ ناشتہ کر کے میں کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گیا اور سڑکوں پر گھومتا رہا۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک۔ ایک چوک سے دوسرا چوک۔ بار بار مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جولین میرے پہلو میں چل رہی ہو اور مجھے پیچھے سے آوازیں دے رہی ہو۔ راستے میں کئی بار میں نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا کہ نہ جانے جولین کی طبیعت کیسی ہو لیکن میں آگے ہی بڑھتا رہا۔

جولین کو کیا اندازہ تھا کہ کوئی اس سے بھی زیادہ تنہا ہو سکتا ہے۔ اس کا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اس سے تو سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ دشمن جگہ جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ مولوی محمد شفیق نے نہ جانے کب تک ساتھ دیا ہوگا۔ کوئی جولین سے اس طرح نہیں بچھڑ گیا تھا جس طرح اس سے بچھڑا۔ کسی نے اس کے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ اس پہ وقت کی گرد پڑ جائے۔ وہ تو میرے دل میں روز بہ روز روشن ہو رہی تھی۔ جولین کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے سینے میں کیسی جلن ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ سر سے پاؤں تک اپنے جسم میں چاقو کھینچ دوں۔

فٹ پاتھوں پر بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی بارش بند ہوئی، لوگ چیونٹیوں کی طرح سڑکوں پر ابل پڑے ــــــ بھیڑ زیادہ ہوتی تھی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا کہ کہیں نگاہ چوک نہ جائے۔ راہ گیر تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے کیونکہ ابھی تک آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں وہاں تک جانا چاہتا تھا جہاں تک آدمی نظر آتے ہوں۔ کسی دن انھی آدمیوں کے درمیان وہ مجھے مل جائے گی۔ میں نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا۔ دھوپ نکلی تب مجھے یاد آیا کہ پیرو نے آج دوپہر مجھے آنے کی ہدایت کی تھی۔ جب میں پاڑے پہنچا تو مجھے کچھ سکون تھا کہ میں نے صبح سے اب تک کا وقت ضائع نہیں کیا ہے۔ پیرو میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اور تجمل نے اجلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ "لاڈلے جانی! اتنی دیر کر دی؟" وہ مجھے دیکھتے ہی چلایا۔ "اب چل، جلدی چل۔"

"کہاں چلنا ہے؟" میں نے اداسی سے پوچھا۔

"یہ مت پوچھ، اپن نے تجمل بھائی کو بھی نہیں بولا ہے۔"

"چلو" میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ دونوں تیار ہی بیٹھے تھے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں کے سوا کوئی اور آدمی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ علاقے میں کچھ دور پیدل چل کے پیرو نے ایک ٹیکسی روک لی۔ چند منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک بڑے جنرل اسٹور کے سامنے رک گیا اور ادھر ادھر دیکھ کے باہر ہی کھڑے کھڑے اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو اشارہ کیا۔ اس کے اشارے کی دیر تھی۔ ایک آدمی لپکتا ہوا اسٹور سے باہر آیا اور اس نے پیرو کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھما دیا۔ اسٹور کے برابر ہی گیراج تھا۔ پیرو نے وہاں سے ایک موٹر نکال لی۔ وہ خود اسے چلا رہا تھا۔ آگے کی نشست پر تجمل اور پچھلی پر میں بیٹھ گیا۔ موٹر کی رفتار تیز تھی۔ پیرو ایک لمبا راستہ عبور کرتا ہوا ایسے علاقے میں داخل ہو گیا جہاں اونچے اونچے مکانات تھے اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اب میری کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ پیرو ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد موٹر ایک سبز پوش آہنی پھاٹک کے پاس رک گئی۔ ہارن کی آواز پر کسی تاخیر کے بغیر دروازہ کھلا اور موٹر اندر داخل ہو گئی۔ چوکی دار نے پیرو کو جھک کے سلام کیا۔ وہ ایک بہت بڑی کوٹھی تھی۔ عمارت کے سامنے میدان میں سبزہ چھایا ہوا تھا۔ پیرو نے پورٹیکو میں موٹر کا انجن بند کر دیا۔ تجمل اسے متجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "آؤ تجمل بھائی!" وہ تجمل کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بے تابی سے بولا۔ "اندر آؤ۔"

"یہ تم کہاں لے آئے پیرو دادا!" تجمل نے مسکرا کے پوچھا۔

"تجمل بھائی! اپن کسی کو آج تک یہاں نہیں لایا۔ پاڑے کے صرف دو ایک آدمیوں کو پتہ ہے کہ اپن ہفتے میں ایک بار کہاں جاتا ہے۔" ابھی وہ بتا ہی رہا تھا کہ اندر سے ایک خوش لباس جوان عورت برآمد ہوئی۔ اسے ادھیڑ کہنا غلط ہوگا۔ اس کا قد جولین کی طرح لانبا، رنگ سرخ و سفید، جسم متوازن اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ہم دونوں کو دیکھ کے وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ "تجمل بھائی! پہچانو، کون ہے؟" پیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

تجمل چند لمحے سوچتا رہا پھر پُرسکون آواز میں بولا۔ "بھابی"

"واہ تجمل بھائی!" وہ اچھل پڑا۔ "تم نے کیسے جانا؟"

"تم دونوں کی آنکھوں سے"

عورت نے دونوں ہاتھ جوڑ کے پہلے تجمل کو نمسکار کیا پھر مجھے۔ "رانی!" پیرو سرشار ہوتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپن کا تجمل بھائی اور سالا لاڈلا رلیا۔" پیرو نے ایک ہی سانس میں ہمارے متعلق نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ رانی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے ہمیں اندر چلنے کے لیے کہا اور ایک سجے ہوئے کمرے میں لے آئی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور ارد گرد اونچی اونچی کرسیاں اور صوفے رکھے ہوئے تھے۔ رانی شائستگی سے ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے کانوں میں چھوٹے بُندے لٹکے ہوئے تھے اور ماتھے پہ بندیا دمک رہی تھی گلے میں میری ماں کی طرح موتیوں کی مالا پڑی تھی۔ جوڑا بندھا ہوا تھا اور چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے پیرو دادا؟" تجمل نے مضطرب ہو کے سرگوشی کی۔

"بس تجمل بھائی!" پیرو کھل کھلانے لگا۔ "اپن نے تم کو نہیں بولا تھا۔ یہ بھی اپن کا پاڑا ہے۔ ابھی تجمل بھائی! اپن نے سوچا تم سے کوئی پردہ رہ گیا تو اپن کو بعد میں بہت خواری ہوگا۔ سالا ٹائم ہی نہیں ملا۔ اپن تم کو بہت پہلے ادھر لے آتا اور یہیں ٹھہرنے کو بولتا۔ پر وہ سالا جھیڑا چھاڑی جو اُدھر چلا آرہا تھا۔ یہ اپن کا رانی ہے تجمل بھائی!" وہ بہکی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی تجمل بھائی کی خاطری کر رانی! اپن کو آنے میں دیر ہو گئی۔ جو بھی گھر میں ہے لے آؤ اور وہ.... وہ پیرو کا بچی مہارانی گیتا کیدر ہے؟ اُسے بولو چاچا تجمل آیا ہے۔ جلدی آؤ۔ بولو دیکھو کون آیا ہے۔"

پیرو کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رانی اٹھ کے اندر چلی گئی۔ پیرو بہت خوش تھا۔ اس نے وہی داستان تجمل کو سنانی شروع کر دی جو چند دن پہلے سرسری انداز میں مجھ سے بیان کر چکا تھا۔ تجمل اشتیاق اور تعجب سے سنتا رہا۔ "اپن اس کو بالکل دور رکھا ہے تجمل بھائی! رانی کو پتہ ہے کہ اپن کہاں رہتا ہے پر چھوکری کچھ نہیں جانتا۔ رانی بہت اچھا عورت ہے تجمل بھائی! ایک دم سو نمبر ہے۔ وہ اس کو سمجھا لیتا ہے۔ کبھی اپن کا بہت جی کرتا ہے کہ بس ادھر ہی رہے، اُدھر واپس نہ جائے۔ پر اپن کیا کرے، تم جانتا ہے تجمل بھائی! چاقو سالا ایک بار ہاتھ کو چمٹ جاتا ہے تو پیچھا نہیں چھوڑتا۔" پیرو اداسی سے بولا۔ وہ بتانے لگا کہ اسے یہ گھر لوگوں کی نظروں سے دور رکھنے میں کتنی مشکل پیش آتی ہے اور اس کی بیوی نے کسی موقع پر اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے کبھی اپنے ماں باپ کا نام نہیں لیا۔ اسی وقت دروازے سے چوڑیاں بجیں۔ پیرو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اس نے درمیان ہی میں آنے والی لڑکی کو جھپٹ کے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اس کی پیشانی، سر اور ہاتھ چومنے لگا۔ "مہارانی جی!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیسا ہو تم؟"

جب پیرو سامنے سے ہٹا اور اس کا ہاتھ تھامے ہوئے اسے ہمارے پاس لایا تو میں نے اسے غور سے دیکھا۔ پیرو نے اس کے بارے میں جو کچھ مجھ سے کہا تھا، وہ بہت کم تھا۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کے گالوں سے خون چھلک رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے رنگ روپ پر گئی تھی۔ وہی قد، وہی نقشہ، وہی سیاہ بال اور بڑی آنکھیں۔ وہ دونوں چھوٹی بڑی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ "چاچا کو پرنام بولو" پیرو نے اسے حکم دیا۔ لڑکی نے آگے آ کے تجمل کے پیر چھو لیے۔ تجمل نے کھڑے ہو کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ تجمل کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ "جیتی رہو" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "پیرو! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں خالی ہاتھ گھر آ گیا۔" تجمل نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے ناراضی سے کہا اور جتنے نوٹ اس کی جیب میں تھے۔ اس نے نکال کے لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیے۔ لڑکی کو تامل ہوا مگر پیرو نے اسے ڈپٹ دیا۔ اس نے دوبارہ تجمل کو پرنام کیا۔ "اور یہ لاڈلا راجا" پیرو نے اسے میری طرف متوجہ کیا۔ "لاڈلا! یہ اپن کی گیتا ہے۔" اس کے لہجے میں لرزش تھی۔ "یہ اپن کا مہارانی ہے۔ اپن اس کا غلام ہے۔"

"پتا جی!" گیتا ناگواری سے بولی۔ "پھر آپ نے!"

"اوہ" پیرو ہنس کے بولا۔ "اپن بھول گیا۔ یہ گیتا اپن کا بیٹی ہے لاڈلا! اپن اس کا باپ ہے، غلام نہیں۔ اپن کا بہت پیارا بیٹی ہے۔"

پیرڈ نے اُسے اپنے اور بجھل کے درمیان بٹھالیا۔" بجھل بھائی! ابھی تمھارا بھتیجی نے گیارہ نمبر درجہ پاس کیلا ہے۔ فٹ فٹ ولایتی بولتا ہے۔ اپن کا جان ہے۔" وہ گیتا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بولا۔

گیتا کا چہرہ لال ہوگیا تھا۔ وہ ڈھیلی موری کا پاجامہ اور کرتا پہنے ہوئے تھی۔ چنا ہوا دوپٹا گلے میں پڑا تھا۔ وہ شرمائی شرمائی سی تھی۔

"چاچا بجھل کہاں سے آئے ہیں؟" اُس نے جھجکتے ہوئے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"چاچا کلکتے سے آیلا ہے بیٹا!" پیرڈ نے ایسے لہجے میں اُسے جواب دیا جیسے گیتا چھوٹی سی بچی ہو۔ وہ کن انکھیوں سے ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

"تو یہ یہاں کیوں نہیں ٹھہرے؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"کیا بولے بیٹا! چاچا کو جانے کا جلدی ہے۔ اپن نے بہت مغز مارا۔ اب تم بول کے دیکھو۔ چاچا اپنی بھتیجی کی بات نئیں ٹالیں گا۔"

"پھر آئیں گے بیٹا!" بجھل نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"چاچا کلکتے میں کیا کرتے ہیں؟"

"چاچا۔" پیرڈ مسکانے لگا۔" چاچا کا اُودر بڑا کاروبار ہے۔"

"کیا کاروبار ہے؟" وہ تجسس سے بولی۔

پیرڈ نے تذبذب سے بجھل کو دیکھا۔" ابھی تم چاچا سے ملنے کلکتے جائیں گا نا۔ تو دیکھنا۔" پیرڈ اٹک اٹک کے بولا۔" یہ بہت سوال کرتا ہے بجھل بھائی!"

"ہاں تم اُدھر آنا تو خود دیکھ لینا۔" بجھل نے سانس بھر کے کہا۔

"تم اُودر جا کے ماں سے بولو کہ جلدی کھانا دیو۔ ایک دم جلدی سمجھا۔" وہ گیتا کے کان مروڑتے ہوئے بولا اور ابھی وہ اٹھی بھی نہیں تھی کہ اُس سے پوچھنے لگا۔" واپس آگیا؟"

"آگئی۔" وہ پیرڈ کے سامنے سیدھی کھڑی ہوگئی اور چھن چھن ہنسنے لگی۔

"دیکھا تم نے بجھل بھائی! کتنا شریر ہے یہ۔" پیرڈ نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کے اُس کے چہرے کی طرف کیے اور بھّوں کہہ کے اُسے ڈرانے لگا۔ وہ اُچھلتی بھاگتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ پیرڈ بجھل سے اُسی کی باتیں کرنے لگا کہ وہ کتنی ذہین، کتنی شوخ اور کتنی سعادت مند لڑکی ہے۔ بجھل اپنا بھاری سر ہلا تا رہا۔

چند ہی لمحوں میں وہ واپس آگئی۔" رانی جی کہتی ہیں، ابھی دیر ہے، صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" وہ سامنے کرسی پر جم کے بیٹھ گئی۔

"دیکھا دیکھا بجھل بھائی! کیا کیا بات اس کو پتہ ہے۔" پیرڈ مچلتے ہوئے بولا۔" ابھی اتنا چھوٹا عمر میں یہ ایسا بڑی بڑی باتیں بولتا ہے۔"

ایک بوڑھی ملازمہ نے میز پر پھلوں کا شربت اور مٹھائیاں لا کے رکھ دیں۔ گیتا نے گلاس بھرے۔ بجھل کو گلاس دینے کے بعد وہ

میرے پاس آئی۔ میں نے نگاہ اُٹھائی تو اُس نے نظریں نیچی کرلیں۔ کو... جب مجھ سے جدا ہوئی تھی، اُس سے خاصی چھوٹی تھی لیکن وہ ... بہت بڑی معلوم ہوتی تھی اور جب میں اُسے گھر سے لے کے آیا تو ... ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اچانک میری عمر بڑھ گئی ہے۔ پیرڈ کو گلاس د... کے بعد وہ اپنی جگہ جا کے بیٹھ گئی مگر اب وہ بار بار میری طرف اس طر... دیکھ رہی تھی جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس نے میرے بارے میں پیرڈ سے کچھ نہیں پوچھا تھا اور نہ پیرڈ نے میرے نام کے ... اُسے کچھ بتایا تھا۔ اُس کے پیر تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور و... اپنے دوپٹے کی چنٹیں کھول رہی تھی۔ پھر پیرڈ کو خود ہی خیال آگیا شاید اُس نے محسوس کرلیا کہ گیتا میرے متعلق کچھ جاننا چاہتی ہے۔ ... دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم دونوں چپ بیٹھے تھے۔" گ... تم راجا سے نئیں ملا۔ یہ راجا ہے۔ راجا بجھل بھائی کا۔۔۔" وہ جھجکتے ہو... بولا۔" بجھل بھائی کا بیٹا ہے۔" راجا اپن کا بجھل بھائی کے مافک ایک ... فس کلاس ہے۔ تم اس سے بات بولو۔ ارے تم دونوں چپ کیوں بیٹھا ... وہ ہم دونوں کو ڈانٹنے لگا۔" بولو۔ بولو راجا! یہ تمھارا گھر ہے۔ ابھی تم گھو... پھر گیتے! راجا کو باغ کا سیر کراؤ۔ راجا! گیتا پھولوں کا عاشق ہے۔ سا... پچھواڑے ایک سے ایک پھول مار رکھا ہے۔ کالا، پیلا، نیلا۔"

"آپ پڑھتے ہیں؟" گیتا نے ہچکچاہٹ سے پوچھا۔ میں نے نفی میں گردن ہلادی۔

"پڑھ چکے ہیں؟" وہ سمٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کہاں تک؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تھوڑا بہت۔"

گیتا میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔ وہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن بات اُس کے ہونٹوں پہ آتے آتے رہ گئی۔ پیرڈ نے اُسے دوبارہ ٹوکا۔ وہ کسمساتی ہوئی اُٹھی اور اضطراری نظروں سے میری جانب دیکھ کے بولی۔" آئیے۔" اُس کا لہجہ شرمیلا تھا۔

مجھے اُس کا ساتھ عجیب سا معلوم ہوا۔ میں منع کردینا چاہتا تھا مگر گیتا کھڑی ہوچکی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کوٹھی کے پچھلے حصے میں لے آئی۔ یہ چمن تھا۔ پیرڈ اسے باغ کہہ رہا تھا۔ یہاں ہر طرف ہریالی تھی اور قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چمن کے ایک کونے میں چھوٹا سا تالاب تھا۔ اُس میں سفید بطیں تیر رہی تھیں۔ گو چمن کا رقبہ زیادہ نہیں تھا مگر پودے بہت سلیقے سے لگائے گئے تھے۔ سارا منظر بہت پیارا تھا۔ فرصت ہو تو آدمی کرسی ڈال کے بیٹھ جائے اور سوچتا رہے۔ گیتا کی پھولوں سے دلچسپی کے بارے میں پیرڈ نے بالکل سچ کہا تھا۔ مجھے اس کی تعریف میں کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ میں چپ

چاپ اُس کے ساتھ گھومتا رہا۔" آئیے، یہاں بیٹھ جائیے۔" اُس نے پتھر کی ایک بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔" آپ کلکتے میں رہتے ہیں؟" اچانک اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے بے سوچے سمجھے جواب دیا۔

"پھر۔۔۔ پھر آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میں بس ایسے ہی شہروں شہروں گھومتا رہتا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ تذبذب سے بولی۔" آپ کا کام ہی ایسا ہوگا؟"

"ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔"

"آپ کو پھولوں سے شوق نہیں ہے؟" کچھ توقف کے بعد اُس نے پوچھا۔

"ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"مجھے تو بہت ہی شوق ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔" آپ کو چمن پسند آیا؟"

"بہت اچھا ہے۔"

"آپ ایک مہینے پہلے آتے تو دیکھتے، پتے نظر نہیں آتے تھے؟"

"جی۔" میں نے ہنکاری بھری۔

"اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔" آپ۔۔۔ آپ کی طبیعت کیا خراب ہے؟"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیا آپ ہمیشہ اتنا ہی بولتے ہیں؟"

"جی۔!" میں نے گھبرا کے کہا۔" کیا میں نے آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دیا؟"

"دیا تو مگر۔۔۔ مگر آپ نے اپنی طرف سے کوئی بھی بات نہیں کی۔" وہ تیزی سے بولی۔" کیا آپ پتا جی اور بجھل چاچا سے بھی بس اتنی ہی باتیں کرتے ہیں؟"

"مجھے زیادہ بولنا نہیں آتا۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"پھر آپ کو کیا آتا ہے؟" وہ چمک کے بولی۔

"زیادہ سننا۔"

"میں بھی یہی کوشش کرتی ہوں مگر میری زبان نہیں رکتی۔ ہماری مس درگا کہتی ہیں کہ کم بولنا، کم کھانا دونوں تن درستی کے لیے ضروری ہیں۔" آپ کی مس سچ کہتی ہیں لیکن وہ ایک بات کہنا شاید بھول گئیں۔ کم سوچنا بھی تن درستی کے لیے مفید ہوتا ہے۔"

"اچھا!" وہ تعجب سے بولی۔" میں اُن سے پوچھوں گی کہ ہمیں یہ کیوں نہیں بتایا۔ کیا آپ سوچتے بھی کم ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"پھر بھی آپ کی۔۔۔ آپ کی صحت بہت اچھی ہے۔"

"اور آپ کی بھی بہت اچھی ہے۔"

اُس کے لبوں پر مسکراہٹ چھلک پڑی۔" تب مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"کیا بتاؤں؟"

"کچھ بھی، یہی کہ آپ کے بہن بھائی کتنے ہیں؟"

"اب تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میری آواز گلے میں پھنس گئی۔

"اب تو سے کیا مطلب؟ یعنی۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں، اب کوئی بھی نہیں ہے۔"

"تو آپ چاچا کے اکیلے بیٹے ہیں؟"

"ہوں۔" میں نے سر ہلایا۔

"اور کوئی بھی نہیں ہے؟"

"نہیں، کوئی بھی نہیں ہے۔"

"آپ کی ماتا جی!"

"وہ بھی نہیں ہیں۔"

اُس کی پلکیں پھڑکنے لگیں۔" پھر تو آپ بہت تنہائی محسوس کرتے ہوں گے؟"

"ہاں۔" میں نے تندی سے کہا۔" چلیے اندر چلیں۔"

"چلیے۔" وہ افسردگی سے بولی۔ ہم اُٹھ ہی رہے تھے کہ ملازم نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ کھانے کا کمرہ دوسرا تھا۔ ایک بڑی میز کے اطراف کرسیاں رکھی ہوئی تھیں مگر بجھل اور پیرڈ تخت پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دو ملازم موجود تھے اور اندر سے سامان لا کے تخت پر رکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی پیرڈ چلانے لگا۔ اُس نے اپنے ایک طرف گیتا کو اور دوسری طرف مجھے بٹھایا اور مجھ سے چمن کا حال پوچھنے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے پیرڈ چمن کے بارے میں کم اور گیتا کے بارے میں زیادہ پوچھ رہا ہے اور مجھے جتا رہا ہے کہ اُس نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی تھی۔ گیتا بھی چمن کی طرح خوب صورت تھی۔ میرے دل میں آیا، سچی بات بتادوں کہ چمن اور گیتا دونوں مجھے اچھے لگے۔ تاہم میں نے لفظ سنبھل سنبھل کے ادا کیے۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ اب لوگوں سے کم بات کیا کروں گا اور دوسروں کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دوں گا۔ میرے اختصار کے باوجود پیرڈ بہت خوش ہوا۔

گیتا کی ماں رانی کے آنے کے بعد ہم نے کھانا شروع کردیا۔ اقسام زیادہ نہیں تھیں لیکن کھانا لذیذ بے حد تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ اتنے کم وقت میں تیار ہوگیا تھا۔" یہ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے ہیں۔" گیتا کی ماں نے پیرڈ سے میری شکایت کی۔

"ہا، راجا مہمان بنا ہے بجھل بھائی!" پیرڈ میرے کولہے پر زور سے کہنی مارتے ہوئے بولا۔" کھا راجا! خوب کھا۔" رانی نے بھنے ہوئے مرغ کا ڈونگا میرے آگے کردیا۔ پیرڈ نے میری پلیٹ میں مسلّم مرغ لوٹ دیا اور

گیتا نے چٹنی بکھیر دی۔ کھانے کے دوران میں پیرو ہی زیادہ باتیں کرتا رہا۔ گیتا نے ایک بار پھر جھل سے کہا کہ وہ چند دن کے لیے یہاں ٹھہر جائے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں جھل آمادہ نہ ہو جائے لیکن اُس نے گیتا سے معذرت کر لی۔ رانی اپنی کھنی ہوئی سی ہوئی آواز میں بار بار مجھے ٹوکتی تھی۔ جب بھی میں نے سر اُٹھایا، اُسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ بھی پیرو کے مانند بہت خوش تھی جیسے ہم اُس کے رشتے دار ہوں اور بہت دن بعد اُس کے ہاں آئے ہوں۔ جو تھوڑی بہت اجنبیت باقی تھی، وہ کھانے کے دوران میں ختم ہو گئی۔ چلتے وقت رانی نے مجھے ایک سو ایک روپے دیے۔ ہم پانچ بجے کے قریب وہاں سے رخصت ہوئے۔ وہ دونوں دروازے تک ہمیں پہنچانے آئیں اور اصرار کرنے لگیں کہ جانے سے پہلے ہم ایک بار اور ان کے گھر آئیں۔ گیتا نے مجھ سے کہا کہ اگر میں کسی دن شام کو آ جاؤں تو وہ مجھے اپنی موٹر میں بمبئی کی سیر کرائے گی۔ میں نے ڈھل مل یقین وعدہ کر لیا۔ پیرو نے جنرل اسٹور کے گیراج میں گاڑی کھڑی کی اور اُسی طرح پاڑے واپس آ گیا جس طرح گیا تھا۔ وہاں پہنچ کے پتہ چلا کہ پولیس افسران کی ایک جماعت پیرو سے بات کرنے کے لیے آئی تھی، اُس کے آدمیوں نے کہہ دیا کہ پیرو شام کو مل سکتا ہے۔ پولیس کے ذکر سے میرے کان کھڑے ہوئے۔ علاقے میں ابھی تک پولیس کا زور کم نہیں ہوا تھا۔ پیرو ایک دن گزار کے واپس آ چکا تھا لیکن اُس کی واپسی اُس کے بری الذمہ ہونے کی دلیل نہیں تھی۔ پولیس کا پھر اس طرف آنا بے مقصد نہیں ہو گا۔ انھوں نے متعدد مرتبہ پاڑے کی تلاشی لی تھی اور مختلف لوگوں کو گرفتار کیا تھا لیکن نہ پاڑے سے انھیں کچھ حاصل ہوا، نہ گرفتار ہونے والوں نے کچھ بتایا۔ شاید تیواڑی کے کسی خاص آدمی نے انھیں پھر پیرو کو ٹٹولنے پر اُکسایا ہو گا یا کوئی اور بات ہو گی۔ اُدھر جھل اور جامو واپسی کے ارادے باندھ رہے تھے۔ وہ واپسی کا ارادہ اُسی وقت کر سکتے تھے جب پیرو کو مکمل طور پر محفوظ سمجھتے ہوں۔ جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ اتنی بڑی واردات کے بعد پولیس یوں چُپ نہیں بیٹھ جائے گی۔ اُوپر سے دباؤ پڑ رہا ہو گا۔ اطلاع سن کے پیرو کے چہرے پر برہمی چھا گئی لیکن وہ محض کچھ دیر قائم رہی۔ پھر پیرو پاڑے کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ شام کا وقت تھا۔ ہر طرف سے آدمی آ رہے تھے۔ پاڑے میں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ رات کو پاڑے کے آدمیوں نے باورچی بلا کے پاڑے ہی میں کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کھانے کے بعد ناچ گانے کے لیے ایک طوائف بھی بُلائی گئی تھی اور نقلیں اُتارنے والا ایک مسخرا بھی۔ اُس نے نقلیں اُتارنی شروع ہی کی تھیں کہ پولیس کے آنے کی اطلاع ملی۔ جھل نے مجھے اشارہ کیا۔ پولیس ابھی پاڑے سے دُور تھی۔ میں وہاں سے پہلے ہی نکل آیا اور پیدل چل دیا۔ سڑکوں پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں چلتا رہا۔ پھر اچانک ایک جگہ اندھیرے میں ایک سپاہی نے میرا راستہ روک لیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کے تلخی سے پوچھا۔

"گھر۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔ وہ پوچھنے لگا کہ گھر کدھر ہے؟ میں نے اُسے پتہ بتا دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ جیب میں چاقو موجود تھا۔ میں نے اُس کا پنجہ پکڑ لیا۔ "جیب سے ہاتھ نکالو۔" میں نے غصّے سے کہا۔

"چاقو۔" وہ طنز سے بولا۔ "اور نوٹ بھی؟ کدھر سے آ رہا ہے؟"

وہ اپنا پنجہ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے حقارت سے بولا۔

"میں نے چوری نہیں کی ہے، یہ رُپے میرے ہیں۔" میں نے تُرشی سے کہا۔

"تیرے ہیں، تیرے باپ کے ہیں۔ تھانے چل۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "چل۔" وہ مجھے دھکا دینے لگا۔ ایک دفعہ مرادآباد میں بھی اسی طرح ایک سپاہی نے مجھے پکڑ لیا تھا اور ایک بیوہ عورت ارجمند بیگم نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ سپاہی سمجھ گیا کہ میرا ارادہ آسانی سے اُس کے ساتھ جانے کا نہیں ہے۔ اُس نے فوراً سیٹی بجا دی۔ اُس کے جواب میں دُور سے سیٹیاں گونجیں اور گرد و پیش میں سیٹیاں ہی سیٹیاں بجنے لگیں۔ ساتھ ہی کُتے بھونکنے لگے۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ مجھے سپاہی سے نرم لہجے میں بات کرنی چاہیے تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے منہ سے سیٹی چھین لی۔ "تم شور کیوں مچا رہے ہو؟"

"سیٹی واپس کر۔" وہ چیختے ہوئے بولا اور میرے ہاتھ سے سیٹی چھیننے کے لیے اُچھلنے کودنے لگا۔ "تُو اکیلے میرے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"میں نے تمھارا بگاڑا کیا ہے بھائی! میں اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔ کیا تم نے مجھے کوئی جرم کرتے ہوئے پکڑا ہے؟ مجھے جانے دو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ابھی تم نے ایک پولیس مین کی ڈیوٹی میں دخل دیا۔ اُس سے سیٹی چھینا اور اُس کے ساتھ اکڑ کے بات کیا۔ زیرِ دفعہ ۳۳۲ دست اندازی پولیس میں چھ مہینے کاٹے گا تو پتہ چل جائے گا کہ تُو نے کیا جرم کیا ہے۔"

سیٹیاں قریب ہو رہی تھیں۔ یہ سیٹیاں سُن کے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ ایسی ہی سیٹیاں اُس وقت بھی بجی تھیں جب کرا کو بدمعاش لیے جا رہے تھے۔ ان سیٹیوں سے میرا دل ہولنے لگتا تھا۔ دوسرے سپاہی اپنے ساتھی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں چند لمحے سوچتا رہا۔ مجھے دوسروں کے آنے سے پہلے بھاگ جانا چاہیے تھا ورنہ وہ جلد ہی مجھ تک پہنچ جاتے اور مجھے دھکے دیتے ہوئے تھانے لے جاتے۔ تھانے جانے میں کوئی بات نہیں تھی۔ میں انھیں بتا سکتا تھا کہ میرا نام راجا ہے۔ تھوڑی سی تصدیق کر کے وہ مجھے چھوڑ دیتے۔ یہ بات میں سپاہی کو بھی بتا سکتا تھا مگر ان حالات میں سپاہی کو یا تھانے جا کے اپنا نام پتہ بتانے سے اور اُلجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں اور اگر میں اپنا نام صحیح نہ بتاتا تو وہ چاقو کی موجودگی سے شک میں پڑ جاتے اور صبح ہونے سے پہلے مجھے ہرگز نہ چھوڑتے۔ جیب میں جتنی بھی رقم تھی، وہ میں نے سپاہی کو دینے کا خیال کیا لیکن اگر سپاہی رقم لینے سے انکار کر دیتا تو بات اور بگڑ سکتی تھی۔ دوسرے سپاہی کسی لمحے بھی یہاں پہنچنے والے تھے۔ میں نے اپنے سامنے، دائیں، بائیں دیکھا۔ سیٹیاں تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی سیٹی زمین پر دُور پھینک دی۔ سپاہی بوکھلا کے اُسے حاصل کرنے کے لیے دوڑا۔ اُس نے میری جیب چھوڑ دی۔ میرے دونوں ہاتھ کُھلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ جُھکا، میں نے جھپٹ کے ایک ہاتھ سے اُس کا منہ بند کیا اور کسی تاخیر کے بغیر دوسرے ہاتھ سے اُس کی گردن پر ضرب لگائی۔

سپاہی کی ایک ہلکی کراہ بلند ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں اُسے دکان کے تختے پر ڈال کے آہستگی سے رینگتا ہوا ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں تعفن پھیلا ہوا تھا۔ شاید یہاں لوگ کوڑا کرکٹ ڈالتے تھے۔ بارش کا پانی گڑھوں میں جمع تھا۔ میرے پاؤں کوڑے کیچڑ میں دھنستے رہے لیکن میں مین روڈ پر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لے کے مجھے بٹھانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اُسے دُگنے پیسوں کی پیش کش کی تھی۔ میں نے غور نہیں کیا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے کیونکہ جس جگہ سے ٹیکسی چلی تھی، وہ میری دیکھی ہوئی نہیں تھی۔ ڈرائیور کی نیت خراب ہو گئی۔ اُس نے ایک سنسان جگہ گاڑی روک لی۔ میں سمجھا، گاڑی خراب ہو گئی ہے لیکن اُس کے ہاتھ میں کُھلا ہوا چاقو تھا اور وہ مجھ سے جیب کی ساری رقم نکالنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں اُسے سارے پیسے دے دوں گا پہلے وہ مجھے میری منزل پر تو پہنچا دے۔ اُس نے چاقو میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے اُس سے دوبارہ کہا کہ وہ میری بات کا یقین کر لے۔ اُسے کچھ خیال آ گیا مگر اُس نے یہ شرط رکھی کہ میں پہلے سارے پیسے اُس کے حوالے کر دوں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے تمام رُپے اُسے تھما دیے۔ رُپے ہاتھ میں آ جانے کے بعد وہ مجھے ٹیکسی سے فوراً اُترنے کا حکم دینے لگا۔ مجھے غصّہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ "چلو، اُترو اور بھاگ جاؤ۔" اُس نے چاقو میری گردن کے گرد لہراتے ہوئے سختی سے کہا۔ میں نے اُس کے چاقو والے ہاتھ پر سکون سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک دم اُچھل گیا۔ اُسے میری جانب سے اس برتاؤ کی توقع نہیں تھی۔ اُس کے ہاتھ ہلنے کے وقفے میں، میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کی کلائی پکڑ لی۔ اُس نے زور کیا۔ میں اُس کا ہاتھ اُس کے سینے تک لے گیا۔ میرے انگوٹھے کے ناخن سے اُس کی نس دبی ہوئی تھی جس سے اُس کے ہاتھ کی طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ وہ چاقو سنبھالنا نہیں جانتا تھا۔ اُس نے گھبرا کے چاقو چھوڑ دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے چاقو اُٹھا کے اُسے بند کر دیا۔

"چلو۔" اپنی نشست سے کمر ٹکاتے ہوئے میں نے کہا۔

"دادا! اپن کو معاف کر دو۔" وہ التجا کرنے لگا۔

"سیدھی طرح چلو۔" میں نے اُسے چاقو واپس کر دیا۔

ڈرائیور نے راستے میں کئی دفعہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اپنا منہ بند کر لیا۔

گھر سے خاصے فاصلے پر میں ٹیکسی سے اُتر گیا۔ ڈرائیور نے باہر آ کے میری پنڈلیاں چھوئیں اور تمام رُپے واپس کر دیے۔ میں نے اُسے مقررہ کرایہ دینا چاہا۔ اُس نے وہ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ "نئیں دادا! اپن کے لیے ایک ڈبل حرام ہے۔"

میں نے اُس سے زیادہ ضد نہیں کی۔ گلیوں میں چوکی داروں کی آوازیں اور لاٹھیوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔ ابھی گھر دُور تھا اور پھر کوئی بھی درمیان میں آ سکتا تھا۔ کیا پتہ کون کس وقت کس ارادے سے سامنے آ جائے۔ میں چاروں طرف دیکھ دیکھ کے محتاط انداز میں قدم بڑھاتا ہوا گھر سے قریب ہوتا رہا۔ یہ احتیاط بے کار تھی، جب تک دوسرے بھی احتیاط نہ برتیں۔ دوسرے خود رخنہ ڈال دیتے ہیں۔ اپنے طور پر طے کی ہوئی ہر بات ادھوری ہے جب تک دوسرے اُس کا ساتھ نہ دیں۔ رہنے کے لیے کوئی اور دنیا تو ہے نہیں۔ اگر میں خاموش رہتا تو گھر پہنچنے کے بجائے اس وقت کہیں اور ہوتا۔ اپنے گھر واپس آنے والے اشخاص کو نہ جانے کتنی مشکلوں سے گزرنا پڑتا ہو گا، راستے میں طرح طرح کے لوگ ملتے ہوں گے، اُن لوگوں سے بچ کے گھر پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔ ہر شخص اپنے پاس چاقو تو نہیں رکھ سکتا۔ میرا جی متلا رہا تھا۔ ہر آدمی کو اُس سے خار ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ میں اُس کے پاس پہنچ سکوں۔ جبین نے دروازہ کھولا۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا اور فرش پر چادر بچھا کے لیٹ گیا۔ میرے کانوں میں سیٹیاں بجتی رہیں اور آنکھوں سے پانی بہتا رہا۔

دوسرے دن اسپیشل پولیس نے شہر کے مختلف پاڑوں پر اچانک چھاپے مارے، تلاشی لی اور بہت سے آدمی پکڑ لیے۔ انھوں نے پاڑوں کے کئی داداؤں کو بھی گرفتار کر لیا۔ پیرو کے پاڑے سے انھیں کچھ دست یاب نہیں ہوا البتہ دوسری جگہوں سے انھیں منشیات، مسروقہ مال اور ہتھیاروں کا انبار ملا۔ ہر جگہ سے کئی سو آدمیوں کو بیک وقت پکڑا گیا تھا۔ ان میں سے بعض آدمی ایسے بھی تھے جنھیں پہلے گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ چھنگا اور بالم خاں کے پاڑے بھی خالی گئے۔ اس مرتبہ پولیس نے نام بنام بہت سے لوگوں کو طلب کیا تھا۔ زیادہ تر زخمی واپس آ چکے تھے۔ مارتی بھی دو ایک دن میں آنے والا تھا۔ فہرست میں اُس کا نام نہیں تھا لیکن دو ایسے نام فہرست میں شامل تھے جو ابھی تک خفیہ جگہوں پر اپنے زخم سُکھا رہے تھے، اُن کی واپسی میں ابھی دیر تھی۔ پیرو نے اُن کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی

کہ وہ گزشتہ دو روز سے غائب ہیں، شاید اپنے گاؤں چلے گئے ہوں، آئیں گے تو انھیں تھانے بھیج دیا جائے گا۔ اتنے آدمیوں میں سے دو کا موقع پر نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ کئی اور زخمی بھی تھے جن کا نام اُن کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ ہر آدمی روزانہ باڑے میں آ کے حاضری دے۔ ویسے تجھل نے ایسے لوگ منتخب کیے تھے جن کے گھر در نہیں تھے اور جو باڑوں میں مستقل طور پر یا اِدھر اُدھر پڑے رہتے تھے۔ جن لوگوں کے گھر بار تھے، انھیں واردات کی رات تیواڑی کے اڈے کے آس پاس متعین کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ کاری زخم لگنے سے محفوظ رہ سکیں۔ باڑے سے متعلق لوگوں کا زخمی ہونا عام بات تھی۔ پولیس انھیں پکڑ بھی لیتی تو یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ وہ کہاں زخمی ہوئے ہیں اور انھیں کس نے زخمی کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ہی باڑوں کے کسی آدمی کا نام لے سکتے تھے۔ جامو اور کانتے بھی اب باہر نکل سکتے تھے۔ اُن کی روپوشی محض احتیاطاً تھی۔

اخبارات پولیس کی ناکامی پر بہت جز بز تھے۔ ان تازہ گرفتاریوں کے بعد خبروں میں پھر سے سرگرمی نظر آنے لگی۔ اب کے پیرو نے اپنے باڑوں سے گرفتار ہونے والوں کی ضمانت کا انتظام کرنے میں عجلت نہیں کی۔ دو دن سخت پوچھ گچھ کر کے پولیس نے بیشتر آدمیوں کو خود چھوڑ دیا۔ اُن پر خاصا تشدد کیا گیا تھا مگر کسی نے اقرار نہیں کیا۔ پولیس کی بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت اس بات سے عیاں تھی کہ اُس نے باڑوں پر چھاپے مارنے میں کوئی تخصیص نہیں برتی تھی۔ تیواڑی کے ماتحت باڑوں پر بھی اسی طرح اچانک چھاپے مارے گئے تھے۔ ماچی نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں لیکن تیواڑی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ اُسے تجھل اور پیرو نے کہاں چھپایا ہوا ہے، وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے، ایسے حالات میں انھوں نے اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں رکھا ہو گا۔ اُن کی لاشیں کہیں کسی پختہ فرش کے نیچے دبا دی گئی ہوں گی یا انھوں نے تیواڑی کو چھوڑ دیا ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیواڑی میں کچھ غیرت باقی تھی، وہ اپنی کٹی ہوئی ناک لے کے اپنے لوگوں یا پولیس کے پاس نہیں جا سکا۔ میں نے بہت کرید کی مگر کسی نے مجھے اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

اخبارات تیواڑی کی بازیابی پر مسلسل زور دے رہے تھے۔ تجھل نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں اب رات کو بھی باڑے نہ آؤں۔ گھر میں روز جاتا رہا۔ گھر میں ہر وقت جولین تھی۔ اُس کا چہرہ اب دیکھا نہیں جاتا تھا۔ برسوں کی بیمار معلوم ہوتی تھی۔ دن بھر میں بھی اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ اُس دن کے بعد سے نہ اُس نے مجھ سے کوئی بات کی تھی، نہ میں نے اُس سے بات چیت بند بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے کھانے کے لیے بلاتی، میں چلا جاتا۔ وہ مجھے چائے دے جاتی، میں لے لیتا۔ جامو اور کانتے دن میں کئی بار ڈرائنگ روم میں جا کے بیٹھتے تھے۔ وہ مجھے بھی بلاتے تھے مگر میں کوئی نہ کوئی عذر کر کے انھیں ٹال دیتا تھا۔ جولین نے اُن کی خاطر داری میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ کانتے اُسے ہنسانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ مسکراتی تھی لیکن کانتے اُس کی مسکراہٹ دیکھ کے خود اداس ہو جاتا تھا۔

گرفتاریوں کا چوتھا دن تھا۔ میں باڑے پہنچا تو اُس دن سرگرمی کچھ زیادہ نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ پیرو نے آج تمام باڑوں کا انتظام اُسی انداز میں کر دیا ہے جو کچھ دن پہلے ایک رات اُن سب کے درمیان طے پایا تھا۔ چھنگا والا باڑا مستقل طور پر زورا کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ چھیدا کو پیرو نے اپنے پاس رکھنے کا اعلان کیا تھا اور بالم خاں کا باڑا ماسٹر مارٹی کو دے دیا گیا تھا۔ پیرو نے اپنے باڑوں پر بھی مختلف آدمی بٹھا دیے تھے اور اگرچہ ابھی تیواڑی کے باڑے اُس کے قبضے میں نہیں آئے تھے لیکن انھیں سنبھالنے والے آدمیوں کی نام زدگی کی جا چکی تھی۔

اُس رات تجھل میرے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ جولین اُسے دیکھ کے بوکھلا سی گئی۔ تجھل نے آتے ہی اُس کی خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ اُس کا رنگ اُڑا اُڑا کیوں ہے؟ جولین کچھ جواب نہیں دے سکی۔ واردات کے بعد تجھل پہلی بار گھر آیا تھا۔ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تجھل کو جانے کی جلدی بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ چائے کے بعد اُس نے بتایا کہ پرسوں اُس کی روانگی ہے۔ میرے کانوں میں سن سناہٹ ہونے لگی۔ میں نے بے یقینی سے اُس کی طرف دیکھا۔ تجھل کی نظریں جولین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جولین سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ چمپا اور جولین کی ماں ایک دوسرے کے چہرے دیکھ رہی تھیں۔ تجھل نے جولین کو آواز دی۔ وہ چونک پڑی۔ تجھل نے اُسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ جامو اور کانتے پرے ہٹ گئے۔ جولین ڈگمگاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور تجھل کے پاس جا کے چپ بیٹھ گئی۔ "جولی بیٹا! ہم جا رہے ہیں۔" تجھل نے آہستگی سے کہا۔ جولین کے بدن میں جنبش نہیں ہوئی۔ "میں لاڈلے کو بھی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ لاڈلے کو آگے بہت سے کام ہیں۔ شاید تم کچھ جانتی بھی ہو۔ مجھے پتہ ہے کہ تم اکیلی ہو جاؤ گی لیکن اگر میں لاڈلے کو چھوڑ کے بھی چلا گیا تو یہ یہاں نہیں رہے گا۔ ہم تم کو اپنے ساتھ لے چلتے پر وہ جگہ تمھارے رہنے کی نہیں ہے اور ہمارا ابھی کوئی بھروسا نہیں ہے کہ ہم آج کہاں ہوں، کل کہاں۔ ہمت کر کے تم کو ادھر ہی رہنا ہے۔"

"نہیں اُستاد!" کانتے نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "جولی بہن ہمارے ساتھ جائے گی۔ تمھاری ذمے داری پر نہیں، میری ذمے داری پر۔ میں اسے کلکتے لے جاؤں گا اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا، وہ اس کے لیے کروں گا۔"

"چپ رہ۔" تجھل نے تلخی سے کہا۔ "اپنا آپ سنبھالا نہیں جاتا، جوان بہن کو سنبھالے گا۔ کتنے دن سنبھالے گا نقشین! پہلے یہ بیل بوٹے مٹا لے جو تو نے کھال پر جگہ جگہ لگا رکھے ہیں۔ بہن کو رسوا کرے گا؟"

"اُستاد!" کانتے بگڑ کے بولا۔ "اس بیچ تم چپ رہو تو بہتر ہے۔"

"منہ نہ کھلوا کانتے!" تجھل نے گرج کے کہا۔ "بہن کے سامنے گالی..."

"میں یہیں رہوں گی بابا!" جولین اُکھڑی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہیں رہنے میں تیرا سکھ ہے جولی بٹیا!" تجھل نے اپنا لہجہ نرم کرنے کی کوشش کی۔ "جو تیرے لیے بہتر ہے، وہی میں بول رہا ہوں۔"

"جولی بہن اگر ہمارے ساتھ جانا چاہے تو ہمیں منع نہیں کرنا چاہیے تجھل بھائی!" جامو ترشی سے بولا۔ "ہم اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ کیا ہم ایک عورت اور ایک لڑکی کا بار نہیں اٹھا سکتے؟"

"جامو!" تجھل نے ناگواری سے کہا۔ "تو بھی ایسی لونڈوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ کیا جولی کوئی لاچار لڑکی ہے۔ اس نے موٹی موٹی کتابیں پڑھی ہیں رے! یہ کتابیں اسی لیے لکھی جاتی ہیں کہ آدمی اکیلا نہ رہے۔ کتابوں کی دھار چاقو کی دھار سے تیز ہوتی ہے۔ سالا روز یہ منوں ٹنوں کاغذ کیا یوں ہی ردّی کیا جاتا ہے۔ جولی اپنا اچھا بُرا تجھ سے بہتر جانتی ہے۔ چلو! ابھی جولی کی ماں موجود ہے۔ سب کے باپ زندہ نہیں ہوتے، اور تو... تو اور کانتے کیا اپنی بابت کچھ بول سکتے ہیں۔ رہنے دے جامو! بس کر، زرّیں بٹیا کا حال نہیں دیکھا۔ جولی تو نے دلا دی، اور چیزیں بھی تو دلا دے۔ جامو استاد! اَن کہی اَن کہی رہنے دے۔"

"آپ لوگ کیوں ایک دوسرے سے ناراض ہو رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے، میں یہیں رہوں گی۔ میں اور میری ماں۔ اگر ظہیر نہ ملتا تو کیا ہم لوگ نہ رہتے۔" جولین نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم جولی کو زرّیں بہن کے پاس ٹھیرا سکتے ہیں۔ وہ بھی اکیلی ہے اور وہ بھی بہت اچھی ہے۔ جولی کو دیکھ کے خوش ہو گی۔" کانتے بولا۔

"ہاں ضرور خوش ہو گی۔" "تم لوگ اگر جولی کے بجائے زہر لے جاؤ گے تو بھی وہ خوش ہو گی۔ پر کانتے! کیا ہم زرّیں بٹیا کو خوش کر سکے؟" تجھل کا لہجہ بوجھل تھا۔ "بس زیادہ مت بول۔"

"پر استاد! جولی بہن...."

"جولی یہیں رہے گی کانتے!" تجھل نے بلند آواز میں کہا۔ کانتے اپنے کان نوچنے لگا۔ "جولی یہیں رہے گی کانتے! اور عزت سے رہے گی۔ جولی! اگر تم کو کسی بات کی ضرورت ہو تو ہم کو بولو۔ پر جو اپنے ہاتھ میں نہیں ہے، وہ ہم تم کو نہیں دے سکتے۔ تم سمجھتی ہو گی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں جولی! جب بھی تم جامو کو کانتے کو یا مجھ کو کسی کام کے لیے بولو گی، ہم تیسرے دن اِدھر آ جائیں گے۔ بس ہم اتنا ہی بول سکتے ہیں۔"

"بابا! آپ کا بہت شکریہ۔" جولین رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں جولی! ایسی بول کے ہم کو چھوٹا مت کرو۔ ہم ویسے ہی بہت چھوٹے ہیں۔ تم اپنے بھروسے پر کلکتے آنا چاہتی ہو تو آ جاؤ یا جہاں تم بولو، پر جولی! جگہ بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آدمی کوشش کرے تو جدھر چاہے وِدھر اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ دُنیا میں آدمیوں کی کمائی نہیں۔ نظر سنبھال کے ڈالی جائے تو مرضی کے آدمی مل جاتے ہیں۔"

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" جولین سراسیمگی سے بولی۔

"جولی ہیرا ہے اُستاد!" کانتے نے بپھر کے کہا۔

"پر تو جوہری نہیں ہے، تیرے ہاتھ میلے ہیں۔ باتیں مت بنا۔"

"میں اس کے لیے اپنے ہاتھ صاف کر لوں گا۔" کانتے غصّے سے بولا۔

"ساری دُنیا کا صابن خرچ ہو جائے گا کانتے! کر لے۔ اگر تو یہ کر سکتا ہے تو کر لے۔ تو اس ہیرے کو ساری عمر ڈبیا میں بند کر کے رکھنا۔"

"کانتے بھائی! آپ بابا کے ساتھ جائیں۔" جولین نے اپنی آنکھیں چھپا لیں۔ "میں یہاں بالکل خوش رہوں گی۔ بہت آرام سے رہوں گی۔"

کانتے نے کچھ اور کہنا چاہا مگر جامو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُسے تحمل کی تلقین کی۔ "چمپا بائی!" تجھل نے چمپا کو مخاطب کیا۔ اُس کی آواز بگڑی ہوئی تھی۔ چمپا سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ "تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں... میں کیا سوچوں۔" وہ ہکلاتی ہوئی بولی۔

"چمپا بائی!" تجھل نے مدھم لہجے میں کہا۔ "تمھیں بھی کچھ سوچنا تو ہو گا۔ تم چاہو تو یہیں جولی کے پاس رہ سکتی ہو یا چاہو تو ہمارے ساتھ چل سکتی ہو۔"

"میں تو ظہیر میاں کی وجہ سے بمبئی آئی تھی اور اسی کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔" چمپا جھجکتی ہوئی بولی۔

"مگر تم میرے پاس کیسے رہو گی؟ میں تمھیں کہاں رکھوں گا؟" میں نے وحشت سے کہا۔ "مجھے تو خود بہت دُور..."

تجھل نے میری بات کاٹ دی۔ "چمپا بائی! لاڈلے ابھی کسی ایک جگہ نہیں رہے گا۔ جب کبھی اس کا گھر ہو جائے، تم اس کے پاس چلی آنا۔ میں لاڈلے کو تمھاری طرف سے بولوں گا۔ ابھی تم اپنے آپ کے بارے میں فکر مت کرو۔ جیسا تم بولو گی، وہی ہو سکتا ہے۔ جولین بھی اپنی بٹیا ہے۔ تم اِدھر بھی رہ سکتی ہو اور چلنا چاہو تو چل بھی سکتی ہو۔"

چمپا بائی میری طرف دیکھنے لگی۔ جولین کی ماں نے پہلی بار زبان کھولی۔ "ابھی چمپا کو اِدھر چھوڑ جاؤ۔ ہم بالکل اکیلا ہو جائیں گا۔"

"اس کا فیصلہ خود چمپا بائی کرے گی۔" تجھل نے نرمی سے کہا۔

"کیوں چمپا بائی! ابھی تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گی؟" جولین کی ماں نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں ممی! چمپا دیدی کو مجبور مت کرو۔" جولین کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔

"میں وہاں سے آنے کے بعد کہیں جگہ جا سکتی تھی لیکن مجھے ظہیر کے پاس آنا تھا، اِس کے پاس رہنا تھا۔ میری کوئی خواہش نہیں تھی۔ اب بھی یہی ہے لیکن اب مجھے ظہیر کی طرف سے کچھ سکون ہے کیونکہ یہ تمھارے ساتھ جا رہا ہے تجھل بھائی! میں ابھی جولین کے ساتھ رہوں گی

لیکن مجھے رہنا تو ظہیر ہی کی چوکھٹ پر ہے۔ میں اس کے لیے دعا کرتی رہوں گی۔" جولین کی ماں نے چمپا کو زور سے چمٹا لیا۔

کچھ دیر بعد ہنجل کل آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے اُٹھ گیا۔ میں، جاموا اور کانتے اُسے ٹیکسی تک پہنچانے گئے۔ کانتے بہت چُپ چپ تھا۔ واپس آ کے بھی وہ کسی سے بات کیے بغیر پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں رات بھر جولین کے پاس جانے کے لیے سوچتا ہی رہا، پھر صبح ہو گئی۔

صبح اُٹھ کے سب سے پہلے میں نے کرشنا جی کی جائداد اور بینک سے متعلق تمام کاغذات نکالے۔ مدراس سے آنے کے بعد انھیں میں نے اب تک نہیں چھوا تھا۔ ایس، پی شکلا کے گھر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ جولین اور چمپا غالباً ایک دو بار وہاں جا چکی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ پتہ پوچھتے پوچھتے آخر میں اُس کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا نام سُن کے شکلا بے تابی سے باہر آیا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کے متجسس نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر وہ مجھے فوراً اندر لے گیا اور میری اس غیر متوقع آمد کا مقصد پوچھنے لگا۔ "شکلا جی!" میں نے دبے دبے لہجے میں کہا: "میں آپ کو یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ میں جا رہا ہوں۔ آپ اپنی ڈیوٹی پر واپس جائیں۔ میں یہ کاغذات اپنے ساتھ لایا ہوں، انھیں دیکھ لیجیے۔ میں نے ان میں سے ایک پیسہ استعمال نہیں کیا ہے۔"

"مگر تم یہ مجھے کیوں دکھانا چاہتے ہو؟" وہ مضطرب لہجے میں بولا: "یہ پیسہ تمھارا ہے۔ تم اسے جہاں چاہو خرچ کرو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن تم اسے اچھی جگہ خرچ کرو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"میں نے اسے خرچ ہی نہیں کیا ہے اور اب میں جا رہا ہوں، چلتے وقت مجھے آپ سے ملنا بھی تھا اور آپ سے ایک کام میں مدد بھی لینی تھی۔"

"کہو کہو، کیا کام ہے؟" میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنا سارا روپیہ جولین کے نام منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں جو ضروری قانونی کارروائیاں ہیں، اُن کی تکمیل میں وہ میری مدد کرے۔ چونکہ میرے پاس وقت کم ہے اور میں ان باتوں سے ناواقف بھی ہوں۔ "ظہیر خاں!" وہ حیرت زدہ آواز میں بولا: "کیا تمھارا دماغ ٹھیک ہے؟"

"کیوں شکلا جی! کیا میں یہ پیسہ کسی کے نام نہیں کر سکتا؟"

"ضرور، ضرور، تم اسے آگ بھی لگا سکتے ہو، کنویں میں بھی پھینک سکتے ہو۔ تم مالک ہو، تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔"

"شکلا جی! مجھے احساس ہے کہ یہ رقم کرشنا جی کی ہے، میں اسے کہیں اور ضائع نہیں کر رہا ہوں، جولین کو دے رہا ہوں۔ کرشنا جی اسے بھی خود سے بہت قریب سمجھتے تھے۔"

"مجھے شک ہے کہ اس وقت تمھاری طبیعت ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس چلو۔ تم یہ سارا روپیہ جولین کے نام کر دینا چاہتے ہو۔ وہ لڑکی اسے سنبھال سکے گی؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا: "اگر تمھیں جولین کی کچھ مدد ہی کرنی ہے تو اُسے چند ہزار دے سکتے ہو، ایک لاکھ دے سکتے ہو، اس سے کچھ اور زیادہ دے سکتے ہو مگر یہ..... اوہ۔ کرشنا جی ہوتے تو! مگر کرشنا جی کیوں ہوتے۔"

"کیا وہ ناراض ہوتے؟"

"وہ اپنا سر پیٹتے ظہیر خاں!"

"وہ کچھ بھی نہیں کہتے۔ وہ اگر یہ سب کچھ اپنی زندگی میں میرے نام کر دیتے اور میں اسے جولین کو دے دیتا تو وہ زبان پر ایک حرف بھی نہ لاتے۔"

"تم جولین کو یہ کیوں دینا چاہتے ہو؟"

"میں سمجھتا ہوں، اُسے مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ اُس کا باپ مر گیا ہے۔ ایک بوڑھی ماں ہے۔ وہ اکیلی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔"

"روپیہ تو اُس کی پریشانی اور بڑھا دے گا ظہیر خاں! روپے سے اگر پریشانیاں دُور ہو جائیں تو تم اس قدر پریشان نہ ہوتے۔"

"وہ اور بات ہے۔"

"وہ اور بات نہیں ہے ظہیر خاں!" "میرے دوست! ذرا غور کرو۔" شکلا میرا ہاتھ دباتے ہوئے تلملاتی آواز میں بولا: "میں تمھیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا اور نہ اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد کروں گا۔"

"شکلا جی! میں آپ سے مشورہ لینے نہیں آیا ہوں۔ آپ مناسب نہیں سمجھتے تو یہ رقم آدھی کر دیجیے۔ جولین کو واقعی روپے کی ضرورت ہے۔ وہ اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے، وہ ولایت چلی جائے۔ وہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ اُس کی ترقی میں جو رُکاوٹ ہے، وہ روپے سے بڑی حد تک دُور ہو سکتی ہے۔"

"تم نے جولین سے اس کا تذکرہ کیا تھا؟"

"ہاں، پہلا اُس نے منع کر دیا۔"

"منع کر دیا! تو جان لو کہ وہ اب بھی اسے قبول نہیں کرے گی۔"

"میں اُسے بتاؤں گا ہی نہیں۔ رخصت ہوتے وقت کاغذ دے جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد وہ دیکھے گی تو خود بخود اُسے قبول کرنا ہوگا۔"

"نہیں نہیں"۔ اُس کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔ وہ مجھے سمجھاتا رہا مگر میں اپنی بات پر قائم رہا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ رقم اُس کی جیب سے نہیں جا رہی ہے اور جولین کو وہ خود بھی پسند کرتا ہے۔ مجھے سوچنا چاہیے کہ پھر اُس کی ناآمادگی کی کیا وجہ ہے۔ "تم کب جا رہے ہو؟" اُس نے افسردگی سے پوچھا۔

"کل رات۔"

"اور کہاں جا رہے ہو؟"

"کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔"

"کوئی تو منزل ہوگی؟" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی شاید کلکتہ سمجھیے۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"وہاں تمھارا پتہ کیا ہوگا؟"

"میرا پتہ!" میں سوچنے لگا کہ اُسے کیا پتہ بتاؤں۔ مجھے کلکتے میں بھی کب رہنا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ اگر میں کلکتے گیا تو وہاں شاید چند ہی دن ٹھہروں گا پھر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ "مگر آپ پتہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھارے بارے میں کوئی خط آیا تو کہاں مطلع کروں؟"

"چھوڑیے شکلا جی! خط آنا ہوتا تو اب تک آ جاتا۔"

"مجھے اب بھی اُمید ہے۔ فرض کرو، تمھاری عدم موجودگی میں کوئی خط کہیں سے آ جائے تو میں تمھیں کہاں ڈھونڈوں؟"

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے اُسے فیض آباد میں زرّیں کا پتہ بتا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے خط لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور اُس نے لکھا بھی تو زرّیں کے پاس وہ خط محفوظ رہے گا۔ وہ ہنجل کو مطلع کر دے گی۔ یہ پتہ کسی اڈّے کا نہیں تھا، زرّیں کا تھا۔ شکلا نے اسے ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ میں نے دوبارہ اُس کی توجہ رقم کی طرف دلائی۔ اُس نے پھر مشورہ دیا کہ مجھے اور سوچ لینا چاہیے۔ یہ رقم بعد میں بھی کسی وقت منتقل ہو سکتی ہے۔ اُس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شاید بعد میں میرا ارادہ بدل جاتے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کاغذات کی تکمیل کے لیے اِس وقت میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں اُٹھ گیا۔ میں نے اُس سے وعدہ لیا کہ وہ اپنی ملازمت پر واپس چلا جائے گا۔ اُس نے مجھے کئی بار گلے لگایا، میرے گال چومے اور کہا کہ کل کسی وقت مجھ سے ملنے کے لیے وہ گھر آئے گا۔

باہر آنے کے بعد ہی میں نے کسی وکیل کی تلاش شروع کر دی۔ راستے میں ایک جگہ ایک بورڈ پر میری نظر پڑی۔ میں جھجکتے جھجکتے وکیل کے دفتر میں پہنچا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اُس نے میری بات پوری توجہ سے سُنی اور سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ اُس نے کئی بار میری شکل دیکھی۔ جیسے میں کوئی مجرم ہوں۔ میں نے اُسے اپنی پوری فائل دکھائی پھر وہ مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگا کہ جولین میری کون ہوتی ہے اور میں یہ سب اُسے کیوں دے رہا ہوں۔ میں نے کہا، تمھیں اس سے کیا۔ تم تو کاغذ تیار کر کے مجھے دے دو اور اپنی فیس بتا دو۔ وہ بڑی مشکل سے آمادہ ہوا۔ اُس نے بتایا کہ زیادہ لمبے چوڑے طریقۂ کار میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں جولین کے نام جس رقم کا چاہوں، ایک چیک کاٹ سکتا ہوں اور چیک کے ساتھ احتیاط کے طور پر بینک کو خط بھی لکھ سکتا ہوں۔ خط کا مضمون بھی اُس نے مجھے بتا دیا۔ میں نے فیس کے لیے کہا تو اُس نے انکار کر دیا کہ وہ مشورے کی فیس نہیں لیتا۔ میری جیب میں پیسے بھی کم تھے اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ زیادہ پیسے نہ مانگ لے۔ اب تمام کام مجھے کرنا تھا۔ وکیل سے بات کر کے مجھے اپنا وزن کچھ کم محسوس ہوا۔

باڑے میں ہنجل کی وہ آخری رات تھی۔ جاموا اور کانتے میرے ساتھ تھے۔ آج معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ ہر طرف بریانی اور بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ آج وہاں مارتی بھی نظر آ رہا تھا۔ زورا اور چھیدا بھی تھے۔ پیرو گو ہنجل کے پاس بیٹھا ہوا تھا مگر کسی سے بہت کم بات کر رہا تھا۔ میں نے مارتی کو جولین کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ وہ رونے لگا اور بولا کہ راجا! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں پھر کبھی ضرور ملاقات ہوگی۔ جاموا اور کانتے بھی لوگوں کے درمیان گھرے رہے۔ سب نے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد سامنے کی جگہ پر سازندوں اور طوائفوں نے قبضہ کر لیا۔ آج ایک نہیں، چار چار طوائفیں موجود تھیں۔ سب زرق برق لباس پہنے اور سنگھار کیے ہوئے تھیں۔ گانے میں ہم بس تھوڑی دیر بیٹھے۔ جاموا اور کانتے کی وجہ سے مجھے بھی رُکنا پڑا۔ جب ہم چلنے لگے تو محفل درہم برہم ہو گئی۔ ہنجل اور پیرو کے سوا تقریباً سبھی ہمارے ساتھ گلی میں آ گئے اور بار بار ہمیں اپنے سینوں میں بھینچتے رہے۔

جولین نے میرے لیے ایک سوٹ کیس خرید لیا تھا۔ میرے تمام کپڑے اُسی سوٹ کیس میں بھر دیے گئے تھے۔ یہ کپڑے کرشنا جی نے بنوائے تھے اور بعد میں جولین نے سلوائے تھے۔ ہم گھر پہنچے تو یہی تیاری ہو رہی تھی۔ جولین نے ہنجل، کانتے اور جاموا کے کپڑے بھی بنوائے تھے۔ جولین کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ میں تو اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ دونوں رات گئے تک باہر ہی بیٹھے رہے۔ صبح ہوئی تو میں آخری بار اُسے تلاش کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ ممکن ہے وہ اسی شہر میں ہو اور اب تک میری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔ میں گھنٹوں مصروف چوراہوں پر کھڑا ہوا لوگوں کو تکتا رہا۔ شام کو واپس آیا تو میرے پیروں میں دُکھن ہو رہی تھی۔ گھر کے باہر ایک نئی لمبی سیاہ موٹر کھڑی تھی اور باوردی ڈرائیور موٹر میں اونگھ رہا تھا۔ یہ موٹر میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ڈرائیور سے پوچھ لینا مناسب سمجھا کہ اندر کون آیا ہے۔ اُس نے نورین کا نام لیا۔ مجھے تسلی ہوئی۔ اندر نورین ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں اکثر آتی رہتی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل بھی آئی تھی اور چمپا نے اُسے میری روانگی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ میرے لیے ایک گل دستہ لائی تھی اور گیارہ بجے دن سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُسے بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ وہ نیلی قمیص اور اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے گلے میں ایک سفید رومال بندھا تھا۔ بالکل کسی اسکول کی طالبہ معلوم ہو رہی تھی۔ "اگر میں کل نہ آتی تو مجھے پتہ بھی نہ چلتا۔" وہ شکایت کرنے لگی۔ میں نے اُس سے معذرت کی کہ میں زیادہ مصروفیت کی وجہ سے اس دوران میں اُس سے نہیں مل سکا اور نہ اُس

سے گھر آسکا۔ زرین نے میری معذرت قبول کرلی اور کرشنا جی کا ذکر کرنے لگی کہ کلب میں لوگ انھیں بہت یاد کرتے ہیں اور کبھی کبھی میرا تذکرہ بھی ہو جاتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہاں لوگ میرے بارے میں مختلف قسم کی باتیں کرتے ہیں اور ڈیڈی بھی تمھیں پوچھتے رہتے ہیں۔ وہ یہ باتیں چمکتی آنکھوں سے کر رہی تھی۔ جولین بھی موجود تھی۔ زرین نے اُس سے پانی طلب کیا اور جولین جیسے ہی اندر گئی، زرین کھسک کے میرے قریب آگئی۔ اُس نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کچھ وقت ہے؟ میں نے جواب دیا کہ گاڑی رات کو جاتی ہے، ابھی خاصا وقت پڑا ہے۔ "مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں مگر یہاں نہیں۔ کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ چلو۔ میں تمھیں یہیں پہنچا دوں گی۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔

"کیسی باتیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کچھ اہم باتیں۔" میں نے تجسس سے اُسے دیکھا۔ وہ تیزی سے بولی "ایسی کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ بس تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میں نے بے تابی سے اقرار میں گردن ہلا دی۔ جولین کے آنے پر وہ چپ ہو گئی۔ میرے دل کو بے کلی ہو گئی کہ وہ مجھ سے ایسی کیا باتیں کرنا چاہتی ہے۔ چند منٹ بعد وہ واپس جانے لگی۔ میں بھی اُس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا۔ جولین اور چمپا بھی دروازے سے باہر آگئی تھیں۔ زرین نے اُن سے کہا کہ وہ مجھے ابھی کچھ دیر بعد واپس لے آئے گی۔ وہ دونوں دیکھتی رہ گئیں۔ موٹر فرّ سے روانہ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اعلا درجے کے ایک پُرسکون اور ٹھنڈے ریستوراں کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "تمھارے پاس وقت کم ہے اس لیے میں کسی تمہید کے بغیر بات کروں گی۔" وہ بیرے کو کافی کا آرڈر دیتے ہوئے کچی پکی اردو میں بولی "تم جانتے ہو کہ مجھے ادھر اُدھر کی باتیں کرنا نہیں آتا۔ میں تمھارے گھر کوئی دس بار آئی ہوں گی، تم کسی بار نہیں ملے۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید جولین اور چمپا تمھیں میرے بارے میں کچھ بتاتی نہیں ہیں۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ انھوں نے ہر بار مجھے بتایا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔" وہ عجلت میں بولی "پہلے مجھے تم سے چند سوال کرنے ہیں، جواب دیتے رہنا۔ پھر میں اپنی بات بتاؤں گی۔" اُس کی آواز میں لرزہ تھا۔

"پوچھیے۔"

"یہ بتاؤ کہ میں تمھیں کیسی لگتی ہوں؟"

"جی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں مجھے بتاؤ کہ میں کیسی لگتی ہوں؟"

"تم... تم بہت اچھی ہو۔"

"نہیں۔" وہ مچل کے بولی "تم مجھے بتاؤ کہ میں تمھیں لگتی کیسی ہوں؟ صرف چہرے مہرے اور رنگ روپ سے نہیں، دونوں طرح تمھیں پوری آزادی ہے کہ تم جس طرح سمجھتے ہو کسی جھجک کے بغیر کہہ دو۔ مجھے خوش کرنے کے لیے جواب نہ دینا۔ اب تم جا رہے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پھر کبھو نہ ملیں اور ایک دوسرے سے شرمندہ نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے تم سے صاف جواب کی اُمید نہ ہوتی تو میں یہ سوال کرتی ہی نہیں۔"

"یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس میری بات کا جواب دو۔"

"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"تم بھی مجھے اچھے لگتے ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں۔ میں نے طے کیا ہے کہ تم مجھ سے اور میں تم سے شادی کر لوں۔"

"کیا۔؟" میں اچھل گیا۔

"ہاں۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی "یہ بات تمھیں عجیب محسوس ہو گی لیکن ہم ایک دوسرے سے کیوں جھجکیں اور غیر ضروری باتوں میں وقت کیوں ضائع کریں۔"

"مگر... مگر" میری آواز دھڑکنے لگی۔

"ہاں تمھارے ذہن میں چند سوال آسکتے ہیں۔ پہلا سوال یہ آ سکتا ہے کہ میں ایک پارسی لڑکی ہوں اور تم مسلمان ہو۔ میرے لیے یہ کوئی اختلاف کی بات نہیں ہے۔ تمھارے لیے میں مسلمان ہو سکتی ہوں۔ دوسرا سوال شاید تمھارے ذہن میں یہ ہو کہ میں ایک کروڑپتی باپ کی بیٹی ہوں اور تم اتنی بڑی حیثیت کے آدمی نہیں ہو۔ میں اسے بھی مسترد کرتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو جو کچھ تمھارا ہے، وہ میرا ہے اور جو میرا ہے، وہ تمھارا ہے۔ تیسرا یہ سوال تمھیں پریشان کر سکتا ہے کہ میرے ڈیڈی رستم جی کیسے اور کیوں تیار ہو جائیں گے تو اس کی فکر بھی چھوڑ دو۔ میرے ڈیڈی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں اُن کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ انھوں نے بہت پہلے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں جسے پسند کروں گی، انھیں اُس کے ساتھ میری شادی کر دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میں نے ایک بار اُن سے تمھارا ذکر کیا تھا، انھوں نے تمھارے بارے میں اچھی رائے ظاہر کی تھی۔ میں تمھارے لیے ایک اچھی بیوی ثابت ہوں گی اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے لیے ایک عمدہ شوہر......"

"زرین... میں... میں" میں نے سراسیمگی سے کچھ کہنا چاہا۔ "ممکن ہے تمھیں کوئی اور لڑکی مجھ سے زیادہ پسند ہو، یہ بات میرے لیے دکھ کی ہے لیکن میں تمھارے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تم اپنے لیے مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ میں چھ مہینے تک تمھارا انتظار کروں گی۔ یہ عرصہ سوچنے کے لیے بھی کافی ہو گا اور تمھیں کام نمٹانے کے لیے بھی۔"

"لیکن... لیکن سوچنا کیا ہے۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"سوچنا ہے ظہیر! سوچنا چاہیے۔ میں نے اپنے طور پر تمھارے بارے میں خوب سوچ لیا ہے لیکن تم نے میرے متعلق اس انداز سے ممکن ہے نہ سوچا ہو۔ یہ شادی ہے۔ ہم دونوں زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ ایک دوسرے کے وفادار۔ ہم دو ہیں، ایک ہو جائیں گے۔ ہماری روحیں، ایک دوسرے سے بندھ جائیں گی۔ سوچے بغیر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تمھیں سوچنے کا پورا موقع دینا چاہتی ہوں۔"

زرین کے گال تمتما رہے تھے۔ میرا سارا جسم گنگ ہو گیا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی کافی بنائی۔ ایک پیالی میرے آگے رکھ دی۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کرنے کی بہت کوشش کی۔ اُس سے کچھ کہنے کے لیے میرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "چلو اٹھو، تمھیں دیر ہو رہی ہے۔" اُس نے بیرے کو بلا کے ایک نوٹ دے دیا اور ریستوراں سے نکل آئی۔ واپسی پر اُس نے مختلف دکانوں سے میرے لیے سوٹ کا کپڑا، شیونگ کا سامان، جوتے، بسکٹوں کے ڈبے اور بہت سی چیزیں خریدیں اور تمام سامان کے ساتھ مجھے چھوڑ گئی۔ وہ اندر نہیں آئی۔ موٹر روانہ ہونے سے پہلے اُس نے یاسیت سے کہا کہ وہ میرے مثبت جواب کی توقع رکھے گی۔ اُس نے کچھ اور بھی کہا جو میں نے سنا نہیں۔ موٹر چل پڑی۔

گھر میں سبھی میرے منتظر تھے۔ تجمل آچکا تھا۔ سوٹ کیس اور بستر بند ڈرائنگ روم میں رکھے تھے۔ جولین، کلنتے اور جامو کے درمیان نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ میری سانس قابو میں نہیں تھی اور مجھے سفر کے خیال سے ہول آ رہا تھا، دل ڈوبا جا رہا تھا۔ تجمل نے میرا بازو پکڑ کے مجھے جھنجوڑ دیا۔

"کیا بات ہے لاڈلے؟" وہ بے قراری سے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے سنبھل کے کہا "کچھ بھی نہیں۔"

"چلنا ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"ہاں چلو۔" میں نے بہکے بہکے انداز میں کہا۔ میں اُس سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکا کہ بس آج کے لیے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا جائے۔ کلنتے ٹیکسی لینے چلا گیا تھا۔ دو ٹیکسیاں آئیں۔ جولین کی ماں گھر ہی پر رہی۔ اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور دعائیں دے کے مجھے رخصت کیا۔ جولین، چمپا اور میں ایک ٹیکسی میں اور دوسری میں وہ تینوں بیٹھ گئے۔

ٹیکسی میں خاموشی طاری تھی۔ پھر چمپا کی روتی ہوئی آواز اُبھری۔ "پیارے میاں! خط لکھنا۔" میں نے گردن ہلائی۔ وہ آیتیں پڑھ پڑھ کے مجھ پر پھونک رہی تھی۔ اسٹیشن پر پیرو پہلے سے موجود تھا۔ اُس کے ساتھ صرف زورا، چھیدا، ماچھی، ٹنڈا اور مارتی تھے۔ گاڑی روانہ ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے چمپا کو علیحدہ لے جا کے ایک لفافہ دیا اور اُسے تاکید کر دی کہ وہ گھر پہنچ کے کسی مناسب وقت لفافہ جولین کو دے دے۔

ٹنڈے نے میری ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں اور اپنا سر پٹخ رہا تھا۔ مارتی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ وہ سب ہم سے بار بار لپٹ جاتے تھے۔ گارڈ نے سیٹی بجائی تو پیرو نے دونوں ہاتھوں سے میرے بال کھینچ لیے اور پیشانی سے سر مارتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "لاڈلے! اپن کو تیرا انتظار رہے گا۔"

وہ دونوں ہم سے علیحدہ کھڑی ہو گئی تھیں۔ کلنتے انھی کے پاس تھا۔ گاڑی بس حرکت میں آیا ہی چاہتی تھی۔ میں دوڑ کے اُن کے پاس پہنچا۔ چمپا نے اپنی بانہیں پھیلا رکھی تھیں۔ میں بے اختیار اُس کے سینے سے چمٹ گیا۔ "پیارے میاں! اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ اللہ تمھیں خوش رکھے، شاد آباد رکھے۔" وہ سسکتی ہوئی بولی "تمھاری مرادیں پوری کرے اور میرے لیے جیتے جی مرنے کا انتظام کر دے۔"

میں چمپا سے الگ ہوا تو اُس کے پہلو میں کھمبے سے ٹکی ہوئی جولین کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں ویران تھیں۔ سونی سونی خالی خالی سی۔ میں نے اُسے دیکھا تو اُس پہ کپکپی طاری ہو گئی۔ اگر میں اُس کا شانہ نہ تھام لیتا تو شاید وہ گر جاتی۔ مجھے نہ جانے کیا ہوا۔ میں نے اُسے زور سے کھینچ کے اپنے بازوؤں میں بند کر لیا۔ جولین کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اُسے تجمل نے مجھ سے جدا کیا۔ گاڑی حرکت میں آگئی تھی۔ چمپا نے ایک طرف، دوسری طرف سے مارتی نے بھاگ کر جولین کو سنبھالا دیا۔

ٹنڈا دور تک گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔

ڈبے میں ہم چاروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ یہ فرسٹ کلاس کا ڈبا تھا۔ اسٹیشن سے چلتے ہی گاڑی اندھیرے میں ڈوب گئی اور بتدریج تیز ہوتی گئی۔ ڈبے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب ایک دوسرے سے دور نشستوں کے کونوں میں بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ دیر تک سامان فرش ہی پر پڑا رہا۔ گھر سے جولین اور چمپا نے جو سامان ساتھ کیا تھا، اُس میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ پیرو اور اُس کے آدمی کھانے پینے کی اتنی چیزیں ساتھ لائے تھے کہ ایک ہفتے کے سفر میں بھی بچ جائیں۔ جامو، کلنتے اور تجمل نے اپنے گلوں سے ہار اُتار اُس کے برتھ پہ ڈال دیے تھے۔ کچھ دیر بعد تجمل قریب آگیا اور میرے گلے میں ہاتھ ڈال کے آہستگی سے بولا "ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تیواڑی کی ناک کا تو نے کیا کیا رے؟" وہ مسکرا کے بولا۔

"وہ میں نے گٹر میں پھینک دی تھی۔"

"بڑی ٹھیک جگہ پھینکی تو نے۔"

"اور تیواڑی کا کیا ہوا؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

"وہ بھی کسی ایسی ہی جگہ پڑا ہو گا۔" تجمل اُکتائے ہوئے لہجے میں بولا "جانے دے اب تو سو جا۔ باتیں صبح ہوں گی، کچھ کھا کے سونا۔"

"نہیں بھوک نہیں ہے۔"

"کھا لے! مجھے تو بہت لگ رہی ہے۔"

"تم کھا لو میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اب جی سنبھال کے رکھ، کب تک بچہ گردی کرے گا۔"

میں نے گھور کے اُسے دیکھا "کیسی بچہ گردی؟"

"خفا ہو گیا؟" وہ ہنسنے لگا "ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتا ہے۔ یہی تو بچہ گردی ہے اور کیا ہے۔ خبر ہے تیری عمر کیا ہے؟ پچیس سے

کیا کم ہوگی۔"

"میں ناراض تو نہیں ہوا۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"لاڈلے!" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "اب کہیں اور مت نکل جانا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

"میرے ساتھ ہی رہنا۔"

"تمہارے ساتھ! مگر مجھے تو۔۔!"

"ہُوں، ہُوں۔ بے صبری مت کر۔ بے صبری میں سارا کام خراب ہو جاتا ہے۔ تُو اگر مجھے پہلے بتا دیتا تو شاید یہ بات نہ ہوتی۔"

"تم اسے بے صبری کہتے ہو؟ سات سال وہاں گزر گئے، ایک سال سے اوپر ہو گیا اور تم۔۔۔۔ تم کیا کر سکتے ہو؟ تم بھی میری طرح مجبور ہو۔ تم کیا کوئی جادوگر ہو؟"

"ہاں۔" وہ اداسی سے بولا۔ "میں بھی مجبور ہوں پر لاڈلے! اکہری سوچ سے دُہری سوچ اچھی ہوتی ہے۔ میں تجھ سے کچھ سوچ سمجھ کے ہی بولتا ہوں۔"

"اب تو تمہیں تقریباً ساری باتیں معلوم ہیں۔ مجھے سوچ کے جواب دو کہ میں کیا کروں؟" میں نے زہر خند سے کہا۔ "تم تو مجھے کلکتے لیے جا رہے ہو لیکن میں تمہیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں۔ مجھے کلکتے میں نہیں رہنا ہے۔ تم وہاں جا کے اڈّے پر بیٹھو۔ جب تم اس معاملے میں کچھ کر ہی نہیں سکتے تو خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوتے ہو۔ میں چلا جاؤں گا۔ کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔"

"میں نے تجھ سے کب بولا ہے کہ تُو کلکتے میں رہنا۔ کون چاہتا ہے کہ تُو اڈّے پہ بیٹھے۔ پگلا ڈلے! اب تُو جائے گا نہیں۔ میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔" وہ حکمیہ لہجے میں بولا۔ "اور اگر تُو چلا گیا تو سمجھ لینا کہ میں تجھ سے کبھی بات تک نہیں کروں گا اور تُو بھی کبھی میرا نام مت لینا۔"

"تو تم میرے ساتھ چلو گے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں ایسا بنا تو میں تیرے ساتھ چلوں گا۔"

"کہاں تک؟" میں نے بپھر کے کہا۔ "تلووں میں چھالے پڑ جائیں گے۔"

"میرے دل میں چھالے پڑے ہوئے ہیں، تُو تلووں کی بات کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "تم نے طے کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم نے تو کہنے کے لیے کوئی بات نہیں رکھی۔"

"لاڈلے! مجھے ایک بار تفصیل سے تمام باتیں بتا۔ دیکھ، اب کچھ چھپانا نہیں۔ ہر بات بول دے۔" وہ اپنا بازو تنگ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر کوئی بات رہ گئی تو شاید میں کچھ فیصلہ نہ کر سکوں۔"

جامو اور کانتے اونگھنے لگے تھے۔ میں نے اُسے ساری باتیں ترتیب سے بتا دیں۔ گھر سے نکلنے کا سارا واقعہ، اپنا اصل نام مولوی محمد تنغیق کے ساتھ اور کلکتے کے مختلف ہوٹلوں میں قیام۔ بدھ گیا میں کورا کی تلاش میں بھٹکنے والے بھکشو کی بے تابی، اُس کا قتل۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ وہ یہ سب کچھ سُن کے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں کھڑکی سے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ "کیوں؟ کیا سوچنے لگے؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"لالے! جو بات تُو آٹھ سال سے سوچ رہا ہے۔ کیا مجھے اُس کے لیے چند گھنٹوں کا وقت بھی نہیں دے گا؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"گھنٹے کیا، دن لے لو، سال لے لو۔" میں نے تنک کے کہا۔ "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ سوچنے میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو، کچھ نہیں ملے گا۔"

"کیسی باتیں کر رہا ہے رے!" وہ ناگواری سے بولا۔ "جب تُو اتنا ہی مایوس ہے تو پھر خود کیوں کسی ایک جگہ نہیں ٹک جاتا۔"

"میرا کیا ہے۔ اگر میں کہیں دیر تک ٹھہر جاتا ہوں تو میرا جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ میرے سینے میں جلن ہونے لگتی ہے۔ جب میں چلنے لگتا ہوں تو میری طبیعت ٹھہری رہتی ہے۔ میرے نصیب ہی میں یہ لکھا ہے۔ بُجھل بھائی! مجھے معلوم ہے، دُنیا بہت بڑی ہے۔ اس بڑی دُنیا میں اُسے تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ جدھر دیکھو اُدھر ہی ایک راستہ جاتا ہے مگر وہ آخر کسی جگہ تو رہتی ہوگی۔ رہتی ہوگی نا؟"

"کیوں نہیں بابرے! شیر ببر! اُسے ڈھونڈیں گے۔ کلکتے جانا ضروری ہے۔ تھوڑے دن ٹھہر کے پھر نکل پڑیں گے۔"

"مگر کس طرف؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"سوچنے دے۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تُو نے بتایا کہ وہ مولوی کلکتے کے ایک مدرسے میں پڑھاتا تھا اور مراد آباد شہر میں رہتا تھا۔"

"ہاں۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "مگر میں مدرسے بھی گیا اور مراد آباد بھی۔ اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ جیسا کہ میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے۔"

بُجھل پھر چپ ہو گیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے سفر طے کرتی رہی۔ وہ بیٹھے بیٹھے چونک کے مجھ سے کوئی بات پوچھتا۔ پھر کھو جاتا۔ سارے سفر میں اُس کا یہی حال رہا۔ جامو اور کانتے بیشتر وقت سوتے رہے اور میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا بھاگتی ہوئی بستیاں دیکھتا رہا۔ جو بھی اسٹیشن آتا، میں اُتر جاتا۔ اُن میں سے کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں